آثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیتُ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

[redacted] زیرِ سرپرستی

حضرت آیتُ اللہ العظمٰی الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباحُ القرآن ٹرسٹ



نام کتاب ——— تفسیر نمونہ
جلد ——— ۱
زیر نظر ——— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ——— حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ
ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مطبع ——— احمد دین پرنٹرز لاہور
تاریخ اشاعت ——— مارچ ۲۰۱۱ء
ہدیہ ——— [redacted]

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر
۲۴۔ الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور
فون: 042-37314311, 0321-4481214

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم : السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ : مصباح القرآن ٹرسٹ ـــــ کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشرو اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرۂ آفاق تفسیر ـــــ تفسیر نمونہ ـــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمۂ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۱ مکمل اور جلد ۲ میں سے صفحہ ۱۹ تا ۲۳۳ شامل ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ فاتحہ و سورہ بقرہ کی تفسیر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی



چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفیٰ مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی



گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

گفتارِ مترجم

اردو میں قرآن حکیم کے بہت سے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں۔ اہل تشیع کے ہاں آج بھی مولانا فرمان علی اور مولانا مقبول احمد کے تراجم و حواشی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ایک عرصے تک تفسیر عمدۃ البیان کو شہرت حاصل رہی ہے۔ اب لے دے کے تفسیر انوار النجف ہی ہے۔ دیگر مکاتب فکر کے ہاں بھی متعدد قابلِ ذکر تفاسیر موجود ہیں لیکن کوئی تو مغربی دنیا کی مادی ترقی کے سامنے دفاعی کوشش معلوم ہوتی ہے اور کوئی اصل معانی و مآخذ ہی سے ہٹی ہوئی ہے اور ناروا جدت پسندی کا شکار ہے۔ ایک آدھ کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش تو کی گئی ہے لیکن وہ بھی ذہنی ناپختگی اور مذہبی تعصب کے اثرات سے نہیں بچ سکی۔ البتہ آزاد اور رواں ترجمے اور جدید اردو لہجے میں لکھی جانے والی تفاسیر کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔

قرآن کے بارے میں کی جانے والی ہر کوشش سے کچھ نہ کچھ فوائد تو ضرور حاصل ہوئے ہیں لیکن قرآن مجید تمام علوم کی جامع کتاب ہے، اس کے تمام موضوعات کو اس طرح سے بیان کرنا کہ ہر علم کا تشنہ سیراب ہو جائے اس نظر سے دیکھا جائے تو نہ فقط پاکستان میں شیعوں کے پاس کچھ نہیں بلکہ دیگر مکاتب فکر کا بھی یہی حال ہے۔

ایران کے عظیم الشان اسلامی انقلاب نے ہمارے نوجوانوں میں قرآن شناسی کے لیے ایک نئی تڑپ پیدا کر دی ہے اور ان کے دلوں میں ایک تازہ جوت جگا دی ہے۔ اکثر نوجوان پوچھتے کہ قرآن فہمی کے لیے ہم کس تفسیر کا مطالعہ کریں تو ہمارے پاس اس کا جواب نہ ہوتا۔ شدت سے احساس ہوا کہ اردو میں کوئی مفید ترین اور جامع تفسیر لکھی جائے جو دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور تمام عالمی افکار و نظریات اور علوم و کمالات کے سامنے اسلامی عظمت اور قرآنی سربلندی و بالاتری کا حقیقی مظہر ہو اور جس کے ذریعے قرآنی مفاہیم سے آشنائی بھی ہو اور اس الٰہی و الہامی کتاب سے حقیقی عشق بھی پیدا ہو سکے۔ چند ایک علماء کرام سے اس ضرورت کا تذکرہ کیا لیکن کسی نے حامی نہ بھری۔ خود اپنی کم مائیگی کا احساس جرأت نہیں دلاتا تھا۔

اسلامی فکر و نظر اور علوم و معارف کا اصل سرمایہ عربی اور فارسی میں موجود ہے۔ تفسیر کا بیش بہا خزانہ بھی انہی زبانوں میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ یکجا تو نہیں ہے۔ وسیع مطالعے اور اجتماعی کوششوں کے بغیر اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ ممکن نہیں۔ فرمائشیں، تقاضے اور سوالات بڑھتے رہے۔ اس پر سیٹھ نوازش علی صاحب سے تذکرہ ہوا۔ وہ کہنے لگے آپ خود یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ میں نے اپنی کم علمی کے علاوہ کچھ مجبوریاں بھی ان کے گوش گزار کیں، مگر انہوں نے ہمت بڑھائی۔ اس

بات پر اتفاق ہوا کہ عربی فارسی میں موجود کسی ایسی تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے جو ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہو۔ آخر ہم دونوں نے ایران کا سفر اختیار کیا۔ وہاں مختلف علماء کرام سے اس بات پر مشورہ کیا کہ اس وقت کونسی تفسیر دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور روزمرہ کے سوالات کا آسان اور مناسب جواب مہیا کرتی ہے۔ ہمارے لیے یہ خوشگوار حیرت کی بات تھی کہ سب نے بالاتفاق **تفسیر نمونہ** کا نام لیا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اسی تفسیر کا ترجمہ کیا جائے گا۔

فارسی میں اب تک **تفسیر نمونہ** کی ۱۵ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر کل ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اس طوالت کی ضرورت اس بناء پر ہے کہ قرآن تمام علوم کا مجموعہ ہے۔ کتنا ہی اختصار سے کام کیوں نہ لیا جائے جب تک تمام موضوعات کے اصل مسائل اور اہم اجزاء پر بحث نہ ہو قاری کو صحیح معنی میں مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے تو آج بھی ایران میں ایسے علماء موجود ہیں جنہوں نے قرآن کی تفسیر میں ڈیڑھ سو سے زائد جلدیں لکھی ہیں لیکن ہم نے دقیق علمی اور فلسفیانہ بحثوں کی حامل اور خالص علمی لہجے اور اصطلاحات میں لکھی گئی تفاسیر کو اپنی موجودہ ضرورت سے ہم آہنگ نہیں سمجھا اور خاص طور پر دور حاضر کے نوجوان ذہنوں کی تشنگی کو پیش نظر رکھا۔ اسی معیار اور تقاضے کے پیش نظر "تفسیر نمونہ" کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ترجمے کے کٹھن مراحل میں بالعموم لفظی ترجمے کا اسلوب اپنایا گیا ہے اگرچہ بعض مقامات پر قارئین کی سہولت اور عبارت کی روانی کے لیے آزاد ترجمے کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ہم مفہوم کو منتقل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس سوال کا جواب قارئین ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

اس تفسیر کے سلسلے میں سب سے زیادہ تعاون کرنے والے اور اس کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کرنے والے میرے عزیز دوست سیٹھ نوازش علی ہیں۔ خداوند عالم انہیں بھائیوں، اولاد اور دیگر اعزاء و اقارب کے ساتھ خوش و خرم رکھے، ان کے اموال میں برکت دے، انہیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی عاقبت بخیر کرے۔ ترجمے کی نوک پلک دیکھنے، دوبارہ لکھنے اور اشاعت کے مراحل میں عزیز ثاقب نقوی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عزیز محمد امین کی خدمات بھی اس ضمن میں قابل قدر ہیں۔ پروفیسر مشکور حسین یاد اور دیگر بہت سے احباب بھی اس کار خیر میں تعاون پر تعریف و تشکر کا حق رکھتے ہیں۔

خدایا! ہمیں توفیق دے کہ ہم صرف تیری رضا کے لیے کام کریں۔ جیسے تیرے
بندے اصل تفسیر سے استفادہ کر رہے ہیں اس کے ترجمے سے بھی
صحیح طور پر فائدہ اٹھائیں۔ اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر کرتے ہوئے
اپنی راہ میں اس کام کو ہماری آخرت کے لیے بہترین ذخیرہ قرار دے۔

اللھم صل علی محمد و عترته المعصومین و عجل فرجھم

صفدر حسین نجفی

تفسیر نمونہ جلد اوّل

فہرست

سُورہ حمد

سُورہ بقرہ

❖ ❖ ❖

مقدمہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لغت میں "تفسیر" کا معنی ہے چہرے سے نقاب ہٹانا۔

تو کیا قرآن پر جو نور، کلام مبین اور تمام مخلوق کی ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی واضح گفتگو ہے کوئی پردہ اور نقاب پڑا ہوا ہے جسے ہم ہٹانا چاہتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

قرآن کے چہرے پر تو کوئی نقاب نہیں ہے تو ہم ہیں جنہیں اپنے چہرے سے نقاب ہٹانا چاہیے اور ہماری عقل و ہوش کی نگاہ سے پردہ اٹھنا چاہیے تاکہ ہم قرآن کے معانی کو سمجھ سکیں اور اس کی روح کا ادراک کر سکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کا صرف ایک چہرہ نہیں ہے۔ اس کا وہ چہرہ جو سب کے لئے کھلا ہے، نور مبین ہے اور ہدایت خلق کا رمز ہے عمومی چہرہ ہے۔

رہا اس کا دوسرا پہلو تو اس کا ایک چہرہ بلکہ کئی چہرے اور ہیں۔ جو صرف غور و فکر کرنے والوں، حق کے پیاسوں، راستے کے متلاشیوں اور زیادہ علم کے طلب گاروں پر آشکار ہوتے ہیں، اس میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے ظرف، خلوص اور کوشش سے حصہ ملتا ہے۔

ان چہروں کو احادیث کی زبان میں "بطون قرآن" کہتے ہیں۔ چونکہ ہر شخص ان کی تجلی نہیں دیکھ پاتا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر آنکھ انہیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی لہٰذا تفسیر آنکھوں کو توانائی دیتی ہے اور پردوں کو ہٹاتی ہے اور ہمارے اندر دیکھنے کی اہلیت پیدا کرتی ہے ــــــ جتنا کہ ہمارے لئے ممکن ہے۔

قرآن کے کئی چہرے ایسے ہیں جن سے زمانہ گزرنے اور انسانی لیاقت و استعداد میں اضافے اور بالیدگی سے پردہ اٹھتا ہے مکتب علی کے ہونہار شاگرد ابن عباس اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں،

القرآن یفسرہ الزمان

زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ایک مشہور حدیث کے مطابق:

القرآن یفسر بعضہ بعضاً

قرآن خود اپنی تفسیر بیان کرتا ہے اور اس کی آیات ایک دوسرے کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

قرآن کا نور اور کلام مبین ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ ایک اکیلا ہے اس طرح کہ دوسرے سے پیوستہ بھی ہے اور

ایک ایسا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا اور یہ سارے کا سارا نور اور کلام مبین ہے اگرچہ اس کی بعض آیات کچھ دیگر آیات کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

یہ کوشش کب شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچی

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی تفسیر اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ کے زمانے سے اور آنحضرتؐ کے پاکیزہ دل پر اس کی اولین آیات کے نازل ہونے سے شروع ہوئی اور پھر اس علم کے بزرگ اور عظیم لوگ اپنی سندوں کا سلسلہ پیغمبرؐ کے شہر علم کے در تک لے جاتے ہیں۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو مختلف زبانوں میں اور مختلف طرز و طریقہ کی ہیں۔ بعض ادبی ہیں اور بعض فلسفی، کچھ کی نوعیت اخلاقی ہے اور کچھ احادیث کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔ بعض تاریخ کے حوالے سے رقم کی گئی اور بعض علوم جدیدہ کی اساس پر لکھی گئی ہیں۔ اس طرح ہر کسی نے قرآن کو ان علوم کے زاویے سے دیکھا ہے جن میں وہ خود تخصص رکھتا ہے۔ پھولوں سے لدے ہوئے اس باغ سے کسی نے دل انگیز اور شاعرانہ مناظر حاصل کیے، کسی نے علوم طبیعی کے استاد کی طرح برگ و گل، پھول، شاخوں اور جڑوں کے اصول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، کسی نے غذائی مواد سے استفادہ کیا ہے اور کسی نے دواؤں کے خواص سے، کسی نے اسرار آفرینش سے یہ سب شگوفے اور رنگا رنگ گل چنے ہیں اور کوئی اس فکر میں ہے کہ کون سے گل سے بہترین عطر کشید کرے اسی طرح کوئی ایسا بھی ہے جس نے فقط شہد کی مکھی کی طرح شہد گل چوسنے اور ان سے انگبیں حاصل کرنے کی جستجو کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ راہ تفسیر کے راہیوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک مخصوص آئینہ تھا جس سے انہوں نے قرآن کی ان دیکھی اور اسرار کو منعکس کیا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب چیزیں باوجودیکہ قرآن کی تفسیریں ہیں ان میں سے کوئی بھی قرآن کی تفسیر نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے ایک رخ سے پردہ ہٹاتی ہے نہ کہ تمام چہروں سے اور اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو پھر بھی وہ قرآن کے چند چہروں کی نقاب کشائی ہوگی نہ کہ تمام چہروں کی۔

قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے لامتناہی علم کی تراوش ہے اور اس کا کلام اس کے علم کا رنگ اور اس کا علم اس کی ذات کا رنگ رکھتا ہے اور وہ سب لامتناہی ہیں۔ اس بنا پر یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ نوع انسانی قرآن کے تمام چہروں کو دیکھ لے۔ کیونکہ دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری فکر و نظر کا ظرف جس قدر وسیع ہوگا اتنا ہی زیادہ ہم اس بحر بیکراں کو اپنے اندر سما سکیں گے۔

اس لئے تمام علماء اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ کسی زمانے میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جائیں۔ قرآن مجید کے زیادہ سے زیادہ حقائق کے انکشاف کے لئے اپنی پے در پے مخلصانہ سعی و کوشش جاری و ساری رکھیں۔ قدماء اور گذشتہ علماء (خداوند عالم کی رحمتیں ان کی ارواح پاک پر ہوتی رہیں) کے ارشادات سے فائدہ اٹھائیں لیکن انہی پر قناعت نہ کریں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لا تفنی عجائبہ ولا تبلی غرائبہ

قرآن کی خوبیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی اور اس کی عجیب و غریب نئی باتیں کبھی پرانی نہ ہوں گی۔

ایک خطرناک غلطی

تفسیر قرآن کے سلسلے میں یہ روش بہت زیادہ خطرناک ہے کہ انسان مکتب قرآن میں شاگردی اختیار کرنے کی بجائے اس عظیم آسمانی کتاب کے مقابلے میں استاد بن بیٹھے یعنی قرآن سے استفادہ کرنے کی بجائے اس پر اپنے افکار کا بوجھ ڈال دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے اصول، تخصیص علمی، خصوص مذہب اور اپنی ذاتی رائے کو قرآن کے نام پر اور قرآن کی صورت میں پیش کرنے لگے اور یوں قرآن ہمارا امام، پیشوا، رہبر، قاضی اور فیصلہ کرنے والا نہ رہے بلکہ الٹا وہ ہمارے اپنے نظریات کی مسند نشینی اور ہمارے اپنے افکار و نظریات کی جلوہ نمائی کا ذریعہ بن جائے۔

قرآن کی تفسیر کا یہ طریقہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں قرآن کے ذریعے اپنے افکار کی تفسیر کا یہ ڈھنگ اگرچہ ایک گروہ میں رائج ہے جو کچھ بھی ہے خطرناک ہے اور ایک دردناک مصیبت ہے جس کا نتیجہ راہ حق کی طرف ہدایت کے حصول کی بجائے صراط مستقیم سے دوری اور غلطیوں اور شبہات کو پختہ کرنے والی بات ہے۔

قرآن سے اس طرح فائدہ اٹھانا تفسیر نہیں بلکہ تحمیل ہے۔ اس سے فیصلہ لینا نہیں بلکہ اس کے اوپر حکم چلانا ہے۔ یہ ہدایت نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے۔ اس طرح تو ہر چیز دگرگوں ہو جاتی ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ اس تفسیر میں ہم انشاء اللہ یہ روش اختیار نہ کریں اور واقعاً قرآن کے سامنے دل و جان سے زانوئے تلمذ تہ کریں اور بس۔

تقاضے اور احتیاج

ہر زمانے کی کچھ خصوصیات، ضرورتیں اور تقاضے ہوتے ہیں جو زمانے کی بدلتی ہوئی کیفیت، تازہ مسائل اور منصۂ شہود پر آنے والے نئے معانی و مفاہیم سے ابھرتے ہیں۔ اسی طرح ہر دور کی کچھ اپنی مشکلات اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور یہ سب معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی تبدیلیوں کا لازمہ ہوتا ہے۔

کامیاب افراد اور جماعتیں وہ ہیں جو ان ضروریات اور تقاضوں کو سمجھ سکیں جنہیں "عصری مسائل" کہا جا سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو ان مسائل کے ادراک سے عاری ہیں یا ادراک تو رکھتے ہیں لیکن وہ خود کسی گذشتہ ماحول اور زمانے کی پیداوار ہیں جس میں یہ مسائل نہ تھے اس لئے وہ سرد مہری اور لاپرواہی سے ان مسائل کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو بے کار کاغذوں کی طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پے در پے شکستوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

ایسے افراد ہمیشہ زمانے کی وضع و کیفیت کا شکوہ کرتے رہتے ہیں، زمین و آسمان کو برا کہتے ہیں اور گزرے ہوئے سنہرے اور خواب و خیال کے زمانے کی یاد میں غمزدہ، افسردہ اور پر حسرت رہتے ہیں۔ ایسے لوگ روز بروز زیادہ بدظن، بدبیں اور مایوس

ہوتے رہتے ہیں اور آخر کار معاشرے سے دوری اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ زمانے کے تقاضوں اور مشکلات کو سمجھ نہیں پاتے یا وہ ایسا چاہتے ہی نہیں۔ ایسے لوگ ایک تاریکی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور چونکہ حوادث کے علل و اسباب اور ان کے نتائج کی تشخیص نہیں کر پاتے اس لئے ان کے مقابلے میں گھبرائے ہوئے، وحشت زدہ، بے دماغ اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے رہتے ہیں ایسے لوگ چونکہ تاریکی میں سرگرداں ہوتے ہیں اس لئے ہر قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور کیا خوب کہا ہے، پیشوائے:

جو شخص اپنے زمانے کے حالات و کوائف سے آگاہ ہے وہ اشتباہات اور غلطیوں سے بچا رہتا ہے[1]

ہر زمانے کے علماء اور دانشوروں کے لئے یہ پیغام ہے کہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ پوری چابکدستی سے ان مسائل، تقاضوں، احتیاجات اور روحانی کمزوری اور اجتماعی خالی نقاط کا ادراک کریں اور انہیں صحیح شکل و صورت میں پُر کریں تاکہ وہ دوسرے امور سے پُر نہ ہو جائیں کیونکہ ہماری زندگی کے معیار و ماحول میں خلاء ممکن نہیں ہے۔

مایوس اور منفی فکر حضرات کے گمان کے برخلاف جن مسائل کو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق واضح طور پر معلوم کیا ہے اور دیکھا ہے ان میں سے ایک نسل نو کی مفاہیم اسلام اور مسائل دینی جاننے کی پیاس ہے، بلکہ یہ پیاس فقط سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں پہنچے چھونے اور آخر کار ان پر عمل کرنے کی ہے۔

ان مسائل نے نسل نو کی روح اور وجود کو بے قرار کر رکھا ہے لیکن یہ فطری امر ہے کہ یہ سب استفہام کی صورت میں ہے۔ ان خواہشات اور تقاضوں کا جواب دینے کے لئے پہلا قدم میراث علمی اور اسلامی تہذیب و تمدن کو عصر حاضر کی زبان میں ڈھالنا اور علمی مفاہیم کو موجودہ دور کی زبان میں موجودہ نسل کی روح، جان اور عقل میں منتقل کرنا ہے اور دوسرا قدم یہ ہے کہ اس زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کو اسلام کے اصولوں سے استنباط کر کے پورا کیا جائے۔

یہ تفسیر انہی دو اہداف و مقاصد کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

کس تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے

یہ ایسا سوال ہے جو بارہا مختلف طبقوں خصوصاً نوجوان طبقے کی طرف سے ہمیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ ہیں جو خلوص سے مل ہوئی پیاس کے ساتھ قرآن کے صاف و شفاف چشمے کے جویا ہیں اور اس محفوظ آسمانی وحی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے سوال میں یہ جملہ پوشیدہ ہے کہ ہمیں ایسی تفسیر چاہیئے جو تقلید کے حوالے سے نہیں بلکہ تحقیق کے حوالے سے ہمیں حقائق قرآن سے روشناس کرا سکے اور دور حاضر میں ہماری ضرورتوں، دکھوں اور مشکلوں میں راہنمائی کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے لوگوں کے لئے مفید بھی ہو اور جس میں پیچیدہ علمی اصطلاحات اس کی صاف و شفاف راہوں اور شاہراہوں میں ناہمواریاں

---

[1] امام صادق علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث میں یہ مضمون یوں منقول ہے:

العالم بزمانہ لا تھجم علیہ اللوابس

پیدا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ فارسی زبان میں آج ہمارے پاس کئی ایک تفاسیر موجود ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ وہ تفاسیر ہیں جو ہمارے قدماء بزرگوں کی میراث ہیں یا بعد میں عصر حاضر کے علماء نے انہیں تحریر کیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جو چند صدیاں پہلے لکھی گئی تھیں اور ان کی مخصوص نثر علماء و ادباء سے مخصوص ہے۔

موجود تفاسیر میں بعض اس سطح پر ہیں کہ صرف خواص کے طبقے کا حصہ ہیں اور دیگر طبقات ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اور بعض قرآن کے خاص گوشوں کو بیان کرتی ہیں۔ ان کی مثال ایک گلدستہ کی سی ہے جسے کسی تر و تازہ باغ سے چنا گیا ہو جس میں باغ کی نشانیاں تو ہیں لیکن باغ نہیں ہے۔

اس طرح اس بار بار کے سوال کا کوئی ایسا جواب نہ مل سکا یا بہت کم ملا کہ جو قانع ہو، دلوں کو مطمئن کرے اور پیاسے متلاشی کی تشنگی روح کو سیراب کر سکے۔

اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کا جواب عمل سے دینا چاہیئے کیونکہ اس وقت اس کا صرف زبانی جواب ممکن نہیں ہے لیکن مشکلات اور روزافزوں مسائل کے ہوتے ہوئے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک ایسا بیکراں سمندر ہے جس میں آسانی سے اور ساز و سامان، تیاری، توفیق الٰہی اور کافی غور و فکر کے بغیر داخل نہیں ہوا جا سکتا اور یہ وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس میں بہت سے لوگ غرق ہوئے اور ڈوب چکے ہیں۔ حیرت و تذبذب کے عالم میں اس دریا کے کنارے کھڑا ہی اس کی امواج خروشاں کا نظارہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک بجلی سی ذہن میں کوند گئی۔ امید کا در پھر کھلا اور مسئلے کی راہ حل سجھائی دینے لگی اور وہ تھی گروپ سسٹم میں کام کرنے کی صورت اور پھر دوست فاضل، مخلص، محقق، آگاہ اور باخبر نوجوان جو "عشرہ کاملہ" کے مصداق میرے رفیق راہ بن گئے۔ ان عزیزوں اور ان کی کوششوں سے تفسیر کا منصوبہ عمدہ صورت میں پورا ثمر آور ہو گیا اور توقع سے بھی جلدی اس کی پہلی جلد چھپ گئی (البتہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس جلد میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ چونکہ یہ پہلی جلد ہے اس لئے اختصار کے پیش نظر لکھی گئی ہے لیکن انشاء اللہ آئندہ جلدوں میں اس کی تلافی کر دی جائے گی)[1]

اس بنا پر کہ کوئی نکتہ عزیز قارئین کے لئے مبہم نہ رہنے پائے ہم اپنے طریقۂ کار کی بھی اجمالاً تشریح کئے دیتے ہیں۔ پہلے آیات قرآنی مختلف حصوں میں ان محترم علماء میں تقسیم کر دی جاتی تھیں (ابتداء میں وہ دو دو افراد کے پانچ گروپ تھے)۔ ضروری ہدایات و رہنمائی کی روشنی میں وہ ان مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرتے جو اس تفسیر کا منبع اور اصل کتب ہیں جنہیں اس فن کے عظیم محققین نے سپرد قلم کیا ہے۔ چاہے وہ محققین سنی ہوں یا شیعہ سب کا مطالعہ کیا جاتا۔ ہمارے زیر نظر

---

[1] یہ جلد جو اردو کے قارئین کے ہاتھوں میں ہے اس پہلی چھپی ہوئی جلد کا ترجمہ نہیں جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں آیا ہے بلکہ نظر ثانی شدہ جلد ہے جو ابھی فارسی میں بھی طبع نہیں ہو سکی تھی کہ اس سے پہلے اردو کے قالب میں پیش کر دی گئی تھی۔ زیر نظر مقدمہ پہلے شائع کی گئی جلد سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

رہنے والی تفاسیر میں سے بعض یہ ہیں:

تفسیر مجمع البیان تالیف شیخ المفسرین محقق عالی قدر جناب طبرسی

تفسیر انوار التنزیل تالیف قاضی بیضاوی

تفسیر الدر المنثور تالیف جلال الدین سیوطی

تفسیر برہان تالیف محدث بحرانی

تفسیر المیزان تالیف استاد علامہ طباطبائی

تفسیر المنار از محمد عبدہ مصری

تفسیر فی ظلال تالیف مصنف معروف سید قطب

اور تفسیر مراغی تالیف احمد مصطفیٰ مراغی

اس کے بعد وہ معلومات اور ماحصل جو موجودہ زمانے کے احتیاجات اور تقاضوں پر منطبق ہوتے انہیں رشتہ تحریر میں لایا جاتا۔ بعد ازاں اس گروپ کی اجتماعی نشستیں ہفتے کے مختلف دنوں میں منعقد ہوتیں اور یہ تحریریں پڑھی جاتیں اور ان کی اصلاحات کی جاتی۔ ان نشستوں میں ہی قرآن کے بارے میں جن نئی معلومات کا اضافہ ضروری ہوتا وہ کیا جاتا۔ پھر اصلاح شدہ تحریروں کو صاف کر کے لکھا جاتا۔ صاف کر کے لکھنے کے دوران حسب ضرورت تبدیلیاں کی جاتیں ان میں سے چند منتخب علماء کو جو پہلے پڑھتے اور انہیں منضبط کرتے۔ آخری شکل دینے کے لئے آخر میں میں خود پہلے سے آخر تک اس کا مطالعہ کرتا اور بعض اوقات اسی حالت میں محسوس ہوتا کہ اس میں چند پہلوؤں کا مزید اضافہ کیا جانا چاہیئے اور پھر یہ کام انجام دیا جاتا۔ ضمنی طور پر آیات کا رواں ترجمہ بھی ساتھ ہی اسی موقع پر کر دیا جاتا تھا۔

تمام مطالب (آیات کے ذیلی ترجمہ اور بعض پہلوؤں کے علاوہ جن کا یہ حقیر اضافہ کرتا) چونکہ ان محترم حضرات کے قلم سے ہوتے تھے اور فطری طور پر مختلف ہوتے تھے اس لئے میں ان تحریروں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے بھی ضروری کاوش انجام دیتا تھا اور ان تمام زحمات و مشقات کا ثمر یہ کتاب ہے جو عزیز قاری کی نظر سے گزر رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ تمام لوگوں کے لئے عمدہ، مفید اور سود مند ثابت ہو گی۔

اس تفسیر کی خصوصیات

اس بناء پر کہ عزیز و محترم قارئین زیادہ بینش و آگہی کے ساتھ اس تفسیر کا مطالعہ کر سکیں اس تفسیر کے مطالب کا ذکر یہاں ضروری ہے شاید ان میں سے کچھ ان کے گمشدہ مطالب ہوں:

(۱) قرآن چونکہ کتاب زندگی ہے۔ اس لئے آیات کی ادبی و عرفانی وغیرہ تفسیر کے زندگی کے مادی، معنوی، تعمیر کرنے والے، اصلاح کنندہ، زندگی سنوارنے والے اور بالخصوص اجتماعی مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اور زیادہ تر انہی مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جو فرد اور معاشرے کی زندگی سے نزدیک کا تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) آیات میں بیان کیے گئے عنوانات کو ہر آیت کے ذیل میں یکجا کیا اور مستقل بحث کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سود، طلاق، عورتوں کے حقوق، حج کا فلسفہ، قمار بازی کی حرمت کے اسرار، شراب، سور کا گوشت، جہاد اسلامی کے ارکان و اہداف وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے تاکہ قارئین اس ایک اجمالی مطالعے کے لئے دوسری کتب کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز ہو جائیں۔

(۳) کوشش کی گئی ہے کہ آیاتِ ذیل میں ترجمہ رواں، سلیس منہ بولتا لیکن گہرا اور اپنی نوسا کے لحاظ سے پرکشش اور قابلِ فہم ہو۔

(۴) لاحاصل ادبی بحثوں میں پڑنے کی بجائے خصوصی توجہ اصلی لغوی معانی اور آیات کے شانِ نزول کی طرف دی گئی ہے کیونکہ قرآن کے دقیق معانی سمجھنے کے لیے یہ دونوں چیزیں زیادہ موثر ہیں۔

(۵) مختلف اشکالات، اعتراضات اور سوالات جو بعض اوقات اسلام کے اصول و فروع کے بارے میں کیے جاتے ہیں ہر آیت کی مناسبت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا جچا تلا اور مختصر سا جواب دے دیا گیا ہے۔ مثلاً شبہ اکل و ماکول (وہ جانور جو دوسرے جانوروں کو کھا جاتے ہیں)، معراج، تعدادِ ازواج، عورت اور مرد کی میراث کا فرق، عورت اور مرد کے خون بہا میں اختلاف، قرآن کے حروفِ مقطعات، احکام کی منسوخی، اسلامی جنگیں اور غزوات، مختلف الٰہی آزمائشیں اور ایسے ہی بیسیوں سوالوں کے جوابات اس طرح دیئے گئے ہیں کہ آیات کا مطالعہ کرتے وقت محترم قاری کے ذہن میں کوئی استفہامی علامت باقی نہ رہے۔

(۶) ایسی پیچیدہ علمی اصطلاحات جن کے نتیجے میں کتاب ایک خاص صنف سے مخصوص ہو جاتی ہے سے دوری اختیار کی گئی ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت علمی اصطلاح کا ذکر کرنے کے بعد اس کی واضح تفسیر و تشریح کر دی گئی ہے۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس راہ میں ہماری مخلصانہ کوشش نتیجہ بخش ثابت ہوں گی اور تمام طبقوں کے لوگ اس تفسیر کے ذریعہ اس عظیم آسمانی کتاب سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں گے جس کا نام بعض دوستوں کی تجویز پر تفسیر نمونہ رکھا گیا ہے۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ، قم
تیر ماہ ۱۳۵۲ بمطابق جمادی الثانی ۱۳۹۳


بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر نمونہ جلد ۱

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورۂ حمد ۲۔ سورۂ بقرہ

سورۂ حمد : مکی سورت ہے اور اس کی سات آیات ہیں

سورۂ بقرہ : مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۸۶ آیات ہیں

پارہ ۱ــــ ۱ تا ۱۴۱

پارہ ۲ــــ ۱۴۲ تا ۲۵۲

پارہ ۳ــــ ۲۵۳ تا ۲۸۶

سُورَۃ حَمْد

سُورۂ حمد کی خصوصیات

یہ سورت قرآن مجید کی دیگر سورتوں کی نسبت بہت سی خصوصیات کی حامل ہے: ان امتیازات کا سرچشمہ مندرجہ ذیل خوبیاں ہیں:

(۱) لب و لہجہ اور اسلوب بیان: یہ سورت دیگر سورتوں سے اس لحاظ سے واضح امتیاز رکھتی ہے کہ وہ خدا کی گفتگو کے عنوان کی حامل ہیں اور یہ بندوں کی زبان کے طور پر نازل ہوئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس میں خداوند عالم نے بندوں کو خدا سے گفتگو اور مناجات کا طریقہ سکھایا ہے۔

سورۃ کی ابتداء خداوند عالم کی حمد و ثناء سے کی گئی ہے۔ خدا شناسی اور قیامت پر ایمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بندوں کے تقاضوں، حاجات اور ضروریات پر کلام کو ختم کیا گیا ہے۔

بیدار مغز اور ذی فہم انسان جب اس سورہ کو پڑھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر عالم بالا کی طرف محو پرواز ہے اور عالم روحانیت و معنویت میں لمحہ بہ لمحہ خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔

یہ نکتہ بڑا جاذب نظر ہے کہ خود ساختہ یا تحریف شدہ مذاہب جو خالق و مخلوق کے درمیان معاملہ میں واسطہ کے قائل ہیں ان کے برخلاف اسلام انسانوں کو یہ دستور دیتا ہے کہ وہ کسی بھی واسطہ کے بغیر خدا سے اپنا رابطہ برقرار رکھیں۔

خدا و انسان اور خالق و مخلوق کے درمیان اس نزدیکی اور بے واسطہ تعلق کے سلسلے میں یہ سورۃ آئینہ کا کام دیتی ہے۔ یہاں انسان صرف خدا کو دیکھتا ہے۔ اسی سے گفتگو کرتا ہے اور فقط اس کا پیغام اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مرسل یا ملک مقرب بھی درمیان میں واسطہ نہیں بنتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی پیوند و ربط جو براہ راست خالق و مخلوق کے درمیان ہے۔ قرآن مجید کا آغاز ہے۔

(۲) اساس قرآن: نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق سورۂ حمد اُم الکتاب ہے۔ ایک مرتبہ جابر بن عبداللہ انصاری آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

الا اعلمك افضل سورة انزلها الله فی کتابه قال فقال له جابر بلی بابی انت وامی یارسول الله علمنیها فعلمه الحمد ام الکتاب .....

کیا تمہیں سب سے فضیلت والی سورت کی تعلیم دوں جو خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہے؟ جابر نے عرض کیا جی ہاں میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس کی تعلیم دیجیے۔ آنحضرت نے سورہ حمد جو ام الکتاب ہے انہیں تعلیم فرمائی اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سورہ حمد موت کے علاوہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔[1]

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہ ما انزل اللہ فی التوراۃ ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثلہا ھی ام الکتاب۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے خداوند عالم نے تورات، انجیل، زبور یہاں تک کہ قرآن میں بھی ایسی کوئی سورۃ نازل نہیں فرمائی اور یہ ام الکتاب ہے۔[2]

اس سورت میں غور و فکر کرنے سے اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ سورۃ پورے قرآن کے مضامین کی فہرست ہے۔ اس کا ایک حصہ توحید اور صفات خداوندی سے متعلق ہے دوسرا حصہ قیامت و معاد سے گفتگو کرتا ہے اور تیسرا حصہ ہدایت و گمراہی کو بیان کرتا ہے جو مومنین و کفار میں حد فاصل ہے۔

اس سورہ میں پروردگار عالم کی حاکمیت مطلقہ اور مقام ربوبیت کا بیان ہے نیز اس کی لا متناہی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جن کے دو حصے ہیں ایک عمومی اور دوسرا خصوصی (رحمانیت اور رحیمیت)۔ اس میں عبادت و بندگی کی طرف بھی اشارہ ہے جو اسی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے حقیقت یہ ہے کہ اس سورۃ میں توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال اور توحید عبادت سب کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورۃ ایمان کے تینوں مراحل کا احاطہ کرتی ہے:

۱۔ دل سے اعتقاد رکھنا۔

۲۔ زبان سے اقرار کرنا۔

۳۔ اعضاء و جوارح سے عمل کرنا۔

ہم جانتے ہیں کہ ام کا مطلب ہے بنیاد اور جڑ۔ شاید اسی بنا پر عالم اسلام کے مشہور مفسر ابن عباس کہتے ہیں:

ان لکل شیء اساسا و اساس القرآن الفاتحہ۔

ہر چیز کی کوئی اساس و بنیاد ہوتی ہے اور قرآن کی اساس سورۃ فاتحہ ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ نور الثقلین آغاز سورہ حمد

[2] ، ، ، ، ،

انہی وجوہ کی بنا پر اس سورۃ کی فضیلت کے سلسلے میں رسول اللہ سے منقول ہے:

ایما مسلم قرء فاتحۃ الکتاب اعطی من الاجر کانما قرء ثلثی القرآن و اعطی من الاجر کانما تصدق علی کل مومن و مومنۃ۔

جو مسلمان سورہ حمد پڑھے اس کا اجر و ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے دو تہائی قرآن کی تلاوت کی ہو (ایک اور حدیث میں پورے قرآن کی تلاوت کے برابر ثواب مذکور ہے) اور اسے اتنا ثواب ملے گا گویا اس نے ہر مومن اور مومنہ کو ہدیہ پیش کیا ہو۔[1]

سورہ فاتحہ کے ثواب کو دو تہائی قرآن کے تلاوت کے برابر قرار دینے کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن کے ایک حصے کا تعلق خدا سے ہے، دوسرے کا قیامت سے اور تیسرے کا احکام و قوانین شرعی سے ان میں سے پہلا اور دوسرا حصہ سورہ حمد میں مذکور ہے۔ دوسری حدیث میں پورے قرآن کے برابر فرمایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا خلاصہ ایمان اور عمل ہے اور یہ دونوں چیزیں سورہ حمد میں جمع ہیں۔

۳۔ **پیغمبر اکرمؐ کے لئے اعزاز:** یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنی آیات میں سورہ حمد کا تعارف آنحضرتؐ کے لئے ایک عظیم انعام کے طور پر کرایا گیا ہے اور اسے پورے قرآن کے مقابلے میں پیش فرمایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔

ہم نے آپ کو سات آیتوں پر مشتمل سورہ حمد عطا کیا جو دو مرتبہ نازل کیا گیا اور قرآن عظیم بھی عنایت فرمایا گیا (حجر آیہ ۸۷)

قرآن مجید اپنی تمام تر عظمت کے باوجود یہاں سورہ حمد کے برابر قرار پایا۔ اس سورۃ کا دو مرتبہ نزول بھی اس کی بہت زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔[2]

اسی مضمون کی ایک روایت رسول اللہ سے حضرت امیر المومنینؑ نے بیان فرمائی ہے:

ان اللہ تعالٰی افرد الامتنان علی بفاتحۃ الکتاب وجعلہا بازاء القرآن العظیم وان فاتحۃ الکتاب اشرف ما فی کنوز العرش۔

خداوند عالم نے مجھے سورہ حمد دے کر خصوصی احسان جتایا ہے اور اسے قرآن کے مقابل قرار دیا ہے عرش کے خزانوں میں سے اشرف ترین سورہ حمد ہے۔

---

[1] مجمع البیان آغاز سورہ حمد

[2] "سبعا من المثانی" قرار دینے کی وجہ اور سورہ حمد کی کچھ مزید خوبیاں اسی تفسیر (نمونہ) میں سورۂ حجر کی آیت ۸۷ کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

(۴) تلاوت کی تاکید: سورۂ حمد کی فضیلتوں کے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احادیث اسلامی میں جو شیعہ و سنی کتب میں موجود ہیں۔ اس سورہ کی تلاوت کے متعلق اتنی تاکید کیوں کی گئی ہے۔۔ اس کی تلاوت انسان کو روح ایمان بخشتی ہے اور اسے خدا کے نزدیک کرتی ہے۔ اس سے دل کو جلا ملتی ہے اور روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسانی ارادے کو کامیابی میسر آتی ہے۔ اس سورہ کی تلاوت سے خالق و مخلوق کے مابین انسانی جستجو فزوں تر ہو جاتی ہے۔ نیز انسان اور گناہ و انحراف کے درمیان رکاوٹ بنتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

ان ابلیس ارن اربع رنات اولهن یوم لعن وحین اهبط الی الارض وحین بعث محمد علی حین فترة من الرسل وحین انزلت ام الکتاب۔

شیطان نے چار دفعہ نالہ و فریاد کیا۔ پہلا وہ موقع تھا جب اسے راندۂ درگاہ کیا گیا۔ دوسرا وہ وقت تھا جب اسے بہشت سے زمین کی طرف اتارا گیا۔ تیسرا وہ لمحہ تھا جب حضرت محمدؐ کو مبعوث برسالت کیا گیا اور آخری وہ مقام تھا جب سورۂ حمد کو نازل کیا گیا۔[1]

سورۂ حمد کے موضوعات

اس سورہ کی سات آیات میں سے ہر ایک ایک اہم مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے:

'بسم اللّٰہ' ہر کام کی ابتداء کا سرنامہ ہے اور ہر کام کے شروع کرتے وقت ہمیں خدا کی ذات پاک سے مدد طلب کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

'الحمد للّٰہ رب العالمین' یہ اس بات کا درس ہے کہ تمام نعمتوں کی بازگشت اور تمام موجودات کی پرورش و تربیت کا تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے۔ یہ امر اس حقیقت سے مربوط ہے کہ تمام عنایات کا سرچشمہ اسی کی ذات پاک ہے۔

'الرحمٰن الرحیم' یہ اس بات کا تکرار ہے کہ خدا کی خلقت، تربیت اور حاکمیت کی بنیاد رحمت و عطوفت پر ہے اور دنیا کا نظام تربیت اسی قانون پر قائم ہے۔

'مالک یوم الدین' یہ آیت معاد، اعمال کی جزا و سزا اور اس عظیم عدالت میں خداوند عالم کی حاکمیت کی جانب توجہ دلاتی ہے۔

'ایاک نعبد و ایاک نستعین' یہ توحید عبادتی کا بیان ہے اور انسانوں کے لئے اس اکیلے مرکز کا تذکرہ ہے

---

[1] نور الثقلین جلد اول ص۴

جو سب کا آسرا اور سہارا ہے۔

'اھدنا الصراط المستقیم' یہ آیت بندوں کی احتیاج ہدایت اور اشتیاق ہدایت کو بیان کرتی ہے۔ یہ آیت اس طرف بھی توجہ دلاتی ہے کہ ہر قسم کی ہدایت اسی کی طرف سے ہے۔

سورۃ کی آخری آیت اس بات کی واضح اور روشن نشانی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد ان لوگوں کی راہ ہے جو نعمات الٰہیہ سے نوازے گئے ہیں اور یہ راستہ مغضوب اور گمراہوں کے راستے سے جدا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک حصہ خدا کی حمد و ثنا ہے اور دوسرا بندے کی ضروریات و حاجات۔

'عیون اخبار الرضا' میں سرکار رسالت سے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ میں نے سورہ حمد کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ لہذا میرا بندہ حق رکھتا ہے کہ وہ جو چاہے مجھ سے مانگے۔ جب بندہ کہتا ہے 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' تو خدائے بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے میرے بندے نے میرے نام سے ابتدا کی ہے مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کے کاموں کو آخر تک پہنچا دوں اور اسے ہر حالت میں برکت عطا کروں۔ جب وہ کہتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین' تو خداوند تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد و ثنا کی ہے۔ اس نے سمجھا ہے کہ جو نعمتیں اس کے پاس ہیں وہ میری عطا کردہ ہیں لہذا میں مصائب کو اس سے دور کیے دیتا ہوں۔ گواہ رہو کہ میں دنیا کی نعمتوں کے علاوہ اسے دار آخرت میں بھی نعمات سے نوازوں گا اور اس جہان کے مصائب سے بھی اسے نجات عطا کروں گا۔ جیسے اس دنیا کی مصیبتوں سے اسے رہائی دی ہے جب وہ کہتا ہے 'الرحمن الرحیم' تو خداوند عالم فرماتا ہے میرا بندہ گواہی دے رہا ہے کہ میں رحمٰن و رحیم ہوں۔ گواہ رہو کہ میں اس کے حصے میں اپنی رحمت و عطیات زیادہ کیے دیتا ہوں۔ جب وہ کہتا ہے 'مالک یوم الدین' تو خدا فرماتا ہے کہ گواہ رہو جس طرح اس نے روز قیامت میری حاکمیت و مالکیت کا اعتراف کیا ہے حساب و کتاب کے دن میں اس کے حساب و کتاب کو آسان کر دوں گا۔ اس کی نیکیوں کو قبول کروں گا اور اس کی برائیوں سے درگذر کروں گا۔ جب وہ کہتا ہے 'ایاک نعبد' تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ سچ کہہ رہا ہے وہ صرف میری عبادت کرتا ہے۔ میں تمہیں گواہ قرار دیتا ہوں کہ اس خالص عبادت پر میں اسے ایسا ثواب دوں گا کہ وہ لوگ جو اس کے مخالف تھے اس پر رشک کریں گے۔ جب وہ کہتا ہے 'ایاک نستعین' تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے مجھ سے مدد چاہی ہے اور صرف مجھ سے پناہ مانگی ہے گواہ رہو اس کے کاموں میں میں اس کی مدد کروں گا۔ سختیوں اور تنگیوں میں اس کی فریاد کو پہنچوں گا اور پریشانی کے دن اس کی دستگیری کروں گا جب وہ کہتا ہے 'اھدنا الصراط المستقیم صراط ..... ولا الضالین' تو خداوند عالم فرماتا ہے میرے بندے کی یہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ وہ چاہتا ہے مجھ

سے مانگے میں اس کی دعا قبول کروں گا۔ جس چیز کی امید لگائے بیٹھا ہے وہ اسے عطا کروں گا، اور جس چیز سے خائف ہے اُس سے مامون قرار دوں گا[1]

اس سورۃ کا نام 'فاتحۃ الکتاب' کیوں ہے؟

فاتحۃ الکتاب کا معنی ہے آغاز کتاب (قرآن) کرنے والی۔ مختلف روایات جو نبی اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سورت آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔ یہیں سے دنیائے اسلام کے ایک اہم ترین مسئلے کی طرف فکر کا دریچہ کھلتا ہے اور وہ ہے جمع قرآن کے بارے میں۔ ایک گروہ میں یہ بات مشہور ہے کہ قرآن مجید نبی اکرمؐ کے زمانے میں منتشر و پراگندہ صورت میں تھا اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر یا حضرت عثمان کے زمانے میں جمع ہوا لیکن "فاتحۃ الکتاب" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اسی موجود صورت میں جمع ہو چکا تھا اور اسی سورۂ حمد سے اس کی ابتداء ہوتی تھی۔ ورنہ یہ کوئی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ تو نہیں جو یہ نام رکھا جائے اور نہ ہی اس سورۃ کے لئے فاتحۃ الکتاب نام کے انتخاب کے لئے کوئی دوسری دلیل موجود ہے بہت سے دیگر مدارک بھی ہمارے پیش نظر ہیں جو اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ قرآن مجید بصورت مجموعہ جس طرح ہمارے زمانے میں موجود ہے اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں آپ کے حکم کے مطابق جمع ہو چکا تھا۔ ان میں سے چند ایک ہم پیش کرتے ہیں:

(۱) علی بن ابراہیم نے حضرت امام صادقؑ سے روایت کیا ہے:

> رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ قرآن ریشم کے ٹکڑوں، کاغذ کے پرزوں اور ایسی دوسری چیزوں میں منتشر ہے اسے جمع کر دو۔ اس پر حضرت علیؑ مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن کو زرد رنگ کے پارچے میں جمع کیا اور پھر اس پر مہر لگا دی۔
>
> انطلق علی فجمعه فی ثوب اصفر ثم ختم علیه[2]

(۲) اہل سنت کے مشہور مؤلف حاکم نے کتاب مستدرک میں زید بن ثابت سے نقل کیا ہے:

> ہم پیغمبر کی خدمت میں قرآن کے پراگندہ ٹکڑوں کو جمع کرتے تھے اور ہر ایک کو نبی اکرمؐ کی راہنمائی کے مطابق اس کے مناسب محل و مقام پر رکھتے تھے لیکن پھر بھی یہ تحریریں متفرق تھیں چنانچہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ وہ انہیں ایک جگہ جمع کریں (اس جمع آوری کے بعد) اب آپ ہمیں اسے ضائع

---

[1] المیزان ج اول ص۳۳ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

[2] تاریخ القرآن، ابو عبداللہ زنجانی ص۲۴۔

کرنے سے ڈرلتے تھے۔

(۳) اہل تشیع کے بہت بڑے عالم سید مرتضیٰ کہتے ہیں:

قرآن رسول اللہؐ کے زمانے میں اسی حالت میں اسی موجودہ صورت میں جمع ہو چکا تھا۔[1]

(۴) طبرانی اور ابن عساکر نے شعبی سے یوں نقل کیا ہے:

انصار میں سے چھ افراد نے قرآن کو پیغمبرؐ کے زمانے میں جمع کیا تھا۔[2]

(۵) قتادہ ناقل ہیں:

میں نے انس سے سوال کیا کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں کس شخص نے قرآن جمع کیا تھا۔ اس نے کہا چار افراد نے جو سب کے سب انصار میں سے تھے۔ ابی بن کعب، معاذ، زید بن ثابت اور ابو زیدؓ۔[3]

ان کے علاوہ بھی روایات ہیں جن کا ذکر کرنا طول کا باعث ہوگا۔ بہرحال یہ احادیث جو شیعہ و سنی کتب میں موجود ہیں ان سے قطع نظر اس سورہ کے لئے فاتحۃ الکتاب نام کا انتخاب اس موضوع کے اثبات کا زندہ ثبوت ہے۔

ایک اہم سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس بات کو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ قرآن رسول اللہؐ کے زمانے میں جمع ہوا جب کہ علماء کے ایک گروہ میں مشہور ہے کہ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے بعد جمع ہوا ہے (حضرت علیؑ کے ذریعے یا دیگر اشخاص کے ذریعے)۔

جواب: جو قرآن حضرت علیؑ نے جمع کیا تھا وہ قرآن، تفسیر، شان نزول آیات وغیرہ کا مجموعہ تھا باقی رہا حضرت عثمانؓ کا معاملہ تو جو ہمارے پاس ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اختلاف قرأت کو روکنے کے لئے اسے ایک قرأت اور نقطہ گذاری کے ساتھ معین کیا کیونکہ اس وقت تک نقطے لگانا معمولات میں داخل نہیں تھا۔

رہا بعض لوگوں کا یہ اصرار کہ قرآن کسی طرح بھی رسول اللہؐ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا اور یہ اعزاز حضرت عثمان، خلیفہ اول یا خلیفہ دوم کو حاصل ہوا ہے۔ شاید اس سے زیادہ تر مقصود فضیلت سازی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر گروہ اس فضیلت کی نسبت خاص شخصیت کی طرف دیتا ہے اور اسی سے متعلق روایت پیش کرتا ہے۔ اصولی اور بنیادی طور پر یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس اہم ترین کام کو نظر انداز کر دیا ہو حالانکہ آپؐ تو چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرف بھی توجہ دیتے تھے جب کہ قرآن اسلام کا اصول اساسی ہے، تعلیم و تربیت کی عظیم کتاب ہے اور تمام اسلامی پروگراموں اور عقاید کی بنیاد ہے۔ کیا نبی اکرمؐ کے زمانے میں جمع نہ ہونے سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے یا مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو جائیں؟

---

[1] مجمع البیان، جلد اول صـ۱۵

[2] منتخب کنز العمال جلد دوم صـ۴۸

[3] صحیح بخاری جلد ۶ صـ۱۰۳

علاوہ ازیں حدیث ثقلین جسے شیعہ و سنی دونوں نے نقل کیا ہے گواہی دیتی ہے کہ قرآن کتابی صورت میں رسول اللہ کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں اور تم میں دو چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں خدا کی کتاب اور میرا خاندان۔

وہ روایات جو دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ کی زیر نگرانی صحابہ نے قرآن جمع کیا تھا ان میں صحابہ کی تعداد مختلف بیان ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر روایت نے چند ایک کی نشاندہی کی ہے اس سے کام فقط ان شخصیتوں میں منحصر نہیں ہو جاتا لہٰذا یہ پہلو باعث اختلاف نظر نہیں ہونا چاہیئے۔

۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ

۳۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ

۴۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ

۵۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ

۶۔ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ

۷۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪

ترجمہ

۱۔ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۲۔ حمد مخصوص اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔

۳۔ وہ خدا جو مہربان اور بخشنے والا ہے (جس کی رحمت عام و خاص سب پر محیط ہے)۔

۴۔ وہ خدا جو روز جزا کا مالک ہے۔

۵۔ پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

۶۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔

۷۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا ان کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کہ جو گمراہ ہو گئے۔

تفسیر

۱۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام لوگوں میں یہ رسم ہے کہ ہر اہم اور اچھے کام کا آغاز کسی بزرگ کے نام سے کرتے ہیں۔ کسی عظیم عمارت کی پہلی اینٹ

اس شخص کے نام پر رکھی جاتی ہے جس سے بہت زیادہ قلبی لگاؤ ہو یعنی اس کام کو اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام منسوب کر دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ کسی پروگرام کو دوام بخشنے اور کسی مشن کو برقرار رکھنے کے لئے ایسی ہستی سے منسوب کیا جائے جو پائیدار، ہمیشہ رہنے والی ہو اور جس کی ذات میں فنا کا گزر نہ ہو۔ اس جہان کی تمام موجودات کہنگی پذیر ہیں اور زوال کی طرف رواں دواں ہیں، صرف وہی چیز باقی رہ جائے گی، جو اس ذات لایزال سے وابستہ ہو گی۔

انبیاء و مرسلین کے نام باقی ہیں تو پروردگار عالم سے رشتہ جوڑنے اور عدالت و حقیقت پر قائم رہنے کی وجہ سے اور یہ وہ رشتہ ہے جو زوال آشنا نہیں، اگر حاتم کا نام باقی ہے تو سخاوت کے باعث جو زوال پذیر نہیں۔ تمام موجودات میں سے خدا کی ذات ہی ازلی و ابدی ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ تمام امور اس کے نام سے شروع کیا جائے۔ اس کے سائے میں تمام چیزوں کو قرار دیا جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے۔

اسی لئے قرآن کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ اپنے امور کو برائے نام خدا سے وابستہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ حقیقتاً اور واقعتاً خدا سے رشتہ جوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ربط انسان کو صحیح راستہ پر چلائے گا اور ہر قسم کی کجروی سے بازرکھے گا۔ ایسا کام یقیناً تکمیل کو پہنچے گا اور باعث برکت ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

كل امر ذي بال لم يذكر فيه اسم الله فهو ابتر۔

جو بھی اہم کام خدا کے نام کے بغیر شروع ہو گا ناکامی سے ہمکنار ہو گا۔[1]

امیرالمومنینؑ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

انسان جس کام کو انجام دینا چاہے چاہیئے کہ بسم اللہ کہے اور جو عمل خدا کے نام سے شروع ہو وہ مبارک ہے۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں:

جب کوئی کام شروع کرنے لگو، بڑا ہو یا چھوٹا بسم اللہ کہو تاکہ وہ بابرکت بھی ہو اور پُر از امن و سلامتی بھی۔

خلاصہ یہ کہ کسی عمل کی پائیداری و بقا اس کے ربط خدا سے وابستہ ہے۔ اسی مناسبت سے جب خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ پر پہلی وحی نازل فرمائی تو انہیں حکم دیا کہ تبلیغ اسلام کی عظیم ذمہ داری کو خدا کے نام سے شروع کریں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تعجب خیز اور نہایت سخت طوفان کے عالم میں حضرت نوحؑ کشتی پر سوار ہو گئے۔ پانی کی موجیں

---

[1] تفسیر البیان جلد اول ص۴۲۶ بحوالہ بحار جلد ۹ باب ۵۸۔

پہاڑوں کی طرح بلند تھیں اور ہر لمحہ بے شمار خطرات کا سامنا تھا۔ ایسے میں منزل مقصود تک پہنچنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ کشتی کے چلتے اور رکتے بسم اللہ کہو۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ط (ہود۔ آیہ ۴۱)

چنانچہ ان لوگوں نے اس پرخطر سفر کو توفیق الٰہی کے ساتھ کامیابی سے طے کر لیا اور امن و سلامتی کے ساتھ کشتی سے اترے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ

حکم ہوا اے نوح (کشتی سے) ہماری طرف سے سلامتی اور برکات کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اتر جاؤ۔ (ہود۔ آیت ۴۸)

جناب سلیمانؑ نے جب ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کا سرنامہ بسم اللہ ہی کو قرار دیا۔

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ....

یہ (مراسلہ) ہے سلیمان کی طرف سے اور بے شک یہ ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم....
(نمل۔ آیت ۳۰)

اسی بنا پر قرآن حکیم کی تمام سورتوں کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے تاکہ نوع بشر کی ہدایت و سعادت کا اصل مقصد کامیابی سے ہمکنار ہو اور بغیر کسی نقصان کے انجام پذیر ہو۔ صرف سورہ توبہ ایسی سورت ہے جس کی ابتداء میں بسم اللہ نظر نہیں آتی کیونکہ اس کا آغاز مکہ کے مجرموں اور معاہدہ شکنوں سے اعلان جنگ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لہذا ایسے موقع پر خدا کی صفات رحمان و رحیم کا ذکر مناسب نہیں۔

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ کہ ہر جگہ بسم اللہ کہا جاتا ہے بسم الخالق یا بسم الرزاق وغیرہ نہیں نہیں کہا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اللہ خدا کے تمام اسماء اور صفات کا جامع ہے۔ اس کی تفصیل عنقریب آئیگی۔ اللہ کے علاوہ دوسرے نام بعض کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً خالقیت، رحمت وغیرہ۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر کام کی ابتداء میں بسم اللہ کہنا جہاں خدا سے طلب مدد کے لئے ہے وہاں اس کے نام سے شروع کرنے کے لئے بھی ہے۔ اگرچہ ہمارے بزرگ مفسرین نے طلب مدد اور شروع کرنے کو ایک دوسرے سے جدا قرار دیا ہے اور ہر ایک نے یہاں پر کوئی ایک مفہوم مراد لیا ہے لیکن حقیقت میں ہر مفہوم کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے۔
خلاصہ یہ کہ آغاز کرنا اور مدد چاہنا ہر دو مفہوم یہاں پر لازم و ملزوم ہیں۔

بہرحال جب تمام کام خدا کی قدرت کے بھروسہ پر شروع کئے جائیں تو چونکہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے اس لئے ہم اپنے میں زیادہ قوت و طاقت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ زیادہ مطمئن ہو کر کوشش کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مشکلات کا خوف نہیں رہتا اور مایوسی پیدا نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے انسان کی نیت اور عمل زیادہ پاک اور زیادہ خالص رہتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں جتنی گفتگو کی جائے کم ہے کیونکہ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ ابتدائے شب سے صبح تک ابن عباس کے سامنے بسم اللہ کی تفسیر بیان فرماتے رہے صبح ہوئی تو آپ بسم اللہ کی "ب" سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ آنحضرتؑ ہی کے ایک ارشاد سے ہم یہاں اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ آئندہ مباحث میں اس سلسلے کے دیگر مسائل پر گفتگو ہوگی۔

عبداللہ بن یحییٰ امیرالمومنین کے محبوں میں سے تھے ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بسم اللہ کہے بغیر اس چارپائی پر بیٹھ گئے جو وہاں پڑی تھی اچانک وہ جھکے اور زمین پر آ گرے۔ اُن کا سر پھٹ گیا۔ حضرت علیؑ نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ان کا زخم مندمل ہو گیا، آپ نے فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی اکرمؐ نے خدا کی طرف سے یہ حدیث مجھ سے بیان فرمائی ہے کہ جو کام نام خدا کے بغیر شروع کیا جائے بے انجام رہتا ہے (عبداللہ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان میں یہ جانتا ہوں اور اب کے بعد پھر اسے ترک نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا پھر تو تم سعادتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔

امام صادقؑ نے اسی حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے بعض شیعہ کام کی ابتداء میں بسم اللہ ترک کر دیتے ہیں اور خدا انہیں کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ وہ بیدار ہوں اور ساتھ ساتھ یہ غلطی بھی ان کے نامۂ عمل سے دھو ڈالی جائے۔[1]

کیا بسم اللہ سورۂ حمد کا جزء ہے؟

شیعہ علماء و محققین میں اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد اور دیگر سور قرآن کا جزء ہیں۔ بسم اللہ کا متن تمام سورتوں کی ابتداء میں ثبت ہونا اصولی طور پر اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ جزو قرآن ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ متن قرآن میں کوئی اضافی چیز نہیں لکھی گئی اور بسم اللہ زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر اب تک سورتوں کی ابتداء میں موجود ہے۔ باقی رہے علمائے اہلسنت تو صاحب تفسیر المنار نے ان کے اقوال درج کئے ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

گذشتہ علمائے اہل مکہ، فقہا قاری حضرات جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں، اہل کوفہ کے قراء میں سے عاصم اور کسائی اور اہل مدینہ میں سے بعض صحابہ اور تابعین اسی طرح شافعی اپنی کتاب جدید میں اور اس کے پیروکار نیز ثوری اور احمد اپنے قول میں اس بات کے معتقد ہیں کہ بسم اللہ جزء سورہ ہے۔ اسی طرح علماء امامیہ اور ان کے قول کے مطابق صحابہ میں سے علیؑ، ابن عباس، عبداللہ بن عمر اور ابوہریرہ، علماء تابعین میں سے سعید بن جبیر، عطاء، زہری اور ابن مبارک بھی اسی نظریے

[1] سفینۃ البحار، جلد اول ص۶۶۳

کے حامل تھے۔

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ان کی اہم ترین دلیل یہ ہے کہ صحابہ اور ان کے بعد برسر کار لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ برأت کے سوا تمام سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ مذکور ہے جب کہ وہ بالاتفاق ایک دوسرے کو وصیت کرتے تھے کہ ہر اس چیز سے جو جزو قرآن نہیں قرآن کو پاک رکھا جائے اسی لئے تو آمین کو انہوں نے سورۂ فاتحہ کے آخر میں ذکر نہیں کیا۔

اس کے بعد انہوں نے مالک اور ابو حنیفہ کے پیروکاروں اور بعض دوسرے لوگوں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ کو مستقل آیت سمجھتے تھے جو سورتوں کی ابتداء کے بیان اور ان کے درمیان حد فاصل کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے اہل سنت کے معروف فقیہ اور بعض قارئین کوفہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ کو سورہ حمد کا تو جزو سمجھتے تھے لیکن باقی سورتوں کا جزو نہیں سمجھتے تھے۔[1]

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی یقینی اکثریت بھی بسم اللہ کو سورت کا جزو سمجھتی ہے۔

اب ہم بعض روایات پیش کرتے ہیں جو شیعہ وسنی طرق سے اس سلسلے میں نقل ہوئی ہیں (ہمیں اعتراف ہے کہ اس ضمن کی تمام احادیث کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں اور ان کا تعلق فقہی بحث سے ہے)۔

۱۔ معاویہ بن عمار (جو امام صادقؑ کے محب و موالی تھے) کہتے ہیں: "میں نے امامؑ سے پوچھا کہ جب میں نماز پڑھنے لگوں تو کیا الحمد کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھوں؟" آپ نے فرمایا "ہاں"۔[2]

۲۔ دار قطنی نے جو علماء اہل سنت میں سے ہیں سند صحیح کے ساتھ حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے:

ایک شخص نے آپ سے پوچھا "سبع مثانی کیا ہے؟" فرمایا: "سورہ حمد"۔ اس نے عرض کیا "سورہ حمد کی تو چھ آیتیں ہیں"۔ آپ نے فرمایا "بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی اس کی ایک آیت ہے"۔[3]

۳۔ اہل سنت کے مشہور محدث بیہقی سند صحیح کے ساتھ ابن جبیر کے طریق سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

استرق الشیطان من الناس اعظم اٰیۃ من القراٰن بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

شیطان صفت اشخاص نے قرآن کی بہت بڑی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو چرا لیا ہے (یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سورتوں کے شروع میں اسے نہیں پڑھا جاتا)۔[4]

ان سب کے علاوہ ہمیشہ مسلمانوں کی یہ سیرت رہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت بسم اللہ ہر سورت کی ابتداء

---

[1] تفسیر المنار جلد اول ص ۳۹، ص ۴۰

[2] کافی جلد ۳ ص ۳۱۲

[3] الاتقان جلد اول ص [illegible]

[4] بیہقی جلد ۲ ص ۵۰

میں پڑھتے رہے ہیں تو اتر سے ثابت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چیز جزو قرآن نہ ہو اسے پیغمبر اور مسلمان ہمیشہ قرآن کے ضمن میں پڑھتے رہے ہوں اور سدا اس عمل کو جاری رکھا ہو۔

باقی رہا بعض کا یہ احتمال کہ بسم اللہ مستقل آیت ہے جو جزو قرآن تو ہے لیکن سورتوں کا حصہ نہیں تو یہ احتمال نہایت ضعیف اور کمزور دکھائی دیتا ہے کیونکہ بسم اللہ کا مفہوم اور معنی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ ابتداء اور آغاز کے لئے ہے نہ کہ یہ ایک علیحدہ اور مستقل اہمیت کی حامل ہے۔ دراصل یہ فکر جمود اور سخت تعصب کی غماز ہے اور یوں لگتا ہے گویا اپنی بات کو برقرار رکھنے کے لئے ہر احتمال پیش کیا جا رہا ہے اور بسم اللہ جیسی آیت کو مستقل اور سابق و لاحق سے الگ ایک آیت قرار دیا جا رہا ہے جس کا مضمون پکار پکار کر اپنے سرنامہ اور بعد والی ابحاث کے لئے ابتداء ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

ایک اعتراض البتہ قابل غور ہے جسے مخالفین اس مقام پر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب قرآن کی سورتوں کی آیات شمار کرتے ہیں (سوائے سورہ حمد کے) تو بسم اللہ کو ایک آیت شمار نہیں کیا جاتا بلکہ پہلی آیت بسم اللہ سے بعد والی آیت کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں وضاحت کے ساتھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کوئی حرج نہیں کہ بسم اللہ سورۂ حمد میں تو الگ ایک آیت ہو اور دوسری سورتوں میں پہلی آیت کا جزء قرار پائے (اس طرح مثلاً سورۂ کوثر میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انا اعطیناک الکوثر سب ایک آیت شمار ہو)

بہر حال مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ کہتے ہیں:

ایک دن معاویہ نے اپنی حکومت کے زمانے میں نماز با جماعت میں بسم اللہ نہ پڑھی تو نماز کے بعد مہاجرین و انصار کے ایک گروہ نے پکار کر کہا "اسرقت ام نسیت" یعنی کیا معاویہ نے بسم اللہ کو چرا لیا ہے یا بھول گیا ہے؟[1]

خدا کے ناموں میں سے "اللہ" جامع ترین نام ہے

بسم اللہ کی ادائیگی میں ہمارا سامنا سب سے پہلے لفظ "اسم" سے ہوتا ہے۔ عربی ادب کے علماء کے بقول اس کی اصل وسمو بروزن "علو" ہے جس کے معنی ہیں ارتفاع اور بلندی۔ تمام ناموں کو اسم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ہر چیز کا مفہوم اخفاء سے ظہور و ارتفاع کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ نام ہو جانے کے بعد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ مہمل اور بے معنی کی منزل سے نکل آتا ہے اور اس طرح ارتفاع و بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

بہر حال کلمہ "اسم" کے بعد ہم کلمہ "اللہ" تک پہنچتے ہیں جو خدا کے ناموں میں سے سب سے زیادہ جامع ہے۔ خدا

---

[1] بیہقی جزء دوم ص۴۹۔ حاکم نے مستدرک جزء اول ص۲۳۳ میں اس روایت کو درج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

کے ان ناموں کو جو قرآن مجید یا دیگر مصادر اسلامی میں آئے ہیں اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کی کسی ایک صفت کو منعکس کرتے ہیں لیکن وہ نام جو تمام صفات و کمالاتِ الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرے لفظوں میں جو صفات جلال و جمال کا جامع ہے وہ صرف "اللہ" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے دوسرے نام عموماً کلمہ "اللہ" کی صفت کی حیثیت سے کہے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

غفور و رحیم: یہ صفت خدا کی صفت بخشش کی طرف اشارہ ہے:
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (بقرہ ۲۲۶)

سمیع و علیم: "سمیع" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ خدا تمام سنی جانے والی چیزوں سے آگاہی رکھتا ہے اور "علیم" اشارہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ٥ (بقرہ ۲۲۷)

بصیر: یہ لفظ بتاتا ہے کہ خدا تمام دیکھی جانے والی چیزوں سے آگاہ ہے:
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (حجرات ۱۸)

رزاق: یہ صفت اس کے تمام موجودات کو روزی دینے کے پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور "ذوالقوۃ" اس کی قدرت کو ظاہر کرتی ہے اور "متین" اس کے افعال اور پروگرام کی پختگی کا تعارف ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ٥ (ذاریات۔ ۵۸)

خالق اور باری: اس کی آفرینش اور پیدا کرنے کی صفت کی طرف اشارہ ہے اور مصور اس کی تصویر کشی کی حکایت کرتا ہے۔
هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (حشر۲۴)

ظاہر ہوا کہ "اللہ" ہی خدا کے تمام ناموں میں سے جامع ترین ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نام "اللہ" قرار پائے ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط

اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ حاکم مطلق ہے، منزہ ہے، ہر ظلم و ستم سے پاک ہے، امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، توانا ہے کسی سے شکست کھانے والا نہیں اور تمام موجودات پر قاہر و غالب اور باعظمت ہے۔ (حشر۔ ۲۳)

اس نام کی جامعیت کا ایک واضح شاہد یہ ہے کہ ایمان و توحید کا اظہار صرف "لا الہ الا اللہ" کے جملے سے ہو سکتا ہے اور جملہ "لا الہ الا العلیم .... الا الخالق .... الا الرزاق" اور دیگر اس قسم کے جملے محدود سے توحید و اسلام کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگ جب مسلمانوں کے معبود کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں

تو لفظ "اللہ" کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ خداوند عالم کی تعریف و توصیف لفظ "اللہ" سے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

خدا کی رحمت عام اور رحمت خاص

مفسرین کے ایک طبقے میں مشہور ہے کہ صفت "رحمان" رحمت عام کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو دوست و دشمن، مومن و کافر، نیک و بد غرض سب کے لئے ہے۔ کیونکہ اس کی بے حساب رحمت کی بارش سب کو پہنچتی ہے اور اس کا عمان نعمت ہر کہیں بچھا ہوا ہے۔ اس کے بندے زندگی کی گوناگوں رعنائیوں سے بہرہ ور ہیں اپنی روزی اس کے دستر خوان سے حاصل کرتے ہیں جس پر بے شمار نعمتیں رکھی ہیں۔ یہ وہی رحمت عمومی ہے جس نے عالم ہستی کا احاطہ کر رکھا ہے اور سب کے سب اس دریائے رحمت میں غوطہ زن ہیں۔

رحیم خداوند عالم کی رحمت خاص کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ رحمت ہے جو اس کے مطیع، صالح اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ انہوں نے ایمان اور عمل صالح کی بناء پر یہ شائستگی حاصل کرلی ہے کہ وہ اس رحمت و احسان خصوصی سے بہرہ مند ہوں جو گنہگاروں اور غارت گروں کے حصے میں نہیں ہے۔

ایک چیز جو ممکن ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو یہ ہے کہ لفظ "رحمان" قرآن میں ہر جگہ مطلق آیا ہے جو عمومیت کی نشانی ہے جب کہ رحیم کبھی مقید ذکر ہوا ہے مثلاً وکان بالمومنین رحیما (خدا مومنین کے لئے رحیم ہے) (احزاب ۴۳) اور کبھی مطلق ہے جیسے کہ سورہ حمد میں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا:

واللہ الٰہ کل شیئ الرحمان بجمیع خلقہ الرحیم بالمومنین خاصۃ [1]

خدا ہر چیز کا معبود ہے۔ وہ تمام مخلوقات کے لئے رحمان اور مومنین پر خصوصیت کے ساتھ رحیم ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رحمان صیغہ مبالغہ ہے جو اس کی رحمت کی عمومیت کے لئے خود ایک مستقل دلیل ہے اور رحیم صفت مشبہ ہے جو ثبات و دوام کی علامت ہے اور یہ چیز مومنین کے لئے ہی خاص ہو سکتی ہے۔

ایک اور شاہد یہ ہے کہ رحمان خدا کے مخصوص ناموں میں سے ہے اور اس کے علاوہ کسی کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جاتا جب کہ رحیم ایسی صفت ہے جو خدا اور بندوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جیسے نبی اکرمؐ کے لئے ارشاد الٰہی ہے:

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ

تمہاری تکلیف و مشقت نبی پر گراں ہے، تمہاری ہدایت اسے بہت پسند ہے اور وہ مومنین کے

---

[1] المیزان بسند کافی، توحید صدوق اور معانی الاخبار

لئے مہربان اور رحیم ہے۔ (توبہ ۱۲۸)

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

الرحمٰن اسم خاص بصفة عامة والرحيم اسم عام بصفة خاصة

رحمٰن اسم خاص ہے لیکن صفت عام ہے اور رحیم اسم عام ہے لیکن صفت خاص ہے۔[1]

یعنی رحمٰن ایسا نام ہے جو خدا کے لئے مخصوص ہے لیکن اس میں اس کی رحمت کا مفہوم سب پر محیط ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ رحیم ایک صفت عام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے البتہ اس میں (صفت خاص کے طور پر استعمال ہونے میں) کوئی مانع نہیں جو فرق بتایا گیا ہے وہ تو اصل لغت کے لحاظ سے ہے لیکن اس میں استثنائی صورت پائی جاتی ہے۔ امام حسینؑ کی ایک بہترین اور مشہور دعا جو دعائے عرفہ کے نام سے معروف ہے کے الفاظ ہیں:

یا رحمان الدنیا والاٰخرة ورحیمهما

اے وہ خدا جو دنیا و آخرت کا رحمان اور دونوں ہی کا رحیم ہے۔

اس بحث کو ہم نبی اکرمؐ کی ایک پرمعنی اور واضح حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان اللّٰه عزوجل مائة رحمة وانه انزل منها واحدة الی الارض فقسمها بین خلقه بها یتعاطفون ویتراحمون واخر تسعا وتسعین لنفسه یرحم بها عباده یوم القیامة

خداوند تعالیٰ کی رحمت کے سو باب ہیں جن میں سے اس نے ایک کو زمین پر نازل کیا ہے اور (اس) رحمت کو اپنی مخلوق میں تقسیم کیا ہے۔ لوگوں کے درمیان جو عطوفت، مہربانی اور محبت ہے وہ اسی کا پرتو ہے لیکن ننانوے حصے رحمت اس نے اپنے لئے مخصوص رکھی ہے اور قیامت کے دن اپنے بندوں کو اس سے نوازے گا۔[2]

خدا کی دیگر صفات بسم اللہ میں کیوں مذکور نہیں؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی تمام سورتیں (سوائے سورۂ برات کے جس کی وجہ بیان ہو چکی ہے) بسم اللہ سے شروع ہوتی ہیں اور بسم اللہ میں مخصوص نام "اللہ" کے بعد صرف صفت رحمانیت و رحیمیت کا ذکر ہے اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر باقی صفات کا ذکر کیوں نہیں۔

اگر ہم ایک نکتے کی طرف توجہ کریں تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر کام کی ابتدا میں ضروری ہے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱ ص۲۱

[2] مجمع البیان، جلد ۱

کہ ایسی صفت سے مدد لی جائے جس کے آثار تمام جہان پر سایہ فگن ہوں، جو تمام موجودات کا احاطہ کئے ہو اور عالم بحران میں مصیبت زدوں کو نجات بخشنے والی ہو۔ مناسب ہے کہ اس حقیقت کو قرآن کی زبان سے سنا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ

میری رحمت تمام چیزوں پر محیط ہے۔ (اعراف ۱۵۶)

ایک اور جگہ ہے۔ حاملان عرش کی ایک دعا کو خداوند کریم نے یوں بیان فرمایا ہے:

ربنا وسعت کل شیئ رحمۃ

پروردگارا! تو نے اپنا دامن رحمت ہر چیز تک پھیلا رکھا ہے۔ (المومن ۷)

ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام نہایت سخت اور طاقت فرسا حوادث اور خطرناک دشمنوں کے چنگل سے نجات کے لئے رحمت خدا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ قوم موسیٰ فرعونیوں کے ظلم سے نجات کے لئے پکارتی ہے:

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

خدایا ہمیں (ظلم سے) نجات (دلا اور اپنی رحمت (کا سایہ) عطا فرما۔ (یونس ۸۶)

حضرت ہودؑ اور ان کے پیروکاروں کے سلسلے میں ارشاد ہے:

فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا

ہودؑ اور ان کے ہمراہیوں کو ہم نے اپنی رحمت کے وسیلے سے نجات دی۔ (اعراف ۷۲)

اصول یہ ہے کہ جب ہم خدا سے کوئی حاجت طلب کریں تو مناسب ہے کہ اسے ایسی صفات سے یاد کریں جو اس حاجت سے میل اور ربط رکھتی ہوں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ مائدہ آسمانی (مخصوص غذا) طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۔

بار الٰہا! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما اور ہمیں روزی عطا فرما اور تو بہترین روزی رساں ہے۔ (مائدہ ۱۱۴)

خدا کے عظیم پیغمبر حضرت نوحؑ بھی ہمیں یہی درس دیتے ہیں۔ وہ جب ایک مناسب جگہ کشتی سے اترنا چاہتے ہیں تو یوں دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ

پروردگارا ہمیں منزل مبارک پر اتار کہ تو بہترین اتارنے والا ہے۔ (مومنون ۲۹)

حضرت زکریاؑ خدا سے ایسے فرزند کے لئے دعا کرتے ہوئے جو ان کا جانشین و وارث ہو اس کی خیر الوارثین سے توصیف کرتے ہیں:

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

خداوندا! مجھے تنہا نہ چھوڑ تو تو بہترین وارث ہے۔ (انبیاء ۸۹)

کسی کام کو شروع کرتے وقت جب خدا کے نام سے شروع کریں تو خدا کی وسیع رحمت کے دامن سے وابستگی ضروری ہے ایسی رحمت جو عام بھی ہو اور خاص بھی۔ کاموں کی پیش رفت اور مشکلات میں کامیابی کے لئے کیا ان صفات سے بہتر کوئی اور صفت ہے؟ قابل توجہ امر یہ ہے کہ وہ توانائی جو قوت جاذبہ کی طرح عمومیت کی حامل ہے جو دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی ہے وہ یہی صفتِ رحمت ہے لہٰذا مخلوق کا اپنے خالق سے رشتہ استوار کرنے کے لئے بھی اسی صفتِ رحمت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ سچے مومن اپنے کاموں کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تمام جگہوں سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنے دل کو صرف خدا سے وابستہ کر لیتے ہیں اور اسی سے مدد و نصرت طلب کرتے ہیں، وہ خدا جس کی رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے اور کوئی موجود ایسا نہیں جو اس سے بہرہ ور نہ ہو۔

بسم اللہ سے واضح طور پر یہ درس بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کے ہر کام کی بنیاد رحمت پر ہے اور بدلہ یا سزا تو استثنائی صورت ہے جب تک قطعی عوامل پیدا نہ ہوں سزا متحقق نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم دعا میں پڑھتے ہیں:

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ خدا کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے[1]

انسان کو چاہیئے کہ وہ زندگی کے پروگرام پر یوں عمل پیرا ہو کہ ہر کام کی بنیاد رحمت و محبت کو قرار دے اور سختی و درشتی کو فقط بوقت ضرورت اختیار کرے۔ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۱۱۳ کی ابتداء رحمت سے ہوتی ہے اور فقط ایک سورہ توبہ ہے جس کا آغاز بسم اللہ کی بجائے اعلانِ جنگ اور سختی سے ہوتا ہے۔

۲۔ الحمد للہ رب العالمین

حمد و ثنا اس خدا کے لئے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک ہے۔

تفسیر

سارا جہان اس کی رحمت میں ڈوبا ہوا ہے۔

بسم اللہ جو سورت کی ابتداء ہے اس کے بعد بندوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عالم وجود کے عظیم مبداء اور اس کی غیر متناہی نعمتوں کو یاد کریں۔ وہ بے شمار نعمتیں جنہوں نے ہمارے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔ پروردگار عالم کی معرفت کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ بلکہ اس راستے کا سبب ہی یہی ہے کیونکہ کسی انسان کو جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ فوراً چاہتا ہے کہ اس نعمت کے بخشنے والے کو پہچانے اور فرمانِ فطرت کے مطابق اس کی سپاس گزاری کے لئے کھڑا ہو اور اس کے شکریے کا حق ادا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء علم کلام (عقائد) اس علم کی پہلی بحث میں جب گفتگو معرفت خدا کی علت و سبب کے

---

[1] دعائے جوشن کبیر

متعلق ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ فطری وعقلی حکم کے مطابق معرفت خدا اس لئے واجب ہے چونکہ محسن کے احسان کا شکریہ واجب ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پروردگار عالم کی معرفت کی رہنمائی اس کی نعمتوں سے حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ (مبداء) خدا کو پہچاننے کا بہترین اور جامع ترین راستہ اسرار آفرینش وخلقت کا مطالعہ کرنا ہے ان میں خاص طور پر ان نعمتوں کا وجود ہے جو نوع انسانی کی زندگی کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہیں۔ ان دو وجوہ کی بنا پر سورہ فاتحۃ الکتاب 'الحمد للہ رب العالمین' سے شروع ہوتی ہے۔ اس جملے کی گہرائی اور عظمت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ حمد، مدح اور شکر کے درمیان فرق اور ان کے نتائج کی طرف توجہ کی جائے۔

حمد: نیک اختیاری کام یا نیک صفت کی تعریف کو عربی زبان میں حمد کہتے ہیں یعنی جب کوئی سوچ سمجھ کر کوئی اچھا کام انجام دے یا کسی اچھی صفت کو انتخاب کرے جو نیک اختیاری اعمال کا سرچشمہ ہو تو اس پر کی گئی تعریف و توصیف کو حمد و ستائش کہتے ہیں۔

مدح: مدح کا معنی ہے ہر قسم کی تعریف کرنا چاہے وہ کسی اختیاری کام کے مقابلے میں ہو یا غیر اختیاری کام کے۔ مثلاً اگر ہم کسی قیمتی موتی کی تعریف کریں تو عرب اسے مدح کہیں گے۔

دوسرے لفظوں میں مدح کا مفہوم عام ہے جب کہ حمد کا مفہوم خاص ہے۔

شکر: شکر کا مفہوم حمد اور مدح دونوں سے زیادہ محدود ہے۔ شکر فقط انعام واحسان کے مقابلے میں تعریف کو کہتے ہیں انعام واحسان بھی وہ جو کسی دوسرے سے اس کی رضا اور رغبت سے ہم تک پہنچے [1]

اب اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ کریں کہ اصطلاحی مفہوم میں 'الحمد' کا الف اور لام جنس ہے اور یہاں عمومیت کا معنی دیتا ہے تو نتیجہ نکلے گا کہ ہر قسم کی حمد وثنا مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا مالک و پروردگار ہے یہاں تک کہ جو انسان بھی خیر و برکت کا سرچشمہ ہے وہ پیغمبر اور خدائی رہنما نور ہدایت سے دلوں کو منور کرتا ہے اور درس دیتا ہے، جو سخی بھی سخاوت کرتا ہے اور جو کوئی طبیب جان لیوا زخم پر مرہم پٹی لگاتا ہے ان کی تعریف کا مبدا بھی خدا کی تعریف ہے اور ان کی ثنا دراصل اسی کی ثنا ہے۔ بلکہ اگر خورشید نور افشانی کرتا ہے، بادل بارش برساتا ہے اور زمین اپنی برکتیں ہمیں دیتی ہے تو یہ سب کچھ بھی اس کی جانب سے ہے لہذا تمام تعریفوں کی بازگشت اسی ذات بابرکات کی طرف ہے۔

دوسرے لفظوں میں 'الحمد للہ رب العالمین'، توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال کی طرف اشارہ ہے (اس بات پر خصوصی غور کیجئے گا)۔

یہاں 'اللہ' کی توصیف 'رب العالمین' سے کی گئی ہے اصولی طور پر یہ مدعی کے ساتھ دلیل پیش کی گئی ہے۔ گویا کوئی سوال کر رہا ہو کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے کیوں مخصوص ہیں تو جواب دیا جا رہا ہے کہ چونکہ وہ رب العالمین ہے یعنی تمام

---

[1] البتہ ایک جہت سے شکر میں عمومیت بھی ہے کیونکہ شکر یہ زبان وعمل دونوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ حمد و مدح عموماً فقط زبان سے ہوتی ہے۔

جہانوں میں رہنے والوں کا پروردگار ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ

یعنی۔ خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کو بہترین صورت میں انجام دیا۔ (سجدہ۔ ۷)

نیز فرمایا:

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا

زمین میں چلنے والے ہر کسی کی روزی خدا کے ذمے ہے۔ (ہود۔ ۶)

کلمہ حمد سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے یہ تمام عطیات اور نیکیاں اپنے ارادہ و اختیار سے ایجاد کی ہیں اور یہ بات ان لوگوں کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا بھی سورج کی طرح ایک مجبور فیض بخش ہے یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حمد صرف ابتدائے کار میں ضروری نہیں بلکہ اختتام کار پر بھی لازم ہے جیسا کہ قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے۔

اہل بہشت کے بارے میں ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۠

پہلے تو وہ کہیں گے کہ اللہ تو ہر عیب و نقص سے منزہ ہے ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کہیں گے اور ہر بات کے خاتمے پر کہیں گے۔ الحمد للہ رب العلمین۔ (یونس۔ ۱۰)

کلمہ "رب" کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا مالک یا صاحب جو اس کی تربیت و اصلاح کرتا ہو۔ کلمہ "ربیبہ" کسی شخص کی بیوی کی اس بیٹی کو کہتے ہیں جو اس کے کسی پہلے شوہر سے ہو۔ لڑکی اگرچہ دوسرے شوہر سے ہوتی ہے لیکن منہ بولے باپ کی نگرانی میں پرورش پاتی ہے۔

لفظ "رب" مطلق اور اکیلا تو صرف خدا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اگر غیر خدا کے لئے استعمال ہو تو ضروری ہے کہ اضافت بھی ساتھ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں رب الدار (صاحب خانہ) یا رب السفینہ (کشتی والا) [1]

تفسیر مجمع البیان میں ایک اور معنی بھی ہیں، "بڑا شخص جس کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہو۔ بعید نہیں کہ دونوں معانی کی بازگشت ایک ہی اصل کی طرف ہو [2]

---

[1] قاموس اللغات، مفردات راغب، تفسیر مجمع البیان، تفسیر البیان۔

[2] یاد رہے کہ رب کا مادہ "رب ب" ہے اور "رب و" یعنی یہ مضاعف ہے ناقص نہیں لیکن رب کے اصلی معنی میں پرورش اور تربیت ہے اسی لئے فارسی میں عموماً اس کا ترجمہ پروردگار کرتے ہیں۔

لفظ "عالمین" عالم کی جمع ہے اور عالم کے معنی ہیں مختلف موجودات کا وہ مجموعہ جو مشترک صفات کا حامل ہو یا جن کا زمان و مکان مشترک ہو، مثلاً ہم کہتے ہیں عالم انسان، عالم حیوان یا عالم گیاہ یا پھر ہم کہتے ہیں عالم مشرق، عالم مغرب، عالم امروز یا عالم دیروز۔ لہذا عالم اکیلا جمعیت کا معنی رکھتا ہے اور جب عالمین کی شکل میں جمع کا صیغہ ہو تو پھر اس سے اس جہان کے تمام مجموعوں کی طرف اشارہ ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ "ی"، "ن" والی جمع عموماً ذوی العقول کے لئے آتی ہے جب کہ اس جہان کے سب عالم تو صاحب عقل نہیں ہیں اسی لیے بعض مفسرین یہاں لفظ عالمین سے صاحبانِ عقل کے گروہوں اور مجموعوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً فرشتے، انسان اور جن۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جمع تغلیبی ہو (جس کا مقصد مختلف صفات کے حامل مجموعے کو بلند تر صنف کی صفت سے متصف کیا جاتا ہے)۔

صاحب تفسیر المنار کہتے ہیں ہمارے جد امام صادق (ان پر اللہ کا رضوان ہو) سے منقول ہے کہ عالمین سے مراد صرف انسان ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بھی عالمین اسی معنی کے لئے آیا ہے جیسا کہ لیکون للعالمین نذیرا۔ یعنی۔ خداوند عالم نے قرآن اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ عالمین کو ڈرائے۔ (فرقان۔ ۱) [1]

لیکن اگر عالمین کے موارد استعمال قرآن میں دیکھے جائیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اگرچہ بہت سے مقامات پر لفظ عالمین انسانوں کے معنی میں آیا ہے تاہم بعض موارد میں اس سے وسیع تر مفہوم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اس سے انسانوں کے علاوہ دیگر موجودات بھی مراد ہیں۔ مثلاً:

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تعریف و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو آسمانوں اور زمین کا مالک و پروردگار ہے۔ جو مالک و پروردگار ہے عالمین کا۔ (الجاثیہ۔ ۳۶)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۝

فرعون نے کہا عالمین کا پروردگار کون ہے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا پروردگار۔ (شعراء۔ ۲۳، ۲۴)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں جو شیخ صدوق نے عیون الاخبار میں حضرت علیؑ سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ امام نے الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا:

رب العالمین هم الجماعات من كل مخلوق من الجمادات والحيوانات

رب العالمین سے مراد تمام مخلوقات کا مجموعہ ہے چاہے وہ بے جان ہوں یا جاندار۔ [2]

یہاں یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ شاید ان روایات میں کوئی تضاد ہے کیونکہ لفظ عالمین کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے

---

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۱ ص۱

لیکن تمام موجوداتِ عالم کا سہرا مہرہ انسان ہے لہٰذا بعض اوقات اس پر انگشت رکھ دی جاتی ہے اور باقی کائنات کو اس کا تابع اور اس کے زیر سایہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اگر امام سجادؑ کی روایت میں اس کی تفسیر انسان کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مجموعہ کائنات کا اصل ہدف و مقصد انسان ہی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض نے عالم کی دو حصوں میں تقسیم کی ہے عالم کبیر اور عالم صغیر۔ عالم صغیر سے ان کی مراد انسان کا وجود ہے کیونکہ ایک انسان کا وجود مختلف توانائیوں اور قوی کا مجموعہ ہے اور اس جہاں عالم پر حاکم ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان تمام کائنات میں ایک نمونہ اور ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے عالم سے یہ وسیع مفہوم مراد لیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ لفظ عالمین جملہ الحمد للہ کے بعد آیا ہے۔ اس جملے میں تمام تعریف و ستائش کو خدا کے ساتھ مختص قرار دیا گیا ہے اس کے بعد رب العالمین کو بطور دلیل ذکر کیا گیا ہے گویا ہم کہتے ہیں کہ تمام تعریفیں مخصوص ہیں خدا کے لئے کیونکہ ہر کمال، ہر نعمت اور ہر بخشش جو عالم میں وجود رکھتی ہے اس کا مالک و صاحب اور پروردگار وہی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) تمام ارباب انواع کی نفی: تاریخ ادیان و مذاہب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح توحید سے منحرف لوگ ہمیشہ اس جہان کے لئے ارباب انواع کے قائل تھے۔ اس طرز فکر کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے گمان کے مطابق موجودات کی ہر نوع ایک مستقل رب نوع کی محتاج ہے جو اس نوع کی تربیت و رہبری کرتا ہے گویا وہ خدا کو ان انواع کی تربیت کے لئے کافی نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ وہ عشق، عقل، تجارت اور جنگ جیسے امور کے لئے بھی رب نوع کے قائل تھے۔ یونانی بارہ بڑے خداؤں کی عبادت کرتے تھے (جن میں سے ہر کوئی رب النوع تھا) یونانیوں کے بقول وہ اُلمپ کی چوٹی پر بزم خدائی سجائے بیٹھے تھے ان میں سے ہر ایک انسان کی ایک صفت کا مظہر تھا۔[1]

ملک آشور کے پایہ تخت کلاہ میں لوگ پانی کے رب نوع، چاند کے رب نوع، سورج کے رب نوع اور زہرہ کے رب نوع کے قائل تھے۔ انہوں نے ہر ایک کا الگ الگ نام رکھ رکھا تھا اور ان سب کے اوپر مردوک کو رب الارباب سمجھتے تھے۔ روم میں بھی بہت سے خدا مروج تھے۔ شرک، تعددِ خدا اور ارباب انواع کا بازار شاید وہاں سب سے زیادہ گرم تھا۔

اہل روم تمام خداؤں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے: گھریلو خدا اور حکومتی خدا۔ خدایانِ حکومت سے لوگوں کو زیادہ لگاؤ تھا (کیونکہ وہ ان کی حکومت سے خوش رہتے تھے) ان خداؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی کیونکہ ہر خدا کی ایک خاص پوسٹ (POST) تھی اور وہ محدود معاملات میں دخیل ہوتا تھا۔ عالم یہ تھا کہ گھر کے دروازے کا ایک مخصوص خدا تھا بلکہ ڈیوڑھی اور صحن خانہ کا بھی الگ الگ رب النوع تھا۔

---

[1] اعلام القرآن صفحہ ۲۰۲

ایک مؤرخ کے بقول اس میں تعجب کی بات نہیں کہ رومیوں کے ۳۰ ہزار خدا ہوں، جیسا کہ ان کے ایک بزرگ نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کے خداؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ گذرگاہوں اور محافل میں وہ افراد قوم سے زیادہ ہیں۔ ان خداؤں میں سے زراعت، باورچی خانہ، غلہ خانہ، گھر، گیس، آگ، میوہ جات، دروازہ، درخت، تاک، جنگل، حریق، شہر روم کے بڑے دروازے اور قومی آتشکدہ کے رب نوع شمار کئے جا سکتے ہیں۔ [1]

خلاصہ یہ کہ گذشتہ زمانے میں انسان قسم قسم کے خرافات سے دست و گریباں تھا جیسا کہ اب بھی اس زمانے کی یادگار بعض خرافات باقی رہ گئے ہیں۔

نزول قرآن کے زمانے میں بھی بہت سے بتوں کی پوجا اور تعظیم کی جاتی تھی اور شاید وہ سب یا ان میں سے بعض پہلے ارباب انواع کے جانشین بھی ہوں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات تو خود انسان کو بھی عملی طور پر رب قرار دیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے جو احبار (علماء یہود) اور رہبان (تارک الدنیا مرد اور عورتیں) کو اپنا رب سمجھتے تھے قرآن کہتا ہے:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر علماء اور راہبوں کو خدا بنا رکھا تھا۔ (توبہ۔ ۳۱)

بہر حال علاوہ اس کے کہ یہ خرافات انسان کو عقلی پستی کی طرف لے گئے تھے۔ تفرقہ پسندی، گروہ بندی اور اختلاف کا سبب بھی تھے۔ پیغمبران خدا بڑی پامردی سے ان کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے یہاں تک کہ بسم اللہ کے بعد پہلی آیت جو قرآن میں آئی ہے وہ اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔۔۔ الحمد للہ رب العالمین یعنی تمام تعریفیں مخصوص ہیں اس خدا کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اس طرح قرآن نے تمام ارباب انواع پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور انہیں ان کی اصلی جگہ ۔۔۔ وادی عدم میں بھیج دیا اور ان کی جگہ توحید و یگانگی اور ہم بستگی و اتحاد کے پھول کھلائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ روزانہ اپنی شب و روز کی نمازوں میں کم از کم دس مرتبہ یہ جملہ پڑھیں اور اس اللہ کے سایہ رحمت میں پناہ لیں جو ایک اکیلا خدا ہے جو تمام موجودات کا مالک، رب، سرپرست اور پرورش کرنے والا ہے تاکہ کبھی توحید کو فراموش نہ کریں اور شرک کی پرپیچ راہوں میں سرگرداں نہ ہوں۔

(۲) خدائی پرورش، خدا شناسی کا راستہ: کہ رب دراصل مالک و صاحب کے معنی میں ہے لیکن ہر مالک و صاحب کے لئے نہیں بلکہ وہ جو تربیت و پرورش بھی اپنے ذمے لے اسی لئے فارسی میں اس کا ترجمہ پروردگار کیا جاتا ہے۔

زندہ موجودات کی سیر تکامل اور بے جان موجودات کا تحول و تغیر نیز موجودات کی پرورش کے لئے حالات کی سازگاری وہ تمام جہان میں پنہاں ہے اس پر غور و فکر کرنا خدا شناسی کے راستوں میں سے ایک بہترین راستہ ہے۔

ہمارے اعضائے بدن میں ایک ہم آہنگی ہے جو زیادہ تر ہماری آگاہی کے بغیر قائم ہے یہ بھی ہماری بات پر ایک

---

[1] تاریخ آلبر مالہ، ج ۱، فصل ۴، تاریخ روم

زندہ دلیل ہے۔ہماری زندگی میں جب کوئی اہم حادثہ پیش آتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ ہم پوری توانائی کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تو ایک مختصر سے لمحے میں ہمارے تمام اعضاء وارکان بدن کو ہم آہنگی کا حکم ملتا ہے تو فوراً دل دھڑکنے لگ جاتا ہے، سانس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، بدن کے تمام قوٰی مجتمع ہو جاتے ہیں، غذا اور آکسیجن خون کے راستے فراوانی سے تمام تک پہنچ جاتی ہے، اعصاب آمادہ کار، عضلات اور پٹھے زیادہ حرکت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انسان میں قوت تحمل بڑھ جاتی ہے۔ درد کا احساس کم ہو جاتا ہے، نیند آنکھوں سے اڑ جاتی ہے اور اعضاء میں سے تکان اور بھوک کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

کون ہے جو یہ عجیب و غریب ہم آہنگی اس حساس موقع پر اس تیزی کے ساتھ وجود انسانی کے تمام ذرات میں پیدا کر دیتا ہے؟ کیا یہ پرورش خداوند عالم و قادر کے سوا ممکن ہے۔ اس پرورش و تربیت کے سلسلے میں بہت سی قرآنی آیات ہیں جو انشاء اللہ اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی اور ان میں سے ہر ایک معرفت خدا کی واضح دلیل ہے۔

۳۔ الرحمٰن الرحیم

وہ خدا جو مہربان اور بخشنے والا ہے (اس کی عام و خاص رحمت نے سب کو گھیر رکھا ہے)۔

تفسیر

رحمان و رحیم کے معنی و مفہوم کی وسعت اور ان کا فرق ہم بسم اللہ کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اب تکرار کی ضرورت نہیں۔

جس نکتے کا یہاں اضافہ ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں صفات جو اہم ترین اوصاف خداوندی ہیں ہر روز کی نماز میں کم از کم ۳۰ مرتبہ ذکر ہوتی ہیں (دو مرتبہ سورہ حمد میں اور ایک مرتبہ بعد والی سورت میں) اس طرح ۶۰ مرتبہ ہم خدا کی تعریف صفت رحمت کے ساتھ کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ تمام انسانوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی میں ہر چیز سے زیادہ اس اخلاق خداوندی کے ساتھ متصف کریں۔ علاوہ ازیں واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ بے رحم مالک اپنے غلاموں سے جو سلوک روا رکھتے ہیں ہماری نگاہ میں جچنے لگے۔

غلاموں کی تاریخ میں ہے کہ ان کے مالک ان سے عجیب قساوت و بے رحمی سے پیش آتے تھے سکتے ہیں کہ اگر کوئی غلام ان کی خدمات کی انجام دہی میں معمولی سی کوتاہی کرتا تو اسے سخت سزا سے دوچار ہونا پڑتا۔ اسے کوڑے مارے جاتے، بیڑیوں میں جکڑا جاتا، چکی سے باندھا جاتا، کان کنی پر لگایا جاتا، زیر زمین اور تاریک وحشتناک قید خانوں میں رکھا جاتا اور اس کا جرم زیادہ ہوتا تو سولی پر لٹکا دیا جاتا۔[1]

---

[1] تاریخ آلبرماله تاریخ روم جلد ۱ ص ۱۵۳

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ محکوم غلاموں کو درندوں کے پنجروں میں پھینک دیا جاتا اگر وہ جان بچا لیتے تو دوسرا درندہ پنجرے میں داخل کر دیا جاتا۔

یہ تو تھا نمونہ مالکوں کے اپنے غلاموں سے سلوک کا لیکن خداوند جہان بار بار قرآن میں انسانوں کو یہ فکر دیتا ہے کہ اگر میرے بندوں نے میرے قانون کو خلاف عمل کیا ہو اور وہ پشیمان ہو جائیں تو میں انہیں بخش دوں گا، انہیں معاف کر دوں گا کہ میں رحیم اور مہربان ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۔

کہیئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے (قانون الٰہی سے سرکشی کرکے) خود اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ خدا تمام گناہوں سے درگزر فرمائے گا (یعنی توبہ کرو رحمت خدا کے بے پایاں دریا سے بہرہ مند ہو جاؤ)۔ (زمر۔۵۳)

لہٰذا رب العالمین کے بعد "الرحمٰن الرحیم" کو لانا اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم قدرت کے باوجود جو کہ ہماری عین ذات ہے، اپنے بندوں پر مہربانی اور لطف و کرم کرتے ہیں۔ یہ بندہ نوازی اور لطف بندے کو خدا کا ایسا شیفتہ و فریفتہ بنا دیتا ہے کہ وہ انتہائی شغف سے کہتا ہے "الرحمٰن الرحیم"۔

یہاں سے انسان اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے اپنے بندوں سے اور مالکوں کے اپنے ماتحتوں سے سلوک میں کس قدر فرق ہے۔ خصوصاً غلامی کے بدقسمت دور میں۔

۴۔ مالک یوم الدین

وہ خدا جو روز جزا کا مالک ہے۔

تفسیر

قیامت پر ایمان دوسری اصل ہے

یہاں اسلام کی دوسری اہم اصل یعنی قیامت اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے۔ وہ خدا جو جزا کے دن کا مالک ہے (مالک یوم الدین) اس طرح محور اور مبداء و معاد جو ہر قسم کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی بنیاد ہے، وجود انسانی میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں قیامت خدا کی ملکیت سے تعبیر کی گئی ہے اور یہ بات اس دن کے لئے خدا کے انتہائی تسلط اور اشیاء و اشخاص پر اس کے نفوذ کو مشخص کرتی ہے۔ وہ دن کہ جب تمام انسان اس بڑے دربار میں حساب کے لئے حاضر ہوں گے۔ لوگ اپنے مالک حقیقی کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اپنی تمام کہی ہوئی باتیں، کیے ہوئے کام یہاں تک کہ سوچے ہوئے افکار

کو اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ حتیٰ کہ سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی بات نابود نہ ہوگی اور فراموش نہ کی گئی ہوگی۔ اب وہ انسان حاضر ہے جسے اپنے تمام اعمال و افعال کی جواب دہی کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا۔ نوبت یہ ہوگی کہ جن امور کو وہ خود بجا نہیں لایا بلکہ کسی طریقہ یا پروگرام کا بانی تھا اس میں بھی اسے اپنے حصے کی جواب دہی کا سامنا ہوگا۔

اس میں شک و شبہ نہیں کہ خداوند عالم کی یہ مالکیت اس طرح سے اعتباری نہیں جس طرح اس دنیا میں چیزیں ہماری ملک ہیں کیونکہ ہماری مالکیت تو ایک قرارداد کی بنا پر ہے یا اعزازی و اسنادی ہے۔ دوسرے اسناد و اعزاز کے ساتھ یہ مالکیت ختم بھی ہو سکتی ہے لیکن جہان ہستی کے لئے خدا کی مالکیت حقیقی ہے اور موجودات کا خدا کے ساتھ ایک ربط ہے اگر ایک لحظ کیلئے منقطع ہو جائے تو نابود ہو جائیں جیسے بجلی کے قمقموں کا رابطہ اپنے بجلی گھر سے ٹوٹ جائے تو ان کی روشنی ختم ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی مالکیت خالقیت اور ربوبیت کا نتیجہ ہے وہ ذات جس نے موجودات کو خلق کیا، اپنی رحمت کے زیر نظر ان کی پرورش کی اور لمحہ بہ لمحہ انہیں فیض وجود ہستی بخشا وہی موجودات کا حقیقی مالک ہے۔

ایک حقیر سا نمونہ مالکیت حقیقی کا ہم اپنی ذات میں اپنے اعضاء بدن کے بارے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہم آنکھ، کان، دل اور اپنے اعصاب کے مالک ہیں۔ اس سے مراد اعتباری مالکیت نہیں بلکہ ایک قسم کی حقیقی مالکیت ہے جس کا سرچشمہ ربط، تعلق اور احاطہ ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا اس جہان کا مالک نہیں؟ اگر ہے تو پھر کیوں ہم اسے مالک روز جزا کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف متوجہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی مالکیت اگرچہ دونوں جہان پر محیط ہے لیکن اس مالکیت کا ظہور قیامت کے دن بہت زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اس دن تمام مادی رشتے اور اعتباری ملکیتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس دن کسی شخص کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ شفاعت بھی فرمان خدا سے ہوگی۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۝

وہ دن کہ جب کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ ہوگا کہ اس کے ذریعے کسی کی مدد کر سکے اور تمام معاملات خدا کے ہاتھ میں ہوں گے۔ (الانفطار - ۱۹)

دوسرے الفاظ میں اس دنیا میں انسان دوسرے کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی زبان سے، کبھی مال سے، کبھی افرادی قوت سے اور کبھی مختلف کاموں سے دوسرے کو اپنی حمایت و مدد فراہم کرتا ہے لیکن اس دن ان امور میں سے کوئی چیز بھی نہ ہوگی اسی لئے تو جب لوگوں سے سوال ہوگا:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ ؟

(آج کس کی حکومت ہے)

تو جواب آئے گا:

لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

(صرف خدائے یگانہ، کامیاب و کامران کی حکمرانی ہے) (المومن - ۱۶)

قیامت کے دن پر اور اس بڑی عدالت گاہ پر ایمان کہ جس میں تمام چیزوں کا بڑی باریک بینی سے حساب لیا جائے گا انسان کو غلط اور ناشائستہ اعمال سے روکنے کے لئے بہت موثر ہے۔ نماز سے قبیح اور برے اعمال سے روکنے کی ایک وجہ یہی ہے کہ ایک تو یہ انسان کو مبدء کی یاد دلاتی ہے جو اس کے تمام کاموں سے واقف ہے اور دوسرے عدل خدا کی بڑی عدالت کو بھی یاد دلاتی ہے۔

روز قیامت خدا کی مالکیت پر ایمان کا فائدہ یہ بھی ہے کہ قیامت کا اعتقاد رکھنے والا مشرکین اور منکرین قیامت کے مقابل قرار پاتا ہے کیونکہ آیات قرآنی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان ایک عمومی عقیدہ تھا یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے سوال ہوتا تھا کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا کون ہے تو کہتے تھے: خدا:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو ضرور کہیں گے: اللہ۔

(لقمان - ۲۵)

جب کہ وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ سے قیامت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب انکار کرتے اور اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ

کافر کہتے ہیں کیا تمہیں ایسے شخص سے متعارف کرائیں جو یہ کہتا ہے کہ جب تم خاک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تمہارے ان منتشر اجزاء کو (سمیٹ کر) پھر سے زندہ کیا جائے گا۔ جانے وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا دیوانہ ہے۔ (سبا - ۷، ۸)

ایک حدیث میں امام سجادؑ کے بارے میں ہے کہ آپؑ جب آیت مالک یوم الدین تک پہنچتے تو اس کا اس طرح سے تکرار کرتے کہ یوں لگتا جیسے آپ کی روح بدن سے پرواز کر جائے گی۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

"کان علی ابن الحسین اذا قرء مالک یوم الدین یکورھا حتی یکاد ان یموت"[1]

باقی رہا لفظ یوم الدین ... یہ تعبیر قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوئی اس سے مراد قیامت ہے جیسا کہ قرآن میں سورہ انفطار کی آیات ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ میں صراحت کے ساتھ اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے (یہ تعبیر قرآن مجید میں دس سے زیادہ مرتبہ اسی معنی میں استعمال ہوئی ہے)۔

اب رہی یہ گفتگو کہ اس دن کو یوم الدین کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن جزا کا دن ہے اور دین لغت

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۱۹

میں جزا کے معنی میں ہے اور قیامت کا واضح ترین پروگرام جزا و سزا اور عوض و ثواب ہے۔ اس دن پردے ہٹ جائیں گے اور تمام اعمال کا تمام تر باریک تفصیلات کے ساتھ محاسبہ ہوگا اور ہر شخص اپنے اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا پالے گا۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"یوم الدین سے مراد روز حساب ہے۔"[1]

اس روایت کے مطابق تو یہاں دین حساب کے ہم معنی ہے۔ شاید یہ تعبیر ذکر علت اور ارادہ معلول کے قبیل میں سے ہو کیونکہ ہمیشہ حساب جزا کی تمہید اور مقدمہ ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ بھی ہے کہ قیامت کے دن کو یوم الدین اس لئے کہا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص اپنے دین و آئین کے مطابق جزا و سزا پائے گا لیکن پہلا معنی (حساب و جزا) زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۵- ایاك نعبد وایاك نستعین

پروردگارا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر

یہاں سے ابتداء ہوتی ہے انسان کے دربار خدا میں پیش ہو کر حاجات اور تقاضوں کو بیان کرنے کی۔ حقیقت میں گفتگو کا لب و لہجہ یہاں سے بدل جاتا ہے کیونکہ گذشتہ آیات میں خدا کی حمد و ثنا اور اس کی ذات پاک پر ایمان کا اظہار نیز قیامت کا اعتراف تھا۔ لیکن یہاں سے گویا بندہ اس محکم عقیدہ اور معرفتِ پروردگار کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کے حضور اور اس کی ذات پاک کے روبرو دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسے مخاطب کر کے پہلے اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس سے طلب امداد کے لئے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں (ایاك نعبد وایاك نستعین)۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب گذشتہ آیات کے مفاہیم انسان کی روح میں سرایت کر جاتے ہیں، اس کے وجود کی گہرائیاں اس اللہ کے نور سے روشن ہو جاتی ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور اس کی عمومی و خصوصی رحمت اور روزِ جزا کی مالکیت کو جان لیتا ہے تو اب عقیدے کے لحاظ سے فرد کامل نظر آنے لگتا ہے۔ توحید کے اس گہرے عقیدے کا پہلا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف انسان خدا کا خالص بندہ بن جاتا ہے، بتوں، جابروں اور شہوات و خواہشات کی عبادت کے دائرے سے نکل آتا ہے اور دوسری طرف طلب امداد کے لئے اس کی ذات پاک کی طرف ہاتھ پھیلانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، ذیل آیہ مذکورہ

واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ آیات توحید ذات وصفات بیان کر رہی ہیں اور یہاں توحید عبادت اور توحید افعال سے متعلق گفتگو ہے۔

توحید عبادت یہ ہے کہ کسی شخص یا چیز کو ذاتِ خدا کے علاوہ پرستش کے لائق نہ سمجھا جائے، صرف اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے، صرف اس کے قوانین و احکام کو قبول کیا جائے اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی کی کسی قسم کی عبادت و بندگی کرنے اور کسی اور کے سامنے سرافگندہ ہونے سے پرہیز کیا جائے۔

توحید افعال یہ ہے کہ سارے جہان میں مؤثر حقیقی اسی کو سمجھا جائے (لا مؤثر فی الوجود الا اللہ یعنی اللہ کے علاوہ کوئی مؤثر وجود نہیں رکھتا)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عالم اسباب کا انکار کر دیا جائے اور سبب کی تلاش نہ کی جائے بلکہ ہمیں یہ اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ ہر سبب کی یہ تاثیر حکم خدا کے تابع ہے وہی ہے جس نے آگ کو جلانے، سورج کو روشنی دینے اور پانی کو حیات بخشنے کی تاثیر دی ہے۔

اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان صرف اللہ پر بھروسہ کرے گا اور قدرت و عظمت کو اسی سے مربوط کرے گا اور اس کا غیر اس کی نظر میں فانی، زوال پذیر اور فاقد قدرت ہوگا۔

صرف خدا کی ذات قابل اعتماد و ستائش ہے اور یہی لیاقت رکھتی ہے کہ انسان اسے تمام چیزوں میں اپنا سہارا قرار دے یہ فکر اور اعتماد انسان کا ناطہ تمام موجودات سے توڑ کر صرف خدا سے جوڑ دے گا۔ یہاں تک کہ اب وہ عالم اسباب کی تلاش بھی حکم خدا کے تحت کرتا ہے یعنی اسباب میں بھی وہ قدرت خدا کا مشاہدہ کرتا ہے کیونکہ خدا ہی مسبب الاسباب ہے۔

چند اہم نکات

(۱) آیت میں حصر کا مفہوم: عربی ادبیات کے قواعد کے مطابق جب مفعول و فاعل پر مقدم ہو جائے تو اس سے حصر کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایاک کا نعبد اور نستعین پر مقدم ہونا دلیل حصر ہے۔ اور اس کا نتیجہ وہی توحید عبادت اور توحید افعال ہے جسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بندگی اور عبودیت میں بھی ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں اور اس کے لئے بھی ہم اسی سے طلب اعانت کرتے ہیں تاکہ کہیں انحراف، خود پسندی، ریاکاری اور ایسے دیگر امور میں گرفتار نہ ہو جائیں کیونکہ یہ چیزیں عبودیت کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم پہلے جملے میں کہتے ہیں کہ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں اس میں کچھ نہ کچھ استقلال کی بُو آتی ہے لہٰذا فوراً ایاک نستعین سے ہم اس کی اصلاح کر لیتے ہیں اس طرح بین الامرین (نہ جبر نہ تفویض) کو اپنی عبادت میں جمع کر لیتے۔ یہ حالت ہمارے تمام کاموں کے لئے ایک نمونہ ہے۔

(۲) نعبد و نستعین اور اسی طرح بعد کی آیات میں جمع کے صیغے آئے ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عبادت اور خصوصاً نماز کی اساس جمع و جماعت پر رکھی گئی ہے یہاں تک کہ جب بندہ خدا کے سامنے راز و نیاز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو جماعت و اجتماع کے ساتھ شمار کرے چہ جائے کہ اس کی زندگی کے دیگر کام۔ اس بناء پر ہر قسم کی انفرادیت علیحدگی، گوشہ نشینی اور اس قسم کی چیزیں قرآن اور اسلام کی نظر میں مردود قرار پاتی ہیں۔

نماز میں اذان و اقامت (جو نماز کے لئے اجتماع کی دعوت ہے) سے لے کر حی علی الصلوٰۃ (نماز کی طرف جلدی آؤ) سے گزرتے ہوئے سورہ الحمد تک جو نماز کی ابتداء اور السلام علیکم تک جو نماز کا اختتام ہے، سب اس امر کی دلیل ہے کہ یہ عبادت دراصل اجتماعی پہلو رکھتی ہے یعنی اسے صورتِ جماعت میں انجام پذیر ہونا چاہیئے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نماز فرادیٰ بھی اسلام میں صحیح ہے لیکن عبادت فرادیٰ جنبہ فرعی کی حامل ہے اور ایسی عبادت دوسرے درجے کی عبادت قرار پاتی ہے۔

(۵) طاقتوں کے ٹکراؤ کے وقت استعانتِ خدا کی طلب: انسان اس جہاں میں کئی ایک طاقتوں سے نبرد آزما ہے۔ چاہے وہ طاقتیں طبیعی و مادی ہوں یا انسان کے اندر کی طاقتیں۔ تباہ و برباد اور منحرف کرنے والی چیزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کو یار و مددگار کی ضرورت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے تئیں پروردگار کے سایۂ حمایت کے سپرد کرتا ہے۔ جو روز انسان بستر خواب سے اٹھتا ہے اور ایاک نعبد و ایاک نستعین کے تکرار سے پروردگار کی عبودیت کا اعتراف کرکے اس کی ذات پاک سے اس بڑے مقابلے میں مدد حاصل کرتا ہے اور شام کے وقت بھی اسی جملے کی تکرار سے سر اپنے بستر پر رکھتا ہے گویا اس کی یاد سے اٹھتا ہے اور اسی کو یاد کرتے ہوئے طلبِ استعانت کے بعد سوتا ہے۔ ایسا شخص کتنا خوش نصیب ہے۔ یہی شخص ایمان کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ پھر کسی سرکش و طاقتور کے سامنے سر نہیں جھکاتا اور مادیات کی کشش کے مقابلے میں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیتا اور وہ پیغمبر اسلام کی پیروی میں کہتا ہے:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۞

یقیناً میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس خدا کے لئے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔ (الانعام - ۱۶۲)

۶۔ اھدنا الصراط المستقیم

ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔

تفسیر

صراطِ مستقیم پر چلنا

پروردگار کے سامنے اظہار تسلیم، اس کی ذات کی عبودیت، اس سے طلبِ استعانت کے مرحلے تک پہنچ جانے کے بعد بندے کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ اسے سیدھی راہ، پاکیزگی و نیکی کی راہ، عدل و داد کی راہ اور ایمان و عمل صالح کی راہ کی ہدایت نصیب ہو۔ تاکہ خدا جس نے اُسے تمام نعمتوں سے نوازا ہے ہدایت سے بھی سرفراز فرمائے۔

اگرچہ یہ انسان ان حالات میں مومن ہے اور اپنے خدا کی معرفت رکھتا ہے لیکن یہ امکان ہے کہ کسی لحظے یہ نعمت کچھ عوامل کے باعث اس سے چھن جائے اور یہ صراط مستقیم سے منحرف اور گمراہ ہو جائے لہٰذا چاہیئے کہ شب و روز میں دس مرتبہ اپنے خدا سے خواہش کرے کہ اسے کوئی لغزش و انحراف درپیش نہ ہو۔

یہ صراط مستقیم جو بالفاظ دیگر آئین و دستور حق ہے کے کئی مراتب و درجات ہیں تمام افراد ان مدارج کو برابر طے نہیں کرتے انسان جس قدر ان درجات کو طے کرے اس سے بلند تر درجات موجود ہیں۔ پس صاحب ایمان کو چاہیئے کہ وہ خدا سے خواہش و دعا کرے کہ وہ اسے ان درجات کی ہدایت کرے۔

یہاں یہ مشہور سوال سامنے آتا ہے کہ ہم ہمیشہ خدا سے صراط مستقیم کی ہدایت کی درخواست کرتے رہتے ہیں، کیا ہم گمراہ ہیں؟ اور اگر بالفرض یہ بات ہمارے لئے درست ہے تو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہل بیت جو انسان کامل کا نمونہ ہیں ان کے لئے کیونکر صحیح ہے؟؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں :-

جیسے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ انسان کے لئے راہ ہدایت میں ہر لمحہ لغزش و کجروی کا خوف ہے لہٰذا چاہیئے کہ اپنے آپ کو پروردگار کے اختیار میں دیدے اور اس سے تقاضا کرے کہ وہ اسے سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھے، ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وجود ہستی اور دیگر تمام نعمات لمحہ بہ لمحہ اس مبداء عظیم ہی سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے کہ ہماری اور تمام موجودات کی مثال بجلی کے بلب کی سی ہے اگر ہم دیکھیں کہ بلب کی روشنی مسلسل پھیل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر لحظہ بجلی کے مرکز سے قوت حاصل کر رہا ہے کیونکہ بجلی کے مرکز سے ہر لحظہ نئی روشنی کی تولید جاری ہے اور یہ مربوط تاروں کے ذریعے اسے بلب تک پہنچاتا ہے۔ ہمارا وجود بھی بلب کی روشنی کی طرح جو بظاہر ایک مستقل پھیلے ہوئے وجود کی طرح ہے لیکن حقیقت میں ہمیں مرکز ہستی، آفریدگار فیاض سے ہر لحظہ ایک نیا وجود ملتا رہتا ہے۔ چونکہ ہمیں ہر لمحہ ایک تازہ وجود میسر آتا ہے اس لئے ہر لمحہ ہم نئی ہدایت کے محتاج ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ خدا اور ہمارے درمیان رابطے کی معنوی تاروں میں اگر کوئی مانع پیدا ہو جائے مثلاً بے راہ روی، ظلم، ناپاکی وغیرہ تو اس منبع ہدایت کے ساتھ ہمارا رابطہ منقطع ہو جائے گا اور یوں ہم صراط مستقیم سے منحرف ہو جائیں گے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں یہ موانع پیش نہ آئیں اور ہم صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں طریق تکامل کو طے کرنا یعنی انسان تدریجاً مراحل نقص پیچھے چھوڑتا جائے اور مراحل بلند تک پہنچتا جائے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ راہ کمال یعنی ایک کمال سے دوسرے کمال تک پہنچنے کا راستہ نا محدود ہے گویا یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

اس بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام بھی خدا سے صراط مستقیم کی ہدایت کا تقاضہ کریں کیونکہ کمال مطلق تو صرف ذات خدا ہے اور باقی سب بلا استثناء سیر تکامل میں ہیں لہٰذا کیا حرج ہے کہ وہ بھی خدا سے بالاتر درجات کی تمنا کریں۔

کیا ہم نبی اکرمؐ پر درود و سلام نہیں بھیجتے؟ اور کیا درود در اصل محمد و آل محمد پر پروردگار عالم سے نئی رحمت کا تقاضا نہیں؟؟

کیا رسول اللہ نہیں فرماتے تھے؟

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۔

خدایا میرے علم (اور ہدایت) کو زیادہ فرما۔

کیا قرآن یہ نہیں کہتا:

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى

یعنی ... خدا ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔ (مریم-۷۶)

یہ بھی قرآن میں ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۝

یعنی جو ہدایت یافتہ ہیں خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں تقویٰ عطا کرتا ہے۔ (محمد-۱۷)

اسی سے نبی اکرمؐ اور آئمہ علیہم السلام پر درود بھیجنے کے متعلق سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی وضاحت کے لئے ذیل کی دو حدیثوں کی طرف توجہ فرمائیں۔

(۱) حضرت امیرالمومنین علیؑ جملہ اهدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

یعنی ادم لنا توفیقك الذی اطعناك به فی ماضی ایامنا حتی نطیعك کذلك فی مستقبل اعمارنا۔

خداوندا جو توفیقات تونے ماضی میں ہمیں عنایت کی ہیں، جن کی برکت سے ہم نے تیری اطاعت کی ہے انہیں اسی طرح برقرار رکھ تاکہ ہم آئندہ بھی تیری اطاعت کرتے رہیں[1]

(۲) حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

یعنی ارشدنا للزوم الطریق المؤدی الی محبتك والمبلغ الی جنتك والمانع من ان نتبع اهوائنا فنعطب او ان نأخذ بآرائنا فنهلك۔

خداوندا ہمیں اس راستہ پر جو تیری محبت اور جنت تک ہے ثابت قدم رکھ یہی راستہ ہلاک کرنے والی خواہشات اور انحرافی و تباہ کرنے والی آراء سے مانع ہے[2]

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

آیات قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم آئینِ خدا پرستی، دینِ حق اور احکامِ خداوندی کی پابندی کا نام ہے۔ جیسے سورہ انعام کی آیت ۱۶۱ میں ہے:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

یعنی ... کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے صراط مستقیم کی ہدایت کی ہے جو سیدھا دین ہے وہ کہ

---

[1] تفسیر صافی (آیہ مذکورہ)، بحار المعانی الاخبار و تفسیر حسن عسکری

[2] ایضاً

جو اس ابراہیم کا آئین ہے جس نے کبھی خدا سے شرک نہیں کیا۔

دین ثابت یعنی وہ دین جو اپنی جگہ قائم ہے، ابراہیم کے آئین توحیدی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کا تعارف بیان بہ صراط مستقیم کے عنوان سے ہوا ہے اور یہی بات اس اعتقادی پہلو کو مشخص کرتی ہے۔

سورہ یٰس آیت ۶۰، ۶۱ میں ہے :

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد و پیمان نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا (اس کے احکام پر عمل نہ کرنا) کیونکہ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی صراط مستقیم ہے۔

یہاں دین حق کے عملی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو ہر قسم کے شیطانی فعل اور عملی انحراف کی نفی ہے۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۱ میں قرآن کے مطابق صراط مستقیم تک پہنچنے کا طریقہ خدا سے تعلق اور ربط پیدا کرنا ہے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

جنہوں نے اللہ کے دامن رحمت کو تھامے رکھا انہی نے صراط مستقیم کی ہدایت پائی۔

اس نکتے کی طرف بھی نظر ضروری ہے کہ صراط مستقیم صرف ایک ہی راستہ ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے جو نزدیک ترین راستے کو تشکیل دیتا ہے۔

لہٰذا اگر قرآن کہتا ہے کہ صراط مستقیم دراصل اعتقادی و عملی پہلوؤں سے دین و آئین الٰہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دین ہی نزدیک ترین راستہ ہے خدا سے ربط پیدا کرنے کا اور یہی وجہ ہے کہ دین حقیقی دو واقعی ہے بھی فقط ایک۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

دین خدا کے نزدیک اسلام (ہی) ہے۔ (آل عمران۔ ۱۹)

انشاء اللہ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اسلام ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر وہ آئین توحید شامل ہے جو کسی بھی زمانے میں جاری تھا اور کسی نئے آئین سے منسوخ نہیں ہوا۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ مفسرین نے صراط مستقیم کی جو مختلف تفاسیر بیان کی ہیں ان سب کی برگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

بعض نے اس کے معنی اسلام کئے ہیں بعض نے قرآن، کچھ مفسرین نے اس سے رسول و آئمہ برحق مراد لئے ہیں اور کچھ نے اللہ کا آئین کہ جس کے علاوہ خدا کوئی چیز قبول نہیں۔ ان تمام معانی کی برگشت اسی دین و آئین الٰہی کی طرف ہے تمام تر اعتقادی و عملی پہلوؤں کے ساتھ۔

جو روایات مصادر اسلامی میں اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ہر ایک اس مسئلے کے ایک زاویے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سب کی بازگشت ایک ہی اصل کی طرف ہے۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا :

الصراط المستقیم صراط الانبیاء وھم الذین انعم اللہ علیھم

صراطِ مستقیم انبیاء کا راستہ ہے اور انبیاء وہ ہستیاں ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔

امام صادقؑ کا ارشاد اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں یوں ہے:

الطریق و معرفۃ الامام

اس سے مراد امام کا راستہ اور اس کی معرفت ہے[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ ہی سے منقول ہے:

و اللہ نحن الصراط المستقیم

بخدا ہم صراطِ مستقیم ہیں[2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ نے فرمایا:

صراطِ مستقیم امیرالمومنین علیؑ ہیں[3]

یہ مسلم ہے کہ رسول اکرمؐ، امیرالمومنینؑ اور دیگر آئمہ اہل بیتؑ سب کے سب اسی آئین توحید کی دعوت دیتے رہے ہیں وہ دعوت جس میں اعتقاد بھی ہے اور عمل بھی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ راغب نے کتاب مفردات میں صراط کے معنی میں کہا ہے کہ صراط کے معنی ہیں سیدھا راستہ لہٰذا مستقیم ہونے کا مفہوم خود صراط میں مضمر ہے گویا مستقیم ساتھ بطور صفت ہے جو اس نکتے پر تاکید کے مفہوم میں ہے۔

۷۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کہ جو گمراہ ہو گئے۔

تفسیر

دو انحرافی خطوط

یہ آیت حقیقت میں صراطِ مستقیم کی واضح تفسیر ہے جسے ہم گذشتہ آیت کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں۔ دعا ہے کہ مجھے ان لوگوں کے راستے کی ہدایت فرما جنہیں قسم قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے (نعمتِ ہدایت و نعمتِ توفیق، مردانِ حق کی رہبری کی نعمت، نعمتِ علم و عمل اور نعمتِ جہاد و شہادت)۔ ان لوگوں کی راہ نہیں جن کے بُرے اعمال اور ٹیڑھے عقائد کے باعث تیرا غضب انہیں

---

[1] تفسیر نورالثقلین، ج ۱، ص ۲۰، ۲۱

[2] ایضاً

[3] ایضاً

دامن گیر ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کی راہ جو شاہراہ حق کو چھوڑ کر بے راہ روی کے عالم میں ہیں، گمراہ و سرگرداں ہیں صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہم راہ و رسم ہدایت سے پورے طور سے آشنا نہیں لہٰذا خدا ہمیں دستور ہدایت دے رہا ہے کہ ہم انبیاء، صالحین اور دیگر وہ لوگ جو نعمت والطاف الٰہی سے نوازے گئے ہیں ان کے راستے کی خواہش کریں۔ نیز ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے سامنے دو ٹیڑھے خطوط موجود ہیں، خطِ مغضوب علیھم اور خطِ ضالین ان دونوں کی تفسیر ہم بہت جلد ذکر کریں گے۔

چند اہم نکات

(۱) الذین انعمت علیھم کون ہیں: سورۂ نساء آیت ۶۹ میں اس گروہ کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ

جو لوگ خدا و رسول کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں خدا انہیں ان لوگوں کے ساتھ قرار دے گا جنہیں نعمات سے نوازا گیا ہے اور وہ ہیں انبیاء، صدیقین، شہدائے راہ حق اور صالح انسان اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں اس آیت میں شاید اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک صحیح و سالم، ترقی یافتہ اور مومن معاشرے کی تشکیل کے لئے پہلے انبیاء اور رہبرانِ حق کو میدان عمل میں آنا چاہیئے ان کے بعد سچے اور راست باز مبلغ ہوں جن کی گفتار اور کردار میں ہم آہنگی ہو تا کہ وہ اس راستے سے انبیاء کے مقاصد کو تمام اطراف میں پھیلا دیں۔ فکری تربیت کے اس پروگرام پر عمل درآمد کے دوران میں بعض گمراہ عناصر راہ حق میں حائل ہونے کی کوشش کریں گے۔ ان کے مقابل ایک گروہ کو قیام کرنا چاہیئے ان میں سے کچھ لوگ شہید ہوں گے اور اپنے خونِ مقدس سے شجرِ توحید کی آبیاری کریں گے۔ چوتھے مرحلے میں ان کوششوں کے نتیجے میں صالح لوگ وجود میں آئیں گے اور یوں ایک پاک و پاکیزہ، شائستہ اور معنویت و روحانیت سے پُر معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

اس لئے ہم روزانہ صبح و شام سورہ حمد میں پے بہ پے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم بھی ان چار گروہوں کے طریقِ حق کے راہی قرار پائیں حق کا راستہ انبیاء کا راستہ، صدیقین کا راستہ، شہداء کا راستہ اور صالحین کا راستہ ہے۔

واضح ہے کہ ہر زمانے کو انجام تک پہنچانے کے لئے ہمیں ان میں سے کسی خط کی پیروی میں اپنی ذمہ داری کو انجام دینا ہوگا۔

(۲) مغضوب علیھم اور ضالین کون ہیں: ان دونوں کو آیت میں الگ الگ بیان کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے۔

دونوں میں فرق کے سلسلے میں تین تفسیریں موجود ہیں:

(۱) قرآن مجید میں دونوں الفاظ کے استعمال کے مواقع سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغضوب علیھم کا مرحلہ ضالین سے سخت تر اور

بدتر ہے۔ بالفاظ دیگر ضالین سے مراد عام گمراہ لوگ ہیں اور مغضوب علیہم سے مراد بدترج گمراہی پر مصر یا منافق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک موقعوں پر ایسے لوگوں کے لئے خدا کے غضب اور لعنت کا ذکر ہوا ہے۔

سورۂ نحل آیت ۱۰۶ میں ہے:

وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ

جنہوں نے کفر کے لئے اپنے سینوں کو کھول رکھا ہے ان پر اللہ کا غضب ہے۔

سورۂ فتح آیت ۶ میں ہے:

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ

منافق مرد اور عورتیں اور مشرک مرد اور عورتیں جو خدا کے بارے میں بُرے گمان کرتے ہیں خدا ان سب پر عذاب نازل کرے گا۔ ان سب پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے وہ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھتا ہے اور انہی کے لئے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

بہرحال مغضوب علیہم وہ ہیں جو راہ کفر میں لجاجت و عناد اور حق سے دشمنی رکھنے کے علاوہ رہبران الٰہی اور انبیاء مرسلین کو ہر ممکن اذیت و آزار پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

سورۂ آل عمران آیت ۱۱۲ میں ہے:

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

ان (یہودیوں) پر خدا کا غضب ہوا اور انہیں رسوائی نصیب ہوئی کیونکہ وہ انبیاء الٰہی کو ناحق قتل کرتے تھے اور حدود شریعت سے تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے۔

(۲) مفسرین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ضالین سے مراد عیسائی اور مغضوب علیہم سے مراد یہودی ہیں یہ نظریہ ان دونوں گروہوں کے دعوت اسلام کے مقابلے میں رد عمل کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ قرآن جس طرح مختلف آیات میں صراحت کے ساتھ یاد دہانی کراتا ہے کہ یہودی دعوت اسلام کے بارے میں مخصوص کینہ و عداوت کا مظاہرہ کرتے تھے اگرچہ ابتدا میں انہی کے علماء لوگوں کو اسلام کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ کئی ایک وجوہ (جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں) کی بناء پر وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہو گئے ان وجوہ میں ایک ان کے مادی مفادات کا خطرے میں پڑ جانا بھی تھا۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی پیش رفت روکنے کے لئے ہر ممکن رکاوٹیں کھڑی کرتے (آج بھی صیہونیوں کا مسلمانوں کے بارے میں وہی طریق کار ہے)۔

ان حالات میں انہیں مغضوب علیہم سے تعبیر کرنا درست معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہ تعبیر حقیقت میں ان کے عمل کے باعث تطبیق کی صورت ہے نہ کہ مغضوب علیہم سے صرف یہودی مراد ہیں۔ رہے نصاریٰ تو اسلام کے بارے میں ان کا موقف

اس قدر سخت نہ تھا بلکہ وہ فقط آئین حق کی پہچان میں گمراہ تھے لہٰذا لفظ ضالین سے عیسائی مراد لئے گئے ہیں اور یہ بھی ایک تطبیق ہے۔

احادیث اسلامی میں بارہا مغضوب علیہم سے یہودی اور ضالین سے عیسائی مراد لئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے۔[1]

(iii) یہ احتمال بھی ہے کہ ضالین سے وہ گمراہ لوگ مراد ہیں جو دوسروں کو گمراہ کرنے پر مصر نہیں جب کہ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جو خود تو گمراہ ہیں ہی دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنا ہم رنگ بنانے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں۔

اس بات کی دلیل وہ آیات ہیں جو ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو راہ راست کی ہدایت حاصل کرنے کے لئے کوشاں دوسرے لوگوں کے درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے:

یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو راہ خدا سے روکتے ہیں۔ (اعراف۔ ۴۵)

سورۂ شوریٰ آیت ۱۶ کے الفاظ ہیں:

وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُہُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ وَعَلَیْہِمْ غَضَبٌ وَّلَہُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ہ

وہ لوگ جو مومنین کی طرف سے دعوت اسلام قبول ہونے کے بعد نبی اکرمؐ سے جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں۔ خدا کے ہاں ان کی دلیل و حجت بے اساس ہے۔ ان پر اللہ کا غضب ہے اور سخت عذاب اُن کا منتظر ہے۔

باوجود اس کے یوں نظر آتا ہے کہ ان تفاسیر میں جامع تر دہی پہلی تفسیر ہے وہ ایسی تفسیر ہے جس میں باقی تفسیریں بھی مجتمع ہیں۔ حقیقت میں باقی تفاسیر اس کے مصادیق میں شمار ہوتی ہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم آیت کے وسیع مفہوم کو محدود کریں۔

والحمد للہ رب العالمین

(تفسیر سورۂ حمد اختتام کو پہنچی)

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱، ص ۲۴، ۲۳

سورۃ بقرہ کے موضوعات

یہ سورت جو قرآن مجید کی طویل ترین سورتوں میں سے ہے مسلماً تمام کی تمام یک دم نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف وقفوں سے مدینہ میں اسلامی معاشرے کی گوناگوں ضروریات کے مطابق نازل ہوئی۔

اس کے باوجود اسلام کے اصول، اعتقاد اور بہت سے عملی مسائل کی رو سے (جن میں عبادتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل شامل ہیں) اس کی جامعیت ناقابل انکار ہے۔ اس کے موضوعات ایک نظر میں یہ ہیں:

(۱) توحید اور خدا شناسی سے متعلق بحثیں خصوصاً وہ جو اسرار آفرینش کے موضوع سے متعلق ہیں۔

(۲) قیامت اور موت کے بعد سے متعلق بحثیں بالخصوص حسی مثالیں، جیسے حضرت ابراہیم کا واقعہ: پرندوں کا مرنے کے بعد زندہ ہونا اور حضرت عزیر کا واقعہ۔

(۳) قرآن کے معجزہ ہونے کی بحثیں اور اس آسمانی کتاب کی اہمیت۔

(۴) یہودیوں اور منافقین کے بارے میں مفصل اور طویل بحثیں، اسلام اور قرآن کے بارے میں ان کے مخصوص اعتراضات اور اس سلسلے میں ان کی کارستانیاں اور رکاوٹیں۔

(۵) بڑے بڑے انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی تاریخ کے سلسلے کی بحثیں۔

(۶) اسلام کے مختلف احکام سے متعلق ابحاث۔ جن میں نماز، روزہ، جہاد فی سبیل اللہ، حج، تغییر قبلہ، نکاح، طلاق، احکام تجارت و قرض، سود کے بعض اہم احکام اور بہت سی دیگر مخصوص بحثیں شامل ہیں۔

راہ خدا میں خرچ، مسئلہ قصاص، کئی ایک حرام گوشت، قمار، حرمت شراب، بعض احکام وصیت وغیرہ بھی اس کے موضوعات میں سے ہیں۔

اس کے نام — البقرہ — کی بناء ایک واقعہ ہے جو بنی اسرائیل میں ایک گائے کے سلسلے میں ہے جس کی تفصیل آیت ۶۷ تا ۷۳ میں انشاء اللہ آئے گی۔

سورۃ بقرہ کی فضیلت

اس سورت کی فضیلت سے متعلق کتب اسلامی میں بہت سی روایات موجود ہیں اس سلسلے میں مرحوم طبرسی نے ایک روایت رسول اکرمؐ سے مجمع البیان میں نقل کی ہے۔

آپؐ سے پوچھا گیا:

ای سورۃ القرآن افضل ؟
(قرآن کی کون سی سورت افضل ہے ؟)
قال البقرۃ
(فرمایا : سورہ بقرہ)
قیل ای آیۃ البقرۃ افضل ؟
(عرض کیا گیا سورہ بقرہ کی کون سی آیت افضل ہے ؟)
قال آیۃ الکرسی
(فرمایا : آیۃ الکرسی)[1]

ظاہراً اس سورت کی فضیلت اس کی جامعیت کی وجہ سے ہے اور آیۃ الکرسی کی فضیلت اس بناء پر ہے کہ اس میں توحید کے بارے میں بعض اہم امور بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل انشاءاللہ اس کی تفسیر میں آئے گی۔

یہ بات اس سے اختلاف نہیں رکھتی کہ قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی کئی ایک جہات کی وجہ سے برتری بیان ہوئی ہے کیونکہ ان کی یہ فضیلت دیگر وجوہ کے پیش نظر ہے۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کی وساطت سے رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

جو شخص سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات ، آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور اس سورہ کی آخری تین آیات پڑھے وہ کبھی بھی اپنی جان و مال میں ناخوشگواری نہ پائے گا ۔ شیطان اس کے نزدیک نہیں آئے گا اور وہ قرآن کو نہیں بھولے گا ۔[2]

ہم یہاں اس اہم حقیقت کا تکرار ضروری سمجھتے ہیں کہ تلاوت قرآن یا سورتوں اور مخصوص آیات کے لئے جو ثواب ، فضیلتیں اور اہم فائدے بیان ہوئے ہیں ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان انہیں بطور ورد پڑھے اور صرف زبان چلانے پر اکتفاء کرے بلکہ قرآن کا پڑھنا سمجھنے کے لئے اور سمجھنا غور و فکر کے لئے ہے اور غور و فکر عمل کرنے کے لئے ہے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو فضیلت کسی سورت یا آیت کے متعلق ذکر ہوئی ہے وہ اس سورت یا آیت کے موضوع سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے ۔

مثلاً ہم سورۂ نور کی فضیلت کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ جو اسے پڑھے گا خداوند عالم اسے اور اس کی اولاد کو زنا کی آلودگی سے محفوظ رکھے گا ۔ تو یہ اس بناء پر ہے کہ سورۂ نور کے مضامین میں جنسی کج رویوں سے مقابلے کے لئے اہم رہنمائی موجود ہے ۔ مجرد اشخاص کو جلد شادی کرنے کا حکم ہے ، پردے کا حکم ہے ، بری نگاہ اور ہوس رانی کی نگاہ ترک کرنے کا حکم ہے ، نارواا ور غلط نسبتوں کی ممانعت ہے اور آخر میں زناکار مردوں اور عورتوں کے لئے حد شرعی کے اجراء کا حکم دیا گیا ہے ۔

---

[1] نور الثقلین ، ج ۱ ، ص ۲۶ ، مجمع البیان ج ۱ ، ص ۳۲
[2] نور الثقلین ج ۱ ، ص ۲۶ ، بحوالہ کتاب ثواب الاعمال ۔

واضح ہے کہ سورۂ نور کے مفاہیم و موضوعات کسی معاشرے یا خاندان میں عملی جامہ پہن لیں تو وہ زنا سے آلودہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح سورہ بقرہ کی وہ آیات جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے سب توحید، ایمان بالغیب، خداشناسی اور شیطانی وسوسوں سے پرہیز کے بارے میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دل و جان سے ان پر عمل پیرا ہو تو یقیناً سب فضائل مذکورہ سے حاصل ہوں گے۔

یہ درست ہے کہ قرآن کا پڑھنا ہر حال باعث ثواب ہے لیکن اصل، اساسی اور آثار چھوڑنے والا ثواب اسی وقت ملے گا جب تلاوت غور و فکر اور عمل کے لئے مقدمہ و تمہید ہو۔

سورۂ بقرہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ الٓمٓ ۝

۲۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ: شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ ال م

۲۔ یہ وہ باعظمت کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ پرہیزگاروں کی ہدایت کی بنیاد ہے۔

تفسیر

قرآن کے حروف مقطعات کے متعلق تحقیق

انیس ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں ہمیں حروف مقطعات دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ حروف ایک دوسرے سے منقطع اور الگ الگ ہیں اور ان سے کوئی ایسا لفظ نہیں بنتا جو کچھ مل سکے۔ قرآن کے حروف مقطعات ہمیشہ قرآن کے اسرار آمیز کلمات میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ مفسرین نے ان کی کئی ایک تفاسیر بیان کی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور علماء کی جدید تحقیقات سے ان کی نئی تفسیریں سامنے آئیں گی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا کہ جہالِ عرب اور مشرکین نے قرآن کی کئی ایک سورتوں کی ابتداء میں موجود ان حروف مقطعات کی وجہ سے رسول اکرم پر اعتراض کیا ہو یا ان کے باعث استہزاء و تمسخر کیا ہو۔ یہ امر اس بات کی خبر دیتا ہے کہ گویا وہ لوگ بھی حروف مقطعات کے وجود کے اسرار سے بالکل بے خبر نہ تھے۔

بہر حال تفاسیر مذکورہ میں سے چند ایک ایسی ہیں جو زیادہ اہم اور معتبر لگتی ہیں اور وہ اس سلسلے کی آخری تحقیقات سے ہم آہنگ ہیں ہم چند ایک کو تدریجاً اس سورت، آل عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اس وقت ان میں سے اہم ترین کا ذکر کیا جا رہا ہے:

یہ حروف اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب اس عظمت و اہمیت کے باوجود کہ اس نے عرب و عجم کے تمام

سخنوروں کو حیران کردیا ہے۔ اور علماء و محققین کو عاجز کردیا ہے انہی حروف کا مجموعہ ہے جن کا استعمال سب کے اختیار میں ہے۔

باوجودیکہ قرآن انہی حروف الف با اور عام کلمات سے مرکب ہے لیکن یہ ایسے موزوں کلمات اور عظیم معانی کا حامل ہے جو انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں انسان کی روح تحسین اور تحسین کی کیفیات سے روبرو ہو جاتی ہے اور اس کے مطالعے سے افکار و عقول ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی جملہ بندی مرتب ہے۔ اس کے کلمات بلند ترین خیالات کے حامل ہیں اور اس میں بلند معانی زیبا ترین الفاظ کے قالب میں اس طرح سے ڈھلے ہوئے ہیں جس کی کوئی مثل و نظیر نہیں ملتی۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بات صرف دعویٰ نہیں کیونکہ خالق کائنات جس نے اس کتاب کو اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے اس نے تمام انسانوں کو اس کی مثل پیش کرنے کی دعوت دی ہے اور ان سے کہا ہے کہ اس جیسا قرآن یا اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ۔ اس نے دعوت دی ہے کہ تمام جہانوں کے باسی (جن و انس) ہم کلام و ہم فکر ہو کر اس کی نظیر پیش کریں۔ لیکن سب کے سب عاجز و ناتواں رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن فکر انسانی کی تخلیق نہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے خداوند عظیم نے اس مٹی سے انسان کو اس تعجب خیز جسم کے ساتھ تخلیق کیا، قسم قسم کے خوبصورت پرندے اور جانور پیدا کئے، طرح طرح کے سبزے اور رنگ برنگے پھول بنائے اور انہی کی طرح اور موجودات کو پیدا کیا اور ہم اس مٹی سے پیالے، کوزے اور اسی قسم کی چیزیں بناتے ہیں۔ ایسے ہی خداوند تعالیٰ حروف الف با، اور معمولی کلمات سے بلند ترین مطالب و معانی کو خوبصورت الفاظ اور موزوں کلمات کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور انہیں ایسا اسلوب دیتا ہے جس سے تمام انگشت بدنداں ہیں۔ بیشک یہی حروف انسانوں کے اختیار میں بھی ہیں لیکن ان میں یہ طاقت نہیں کہ قرآن جیسی تراکیب اور جملہ بندی ایجاد کرسکیں۔

ادبیات عرب کا عہد زریں

یہ بات قابل غور ہے کہ زمانہ جاہلیت ادبیات کے لحاظ سے ایک عہد زریں تھا۔ (عرب) باوجود اور نیم وحشی بادیہ نشینی کے تمام تر اقتصادی و معاشرتی محرومیوں کے باوجود ادبی ذوق اور سخن سنجی سے سرشار تھے۔ یہاں تک کہ آج بھی ان کے اشعار اُن کے سنہری زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے بہترین اور قیمتی اشعار ادبیات عرب کا سرمایہ ہیں اور حقیقی عربی ادب کے متلاشیوں کے لئے ایک گراں بہا ذخیرہ ہیں۔ یہ بات اس وقت کے عربوں کے تفوق ادبی اور ذوق سخن پروری کی بہترین دلیل ہے۔

عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں ایک سالانہ میلہ لگتا تھا جو بازار عکاظ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ایک ادبی اجتماع کے ساتھ ساتھ سیاسی و عدالتی کانفرنس بھی تھی۔ اسی بازار میں چیدہ چیدہ اقتصادی سودے بھی ہوتے۔ شعراء اور سخنور اپنی اپنی تخلیقات اس کانفرنس میں پیش کرتے ان میں سے بہترین کا انتخاب ہوتا جسے شعر سال کا اعزاز حاصل ہوتا۔ ان میں سے سات یا دس قصیدے سبعہ یا عشرہ معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس عظیم الشان ادبی مقابلے میں کامیاب شاعر اور اس کے قبیلے کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تصور کی جاتی تھی۔

ایسے زمانے میں قرآن نے اپنی مثل لانے کی دعوت انہی لوگوں کو دی اور سب نے اظہار عجز کیا اور اس کے سامنے سر جھکا

لئے اس کی مزید تشریح اسی سورۃ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں آئے گی جہاں قرآن کے چیلنج اور عرب سخنوروں کے عجز کا تذکرہ ہے۔

واضح گواہ

حروف مقطعہ کی اس تفسیر کا زندہ ثبوت وہ حدیث ہے جو امام سجاد علی بن الحسین علیہما السلام سے منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

کذب قریش والیھود بالقران وقالوا سحر مبین تقوله فقال الله، الٓمّٓ ، ذلك الكتاب . . . ای یا محمد ھذا الکتاب الذی انزلته الیك الحروف المقطعة التی منھا الف ولام و م وھو بلغتکم فاتوا بمثله ان کنتم صٰدقین . . . .

قریش اور یہودیوں نے یہ کہہ کر قرآن کی طرف غلط نسبت دی کہ قرآن جادو ہے یہ خود ساختہ ہے اور اسے خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ خدا نے انہیں خبردار کیا اور فرمایا الٓمّٓ ذلك الكتاب یعنی اے محمد جو کتاب ہم نے آپ پر نازل کی ہے وہ انہی حروف مقطعہ (الف، لام، م) وغیرہ پر مشتمل ہے جو تمہارے زیر استعمال ہیں . . . اور اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل پیش کر دو۔[1]

دوسری شہادت وہ حدیث ہے جو امام علی ابن موسیٰ رضا سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ثم قال: ان الله تبارك وتعالٰی انزل ھذا القران بھذہ الحروف التی یتداولھا جمیع العرب ثم قال: قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القران

خداوند تعالیٰ نے قرآن کو انہی حروف میں نازل فرمایا جنہیں تمام اہل عرب بولتے ہیں۔ پھر فرمایا: ان سے کہیے کہ اگر انس و جن قرآن کی مثل لانے کے لئے جمع ہو جائیں تب بھی وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے۔[2]

ایک اور نکتہ جو قرآن کے حروف مقطعہ کے بارے میں اس نظریے کی تائید کرتا ہے یہ ہے کہ قرآن میں ۲۴ مقامات ایسے ہیں جہاں سورتوں کی ابتدا جب ان حروف سے ہوتی ہے تو بلا فاصلہ قرآن اور اس کی عظمت سے متعلق گفتگو شروع ہو جاتی ہے یہ بات خود نشاندہی کرتی ہے کہ حروف مقطعہ اور قرآن میں ربط موجود ہے۔

ایسے چند ایک مقامات یہ ہیں:

(۱) الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝

(۲) طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۳) الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝

---

[1] تفسیر برہان، جلد اول، ص۵۴

[2] توحید صدوق ص ۱۶۲ طبع ...

(۴) الٓمٓصٓ ۚ کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ....

ان موارد میں قرآن کی دیگر سورتوں کے آغاز میں بہت سے مواقع پر حروف مقطعہ کے ذکر کے بعد قرآن سے متعلق بات کی گئی ہے اور اس کی عظمت بیان ہوئی ہے۔

اس سورہ (بقرہ) کے آغاز میں بھی حروف مقطعہ کو بیان کرنے کے بعد اس آسمانی کتب کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ وہی باعظمت کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ (ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ)

یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ خدا نے اپنے رسول سے وعدہ کیا ہو کہ وہ انسانوں کی رہنمائی کے لئے اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جو تمام طالبانِ حق کے لئے باعثِ ہدایت ہوگی اور حقیقت کے متلاشیوں کے لئے اس میں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا۔ اور اب اس نے اپنے اس وعدے کو ایفا کیا ہو۔

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں صرف ایک دعویٰ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ اس قرآن میں ہے وہ خود اپنی حقانیت پر گواہی دیتا ہے۔ گویا عطار کے صندوقچہ کی طرح ہے، خاموش ہے مگر اپنا کمال دکھا رہا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح سے آثارِ صدق و عظمت، نظم و استحکام، معانی کی گہرائی، الفاظ و تعبیرات کی مٹھاس اور فصاحت اس میں نمایاں ہے کہ ہر قسم کا وسوسہ اور شک دور ہوتا چلا جاتا ہے اور "آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است" کا مصداق ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رفتارِ زمانہ نہ فقط اس شگفتگی و تازگی کو کم نہیں کر سکی بلکہ علوم کی پیش رفت اور اسرارِ کائنات کے آشکار ہونے سے اس کے حقایق روشن تر ہوتے جا رہے ہیں اور علم جتنا کامل ہو رہا ہے اس کی آیات زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس سے ہم انشاء اللہ اسی تفسیر میں آگاہ ہوں گے۔

چند اہم نکات

(۱) دور کا اشارہ کیوں ؟ : ہمیں معلوم ہے کہ لفظ 'ذٰلک' لغت عرب میں دور کے لئے اسم اشارہ ہے۔ اس بناء پر 'ذٰلک الکتاب' کا مفہوم ہے 'وہ کتاب' حالانکہ یہاں نزدیک کے اسم اشارہ سے استفادہ کیا جانا چاہیئے تھا اور 'ھٰذا الکتٰب' ہونا چاہیئے تھا کیونکہ قرآن لوگوں کی دسترس میں تھا۔ یہ اس لئے ہوا کہ کبھی بعید کا اسم اشارہ کسی چیز یا شخص کی عظمت کے پیشِ نظر استعمال کیا جاتا ہے گویا اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ آسمانوں کی بلندی کا حامل ہے۔ فارسی میں بھی ایسی تعبیرات موجود ہیں۔ مثلاً کسی عظیم شخصیت کے حضور میں ہم کہتے ہیں :

"اگر آن سرور اجازہ دہند"

یعنی "اگر وہ سردار اجازت دیں"

حالانکہ یہاں 'این سرور' یعنی 'یہ سردار' کہنا چاہیئے۔ یہ صرف بیانِ عظمت اور مقامِ بلند کے باعث ہے۔ کئی ایک دوسری آیات میں بھی تلک کا استعمال ہوا ہے اور یہ بھی اشارہ بعید ہے مثلاً

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ (لقمان ۲)

(۲) معنیٰ "کتاب": کتاب بمعنی مکتوب ہے یعنی لکھی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔

اب یہاں یہ سوال سامنے آئے گا کہ کیا اُس وقت تمام قرآن لکھا ہوا تھا۔ اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ تمام قرآن کا لکھا ہونا ضروری نہیں کیونکہ قرآن جس طرح اس پوری کتاب کو کہا جاتا ہے اس کے اجزا کو بھی کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں لفظ کتاب بعض اوقات اس سے زیادہ وسیع معنی میں بولا جاتا ہے۔ وہ مطالب جو لکھنے کے قابل ہیں اور جنہیں لکھا جاتا ہے چاہے اس وقت وہ لکھے گئے ہوں۔ سورہ ص آیہ ۲۹ میں ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا

یعنی... یہ کتاب جسے ہم نے آپ پر نازل کیا بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر و تفکر کریں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ کتاب سے تعبیر کرنا قرآن کے لوح محفوظ میں لکھے ہونے کی طرف اشارہ ہو (لوح محفوظ کے بارے میں بحث ہم اس کی جگہ پر کریں گے)۔[1]

(۳) ہدایت کیا ہے؟: لفظ ہدایت قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس کی بنیاد دو معانی ہیں:

(۱) ہدایت تکوینی — جو تمام موجوداتِ عالم میں پائی جاتی ہے (اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو تمام موجودات نظام خلقت کے تحت عالم ہستی کے قوانین کی پابندی کے ساتھ پروردگار عالم سے حاصل کرتی ہیں)۔

قرآن مجید اس ضمن میں حضرت موسیٰ کا قول بیان کرتا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

حضرت موسیٰ نے کہا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کی۔

(طٰہٰ ۵۰)

(۲) ہدایت تشریعی — جو انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعے انجام پذیر ہوتی ہے اور نوعِ انسانی ان کی تعلیم و تربیت سے ترقی کی راہیں طے کرتی ہے۔ اس کے شواہد بھی قرآن میں بہت سے ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

انہیں ہم نے رہنما قرار دیا تاکہ ہمارے فرمان کے مطابق لوگوں کو ہدایت کریں۔ (انبیاء ۷۳)

(۴) قرآنی ہدایت پرہیزگاروں کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟: یہ مسلّم ہے کہ قرآن تمام دنیا کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا آیت میں اس کی ہدایت کو پرہیزگاروں کے ساتھ کیوں مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک تقویٰ کا کچھ حصہ انسان میں موجود نہ ہو اس کے لئے آسمانی کتابوں اور انبیاء کی دعوت

---

[1] ذیل آیت ۳۹، سورہ رعد، تفسیر نمونہ

سے ہدایت کا حصول محال ہے (تقویٰ کے کچھ حصے سے مراد یہ ہے کہ انسان عقل و فطرت کی روشنی میں حق کو پہچان سکے اور پھر اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم بھی کر دے)۔

بالفاظ دیگر جن لوگوں کے پاس ایمان نہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو حق کی تلاش میں ہیں اور اس قدر تقویٰ ان میں موجود ہے کہ جہاں کہیں حق کو پائیں گے اسے قبول کرلیں گے اور دوسرا حصہ وہ جو ہٹ دھرم، متعصب اور ہوا پرست لوگوں پر مشتمل ہے جو نہ صرف یہ کہ تلاش حق نہیں کرتے بلکہ جہاں کہیں اسے دیکھیں گے اسے ختم کر دینے کے درپے ہوں گے اب یہ مسلم ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتب صرف پہلے گروہ کے لئے مفید تعلیمات رکھتی ہیں اور دوسرا گروہ ان کی ہدایت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ گویا فاعل کی فاعلیت کے علاوہ قبول کرنے والے میں قبولیت کی شرط بھی ہے۔ فرق نہیں کہ ہدایت تکوینی ہو یا ہدایت تشریعی

زمین شورہ زار ہرگز سنبل بر نیارد
اگر چہ ہزاران مرتبہ باران بر آن بیارد

یعنی — شورہ دار زمین سے فصل نہیں اگتی چاہے ہزاروں مرتبہ اس پر بارش برسے۔

بلکہ ضروری ہے کہ زمین آمادہ ہو تاکہ وہ بارش کے حیات بخش قطروں سے بہرہ ور ہو سکے۔

وجود انسانی کی سرزمین بھی جب تک ہٹ دھرمی، عناد اور تعصب سے پاک نہ ہو ہدایت کے بیج کو قبول نہیں کرے گی۔ اسی بناء پر ارشادِ الٰہی ہے کہ — قرآن متقی لوگوں کے لئے ہادی و رہنما ہے۔

۳۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝

۴۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ؕ

۵۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ۗ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۔ پرہیزگار وہ ہیں جو غیب (جس کا حواس ادراک نہیں کر سکتے) پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ان تمام نعمتوں اور

عطیوں میں سے جو ہم نے انہیں بطور روزی دیئے ہیں خرچ کرتے ہیں۔
۴۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ آپ سے قبل (انبیاء گزشتہ پر) نازل ہو چکا ایمان رکھتے ہیں۔
۵۔ انہیں خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

تفسیر

روح وجسم انسانی میں آثار تقویٰ

قرآن اس سورۃ کی ابتداء میں اسلامی آئین اور پروگرام سے مربوط ہونے کے لحاظ سے لوگوں کو تین مختلف گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔

(۱) متقین (پرہیزگار) — جو اسلام کو مکمل طور پر قبول کرتے ہیں۔

(۲) کافرین — جو پہلے گروہ کے مدمقابل کھڑے ہیں، اپنے کفر کے معترف ہیں اور اسلام کے مقابلے میں دشمنی کی گفتار و رفتار سے انکاری نہیں ہیں۔

(۳) منافقین — جو دو رُخ اور دو چہرے رکھتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ ظاہراً مسلمان ہیں اور گروہ مخالف کے ساتھ ہوں تو مخالف اسلام۔ البتہ ان کا اصلی چہرہ وہی کفر والا ہے تاہم اسلام کی ظاہری چیزیں بھی اپناتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گروہ اسلام کے لئے دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ خطرناک ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اسی بناء پر قرآن ان پر بہت زیادہ نکتہ چینی کرتا ہے۔

البتہ یہ موضوع اسلام ہی سے مخصوص نہیں بلکہ تمام مکاتب و مذاہب عالم ان تین گروہوں سے واسطہ رکھتے ہیں کیونکہ کوئی شخص کسی مکتب کا مومن ہے یا واضح طور پر اس کا مخالف یا پھر منافق جسے اپنے کام سے کام ہے۔ نیز یہ مسئلہ کسی خاص زمانے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام ادوار عالم میں ایسا ہی رہا ہے۔

زیر بحث آیات میں پہلے گروہ کے متعلق گفتگو ہے۔ ان کی خصوصیات کو ایمان و عمل کے لحاظ سے پانچ عنوانات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۱) **غیب پر ایمان:** سب سے پہلے قرآن کہتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں (الذین یؤمنون بالغیب)۔ غیب و شہود ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ عالم شہود عالم محسوسات ہے اور عالم غیب ماوراء حس ہے۔ کیونکہ غیب کے معنی اصل میں پوشیدہ و پنہاں چیز کے ہیں۔ کیونکہ محسوسات سے ماوراء کی دنیا ہماری حس سے پوشیدہ ہے لہٰذا اسے غیب کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝

وہ خدا جو — غیب و شہود سب سے واقف ہے وہی مہربان (اور) رحیم ہے۔

غیب پر ایمان رکھنا دراصل وہ پہلا نقطہ ہے جو مومنین کو دوسروں سے جدا کرتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو آسمانی ادیان کے پیروکاروں کو خدا، وحی اور قیامت کے منکروں کے مقابلے میں کھڑا کرتا ہے۔ اسی بناء پر پرہیزگاروں کی پہلی خصوصیت کے طور پر ایمان بالغیب کا ذکر کیا گیا ہے۔

مومنین سرحد مادہ کو توڑ کر، اس محدود چار دیواری سے نکال لئے گئے ہیں اور وہ اس وسعت فکر و نظر کے باعث ایک بہت بڑے فوق العادہ جہان سے مربوط ہو گئے ہیں جبکہ ان کے مخالف مصر ہیں کہ انسان کو مادہ کی چار دیواری میں جانوروں کی طرح محدود رکھیں اور اس الٹی چال کو وہ تمدن کی پیش رفت اور ترقی کا نام دیتے ہیں۔

ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے ادراک و فکر کا مقابلہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ غیب پر ایمان رکھنے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جہان ہستی اس دنیا سے کہیں وسیع تر ہے جسے ہمارے حواس درک کرتے ہیں۔ اس جہان کے پیدا کرنے والے کا علم اور قدرت بے انتہا ہے اور اس کی عظمت و ادراک کی کوئی حد نہیں۔ وہ ازلی و ابدی ہے۔ اس نے عالم ایک بہت بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بنایا ہے۔

روح انسانی اور باقی حیوانات میں بہت بڑا فرق ہے۔ موت کے معنی نابود ہونا اور فنا ہونا نہیں بلکہ یہ انسان کی تکمیل کا ایک مرحلہ و منزل ہے۔ یہ ایک وسیع تر جہان دیکھنے کے لئے ایک دریچہ ہے جب کہ ایک مادی شخص اعتقاد رکھتا ہے کہ جہان ہستی اسی میں محدود ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ جتنا علوم طبیعی نے ہمارے لئے ثابت کیا ہے وہی کچھ کائنات ہے۔ قوانین طبیعت جبری قوانین کا ایک سلسلہ ہے جو بغیر کسی پروگرام یا منصوبے کے ظاہر ہو گیا۔ اس عالم کے پیدا کرنے والی قوت فی ذاتہ ایک چھوٹے سے بچے جتنی عقل و شعور بھی نہیں رکھتی۔ انسان بھی اس طبیعت کا ایک جزء ہے اور موت کے بعد اس کی ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ اس کا بدن منتشر ہو جائے گا اور اس کے اجزاء دوبارہ طبیعی مواد سے مل جائیں گے۔ انسان کے لئے بقاء نہیں ہے۔ اس کے اور عام حیوانات کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں[1]۔ کیا انسانوں کا ان دو متضاد طرز فکر ہوتے ہوئے ایک دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ آیا معاشرے میں ان کا طرز زندگی اور طریق کار ایک جیسا ہو سکتا ہے۔

پہلا شخص (مومن) حق و عدالت، خیر خواہی اور دوسروں کی مدد سے چشم پوشی نہیں کر سکتا لیکن دوسرے (مادی) شخص کے پاس ان امور کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں مگر جتنا اس کی آج یا کل کی مادی زندگی کا تقاضا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مومنین کے درمیان سچا بھائی چارہ، پاکیزہ افہام و تفہیم اور تعاون ہوتا ہے جب کہ جہاں پر مادی فکر کے حامل شخص کی حکمرانی ہے وہاں استبداد، استثمار، خونریزی، غارت گری اور تاراجی ہے۔

واضح ہوا کہ قرآن نے تقویٰ کا پہلا نقطہ ایمان بالغیب کو قرار دیا ہے تو اس کی یہی وجہ ہے جو بیان کی گئی ہے۔

کیا ایمان بالغیب سے مراد صرف ذات پاک پروردگار پر ایمان لانا ہے یا غیب یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے یعنی وحی، قیامت، فرشتے اور عالم حس سے ماوراء سب کچھ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف

---

[1] اقتباس از قرآن و آخرین پیامبر

ہے لیکن ہم نے ابھی کہا ہے کہ جہانِ ماورائے حس پر ایمان رکھنا مومنین اور کافرین میں نقطۂ اختلاف اور علیحدگی کا سبب ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غیب یہاں ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں آیت کی تعبیر بھی مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی قید موجود نہیں جو اسے کسی خاص معنی میں محدود کرے۔

اب اگر ہم اہلبیتؑ کی بعض روایات میں دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں غیب سے مراد امام غائب حضرت مہدی سلام اللہ علیہ لئے گئے ہیں[1] تو یہ بات ہماری گذشتہ گفتگو سے اختلاف نہیں رکھتی۔ امام مہدی علیہ السلام ہمارے عقیدے کی بناء پر زندہ وسلامت ہیں اور نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ آیات کی تفسیر کے سلسلے کی روایات جن کے بہت سے نمونے آپ ملاحظہ کریں گے زیادہ تر مخصوص مصادیق کے لئے بیان ہوئی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں ان مصادیق تک محدود کر دیا گیا ہے بلکہ مذکورہ روایات حقیقت میں ایمان بالغیب کی وسعت اور اس کے امام غائب تک کے شمول کو بیان کرتی ہے یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان بالغیب ممکن ہے زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے مصداق بھی پیدا کرے۔

(۲) **خدا سے رابطہ**: پرہیزگاروں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں (ویقیمون الصلوٰۃ)۔ نماز خدا سے رابطے کی ایک رمز ہے۔ مومنین جو جہانِ ماورائے طبیعت تک رسائی حاصل کر چکے ہیں نماز ان کا دائمی وہمیشگی رابطہ مبداء عظیم آفرینش سے برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ وہ فقط جہان ہستی کے خالق کے سامنے جھکتے ہیں لہذا بتوں کے سامنے خضوع کرنا یا جابروں اور ستمگروں کے سامنے جھکنا ان کی زندگی میں کیسے حائل ہو سکتا ہے۔

ایسا انسان احساس کرتا ہے کہ میں تمام مخلوقات سے آگے بڑھ گیا ہوں اور مجھے اس مقام تک رسائی حاصل ہوگئی ہے کہ خدا سے گفتگو کروں۔ یہ احساس اس کی تربیت کے لئے بہترین عامل ہے۔

جو شخص روزانہ کم از کم پانچ مرتبہ خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے اس کی فکر، اس کا عمل اور اس کی گفتار سب خدائی ہو جاتے ہیں، کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کی خواہش کے برخلاف قدم اٹھائے (لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ درگاہِ حق میں اس کا راز و نیاز دل و جان کے ساتھ ہو اور مکمل دلجمعی کے ساتھ وہ اس کی بارگاہ کا رُخ کرے)۔[2]

(۳) **انسانوں سے رابطہ**: مومنین وہ لوگ ہیں جو پروردگار کے ساتھ دائمی رابطے کے علاوہ خلق خدا سے بھی مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے قرآن ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے جو نعمتیں انہیں روزی کے طور پر عطا کی ہیں انہیں خرچ کرتے ہیں (ومما رزقنٰھم ینفقون)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "من اموالھم ینفقون" (اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں) بلکہ کہتا ہے مما رزقنٰھم ـــــ جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے ـــ اس طرح مسئلہ انفاق اور خرچ کرنے کو عمومیت دے دی گئی ہے گویا اس میں خدا کی مادی اور معنوی سب عنایتیں شامل ہیں۔ اس بناء پر پرہیزگار وہ ہیں جو نہ صرف اپنا مال بلکہ علم، عقل و

---

[1] نورالثقلین جلد اول ص۳۱

[2] اہمیت نماز اور اس کے بے شمار تربیتی آثار کے متعلق اسی تفسیر میں سورہ ہود کی آیہ ۱۱۴ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

دانش، جسمانی قوتیں، مقام اور منصب، اجتماعی عزت اپنا ہر قسم کا سرمایہ صاحبانِ حاجت پر خرچ کرتے ہیں اور اس خواہش کے بغیر کہ ان لوگوں سے اس کا کچھ عوض لے گا۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انفاق اور خرچ کرنا جہانِ آفرینش کا ایک عمومی قانون ہے یہ قانون خاص طور پر موجوداتِ زندہ میں نظر آتا ہے۔ مثلاً انسان کا دل صرف اپنے لئے کام نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ بدن کے تمام خلیوں پر خرچ کرتا ہے، مغز، جگر اور بدن انسانی کے کارخانے کا ہر جزء اپنے کام کے ماحصل کو ہمیشہ خرچ کرتا ہے۔ اصولی طور پر جو لِل جُل کر رہتے ہیں، انفاق کے بغیر اُن کی زندگی کا کوئی مفہوم نہیں [1]

دوسرے انسانوں سے رابطہ درحقیقت خدا سے ربط و تعلق کا نتیجہ ہے۔ جس انسان کا خدا سے تعلق ہے اور جو ومما رزقنٰھم کے مطابق روزی کو خدا کی عطا سمجھتا ہے، اسے اپنی پیدا کردہ نہیں سمجھتا بلکہ خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ چند دن کے لئے اس کے پاس بطورِ امانت ہے۔ وہ انفاق و بخشش سے تکلیف نہیں بلکہ راحت محسوس کرے گا کیونکہ اس نے خدا کی عطا خدا کے بندوں کو دی ہے البتہ اس کے مادی و معنوی نتائج و برکات خود حاصل کئے ہیں۔ یہ طرزِ فکر روحِ انسانی کو بخل و حسد سے پاک کر دیتا ہے اور تنازع کی دنیا کو تعاون کی دنیا میں بدل دیتا ہے۔ ایسی دنیا کہ جس میں ہر شخص اپنے آپ کو مقروض سمجھتے ہوئے وہ نعمات جو اس کے پاس ہیں حاجت مندوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ آفتاب کی طرح نور افشانی کرتا ہے اور کسی عوض کا خواہاں نہیں ہوتا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ امام صادقؑ نے ومما رزقنٰھم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

ان معناہ ومما علمناھم یبثون

یعنی جن علوم و احکام کی ہم نے انہیں تعلیم دی ہے وہ ان کی نشر و اشاعت کرتے ہیں اور جو ان کی احتیاج رکھتے ہیں انہیں تعلیم دیتے ہیں [2]

واضح ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انفاق اور خرچ کرنا علم کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ مسئلہ انفاق میں نگاہیں چونکہ مالی انفاق کی طرف متوجہ تھیں لہٰذا امام نے معنوی انفاق کا ذکر فرما کر اس مفہوم کی وسعت کو روشن کر دیا۔

ضمنی طور پر یہاں یہ بھی پورے طور پر واضح ہو گیا کہ زیرِ بحث آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد فقط زکوٰۃ واجب یا واجب و مستحب صدقات نہیں بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے جو ہر قسم کی بلا عوض مدد پر محیط ہے۔

(۴) پرہیزگاروں کی ایک اور خصوصیت: متقی انسانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام انبیاء اور خدائی پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ آپؐ پر اور آپؐ سے پہلے نازل ہوا ہے اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔ والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

---

[1] انفاق، اس کی اہمیت اور اس کے اثرات کی بحث اسی تفسیر کی جلد ۲ صفحہ ۱۸۱ تا ۲۰۸ آیات ۲۶۱ تا ۲۷۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] نور الثقلین و مجمع البیان ذیل آیہ مذکورہ۔

اس لحاظ سے قرآن نہ صرف یہ کہ اصول و اساس کی نظر سے دعوت انبیاء میں اختلاف نہیں سمجھتا بلکہ انہیں ایک ایسا معلم و مربی سمجھتا ہے جن میں سے ہر کوئی جہان انسانیت کی عظیم درسگاہ میں انسانوں کی تکمیل کے لئے قدم بڑھاتا ہے۔ انبیاء نہ صرف یہ کہ ادیانِ آسمانی کو فرقہ بندی اور نفاق کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ انسانوں کے درمیان رابطہ و تعلق کے لئے انہیں وسیلہ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس فکر و نظر کے حامل ہیں وہ اپنی روح کو تعصب سے پاک کر لیتے ہیں۔ پیغمبرانِ خدا جو کچھ انسانی ہدایت و تکمیل کے لئے لے کر آئے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں اور راہِ توحید کے سب ہادیوں اور رہنماؤں کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔

البتہ گزشتہ انبیاء کے دستورات پر ایمان انہیں اپنے لئے کو عمل کو آخری نبی کے آئین سے منطبق کرنے سے نہیں روکتا کیونکہ آخری نبی کا لایا ہوا آئین تکامل ادیان کے سلسلے کا آخری حلقہ ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے مرحلہ تکمیل میں قدم بڑھانے کی بجائے ہٹا لیے ہیں۔

(۵) قیامت پر ایمان: یہ وہ آخری صفت ہے جو پرہیزگاروں کی صفات کے سلسلے میں بیان ہوئی ہے فرمایا گیا ہے کہ وہ آخرت پر یقیناً ایمان رکھتے ہیں (وبالآخرۃ ھم یوقنون)۔

وہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان مہمل، عبث اور بے مقصد پیدا نہیں ہوا۔ اس کی تخلیق اس کے آگے بڑھنے کے لئے ہے اور اس کا سفر موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ اگر معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تو یقیناً چند دن کی زندگی کے لئے یہ شور و غوغا فضول اور بیکار تھا۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ پروردگار کی عدالت مطلقہ سب کے انتظار میں ہے اور یہ نہیں کہ اس دنیا میں ہمارے اعمال بے حساب اور بغیر جزا و سزا کے رہ جائیں۔

جب وہ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہا ہوتا ہے تو قیامت کا اعتقاد اس میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور کام کا بوجھ اس کے لئے باعث تکلیف نہیں رہتا بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کا استقبال کرتا ہے۔ حوادث کے مقابلے میں کوہ گراں کی مانند کھڑا ہو جاتا ہے۔ غیر عادلانہ سلوک کے مقابلے میں سر نہیں جھکاتا۔ وہ مطمئن ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے نیک و بد کام کی جزا و سزا ہے۔ موت کے بعد ایک زیادہ وسیع جہان کی طرف منتقل ہوتا ہے اور رحمت وسیع اور الطاف پروردگار سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

آخرت پر ایمان کا مطلب ہے عالمِ مادہ کی سرحد سے باہر نکل آنا اور ایک بلند تر عالم میں قدم رکھنا جو ایسا جہان ہے کہ یہ دنیا اس کے لئے کھیتی ہے وہاں کی زندگی کے لئے زیادہ آمادہ ہونے کے لئے یہ ایک تربیت گاہ ہے۔ اس دنیا کی زندگی آخری ہدف اور مقصد نہیں بلکہ یہ حقیقی زندگی کے لئے تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے جہان کی زندگی کو سازگار بنانے کے لئے اس جہان کی زندگی رحمِ مادر میں بچے کی زندگی کی طرح ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد کبھی بھی یہ زندگی نہیں رہا بلکہ یہ ایک زندگی کے لئے مقدمہ تکامل ہے۔ جب تک انسان جنین سے صحیح و سالم اور ہر قسم کے عیب سے پاک متولد نہ ہو بعد والی زندگی میں خوش بخت اور سعادت مند نہیں ہو سکتا۔

قیامت کا عقیدہ رکھنا انسان کی زندگی پر گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو شہامت و شجاعت بخشتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر انسان اس جہان کی زندگی میں افتخار کی بلندیوں تک پہنچتا ہے جو اسے خداوند عالم کی مقدس راہ میں "شہادت" سے حاصل ہوتا ہے اور یہ شہادت ایک صاحب ایمان انسان کے لئے محبوب ترین چیز ہے کیونکہ یہ دراصل ایک ابدی و جاودانی زندگی کی ابتداء ہے

قیامت پر ایمان انسان کو گناہ سے روکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے گناہ خدا اور آخرت پر ایمان کی نسبت معکوس رکھتے ہیں۔ یہ ایمان جتنا قوی ہو گا گناہ اتنے کم ہوں گے۔ سورہ ص آیہ ۲۶ میں حضرت داؤد سے خطاب الٰہی ہے:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۟

خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں خدائی راستے سے گمراہ کر دیں گی وہ لوگ جو راہ خدا سے گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ انہوں نے روزِ قیامت کو فراموش کر دیا ہے۔

گویا روزِ جزا کو بھول جانا قسم قسم کی سرکشی ظلم و ستم اور گناہوں کا پیش خیمہ ہے اور یہی چیزیں عذاب شدید کا سرچشمہ ہیں۔

زیر نظر آیات میں سے آخری ان لوگوں کے نتیجے اور انجام کار کی خبر دیتی ہے جن کی صفات گذشتہ پانچ آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں (اولئك علی هدی من ربهم) اور یہی کامیاب ہیں (واولئك هم المفلحون)۔

حقیقت میں ان کی ہدایت اور کامیابی کی ضمانت خدا کی طرف سے ہے۔ "من ربهم" کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن کہتا ہے "علی هدی من ربهم" یہ ایسے ہے گویا ہدایت خداوندی ایک سواری ہے جس پر وہ سوار ہیں اور اس سواری کی مدد سے وہ کامیابی اور سعادت کی طرف رواں دواں ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ لفظ "علی" عموماً تسلط، علو اور غلبے کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔

"هدی" (بصورت نکرہ) ضمناً اس ہدایت کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جو خدا کی طرف سے ان کے شامل حال ہے یعنی وہ بہت عظیم ہدایت پر فائز ہیں۔

هم المفلحون کی تعبیر علم معانی و بیان کے اصول کے پیش نظر دلیل حصر ہے یعنی کامیابی کا راستہ صرف انہی لوگوں کا راستہ ہے کیونکہ یہ لوگ پانچ مخصوص صفات اپنا کر ہدایت الٰہی سے سرفراز ہوئے ہیں[1]

چند اہم نکات

(۱) ایمان و عمل کی راہ میں تسلسل: گذشتہ آیات میں تمام جگہوں پر فعل مضارع سے استفادہ کیا گیا ہے جو عموماً استمرار و تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ یؤمنون بالغیب، یقیمون الصلوٰۃ، ینفقون، وبالاٰخرۃ هم یوقنون یہ اس امر کی

---

[1] صاحب تفسیر المنار معتقد ہیں کہ اولئك دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلا وہ جس میں ایمان بالغیب، قیام نماز اور انفاق کی صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرا وہ جو آسمانی وحی اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے کیونکہ یہ پانچ صفات ایک گروہ سے مخصوص ہیں اور ایک دوسرے سے متصل ہیں اور اس کے دو حصے کرنا درست نہیں۔

نشاندہی کرتا ہے کہ پرہیزگار اور سچے مومن وہ ہیں جو اپنے پروگرام میں ثبات و استمرار رکھتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز ان کی روح و فکر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ان سے اُن کے انسان ساز پروگراموں میں خلل پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ابتداء ہی سے حق طلبی کی روح رکھتے ہیں جو اس کا باعث بنتی ہے کہ وہ دعوت قرآن کے پیچھے جائیں اور پھر دعوت قرآن ان میں یہ پانچ صفات پیدا کر دیتی ہے۔

(۲) **حقیقت تقویٰ کیا ہے:** تقویٰ کا مادہ ہے "وقایۃ" جس کے معنی ہیں نگہداری یا محافظت۔[1] دوسرے لفظوں میں نظم و ضبط کی ایک ایسی اندرونی طاقت کا نام تقویٰ ہے جو سرکشیٔ شہوت کے مقابلے میں انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ قوت ایک ایسے مضبوط ہینڈل کا کام دیتی ہے جو وجود انسانی کی مشینری کو الٹ جانے کی جگہوں پر محفوظ رکھتا ہے اور خطرناک تیزیوں سے روکتا ہے۔

اسی لئے امیر المومنین علی تقویٰ کو خطرات گناہ کے مقابلے میں ایک مضبوط قلعے کا عنوان دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

اعلموا عباد اللہ ان التقویٰ دار حصن عزیز

اے اللہ کے بندو! جان لو کہ تقویٰ ایسا مضبوط قلعہ ہے جسے تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔[2]

اسلامی احادیث اور علماء اسلام کے کلمات میں حالت تقویٰ کے لئے بہت سی تشبیہات بیان ہوئی ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی فرماتے ہیں:

الا و ان التقویٰ مطایا ذلل حمل علیها اهلها و اعطوا ازمتها فاوردتهم الجنة

تقویٰ ایسے راہوار کی مانند ہے جس پر اس کا مالک سوار ہو اس کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اسے بہشت کے اندر پہنچا دے۔[3]

بعض نے تقویٰ کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی ہے جو کانٹوں بھری زمین سے گزر رہا ہو اور اس کوشش میں ہو کہ اپنا دامن بھی سنبھالے رکھے اور قدم بھی احتیاط سے اٹھائے تاکہ کوئی کانٹا اس کے دامن سے نہ الجھ جائے اور نہ ہی کوئی خار اس کے پاؤں میں چبھے۔

عبداللہ معتز نے اس کیفیت کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها   وکبیرها فهو التقیٰ

---

[1] راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ وقایہ کے معنی ہیں چیزوں کو ان امور سے محفوظ کرنا جو انہیں نقصان یا تکلیف پہنچائیں۔ لفظ تقویٰ کے معنی ہیں خطرات سے بچا کر روح کو ایک محافظ پردے میں رکھنا۔ تقویٰ کے معنی کبھی خوف بھی کئے جاتے ہیں حالانکہ خوف تو تقویٰ کا سبب ہے۔ عرف شریعت میں تقویٰ کا مطلب ہے اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھنا اور کمال تقویٰ یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۰

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶

۲- زاضع ھکماش فوق ار ... من الشوک یحذر ما یری
۳- لا تحقرون صغیرۃ ... ان الجبال من الحصیٰ

۱- سب چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے کہ حقیقت تقویٰ یہی ہے۔
۲- اس شخص کی طرح ہو جا جو خاردار زمین پر انتہائی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہے۔
۳- چھوٹے گناہوں کو چھوٹا سمجھ کر پہاڑ سنگریزوں ہی سے بنتا ہے[1]

ضمناً اس تشبیہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ تقویٰ یہ نہیں کہ انسان گوشہ نشین ہو جائے اور لوگوں سے میل جول ترک کر دے بلکہ معاشرہ میں رہتے ہوئے اگرچہ وہ غلیظ معاشرہ ہی کیوں نہ ہو اپنی حفاظت کرے۔

اسلام میں کسی کی شخصیت کے لئے معیار فضیلت و افتخار یہی تقویٰ ہے اور اسلام کا شعار زندہ ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

یعنی یقیناً خدا کے ہاں تم میں سے زیادہ صاحب عزت و تکریم وہی ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ (حجرات۔ ۱۳)

حضرت علی فرماتے ہیں:

ان تقوی اللّٰہ مفتاح سداد و ذخیرۃ معاد و عتق من کل ملکۃ و نجاۃ من کل ھلکۃ

تقویٰ اور خوف خدا ہر بند دروازے کی کلید ہے، قیامت کے لئے ذخیرہ ہے، شیطان کی بندگی سے آزادی کا سبب ہے اور ہر ہلاکت سے باعث نجات ہے[2]

ضمناً متوجہ رہیے گا کہ تقویٰ کی کئی ایک شاخیں اور شعبے ہیں مثلاً تقویٰ مالی، تقویٰ اقتصادی، تقویٰ جنسی، تقویٰ اجتماعی اور تقویٰ سیاسی وغیرہ۔

۶- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○

۷- خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد اول صفحہ ۶۲
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۰

ترجمہ

۶۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۷۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ایک بڑا عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

تفسیر

دوسرا گروہ سرکش کفار کا ہے

یہ گروہ ان پرہیزگار انسانوں کے بالکل برعکس ہے جن کی صفات گذشتہ دو آیات میں پوری وضاحت سے بیان ہوئی ہیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی میں ہے کہ جو کافر ہیں (اور ساتھ اپنے کفر و بے ایمانی پر مُصر ہیں) ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ انہیں عذاب الٰہی سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کیونکہ وہ تو ایمان لانے کے نہیں (ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون)۔

پہلا گروہ حواس و ادراک کے ساتھ پوری طرح تیار تھا کہ وہ حق کو پہچانے اور پھر اسے قبول کرکے اس کی پیروی کرے۔ لیکن اس گروہ کے افراد اپنی گمراہی میں اتنے کٹر ہیں کہ حق جتنا بھی ان کے سامنے واضح ہو جائے وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں وہ قرآن جو متقین کے لئے ہادی اور راہنما ہے ان کے لئے بالکل بے اثر ہے۔ کچھ کہیں یا نہ کہیں، ڈرائیں یا نہ ڈرائیں کوئی بشارت دیں یا نہ دیں ان پر کسی چیز کا کچھ اثر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق کی پیروی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے روحانی طور پر آمادہ ہی نہیں۔

دوسری آیت میں اس تعصب و ڈھٹائی کی دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ یہ کفر و عناد میں اس طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ حس شناخت کھو بیٹھے ہیں "خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے" (ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ) اسی بناء پر ان کا انجام یہ ہے کہ ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے (ولھم عذاب عظیم)۔

اس لحاظ سے وہ آنکھ پرہیزگار جس سے آیات خدا کو دیکھتے تھے، وہ کان پرہیزگار جس سے حق کی باتیں سنتے تھے اور وہ دل پرہیزگار جس سے حقائق کا ادراک کرتے تھے کفار کے لئے بے کار ہیں۔ عقل، آنکھ اور کان ان کے پاس ہیں لیکن سمجھنے، دیکھنے اور

سننے کی قوت ان میں نہیں رہی کیونکہ انکے بُرے اعمال اُن کا عناد اور ہٹ دھرمی انکی شناخت کی قوت کے سامنے پردہ بن گئے ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ جب تک انسان اس مرحلے تک نہ پہنچے، کتنا ہی گمراہ کیوں نہ ہو قابل ہدایت ہوتا ہے لیکن جب وہ اعمال بد کی وجہ سے حس تشخیص ہی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کے لئے راہ نجات نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس پہچان کی قوت ہی نہیں لہذا یقینی طور پر عذاب عظیم اُس کے انتظار میں ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **تشخیص کی قدرت کا چھن جانا دلیل جبر نہیں:** پہلا سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت کے مطابق اگر خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تو پھر وہ مجبور ہیں کہ کفر پر باقی رہ جائیں تو کیا یہ جبر نہیں؟ قرآن میں اس آیت کی طرح اور بھی ایسی ہی آیات موجود ہیں۔ ان حالات میں انہیں سزا دینے کے کیا معنی ہیں؟

اس سوال کا جواب خود قرآن نے دیا ہے اور وہ یہ کہ حق کے مقابلے میں ان لوگوں کا اصرار اور ہٹ دھرمی، ان کی طرف سے ظلم و ستم اور کفر کا استمرار و دوام ان کی حس شناخت پر پردہ پڑ جانے کا باعث بنتا ہے۔ سورہ نساء، آیت ۱۵۵ میں ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ

خداوند عالم نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔

سورہ مومن، آیت ۳۵ میں ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

اس طرح خدا ہر متکبر اور ستمگر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے

اسی طرح سورہ جاثیہ، آیت ۲۳ میں ہے:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہوائے نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے لہذا وہ گمراہ ہو گیا ہے اور خدا نے اُس کے گوش و دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈالدیا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کی حس تشخیص کا سلب ہو جانا اور آلات تمیز و معرفت کا بے کار ہو جانا ان آیات میں چند ایک عمل کا معلول شمار ہوا ہے۔ کفر، تکبر، ستم، پیروی ہوا و ہوس، سرکشی، تعصب اور حق کے مقابلے میں اصرار، حقیقت میں یہ حالت انسان کے اعمال کا عکس العمل اور بازگشت ہے کوئی اور چیز نہیں۔

اصولاً یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر انسان ایک غلط کام کو مسلسل کرتا رہے تو آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو جاتا ہے پہلے ایک حالت ہے پھر وہ ایک عادت بن جاتی ہے گویا وہ روح انسانی کا جزو ہو جاتی ہے اور کبھی معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے

کہ انسان کا پلٹ آنا ممکن نہیں رہتا لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کیا تھا لہٰذا عواقب و انجام کا بھی خود ذمہ دار ہے۔ اور اس میں جبر کی کوئی بات نہیں بالکل اس شخص کی طرح جو خود اپنی آنکھ پھوڑ لے اور کان ضائع کر دے کہ دیکھ سکے نہ سن سکے۔

اب اگر آپ دیکھیں کہ ان افعال کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اس قسم کے افعال میں ایسی خاصیت رکھی ہے (یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے)۔

قوانینِ آفرینش سے اسی مفہوم کی پورے طور پر عکاسی ہوتی ہے۔ جو شخص صحیح اور سچے تقویٰ اور پاکیزگی کو اپنا پیشہ بنا لے خداوند عالم اس کی حسِ تمیز کو زیادہ قوی کر دیتا ہے اور اسے خاص ادراکِ نظر اور روشن فکری عطا کرتا ہے۔ جیسے سورۂ انفال آیہ ۲۹ میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا

اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ کو اپنا پیشہ قرار دو تو خداوند عالم تمہیں فرقان (یعنی وسیلۂ ادراکِ حق و باطل) عطا کرے گا۔

اس حقیقت کو ہم نے روزمرہ کی زندگی میں بھی آزمایا ہے۔ بعض ایسے اشخاص ہیں جو غلط کام شروع کرتے ہیں اور ابتداء میں خود معترف بھی ہوتے ہیں کہ سو فیصد غلط کاری اور برائی کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اسی بناء پر وہ اس کام سے دکھی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو جاتے ہیں تو وہ دکھ ان سے دور ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ نہ صرف انہیں اس کام سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں حتیٰ کہ اسے انسانی یا دینی ذمہ داری سمجھنے لگتے ہیں۔

حجاج ابن یوسف جو دنیا کا سب سے بڑا سفاک اور ظالم انسان تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ہولناک مظالم اور سفاکیوں کی توجیہ میں کہتا تھا:

"یہ لوگ گنہگار ہیں لہٰذا مجھ جیسا شخص ان پر مسلط رہنا چاہیے تاکہ ان پر ظلم کرے کیونکہ یہ اسی کے مستحق ہیں۔"

گویا وہ جس قدر قتل و خونریزی اور ظلم کرتا تھا اس کے لئے اپنے آپ کو خدا کی طرف سے مامور سمجھتا تھا۔

کہتے ہیں چنگیز خاں کے ایک سپاہی نے ایران کے ایک سرحدی شہر میں تقریر کی اور کہنے لگا:

"کیا تمہارا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ خدا گنہگاروں پر عذاب نازل کرتا ہے۔ ہم وہی عذابِ الٰہی ہیں لہٰذا کسی قسم کے مقابلے کی کوشش نہ کرو۔"

(۲) ایسے لوگ قابلِ ہدایت نہیں تو تبلیغ کا تقاضا کیوں: یہ دوسرا سوال ہے جو زیرِ نظر آیات کے سلسلے میں سامنے آتا ہے۔ اگر ہم ایک نکتے کی طرف توجہ دیں تو جواب واضح ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ سزا اور عذابِ الٰہی ہمیشہ انسان کے اعمال و کردار سے مربوط ہے۔ صرف اس بناء پر کسی شخص کو سزا نہیں دی جا سکتی کہ وہ دلی طور پر برا شخص ہے بلکہ ضروری ہے کہ پہلے اسے حق کی دعوت دی جائے۔ اگر اس نے پیروی نہ کی اور اپنے اندرونی خباثت کو اپنے اعمال و کردار سے ظاہر کیا تو اس وقت وہ سزا و عذاب کا مستحق ہے ورنہ وہ ظلم سے پہلے قصاص کا مصداق قرار پائے گا۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم اتمامِ حجت کا نام دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جزا اور

عمل کا بدلہ یقیناً انجام عمل کے بعد ہونا چاہیے صرف ارادہ یا ذہنی و فکری آمادگی اس کے لئے کافی نہیں۔ علاوہ ازیں انبیاء صرف ان کی ہدایت کے لئے نہیں آتے رہے۔ ایسے لوگ اقلیت میں ہیں زیادہ تعداد تو ان گمراہ لوگوں کی ہے جو صحیح تعلیم و تربیت کے تحت قابلِ ہدایت ہیں۔

(۳) دلوں پر مہر لگانا: زیر بحث اور دیگر بہت سی آیات قرآن مجید میں بعض اشخاص سے حق تمیز اور ادراک و تفقہ کے چھن جانے کو "ختم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض اوقات "طبع" یا "رین" قرار دیا گیا ہے۔ یہ معنی یہاں سے لئے گئے کہ لوگوں میں رسم تھی کہ وہ جب کچھ چیزیں تھیلوں یا مخصوص برتنوں میں رکھتے یا کسی اہم خط کو کسی لفافے میں رکھتے تو اس بناء پر کہ کوئی اسے کھولے نہیں اور اسے ہاتھ نہ لگائے اسے باندھ دیتے اور گرہ لگا دیتے پھر گرہ کے اوپر مہر لگاتے تھے۔ آج بھی یہی معمول ہے۔ جیسا کہ لوگوں کی رجسٹریوں کو اسی بناء پر خاص قسم کی رسی سے باندھتے ہیں۔ اس کے اوپر لاک (خاص قسم کی دھات) ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اوپر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ اگر اس کے مضمون میں کوئی کمی بیشی کی جائے تو معلوم ہو جائے۔

تاریخ میں بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ سربراہانِ حکومت درہم و دینار کے توڑوں پر اپنی مہر لگا دیتے تھے اور خاص خاص اشخاص کی طرف بھیجتے تھے۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ اس میں کسی قسم کا تصرف نہ ہونے پائے اور وہ یونہی اُس خاص شخص تک پہنچ جائے کیونکہ اس میں تصرف مہر توڑے بغیر ممکن نہ تھا۔ آج کل بھی ڈاک کے تھیلوں پر مہر کا طریقہ رائج ہے۔

عربی زبان میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے لفظ "ختم" استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ تعبیر صرف ان اشخاص کے لئے ہے جو بے ایمان اور ہٹ دھرم ہیں جو کثرتِ گناہ کے باعث عوامل ہدایت کا اثر قبول نہیں کرتے اور اہل حق کے مقابلے میں ان کے دلوں میں بغض و عناد اتنا راسخ ہوتا ہے کہ گویا اس تھیلے کی طرح ان پر مہر لگ چکی ہے اور اب ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں ہو سکتا۔

"طبع" بھی لغت میں اسی معنی کے لئے آیا ہے اور طابع و خاتم ہر دو کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگاتے ہیں۔

باقی رہا "رین" یعنی زنگ، غبار یا سخت قسم کی مٹی جو قیمتی چیزوں سے چپک جائے۔ یہ تعبیر بھی قرآن میں ان اشخاص کے لئے آئی ہے جو کثرتِ گناہ کی وجہ سے اس عالم کو پہنچ چکے ہیں کہ ان کے دل نفوذِ حق کے قابل نہیں رہے۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ایسا ہرگز نہیں بلکہ جرائم پیشہ ہونے اور مسلسل بُرے اعمال کرتے رہنے کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں۔ (مطففین۔ ۱۴)

یہاں یہ بات اہم ہے کہ انسان ہمیشہ متوجہ رہے اگر خدانخواستہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو بہت جلد اُسے توبہ کے پانی اور نیک عمل سے دھو ڈالنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دل پر زنگ کی شکل اختیار کر جائے اور اس پر مہر لگا دے۔

امام باقرؑ سے ایک روایت میں ہے:

ما من عبد مومن الا و فی قلبہ نکتۃ بیضاء فاذا اذنب ذنباً خرج فی تلک النکتۃ سودا فان تاب ذھب ذلک السواد فان تمادی فی الذنوب زاد ذلک السواد حتی یغطی البیاض فاذا اغطی البیاض لم یرجع صاحبہ الی الخیر ابداً و ھو قول اللہ عزوجل:

کَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝

کوئی بندۂ مومن ایسا نہیں جس کے دل میں ایک وسیع سفید اور چمکدار نقطہ نہ ہو۔ جب اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس نقطۂ سفید کے درمیان ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر توبہ کرلے تو وہ سیاہی برطرف ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل گناہ کرتا ہے تو سیاہی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ تمام سفیدی پر چھا جاتی ہے اور جب سفیدی بالکل ختم ہو جائے تو پھر ایسے دل والا کبھی بھی خیر و برکت کی طرف نہیں پلٹ سکتا اور اس ارشادِ الٰہی کا یہی مفہوم ہے جب فرماتا ہے کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون[1]

(۲) قرآن میں قلب سے کیا مراد ہے، قرآن مجید میں ادراکِ حقائق کی نسبت دل کی طرف کیوں دی گئی ہے جب کہ یہ بات واضح ہے کہ دل ادراکات کا مرکز نہیں وہ تو بدن میں گردش خون کا ایک آلہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ قلب قرآن میں کئی معانی کے لئے ہے جن میں سے بعض یہ ہیں:

(i) ادراک و عقل —— جیسا کہ سورہ ق، آیہ ۳۷ میں ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ

ان مطالب میں تذکرہ و یاد دھانی ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل و ادراک کی قوت رکھتے ہیں۔

(ii) روح و جان —— جیسا کہ سورہ احزاب، آیہ ۱۰ میں ہے:

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ

جب آنکھیں دھنس گئیں اور مارے دہشت کے روح و جان لبوں تک آ پہنچی۔

(iii) مرکزِ عواطف و مہربانی —— سورۂ انفال، آیہ ۱۲ میں ہے:

سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

بہت جلد کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔

ایک اور جگہ سورہ آل عمران، آیہ ۱۵۹ میں ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪

یہ رحمتِ الٰہی ہے کہ آپ لوگوں کے لئے نرم خو ہیں اور اگر آپ تند خو اور سنگدل ہوتے تو آپ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۲۰، ص ۲۷۳

اس کی توضیح یہ ہے کہ انسانی وجود میں دو قوی مرکز ہیں جو یہ ہیں:

(ا) مرکز ادراک — جو مغز اور کارخانۂ اعصاب ہے اسی لئے جب کوئی فکری کام درپیش ہو تو ہم احساس کرتے ہیں اور اپنے مغز کو اس کے تجزیہ و تحلیل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اگرچہ مغز اور سلسلۂ اعصاب حقیقت میں روح کے لئے وسیلہ اور آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(ب) مرکز عواطف — جس سے مراد وہی چلغوزہ نما دل ہے جو سینے کے بائیں حصے میں ہے اور مسائل عواطف (مہربانی و رحم) پہلے پہل اسی مرکز پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پہلی چنگاری دل سے شروع ہوتی ہے۔

ہم وجدانی طور پر جب کسی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کا بوجھ اسی دل پر محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی سرور انگیز اور مسرت آور امر کا سامنا کرتے ہیں تو اسی مرکز میں فرحت و انبساط کا احساس کرتے ہیں (یہ بات غور طلب ہے)۔

یہ صحیح ہے کہ سب ادراکات و عواطف کا اصلی مرکز انسان کی روح رواں ہے لیکن ان کا مظاہرہ اور جسمی عکس العمل مختلف ہوتا رہتا ہے۔ ادراک و فہم کا عکس العمل پہلی دفعہ کارخانۂ مغز میں ظاہر ہوتا ہے لیکن مسائل عواطف مثلاً محبت، عداوت، خوف، اطمینان، خوشی اور غمی کا عکس العمل انسان کے دل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان امور کے پیدا ہوتے ہی واضح طور پر ان کا اثر ہم اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر قرآن میں مسائل عواطف کو اسی دل کی طرف اور مسائل عقلی کو قلب بمعنی عقل یا مغز کی طرف نسبت دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے جو بیان کی گئی ہے اور یہ کوئی بے قاعدہ بات نہیں ہے۔

علاوہ ازیں قلب بمعنی عضو خاص (دل) انسانی زندگی اور اس کی بقا میں نہایت اہم کردار کا حامل ہے کیونکہ اس کا ایک لحظے کا توقف بھی تباہی اور نابودی کا سبب ہے۔ اس بنا پر کیا مضائقہ ہے کہ فکری و عاطفی تحریکوں اور فعالیتوں کی نسبت اس کی طرف دی جائے۔

(۵) قلب و بصر صیغہ جمع اور سمع مفرد میں کیوں: زیر مطالعہ آیت میں اور بہت سی آیات قرآنی کی طرح قلب و بصر صورت جمع (قلوب و ابصار) آئے ہیں جب کہ سمع قرآن میں ہر جگہ مفرد کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو اس فرق میں کوئی نکتہ ہونا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ لفظ سمع قرآن مجید میں ہر جگہ مفرد آیا ہے اور کہیں بھی جمع (اسماع) نہیں آیا لیکن قلب و بصر کبھی جمع کی صورت میں جیسا کہ زیر نظر آیت میں اور کبھی بصورت مفرد جیسے سورۂ جاثیہ آیہ ۲۳ اور سورہ اعراف آیہ ۲۳ میں آیا ہے:

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (جاثیہ ۲۳)

عالم بزرگوار مرحوم شیخ طوسی تفسیر تبیان میں ایک مشہور ادیب کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

ممکن ہے اسمع کے مفرد آنے کی ان دو میں سے ایک وجہ ہو:

(۱) سمع کبھی تو اسم جمع کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ اسم جمع میں جمع کے معنی ہوتے ہیں لہٰذا صیغہ جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) سمع میں یہ گنجائش ہے کہ وہ مصدری معنی رکھتا ہو اور ہم جانتے ہیں کہ مصدر کم یا زیادہ ہو دونوں پر دلالت

کرتا ہے لہٰذا جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ ایک وجہ ذوق و علم کے اعتبار سے بھی بیان کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ادراکات قلبی اور مشاہدات چشم ان امور کی نسبت زیادہ ہیں جو سماعت میں آتے ہیں اس اختلاف کی بناء پر قلوب و ابصار جمع کی شکل میں آیا ہے لیکن سمع مفرد کی صورت میں۔ ماڈرن فزکس کے مطابق امواج صوتی جو قابل سماعت ہیں نسبتاً تعداد میں محدود ہیں اور وہ چند ہزار سے زیادہ نہیں جبکہ امواج نور و رنگ جو قابل رؤیت ہیں کئی ملین سے زیادہ ہیں (یہ بات غور طلب ہے)۔

۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

۹۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

۱۰۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

۱۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝

۱۲۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

۱۳۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۴۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝

۱۵۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

۱۶۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ
وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم خدا اور روز قیامت پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں۔

۹۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا اور مؤمنین کو دھوکا دیں مگر وہ اس طرح اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔
۱۰۔ ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور خدا کی طرف سے اس بیماری کو بڑھا دیا جاتا ہے اور ان کی کذب بیانیوں کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
۱۱۔ جب اُن سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔
۱۲۔ آگاہ رہو یہ سب مفسدین ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔
۱۳۔ اور جب اُن سے کہا جائے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ جان لو کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔
۱۴۔ اور جب ایماندار لوگوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لا چکے ہیں لیکن جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اُن سے تو ہم تمسخر کرتے ہیں۔
۱۵۔ خداوند عالم ان سے استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ سرگرداں رہیں۔
۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی ہے حالانکہ یہ تجارت ان کے لئے نفع مند نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

تیسرا گروہ ــــ منافقین

زیر نظر آیات منافقین کے سلسلے میں مکمل اور بہت پُر مغز تشریح کی حامل ہیں۔ ان میں ان کی روحانی شخصیات اور اعمال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی کچھ وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اسلام کو ایک ایسے گروہ کا سامنا کرنا پڑا جو ایمان لانے کے لئے جذبۂ خلوص رکھتے تھے نہ صریحاً مخالفت کی جرأت کرتے تھے۔ قرآن اس گروہ کو "منافقین" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فارسی میں ہم دورو یا دوچہرہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقی مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ شمار ہوتے تھے۔ چونکہ ان کا ظاہر اسلامی تھا لہٰذا ان کی شناخت مشکل تھی لیکن قرآن ان کی باریک اور زندہ علامات بیان کرتا ہے تاکہ ان کی باطنی کیفیت کو مشخص کرے۔ اس سلسلے میں قرآن ہر زمانے اور قرن کے مسلمانوں کو ایک نمونہ دے رہا ہے۔

پہلے تو نفاق کی تفسیر بیان کی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور قیامت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ ان میں ایمان نہیں ہے۔ (ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھو بمؤمنین)

وہ اپنے اس عمل کو ایک قسم کی چالاکی اور عمدہ تکنیک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے اس عمل سے خدا اور مؤمنین کو دھوکہ دیں (یخدعون اللہ والذین امنوا)۔

حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں (وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون)۔

وہ صحیح راستے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر عمر کا ایک حصہ بے راہ روی میں گذار دیتے ہیں، اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو برباد کر دیتے ہیں اور ناکامی و بدنامی اور عذاب الٰہی کے علاوہ انہیں کچھ نہیں ملتا۔

اس کے بعد اگلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفاق درحقیقت ایک قسم کی بیماری ہے کیونکہ صحیح سالم انسان کا صرف ایک چہرہ ہوتا ہے۔ اس کے جسم و روح میں ہم آہنگی ہوتی ہے کیونکہ ظاہر و باطن، جسم و روح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اگر کوئی مومن ہے تو اس کا پورا وجود ایمان کی صدا بلند کرتا ہے اور اگر ایمان سے منحرف ہے تب بھی اس کا ظاہر و باطن انحراف کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ جسم و روح میں گویا ایک دردِ نو اور اضافی بیماری ہے۔ یہ ایک طرح کا تضاد، ناہم آہنگی اور ایک دوسرے سے دوری ہے جو وجودِ انسانی پر حکمران ہے۔

قرآن کہتا ہے ان کے دلوں میں ایک خاص بیماری ہے (فی قلوبھم مرض)۔

نظام آفرینش میں جو شخص کسی راستے پر چلتا ہے اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کیے رکھتا ہے تو وہ یقیناً آگے بڑھتا رہتا ہے یا بہ الفاظِ دیگر ایک ہی میسر راستے پر چلنے والے انسان کے اعمال و افکار کا حجم اس میں زیادہ رنگ بھرتا ہے اور اسے زیادہ راسخ کرتا ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے، خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے (فزادھم اللہ مرضا)۔

چونکہ منافقین کا اصل سرمایہ جھوٹ ہے لہٰذا ان کی زندگی میں جو تناقضات رونما ہوتے ہیں وہ ان کی توجیہہ کرتے رہتے ہیں۔ آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے، ان کی ان دروغ گوئیوں کی وجہ سے اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون)۔

اس کے بعد ان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے پہلی اصلاح طلبی کا دعویٰ کرنا ہے حالانکہ حقیقی فسادی وہی ہیں۔ جب ان سے کہا جائے کہ روئے زمین پر فساد نہ کرو تو وہ اپنے تئیں مصلح بتلاتے ہیں (واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون) اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا تو زندگی میں اصلاح کے علاوہ کبھی کوئی مقصد رہا ہے نہ اب ہے۔

اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے، جان لو کہ یہ سب مفسد ہیں اور ان کا پروگرام فساد کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن وہ خود بھی شعور سے تہی دامن ہیں (الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون)۔

ان کے اصرارِ نفاق میں پختگی اور اس باعثِ ننگ و عار کام کی عادت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ گمان کرنے لگے ہیں کہ یہی پروگرام تربیت و اصلاح کے لئے مفید ہے جیسے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگر گناہ ایک حد سے بڑھ جائے تو پھر انسان سے حسِ تشخیص چھن جاتی ہے بلکہ اس کی تشخیص برعکس ہو جاتی ہے اور ناپاکی و آلودگی اس کی طبیعت ثانوی بن جاتی ہے۔

ایسے لوگوں کی دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عاقل و ہوشیار اور مومنین کو بیوقوف، سادہ لوح اور جلد دھوکا کھانے والے سمجھتے ہیں۔ جیسے قرآن کہتا ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ ایمان لے آؤ جس طرح باقی لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں (واذا قیل لھم آمنوا کما آمن الناس قالوا انؤمن کما آمن السفھاء)۔

اس طرح وہ ان پاک دل، حق طلب اور حقیقت کے متلاشی افراد کو حماقت و بیوقوفی سے متہم کرتے ہیں جو دعوتِ پیغمبر اور ان کی تعلیمات میں آثارِ حقانیت کا مشاہدہ کر کے سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں، اپنی شیطنت، دورُخی اور نفاق کو ہوشِ عقل اور درایت

کی ذلیل سمجھتے ہیں گویا ان کی منطق میں عقل نے بے عقلی کی جگہ لے لی ہے اسی لئے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: جان لو کہ واقعی بیوقوف یہی لوگ ہیں لیکن وہ جانتے نہیں (الا انھم ھم السفھاء ولٰکن لا یعلمون)۔

کیا یہ بیوقوفی نہیں کہ انسان اپنی زندگی کے مقصد کا تعین نہ کر سکے اور ہر گروہ میں اس گروہ کا رنگ اختیار کرکے داخل ہو اور یکسانیت و شخصی وحدت کی بجائے دو گانگی یا کئی ایک بہروپ قبول کرکے اپنی استعداد اور قوت کو شیطنت، سازش اور تخریب کاری کی راہ میں صرف کرے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو عقلمند سمجھے۔

اُن کی تیسری نشانی یہ ہے کہ ہر روز کسی نئے رنگ میں نکلتے ہیں اور ہر گروہ کے ساتھ ہم صدا ہوتے ہیں جس طرح قرآن کہتا ہے: جب وہ اہل ایمان سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں (واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا) ہم تم میں سے ہیں ایک ہی مکتب کے پیروکار ہیں اور دل و جان سے اسلام قبول کر چکے ہیں اور تمہیں غیر نہیں سمجھتے۔

لیکن جب اپنے شیطان صفت دوستوں کی خلوت گاہ میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں (واذا خلوا الٰی شیٰطینھم قالوا انا معکم) اور یہ جو ہم مومنین سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں یہ تو تمسخر و استہزاء ہے (انما نحن مستھزءون) ان کے افکار و اعمال پر دل میں تو ہم ہنستے ہیں یہ سب ان سے مذاق ہے ورنہ ہمارے دوست، ہمارے محرم راز اور ہمارا سب کچھ تو آپ لوگ ہیں۔

اس کے بعد قرآن ایک سخت اور دو ٹوک لب و لہجہ کے ساتھ کہتا ہے: خدا ان سے تمسخر کرتا ہے (اللہ یستھزئ بھم) اور خدا انہیں ان کے طغیان و سرکشی میں رکھے گا تاکہ وہ کاملاً سرگرداں رہیں (ویمدھم فی طغیانھم یعمھون)۔[1]

مورد بحث آیات میں سے آخری ان کی آخری سرنوشت ہے جو بہت غم انگیز اور تاریک ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس تجارت خانہ عالم میں ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا ہے (اولٰئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدٰی) اسی وجہ سے ان کی تجارت نفع مند نہیں بلکہ سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں (فما ربحت تجارتھم) اور کبھی بھی انہوں نے ہدایت کا چہرہ نہیں دیکھا (وما کانوا مھتدین)۔

چند اہم نکات

(۱) نفاق کی پیدائش اور اس کی جڑیں: جب کسی علاقے میں کوئی انقلاب آتا ہے خصوصاً اسلام جیسا انقلاب جس کی بنیاد حق و عدالت پر ہے تو مسلماً غارت گروں، ظالموں اور خود سروں کے منافع کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو وہ پہلے پہل تمسخر سے پھر مسلح قوت، اقتصادی دباؤ اور مسلسل اجتماعی پراپیگنڈہ سے کام لیتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ انقلاب کو درہم برہم کر دیں۔ جب انقلاب کی کامیابی کا پرچم علاقے کی قوتوں کو سربلند نظر آتا ہے تو مخالفین کا ایک گروہ اپنی تکنیک اور روش ظاہری کو بدل دیتا ہے اور ظاہراً انقلاب کے سامنے جھک جاتا ہے لیکن وہ زیر زمین مخالفت کا پروگرام تشکیل دیتا ہے۔

---

[1] "یعمھون" مادہ "عمہ" سے ہے (بروزن "ہمہ") جو تردد یا کسی کام میں متحیر ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کوردلی، تاریکی بصیرت کے معنی میں بھی مستعمل ہے جس کا اثر سرگردانی ہے۔ مفردات راغب، تفسیر منار اور قاموس اللغۃ کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہ لوگ جو دو مختلف چہروں کی وجہ سے منافق کہلاتے ہیں انقلاب کے خطرناک ترین دشمن ہیں (منافق کا مادہ "نفق" ہے یہ بروزن "شفق" ہے جس کے معنی زیر زمین نقب اور سرنگ کے ہیں جس سے چھپنے یا جاگنے کا کام لیا جاتا ہے) ان کا موقف پورے طور پر مشخص نہیں ہوتا لہٰذا انقلابی انہیں پہچان نہیں پاتے کہ خود سے انہیں دور کر دیں وہ لوگ پاک باز اور سچے لوگوں میں گھس جاتے ہیں یہاں تک کہ کبھی کبھی اہم ترین پوسٹ پر جا پہنچتے ہیں۔

جب تک پیغمبر اسلام نے مکے سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی اور مسلمانوں کی حکومت تشکیل نہیں پائی تھی ایسا گروہ سرگرم عمل نہیں ہوا لیکن نبی اکرمؐ جب مدینہ میں آگئے تو حکومت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی اور جنگ بدر کی کامیابی کے بعد یہ معاملہ زیادہ واضح ہوگیا یعنی رسمی طور پر ایک چھوٹی سی حکومت جو قابل رشد تھی، قائم ہوگئی۔

یہ وہ موقع تھا کہ مدینے کے کئی نشینوں خصوصاً یہودیوں کے (جو اس زمانے میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے) بہت سے منافع خطرے میں پڑ گئے۔

اس زمانے میں یہودیوں کا زیادہ احترام اس وجہ سے تھا کہ وہ اہل کتاب اور نسبتاً پڑھے لکھے لوگ تھے اور وہ اقتصادی طور پر بھی آگے تھے حالانکہ یہی لوگ ظہور پیغمبرؐ سے پہلے اس قسم کے امور کی خوش خبری دیتے تھے۔ مدینہ میں کچھ اور لوگ بھی تھے جن کے سر میں لوگوں کی سرداری کا سودا سمایا ہوا تھا۔ لیکن رسول خداؐ کی ہجرت سے ان کے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

ظالم سرداروں، سرکشوں اور ان غارت گروں کے حمایتیوں نے دیکھا کہ عوام تیزی سے نبی اکرمؐ پر ایمان لا رہے ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب بھی ایک عرصے تک مقابلہ کرتے رہے لیکن آخرکار انہیں بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ظاہراً مسلمان ہو جائیں۔ کیونکہ علم مخالفت بلند کرنے میں جنگی مشکلات اور اقتصادی صدمات کے علاوہ ان کی نابودی کا خطرہ تھا خصوصاً عرب کی پوری قوت بھی آپؐ کے ساتھ تھی اور ان لوگوں کے قبیلے بھی ان سے جدا ہو چکے تھے۔

اس بنا پر انہوں نے تیسرا راستہ انتخاب کیا اور وہ یہ کہ ظاہراً مسلمان ہو جائیں اور مخفی طور پر اسلام کو برباد کرنے کا منصوبہ بنائیں۔
خلاصہ یہ کہ کسی معاشرے میں نفاق کے ظہور کی ان دو وجوہ میں سے ایک ہوتی ہے:

(i) کسی انقلاب کی کامیابی اور معاشرے پر اس کا تسلط

(ii) نفسیاتی کمزوری اور سخت حوادث کے مقابلے میں جرأت و ہمت کا فقدان

(۲) ہر معاشرے میں منافقین کی پہچان ضروری ہے: اس میں شک و شبہ نہیں کہ نفاق اور منافق زمانۂ پیغمبرؐ سے مخصوص نہ تھے بلکہ ہر معاشرے میں اس گروہ کا وجود ہوتا ہے البتہ ضروری ہے کہ قرآن کے دیے ہوئے معیار کی بنیاد پر ان کی پہچان کی جائے تاکہ وہ کوئی نقصان یا خطرہ پیدا نہ کر سکیں۔ زیر مطالعہ آیات کے علاوہ سورۂ منافقون اور روایات اسلامی میں ان کی مختلف نشانیاں بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

(i) زیادہ شور شرابہ اور بڑے بڑے دعوے ــــ باتیں بہت، عمل کم اور قول و فعل میں تضاد ہونا۔

(ii) ہر جگہ کے رنگ کو اپنا لینا اور ہر گروہ کے ساتھ ان کے ذوق کے مطابق گفتگو کرنا۔ مومنین سے "آمنا" کہنا اور مخالفین سے

"انا معکم"۔

(۱۱) عوام سے اپنے آپ کو الگ رکھنا، خفیہ انجمنیں قائم کرنا اور پوشیدہ منصوبے بنانا۔

(۱۷) دھوکا دہی، مکر و فریب، جھوٹ، تملق، چاپلوسی، پیمان شکنی اور خیانت کی راہ چلنا۔

(۷) اپنے تئیں بڑا سمجھدار گرداننا اور دوسروں کو نا سمجھ، بیوقوف اور نادان قرار دینا۔

خلاصہ یہ کہ دو رُخی اور اندرونی و بیرونی تضاد منافقین کی واضح صفت ہے۔ ان کا انفرادی و اجتماعی چال چلن ایسا ہوتا ہے جس سے انہیں واضح طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم کی یہ تعبیر کتنی عمدہ ہے کہ "ان کے دل بیمار ہیں" (فی قلوبھم مرض)۔ کون سی بیماری ظاہر و باطن کے تضاد سے بدتر ہے اور کون سی بیماری اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور سخت حوادث کے مقابلے سے فرار سے بڑھ کر ہے۔

جیسے دل کی بیماری جتنی بھی پوشیدہ ہو اسے کاملاً مخفی نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس کی علامات انسان کے چہرے اور تمام اعضاء بدن سے آشکار ہوتی ہیں۔ نفاق کی بیماری بھی اسی طرح ہے جو مختلف مظاہر کے ساتھ قابلِ شناخت ہے اور اندرونی نفاق کی بیماری کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔

تفسیر نمونہ سورۂ نساء آیت ۱۴۱ تا ۱۴۳ میں بھی صفاتِ منافقین کے بارے میں بحث کی گئی ہے نیز سورہ توبہ آیت ۴۹ تا ۵۰ کے ذیل میں بھی اس سلسلے میں کافی بحث ہے اور سورہ توبہ آیت ۶۲ تا ۵۰ کے ذیل میں بھی ایسی ابحاث موجود ہیں۔

(۳) معنیٔ نفاق کی وسعت: اگرچہ نفاق اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے ان بے ایمان لوگوں کے لئے ہے جو ظاہراً مسلمانوں کی صف میں داخل ہوں لیکن باطنی طور پر کفر کے دلدادہ ہوں لیکن نفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے ظاہر و باطن اور گفتار و کردار کے تضاد پر محیط ہے چاہے یہ چیز مومن افراد میں پائی جائے جنہیں ہم "دو رگہ ہائے نفاق" (یعنی - ایسے انسان یا حیوان جن کے ماں باپ مختلف نسل سے ہوں) کہتے ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے:

ثلاث من کن فیہ کان منافقاً و ان صام وصلی وزعم انہ مسلم من اذا ائتمن خان و اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف۔

تین صفات ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں وہ منافق ہے چاہے وہ روزے رکھے نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے (اور وہ صفات یہ ہیں) جب امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، بات کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے[۱]

مسلّم ہے کہ ایسے اشخاص اس خاص معنی کے لحاظ سے منافق نہیں تاہم نفاق کی جڑیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً ریاکاروں کے بارے میں امام صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

الریاء شجرۃ لا تثمر الا الشرک الخفی و اصلھا النفاق

یعنی —— ریاکاری و دکھاوا ایسا (تلخ) درخت ہے جس کا پھل شرکِ خفی کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کی

---

[۱] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۰۵

اصل اور جڑ نفاق ہے[1]

یہاں ہم آپ کی توجہ امیرالمؤمنین علیؑ کے ایک ارشاد کی طرف دلاتے ہیں جو منافقین کے متعلق ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

اے خدا کے بندو! تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں اور منافقین سے ڈراتا ہوں کیونکہ وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، خود خطاکار ہیں اور دوسروں کو خطاؤں میں ڈالتے ہیں، مختلف رنگ اختیار کرتے ہیں، مختلف چہروں اور زبانوں سے خودنمائی کرتے ہیں، ہر طریقے سے تمہیں پھانسنے اور برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کمین گاہ میں تمہارے شکار کے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن کا ظاہر اچھا اور باطن خراب ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے خفیہ چال چلتے ہیں۔ ان کی گفتگو ظاہراً تو شفا بخش ہے لیکن ان کا کردار ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ لوگوں کی خوش حالی اور آسائش پر حسد کرتے ہیں اور اگر کسی پر مصیبت آن پڑے تو خوش ہوتے ہیں۔ امید رکھنے والوں کو مایوس کر دیتے ہیں۔ ہر راستے میں ان کا کوئی نہ کوئی مقتول ہے۔ ہر دل میں ان کی راہ ہے اور ہر مصیبت پر آنسو بہاتے ہیں۔ مدح و ثنا ایک دوسرے کو بطور قرض دیتے ہیں اور جزا و عوض کے منتظر رہتے ہیں اگر کوئی چیز لینی ہو تو اصرار کرتے ہیں اور اگر کسی کو ملامت کریں تو اس کی پردہ دری کرتے ہیں[2]

(۴) منافقین کی حوصلہ شکنیاں: نہ صرف اسلام بلکہ ہر انقلابی اور ارتقاپسند آئین و دین کے لئے منافقین خطرناک ترین گروہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس جاتے ہیں اور حوصلہ شکنی کے لئے ہر موقع کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ کبھی سچے مومنین کا اس پر بھی تمسخر اڑاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مختصر سرمایہ راہِ خدا میں خرچ کیا ہے جیسے قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

وہ مخلصین مومنین کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ انہوں نے (اپنے مختصر سرمایہ کو بے ریا راہِ خدا میں) خرچ کیا۔ خدا ان سے استہزاء کرتا ہے اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ (توبہ۔ ۷۹)

کبھی وہ اپنی خفیہ میٹنگوں میں فیصلہ کرتے کہ رسولِ خدا کے اصحاب سے مالی امداد کلی طور پر منقطع کر دیں اور آپ سے الگ ہو جائیں۔ جیسے سورہ منافقون میں ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ جو لوگ ہیں ان سے مالی امداد منقطع کر لو تا کہ وہ آپؐ کے گرد و پیش سے

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱، مادہ رئی

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۴

منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ آسمان و زمین کے خزانے خدا کے لئے ہیں لیکن منافق نہیں جانتے۔ (منافقون-۷)
کبھی یہ فیصلہ کرتے تھے کہ جنگ سے مدینہ واپس پہنچنے پر متحد ہو کر مناسب موقع پر مومنین کو مدینہ سے نکال دیں گے اور کہتے تھے:

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ

اگر ہم مدینہ کی طرف پلٹ گئے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے۔ (منافقون-۸)

کبھی مختلف بہانے بنا کر (مثلاً فصل کے محصولات کی جمع آوری کا بہانہ) جہاد کے پروگرام میں شریک نہ ہوتے تھے اور سخت مشکلات کے وقت نبی اکرمؐ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے اور ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے مبادا اس طرح انہیں رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

ان کی معاندانہ حوصلہ شکنیوں کی وجہ سے قرآن مجید نے ان پر سخت وار کئے ہیں اور قرآن مجید کی ایک سورت (منافقون) ان کے طور طریقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، توبہ، حشر اور بعض دوسری سورتوں میں بھی انہیں ملامت کی گئی ہے اور اسی سورہ بقرہ کی تیرہ آیات انہی کی صفات اور انجام بد سے متعلق ہیں۔

(۵) وجدان کو دھوکا دینا: مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی مشکل منافقین سے رابطے کے سلسلے میں تھی کیونکہ ایک طرف تو وہ مامور تھے کہ جو شخص اظہار اسلام کرے کشادہ روئی سے استقبال کیا جائے اور ان کے عقائد کے سلسلے میں جستجو اور تفتیش نہ کی جائے اور دوسری طرف منافقین کے منصوبوں کی نگرانی کا کام تھا۔ منافق اپنے تئیں جب حق کا ساتھی اور ایک فرد مسلمان کی حیثیت سے متعارف کرواتا تو اس کی بات قبول کرنا پڑتی جب کہ باطنی طور پر وہ اسلام کے لئے سد راہ ہوتا اور اس کے کلمات سوگند کھائے ہوئے دشمنوں میں سے ہوتا۔ یہ گروہ اس راہ کو اپنا کر اس زعم میں مبتلا رہتا کہ خدا اور مومنین کو ہمیشہ دھوکا دے سکے گا۔ حالانکہ یہ لوگ لاشعوری طور پر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

یخدعون اللہ والذین اٰمنوا کی تعبیر دقیق معنی دیتی ہے (مخادعہ کے معنی ہیں دونوں طرف سے دھوکہ دینا)، یہ لوگ ایک طرف تو کور باطنی کی وجہ سے اعتقاد رکھتے تھے کہ نبی اکرمؐ دھوکہ باز ہیں اور انہوں نے حکومت کے لئے دین و نبوت کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور سادہ لوح لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں لہٰذا ان کے مقابلے میں دھوکا ہی کرنا چاہیئے۔ اس بنا پر ان منافقین کا کام ایک طرف تو دھوکا فریب تھا دوسری طرف نبی اکرمؐ کے بارے میں اس قسم کا غلط اعتقاد رکھتے تھے لیکن جملہ "وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون" ان کے دونوں ارادوں کو خاک میں ملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ جملہ ایک طرف تو یہ ثابت کرتا ہے کہ دھوکا و فریب صرف انہی کی طرف سے ہے۔ دوسری طرف کہتا ہے کہ اس فریب کی بازگشت بھی انہی کی طرف ہے لیکن وہ سمجھتے نہیں ان کا اصلی سرمایہ جو حصول سعادت کے لئے خدا نے ان کے وجود میں پیدا کیا ہے وہ اسے دھوکا و فریب کی راہ میں برباد کر رہے ہیں اور ہر خیر و نیکی سے تہی دامن اور گناہوں کا بھاری بوجھ اٹھائے دنیا سے جا رہے ہیں:

کوئی شخص بھی خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ظاہر و باطن سے باخبر ہے اس بنا پر یخدعون اللہ سے تعبیر کرنا اس لحاظ سے ہے کہ رسولؐ خدا اور مومنین کو دھوکا دینا خدا کو دھوکا دینے کی طرح ہے (دوسرے مواقع پر بھی قرآن میں ہے کہ خدا نے

عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ اور مومنین کی تعظیم کیلئے خود کو ان کی صف میں بیان کرتا ہے) یا پھر یہ لوگ صفات خدا کو نہ پہچاننے کی وجہ سے اپنی کوتاہ و ناقص فکر سے واقعاً یہ سمجھتے تھے کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے پوشیدہ ہو ایسی نظیر قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال زیر نظر آیت وجدان کو دھوکا دینے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گمراہ اور گناہ سے آلودہ انسان برے اور غلط اعمال کے مقابلے میں وجدان کی سزا و سرزنش سے بچنے کے لئے اسے دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے تئیں مطمئن کر لیتا ہے کہ نہ صرف اس کا عمل برا اور قبیح نہیں بلکہ باعث اصلاح ہے اور فساد کے مقابلے میں ہے (انما نحن مصلحون)۔ یہ اس لئے کہ وجدان کو دھوکا دے کر اطمینان سے غلط کام کو جاری رکھ سکے۔

امریکہ کے ایک صدر کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب اس سے سوال کیا گیا کہ اس نے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایٹم بم سے تباہ کرنے کا حکم کیوں دیا تھا جب کہ اس سے دو لاکھ افراد بچے، بوڑھے اور جوان ہلاک یا ناقص الاعضاء ہو گئے تو اس نے جواب دیا تھا کہ اگر ہم یہ کام نہ کرتے تو جنگ طویل ہو جاتی اور پھر زیادہ افراد کو قتل کرنا پڑتا۔

گویا ہمارے زمانے کے منافق بھی اپنے وجدان یا لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ایسی باتیں اور ایسے بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ جنگ جاری رکھنے یا شہر کو ایٹم بم سے اڑانے کے علاوہ تیسری واضح راہ بھی تھی وہ یہ کہ توسیع پسندی سے ہاتھ اٹھا لیں اور قوموں کو ان کے ملکوں کے سرحدوں کے ساتھ آزاد رہنے دیں۔

نفاق حقیقت میں وجدان کو فریب دینے کا وسیلہ ہے۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ انسان اس اندرونی واعظ، ہمیشہ بیدار و بہرہ دار اور خدا کے باطنی نمائندے کا گلا گھونٹ دے یا اس کے چہرے پر اس طرح پردہ ڈال دے کہ اس کی آواز کان تک نہ پہنچے۔

(۴) نقصان دہ تجارت: اس دنیا میں انسان کی کارگزاریوں کو قرآن مجید میں بارہا ایک قسم کی تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے اور حقیقت میں ہم سب اس جہان میں تاجر ہیں اور خدا نے ہمیں عقل، فطرت، احساسات، مختلف جسمانی قوی، نعمات دنیا طبیعت اور سب سے آخر میں انبیاء کی رہبری کا عظیم سرمایہ عطا فرما کر تجارت کی منڈی میں بھیجا ہے۔ ایک گروہ نفع اٹھاتا ہے اور کامیاب و سعادت مند ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا گروہ نہ صرف یہ کہ نفع حاصل نہیں کرتا بلکہ اصل سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے اور مکمل دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ پہلے گروہ کا کامل نمونہ مجاہدین راہ خدا ہیں جیسا کہ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ

اے ایمان والو! کیا تمہیں ایسی تجارت کی راہنمائی نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے (اور سعادت ابدی کا ذریعہ ہو) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس کی راہ میں مال و جان سے جہاد کرو۔

(صف - ۱۰،۱۱)

دوسرے گروہ کا واضح نمونہ منافقین ہیں۔ منافقین جو مخرب اور مفسد کام اصلاح وعقل کے لباس میں انجام دیتے تھے۔ قرآن گذشتہ آیات میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا ہے اور یہ تجارت اُن کے لئے نفع بخش ہے نہ ہی باعث ہدایت۔ وہ لوگ ایسی پوزیشن میں تھے کہ بہترین راہ انتخاب کرتے۔ وہ وحی کے سرچشمہ اور میٹھے چشمے کے کنارے موجود تھے اور ایسے ماحول میں رہتے تھے جو صدق وصفا اور ایمان سے لبریز تھا۔

بجائے اس کے کہ وہ اس خاص موقع سے بڑا فائدہ اٹھاتے جو طویل صدیوں میں ایک چھوٹے سے گروہ کو نصیب ہوا، انہوں نے ایسی ہدایت کھو کر گمراہی خرید لی جو اُن کی فطرت میں تھی اور وہ ہدایت جو وحی کے ماحول میں موجزن تھی۔ان تمام سہولتوں کو وہ اس گمان میں ہاتھ سے دے بیٹھے کہ اس سے وہ مسلمانوں کو شکست دے سکیں گے اور خود ان کے گندے افکار میں پرورش پانے والے بُرے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں گے جبکہ اس معاملے اور غلط انتخاب میں انہیں دو بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا:

(i) ایک یہ کہ ان کا مادی اور معنوی دونوں قسم کا سرمایہ تباہ ہو گیا اور اس سے انہیں کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا۔

(ii) دوسرا یہ کہ وہ اپنے غلط مطمع نظر تک بھی نہ پہنچ سکے کیونکہ اسلام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور صفحۂ ہستی پر محیط ہو گیا اور یہ منافقین بھی رُسوا ہو گئے۔

۱۷۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ
بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ○
۱۸۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ○
۱۹۔ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ
فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ○
۲۰۔ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا
أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ ع ۲

ترجمہ

۱۷۔ وہ (منافقین) اس شخص کی مثل ہیں جس نے آگ روشن کی ہو (تاکہ تاریک بیابان میں اسے راستہ مل جائے) مگر جب آگ سے سب اطراف روشن ہو گئیں تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج کر) اسے خاموش کر دیا اور ایسی وحشت ناک تاریکی مسلط کی جس میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

۱۸۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں لہٰذا خطا کاری کے راستے سے پلٹیں گے نہیں۔

۱۹۔ یا پھر ان کی مثال ایسی ہے کہ بارش شب تاریک میں گھن گرج، چمک اور بجلیوں کے ساتھ دریگذاروں کے سروں پر برس رہی ہو اور وہ موت کے خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تاکہ بجلی کی آواز سے بچیں اور یہ سب کافر خدا کے احاطۂ قدرت میں ہیں۔

۲۰۔ قریب ہے کہ بجلی کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو چندھیا دے۔ جب بھی بجلی چمکتی ہے اور (صفحۂ بیابان کو) ان کے لئے روشن کر دیتی ہے تو وہ (چند گام) چل پڑتے ہیں اور جب وہ خاموش ہو جاتی ہے تو رک جاتے ہیں اور اگر خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں تلف کر دے (کیونکہ) یقیناً ہر چیز خدا کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔

تفسیر

منافقین کے حالات واضح کرنے کیلئے دو مثالیں:

منافقین کی صفات و خصوصیات بیان کرنے کے بعد قرآن مجید ان کی کیفیت کی تصویر کشی کے لئے زیر نظر آیات میں دو واضح مثالیں اور تشبیہیں بیان کرتا ہے:

(۱) پہلی مثال میں ہے کہ وہ اس شخص کی مانند ہیں جس نے (سخت تاریک رات میں) آگ روشن کی ہو تاکہ اس کی روشنی میں سیدھے اور ٹیڑھے راستے کی پہچان کر سکے اور منزل مقصود تک پہنچ جائے (مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا) مگر جب آگ کے شعلوں نے گرد و پیش کو روشن کر دیا تو خداوند عالم نے اسے بجھا دیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا اس عالم میں کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے (فلما اضاءت ما حولہ ذھب اللہ بنورھم و ترکھم فی ظلمات لا یبصرون) وہ سمجھتے تھے کہ اس تھوڑی سی آگ اور اس کی روشنی سے تاریکیوں کے ساتھ برسر پیکار رہ سکیں گے مگر اچانک آندھی اٹھی یا سخت بارش برسی یا ایندھن ختم ہو گیا اور آگ سردی اور خاموشی میں بدل گئی یوں وہ دوبارہ وحشت ناک تاریکی میں سرگرداں ہو گئے اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں اور چونکہ ادراکِ حقائق کا کوئی وسیلہ ان کے پاس نہیں رہا لہٰذا وہ اپنے راستے سے پلٹیں گے نہیں (صم بکم عمی فھم لا یرجعون) یہ کس قدر باریک اور واضح مثال ہے۔ انسانی زندگی میں ٹیڑھے راستے تو بہت ہیں لیکن خط مستقیم جو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں۔ ٹیڑھے خط تو بہت ہیں علاوہ ازیں اس راستے میں تاریکیوں کے پردے، وحشتناک طوفان اور قسم قسم کے حوادث ہیں لہٰذا ایک ایسے روشن چراغ کی ضرورت ہے جو ان حوادث سے محفوظ رہ سکے وہ تاریکی کے پردوں کو چاک کر سکے اور طوفانوں کا مقابلہ کر سکے اور ایسا چراغ سوائے چراغ عقل و ایمان اور خورشید وحی کے کوئی اور نہیں۔

مختصر شعلہ جو انسان وقتی طور پر روشن کرتا ہے وہ اس طویل مسافت میں جس میں طوفان ہی طوفان ہیں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

منافقین نفاق کی راہ انتخاب کر کے یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر حال میں اپنی حیثیت و وجاہت کی حفاظت کر سکیں گے اور ہر احتمالی خطرے سے محفوظ رہ سکیں گے اور دونوں طرف سے منافع سمیٹ لیں گے اور جو گروہ بھی غالب ہوگا ہمیں اپنے میں سے سمجھے گا اگر

مومن کامیاب ہوئے تو مومنین کی صف میں اور اگر کافر غالب رہے تو ان کے ساتھ۔
وہ اپنے آپ کو چالاک اور ہوشیار سمجھتے تھے اور اس کمزور و ناپائیدار شعلے کی روشنی میں اپنی روحیات پر ہمیشہ کے لئے چلنا چاہتے تھے تاکہ خوشحالی تک جا پہنچیں لیکن قرآن نے انہیں بے نقاب کر دیا اور ان کے جھوٹ کو آشکار کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝

جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ آپ اسی کے بھیجے ہوئے ہیں مگر خدا جانتا ہے کہ منافق اپنے اظہارات میں جھوٹے ہیں۔ (منافقون-۱)

یہاں تک کہ قرآن کفار کو بھی واضح کرتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے ساتھ بھی نہیں ہیں وہ جو بھی وعدے کرتے ہیں اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ۝

منافق اہل کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تمہیں مدینے سے باہر نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں کسی کی بات پہ کان نہیں دھریں گے اور اگر تمہارے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں اگر انہیں باہر کیا گیا تو یہ ان کے ساتھ باہر نہیں جائیں گے اور اگر ان (کافروں) سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے بلکہ تو (محاذ جنگ سے) بھاگ جائیں گے اور ثابت قدم نہیں رہیں گے۔ (حشر-۱۱، ۱۲)

قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن نے جملہ "استوقد نارًا" سے استفادہ کیا ہے یعنی وہ نور تک پہنچنے کے لئے نار کا سہارا لیں گے وہ آگ کہ جس میں دھواں، خاکستر اور سوزش ہے جب کہ مومنین خالص نور اور ایمان کے درخشاں و پُر فروغ چراغ سے بہرہ ور ہیں۔
منافقین اگرچہ نور ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا باطن نار سے پُر ہے اور اگر نور ہو بھی تو کمزور اور تھوڑی مدت کا ہے یہ مختصر نور وجدان و فطرت توحیدی کی روشنی کی طرف اشارہ ہے یا ان کے ابتدائی ایمان کی طرف جو بعد میں کورانہ تقلید، غلط تعصب، ڈھٹائی اور عداوت کے نتیجے میں تاریک پردوں کی اوٹ میں چھپ گیا قرآن کی نظروں میں یہ سیاہ پردے ظلمت نہیں بلکہ ظلمات ہیں۔
یہی چیزیں ہیں جو بالآخر ان سے دیکھنے والی آنکھ، سننے والا کان اور بولنے والی زبان چھین لیتی ہیں کیونکہ (جیسا پہلے بھی

کہا جا چکا ہے) غلط راستے پر چلتے رہنا رفتہ رفتہ قوت تشخیص اور ادراک انسانی کو کمزور کر دیتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اُسے حقائق اُلٹ نظر آتے ہیں اس کی نگاہ میں نیک بد ہو جاتا ہے۔ زشتہ اسے حق نظر آنے لگتا ہے۔ بہر حال یہ تشبیہ در حقیقت نفاق کے سلسلے میں ایک واقعیت کو واضح کرتی ہے اور وہ یہ کہ نفاق و دورنگی طویل مدت کے لئے موثر نہیں ہو سکتی۔ منافق تھوڑی مدت تک اسلام کی خوبیوں اور مومنین کی معنویت و حفاظت سے سرفراز رہیں اور کفار سے پوشیدہ دوستی سے بھی بہرہ مند ہوں لیکن یہ ایک شعلۂ ضعیف کی طرح ہے جو بیابانِ تاریک اور ظلمانی طوفانوں کی زد میں ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ ان کا حقیقی چہرہ آشکار ہو جاتا ہے اور کسب مقام و محبوبیت کی بجائے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں دور پھینک دیتے ہیں اور ان کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو سرگرداں ہو جس نے بیابان میں راستہ کھو دیا ہو اور چراغ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیہ ھو الذی جعل الشمس ضیاءً و القمر نورًا (وہ خدا ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بخشا ہے) کی تفسیر میں امام باقرؑ سے اس طرح منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اضاءت الارض بنور محمد کما تضیئ الشمس فضرب اللہ مثل محمد الشمس ومثل الوصی القمر۔

خداوند عالم نے روئے زمین کو محمدؐ کے وجود سے روشنی بخشی جس طرح آفتاب سے۔ لہٰذا محمدؐ کو آفتاب سے اور اُن کے وصی (علیؑ) کو چاند سے تشبیہ دی[1]

یعنی نورِ ایمان وہی عالمگیر ہے جب کہ نفاق کا کوئی پرتو ہو بھی تو وہ اپنے گرد کے ایک چھوٹے سے دائرے میں اور بہت تھوڑی مدت کے لئے روشنی دیتا ہے (ملاحظہ)۔

(۲) دوسری مثال میں قرآن ان کی زندگی کو ایک دوسری شکل میں پیش کرتا ہے:

تاریک و سیاہ اور پُر خوف و خطر رات ہے جس میں شدید بارش ہو رہی ہے۔ اُفق کے کناروں سے پُر نور بجلی چمکتی ہے۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اتنی وحشتناک اور مہیب ہے کہ کانوں کے پردے چاک کئے دیتی ہے۔ وہ انسان جس کی کوئی پناہ گاہ نہیں وسیع و تاریک اور خطرناک دشت و بیابان کے وسط میں حیران و سرگرداں کھڑا ہے۔ موسلا دھار بارش نے اس کی پشت کو تر کر دیا ہے نہ کوئی جائے امان ہے اور نہ تاریکی چھٹتی ہے کہ قدم اُٹھائے۔

مختصر سی عبارت میں قرآن ایسے مسافر کی نقشہ کشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ منافقین کی حالت یا ایسی ہے جیسے تاریک رات میں سخت بارش گرج چمک اور بجلیوں کے ساتھ راہگذاروں کے سروں پر برس رہی ہو (او کصیب من السماء فیہ ظلمات ورعد وبرق) اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لیتے ہیں تاکہ وحشتناک بجلیوں کی آواز نہ سنیں (یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت)۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اول، ص ۳۹

اور آخر میں فرماتا ہے، خداوند عالم کی قدرت کافروں پر محیط ہے وہ جہاں جائیں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں (واللہ محیط بالکافرین)۔

پے درپے بجلیاں صفحۂ آسمان پر کوندتی ہیں۔ بجلیوں کی روشنی آنکھوں کو یوں خیرہ کئے دیتی ہے کہ قریب ہے کہ آنکھوں کو اچک لے (یکاد البرق یخطف ابصارھم)

جب بجلی چمکتی ہے اور صفحۂ بیابان روشن ہو جاتا ہے تو مسافر چند قدم چل لیتے ہیں لیکن فوراً تاریکی ان پر مسلط ہو جاتی اور وہ اپنی جگہ پر رک جاتے ہیں (کلما اضاء لھم مشو فیہ و اذا اظلم علیھم قاموا) وہ ہر لحظہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس وسطِ بیابان میں کوئی پہاڑ دکھائی دیتا ہے نہ درخت نظر پڑتا ہے جو رعد اور برق و صاعقہ کے خطرے کو روک سکے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ بجلی ان پر گرے اور وہ فوراً خاکستر ہو جائیں۔

ہم جانتے ہیں کہ صواعق (آسمانی بجلیاں) زمین سے ابھری ہوئی چیز پر حملہ کرتی ہیں لیکن وسطِ بیابان میں سوائے ان اشخاص کے کوئی ابھری ہوئی چیز بھی نہیں کہ بجلی اس طرف متوجہ ہو لہٰذا خطرہ یقینی اور حتمی ہے یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کوہستانی علاقوں کی نسبت حجاز کے بیابانوں میں آسمانی بجلی کے انسانوں پر گرنے کا خطرہ نسبتاً کئی گنا زیادہ ہے اس مثال کی اہمیت اس علاقے کے لوگوں کے لئے زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں مضطرب، پریشان اور حیران و سرگرداں اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ بیابان ور ریگستان میں نہ راہ سجھائی دیتی ہے نہ کوئی راہنما نظر آتا ہے۔ جس کی راہنمائی میں قدم آگے بڑھا سکیں۔ یہ خطرہ بھی کہ بادلوں کی گرج ان کے کانوں کے پردے پھاڑ دے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی بصارت چھین لے جائے اور اگر خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں ختم کر دے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم و ابصارھم ان اللہ علی کل شیء قدیر)۔

منافق بعینہٖ ان مسافروں کی طرح ہیں۔ مومنین کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اور وہ سخت سیلاب اور موسلادھار بارش کی طرح ہر طرف سے آگے بڑھ رہے ہیں انکے درمیان منافق موجود ہیں افسوس کہ انہوں نے قابل اطمینان پناہ گاہ 'ایمان' سے پناہ نہیں لی تاکہ عذاب الہٰی کی فنا کر دینے والی بجلیوں سے نجات پا سکیں۔

مسلمانوں کا مسلح جہاد دشمنوں کے مقابلے میں رعد و صاعقہ کی سخت آواز کی طرح ان کے سر پر آپڑتا ہے کبھی کبھی راہ حق پیدا کرنے کے مواقع انہیں نصیب ہوتے ہیں کہ کچھ انکا بیدار ہوں مگر افسوس کہ یہ بیداری آسمانی بجلی کی طرح دیر پا نہ رہتی چند ہی قدم چلتے تو بجھ جاتی اور غفلت کی تاریکی پھر توقف و سرگردانی کی جگہ لے لیتی۔

اسلام کی تیز پیش رفت آسمانی بجلی کی طرح ان کی آنکھوں کو خیرہ کر چکی تھی اور آیاتِ قرآنی ان کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھا رہی تھیں اور بجلیوں کی طرح انہیں اپنا ہدف بناتی تھیں۔ انہیں ہر وقت احتمال ہوتا کہ کہیں کوئی آیت نازل ہو کر ان کے کسی اور راز سے پردہ نہ اٹھا دے اور وہ زیادہ رسوا نہ ہو جائیں۔

جیسا کہ قرآن سورہ توبہ، آیت ۶۴ میں فرماتا ہے:

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝

منافق اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادہ کوئی سورہ ان کے برخلاف نازل ہو اور جو کچھ وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں وہ فاش ہو جائے۔ کہیے جتنا چاہتے ہو استہزاء کرو جس سے ڈرتے ہو خدا اسے ظاہر کر کے رہیگا۔

منافق اس سے بھی ترساں تھے کہ ان کے اسرار ظاہر ہو جانے کے بعد کہیں خدا کی طرف سے ان اندرونی خائن دشمنوں کے خلاف فرمان جنگ جاری نہ ہو جائے اور مسلمان جو اس وقت قوی اور طاقت ور ہو چکے ہیں ان پر حملہ نہ کر دیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِى الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۖۛ مَّلْعُوْنِيْنَ ۛۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝

اگر منافقین اور وہ جن کے دل بیمار ہیں اور جو جھوٹی خبریں اڑا کر خوف، وحشت اور مایوسی پیدا کرتے ہیں اپنے برے کردار سے باز نہ آئے تو ہم ضرور ان کے خلاف تمہیں قیام کا حکم دیں گے تاکہ وہ تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں اور وہ جہاں مل جائیں انہیں قابل نفرت افراد کی طرح گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔

(احزاب - ۶۰، ۶۱)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ منافق مدینہ میں انتہائی وحشت و سرگردانی میں مبتلا تھے۔ سخت لہجہ اور دو ٹوک آیات پے در پے رعد و برق آسمانی کی طرح ان کے خلاف نازل ہوتی تھیں اور انہیں ہر وقت احتمال رہتا تھا کہ ان کی سرکوبی یا کم از کم انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم صادر ہو جائے۔ اگرچہ ان آیات کی شان نزول زمانہ پیغمبر کے منافقین سے متعلق ہے لیکن چونکہ منافقین ہر عہد کے سچے اور حقیقی انقلابوں کے مقابلے میں موجود رہتے ہیں اس لئے ہر عصر و قرن کے منافقین کے لئے یہ آیات وسعت رکھتی ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے ایک ایک کر کے یہ تمام نشانیاں سر مو فرق کے بغیر اپنے زمانے کے منافقین میں دیکھ رہے ہیں۔ ان کی سرگردانی ان کا اضطراب غرضیکہ ان کی بیچارگی، بدبختی اور رسوائی بالکل اس مسافر کی طرح نظر آتی ہے جس کی قرآن نے نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔

دونوں مثالوں کا فرق: زیر نظر آیات میں پہلی اور دوسری مثال ایک دوسرے سے کیا فرق رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ پہلی آیت (مثلھم کمثل الذی ...) ان منافقین کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ابتداء میں سچے مومنین کی صف میں داخل ہوئے اور حقیقتاً ایمان لائے تھے لیکن یہ ایمان مستقر اور مستحکم نہ تھا لہذا وہ نفاق کی طرف جھک گئے۔

باقی رہی دوسری مثال (او کصیب من السماء ...) تو وہ ان منافقین کی حالت بیان کرتی ہے جو ابتداء ہی سے منافقین کی صف میں تھے اور ایک لحظہ کے لئے بھی ایمان نہیں لائے۔

(۲) دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی مثال افراد کی حالت کو واضح کرتی ہے اور دوسری مثال معاشرے کی کیفیت بیان کرتی ہے لہذا پہلی مثال میں ہے "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِىْ" ان لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے اور دوسری مثال میں ہے

"اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ" یا ان کی مثال ایسی ہے کہ موسلا دھار بارش جو آسمان سے برستی ہے اور اس میں تاریکیاں، رعد اور برق ہے جو وحشت ناک ہے اور خوف و خطر سے بھرپور ہے کہ جس میں منافق زندگی گزارتے ہیں۔

۲۱۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ

۲۲۔ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ اے لوگو! اپنے پروردگار کی پرستش و عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ اور اللہ کے لئے شریک قرار نہ دو اور تم جانتے ہی ہو۔

۲۲۔ وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان (فضائے زمین) کو تمہارے سروں پر چھت کی طرح قائم کیا، آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے میوہ جات کی پرورش کی تاکہ وہ تمہاری روزی بن جائیں جیسا کہ تم جانتے ہو (ان شرکاء اور بتوں میں سے نہ کسی نے تمہیں پیدا کیا اور نہ تمہیں روزی دی لہٰذا بس اسی خدا کی عبادت کرو)۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں خداوند تعالیٰ نے تین گروہوں (پرہیزگار، کفار اور منافقین) کی تفصیل بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ پرہیزگار ہدایت الٰہی سے نوازے گئے ہیں اور قرآن ان کا راہنما ہے جب کہ کفار کے دلوں پر جہل و نادانی کی مہر لگادی ہے اور ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ان کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے اور ان سے حق تمیز چھین لی ہے اور منافق ایسے بیمار دل ہیں کہ ان کے بُرے عمل کے نتیجے میں ان کی بیماری بڑھاری ہے۔

زیر بحث آیات میں تقابل کے بعد سعادت و نجات کی راہ جو پہلے گروہ کے لئے ہے واضح طور پر مشخص کرتے ہوئے فرماتا ہے اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے تاکہ پرہیزگار بن جاؤ (يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○)۔

چند اہم نکات

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کا خطاب: اس کا مطلب ہے "اے لوگو" اس خطاب کی قرآن میں تقریباً بیس مرتبہ تکرار

ہے۔ یہ جامع اور عمومی خطاب ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کسی قبیلے یا گروہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس کی دعوت عام ہے اور یہ سب کو ایک یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے شرک اور راہ توحید سے انحراف کا مقابلہ کرتا ہے۔

(۲) خلقتِ انسان نعمتِ خداوندی ہے: انسان کے جذبۂ تفکر کو ابھارنے کے لئے اور اسے عبادت پروردگار کی طرف مائل کرنے کے لئے قرآن اپنی گفتگو کا آغاز تمام انسانوں کی خلقت و آفرینش سے کرتا ہے جو ایک اہم ترین نعمت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو خدا کی قدرت، علم و حکمت اور رحمت خاص و عام کی نشانی ہے کیونکہ انسان جو عالم ہستی کا مکمل نمونہ ہے اس کی خلقت میں خدا کے غیر متناہی علم و قدرت اور اس کی وسیع نعمتیں مکمل طور پر نظر آتی ہیں۔

جو لوگ خدا کے سامنے نہیں جھکتے اور اس کی عبادت نہیں کرتے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی اور اپنے سے پہلے لوگوں کی خلقت میں غور نہیں کرتے وہ اس نکتے کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ اس عظیم خلقت کو گونگی اور بہری طبیعت کے عوامل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا اور ان بے حساب و بے نظیر نعمتوں کو جو انسانی جسم و جان میں نمایاں ہیں سوائے اس مبداء کے نہیں کہا جاسکتا جس کا علم اور قدرت لامتناہی ہے۔

اس بناء پر ذکر نعمات ایک تو خداشناسی کے لئے دلیل ہے اور دوسرا شکر گزاری اور عبادت کے لئے محرک ہے۔

(۳) عبادت کا نتیجہ ـــــ تقویٰ و پرہیزگاری (لعلکم تتقون): ہماری عبادتیں اور تسبیحات خدا کے جاہ و جلال میں اضافے کا باعث نہیں اسی طرح ان کا ترک کرنا اس کے مقام کی عظمت میں کمی کا باعث نہیں۔ یہ عبادات تو "تقویٰ" کا سبق حاصل کرنے کے لئے تربیتی کلاسیں ہیں اور تقویٰ (بھی) ـــــ احساس ذمہ داری اور انسان کے جذبۂ باطن کا نام ہے جو انسان کی قیمت کا معیار اور مقام شخصیت کا میزان و ترازو ہے۔

(۴) الذین من قبلکم: یہ شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم بتوں کی پرستش میں اپنے آباؤ و اجداد کی سنت سے استدلال کرو تو خدا جو تمہیں پیدا کرنے والا ہے وہی تمہارے آباؤ اجداد کا مالک و پروردگار ہے۔ اس بناء پر بتوں کی پرستش تمہاری طرف سے ہو چاہے ان کی طرف سے بجروی کے سوا کچھ نہیں۔

نعمت آسمان و زمین

زیر نظر دوسری آیت میں خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ہے جو ہمارے لئے شکر گزاری کا سبب ہو سکتا ہے۔

پہلے زمین کی پیدائش کے بارے میں گفتگو ہے کہتا ہے "وہی خدا جس نے زمین کو تمہارے لئے آرام دہ بچھونا قرار دیا" الذی جعل لکم الارض فراشا۔ یہ رہوار جس نے تمہیں اپنی پشت پر سوار کر رکھا ہے، اس فضا میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی مختلف حرکات جاری رکھے ہوئے ہے جب کہ اس سے تمہارے وجود میں کوئی حرکت و لرزش پیدا نہیں ہوتی۔ یہ اس کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے اس زمین کی کشش ثقل کی وجہ سے تمہیں حرکت اور استراحت، گھر اور آشیانہ، باغ اور کھیتی اور قسم قسم کے وسائل زندگی میسر ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ زمین کی کشش ثقل بھی ایک نعمت ہے اگر یہ نہ ہو تو چشم زدن میں ہم سب اور ہماری

زندگی کے سب وسائل زمین کی دورانی حرکت کے نتیجے میں فضا میں جا پڑیں اور سرگرداں پھرتے ہیں۔

زمین بچھونا ہے: زمین کو بستر استراحت سے تعبیر کیا گیا ہے یہ کس قدر خوبصورت تعبیر ہے۔ بستر میں نہ صرف اطمینان، آسودگی خاطر اور استراحت کا مفہوم پنہاں ہے بلکہ گرم و نرم ہونا اور حد اعتدال میں رہنے کے معنی بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ عالم تشیع کے چوتھے پیشوا امام سجاد علی ابن الحسینؑ نے اپنے ایک بہترین بیان میں اس آیت کی تفسیر میں اس حقیقت کی تشریح فرمائی ہے:

جعلها ملائمة لطباعکم موافقة لاجسامکم و لم یجعلها شدید الحمی والحرارۃ فتحرقکم ولاشدیدۃ البرد فتجمدکم ولاشدیدۃ طیب الریح فتصدع هاماتکم ولاشدیدۃ النتن فتعطبکم ولاشدیدۃ اللین کالماء فتغرقکم ولاشدیدۃ الصلابة فتمتنع علیکم فی دورکم و ابنیتکم وقبور موتاکم فلذا جعل الارض فراشا لکم۔

خدا نے زمین کو تمہاری طبیعت اور مزاج کے مطابق بنایا اور تمہارے جسم کی موافقت کے لئے اسے گرم اور جلانے والی نہیں بنایا کہ اس کی حرارت سے تم جل جاؤ اور اسے زیادہ ٹھنڈا بھی پیدا نہیں کیا کہ کہیں تم منجمد ہو جاؤ۔ اسے اس قدر معطر اور خوشبودار پیدا نہیں کیا کہ اس کی تیز خوشبو تمہارے دماغ کو تکلیف پہنچائے اور اسے بدبودار بھی پیدا نہیں کیا کہ کہیں تمہاری ہلاکت کا ہی سبب بن جائے۔ ایسے پانی کی طرح نہیں بنایا کہ تم اس میں غرق ہو جاؤ۔ اور اسے اتنا سخت بھی نہیں بنایا تاکہ تم اس میں گھر اور مکانات بنا سکو اور مُردوں کو (جن کا سطح زمین پر رہ جانا گوناگوں پریشانیوں کا باعث ہوتا) اس میں دفن کر سکو۔ ہاں خدا ہی نے زمین کو تمہارے لئے ایسا بستر استراحت قرار دیا ہے۔[1]

پھر نعمت آسمان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: آسمان کو تمہارے سروں پر چھت جیسا بنایا ہے (والسماء بناء)

لفظ "بناء" لفظ "علیکم" کی طرف توجہ کریں تو یہ بیان کرتا ہے کہ آسمان تمہارے سر کے اوپر بالکل چھت کی طرح بنا ہوا ہے۔ یہی معنی زیادہ صراحت کے ساتھ قرآن میں ایک اور جگہ بھی ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا ہے۔ (انبیاء - ۳۲)

شاید یہ تعبیر بعض ایسے افراد کے لئے عجیب و غریب ہو جو آسمان و زمین کی عمارت کی کیفیت کو آج کے علم ہیئت کی نظر سے جانتے ہیں یعنی یہ چھت کیونکر ہے اور کہاں ہے۔ بطلیموس کی فرضی ہیئت جس کے مطابق افلاک ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح ہیں کیا یہ تعبیر اس مفہوم کو تو ہمارے دلوں میں بٹھانا نہیں چاہتی؟

مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کرنے سے مطلب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے:

---

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۴۱

لفظ "سما" قرآن میں مختلف معانی کے لئے آیا ہے جس میں مشترک قدر وہ چیز ہے جو مندرجہ بالا جہت میں ہے ان میں سے ایک معنی جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ وہی فضائے زمین ہے یعنی ہوائے متراکم کا چھلکا اور چھڑا جس نے ہر طرف سے کرۂ زمین کو چھپایا ہوا ہے اور علماء و دانشوروں کے نظریہ کے مطابق اس کی ضخامت کئی سو کلو میٹر ہے۔

اب اگر ہم اس ہوا کے قشر ضخیم کے اساسی اور حیاتی نقش کے بارے میں جس نے زمین کو ہر طرف سے گھیرا اور احاطہ کیا ہوا ہے غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ چھت انسانوں کی حفاظت کے لئے کس قدر محکم اور مؤثر ہے۔ یہ مخصوص ہوائی جلد جو بلوریں چھت کی طرح ہمارے گرد احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سورج کی حیات بخش شعاعوں کے پہنچنے سے مانع بھی نہیں اور محکم و مضبوط بھی ہے بلکہ کئی میٹر ضخیم فولادی تہوں سے زیادہ مضبوط ہے۔

اگر یہ چھت نہ ہوتی تو زمین ہمیشہ پراگندہ آسمانی پتھروں کی بارش کی زد میں رہتی اور عملی طور پر لوگوں سے راحت و اطمینان چھن جاتا لیکن یہ سخت جلد جو کئی سو کلو میٹر ہے[1] تمام آسمانی پتھروں کو زمین کی سطح تک پہنچنے سے پہلے جلا کر نابود کر دیتی ہے اور بہت کم مقدار میں ایسے پتھر ہیں جو اس جلد کو عبور کر کے خطرے کی گھنٹی کے عنوان سے گوشہ و کنار میں آگرتے ہیں لیکن یہ قلیل تعداد اہل زمین کے اطمینان میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتی۔

منجملہ شواہد کے جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آسمان کے ایک معنی فضائے زمین ہے وہ حدیث ہے جو ہمارے بزرگ پیشوا امام صادقؑ سے آسمان کے رنگ کے بارے میں منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اے مفضل! آسمان کے رنگ میں غور و فکر کرو کہ خدا نے اسے آبی رنگ پیدا کیا ہے جو انسانی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ موافق ہے یہاں تک کہ اسے دیکھنا بینائی کو تقویت پہنچاتا ہے۔[2]

آج اس چیز کو ہم سب جانتے ہیں کہ آسمان کا آبی رنگ در اصل اس متراکم ہوا کا رنگ ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔
اس بنا پر اس حدیث میں آسمان سے مراد یہی فضائے زمینی ہے۔

سورہ نحل کی آیہ ۷۹ میں ہے:

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ

آیا وہ ان پرندوں کو نہیں دیکھتے جو وسط آسمان میں تسخیر شدہ ہیں۔

آسمان کے دوسرے معانی کے سلسلے میں اسی سورت کی آیت ۲۹ میں آپ مزید صراحت سے مطالعہ کریں گے۔

اس کے بعد بارش کی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "اور آسمان سے پانی نازل کیا (و انزل من السماء ماء)

---

[1] بہت سی کتب میں اس ہوائی جلد کی ضخامت ایک سو کلو میٹر لکھی ہوئی ہے لیکن بظاہر ان کا مقصود وہ جگہ ہے جہاں ہوا کے سالمے (MOLECULES) نسبتاً زیادہ نزدیک ہیں لیکن موجودہ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ چند سو کلو میٹر کی ضخامت میں ہوا کے سالمے پراگندہ حالت میں موجود ہیں۔

[2] توحید مفضل۔

کیا پانی — جو حیات بخش، تمام آبادیوں کا سبب اور تمام مادی نعمتوں کا جامع ہے۔ جملہ "انزلنا من السماء" دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ سماء سے مراد یہاں وہی فضائے آسمانی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بارش بادلوں سے برستی ہے اور بادل فضائے زمین میں موجود بخارات سے پیدا ہوتے ہیں۔

امام سجاد علی ابن الحسینؑ اس آیہ کے ذیل میں بارش کے آسمان سے نازل ہونے کے بارے میں ایک جاذب نظر بیان میں ارشاد فرماتے ہیں :

"خداوند عالم بارش کو آسمان سے نازل کرتا ہے تاکہ وہ پہاڑوں کی تمام چوٹیوں، ٹیلوں اور گرموں غرض تمام بلند و ہموار جگہوں تک پہنچ جائے (اور سب بغیر استثناء کے سیراب ہوں) اور یہ نرم اور پے در پے اور کبھی سخت دانوں کی شکل میں اور کبھی قطرات کی صورت میں برستی ہے تاکہ پوری طرح زمین کے اندر چلی جائے اور زمین اس سے سیراب ہو۔ اسے سیلاب کی صورت میں نہیں بھیجا کہ مبادا زمینوں، درختوں، کھیتوں اور تمہارے پھلوں کو بہا لیجائے اور انہیں ویران کر دے۔"[1]

اس کے بعد قرآن بارش کی برکت سے پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھلوں اور ان روزیوں کی طرف جو انسانوں کا نصیب ہیں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "خداوند عالم نے بارش کے سبب میوہ جات کو تمہاری روزی کے عنوان سے زمین سے نکالا (فاخرج به من الثمرات رزقا لکم)۔

یہ خدائی پروگرام ایک طرف خدا کی وسیع اور پھیلی ہوئی رحمت کو جو اس کے بندوں پر ہے مشخص کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی قدرت کو بیان کرتا ہے۔ اس نے کس طرح بے رنگ پانی سے ہزاروں رنگوں کے میوے جو انسانی غذا کے لئے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں اور اسی طرح دوسرے جاندار پیدا کیے جو اس کے وجود کے زندہ ترین دلائل میں سے ہیں لہذا بلا فاصلہ مزید کہتا ہے "جب ایسا ہی ہے تو پھر خدا کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تمہیں معلوم ہے (فلا تجعلوا لله اندادا و انتم تعلمون) تم سب جانتے ہو کہ ان بتوں اور خود ساختہ شرکاء نے تمہیں پیدا نہیں کیا اور نہ یہ روزی دیتے ہیں، تمہارے پاس کوئی کم ترین نعمت بھی ان کی طرف سے نہیں پس کس طرح انہیں خدا کا شبیہ و نظیر قرار دیتے ہو۔

"انداد" جمع ہے "ند" (بروزن "ضد") کی۔ اس کے معنی ہیں شریک و شبیہ۔ ظاہر ہے کہ یہ شباہت و شرکت بت پرستوں کے گمان میں تھی نہ یہ کہ اس کی کوئی حقیقت و واقعیت ہے یا زیادہ دقیق تعبیر کی بناء پر جیسے راغب نے مفردات میں کہا ہے "ند" و "ندید" وہ چیز ہے جو گوہر ذات میں کسی دوسری چیز کی شریک اور شبیہ ہو اسی بناء پر ایک خاص قسم کی شباہت کے لئے یہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول، ص ۴۲ کے مطابق حدیث کی عبارت اس طرح ہے :

ینزله من اعلی لیبلغ قلل جبالکم و تلالکم و هضابکم و اوهادکم ثم فرقه رذاذا و وابلا و هطلا لتنشفه ارضوکم ولم یجعل ذلک المطر نازلا علیکم قطعة واحدة فیفسد ارضیکم و اشجارکم و زروعکم و ثمارکم

لفظ بولا جاتا ہے یعنی گوہر ذات میں ایک جیسا ہونا۔

بت پرستی مختلف شکلوں میں

یہاں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے کہ خدا کا شریک قرار دینا یہی نہیں کہ پتھر اور لکڑی کے بت بنالئے جائیں یا اس سے بڑھ کر انسان کو مثلاً مسیح کو تین میں سے ایک خدا سمجھا جائے بلکہ اس کے وسیع ترمعنی ہیں جو زیادہ مخفی اور پنہاں صورتوں پر بھی مشتمل ہیں کلیہ و قاعدہ یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کو بھی خدا کے ساتھ ساتھ مؤثر سمجھا جائے ـــ وہ ایک قسم کا شرک ہے۔

اس موقع پر ابن عباس کی ایک عجیب تفسیر ہے وہ کہتے ہیں:

الانداد هو الشرك الخفی من دبیب النمل علی صفاة سوداء فی ظلمة اللیل وهو ان یقول والله وحیاتك یا فلان وحیاتی .... ویقول لولا کلبه هذا لاتانا اللصوص البارحة .... وقول الرجل لصاحبه ماشاء الله وشئت هذا کله به شرك یعنی ـــ انداد وہی شرک ہے جو کبھی تاریک رات میں سیاہ پتھر پر ایک چیونٹی کی حرکت سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔ انسان کا یہ کہنا کہ خدا کی قسم اور تیری جان کی قسم یا خدا کی قسم اور مجھے میری جان کی قسم (یعنی خدا اور دوست کی جان یا خدا اور اپنی جان کو ایک ہی لائن میں قرار دینا) یا یوں کہنا کہ اگر یہ کتیا کل رات نہ ہوتی تو چور آگھُستے (لہٰذا چوروں سے نجات دلانے والی یہ کتیا ہے) یا پھر اپنے دوست سے کہے کہ جو کچھ خدا چاہے اور تم پسند کرو ـــ ان سب میں شرک کی بُو ہے۔[1]

ایک حدیث میں ہے:

ایک شخص نے نبی اکرمؐ کے سامنے یہ جملہ کہا:

"ماشاء اللہ وشئت" (جو کچھ خدا اور آپ چاہتے ہیں)

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اجعلتنی للہ ندًا" (کیا تونے مجھے اللہ کا شریک و ردیف قرار دیا)۔

عام لوگ روزانہ ایسی بہت سی باتیں کرتے رہتے ہیں مثلاً "پہلے خدا پھر تم" یاد رکھیے کہ ایک کامل موحد انسان کے لئے یہ تعبیرات بھی مناسب نہیں ہیں۔

سورہ یوسف کی آیت ۱۰۶ ـــ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ٥ کی تفسیر کے ذیل میں امام صادقؑ سے ایک روایت ہے، آپؑ نے (شرک خفی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا:

جیسے ایک انسان دوسرے سے کہتا ہے اگر تو نہ ہوتا تو میں نابود ہوجاتا یا میری زندگی تباہ

---

[1] فی ظلال سید قطب، جلد اول، ص ۴۶۔

ہو جاتی "۔ [1]

اس کی مزید وضاحت اسی تفسیر میں سورہ یوسف، آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

۲۳۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۲۴۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۳۔ اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (پیغمبر) پر نازل کی ہے کوئی شک و شبہ ہے تو (کم از کم) ایک سورہ اس کی مثل لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر اپنے گواہوں کو بھی اس کام کی دعوت دو، اگر تم سچے ہو۔

۲۴۔ اگر یہ کام تم نے نہ کیا اور کبھی کر بھی نہ سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسانوں کے بدن اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

تفسیر

قرآن ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے

گذشتہ آیات کا موضوع سخن کفر و نفاق ہے۔ کفر و نفاق کبھی نبوت اور اعجاز پیغمبر کے عدم ادراک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا زیر بحث آیات میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ انگشت قرآن پر رکھ دی گئی ہے جو ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔ یہ اس لئے کہ رسول اسلام کی رسالت کے بارے میں ہر قسم کا شک و شبہ دور ہو سکے۔

قرآن کہتا ہے، "اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کوئی شک و شبہ ہے تو ایک سورت

---

[1] سفینۃ البحار، جلد اول، ص ۴۹۶

ہی اس جیسی سے آؤ" (ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ)[1] مقابلے کی دعوت اور چیلنج کو قطعی ہونا چاہیئے اور دشمن کو پوری طرح تحریک پیدا کرنی چاہیئے۔ اور اصطلاحاً غیرت دلانی چاہیئے تاکہ وہ ساری طاقت استعمال کر سکے۔ اس طرح جب عجز و ناتوانی ثابت ہو جائے گی تو وہ مسلم طور پر جان لے گا کہ جس چیز کے وہ مدمقابل ہے وہ کام بشر نہیں بلکہ خدائی کام ہے لہذا بعد والی آیت میں مختلف تعبیروں سے اسے بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "اگر تم اس کام کو انجام نہ دے سکے اور ہرگز نہ دے سکو گے لہذا اس آگ سے ڈرو کہ جس کا ایندھن بے ایمان آدمیوں کے بدن اور پتھر ہیں (فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ) یعنی آگ ابھی سے کافروں کے لئے تیار ہے اور اس میں تاخیر نہ ہوگی (اعدت للکافرین)۔

"وقود" کے معنی ہیں وہ چیز جسے آگ پکڑ لے یعنی وہ مادہ جو جلنے کے قابل ہے جیسے لکڑیاں۔ اس سے مراد وہ چیز نہیں جس سے آگ نکلے مثلاً ماچس یا وہ خاص پتھر جن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔

مفسرین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ "حجارۃ" سے بت مراد ہیں جنہیں پتھر سے بنایا گیا تھا اور سورۃ انبیاء کی آیت ۹۸ کو اس کا شاہد قرار دیتا ہے:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۝

تم اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں۔

ایک اور گروہ کہتا ہے کہ "حجارۃ" سے مراد گندھک کے پتھر ہیں جن کی حرارت دوسرے پتھروں سے زیادہ ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس تعبیر کا مقصد جہنم کی شدتِ حرارت کی طرف متوجہ کرنا ہے یعنی اس میں ایسی حرارت و تپش ہوگی جو پتھروں اور انسانوں کو بھی شعلہ ور کر دے گی۔

گذشتہ آیات کے پیشِ نظر جو بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جہنم کی آگ خود انسانوں اور پتھروں کے اندر سے نکلے گی اور یہ حقیقت آج ثابت ہو چکی ہے کہ جسموں کے اندر ایک عظیم آگ چھپی ہوئی ہے (دوسرے لفظوں میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو آگ میں تبدیل ہو سکتی ہیں)، یہ مفہوم سمجھنا مشکل نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس جلانے والی آگ کو اس دنیا کی عمومی آگ

---

[1] بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ضمیر "مثلہ" رسول اکرمؐ کے بارے میں ہے جنہیں قبل کے جملے میں "عبدنا" سے یاد کیا گیا یعنی اگر اس وحی آسمانی کے حقیقی ہونے میں تمہیں شک ہے تو کوئی شخص محمدؐ جیسا پیش کرو جس نے بالکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور نہ خط و کتابت سیکھی ہو جو ایسا کلام پیش کر سکے۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ یوں آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ (طور ۳۴)

ایک اور مقام پر ہے:

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ (یونس ۳۸)

۰ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "مثلہ" قرآن کے لئے ہے پیغمبر کے لئے نہیں۔

کی طرح سمجھا جائے۔

سورۂ ہمزہ آیہ ۷، ۶ میں ہے:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ

خدا کی جلانے والی آگ جس کا سرچشمہ دل ہیں اور جو اندر سے باہر کی طرف سرایت کرتی ہے (اس جہان کی آگ کے برعکس جو باہر سے اندر تک پہنچتی ہے)۔

چند اہم نکات

(۱) انبیاء کے لئے معجزے کی ضرورت: ہم جانتے ہیں کہ نبوت و رسالت ایک عظیم ترین منصب ہے جو پاک لوگوں کے ایک گروہ کو عطا ہوا ہے کیونکہ دوسرے منصب و مقام جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں لیکن نبوت وہ منصب ہے جو معاشرے کی روح اور دل پر حکومت کرتا ہے۔ جھوٹے مدعی اور بہت سے بڑے افراد اس کی رفعت و سربلندی کے ہی پیش نظر اس منصب کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس سے غلط مفاد اٹھاتے ہیں۔

لوگ یا تو ہر مدعی کے دعویٰ کو قبول کرلیں یا سب کی دعوت کو رد کر دیں۔ سب کو قبول کرلیں تو واضح ہے کہ کس قدر ہرج و مرج لازم آئے گا اور دین خدا کی کیا صورت بنے گی اور اگر کسی کو بھی قبول نہ کریں تو اس کا نتیجہ بھی گمراہی اور پسماندگی ہے اس بناء پر جس دلیل کی رو سے انبیاء کا وجود ضروری ہے اسی دلیل کی روشنی میں سچے انبیاء کے پاس ایسی نشانی ہونی چاہیئے جو جھوٹے دعویداروں سے انہیں ممتاز قرار دے اور وہ ان کی حقانیت کی سند ہو۔

اس اصل کی بناء پر ضروری ہے کہ نبی معجزہ لے کر آئے جو اس کی رسالت کی صداقت کا شاہد ہو سکے اور جیسا کہ لفظ معجزہ سے واضح ہے نبی خارق العادۃ اعمال (وہ کام جو عموماً نہ ہوئے ہوں) انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو جن کی انجام دہی سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔

نبی جو صاحب معجزہ ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو مقابلہ بمثل کی دعوت دے (یعنی کہے کہ ایسا کام تم بھی کر دکھاؤ) اور وہ اپنی گفتار کی سچائی کی علامت و نشانی کو اپنا معجزہ قرار دے تاکہ اگر دوسرے بھی ویسا کام کر سکتے ہیں تو بجالائیں۔ اس کام کو اصطلاح میں تحدی (چیلنج) کہتے ہیں۔

قرآن رسول اسلام کا دائمی معجزہ

جو معجزات اور خارق عادات پیغمبر اسلام سے صادر ہوئے قرآن ان میں سے آپ کی حقانیت کی بلند ترین اور زندہ سند ہے۔ قرآن افکار بشر سے بلند تر کتاب ہے کوئی اب تک ایسی کتاب نہیں لا سکا۔ یہ ایک عظیم آسمانی معجزہ ہے۔

قرآن پیغمبر اسلام کی حقانیت کی زندہ سند ہے اور آپ کے معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی علت یہ ہے:

قرآن ایک بولنے والا ابدی، عالمگیر اور روحانی معجزہ ہے۔

گذشتہ انبیاء کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے معجزات کے ساتھ ہوں اور ان کے اعجاز کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کو مقابلہ

بشل کی دعوت دیں۔ درحقیقت ان کے معجزات کی اپنی کوئی زبان نہ تھی بلکہ انبیاء کی گفتار ان کی تکمیل کرتی تھی۔ یہی بات قرآن کے علاوہ پیغمبر اسلام کے دیگر معجزات پر بھی صادق آتی ہے۔

لیکن قرآن ایک بولنے والا معجزہ ہے وہ تعارف کرانے کے لئے محتاج نہیں۔ وہ خود اپنی طرف دعوت دیتا ہے اور مخالفین کو مقابلے کے لئے پکارتا ہے، انہیں مغلوب کرتا ہے اور خود میدانِ مقابلہ سے کامیابی کے ساتھ نکلتا ہے لہٰذا وفات نبی کو کئی صدیاں بیت گئیں مگر قرآن آپ کے زمانہ حیات کی طرح آج بھی اپنا دعویٰ پیش کر رہا ہے۔ قرآن خود دین بھی ہے اور معجزہ بھی۔ قانون بھی ہے اور سندِ قانون بھی، قرآن زمان و مکان کی سرحد سے مافوق ہے۔

گزشتہ انبیاء کے معجزات بلکہ قرآن کے علاوہ آنحضرتؐ کے دیگر معجزات بھی معین و مشخص زمان و مکان اور مخصوص افراد کے سامنے ظہور پذیر ہوتے تھے۔ مثلاً حضرت مریمؑ کے نومولود بچے کی گفتگو، مردوں کو زندہ کرنا اور حضرت مسیحؑ کے ایسے دوسرے معجزات مخصوص زمان و مکان اور معین اشخاص کے لئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو امور زمان و مکان کے رنگ سے ہم آہنگ ہوں گے وہ اس زمان و مکان سے جتنا دور ہوں گے ان کے رنگ و روپ میں کمی واقع ہوگی اور یہ چیز امور زمانی کے خواص میں سے ہے۔

لیکن قرآن کسی خاص زمان و مکان سے وابستہ نہیں۔ یہ جس طرح اور جس حالت میں چودہ سو سال قبل حجاز کے تاریک ماحول میں جلوہ گر تھا اسی طرح آج بھی ہم پر ضوفشاں ہے بلکہ رفتار زمانہ اور علم و دانش کی پیش رفت کی وجہ سے ہم میں اس کی استعداد بڑھ گئی ہے کہ دور حاضر کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ یہ واضح ہے کہ جس پر اپنے زمان و مکان کا رنگ نہ ہو وہ ابد تک اور سارے جہان تک رسائی حاصل کر سکے گا اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک عالمی دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالمی و ابدی سند حقانیت رکھتا ہو۔

قرآن روحانی کیوں ہے؟

گزشتہ انبیاء سے جو خارق عادت امور ان کی گفتار کے سچے گواہ کے طور پر دیکھنے میں آتے تھے وہ عموماً جسمانی پہلو رکھتے تھے۔ ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مُردوں کو زندہ کرنا، نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں باتیں کرنا وغیرہ سب جسمانی پہلو رکھتے تھے اور انسان کی آنکھ اور کان کو مسخر کرتے تھے لیکن قرآنی الفاظ جو انہی عام حروف و کلمات سے مرکب ہیں انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، انسان کی روح انہیں عجیب و غریب سمجھتے ہوئے ان کے لئے احساساتِ تحسین سے معمور ہو جاتی ہے اور افکار و عقول ان کی تعظیم پر مجبور نظر آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو صرف انسانی اذہان، افکار اور ارواح سے سروکار رکھتا ہے۔ جسمانی معجزات پر ایسے معجزے کی برتری کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

کیا قرآن نے مقابلے کے لئے چیلنج کیا ہے؟

قرآن نے چند ایک سورتوں میں اپنی مثل لانے کے لئے چیلنج کیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) سورۂ اسراء آیہ ۸۸ (یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی) میں ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ
وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ٥

کہیے کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں تاکہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے اگرچہ خوب ہم فکر و ہم کار بھی ہو جائیں۔

(ii) سورہ ہود (جو بھی مکہ میں نازل ہوئی) کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں یوں ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات خدا پر افتراء ہیں کہہ دے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو ایسی دس سورتیں گھڑ کے لے آؤ اور بدون خدا جسے مدد کی دعوت دے سکتے ہو دے لو ـــــ اور اگر انہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو جان لو کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں۔

(iii) سورہ یونس (جو مکہ میں نازل ہوئی) کی آیت ۳۸ میں اس طرح ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥

کیا وہ کہتے ہیں کہ خدا پر افتراء باندھا گیا ہے آپ کہیے کہ اس جیسی ایک سورت لا دکھاؤ اور خدا کے علاوہ ہر کسی کو مدد کے لئے طلب کر لو اگر تم سچے ہو۔

(iv) چوتھی مثال یہی زیر بحث آیت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

جیسا کہ واضح ہے کہ قرآن صراحت اور بے نظیر قاطعیت اور یقین کے ساتھ مقابلے کی دعوت دے رہا ہے ایسی صراحت و قاطعیت جو حقانیت کی زندہ نشانی ہے۔

قرآن نے بہت قاطع اور صریح بیان کے ساتھ تمام جہانوں اور تمام ان انسانوں کو مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے جو قرآن کے مبداء جہان آفرینش کے ساتھ ربط میں شک رکھتے ہیں۔ صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ مقابلے کا شوق دلایا ہے اور اس کے لئے تحریک پیدا کی ہے اور ان آیات میں ایسے الفاظ صرف کئے ہیں جو ان کی غیرت کو ابھارتے ہیں۔ مثلاً:

"اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

اگر تم سچے ہو۔

"فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ"

ایسی دس سورتیں گھڑ لاؤ۔

"قل فاتوا بسورة مثله .... ان كنتم صدقين"

اگر سچے ہو تو ایسی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔

"وادعوا من استطعتم من دون اللہ"

بلالو جسے بلا سکو دعوت دو۔

"قل لئن اجتمعت الانس والجن"

اگر تم جن وانس بھی اکٹھے کر لو۔

"لا یاتون بمثلہ"

اس کی مثل نہیں لا سکتے۔

"فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ"

اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہ گار) لوگوں کے بدن اور پتھر ہیں۔

"فان لم تفعلوا ولن تفعلوا"

اگر اس کی مثل نہ لاسکے اور نہ ہی تم لاسکتے ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف ادبی یا مذہبی مقابلہ نہ تھا بلکہ ایک سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مقابلہ تھا تمام چیزیں یہاں تک کہ خود ان کے وجود کی بقا کا انحصار بھی اس مقابلے میں کامیابی پر تھا بہ الفاظ دیگر ایک مکمل مقابلہ تھا جو ان کی زندگی اور موت کی راہ اور سرنوشت کو روشن کر دیتا۔ اگر کامیاب ہو جاتے تو سب کچھ ان کے پاس ہوتا اور اگر مغلوب ہو جاتے تو اپنی بھی ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے اس سب کے باوجود تحریک و تشویق کا یہ عالم ہے۔

اس کے باوصف اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیے اور اس کا مثل نہ لاسکے تو قرآن کا معجزہ ہونا زیادہ واضح اور روشن تر ہو جاتا ہے۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ یہ آیات کسی خاص زمانے یا جگہ سے مخصوص نہیں بلکہ تمام جہانوں اور تمام علمی مراکز کو مقابلے کی دعوت دے رہی ہیں اور کسی قسم کا استثنا نہیں ہے اور یہ چیلنج آج بھی برقرار ہے۔

یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن کی مثل نہ لائی جا سکی؟ —— تاریخ اسلام پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی ممالک کے اندر رسول اکرمؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد یہاں تک کہ خود مکہ اور مدینہ میں کٹر اور متعصب عیسائی اور یہودی بستے تھے جو مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے ہر موقع کو غنیمت جانتے تھے۔ خود مسلمانوں میں بھی ایک مسلمان نماء گروہ موجود تھا قرآن نے ان کا نام منافق رکھا ہے ان کے ذمے مسلمانوں کے جاسوس کا رول ادا کرنا تھا جیسے ابو عامر راہب اور مدینہ میں اس کے منافق ساتھی جن کے بادشاہ روم سے مخصوص روابط کا تاریخ میں تذکرہ موجود ہے۔ مدینہ میں مسجد ضرار انہی لوگوں نے بنائی تھی جہاں سے وہ عجیب سازش وجود پذیر ہوئی جس کا قرآن نے سورہ توبہ میں ذکر کیا ہے پہلے شدہ بات ہے کہ منافقین کا یہ گروہ اور وہ متعصب اور کٹر دشمن گہری نظر سے مسلمانوں کے حالات کی تاک میں رہتے تھے اور ہر وہ چیز جو مسلمانوں کے نقصان کا باعث ہوتی اسے خوش آمدید کہتے تھے۔

اگر ان لوگوں کو اس قسم کی کتاب مل جاتی تو مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اس کی ہر ممکن نشر و اشاعت کرتے یا

کم از کم اس کی حفاظت و نگہداشت کی کوشش کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ افراد جن کے متعلق نہایت کم احتمال بھی ہے کہ وہ قرآن کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ تاریخ نے ان کے نام ریکارڈ کئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

عبداللہ بن مقفع: اس نے اسی مقصد کے لئے کتاب "الدرة الیتیمة" تصنیف کی۔ کتاب ابھی موجود ہے اور کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے اس کتاب میں اس بات کا چھوٹا سا اشارہ بھی نہیں کہ یہ قرآن کے مقابلے میں لکھی گئی ہے اس کے باوجود ہم نہیں جانتے کہ اس کی طرف یہ نسبت کیوں دی گئی ہے۔

متنبی احمد بن حسین کوفی: یہ شاعر تھا۔ اس کا نام بھی اس زمرے میں آتا ہے کہ اس نے دعویٰ نبوت کیا تھا جب کہ بہت سے قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ گھریلو ناکامیوں اور جاہ طلبی کی خواہش کے پیش نظر اس نے بلند پروازی کا یہ پروگرام بنایا تھا۔

ابو العلای معری: اس کا نام بھی اس امر میں داخل ہے اگرچہ اسلام کے بارے میں اس سے منسوب سخت باتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن وہ قرآن کے مقابلے کا ارادہ کبھی بھی نہ رکھتا تھا بلکہ اس نے قرآن کی عظمت کے متعلق بہت عمدہ جملے کہے ہیں جن میں بعض کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

مسیلمہ کذاب: یہ یمامہ کا رہنے والا تھا اور یقیناً ان اشخاص میں سے ہے جو قرآن کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور بقول اس کے کچھ آیات لایا جن میں تفریح طبع کا پہلو زیادہ ہے حرج نہیں کہ ان میں سے چند جملے ہم یہاں نقل کر دیں:

(۱) سورہ الذاریات کے مقابلے میں اس نے یہ جملے پیش کئے:

والمبذرات بذرا والحاصدات حصدا والذاریات قمحا والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا والخابزات خبزا والثاردات ثردا واللاقمات لقما اهالة وسمنا[1]

یعنی — قسم ہے کسانوں کی — قسم ہے بیج ڈالنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گندم سے جدا کرنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گھاس سے الگ کرنے والوں کی۔ قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی اور قسم ہے روٹی پکانے والوں کی اور قسم ہے ثرید بنانے والوں کی اور قسم ہے ان کی جو چرب و نرم لقمہ اٹھاتے ہیں۔

(۲) یا ضفدع بنت ضفدعین نقی ما تنقین نصفک فی الماء ونصفک فی الطین لا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین[2]

یعنی — اے مینڈک! مینڈک کی بیٹی! جتنا چاہتی ہے آواز نکال تیرا آدھا حصہ پانی میں ہے اور آدھا کیچڑ میں۔ پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ کسی کو پینے سے روکتی ہے۔

---

[1] اعجاز القرآن رافعی

[2] قرآن و آخرین پیامبر

یہاں ضروری ہے کہ چند جملے بڑے لوگوں کے ــــ یہاں تک کہ جو قرآن کا مقابلہ کرنے میں متہم ہیں نقل کئے جائیں تاکہ عظمت قرآن ظاہر ہو۔

ابو العلای معری: یہ قرآن کا مقابلہ کرنے میں متہم ہے، کہتا ہے:

"یہ بات تمام لوگوں میں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم مورد اتفاق ہے کہ وہ کتاب جو محمد (ص) لے کر آیا ہے اس نے اپنے مقابلے میں عقلوں کو مغلوب کر دیا ہے اور آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لا سکا۔ اس کا طرز اسلوب عربوں کے معمول کے اسلوبوں خطابہ، رجز، شعر اور کاہنوں کے مسجع کسی سے بھی مشابہت نہیں رکھتا۔ اس کتاب میں اس قدر امتیاز اور کشش ہے کہ اگر اس کی ایک آیت کسی دوسرے کے کلمات میں موجود ہو تو شب تاریک میں چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن ہو گی۔"

ولید بن مغیرہ مخزومی: وہ ایسا شخص ہے جو حسن تدبیر کے باعث عربوں میں شہرت رکھتا تھا اور زمانہ جاہلیت میں حل مشکلات کے لئے اس کے فکر و تدبر سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اسے "ریحانہ قریش" (قریش کا گلدستہ) کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں جب اس نے نبی کریم سے سورہ غافر کی چند ابتدائی آیات سنیں تو بنی مخزوم کی ایک محفل میں آیا اور کہنے لگا:

"خدا کی قسم میں نے محمد (ص) سے ایسی گفتگو سنی ہے جو کلام انسان سے شباہت رکھتی ہے نہ جنوں کی گفتگو ہے۔"

اس نے مزید کہا:

وان له لحلاوة، وان عليه لطلاوة، وان اعلاه لمثمر وان اسفله لمغدق، وانه يعلو ولا يعلى عليه.

اس کی گفتگو میں خاص مٹھاس اور حسن ہے۔ اس کا اوپر کا حصہ (بار آور درختوں کی شاخوں کی طرح) پھلدار ہے اور نیچے کا حصہ (پرانے درختوں کی جڑوں کی طرح) مضبوط بنیاد پر استوار ہے۔ یہ ایسی گفتگو ہے جو ہر ایک پر غالب ہے اور کوئی اس پر غالب نہیں آ سکتا۔[1]

کارلائل: یہ انگلستان کا مشہور مؤرخ اور محقق ہے جو قرآن کے بارے میں کہتا ہے:

"اگر اس مقدس کتاب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ برجستہ حقائق اور وجود کے اسرار و خصائص نے اس کے جوہر دار مضامین میں ایسے پرورش پائی ہے جس سے قرآن کی عظمت و حقیقت وضاحت سے نمایاں ہوتی ہے یہ خود ایک ایسی خوبی ہے جو صرف قرآن سے مخصوص ہے اور کسی دوسری علمی، سیاسی اور اقتصادی کتاب میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ یقیناً بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ ذہن انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے لیکن ان کا قرآن سے کبھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا اس بنا پر کہنا چاہیئے کہ قرآن کی ابتدائی خوبیاں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، سورہ مدثر

اور بنیادی دستاویزات جن کا تعلق حقیقت، پاکیزہ احساسات، برجستہ عنوانات اور اس کے اہم مسائل و مضامین سے ہے ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ وہ فضائل جو تکمیل انسانیت اور سعادت بشری کا باعث ہیں اس میں ان کی انتہا ہے اور قرآن وضاحت سے ان فضائل کی نشاندہی کرتا ہے"۔[1]

جان ڈیون پورٹ: یہ کتاب "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن" کا مصنف ہے۔ قرآن کے بارے میں لکھتا ہے:

"قرآن نقائص سے اس قدر مبرّا و منزّہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی تصحیح اور اصلاح کا بھی محتاج نہیں، ممکن ہے کہ انسان اسے اوّل سے آخر تک پڑھتا جائے اور معمولی سی ملالت و افسردگی بھی محسوس نہ کرے"۔

اس کے بعد مزید لکھتا ہے:

"سب اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ قرآن سب سے زیادہ فصیح و بلیغ زبان اور عرب کے سب سے زیادہ نجیب اور ادیب قبیلے قریش کے لب ولہجے میں نازل ہوا اور یہ دلکش ترین صورتوں اور محکم ترین تشبیہات سے معمور ہے"۔[2]

گوئٹے: یہ آلمانی شاعر اور عالم ہے، کہتا ہے:

"قرآن ایسی کتاب ہے کہ ابتداء میں قاری اس کی وزنی عبارت کی وجہ سے روگردانی کرنے لگتا ہے لیکن اس کے بعد اس کی کشش کا فریفتہ ہو جاتا ہے اور پھر بے اختیار اس کی متعدد خوبیوں کا عاشق ہو جاتا ہے"۔

یہی گوئٹے ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"سالہا سال تک خدا سے ناآشنا پوپ ہمیں قرآن اور اس کے لانے والے محمدؐ کی عظمت سے دور رکھے رہے مگر علم و دانش کی شاہراہ پر جتنا ہم نے قدم آگے بڑھایا جہالت و تعصب کے نارواپردے ہٹتے گئے اور بہت جلد اس کتاب نے جس کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس نے دنیا کے علم و دانش پر گہرا اثر کیا ہے اور آخر کار یہ کتاب دنیا بھر کے لوگوں کے افکار کا محور قرار پائے گی"۔

مزید لکھتا ہے:

"ہم ابتداء میں قرآن سے روگرداں تھے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کتاب نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ہمیں حیران کر دیا یہاں تک کہ اس کے اصول اور عظیم علمی قوانین کے سامنے ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا"۔[3]

---

[1] "سازندگان تمدن امپراطوری اسلام"

[2] مذکورہ کتاب "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن" (یہ اصل کتاب کے فارسی ترجمے کا حوالہ ہے۔ مترجم)

[3] "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن"

ول ڈیوران : یہ ایک مشہور مؤرخ ہے، لکھتا ہے :

"قرآن نے مسلمانوں میں اس طرح کی عزت نفس، عدالت اور تقویٰ پیدا کیا ہے جس کی نظیر و مثال دنیا کے دوسرے ممالک میں نہیں ملتی"

ژول لابوم : یہ ایک فرانسیسی مفکر ہے۔ اپنی کتاب "تفصیل الآیات" میں کہتا ہے :

"دنیا نے علم و دانش مسلمانوں سے لی ہے اور مسلمانوں نے یہ علوم اس قرآن سے لئے ہیں جو علم و دانش کا دریا ہے اور اس سے عالم بشریت کے لئے کئی نہریں جاری ہوتی ہیں"

ڈیونپورٹ : یہ ایک اور مستشرق ہے، لکھتا ہے :

ضروری ہے کہ ہم اعتراف کر لیں کہ علوم طبیعی و فلکی اور فلسفہ و ریاضیات جو یورپ میں رائج پذیر ہیں زیادہ تر تعلیمات قرآن کی برکت سے ہیں۔ اور ہم مسلمانوں کے مقروض ہیں بلکہ اس لحاظ سے یورپ ایک اسلامی شہر ہے"۔ [1]

ڈاکٹر مسز لورا واکسیا گلیری : یہ ناپل یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں۔ "پیش رفت سریع اسلام" میں لکھتی ہیں :

"اسلام کی کتاب آسمانی اعجاز کا ایک نمونہ ہے ..... قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کے اسلوب اور طرز کا نمونہ گذشتہ ادبیات میں نہیں پایا جاتا اور یہ طرز روح انسانی میں جو تاثیر پیدا کرتی ہے وہ اس کے امتیازات اور بلندیوں سے پیدا ہوتی ہے کس طرح ممکن ہے کہ یہ اعجاز آمیز کتاب محمدؐ کی خود ساختہ ہو جب کہ وہ ایک ایسا عرب تھا جس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہمیں اس کتاب میں علوم کے خزینے اور ذخیرے نظر آتے ہیں جو نہایت ہوشمند اشخاص، بزرگ ترین فلاسفہ اور قوی ترین سیاست دان اور قانون دان لوگوں کی استعداد اور ظرفیت سے بلند ہیں اسی بناء پر قرآن کسی تعلیم یافتہ مفکر و عالم کا کلام نہیں ہو سکتا"۔ [2]

۲۵۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ
قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ○

[1] قرآن بر فراز اعصار بحوالہ المعجزۃ الخالدۃ۔

[2] پیش رفت سریع اسلام۔ (یہ بھی اصل کتاب کے فارسی ترجمے کا حوالہ ہے۔ مترجم)

ترجمہ

ایمان لانے والوں اور نیک عمل بجالانے والوں کو خوشخبری دیجئے کہ اُن کے لئے بہشت کے باغات ہیں جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب انہیں ان میں سے پھل دیا جائے گا تو کہیں گے یہ وہی ہے جو پہلے بھی ہمیں دیا گیا تھا (لیکن یہ اس سے کس قدر بہتر ہے) اور جو پھل ان کو پیش کئے جائیں گے (خوبی و زیبائی میں) یکساں ہیں اور ان کے لئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

بہشت کی نعمات کی خصوصیات

چونکہ گذشتہ بحث کی آخری آیت میں کفار اور منکرین قرآن کو دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے لہذا زیر نظر آیت میں مومنین کی سرنوشت کا تذکرہ ہے تاکہ قرآن کے روش اور طریقے کے مطابق دونوں کے مدمقابل ہونے سے حقیقت زیادہ دلکش ہوتی رہے۔

پہلے کہتا ہے کہ ان افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں بشارت دے دو کہ ان کے لئے بہشت کے باغ ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (وبشر الذین امنوا وعملوا الصالحات ان لھم جنات تجری من تحتھا الانھار)۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ باغات جہاں ہمیشہ پانی نہیں ہوتا بلکہ باہر سے پانی لاکر انہیں سیراب کیا جاتا ہے ان میں زیادہ طراوت نہیں ہوتی۔ تروتازگی تو اس باغ میں ہوتی ہے جس کے لئے پانی کا اپنا انتظام ہو اور وہ پانی اس سے کبھی منقطع نہ ہوتا ہو، ایسے باغ کو خشک سالی اور پانی کی کمی کا خطرہ نہیں ہوتا اور بہشت کے باغات اسی طرح کے ہیں۔

اس کے بعد ان باغوں کے گوناگوں پھلوں کے بارے میں کہتا ہے ہر زمانے میں ان باغوں کے پھل انہیں دیئے جائیں گے تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا ہے (کلما رزقوا منھا من ثمرۃ رزقا قالوا ھٰذا الذی رزقنا من قبل)۔

مفسرین نے اس جملے کی کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ نعمات ان اعمال کی جزا ہیں جنہیں ہم پہلے دنیا میں انجام دے چکے ہیں اور یہ موضوع پہلے سے فراہم شدہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس وقت جنت کے پھل دوبارہ ان کے لئے لائے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی میوے ہیں جو ہم پہلے کھا چکے ہیں لیکن جب اسے کھائیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کا ذائقہ نیا اور لذت تازہ ہے۔ مثلاً سیب اور انگور جو ہم دنیا میں کھاتے ہیں ہر دفعہ وہی پہلے والا ذائقہ محسوس کرتے ہیں لیکن جنت کے میوے جس قدر بھی ظاہراً ایک قسم کے ہوں ہر دفعہ ایک نیا ذائقہ دیں گے اور یہ اس جہان کی خصوصیات میں سے ہے گویا وہاں تکرار نہیں ہے۔

کچھ اور حضرات کے نزدیک اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ جب جنت کے میووں کو دیکھیں گے تو انہیں دنیا کے میووں سے

مشابہ پائیں گے تاکہ ناما نوسی کا احساس نہ ہو لیکن جب کھائیں گے تو ان میں تازگی اور بہترین ذائقہ محسوس کریں گے۔

بعید نہیں کہ آیت میں ان تمام مفاہیم و تفاسیر کی طرف اشارہ ہو کیونکہ قرآن کے الفاظ بعض اوقات کئی معانی کے حامل ہوتے ہیں[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ ان کے لئے ایسے پھل پیش کئے جائیں گے جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں گے (و اتوا بہ متشابھا) یعنی وہ سب خوبی و زیبائی میں ایک جیسے ہوں گے وہ ایسے اعلیٰ درجے کے ہوں گے کہ انہیں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دی جا سکے گی۔ یہ اس دنیا کے میووں سے برعکس بات ہوگی جہاں بعض کچے ہوتے ہیں اور بعض زیادہ پک جاتے ہیں۔ بعض کم رنگ اور کم خوشبو ہوتے ہیں اور بعض خوش رنگ، خوشبودار اور معطر ہوتے ہیں۔ لیکن جنت کے باغات کے میوے ایک سے ایک بڑھ کر خوشبودار، ایک سے ایک بڑھ کر میٹھا اور ایک سے ایک بڑھ کر جاذب نظر اور زیبا ہوگا۔

اور آخر میں جنت کی جس نعمت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پاک و پاکیزہ بیویاں ہیں۔ فرمایا: ان کے لئے جنت میں مطہر و پاک بیویاں[2] ہیں (و لھم فیھا ازواج مطھرۃ) یہ ان تمام آلائشوں سے پاک ہوں گی جو اس جہان میں ممکن ہے ان میں ہوں۔ گویا روح و دل پر نگاہ کریں تو پاک اور جسم و بدن پر نظر ڈالیں تو پاک۔

دنیا کی نعمات میں جو مشکلات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے اس وقت اس کے زوال کی فکر بھی لاحق رہتی ہے اور اس کا دل پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر یہ نعمتیں کبھی بھی اطمینان بخش نہیں ہوتیں لیکن جنت کی نعمتیں چونکہ ابدی و جاودانی ہیں ان کے لئے فنا و زوال نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ہر جہت سے کامل اور اطمینان بخش ہیں اسی لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا: مومنین ہمیشہ ہمیشہ ان باغاتِ بہشت میں رہیں گے۔ (و ھم فیھا خلدون)۔

چند اہم نکات

(۱) ایمان و عمل: قرآن کی بہت سی آیات میں ایمان و عمل صالح ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اس بات کی نشاندہی ہے کہ ان میں جدائی نہیں ہو سکتی اور حقیقتاً ایسا ہی ہے کیونکہ ایمان و عمل صالح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اگر ایمان روح کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یقیناً اس کی شعاع انسان کے اعمال کو بھی روشن کرے گی اور اس کے عمل کو عمل صالح بنا دے گی۔ جیسے کوئی چراغِ پُر نور کسی کمرے میں جلا دیں تو روشندانوں اور دریچوں سے باہر بھی اس کی کرنیں دکھائی دیتی ہیں۔

سورہ طلاق آیہ ۱۱ میں ہے:

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط

---

[1] لفظ کے ایک سے زیادہ معانی میں استعمال کی بحث میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

جو خدا پر ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے اُسے خدا باغات بہشت میں داخل کرے گا جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جہاں جانے والے ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

سورہ نور، آیہ ۵۵ میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

جو افراد ایمان لے آئیں اور اعمال صالح انجام دیں خدا کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انہیں روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا۔

اصولی طور پر ایمان جڑ ہے اور عمل صالح اس کا پھل اور میٹھے پھل کا وجود جڑ کی سلامتی کی دلیل ہے اور جڑ کی سلامتی مفید پھل کی پرورش کا سبب ہے۔

ممکن ہے بے ایمان لوگ کبھی کبھی عمل صالح انجام دیں لیکن یہ مسلم ہے کہ اس میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہوگی۔ ایمان جو عمل صالح کا ضامن ہے ایسا ایمان ہے جس کی جڑیں وجود انسانی کی گہرائیوں میں پہنچی ہوئی ہوں اور اُن کی وجہ سے انسان میں احساس مسئولیت پیدا ہو۔

(۲) پاکیزہ بیویاں: یہ امر قابل غور ہے کہ جنت کی بیویوں کی اس آیت میں صرف ایک صفت "مطھرۃ" بیان کی گئی ہے۔ صفت مطھرہ (یعنی پاک و پاکیزہ) کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیوی کے لئے سب سے پہلی اور اہم ترین شرط پاکیزگی ہے باقی صفات سب اس کے ماتحت ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث اس حقیقت کو روشن کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

ایاکم وخضراء الدمن، قیل: یا رسول اللّٰہ وما خضراء الدمن، قال: المرئة الحسناء فی منبت السوء۔

ان سبزیوں سے پرہیز کرو جو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر اُگیں۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کا مقصد اس سبزی سے کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: خوبصورت عورت جس نے گندے خاندان میں پرورش پائی ہو[1]

(۳) جنت کی مادی و معنوی نعمات: اگرچہ بہت سی آیات قرآنی میں مادی نعمتوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ مثلاً باغات جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، قصور و محلات، پاکیزہ بیویاں، رنگ برنگے پھل اور میوے اور ہم مزاج دوست وغیرہ مگر ان کے ساتھ ساتھ اہم ترین معنوی نعمات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جن کی عظمت و رفعت کو ہمارے پیمانوں سے ناپنا ممکن نہیں، مثلاً سورہ توبہ آیہ ۷۲ میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۰، ص ۱۹۔

خداوند عالم نے ایماندار مردوں اور عورتوں سے باغاتِ جنت کا وعدہ کیا ہے جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے اور ان کے لئے ان دائمی بہشتوں میں پاکیزہ مکانات ہیں اور اسی طرح پروردگار کی خوشنودی بھی جو ان سب سے بالاتر ہے اور یہ ہے عظیم کامیابی۔

سورہ بینہ کی آیہ ۸ میں جنت کی مادی نعمتوں کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

خداوند عالم ان سے خوش ہے اور وہ بھی خدا سے خوش ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس مقام پر پہنچ جائے کہ اسے احساس ہو کہ خدا اُس سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہے تو وہ تمام لذات کو بھلا دیتا ہے صرف اسی سے دل لگا لیتا ہے اس کے علاوہ اپنی فکر میں کچھ نہیں لاتا اور یہ ایسی روحانی لذت ہے۔ کسی طرح بھی زبان و بیان سے ادا نہیں کی جا سکتی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ چونکہ قیامت و معاد میں روحانی پہلو بھی ہے اور جسمانی بھی لہٰذا جنت کی نعمات بھی دونوں پہلو رکھتی ہیں تاکہ انہیں جامعیت حاصل ہو اور ہر شخص اپنی استعداد اور شائستگی کے مطابق ان سے بہرہ ور ہو۔

۲۶۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

ترجمہ

۲۶۔ خداوند عالم مچھر یا اس سے بڑھ کر کوئی مثال دینے میں جھجکتا نہیں۔ (اس لئے کہ) جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف سے حقیقت ہے لیکن جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے (اس موضوع کو بہانہ بنا کر) کہتے ہیں کہ خدا کا مقصد اس مثال سے کیا تھا۔ خدا اس سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے لیکن گمراہ صرف فاسقوں کو کرتا ہے۔

تفسیر

کیا خدا بھی مثال دیتا ہے؟

مندرجہ بالا میں سے پہلی آیت کہتی ہے کہ خداوند عالم اس سے نہیں شرماتا کہ وہ اپنی موجودات میں سے جسے چاہے وہ ظاہراً چھوٹی سی ہو جیسے مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی مثال دے (ان اللہ لا یستحیٰ ان یضرب مثلاً ما بعوضة فما فوقها) کیونکہ مثال کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقصد کے مطابق ہو بہ الفاظ دیگر مثال حقیقت کی تصویر کشی کا ذریعہ ہے بعض اوقات کہنے والا مدعیان کی تحقیر اور ان کے کمزور پہلو کو بیان کر رہا ہو تو کسی کمزور چیز کو مثال کے لئے منتخب کرتا ہے۔ مثلاً سورہ حج آیہ ۷۳ میں ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡہُ مِنۡہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ ۝

خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں بلکہ اگر مکھی کوئی چیز ان سے چھین کر لے جائے تو وہ اس سے واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتے طلب کرنے والا اور جس سے طلب کی جا رہی ہے دونوں کمزور ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں مکھی یا اس جیسی کسی چیز کی مثال کے بغیر کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جو ان کی کمزوری اور ناتوانی کی تصویر کشی کرے۔

سورہ عنکبوت میں جب اس نے چاہا کہ بت پرستوں کے سہاروں کی کمزوری کی تصویر کشی کرے تو انہیں مکڑی سے تشبیہ دی جس نے اپنے لئے کمزور سے گھر کا انتخاب کیا ہے کیونکہ دنیا میں کمزور ترین گھر عنکبوت ہی کا ہے:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۖۚ اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (عنکبوت، ۴۱)

یہ بات مسلم ہے کہ اگر ان مواقع پر ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثال کی بجائے عالم خلقت کی بڑی بڑی چیزوں مثلاً ستاروں اور وسیع آسمانوں کی مثال پیش کی جائے تو بہت ہی نامناسب ہوگا اور اصول فصاحت و بلاغت کے بالکل مطابق نہ ہوگا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں خداوند عالم فرماتا ہے کہ ہمیں انکار نہیں کہ ہم مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال دیں تاکہ حقائق عقلی کو حسی مثالوں کے لباس میں پیش کیا جا سکے اور پھر انہیں بندوں کے اختیار میں دے دیں۔

خلاصہ یہ کہ غرض تو مقصد پہنچانا ہے مثالیں ایسی قبا کی مانند ہونا چاہئیں جو قامت مطالب پر فٹ آسکیں۔

"فما فوقھا" کا مقصود کیا ہے اس کی مفسرین نے دو قسم کی تفسیریں کی ہیں:

ایک گروہ کے مطابق اس سے مراد "چھوٹے ہونے میں بڑھ کر" ہے کیونکہ مثال چھوٹے ہونے کا بیان کر رہی ہے لہٰذا اس سے بڑھ کر یا اس سے اوپر ہونا بھی اسی نظر سے ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ ایک ٹپلے کے لئے کیوں اتنی زحمت اٹھاتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور وہ جواب دے کہ میں تو اس سے اوپر کے لئے بھی تکلیف اٹھاتا ہوں یہاں تک کہ ایک آنے کے لئے بھی۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد "اوپر سے بڑے ہونے کے لحاظ سے ہے" یعنی خداوند عالم چھوٹی چیزوں کی مثالیں بھی دیتا ہے اور بڑی کی بھی، مقتضائے حال کے مطابق۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات اُن کے پروردگار کی طرف سے حق ہے (فاما الذین اٰمنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم) وہ ایمان اور تقویٰ کی روشنی میں تعصب، عناد اور حق سے کینہ پروری سے دور ہیں اور وہ حق کے چہرے کو پورے طور پر دیکھ سکتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی مثالوں کی منطق کا ادراک کر سکتے ہیں۔

لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کا اس مثال سے کیا مقصد تھا جو تفرقہ و اختلاف کا سبب بن گئی ہے ایک گروہ کی اس کی وجہ سے ہدایت کی ہے اور دوسرے کو گمراہ کیا ہے (واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیرا) ان کے نزدیک یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مثالیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں کیونکہ خدا کی طرف سے ہوتیں تو سب لوگ اسے قبول کر لیتے۔

مگر خدا انہیں ایک مختصر اور دو ٹوک جواب دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے صرف فاسقوں اور گنہ گاروں کو جو حق کے دشمن ہیں گمراہ کرتا ہے (وما یضل بہ الا الفسقین)۔

اس بنا پر یہ ساری گفتگو خدا کی ہے اور نور و ہدایت ہے البتہ چشم بینا کی ضرورت ہے جو استفادہ کرے اب اگر یہ دلوں کے اندر سے مخالفت اور ڈھٹائی پر اُتر آئے ہیں تو اس میں ان کا اپنا ہی نقصان اور خسارہ ہے ورنہ ان آیاتِ الٰہی میں کوئی نقص نہیں۔[1]

چند اہم نکات

(۱) حقائق کے بیان کرنے میں مثال کی اہمیت: حقائق واضح کرنے اور مطالب کو دل نشین بنانے کے لئے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ یضل بہ کثیراً..... خدا کا کلام ہے نہ کہ کفار کا۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ان مثالوں کا کیا مقصد ہے ان کے جواب میں خدا فرماتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہدایت کرے اور بہت سوں کو گمراہ کر دے فاسقین کے علاوہ کوئی گمراہ نہیں ہوتا (لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے)

مختلف مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور ان کی اثر آفرینی ناقابلِ انکار ہے۔

بعض اوقات ایک مثال کا تذکرہ راستے کو اتنا کم کر دیتا ہے کہ زیادہ فلسفیانہ استدلال کی زحمت و تکلیف سے کہنے اور سننے والے دونوں کو نجات مل جاتی ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پیچیدہ علمی مطالب کو عمومی سطح تک عام اور وسیع کرنے کے لئے مناسب مثالوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

ڈھٹائی پسند اور حیلہ ساز لوگوں کو خاموش کرنے کے لئے مثال کی تاثیر کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال معقول کو محسوس سے تشبیہ دینا مسائل عقلی کو سمجھانے کے لئے ایک موثر طریقہ ہے (البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مثال مناسب ہونی چاہیئے ورنہ گمراہ کن، اتنی ہی خطرناک اور مقصد سے دور کرنے والی ہوگی) اسی بناء پر قرآن میں ہمیں بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک بہت پُرکشش، بہت میٹھی اور بہت پر تاثیر ہے کیونکہ تمام انسانوں، ہر سطح کے افراد اور فکر و معلومات کے لحاظ سے ہر درجے کے لوگوں کے لئے یہ کتاب انتہائی فصیح و بلیغ ہے [1]

(۲) **مچھر کی مثال کیوں:** بہانہ سازوں نے اگرچہ مچھر اور مکھی کے چھوٹے پن کو آیات قرآن سے استہزاء اور اعتراضات کا ذریعہ بنا لیا ہے لیکن اگر ان میں انصاف اور ادراک و شعور ہوتا اور اس چھوٹے سے جانور کی ساخت اور بناوٹ پر غور و فکر کرتے تو سمجھ لیتے کہ اس کے بنانے میں باریک بینی اور عمدگی کی ایک دنیا صرف ہوئی ہے کہ جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ امام صادقؑ اس چھوٹے سے حیوان کی خلقت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

> خداوند عالم نے مچھر کی مثال دی ہے حالانکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے جسم میں وہ تمام آلات اور اعضاء و جوارح ہیں جو خشکی کے سب سے بڑے جانور کے جسم میں ہیں۔ یعنی ہاتھی اور اس کے علاوہ بھی اس کے دو عضو (سینگ اور پر) ہیں جو ہاتھی کے پاس نہیں ہیں۔ خداوند یہ چاہتا ہے کہ مومنین کو اس مثال سے خلقت و آفرینش کی خوبی و عمدگی بیان کرے۔ یہ ظاہراً کمزور سا جانور جسے خدا نے ہاتھی کی طرح پیدا کیا ہے اس میں غور و فکر انسان کو پیدا کرنے والے کی عظمت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔
>
> خصوصاً اس کی سونڈ جو ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہے اندر سے خالی ہے اور وہ مخصوص قوت سے خون کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کی یہ ٹونٹی دنیا کی عمدہ ترین سرنگ ہے اور اس کا اندرونی سوراخ بہت باریک ہے۔
>
> خدا نے مچھر کو قوت جذب و دفع اور ہاضمے کی قوت دی ہے۔ اسی طرح اسے مناسب طور پر ہاتھ، پاؤں اور کان دیئے ہیں، اسے پر دیئے ہیں تاکہ غذا کی تلاش کر سکے اور یہ پر اس تیزی سے اوپر نیچے حرکت کرتے

---

[1] انسانی زندگی میں مثال کی تاثیر کس قدر ہے اس سلسلے میں سورہ رعد کی آیہ ۱۷ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے جسے تفسیر نمونہ کی جلد دہم میں ملاحظہ کیجیے۔

ہیں کہ آنکھ ان کی یہ حرکت دیکھ نہیں پاسکتی۔ یہ جانور اتنا حساس ہے کہ صرف کسی چیز کے اٹھنے سے خطرہ محسوس کر لیتا ہے اور بڑی تیزی سے اپنے آپ کو خطرے کی جگہ سے دور لے جاتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ انتہائی کمزور ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے جانور کو عاجز کر دیتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیؑ کا اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب خطبہ نہج البلاغہ میں ہے۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

اگر دنیا جہاں کے سب زندہ موجودات جمع ہو جائیں اور باہم مل کے کوشش کریں کہ ایک مچھر بنا لیں تو وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے بلکہ اس جانور کی خلقت کے اسرار پر ان کی عقلیں دنگ رہ جائیں گی۔ ان کے قویٰ عاجز آ جائیں گے اور وہ تھک کر انجام کو پہنچ جائیں گے۔ تلاش بسیار کے بعد بالآخر شکست خوردہ ہو کر اعتراف کریں گے کہ وہ مچھر کی خلقت کے معاملے میں عاجز ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے نابود کرنے سے بھی عاجز ہیں[1]

(۲) خدا کی طرف سے ہدایت و گمراہی: گذشتہ آیت کا ظاہری مفہوم ممکن ہے یہ شک پیدا کرے کہ ہدایت اور گمراہی میں جبر کا پہلو ہے اور اس کا دارومدار خدا کی چاہت پر ہے جب کہ اس آیت کا آخری جملہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ہدایت و ضلالت کا سرچشمہ انسان کے اپنے اعمال ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کے اعمال و کردار کے ہمیشہ خاص نتائج و ثمرات ہوتے ہیں ان میں سے اگر عمل نیک ہو تو اس کا نتیجہ روشن ضمیری، توفیق الٰہی، خدا کی طرف سے ہدایت اور بہتر انجام کا وہ ہے۔

سورہ انفال کی آیہ ۲۹ اس بات کی گواہ ہے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو! اگر پرہیزگاری کو اپنا لو تو خدا تمہیں تمیز حق و باطل اور روشن ضمیری عطا کرے گا۔

اور اگر انسان برے کاموں کے پیچھے لگا رہے تو اس کے دل کی تیرگی اور بڑھ جائے گی اور گناہ کی طرف اس کا رجحان زیادہ ہو گا بلکہ بعض اوقات انکارِ خدا کی سرحد تک پہنچ جائے گا۔

اس کی شاہد سورہ روم کی آیہ ۱۰ ہے جس میں فرمایا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ۝

برے اعمال انجام دینے والے اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ اب آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔

ایک اور آیت میں ہے:

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ

جب وہ حق سے پھر گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ (صف، ۵)

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶

زیر بحث آیت بھی اسی مفہوم کی شاہد ہے جب وہ فرماتی ہے وما یضل بہ الا الفسقین یعنی خدا فاسقین ہی کو گمراہ کرتا ہے۔

اس بناء پر اچھے یا بُرے راستے کا انتخاب پہلے ہی سے خود ہمارے اختیار میں ہے اس حقیقت کو ہر شخص کا وجدان قبول کرتا ہے۔ انتخاب کے بعد اس کے قہری نتائج کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن کے مطابق ہدایت و ضلالت اچھے یا بُرے راستے کے جبری اختیار کا نام نہیں بلکہ قرآن کی متعدد آیات شہادت دیتی ہیں کہ ہدایت کے معنی ہیں سعادت کے وسائل فراہم ہونا اور ضلالت کا مطلب ہے سازگار حالات کا ختم ہو جانا، لیکن اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے اور یہ اسباب کا فراہم کرنا (جس کا نام ہمارے نزدیک توفیق ہے)، یا اسباب ختم کر دینا جسے ہم سلب توفیق کہتے ہیں انسان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔

اس حقیقت کو ہم ایک سادہ سی مثال سے پیش کر سکتے ہیں۔ جب انسان کسی گرنے کی جگہ یا کسی خطرناک بڑی نہر سے گذرتا ہے تو وہ جتنا اپنے آپ کو نہر کے قریب تر کرتا ہے اس کے پاؤں کی جگہ زیادہ پھسلنے والی ہوتی ہے ایسے میں گرنے کا احتمال زیادہ اور نجات پانے کا کم ہو جاتا ہے اور انسان جتنا اپنے آپ کو اس سے دور رکھے گا اس کے پاؤں رکھنے کی جگہ زیادہ محکم اور اطمینان بخش ہوگی اور گرنے کا احتمال کم ہوگا۔ ان میں سے ایک کا نام ہدایت اور دوسری کا ضلالت ہے۔ اس گفتگو سے اُن لوگوں کی بات کا جواب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے جو آیاتِ ہدایت و ضلالت پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۴) فاسقین: فاسقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو عبودیت و بندگی کے دستور سے پاؤں باہر نکالیں کیونکہ اصل لغت میں فسق گٹھلی کے کھجور سے باہر نکلنے کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی کو وسعت دے کر ان لوگوں کے لئے یہ لفظ بولا گیا ہے جو خدا کی بندگی کی شاہراہ سے الگ ہو جائیں۔

۲۷۔ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۔ (فاسق وہ ہیں) جو خدا سے محکم عہد و پیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں وہ تعلق جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

تفسیر

حقیقی زیاں کار

گذشتہ آیت کے آخر میں چونکہ فاسقین کے گمراہ ہونے سے متعلق گفتگو تھی لہٰذا اس آیت میں ان کی تین صفات بیان

کرکے انہیں مکمل طور پر مشخص کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں ان علامات و صفات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) فاسق وہ ہیں جو خدا سے محکم عہد و پیمان باندھ کر توڑ دیتے ہیں (الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ)۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے خدا سے مختلف پیمان باندھ رکھے ہیں۔ توحید و خداشناسی کا پیمان اور شیطان اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا پیمان۔ فاسق ان تمام پیمانوں کو توڑ دیتا ہے وہ فرمانِ حق سے سرتابی کرتا ہے اور شیطان اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے۔

یہ پیمان کہاں اور کس طرح باندھا گیا تھا: یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پیمان تو دو طرفہ معاملہ ہے ہمیں بالکل یاد نہیں کہ ہم نے گذشتہ زمانے میں اس سلسلے میں اپنے پروردگار سے کوئی عہد و پیمان کیا ہو۔

ایک نکتے کی طرف متوجہ ہونے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ روح کی گہرائی اور سرشتِ انسان کے باطن میں ایک مخصوص شعور اور کچھ خاص قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں جن کی ہدایت کے ذریعے انسان سیدھی راہ اختیار کر سکتا ہے اور اسی ذریعے سے وہ خواہشِ نفس کی پیروی سے بچتے ہوئے رہبرانِ الٰہی کی دعوت کا مثبت جواب دے سکتا ہے اور خود کو اس دعوت سے ہم آہنگ کر سکتا ہے۔

قرآن اس مخصوص فطرت کو عہدِ خدا اور پیمانِ الٰہی قرار دیتا ہے حقیقت میں یہ ایک تکوینی پیمان ہے نہ کہ تشریعی و قانونی۔ قرآن کہتا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

اے اولادِ آدم! کیا ہم نے تم سے یہ عہد و پیمان نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا جو تمہارا واضح دشمن ہے اور میری ہی عبادت کرنا جو سیدھا راستہ ہے۔ (یٰس ۶۰،۶۱)

واضح ہے کہ یہ اسی فطرتِ توحید و خداشناسی کی طرف اشارہ ہے اور انسان میں راہِ تکامل طے کرنے کا جو عشق ہے اس کی نشاندہی ہے۔

اس بات کے لئے دوسرا شاہد وہ جملہ ہے جو نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں موجود ہے:

وبعث فیھم رسلہ وواتر الیھم انبیائہ لیستأدوھم میثاق فطرتہ

خداوند عالم نے یکے بعد دیگرے لوگوں کی طرف اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ ان سے یہ خواہش کریں کہ وہ اپنے فطری پیمان پر عمل کریں۔

مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو ہر نعمت وافر دی ہے اور اس کے ساتھ عملی طور پر اس سے زبانِ آفرینش میں عہد و پیمان لیا ہے۔ اسے آنکھ دی ہے تاکہ اس سے حقائق کو دیکھ سکے کان دیا ہے تاکہ حق کی آواز سن سکے اور اسی طرح دیگر نعمات ہیں۔

جب انسان اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا نہ ہو یا خداداد قوتوں کا غلط استعمال کرے تو گویا اس نے عہد و پیمان خدا کو

توڑ دیا۔ فاسق تمام کے تمام یا ان میں سے بعض فطری پیمانوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔

(۲) اس کے بعد قرآن فاسقین کی دوسری علامت کی نشاندہی یوں فرماتا ہے: جو تعلق خدا نے قائم رکھنے کو کہا ہے وہ انہیں منقطع کر دیتے ہیں (ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل)۔

بہت سے مفسرین نے اگرچہ اس آیت کو قطع رحمی اور عزیز داری کے رشتے کو منقطع کرنے سے مخصوص سمجھا ہے لیکن مفہوم آیت پر گہرا غور نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے معنی زیادہ وسعت اور زیادہ عمومیت رکھتے ہیں جس کی بنا پر قطع رحم اس کا ایک مصداق ہے کیونکہ آیت کہتی ہے کہ فاسقین ان رشتوں اور تعلقات کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اب یہ پیوند اور تانتے، رشتہ داری کے ناتے، دوستی کے ناتے، معاشرے کے رشتے، خدائی رہبروں سے ربط و پیوند اور خدا سے رابطہ سب پر محیط ہیں لہٰذا آیت کو قطع رحمی اور رشتہ داری کے رابطوں کو روندنے کے معنی میں منحصر نہیں کرنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت سے مراد انبیاء و مومنین سے رابطہ منقطع کرنا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم انبیاء اور آسمانی کتابوں سے رابطہ قطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان سے رابطہ استوار رکھنے کا حکم دیا ہے واضح ہے کہ یہ تفسیریں بھی آیت کے مفہوم کا جز ہیں۔

بعض روایات میں "ما امر اللہ بہ ان یوصل" کی تفسیر امیر المومنینؑ اور ائمہ اہل بیتؑ سے مربوط کی گئی ہے۔[1]

(۳) فاسقین کی ایک اور علامت زمین میں فساد برپا کرنا ہے جس کی آخری مرحلے میں نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں (ویفسدون فی الارض)۔

یہ واضح ہے کہ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے، اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے رشتے داروں سے رحم و شفقت کا برتاؤ نہیں کرتے وہ دوسروں سے کیسا معاملہ کریں گے۔ وہ اپنی مفسدہ کاری، اپنی لذتوں اور ذاتی فائدوں کے لئے فکر میں رہیں گے۔ معاشرے کی حالت کچھ بھی ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا ہدف تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی جائے۔ اس ہدف و غرض تک پہنچنے کے لئے وہ کسی بھی غلطی کی پرواہ نہیں کرتے۔ واضح ہے کہ اس طرز فکر و عمل سے معاشرے میں کیسے کیسے فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

زیر بحث آیت کے آخر میں ہے کہ یہی لوگ زیاں کار اور خسارہ اٹھانے والے ہیں (اولئک ھم الخاسرون)۔

واقعاً ایسا ہی ہے۔ اس سے بدتر کیا خسارہ ہوگا کہ وہ تمام مادی و روحانی سرمایہ جس سے انسان بڑے بڑے اعزاز اور سعادتیں حاصل کر سکتا ہے اُسے اپنی فنا و نابودی، بدبختی اور سیاہ کاری کی راہ میں خرچ کر دے اور جو لوگ مفہوم فسق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خدا کی اطاعت کے مرکز سے خارج ہو گئے ہیں ان کی قسمت میں اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اول ص۴۵ (مزید توضیح کے سلسلے میں نیز ان روایات کے لئے جو ان پیوندوں کے مفہوم کی وسعت سے متعلق ہیں اسی تفسیر نمونہ) میں سورہ رعد کی آیہ ۲۱ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

چند اہم نکات

(۱) اسلام میں صلہ رحمی کی اہمیت: گذشتہ آیت اگرچہ تمام خدائی باتوں کے احترام کے متعلق گفتگو کرتی ہے لیکن بلاشک و تردد رشتہ داری کا ناتا اور تعلق اس کا واضح اور روشن مصداق ہے۔

اسلام صلہ رحمی، عزیزوں کی مدد و حمایت اور ان سے محبت کرنے کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور قطع رحمی اور رشتہ داروں اور عزیزوں سے رابطہ منقطع کرنے کو سختی سے منع کرتا ہے۔

صلہ رحمی کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اکرم فرماتے ہیں:

صلة الرحم تعمر الديار وتزيد فی الاعمار وان كان اهلها غير اخيار

رشتہ داروں سے صلہ رحمی شہروں کی آبادی کا باعث ہے اور زندگیاں اس سے بڑھتی ہیں اگرچہ صلہ رحمی کرنے والے لوگ اچھے نہ ہوں۔[1]

امام صادقؑ کے ارشادات میں سے ہے:

صل رحمك ولو بشربة من ماء وافضل ما يوصل به الرحم كف الاذى عنها۔

رشتہ داری کی گرہ اور ناتے کو مضبوط کرو چاہے پانی کے ایک گھونٹ سے ہو سکے اور ان کی خدمت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ (کم از کم) تم سے انہیں کوئی تکلیف و اذیت نہ پہنچے۔[2]

قطع رحمی کی قباحت اور گناہ اس قدر ہے کہ امام سجادؑ نے اپنے فرزند کو نصیحت کی کہ وہ پانچ گروہوں کی صحبت اور دوستی سے پرہیز کرے اور ان پانچ گروہوں میں سے ایک قطع رحمی کرنے والے ہیں:

.... واياك ومصاحبة القاطع لرحمه فانی وجدته ملعونا فی كتاب الله

قطع رحمی کرنے والے کی معاشرت سے پرہیز کرو کیونکہ قرآن نے اسے ملعون اور خدا کی رحمت سے دور قرار دیا ہے۔[3]

سورہ محمد آیہ ۲۲، ۲۳ میں ارشاد ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ

پس اس کے سوا تم سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ اگر اقتدار تمہارے ہاتھ آ جائے تو زمین میں فساد برپا کرو اور قطع رحمی کرو۔ ایسے ہی لوگ خدا کی لعنت کے سزاوار ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۱۱۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۳۹۵

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۱۴ (مادہ رحم)

خلاصہ یہ کہ قرآن میں قطع رحمی کرنے والوں اور رشتہ داری کے پیوند کو توڑنے والوں کے لئے سخت احکامات ہیں اور احادیث اسلامی بھی ان کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مغضوب کون سا عمل ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا: خدا سے شرک کرنا۔ پوچھا اس کے بعد کون سا عمل زیادہ باعث غضب الٰہی ہے تو فرمایا: قطع رحمی۔[1]

اسلام نے جو رشتہ داری کی اس قدر حفاظت و نگہداری کی تاکید کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عظیم معاشرے کا استحکام، ترقی، تکامل اور اسے عظیم تر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کام چھوٹی اکائیوں سے شروع کیا جائے۔ یہ عظمت اقتصادی اور فوجی لحاظ سے درکار ہو یا روحانی و اخلاقی لحاظ سے۔ جب چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں پیش رفت اور استحکام پیدا ہو گا تو بڑا معاشرہ خود بخود اصلاح پذیر ہو جائے گا۔

اسلام نے مسلمانوں کی عظمت کے لئے اس روش سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نے اکائیوں کی اصلاح کا حکم دیا ہے اور عموماً لوگ ان کی مدد، امانت اور انہیں عظمت بخشنے سے روگردانی نہیں کرتے کیونکہ وہ ایسے افراد کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے کی نصیحت کرتا ہے جن کا خون ان کے رگ و ریشہ میں گردش کر رہا ہے اور جو ایک خاندان کے ارکان ہیں۔ واضح ہے کہ جب رشتہ داری کے چھوٹے گروپ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے تو بڑا گروپ بھی عظمت حاصل کرے گا اور ہر لحاظ سے قوی ہو گا۔ وہ حدیث جس میں ہے کہ صلہ رحمی شہروں کی آبادی کا باعث ہے غالباً اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۲) جوڑنے کی بجائے توڑنا: یہ بات قابل غور ہے کہ آیت کی تعبیر میں اس طرح ہے کہ خدا نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے فاسق اسے توڑتے ہیں۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قطع کرنا وصل سے پہلے ممکن ہے؟ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ وصل سے مقصد ان روابط کو جاری رکھنا ہے جو خداوند عالم نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان یا جانداروں میں سے ایک دوسرے کے درمیان طبعی اور فطری طور پر قائم کئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خدا نے حکم دیا ہے کہ ان فطری اور طبعی رابطوں کی محافظت و پاسداری کی جائے لیکن گنہگار انہیں قطع کر دیتے ہیں (اس بات پر خصوصی غور کیجئے)۔

۲۸۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

۲۹۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۸۔ تم خدا سے کیونکر کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندگی دی پھر وہ تمہیں مارے گا اور دوبارہ تمہیں

---

[1] سفینۃ البحار (مادہ رحم)

زندہ کرے گا اس کے بعد اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے (اس بنا پر نہ تمہاری زندگی تمہاری طرف سے ہے اور نہ موت جو کچھ تمہارے پاس ہے سب خدا ہی کی طرف سے ہے)۔

۲۹۔ وہ خدا جس نے زمین کی تمام نعمتوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

زندگی ایک اسرار آمیز نعمت ہے

مندرجہ بالا دو آیات میں قرآن نے نعمات الٰہی کے ایک سلسلے اور تعجب انگیز خلقت کا ذکر کرکے انسان کو پروردگار اور اس کی عظمت کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور خدا شناسی کے سلسلے میں جو دلائل گذشتہ آیات (۲۱ و ۲۲) میں بیان کئے گئے ہیں ان کی تکمیل کر رہا ہے۔

قرآن یہاں وجود خدا کے اثبات کا ایسے نکتے سے شروع کر رہا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور وہ ہے زندگی کا پُر اسرار مسئلہ۔

پہلے کہتا ہے تم خدا کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے روح جسم تھے اس نے تمہیں زندہ کیا اور تمہارے بدن پر زندگی کا لباس پہنایا (کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم)۔

قرآن ہم سب کو یاد دہانی کراتا ہے کہ اس سے پہلے تم پتھروں، لکڑیوں اور بے جان موجودات کی طرح مردہ تھے اور نسیم زندگی کا تمہارے قریب سے گذر نہ تھا لیکن اب تم نعمت حیات و ہستی کے مالک ہو۔ تمہیں اعضاء، حواس اور ادراک کے کارخانے عطا کئے گئے ہیں۔ یہ وجود اور حیات تمہیں کس نے عطا کیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ خود تم نے اپنے آپ کو دیا ہے۔ واضح ہے کہ ہر منصف مزاج انسان بغیر کسی تردد کے اعتراف کرتا ہے کہ یہ نعمت خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ ایک مبداء عالم و قادر کی طرف سے اسے ملی ہے جو زندگی کے تمام رموز اور پیچیدہ قوانین سے واقف تھا، انہیں منظم کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ کیوں حیات و ہستی بخشنے والے خدا کا انکار کرتے ہیں۔

آج کے زمانے میں تمام علماء و محققین پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے پاس اس دنیا میں حیات و ہستی سے زیادہ پیچیدہ کوئی دوسرا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ تمام تر عجیب و غریب ترقی کے باوجود جو طبیعی علوم و فنون کے سلسلے میں انسان کو نصیب ہوئی ہے ابھی تک حیات کا معمہ حل نہیں ہو سکا۔ یہ مسئلہ اس قدر اسرار آمیز ہے کہ لاکھوں علماء کے افکار اور کوششیں اب تک اس مسئلے کے ادراک سے عاجز ہو چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انتھک کوششوں کے سائے میں آئندہ تدریجاً انسان رموز حیات سے آگاہ ہو سکے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی شخص اس معاملے کو جو بہت گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اسرار انگیز ہے اور بہت زیادہ علم و قدرت کا محتاج ہے بے شعور طبیعت کی طرف نسبت دے سکتا ہے وہ طبیعت جو خود حیات و زندگی سے عاری ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم کہتے ہیں کہ اس جہان طبیعت میں حیات و زندگی کا ظہور وجود خدا کے اثبات کی سب سے بڑی سند ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

قرآن اوپر والی آیت میں خصوصیت کے ساتھ اسی مسئلے کا سہارا لیتا ہے ہم سرعت سے اسی مختصر اشارے سے گزر جاتے ہیں۔ قرآن اس نعمت کی یاد دہانی کے بعد ایک اور واضح دلیل پیش کرتا ہے اور وہ ہے مسئلہ موت۔ قرآن کہتا ہے: پھر خدا تمہیں مار دے گا (ثم یمیتکم)۔

انسان دیکھتا ہے کہ اس کے اعزاء و اقرباء اور دوست و احباب یکے بعد دیگرے مرتے رہتے ہیں اور ان کا بے جان جسم مٹی کے نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ یہ مقام ہی خود فکر کرتا ہے کہ آخر کس نے ان سے وجود کو چھین لیا ہے اگر ان کی زندگی اپنی طرف سے تھی تو ہمیشہ رہتی یہ چھن لی گئی ہے اس کی دلیل ہے کہ کسی دوسرے نے انہیں دی تھی۔

زندگی پیدا کرنے والا وہی موت پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ سورہ ملک کی آیت ۲ میں ہے:

الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

خدا وہ ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہیں حسن عمل کے میدان میں آزمائے۔

قرآن نے وجود خدا پر ان دو واضح دلیلوں کو پیش کیا ہے۔ دوسرے مسائل کے لئے ذہن انسانی کو آمادہ کیا ہے اور اس بحث سے مسئلہ معاد اور موت کے بعد زندگی کو بیان کیا ہے پھر کہتا ہے وہ اس کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا (ثم یحییکم)۔ البتہ موت کے بعد یہ زندگی کسی طرح تعجب خیز نہیں کیونکہ پہلے بھی انسان اسی طرح تھا (پہلی دلیل یعنی بے جان کو زندگی عطا کرنا) کی طرف متوجہ ہونے کے بعد دوسری مرتبہ اجزائے بدن کے منتشر ہونے کے بعد زندگی ملنے کو قبول کرنا مشکل نہیں بلکہ پہلی دفعہ کی نسبت آسان ہے اگرچہ جس ذات کی قدرت لامتناہی ہو اس کے لئے تسہیل و مشکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں انسانوں کی دوبارہ کی زندگی میں شک اور تردد تھا حالانکہ پہلی زندگی جو بے جان موجودات سے صورت پذیر ہوئی ہے اسے جانتے تھے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن آغاز سے اختتام تک فرضیات کو انسان کے سامنے کھولتا ہے اور ایک مختصر سے بیان میں زندگی کی ابتداء و انتہا اور مسئلہ معاد و قیامت کی اس کے سامنے تصویر کشی کرتا ہے۔

اس آیت کے آخر میں کہتا ہے: پھر اس کی طرف تمہاری بازگشت ہوگی (ثم الیہ ترجعون) خدا کی طرف رجوع کرنے کے معنی وہی خدا کی نعمتوں کی طرف رجوع کرنا ہیں یعنی قیامت اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے والے دن خدا کی نعمتوں کی طرف رجوع کریں گے۔ اس کی شاہد سورہ انعام کی آیت ۳۶ ہے جہاں فرماتا ہے:

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝

خدا مُردوں کو قبروں سے اُٹھائے گا اور اُسی کی طرف ان کی بازگشت ہوگی۔

ممکن ہے خدا کی طرف رجوع کرنے سے مقصود کوئی ایسی حقیقت ہو جو اس سے زیادہ دقیق و باریک ہو اور وہ یہ کہ تمام موجودات نے اپنا سفر نقطہ عدم جو نقطہ صفر ہے سے شروع کیا ہے اور تمام موجودات سیر تکامل میں ہیں اور لامتناہی کی طرف

بڑھ رہے ہیں جو ذات پروردگار ہے لہٰذا مرنے سے سیر تکامل کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا اور دوسری مرتبہ قیامت میں زندگی کی زیادہ بلند سطح کی طرف یہ سیر تکامل جاری و ساری رہے گی۔

نعمت حیات اور مسئلہ مبداء و معاد کے ذکر کے بعد خدا ایک اور وسیع نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: خدا وہ ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لئے پیدا کیا ہے (ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا)۔ اس ترتیب سے انسان کی وجودی قدر و قیمت اور زمین کے تمام موجودات پر ان کی سرداری کو مشخص کیا گیا ہے۔ اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان کو بہت بڑے قیمتی اور عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ تمام چیزوں کو تو اس کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب اسے کس لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس جہاں عالم میں عالی ترین وجود ہے اور عین عالم ہی سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

صرف یہی آیت نہیں جس میں انسان کے بلند ترین مقام کو بیان کیا گیا ہے بلکہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات ملتی ہیں جو انسان کا تعارف تمام تر موجودات کا مقصود اصلی کی حیثیت سے کراتی ہیں جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو تمہارے لئے مسخر قرار دیا ہے۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل بیان ہوئی ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ ... وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ[1] وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ[2] ... وَسَخَّرَ الْبَحْرَ ۚ[3] ... وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ[4]

کشتیوں کو تمہارے لئے مسخر کیا ... اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا ... دن اور رات کو تمہارے لئے مسخر کیا ... اور سمندروں کو مسخر کیا ... اور آفتاب و ماہتاب کو بھی تمہارا فرمان بردار اور خدمت گزار قرار دیا۔[5]

دوبارہ توحید کے دلائل کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا ہے: پھر خداوند عالم آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (ثم استوی الی السماء فسواھن سبع سموٰت وھو بکل شیء علیم)۔

لفظ "استوی" مادہ "استواء" سے لیا گیا ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں احاطہ کامل، تسلط اور خلقت و تدبیر پر مکمل قدرت۔ لفظ "ثم" جملہ "ثم استوی الی السماء" میں ضروری نہیں کہ تاخیر زمانی کے معنی میں ہو بلکہ ہو سکتا ہے اس کے معنی تاخیر بیان اور حقائق کو ایک دوسرے کے بعد لانا ہو۔

---

[1] ابراہیم، آیہ ۳۲

[2] و [3] ابراہیم، آیہ ۳۳

[4] نحل، آیہ ۱۴

[5] اس سلسلے میں زیادہ تر بحث اسی تفسیر میں سورہ رعد آیہ ۲ اور سورہ ابراہیم آیات ۳۲ اور ۳۳ میں کی گئی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) تناسخ اور ارواح کا پلٹ آنا

اُوپر والی آیت ان آیات میں سے ہے جو عقیدۂ تناسخ کی صریحاً نفی کرتی ہیں کیونکہ تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کا خیال ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوسری دفعہ اسی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے البتہ ہوتا یہ ہے کہ اس کی رُوح دوسرے جسم (اور دوسرے نطفے) میں حلول کرکے نئے سرے سے اسی دنیا میں زندگی کا آغاز کرتی ہے اور ممکن ہے اسی سلسلے کا بارہا تکرار ہو۔ اس جہان میں اس مکرر زندگی کو تناسخ یا عودِ ارواح کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت صراحت سے بیان کرتی ہے کہ موت کے بعد ایک سے زیادہ زندگی نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ یہ حیات وہی معاد و قیامت کی حیات ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آیت کہتی ہے کہ مجموعی طور پر تمہاری دو زندگیاں اور دو اموات تھیں اور ہیں۔ پہلے مردہ تھے (بے جان عالم موجودات میں تھے) خداوندعالم نے تمہیں زندہ کیا پھر وہ مارے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ اگر تناسخ صحیح ہوتا تو انسان کی حیات اور موت کی تعداد دو دو سے زیادہ ہوتی۔

یہی مضمون قرآن کی اور متعدد آیات میں بھی نظر آتا ہے جن کی طرف اپنی اپنی جگہ اشارہ ہوگا۔[۱]

اس بناء پر تناسخ کا عقیدہ جسے عودِ ارواح بھی کہا جاتا ہے قرآن کی نظر میں باطل اور بے اساس ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس روشن عقلی دلیلیں بھی موجود ہیں جو اس عقیدے کی نفی کرتی ہیں جن سے یہ ایک قسم کا دقیانوسی اور قانون تکامل کی رجعت قہقری کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے متعلق اس کی اپنی جگہ گفتگو کی گئی ہے۔[۲]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ شاید بعض لوگ مندرجہ بالا آیت کو برزخ کی زندگی کی طرف اشارہ قرار دیں حالانکہ آیت اس پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی صرف اتنا کہتی ہے کہ تم پہلے بے جان جسم تھے خداوندعالم نے تمہیں پیدا کیا دوبارہ وہ تمہیں مارے گا جو اشارہ ہے اس دنیا کی زندگی کے اختتام کی طرف) پھر تمہیں زندہ کرے گا (یہ حیات آخرت کی طرف اشارہ ہے) اور اسی کی طرف تم اپنی سیر تکامل جاری رکھو گے۔

(۲) سات آسمان:

لفظ "سما" لغت میں "اوپر" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ ایک جامع مفہوم ہے جس کے مختلف مصادیق ہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں گوناگوں موقعوں پر صرف ہوا ہے۔

(۱) کبھی زمین کے پڑوس میں "اوپر" والی جہت پر بولا جاتا ہے جیسے کہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا

---

[۱] موضوعِ رجعت کی وجہ سے اس مسئلے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ رجعت اول تو ایک مخصوص طبقہ کے لئے ہے اس میں عمومیت نہیں ہے جب کہ زیرِ نظر آیت ایک حکم کلی بیان کر رہی ہے پھر تناسخ میں اجسام اور ان کے اجزاء الگ الگ ہوتے ہیں جب کہ رجعت میں ایسا نہیں ہے۔

[۲] کتاب "عودِ ارواح و ارتباط ارواح" کی طرف رجوع فرمائیں

فِي السَّمَاءِ ۝

کیا تونے دیکھا نہیں کہ خداوند عالم نے پاک گفتگو کو کس طرح ایک ایسے پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑ مضبوط و ثابت ہے اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ (ابراہیم۔ ۲۴)

(ii) کبھی لفظ "سماء" سطح زمین سے بہت دور (بادلوں کی جگہ) کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبٰرَكًا

ہم آسمان سے برکتوں والا پانی نازل کرتے ہیں۔ (ق۔ ۹)

(iii) کبھی اطراف زمین کی ہوائے متراکم کی جلد کو آسمان کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ

ہم نے آسمان کو محکم و مضبوط چھت قرار دیا ہے۔ (انبیاء۔ ۳۲)

یہ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ زمین کی فضا جو چھت کی طرح ہمارے سروں پر برقرار ہے وہ اتنی مضبوط ہے کہ کرہ ارض کو آسمانی پتھروں کے گرنے سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ پتھر جو مسلسل شب و روز کشش زمین کے مرکز میں آتے ہیں اور اس کی طرف کھچے آتے ہیں اگر ہوائے متراکم کی یہ جلد نہ ہو تو ہم ہمیشہ ان خطرناک پتھروں کی زد میں رہیں لیکن اس جلد کا وجود اس بات کا سبب بنتا ہے کہ یہ پتھر فضائے زمین ہی میں جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

(iv) اور کبھی اوپر کے کروں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جب کہ وہ دھواں اور بخارات تھے (اور پہلی گیس سے کرات کو پیدا کیا)۔ (فصلت، ۱۱) (حم سجدہ ۱۱)

اب اصل بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ سات آسمانوں سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین اور علماء اسلام کے گوناگوں بیانات اور مختلف تفاسیر ہیں۔

(و) بعض سات آسمانوں سے وہی سبع سیارات (سات سیارے یعنی عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل، چاند اور سورج) مراد لیتے ہیں۔ علمائے ہیئت قدیم کے نزدیک چاند اور سورج بھی سیارات میں داخل تھے[1]

(ب) بعض کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد زمین کے گرد ہوائے متراکم کے طبقات ہیں اور وہ مختلف تہیں جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔

---

[1] بعض علماء نے نظام شمسی کے دس کرات (نو سیارے تو مشہور ہیں ایک اور سیارہ بھی ہے جو مریخ اور مشتری کے درمیان تھا لیکن وہ منتشر ہو گیا اس کا کچھ حصہ اسی طرح اسی مدار میں محو گردش ہے) کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک گروہ وہ ہے جو مدار زمین میں گردش کر رہے ہیں (جن میں عطارد و زہرہ شامل ہیں) اور ایک گروہ مدار زمین سے باہر اور اس کے اوپر کی طرف ہے۔ شاید اسی تفسیر سے یہی باہر کے سات سیارے مراد ہیں۔

(ج) بعض کہتے ہیں یہاں سات کا عدد تعدادی عدد (عدد مخصوص) کے معنی میں نہیں بلکہ عدد تکثیری ہے جس کے معنی ہیں زیادہ اور تعداد فراواں کلام عرب اور خود قرآن میں کئی جگہ اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً سورہ لقمان آیت ۲۷ میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ

اگر زمین کے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں اور سات سمندر مزید مل جائیں تو بھی کلماتِ خدا کو لکھا نہیں جا سکتا۔

بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں سات سے مراد عدد مخصوص سات نہیں بلکہ اگر ہزار ہا سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو اس سے خدا کے لامتناہی علم کو نہیں لکھا جا سکتا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سات آسمانوں سے متعدد آسمان اور عالم بالا کے بہت سے کرات مراد ہیں اور اس سے کوئی عدد مخصوص مراد نہیں۔

(د) جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ "سموات سبع" سے مراد سات آسمان ہی ہے جو اس کے حقیقی معنی ہیں۔ مختلف آیاتِ قرآن میں اس عبارت کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ سات کا عدد یہاں کثرت کے معنی میں نہیں بلکہ اسی خاص عدد کی طرف اشارہ ہے البتہ آیاتِ قرآن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام کرات، ثوابت اور سیارات جو ہم دیکھ رہے ہیں پہلے آسمان کا جزء ہیں اور چھ عالم اس کے علاوہ موجود ہیں جو ہماری نگاہ اور آج کے علمی آلات کی دسترس سے باہر ہیں اور مجموعی طور پر سات آسمانوں سے سات عالم تشکیل پذیر ہیں۔

قرآن اس گفتگو کا شاہد ہے:

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ

ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے سجایا۔ (فصلت۔ ۱۲)

دوسری جگہ پر یوں ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨ الْكَوَاكِبِ ۙ

یقیناً ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی۔ (الصّٰفّٰت۔ ۶)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ جیسے ستاروں کی دنیا کہتے ہیں سب آسمان اوّل ہے اس کے علاوہ چھ آسمان اور موجود ہیں جن کی جزئیات کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ چھ اور آسمان ہیں جو ہمارے لئے مجہول ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ علوم ان سے پردہ اٹھائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ناقص علوم جتنے آگے بڑھتے ہیں خلقت کے نئے عجائبات تک دسترس حاصل کرتے ہیں مثلاً علم ہیئت ابھی وہاں تک پہنچا ہے جہاں سے آگے ٹیلی سکوپ (TELESCOPE) دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

بڑی بڑی رصدگاہوں کے انکشافات ایک ارب نوری سال کے فاصلے تک پہنچ چکے ہیں اور سائنس دان معترف ہیں کہ یہ تو آغازِ عالم ہے اختتام نہیں لہٰذا اس میں کیا مانع ہے کہ آئندہ علم ہیئت کی ترقی سے مزید آسمان، کہکشائیں اور دوسرے

عوالم کا انکشاف ہو جائے۔ بہتر ہے کہ یہ گفتگو دنیا کی ایک بہت بڑی رصدگاہ کی زبان ہی سے سنی جائے۔

(۳) عظمتِ کائنات: پالومار کی رصدگاہ نے جہانِ بالا کی اس طرح توصیف کی ہے:

"جب تک پالومار کی رصدگاہ کی دُور بین نہیں بنی تھی دنیا کی وسعت جو ہمیں نظر آتی تھی پانچ سو نوری سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب اس دُور بین نے ہماری دنیا کی وسعت ایک ارب نوری سال تک پہنچا دی ہے اس کے نتیجے میں کئی ملین نئی کہکشاؤں کا انکشاف ہوا ہے جن میں سے بعض ہم سے ایک ارب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں لیکن ایک ارب نوری سال کے فاصلے کے بعد ایک عظیم مہیب اور تاریک فضا نظر آتی ہے جس کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی یعنی روشنی وہاں سے عبور نہیں کر سکتی کہ رصدگاہ کی دُور بین کے صفحہ کو کسی کو متاثر کرے لیکن بلاشک اس مہیب و تاریک فضا میں کئی سو ملین کہکشائیں موجود ہیں لیکن ہماری دنیا ان کہکشاؤں کی کشش سے محفوظ ہے۔

یہ عظیم دنیا جو نظر آ رہی ہے جس میں کئی سو ملین کہکشائیں موجود ہیں ایک عظیم تر جہان کا چھوٹا سا ذرہ بے مقدار ہے اور ابھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس دوسری دنیا کے اوپر بھی کوئی اور دنیا ہے"۔[1]

اس گفتگو سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیائے علم آسمانوں کے بارے میں اپنی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اپنے انکشافات کو آغازِ جہاں سمجھتی ہے نہ کہ اس کا اختتام بلکہ ایک بہت ہی عظیم جہان کے مقابلے میں اسے ایک چھوٹا سا ذرہ خیال کرتی ہے۔

۳۰۔ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ
فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ
نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○
۳۱۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○
۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ○

---

[1] مجلہ "فضا" شمارہ ۵۶ فروردین ۱۳۵۱ ہجری شمسی

۳۳۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۰۔ جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک جانشین اور حاکم مقرر کرنے لگا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگارا) کیا ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا (کیونکہ آدم سے پہلے زمین کے دوسرے موجودات جو عالم وجود میں آچکے ہیں ان کی طبیعت اور مزاج جہان مادہ کے حکم کا پابند ہے لہٰذا وہ فساد اور خونریزی کے گناہ ہی میں مبتلا تھے لیکن خلقت انسان کا مقصد اگر عبادت ہے تو ہم تیری تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں (اس پر پروردگار عالم نے فرمایا) میں حقائق کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

۳۱۔ پھر علم اسماء (علم اسرارِ خلقت اور موجودات کے نام رکھنے کا علم) سب کا سب آدم کو سکھایا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔

۳۲۔ فرشتوں نے کہا تو پاک و منزہ ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو حکیم و دانا ہے۔

۳۳۔ فرمایا: اے آدم! انہیں ان (موجودات) کے ناموں (اور اسرار) سے آگاہ کردے جب اس نے انہیں آگاہ کر دیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو انہیں بھی جانتا ہوں۔

تفسیر

زمین میں خدا کا نمائندہ — انسان

گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا نے زمین کی تمام نعمتیں انسان کے لئے پیدا کی ہیں اور ان آیات میں رسمی طور پر انسان کی رہبری اور خلافت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کی اُس روحانی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ان تمام احسانات کے لائق تھا۔

ان آیات میں آدم (پہلے انسان) کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات کے اس سلسلے میں جو آیہ ۳۰ سے شروع ہو کر ۳۹ تک پہنچتا ہے تین بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے:

(۱) پروردگارِ عالم کا فرشتوں کو زمین میں انسان کی خلافت و سرپرستی کے بارے میں خبر دینا اور وہ گفتگو جو فرشتوں نے اس سلسلے میں خدا سے کی۔

(۲) پہلے انسان کے لئے فرشتوں کو خضوع و تعظیم کا حکم جس کا ذکر مختلف مناسبات سے قرآن کی مختلف آیات میں کیا گیا ہے۔
(۳) بہشت میں آدم کی کیفیت اور رہنے کی تشریح، وہ حوادث جو جنت سے ان کے نکلنے کا سبب بنے، آدم کا توبہ کرنا اور پھر آدم اور اولاد آدم کا زمین میں آکر آباد ہونا۔

زیر بحث آیات ان میں سے پہلی منزل کی بات کرتی ہیں۔ خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا موجود خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو، اس کی صفات صفاتِ خداوندی کا پرتو ہوں اور اس کا مرتبہ و مقام فرشتوں سے بالاتر ہو۔ خدا کی خواہش اور ارادہ یہ تھا کہ ساری زمین اور اس کی نعمتیں، تمام قوتیں، سب خزانے، تمام کانیں اور سارے وسائل بھی اس کے سپرد کر دیے جائیں۔ ضروری ہے کہ ایسا شخص عقل و شعور، اور ادراک کے وافر حصے اور خصوصی استعداد کا حامل ہو جس کی بنا پر موجوداتِ ارضی کی رہبری اور پیشوائی کا منصب سنبھال سکے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت کہتی ہے یاد کریں اُس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر جانشین مقرر کرنے والا ہوں (و اذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خلیفة)۔

" خلیفہ " کے معنی ہیں جانشین۔ لیکن یہاں اس سے کس کا جانشین مراد ہے اور کس چیز میں جانشین ہے۔ مفسرین نے اس کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں انسان یا اور موجودات کا جانشین جو زمین میں پہلے زندگی گزارتے تھے۔
بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ انسان کی دوسری نسلیں ایک دوسرے کا جانشین ہوں گی۔
لیکن انصاف یہ ہے جسے بہت سے محققین نے بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد خلافتِ الٰہی اور زمین میں خدا کی نمائندگی ہے کیونکہ اس کے بعد فرشتوں کا سوال اور ان کا کہنا کہ ممکن ہے نسل آدم مبداء فساد و خونریزی ہو جب کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے کیونکہ زمین میں خدا کی نمائندگی ان کاموں کے ساتھ سازگار نہیں۔

اسی طرح آدم کو " اسماء " کی تعلیم دینا جس کی تفصیل بعد کی آیات کے ذیل میں آئے گی اس دعوے پر ایک اور واضح قرینہ ہے اور آدم کے سامنے سجدہ بھی اسی مقصد کا شاہد ہے۔

بہرحال خدا چاہتا تھا کہ ایسے وجود کو پیدا کرے جو عالم وجود کا گلدستہ ہو اور خلافتِ الٰہی کے مقام کی اہلیت رکھتا ہو اور زمین میں اللہ کا نمائندہ ہو۔

ان آیات کی تفسیر میں ایک حدیث جو امام صادقؑ سے مروی ہے وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فرشتے مقام آدم پہچاننے کے بعد سمجھ گئے کہ آدم اور ان کی اولاد زیادہ حقدار ہیں کہ وہ زمین میں خلفاءِ الٰہی ہوں اور مخلوق پر اس کی حجت ہوں۔[۱]

زیر بحث آیت مزید بیان کرتی ہے کہ فرشتوں نے حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ اعتراض کی غرض سے عرض کیا: کیا زمین

---

[۱] معانی الاخبار بحوالہ المیزان جلد ۱ ص ۱۲۱۔ اس حدیث سے اگرچہ زیادہ تر انبیاء اور آئمہ کا مقام ظاہر ہوتا ہے لیکن معلوم ہے کہ یہ انہی میں منحصر نہیں وہ تو اس موضوع کے اتم و اکمل مصداق ہیں۔

میں اسے (جانشین) قرار دے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا (قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء)۔
جب کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، تیری تسبیح و حمد کرتے ہیں اور جس چیز کی تیری ذات لائق نہیں اُس سے تجھے پاک سمجھتے ہیں
(ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك)۔

مگر یہاں خدا نے انہیں سربستہ و مجمل جواب دیا جس کی وضاحت بعد کے مراحل میں آشکار ہوئی۔ فرمایا: میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے (قال انی اعلم مالا تعلمون)۔

جیسے کہ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے فرشتے سمجھ گئے تھے کہ یہ انسان سربراہی نہیں بلکہ فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کس طرح سمجھے تھے۔

بعض کہتے ہیں خدا نے انسان کے آئندہ حالات بطور اجمال انہیں بتائے تھے جب کہ بعض کا احتمال ہے کہ ملائکہ خود اس مطلب کو لفظ فی الارض (زمین میں) سے سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے انسان مٹی سے پیدا ہوگا اور مادہ اپنی محدودیت کی وجہ سے طبعاً مرکز تزاحم و تزاحم ہے کیونکہ محدود مادی زمانہ انسانوں کی اس طبیعت کو سیر و سیراب نہیں کر سکتا جو زیادہ کی طلب رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر ساری دنیا ایک فرد کو دے دی جائے تو ممکن ہے وہ پھر بھی سیر نہ ہو اگر کافی احساسِ ذمہ داری نہ ہو تو یہ کیفیت فساد اور خونریزی کا سبب بنتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین معتقد ہیں کہ فرشتوں کی پیشین گوئی اس وجہ سے تھی کہ آدم روئے زمین کی پہلی مخلوق نہیں تھا بلکہ اس سے قبل بھی دیگر مخلوقات تھیں جنہوں نے نزاع، جھگڑا اور خونریزی کی تھی۔ ان سے پہلے کی مخلوق کی بری فائل نسل آدم کے بارے میں فرشتوں کی بدگمانی کا باعث بنی۔

یہ تین تفاسیر ایک دوسرے سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتیں یعنی ممکن ہے یہ تمام امور فرشتوں کی اس توجہ کا سبب بنے ہوں اور در اصل یہ ایک حقیقت بھی تھی جسے انہوں نے بیان کیا تھا یہی وجہ ہے کہ خدا نے جواب میں کہیں بھی اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ایسی مزید حقیقتیں انسان اور اس کے مقام کے بارے میں موجود ہیں جن سے فرشتے آگاہ نہیں تھے۔ فرشتے سمجھتے تھے اگر مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو ہم اس کے مصداق کامل ہیں ہمیشہ عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں لہٰذا سب سے زیادہ ہم خلافت کے لائق ہیں لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے وجود میں شہوت و غضب اور قسم قسم کی خواہشات موجود نہیں جب کہ انسان کو میلانات و شہوات نے گھیر رکھا ہے اور شیطان ہر طرف سے اسے وسوسے ڈالتا رہتا ہے لہٰذا ان کی عبادت انسان کی عبادت سے بہت زیادہ تفاوت رکھتی ہے۔ کہاں اطاعت اور فرمانبرداری ایک طوفان زدہ کی اور کہاں عبادت ان ساحل نشینوں کی جو مطمئن، خالی ہاتھ اور سبک بار ہیں۔

انہیں کب معلوم تھا کہ اس آدم کی نسل سے محمدؐ، ابراہیم، نوح، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء اور ائمہ اہل بیتؑ جیسے امام اور ایسے صالح بندے اور جانباز شہید مرد اور عورتیں عرصۂ وجود میں قدم رکھیں گے جو پروانہ وار اپنے آپ کو راہ خدا میں پیش کریں گے۔ ایسے افراد جن کے غور و فکر کی ایک گھڑی فرشتوں کی سالہا سال کی عبادت کے برابر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فرشتوں نے اپنی صفات کے بارے میں تین چیزوں کا سہارا لیا تسبیح، حمد اور تقدیس۔ اس میں

شک نہیں کہ تسبیح اور حمد کے معنی ہیں خدا کو ہر قسم کے نقص سے پاک اور ہر قسم کے کمال کا اہل سمجھنا لیکن یہ کہ تقدیس سے کیا مقصود ہے۔

بعض نے تقدیس کے معنی "پروردگار کو ہر قسم کے نقصان سے پاک شمار کرنا" بیان کئے ہیں جو کہ درحقیقت تسبیح کے معنی کی تاکید ہے۔

لیکن بعض معتقد ہیں کہ تقدیس مادہ "قدس" سے ہے جس کے معنی ہیں روئے زمین کو فاسد اور مفسد لوگوں سے پاک کرنا یا اپنے آپ کو ہر قسم کی بُری اور مذموم صفات سے پاک کرنا اور جسم و جان کو خدا کے لئے پاک کرنا۔ لفظ "لک" کو جملہ "نقدس لک" میں اس مقصود کے لئے شاہد قرار دیتے ہیں کیونکہ فرشتوں نے یہ نہیں کہا کہ "نقدسک" یعنی ہم تجھے پاک سمجھیں گے بلکہ انہوں نے کہا "نقدس لک" یعنی تیرے لئے معاشرے کو پاک کریں گے۔

درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر ہدف اور غرض، اطاعت اور بندگی ہے تو ہم فرمانبردار ہیں اور اگر عبادت ہے تو ہم ہر وقت اس میں مشغول ہیں اور اگر اپنے آپ کو پاک رکھنا یا صفحۂ ارضی کو پاک رکھنا ہے تو ہم ایسا کریں گے جب کہ یہ مادی انسان خود بھی فاسد ہے اور روئے زمین کو بھی فاسد کرے گا۔

حقائق کو تفصیل سے ان کے سامنے واضح کرنے کے لئے خداوند عالم نے ان کی آزمائش کے لئے اقدام کیا تاکہ وہ خود اعتراف کریں کہ ان کے اور اولادِ آدم کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

فرشتے امتحان کے سانچے میں

پروردگار کے لطف و کرم سے آدم حقائق عالم کے ادراک کی کافی استعداد رکھتے تھے خدا نے ان کی اس استعداد کو فعلیت کے درجے تک پہنچایا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق آدم کو تمام اسماء (عالم وجود کے حقائق و اسرار) کی تعلیم دی (وعلم آدم الاسماء کلھا)۔

مفسرین نے اگرچہ "علم اسماء" کی تفسیر میں قسم قسم کے بیانات دیے ہیں لیکن مسلم ہے کہ آدم کو کلمات و اسماء کی تعلیم بغیر معنی کے نہیں دی تھی کیونکہ یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان اسماء کے معانی و مفاہیم اور جن چیزوں کے وہ نام تھے ان سب کی تعلیم ہو۔ البتہ جہانِ خلقت اور عالم ہستی کے مختلف موجودات کے اسماء و خواص سے مربوط علوم سے باخبر و آگاہ کیا جانا حضرت آدم کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادقؑ سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

الارضین والجبال والشعاب والاودیہ ثم نظر الی بساط تحتہ فقال وھذا البساط مما علمہ۔

اسماء سے مراد زمینیں، پہاڑ، درے، وادیاں (غرض یہ کہ تمام موجودات) تھے۔ اس کے بعد امامؑ نے اس فرش کی طرف نگاہ کی جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور فرمایا یہاں تک کہ یہ فرش بھی ان امور میں

سے ہے کہ خدا نے جن کی آدمؑ کو تعلیم دی [1]

اس سے ظاہر ہوا کہ علم اسماء علم لغت کے مشابہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق فلسفہ، اسرار اور کیفیات و خواص کا ساتھ تھا۔ خداوند عالم نے آدم کو اس علم کی تعلیم دی تاکہ وہ اپنی سیر تکامل میں اس جہان کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ اسی طرح چیزوں کے نام رکھنے کی استعداد بھی انہیں دی تاکہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکیں اور ضرورت کے وقت ان کا نام لے کر انہیں بلا سکیں یا منگوا سکیں اور یہ ضروری نہ ہو کہ اس کے لئے ویسی چیز دکھانی پڑے۔ یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس موضوع کی اہمیت ہم اس وقت سمجھتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ انسان کے پاس اس وقت جو کچھ ہے کتاب اور لکھنے کی وجہ سے ہے اور گذرے ہوئے لوگوں کے سب علمی ذخائر ان کی تحریروں میں جمع ہیں اور یہ سب کچھ چیزوں کے نام رکھنے اور ان کے خواص کی وجہ سے ہے ورنہ کبھی بھی ممکن نہ تھا کہ ہم گذشتہ لوگوں کے علوم آنے والوں تک منتقل کر سکتے۔

پھر خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو ان اشیاء اور موجودات کے نام بتاؤ جنہیں دیکھ رہے ہو اور ان کے اسرار و کیفیات کو بیان کرو (ثم عرضهم على الملائكة فقال انبؤني باسماء هؤلاء ان كنتم صدقين) لیکن فرشتے جو اتنا علم نہ رکھتے تھے اس امتحان میں رہ گئے لہٰذا جواب میں کہنے لگے خداوندا! تو منزہ ہے، تو نے ہمیں جو تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے (قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا) تو خود ہی علیم و حکیم ہے (انك انت العليم الحكيم) اگر ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا ہے تو یہ ہماری ناآگاہی کی بناء پر تھا ہم نے یہ مطلب نہیں پڑھا تھا اور آدم کی اس عجیب استعداد اور قدرت سے بے خبر تھے جو ہمارے مقابلے میں اس کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ بے شک وہ تیری خلافت و جانشینی کی اہلیت رکھتا ہے جہان ہستی کی سرزمین اس کے وجود کے بغیر ناقص تھی۔

اب آدمؑ کی باری آئی کہ وہ ملائکہ کے سامنے موجودات کا نام لیں اور ان کے اسرار بیان کریں۔ خداوند عالم نے فرمایا: اے آدمؑ! فرشتوں کو ان موجودات کے ناموں اور کاموں سے آگاہ کرو (قال یا ادم انبئهم باسمائهم) جب آدمؑ نے انہیں ان اسماء سے آگاہ کیا تو خداوند عالم نے فرمایا: کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب سے واقف ہوں اور تم جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو سب سے باخبر ہوں (فلما انباهم باسمائهم قال الم اقل لكم اني اعلم غيب السموٰت والارض واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون)

اس مقام پر ملائکہ نے اس انسان کی وسیع معلومات اور فراواں حکمت و دانائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ان پہ واضح ہو گیا کہ صرف یہی زمین پر خلافت کی اہلیت رکھتا ہے۔

جملہ "ماکنتم تکتمون" (جو کچھ تم اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے) اس بات کی نشاندہی ہے کہ فرشتوں نے جو کچھ ظاہر کیا تھا اس کے علاوہ کچھ دل میں بھی چھپائے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ ابلیس کے غرور و تکبر کی طرف اشارہ ہے جو ان دنوں ملائکہ کی صف میں رہتا تھا لہٰذا وہ بھی ساتھ ہی مخاطب تھا۔ اس نے دل میں پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ آدم کے سامنے ہرگز نہیں

---

[1] مجمع البیان، زیر نظر آیات کے ضمن میں۔

جھکے گا۔

یہ بھی احتمال ہے فرشتے درحقیقت اپنے آپ کو روئے زمین پر خلافت الٰہی کے لئے ہر کسی سے زیادہ اہل سمجھتے تھے اگرچہ اس مطلب کی طرف اشارہ تو کرچکے تھے لیکن صراحت سے بیان نہ کیا تھا۔

دو سوال اور ان کا جواب

دو سوال اس موقع پر باقی رہ جاتے ہیں پہلا یہ کہ خداوند عالم نے حضرت آدم کو کس طرح ان علوم کی تعلیم دی تھی اور دوسرا یہ کہ اگر ان علوم کی فرشتوں کو بھی تعلیم دے دیتا تو وہ بھی آدم والی فضیلت حاصل کرلیتے۔ یہ آدم کے لئے کون سا افتخار و اعزاز ہے جو فرشتوں کے لئے نہیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ یہاں تعلیم جنبۂ تکوینی رکھتی ہے یعنی خدا نے یہ آگاہی آدم کی طبیعت و سرشت میں قرار دی تھی اور تھوڑی سی مدت میں اسے بارآور کردیا تھا۔

لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم تکوینی پر قرآن میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے۔ سورہ رحمٰن آیہ ۴ میں ہے:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

خداوند عالم نے انسان کو بیان کی تعلیم دی ہے

واضح ہے کہ یہ تعلیم خداوند عالم نے انسان کو مکتب آفرینش و خلقت میں دی ہے اور اس سے مراد وہی استعداد و خصوصیت فطری ہے جو انسانوں کے مزاج میں رکھ دی گئی ہے تاکہ وہ بات کرسکیں۔

دوسرے سوال کے جواب میں اس طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ ملائکہ کی خلقت ایک خاص قسم کی ہے جس میں یہ تمام علوم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے وہ ایک اور مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس مقصد کے لئے ان کی تخلیق نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس امتحان کے بعد ملائکہ حقیقت حال سمجھ گئے اور انہوں نے قبول کرلیا۔ پہلے شاید وہ سوچتے تھے کہ اس مقصد کی اہلیت بھی اُن میں ہے مگر خدا نے علمِ اسماء کے امتحان سے آدم اور ان کی استعداد کا فرق واضح کردیا۔

یہاں ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اگر مقصود علم اسماء، علم اسرارِ خلقت اور تمام موجودات کے خواص جاننا تھا تو پھر ضمیر "ھم"، لفظ "اسمائھم" اور لفظ "ھؤلاء" کیوں استعمال ہوئے جو عموماً افراد عاقل کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ ضمیر "ھم" اور لفظ "ھؤلاء" صرف ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات عاقل اور غیر عاقل کے مجموعے پر یا یہاں تک کہ افرادِ غیر عاقل کے مجموعے کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جیسے حضرت یوسفؑ ستاروں، سورج اور چاند کے بارے میں کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝

میں نے خواب میں دیکھا یہ سب مجھے سجدہ کررہے ہیں۔ (یوسف-۴)

۳۴۔ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٘ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○

۳۵۔ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۳۶۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○

ترجمہ

۳۴۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ و خضوع کرو تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کرکے (نافرمانی کی وجہ سے) کافروں میں سے ہو گیا۔

۳۵۔ اور ہم نے کہا اے آدمؑ! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں سکونت اختیار کر لو اور (اس کی نعمتوں میں سے) جو چاہو کھاؤ (لیکن) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ستمگاروں میں سے ہو جاؤ گے۔

۳۶۔ پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس (بہشت) میں وہ رہتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور (اس وقت) ہم نے ان سے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہو گے۔ زمین تمہاری ایک مدت معین کے لئے قرارگاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔

تفسیر

آدم جنت میں

گذشتہ بحثیں جو انسان کے مقام و عظمت کے بارے میں تھیں اُن کے ساتھ قرآن نے ایک اور فصل بیان کی ہے۔ پہلے کہتا ہے: یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدمؑ کے لئے سجدہ و خضوع کرو (واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم) ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے انکار کیا اور تکبر اختیار کیا (فسجدوا الا ابلیس ابیٰ واستکبر)۔ اُس نے تکبر کیا اور اسی تکبر و نافرمانی کی وجہ سے کافروں میں داخل ہو گیا (وکان من الکافرین)۔

پہلے پہل یوں لگتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کا مرحلہ فرشتوں کے امتحان اور تعلیم اسماء کے بعد آیا لیکن قرآن کی دوسری آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع آفرینش انسان اور اس کی خلقت کی تکمیل کے ساتھ ہے اور ملائکہ کے امتحان سے پہلے درپیش ہوا۔

سورہ حجر آیہ ۲۹ میں ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝

جب خلقتِ آدم کو منظم کروں اور اپنی روح میں سے (ایک شائستہ رُوح جو میری مخلوق ہے)، اس میں پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ کرو۔

یہی مفہوم سورہ ص آیہ ۷۲ میں بھی ہے۔[1]

اس موضوع کی شاہد یہ بات بھی ہے کہ اگر سجدہ کا حکم مقامِ آدمؑ کے واضح ہونے کے بعد ہوتا تو ملائکہ کے لئے زیادہ افتخار کا باعث نہ ہوتا چونکہ اس وقت تو آدم کا افتخار سب پر واضح ہو چکا تھا۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت انسانی شرافت اور اس کی عظمت مقام کی زندہ اور واضح گواہ ہے کہ اس کی تکمیل خلقت کے بعد تمام ملائکہ کو حکم ملتا ہے کہ اس عظیم مخلوق کے سامنے سرِتسلیم خم کرو۔ واقعاً وہ شخص جو مقامِ خلافتِ الٰہی اور زمین پر خدا کی نمائندگی کا منصب حاصل کرے، تمام تر کمال و کمال پر فائز ہو اور بلند مرتبہ فرزندوں کی پرورش کا ذمہ دار ہو جن میں انبیاء اور خصوصاً پیامبرِ اسلام اور ان کے جانشین شامل ہوں، ایسا انسان ہر قسم کے احترام کے لائق ہے۔

ہم اس انسان کا کتنا احترام کرتے ہیں اور اس کے سامنے جھکتے ہیں جو علم کے چند فارمولے جانتا ہو۔ تو پھر وہ پہلا انسان جو جہانِ ہستی کی بھرپور معلومات رکھتا تھا اس کے ساتھ کیا کچھ ہونا چاہیئے تھا۔

چند اہم نکات

(۱) ابلیس نے مخالفت کیوں کی: ہم جانتے ہیں کہ لفظ "شیطان" اسم جنس ہے جس میں پہلا شیطان اور دیگر تمام شیطان شامل ہیں لیکن ابلیس مخصوص نام ہے اور یہ اسی شیطان کی طرف اشارہ ہے جس نے حضرت آدمؑ کو ورغلایا تھا وہ صریحاً آیات قرآن کے مطابق ملائکہ کی نوع سے نہیں تھا صرف اُن کی صفوں میں رہتا تھا وہ گروہ جن میں سے تھا جو ایک مادی مخلوق ہے۔

سورہ کہف آیہ ۵۰ میں ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے (اور) وہ گروہ جن میں سے تھا۔

اس مخالفت کا سبب کبر و غرور اور خاص تعصب تھا جو اس کی فکر پر مسلط تھا۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں لہٰذا اسے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا جانا چاہیئے بلکہ آدم کو سجدہ کرنا چاہیئے اور اسے مسجود ہونا چاہیئے۔ اس کی تفصیل سورہ اعراف کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں آئے گی۔[2]

شیطان کے کفر کی علت بھی یہی تھی کہ اس نے خداوندِ عالم کے حکیمانہ حکم کو ناروا سمجھا۔ نہ صرف یہ کہ عملی طور پر اس نے نافرمانی

---

[1] آلوسی نے روح المعانی میں اور رازی نے تفسیر کبیر میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[2] تفسیر نمونہ سورہ اعراف کی آیہ ۱۲ کی تفسیر سے رجوع کیجیے۔

کی بلکہ اعتقاد کی نظر سے بھی معترض ہوا اور خود بینی و خود خواہی نے یوں ایک عمر کے ایمان و عبادت کے ماحصل کو برباد کر دیا اور اس کے خرمنِ ہستی میں آگ لگا دی۔ کبر و غرور کے آثار بد اس سے بھی زیادہ ہیں۔

کان من الکافرین کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پہلے ہی میر ملائکہ اور فرمانِ خدا کی اطاعت سے اپنا حساب الگ کر چکا تھا اور اس کے سر میں استکبار کی فکر پرورش پا رہی تھی اور شاید وہ خود سے کہتا تھا کہ اگر مجھے آدم کو سجدہ اور خضوع کرنے کا حکم دیا گیا تو میں قطعاً اطاعت نہیں کروں گا۔ ممکن ہے جملہ ماکنتم تکتمون (جو کچھ تم چھپاتے تھے) اسی طرف اشارہ ہو۔ تفسیر قمی میں جو حدیث امام حسن عسکریؑ سے روایت کی گئی ہے اس میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔[1]

(۲) سجدہ خدا کے لئے تھا یا آدم کے لئے: اس میں کوئی شک نہیں کہ سجدہ۔ جس کا معنی عبادت و پرستش ہے صرف خدا کے لئے ہے کیونکہ عالم میں خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور توحید عبادت کے معنی یہی ہیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں لہٰذا اس میں شک و شبہ نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے لئے سجدۂ عبادت نہیں کیا بلکہ یہ سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن اس عجیب و غریب مخلوق کی وجہ سے یا یہ کہ سجدہ آدم کے لئے تھا لیکن وہ خضوع و تعظیم کا سجدہ تھا نہ کہ عبادت و پرستش کا۔

کتاب عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے اسی طرح روایت ہے:

کان سجودھم للہ تعالٰی عبودیۃ و لآدم اکرام وطاعۃ لکوننا فی صلبہ۔

فرشتوں کا سجدہ ایک طرف سے خدا کی عبادت تھا اور دوسری طرف آدم کا اکرام و احترام۔ کیونکہ ہم صلبِ آدم میں موجود تھے۔[2]

بہرحال اس واقعہ اور فرشتوں کے امتحان کے بعد آدم اور اُس کی بیوی کو حکم دیا گیا کہ وہ بہشت میں سکونت اختیار کریں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جو چاہو کھاؤ (وقلنا یاٰدم اسکن انت و زوجک الجنۃ وکلا منھا رغداً حیث شئتما)۔[3] لیکن اس مخصوص درخت کے نزدیک نہ جانا۔ ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظّٰلمین)۔

آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم زندگی گزارنے کے لئے اسی عام زمین پر پیدا ہوئے تھے لیکن ابتداء میں خداوندِ عالم نے انہیں بہشت میں سکونت دی جو اسی جہان کا ایک سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے مالا مال باغ تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں آدم نے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیکھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آدمؑ زمین میں زندگی گزارنے سے آشنائی نہ رکھتے تھے اور بغیر کسی تمہید کے زحمات و تکالیف اٹھانا ان کے لئے مشکل تھا اور زمین میں زندگی گزارنے کے لئے یہاں کے کردار و رفتار کی کیفیت سے آگاہی ضروری تھی لہٰذا مختصر مدت کے لئے بہشت کے اندر ضروری تعلیمات حاصل کر لیں کیونکہ زمین کی زندگی پروگراموں، تکلیفوں

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱ ص ۱۲۶۔

[2] نور الثقلین، جلد ۱ ص ۵۸

[3] "رغد" بروزن "صمد" ہے جس کے معنی ہیں فراواں، وسیع اور گوارا۔ حیث شئتما اشارہ ہے ہر جگہ اور ہر قسم کے میوے کی طرف۔

اور ذمہ داریوں سے معمور ہے جس کا انجام صحیح سعادت، تکامل اور بقائے نعمت کا سبب ہے اور ان سے روگردانی کرنا رنج و معصیبت کا باعث ہے اور یہ بھی جان لیں کہ اگرچہ انہیں آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ مطلق ولا محدود آزادی نہیں ہے کہ جو کچھ چاہیں انجام دیں بلکہ انہیں چاہیئے کہ زمین کی کچھ چیزوں سے چشم پوشی کریں۔ نیز یہ جان لینا بھی ضروری تھا کہ اگر خطا و لغزش دامن گیر ہو تو ایسا نہیں کہ سعادت وخوش بختی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے بلکہ انہیں پلٹ کر دوبارہ عہد و پیمان کرنا چاہیئے کہ وہ حکم خدا کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دیں گے تاکہ دوبارہ نعماتِ الٰہی سے مستفید ہو سکیں۔ یہ بھی تھا کہ وہ اس ماحول میں رہ کر کچھ پختہ ہو جائیں اور اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیں اور زمین میں زندگی گزارنے کی کیفیت سے آشنا ہو جائیں۔ یقیناً یہ سلسلۂ تعلیمات ضروری تھا تاکہ وہ اسے یاد رکھیں اور اس تیاری کے ساتھ روئے زمین پر قدم رکھیں۔

یہ ایسے مطالب تھے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد آئندہ زندگی میں ان کی محتاج تھی لہٰذا باوجودیکہ آدمؑ کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا تھا ایک مدت تک بہشت میں قیام کرتے ہیں اور انہیں کئی ایک حکم دیئے جاتے ہیں شاید یہ سب تمرین و تعلیم کے پہلو سے تھا۔

اس مقام پر آدمؑ نے اس فرمانِ الٰہی کو دیکھا جس میں آپ کو ایک درخت کے بارے میں منع کیا گیا تھا۔ ادھر شیطان نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آدم اور اولادِ آدم کو گمراہ کرنے سے باز نہ آئے گا۔ وہ وسوسے پیدا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جیسا کہ باقی آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے اس نے آدمؑ کو اطمینان دلایا کہ اگر اس درخت سے کچھ کھالیں تو وہ اور ان کی بیوی فرشتے بن جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے یہاں تک کہ اس نے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں[1]

بالآخر شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور جس بہشت میں وہ رہتے تھے اس سے باہر نکال دیا۔ قرآن کے الفاظ میں:

فازلهما الشیطن عنها فاخرجهما مما کانا فیه[2]

اس بہشت سے جو اطمینان و آسائش کا مرکز تھی اور رنج و غم سے دور تھی شیطان کے دھوکے میں آکر نکالے گئے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وقلنا اهبطوا بعضکم لبعض عدو

اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ زمین پر اتر آؤ جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے (آدم و حوا ایک طرف اور شیطان دوسری طرف)۔

مزید فرمایا گیا کہ تمہارے لئے ایک مدت معین تک زمین میں قرار گاہ ہے جہاں سے تم نفع اندوز ہو سکتے ہو (ولکم فی الارض

---

[1] سورہ اعراف آیہ ۲۰، ۲۱

[2] ضمیر "عنہا" کے مرجع میں دو احتمال ہیں۔ ۱۔ یہ جنت کے لئے ہو اس صورت میں "مما کانا فیہ" کا جملہ مقام و مرتبہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہو گا کہ شیطان نے ان دونوں کو جنت سے پھسلا یا اور جس مقام کے وہ حامل تھے اس سے باہر نکالا۔ ۲۔ یہ مرجع "شجرہ" ہو یعنی شیطان نے اس درخت ممنوعہ کی وجہ سے انہیں پھسلایا اور جس بہشت میں وہ تھے اس سے باہر نکالا۔

مستقر و متاع الی حین)۔ یہ وہ مقام تھا کہ آدمؑ متوجہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور بہشت کے آرام دہ اور نعمتوں سے مالا مال ماحول سے شیطانی وسوسے کے سامنے سر جھکانے کے نتیجے میں باہر نکالے جا رہے ہیں اور اب زحمت و مشقت کے ماحول میں جا کر رہیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ آدمؑ نبی تھے اور گناہ سے معصوم تھے لیکن جیسا کہ ہم آئندہ چل کر بتائیں گے کہ کسی پیغمبر سے جب ترک اولیٰ سرزد ہو جاتا ہے تو خداوند عالم اس سے اس طرح سخت گیری کرتا ہے جیسے کسی عام انسان سے گناہ سرزد ہو۔

چند اہم نکات

(۱) آدمؑ کس جنت میں تھے: اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے کہ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جو نیک اور پاک لوگوں کی وعدہ گاہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ وہ بہشت نہ تھی بلکہ زمین کے سرسبز علاقوں میں نعمات سے مالا مال ایک رنگ برنگ مقام تھا۔

اوّل تو وہ بہشت جس کا وعدہ قیامت کے ساتھ ہے وہ ہمیشگی اور جاودانی نعمت ہے جس کے دوام کی نشاندہی بہت سی آیات میں کی گئی ہے اور اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔

دوم یہ کہ غلیظ اور بے ایمان ابلیس کے لئے اس بہشت میں جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔ وہاں نہ وسوسۂ شیطانی ہے اور نہ خدا کی نافرمانی۔

سوم یہ کہ اہل بیتؑ سے منقول روایات میں یہ موضوع صراحت سے نقل ہوا ہے۔

ایک راوی کہتا ہے: میں نے امام صادقؑ سے آدمؑ کی بہشت کے متعلق سوال کیا۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا:

جنة من جنات الدنیا یطلع فیھا الشمس والقمر ولو کان من جنان الاٰخرة ماخرج منھا ابدًا

دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا جس پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی پڑتی تھی اگر آخرت کی جنتوں میں سے ہوتی تو کبھی بھی اس سے باہر نہ نکالے جاتے۔[۱]

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ کے ہبوط و نزول سے مراد نزولِ مقام ہے نہ کہ نزولِ مکان یعنی اپنے اس بلند مقام اور سرسبز جنت سے نیچے آئے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جنت کسی آسمانی کرہ میں تھی اگرچہ وہ ابدی جنت نہ تھی۔ بعض اسلامی روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ یہ جنت آسمان میں تھی لیکن ممکن ہے لفظ "سماء" (آسمان) ان روایات میں مقام بلند کی طرف اشارہ ہو۔

تاہم بے شمار شواہد نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جنت آخرت والی جنت نہ تھی کیونکہ وہ تو انسان کی سیر تکامل کی آخری منزل ہے

---

[۱] نور الثقلین جلد ۱، ص ۶۲ بحوالہ کتاب کافی۔

اور یہ اُس کے سفر کی ابتدا تھی اور اس کے اعمال اور پروگرام کی ابتدا تھی اور وہ جنت اس کے اعمال اور پروگرام کا نتیجہ ہے۔

(۲) **آدم کا گناہ کیا تھا:** واضح ہے کہ آدم اس مقام کے علاوہ جو خدا نے گذشتہ آیات میں ان کے لئے بیان کیا ہے معرفت و تقویٰ کے لحاظ سے بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ وہ زمین میں خدا کے نمائندے تھے، وہ فرشتوں کے معلم تھے وہ عظیم ملائکہ الٰہی کے مسجود تھے اور یہ مسلم ہے کہ آدم ان امتیازات و خصوصیات کے ہوتے ہوئے گناہ نہیں کر سکتے تھے علاوہ ازیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ پیغمبر تھے اور ہر پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمؑ سے جو کچھ سرزد ہوا وہ کیا تھا۔ یہاں تین تفاسیر موجود ہیں۔

(i) آدمؑ سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترکِ اولیٰ تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان کی حیثیت اور نسبت سے وہ گناہ تھا لیکن گناہِ مطلق نہ تھا۔ گناہِ مطلق وہ گناہ ہے جو کسی سے سرزد ہو اور اس کے لئے سزا ہے (مثلاً شرک، کفر، ظلم اور تجاوز وغیرہ) اور نسبت کے اعتبار سے گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات بعض مباح اعمال بلکہ مستحب بھی بڑے لوگوں کے مقام کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ ان اعمال سے گریز کریں اور اہم کام بجا لائیں ورنہ کہا جائے گا کہ انہوں نے ترک اولیٰ کیا ہے۔ مثلاً ہم جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کچھ حصہ حضورِ قلب سے ہوتا ہے کچھ بغیر اس کے۔ یہ امر ہمارے مقام کے لئے تو مناسب ہے لیکن حضرت رسولِ اسلامؐ اور حضرت علیؑ کے شایانِ شان نہیں ان کی ساری نماز خدا کے حضور میں ہونی چاہیئے اور اگر اس کے علاوہ کچھ ہو تو کسی فعل حرام کا ارتکاب تو نہیں تاہم ترکِ اولیٰ ہے۔

(ii) خدا کی نہی یہاں "نہیِ ارشادی" ہے۔ جیسے ڈاکٹر کہتا ہے فلاں غذا نہ کھاؤ۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔ خدا نے بھی آدمؑ سے فرمایا کہ اگر درخت ممنوعہ سے کچھ کھا لیا تو بہشت سے باہر جانا پڑے گا اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا پڑے گا لہٰذا آدم نے حکم خدا کی مخالفت نہیں کی بلکہ "نہیِ ارشادی" کی مخالفت کی ہے۔

(iii) جنت بنیادی طور پر جائے تکلیف نہ تھی بلکہ وہ آدمؑ کے زمین کی طرف آنے کے لئے ایک آزمائش اور تیاری کا زمانہ تھا اور یہ نہی صرف آزمائش کا پہلو رکھتی تھی۔[۱]

(۳) **تورات سے معارف قرآن کا مقابلہ:** مندرجہ بالا آیات کے مطابق وجود آدم میں سب سے بڑا افتخار اور نقطۂ قوت جس کی وجہ سے وہ مخلوق میں منتخب ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسجود ملائک ہے وہی علم الاسماء سے آگاہی اور حقائق اسرارِ خلقت و جہانِ ہستی سے واقفیت ہے۔ واضح ہے کہ آدمؑ انہی علوم کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور اولادِ آدمؑ اگر کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ان علوم سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے۔ اولادِ آدم میں سے ہر ایک کا کمال و تکامل اسرارِ خلقت کی آگاہی سے سیدھی نسبت رکھتا ہے۔ قرآن پوری صراحت سے آدم کے مقام کی عظمت ان چیزوں میں سمجھتا ہے لیکن توریت میں آدم کے بہشت سے باہر نکالے جانے کا جو راز اور بہت بڑا گناہ بیان کیا گیا ہے وہ ان کی علم و دانش کی طرف توجہ اور نیک و بد جاننے کی خواہش ہے۔

---

[۱] مزید وضاحت کے لئے جلد ۴ سورہ اعراف ۱۹ تا ۲۲ اور جلد ۷ آیات ۱۲۱ اور اس کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں۔

تورات فصل دوم سفر تکوین میں ہے:

"پس خداوند خدا نے آدم کو خاکِ زمین سے صورت دی اور تسلیم حیات اس کے دماغ میں پھونکی اور آدم زندہ جان ہوگیا اور خداوند خدا نے ہر خوشنما درخت اور جو کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اُگایا نیز شجرِ حیات کو وسطِ باغ میں لگایا اور نیک و بد جاننے کے درخت کو...... اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ باغ کے تمام درختوں سے تمہیں کھانے کا اختیار ہے لیکن "نیک و بد جاننے" کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اسے کھائے گا موت کا مستحق ہو جائے گا۔"

فصل سوم میں یوں آیا ہے:

"اور خداوند کی آواز کو سنا جو دن کو نسیم کے وقت باغ میں خراماں خراماں چلتا تھا اور آدم اور اس کی بیوی اپنے آپ کو خداوند کے حضور سے باغ کے درختوں کے درمیان چھپاتے تھے۔"

"اور خداوند خدا نے آدم کو آواز دی۔ اُسے کہا کہ تو کہاں ہے۔"

"اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تیری آواز سنی اور میں ڈر گیا کیونکہ میں برہنہ ہوں اس وجہ سے چھپا بیٹھا ہوں۔"

"خدا نے اس سے کہا: تجھے کس نے کہا کہ تو برہنہ ہے کیا جس درخت سے تمہیں نہ کھانے کے لئے کہا تھا تم نے کچھ کھایا۔"

"آدم نے کہا جو عورت تو نے مجھے میرے ساتھ رہنے کے لئے دی ہے اُس نے اس درخت سے مجھے دیا ہے جسے میں نے کھا لیا ہے۔"

"اور خداوند خدا نے کہا آدم تو "نیک و بد جاننے" کی وجہ سے چونکہ ہم میں سے ایک ہوگیا ہے لہٰذا اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ دراز کرے اور "درخت حیات" سے بھی پھل لے اور کھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ رہے۔"

"پس اس سبب سے خداوند خدا نے اسے باغ عدن سے نکال دیا تاکہ اس زمین میں جو اس سے لے لی گئی تھی زراعت کرے۔"

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا یہ تکلیف دہ افسانہ جو آج تورات میں ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے موجود ہے اس کے مطابق آدم کے بہشت سے نکلنے اور ان کے عظیم گناہ کی اصلی علت و سبب علم و دانش کی طرف ان کی توجہ اور نیک و بد سے آگاہی کے لئے اُن کی تمنا ہے چنانچہ اگر آدم "شجرۂ نیک و بد" کی طرف ہاتھ نہ پھیلاتے تو ابد تک جہالت میں باقی رہ جاتے یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہ جانتے کہ برہنہ ہونا قبیح اور ناپسندیدہ فعل ہے اور ہمیشہ کے لئے بہشت میں باقی رہ جاتے۔

اس لحاظ سے تو آدم کو اپنے کام پر پشیمان نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ایسی جنت کو ہاتھ سے دینا جہاں رہنے کی شرط نیک و بد سے عدم آگاہی ہو۔ اس کے مقابلے میں علم و دانش حاصل کرنا نفع مند تجارت ہے اس تجارت کے بعد آدم کیوں حیران و پریشان ہوں۔

اس بنا پر تورات کا یہ افسانہ ٹھیک قرآن کے مدمقابل قرار پاتا ہے جس کے نزدیک انسان کا مقام عظمت اور اس کی خلقت کا راز علم الاسماء سے آگاہی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ افسانے میں خداوند عالم اور مخلوقات کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً:

(۱) خدا کی طرف جھوٹ کی نسبت — جیسے فصل دوم کا جملہ ۱۷:

"خداوند خدا نے کہا کہ اس درخت سے مت کھانا ورنہ مر جاؤ گے"

حالانکہ انہوں نے مرنا نہیں تھا بلکہ دانا و عقل مند ہونا تھا۔

(۲) خداوند عالم کی طرف بخل کی نسبت — جیسے فصل سوم کا جملہ ۲۲ جس کے مطابق خدا نہیں چاہتا تھا کہ آدم و حوا علم و حیات کے درخت سے کھائیں اور دانا و عقل مند ہو جائیں نیز ابدی زندگی حاصل کریں۔

(۳) خداوند عالم کے لئے شریک کے وجود کا امکان — جیسے یہ جملہ:

"آدم شجر نیک و بد سے کھانے کے بعد ہم (خداؤں) میں سے ایک کی طرح ہو گیا ہے"

(۴) خدا کی طرف حسد کی نسبت — جیسے اس جملے سے ظاہر ہے:

"خداوند نے اس علم و دانش کی وجہ سے جو آدم میں پیدا ہو گئی تھی اس پر رشک و حسد کیا"

(۵) خداوند عالم کی طرف جسم کی نسبت — جیسے فصل سوم میں ہے:

"خداوند صبح کے وقت بہشت کی سڑکوں پر خراماں خراماں چل رہا تھا"

(۶) خداوند عالم کی ان حوادث سے بے خبری جو اس کے قریب واقع ہوتے ہیں — جیسے جملہ ۹ میں ہے:

"آواز دی اے آدم! کہاں ہو۔ انہوں نے درختوں کے درمیان اپنے آپ کو خداوند کی آنکھ سے چھپا رکھا تھا"[1]

یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ جھوٹے افسانے پہلے تورات میں نہ تھے بعد میں لا دیئے گئے)

(۴) قرآن میں شیطان سے کیا مراد ہے: لفظ "شیطان" مادہ "شطن" سے ہے اور شاطن کے معنی ہیں "خبیث و پست" اور شیطان وجود سرکش و متمرد کو کہا جاتا ہے چاہے وہ انسان ہو یا جن یا کوئی اور حرکت کرنے والی چیز۔ روح شریر اور حق سے دور کو بھی شیطان کہتے ہیں جو حقیقت میں ایک قدر مشترک رکھتے ہیں۔ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ شیطان اسم عام (اسم جنس) ہے جب کہ ابلیس اسم خاص (علم) ہے۔

دوسرے لفظوں میں شیطان ہر موذی، گمراہ، باغی اور سرکش کو کہتے ہیں وہ انسان ہو یا غیر انسان لیکن ابلیس اس شیطان کا نام ہے جس نے آدم کو ورغلایا تھا اور اس وقت بھی وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اولاد آدم کے شکار کے لئے کمین گاہ میں ہے۔

قرآن میں اس لفظ کے استعمال کے مواقع سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان موذی و مضر چیز کو کہتے ہیں۔ جو راہ راست سے ہٹ چکا ہو، جو دوسروں کو آزار پہنچانے کے درپے ہو۔ اختلاف و تفرقہ پیدا کرتا جس کی کوشش ہو اور جو اختلاف و فساد کو

---

[1] کتاب قرآن و آخرین پیامبر ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۲

ہوا دیتا ہو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ

شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی، بغض اور کینہ پیدا کرے۔ (مائدہ-۹۱)

اگر ہم دیکھیں گے کہ لفظ "یرید" فعل مضارع کا صیغہ ہے اور استمرار و تسلسل پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کا ہمیشہ کا ارادہ ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں لفظ شیطان کسی خاص موجود کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ مفسد اور شریر انسانوں تک کو شیطان کہا گیا ہے۔ جیسے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ

اسی طرح ہر نبی کے لئے ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن قرار دیا ہے۔ (انعام-۱۱۲)

یہ جو ابلیس کو بھی شیطان کہا گیا ہے وہ اس کی شرارت اور فساد کے باعث ہے۔

اس کے علاوہ بعض اوقات لفظ شیطان جراثیم کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

لا تشربوا الماء من ثلمة الاناء ولا من عروته فان الشيطان يقعد على العروة والثلمة

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصے اور دستے کی جگہ سے پانی نہ پیو کیونکہ دستے کی جگہ اور ٹوٹے ہوئے حصے پر شیطان بیٹھا ہوتا ہے۔[1]

نیز امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ولا يشرب من اذن الكوز ولا من كسره فان كان فيه فانه مشرب الشياطين۔

دستے اور کوزے کے ٹوٹے ہوئے مقام سے پانی نہ پیو کیونکہ یہ شیطانوں کے پینے کی جگہ ہے۔[2]

رسول اسلامؐ کا ارشاد ہے:

مونچھوں کے بال بڑے نہ رکھو کیونکہ شیطان اسے اپنی زندگی کے لئے جائے امن سمجھتا ہے اور اس میں چھپ کر بیٹھتا ہے۔[3]

اس سے ظاہر ہوا کہ شیطان کے ایک معنی نقصان دہ اور مضر جراثیم بھی ہے لیکن واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ لفظ شیطان تمام مقامات پر اس معنی میں ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ شیطان کے مختلف معانی ہیں۔ ان روشن و واضح مصادیق میں سے ایک ابلیس کی اس کا لشکر اور اس کے اعوان و مددگار بھی ہیں اور اس کا دوسرا مصداق مفسد اور حق سے منحرف کرنے والے انسان ہیں اور بعض اوقات اذیت دینے والے جراثیم کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (اس میں خوب غور کیجئے گا)۔

(۵) خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا ہے: بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ شیطان جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہے آخر

[1] و [2] و [3] کافی جلد ۶، کتاب الاطعمہ والاشربہ باب الاوانی۔

اسے کیوں پیدا کیا گیا اور اس کے وجود کا فلسفہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

اوّل تو خدا نے شیطان کو شیطان نہیں پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ سالہا سال تک وہ ملائکہ کا ہم نشین رہا اور پاک فطرت پر رہا لیکن پھر اس نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا اور بغاوت و سرکشی کی بنیاد رکھی لہٰذا وہ ابتداء میں پاک پاکیزہ پیدا کیا گیا اس کی کجروی اس کی اپنی خواہش پر ہوئی۔

دوم یہ کہ نظام خلقت کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبانِ ایمان اور وہ لوگ جو راہ حق پر گامزن رہنا چاہتے ہیں اُن کے لئے نہ صرف یہ کہ شیطان کا وجود مضر اور نقصان دہ نہیں بلکہ اُن کی پیش رفت اور تکامل کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ترقی اور کمال ہمیشہ متضاد چیزوں کے درمیان ہی صورت پذیر ہوتے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک انسان طاقت ور دشمن کے مقابلے میں کھڑا نہ ہو کبھی بھی اپنی قوت و استعداد اور مہارت کو پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے کام میں لا سکتا ہے۔ یہی طاقت ور دشمن کا وجود انسان کے زیادہ تحرک اور جنبش کا سبب بنتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے ترقی اور کمال نصیب ہوتا ہے۔

معاصرین میں سے ایک بہت بڑا فلسفی ٹوائن بی کہتا ہے:

"دنیا میں کوئی درخشاں تمدن اس وقت تک پیدا نہیں ہوا جب تک کوئی ملت کسی خارجی طاقت کے حملے کا شکار نہیں ہوئی۔ اس حملے اور یلغار کے مقابلے میں وہ اپنی مہارت و استعداد کو بروئے کار لائی اور پھر کسی درخشاں تمدن کی داغ بیل پڑی۔"

۳۷۔ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

۳۸۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۳۷۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے اور (ان کے ذریعے) توبہ کی اور خداوند عالم نے اس کی توبہ قبول کر لی، خداوند عالم تواب اور رحیم ہے۔

۳۸۔ ہم نے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) اُتر جاؤ۔ جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی اس وقت

جو لوگ اس کی پیروی کریں گے اُن کے لئے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۳۹۔ اور جو لوگ کافر ہو جائیں اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہ اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

تفسیر

خدا کی طرف آدمؑ کی بازگشت

وسوسۂ ابلیس اور آدم کے جنت سے نکلنے کے حکم جیسے واقعات کے بعد آدم متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اس اطمینان بخش اور نعمتوں سے مالا مال جنت شیطانی فریب کی وجہ سے نکلنا پڑا اور اب زحمت و مشقت سے بھری ہوئی زمین میں رہیں گے۔ اس وقت آدمؑ اپنی غلطی کی تلافی کی فکر میں پڑے اور مکمل جان و دل سے پروردگار کی طرف متوجہ ہوئے ایسی توجہ جو ندامت و حسرت کا ایک پہاڑ ساتھ لئے ہوئے تھی۔ اس وقت خدا کا لطف و کرم بھی اُن کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا آیات میں کہتا ہے، آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے جو بہت مؤثر اور انقلاب خیز اُن کے ساتھ توبہ کی اور خدا نے بھی ان کی توبہ قبول کر لی (فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ) کیونکہ وہ تواب و رحیم ہے۔

• توبہ کے اصل معنی ہیں "بازگشت" اور قرآن کی زبان میں گناہ سے واپسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اُس صورت میں ہے جب توبہ کا لفظ کسی شخص گنہگار کے لئے استعمال کیا جائے لیکن کبھی کبھی یہ لفظ اللہ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے وہاں اس کا مفہوم ہے رحمت کی طرف بازگشت۔ یعنی وہ رحمت جو ارتکاب گناہ کی وجہ سے بندے سے سلب کر لی گئی تھی، اب اطاعت و بندگی کے راستے کی طرف اس کی واپسی کی وجہ سے اُسے لوٹا دی جاتی ہے اسی لئے خدا کے لئے تواب (بہت زیادہ رحمت کی طرف پلٹنے والا) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر توبہ خدا اور بندے کے درمیان ایک لفظ مشترک ہے۔ جب یہ صفت بندوں کے لئے ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ ہر گناہ کرنے والا در اصل اپنے پروردگار سے بھاگتا ہے اور جب وہ توبہ کرتا ہے تو اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ گناہ کے وقت خدا بھی اُن سے منہ پھیر لیتا ہے اور جب یہ صفت خدا کے لئے استعمال ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے لطف، رحمت اور محبت کی نظر اُن کی طرف لوٹا دیتا ہے[1]

یہ صحیح ہے کہ حضرت آدمؑ نے حقیقت میں کوئی فعل حرام انجام نہیں دیا تھا لیکن یہی ترک اولیٰ اُن کے لئے نافرمانی شمار ہوتا ہے۔ وہ حضرت فوراً اپنی کیفیت و حالت کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹے۔

• کلمات سے کیا مراد ہے۔ اس کے بارے میں اس بحث کے اختتام پر گفتگو کریں گے۔

بہر حال جو کچھ نہیں ہونا چاہیئے تھا یا ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا اور باوجودیکہ آدم کی توبہ قبول ہو گئی لیکن اس کا اثر وضعی

---

[1] یہی وجہ ہے کہ لفظ توبہ جب بندے کی طرف منسوب ہو تو لفظ "الی" آتا ہے اور خدا کی طرف منسوب ہو تو "علی" آتا ہے۔ پہلی صورت میں "تاب الیہ" اور دوسری طرف "تاب علیہ" کہا جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر اور تفسیر صافی زیر نظر آیت کے ذیل میں)

یعنی زمین کی طرف اترنا یہ متغیر نہ ہوا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں: ہم نے ان سے کہا کہ تم سب (آدم و حوا) زمین کی طرف اتر جاؤ۔ جب تمہیں ہماری طرف سے ہدایت پہنچے اس وقت جو لوگ اس کی پیروی کریں گے ان کے لئے خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے (وقلنا اھبطوا منھا جمیعا فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون)۔

لیکن جو لوگ کافر ہوگئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں رہیں گے (والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اولئک اصحاب النار ھم فیھا خلدون)۔

چند اہم نکات

(۱) خدا نے جو کلمات آدمؑ پر القا کئے وہ کیا تھے: توبہ کے لئے جو کلمات خدا نے آدم کو تعلیم فرمائے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مشہور ہے کہ وہ جملے یہ تھے جو سورۂ اعراف آیہ ۲۳ میں ہیں:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ان دونوں نے کہا خدایا! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً کار زیاں اور خسارے میں رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

بعض کہتے ہیں کہ کلمات سے مراد یہ دعا و زاری تھی:

اللھم لا الہ الا انت سبحنک و بحمدک رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی انک خیر الغافرین

اللھم لا الہ الا انت سبحنک و بحمدک رب انی ظلمت نفسی فارحمنی انک خیر الراحمین

اللھم لا الہ الا انت سبحنک و بحمدک رب انی ظلمت نفسی فتب علی انک انت التواب الرحیم۔

پروردگارا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک و منزہ ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، مجھے بخش دے کہ تو بہترین بخشنے والا ہے۔

خدایا! تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو پاک و منزہ ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، تو مجھ پر رحم فرما کہ تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

بارالہا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک و منزہ ہے میں تیری حمد کرتا ہوں، میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اپنی رحمت کو میرے شامل حال قرار دے اور میری توبہ قبول کر لے کہ تو تواب و رحیم ہے۔

امام محمد باقرؑ سے منقول ایک روایت میں بھی یہ موضوع اسی طرح وارد ہوا ہے[1]

---

[1] مجمع البیان، آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

اسی قسم کی تعبیرات قرآن کی دوسری آیات میں حضرت یونسؑ و موسیٰؑ کے بارے میں بھی ہیں:
حضرت یونسؑ خدا سے بخشش کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سُبْحٰنَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

خدایا! تو پاک ہے، میں ان میں سے ہوں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ (انبیاء - ۸۷)

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں ہے:

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهٗ

انہوں (حضرت موسیٰؑ) نے عرض کیا: پروردگارا! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے اور خدا نے انہیں بخش دیا۔ (القصص - ۱۶)

کئی ایک روایات جو طرق اہل بیت سے منقول ہیں میں ہے کہ کلمات سے مراد خدا کی بہترین مخلوق کے ناموں کی تعلیم تھی یعنی محمدؐ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام اور آدمؑ نے ان کلمات کے وسیلے سے درگاہ الٰہی سے بخشش چاہی اور خدا نے انہیں بخش دیا۔

یہ تین قسم کی تفاسیر ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت آدمؑ کو ان سب کلمات کی تعلیم دی گئی ہو تاکہ ان کلمات کی حقیقت اور باطنی گہرائی پر غور کرنے سے آدمؑ مکمل طور پر انقلاب روحانی پیدا ہو اور خدا انہیں اپنے لطف و ہدایت سے نوازے۔

(۲) **لفظ "اِهْبِطُوْا" کا تکرار کیوں:** زیر بحث اور اس سے پہلی آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ توبہ سے پہلے اور بعد بھی حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ حوا کو خطاب ہوا کہ زمین کی طرف اتر جاؤ۔ یہ تکرار آیا تاکید کے لئے ہے یا کسی اور مقصد کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ دوسری مرتبہ یہ لفظ اس واقعیت و حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کہیں آدمؑ یہ گمان نہ کریں کہ ان کی توبہ قبول ہو جانے کے بعد زمین کی طرف اترنے کا حکم بھی واپس لے لیا گیا ہے بلکہ انہیں اس راستے کی طرف ہر حال میں جانا ہے یا اس لحاظ سے کہ وہ اصل میں پیدا ہی اس مقصد کے لئے ہوئے تھے یا پھر اس نظر سے کہ یہ اترنا اس عمل کا اثر وضعی ہے اور یہ توبہ سے نہیں بدلا۔

(۳) "**اهبطوا**" میں کون مخاطب ہیں: "اهبطوا" صیغہ جمع کے ساتھ آیا ہے جب کہ آدمؑ و حوا جو اس گفتگو کے اصلی مخاطب ہیں وہ دو سے زیادہ نہیں تھے لہٰذا ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیئے تھا لیکن اس بنا پر جمع کا صیغہ آیا کہ آدمؑ و حوا کے زمین پر اترنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی اولاد اور نسل کو بھی زمین میں رہنا تھا لہٰذا جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔

۴۰ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

ترجمہ

۴۰۔ اے اولادِ اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں انہیں یاد رکھو اور میرے ساتھ جو عہد و پیمان تم نے باندھا ہے اسے پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کروں (اور ذمہ داری کی انجام دہی نیز عہد و پیمان کی پابندی میں) صرف مجھ سے ڈرا کرو۔

تفسیر

خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا

زمین پر خلافتِ آدم کی داستان، ملائکہ کی طرف سے ان کی تعظیم کا واقعہ، آدم کا عہد و پیمان الٰہی کو بھول جانے کا ذکر اور پھر ان کی توبہ کا تذکرہ یہ سب کچھ ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں۔

اس واقعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اس دنیا میں ہمیشہ دو مختلف طاقتیں، حق و باطل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی ہیں جس شخص نے شیطان کی پیروی کی اس نے باطل کی راہ کا انتخاب کیا جس کا انجام ہے جنت و سعادت سے دوری اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا اور اس کے بعد پشیمانی ہے۔ اس کے برخلاف جو فرمانِ خداوندی کی راہ پر چلتا رہا اور اس نے شیاطین اور باطل پرستوں کے وسوسوں کی پرواہ نہ کی وہ پاک و پاکیزہ اور رنج و غم سے آسودہ زندگی بسر کرے گا۔

بنی اسرائیل نے فرعونیوں کے چنگل سے نجات پائی، زمین میں مقیم ہوئے پھر پیمانِ الٰہی کو بھول گئے اور دوبارہ رنج و بدبختی میں پھنس گئے چونکہ یہ واقعہ حضرت آدم کے واقعے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے بلکہ اسی اصل کی ایک فرع شمار ہوتا ہے لہٰذا خداوندِ عالم زیر بحث اور اس کے بعد دسویں آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور ان کی سرگزشت بیان کرتا ہے تاکہ وہ تربیتی درس جو سرگزشتِ آدمؑ سے شروع ہوا تھا ان مباحث میں مکمل ہو جائے۔

بنی اسرائیل کی طرف اس طرح روئے سخن ہے: اے بنی اسرائیل! ہماری ان نعمتوں کو یاد کرو جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں اور مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو تاکہ میں بھی تم سے کئے ہوئے عہد سے وفا کروں اور صرف مجھ سے ڈرو (یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم و اوفوا بعھدی اوف بعھدکم و ایای فارھبون)۔

درحقیقت یہ تین دستور اور احکام (خدا کی عظیم نعمتوں کو یاد کرنا، عہدِ پروردگار کو پورا کرنا اور اس کی نافرمانی سے ڈرنا) خدا کے تمام پروگراموں کی تشکیل کرتے ہیں۔

اس کی نعمتوں کو یاد کرنا، انسان کو اس کی معرفت کی دعوت دیتا ہے اور انسان میں شکر گزاری کا احساس ابھارتا ہے۔ اس کے بعد اس نکتے کی طرف توجہ کہ یہ نعمتیں بغیر کسی قید و شرط کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ خدا نے عہد و پیمان لیا ہے یہ انسان کو اس کی الٰہی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ انسان ذمہ داری کی راہ میں کسی شخص یا ہستی سے نہ ڈرے۔ یہ سبب بنتا ہے کہ انسان اس راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دے اور اپنی ذمہ داریوں اور عہد و پیمان کو پورا کرے کیونکہ

اس راستے کی اہم رکاوٹوں میں سے ایک بلاوجہ اس سے اور اُس سے ڈرنا ہے خصوصاً بنی اسرائیل جو سالہا سال تک فرعونوں کے زیر تسلط رہے تھے، خوف ان کے بدن کا جزو بن چکا تھا۔

چند اہم نکات

(۱) یہودی مدینہ میں : یہ بات قابل غور ہے کہ بعض مؤرخین قرآن کی تصریح یہ ہے کہ سورہ بقرہ وہ پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کا اہم حصہ یہودیوں کے بارے میں ہے کیونکہ اہل کتاب کے پیروکاروں کی زیادہ مشہور جماعت یہاں پر یہودیوں ہی کی تھی۔ وہ ظہور پیغمبرؐ سے پہلے اپنی مذہبی کتب کی روشنی میں اس قسم کے ظہور کے منتظر تھے اور دوسروں کو بھی اس کی بشارت دیتے تھے۔ اقتصادی حالت بھی اُن کی بہت اچھی تھی خلاصہ یہ کہ مدینہ میں ان کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو اسلام ان کے غیر شرعی منافع کے راستوں کو بند کرتا تھا اور ان کے غلط رویّوں اور خود سری کو روکتا تھا۔ ان میں سے اکثر نے نہ صرف یہ کہ اسلام کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر اس کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ چودہ سو سال گذرنے کے باوجود اسلام سے ان کا یہ مقابلہ ابھی تک جاری ہے۔

مندرجہ بالا اور اس کے بعد کی آیات نازل ہوئیں اور سخت ترین سرزنشوں کے تیر یہودیوں پر چلائے گئے اور ان کی تاریخ کے حساس حصوں کو اس باریکی کے ساتھ ذکر کیا گیا کہ جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا اُن میں سے جو بھی تھوڑی سی حق جوئی کی روح رکھتا تھا وہ بیدار ہو کر اسلام کی طرف آ گیا علاوہ ازیں مسلمانوں کے لئے بھی یہ ایک تربیتی درس تھا۔

انشاء اللہ آنے والی آیات میں آپ بنی اسرائیل کے نشیب و فراز پڑھیں گے جس میں اُن کا فرعون کے چنگل سے نجات پانا، دریا کا شق ہونا، فرعون اور فرعونیوں کا غرق ہونا، کوہ طور حضرت موسیٰؑ کی وعدہ گاہ، حضرت موسیٰؑ کی غیبت کے زمانے میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی، خونی توبہ کا حکم، خدا کی مخصوص نعمتوں کا ان پر نزول اور اس قسم کے دیگر واقعات جن میں سے ہر ایک واقعہ اپنے اندر ایک یا کئی عبرت ناک درس لئے ہوئے ہے۔

(۲) یہودیوں سے خدا کے بارہ معاہدے : جس طرح آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے وہ معاہدے یہ تھے : ایک اکیلے خدا کی عبادت کرنا، ماں باپ، عزیز و اقارب، یتیموں اور مدد طلب کرنے والوں سے نیکی کرنا، لوگوں سے اچھا سلوک کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا اور اذیت و آزار اور خون ریزی سے دور رہنا۔

اس بات کی شاہد اسی سورت کی آیت ۸۳ اور ۸۴ ہے :

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔۔۔۔
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

در اصل یہ دو آیات دس معاہدوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو خدا نے یہودیوں سے کیے تھے اور سورہ مائدہ کی

آیت ۱۲ مائدہ یہ ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ..... وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ -

اس میں سے دوسرے عہد و پیمان جن میں انبیاء پر ایمان لانا اور انہیں تقویت پہنچانا شامل ہیں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کی بڑی بڑی نعمتیں کچھ معاہدوں کی بنیاد پر حاصل کی تھیں اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر ان معاہدوں کے وفادار رہوگے تو تمہیں جنت کے باغوں میں بھی جگہ دی جائے گی جن کی نہریں اُن کے قصروں اور درختوں کے نیچے جاری ہوں گی:

لادخلنکم جنات تجری من تحتها الانهر

بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے آخر کار یہ عہد و پیمان پاؤں تلے روند ڈالے اور اب اس زمانے میں بھی اپنی پیمان شکنی جاری رکھے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ منتشر و پراگندہ ہیں اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور جب تک ان کی یہ پیمان شکنیاں جاری رہیں گی، ان کی یہ کیفیت بھی جاری رہے گی۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دوسروں کی پناہ میں نشوونما پا رہے ہیں تو یہ ہرگز ان کی کامیابی کی دلیل نہیں اور ہم اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں کہ جس دن اسلام کے غیور بیٹے نسلی اور قومی رجحانات و میلانات سے دور ہو کر صرف قرآن کے سائے میں اٹھ کھڑے ہوں گے وہ اس شور اور ہنگامے کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔

(۴) خدا بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا: خدا کی نعمتیں کبھی قید اور شرط کے بغیر نہیں ہوتیں اور ہر نعمت کے پہلو میں ایک ذمہ داری اور شرط پنہاں ہے۔ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اوف بعهدكم سے مراد یہ ہے کہ میں اپنے عہد کو پورا کروں گا اور تمہیں جنت میں لے جاؤں گا۔[1]

اس حدیث کے ایک حصے میں ولایت علیؑ پر ایمان لانا بھی اس عہد کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ بنی اسرائیل کے عہد و پیمان کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ انبیاء خدا کی رسالت پر ایمان لائیں گے اور ان کو تقویت پہنچائیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے جانشینوں کو بھی ماننا اسی مسئلۂ رہبری و ولایت کا ضمیمہ ہے جو ہر زمانے میں اُس کی مناسبت سے تحقق پذیر ہوتا رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں اس منصب پر فائز خود حضرت موسیٰؑ تھے۔ اور نبی اکرمؐ کے زمانے میں خود آنحضرتؐ ہی تھے اور بعد والے زمانے میں حضرت علیؑ۔

ضمنی طور پر جملہ ایای فارھبون (صرف میری سزا سے ڈرو) اس امر کی تاکید ہے کہ خدا سے ایفائے عہد اور اطاعت احکام کی راہ میں ہیں کسی چیز اور کسی شخص سے خوف و وحشت نہیں ہونا چاہیے۔ لفظ ایای جو فارھبون سے مقدم ہے سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے۔

(۵) حضرت یعقوبؑ کی اولاد کو بنی اسرائیل کیوں کہتے ہیں: حضرت یعقوبؑ جو حضرت یوسفؑ کے والد تھے ان کا ایک

---

[1] نور الثقلین ج ۱ ص ۶۲

نام "اسرائیل" بھی ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنا یہ نام کیوں رکھا تھا۔ اس سلسلے میں غیر مسلم مؤرخین نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو خرافات کا پلندہ ہیں۔ جیسے قاموس "کتاب مقدس" میں لکھا ہے:

"اسرائیل کا معنیٰ وہ شخص ہے جو خدا پر غالب اور کامیاب ہوگیا ہو۔"

وہ مزید لکھتا ہے:

"یہ لفظ یعقوب بن اسحاق کا لقب ہے جنہیں خدا کے فرشتوں سے کشتی لڑتے وقت یہ لقب ملا تھا۔"

اسی کتاب میں لفظ یعقوب کے نیچے لکھا ہے:

"جب انہوں نے اپنے اثبات و استقامت ایمان کو ظاہر کیا تو خداوند نے اس کا نام بدل کر اسرائیل رکھ دیا اور وعدہ کیا کہ وہ عوام کے گروہوں کے باپ ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ وہ انتہائی کمال کے ساتھ اس دنیا سے گئے اور دنیا کے کسی بادشاہ کی طرح دفن ہوئے اور اسم یعقوب و اسرائیل ان کی پوری قوم کے لیے بولا جاتا ہے۔"

لفظ "اسرائیل" کے ذیل میں لکھتا ہے:

"اس نام کے بہت سے موارد ہیں چنانچہ کبھی اس سے مراد نسل اسرائیل و نسل یعقوب بھی ہوتی ہے۔"[1]

علماء اسلام اس سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں مثلاً مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

"اسرائیل وہی فرزند اسحاقؑ بن ابراہیمؑ ہیں۔"

وہ لکھتے ہیں:

"اسر" کے معنی "عبد" اور "ئیل" کے معنی "اللہ" ہیں۔ لہٰذا "اسرائیل" کے معنی "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ ہیں۔"

واضح ہے کہ اسرائیل کی فرشتوں سے کشتی لڑنے کی داستان جیسے کہ تحریف شدہ تورات میں اب بھی موجود ہے ایک خود ساختہ اور بچگانہ کہانی ہے جو ایک آسمانی کتاب کی شان سے بعید ہے اور یہی داستان موجودہ تورات کے تحریف شدہ ہونے کی دلیل و مدرک ہے۔

۴۱۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ○

۴۲۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۴۳۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○

---

[1] قاموس کتاب مقدس ص۳۵ و ص۹۵

ترجمہ

۴۱۔ اور جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ تمہاری کتابوں میں ہے اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو (تھوڑی سی آمدنی کے لیے ان نشانیوں کو نہ چھپاؤ جو قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق تمہاری کتابوں میں موجود ہیں) اور (لوگوں سے ڈرنے کی بجائے) صرف مجھ سے (میرے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے) ڈرو۔

۴۲۔ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ چھپاؤ۔

۴۳۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (یعنی نماز جماعت کے ساتھ پڑھو)۔

شانِ نزول

زیر نظر آیات میں سے شروع کی آیتوں کے بارے میں بعض بزرگ مفسرین نے امام محمد باقرؑ سے یوں نقل کیا ہے:

"حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور یہودیوں کی ایک جماعت کے لئے یہودیوں کی طرف سے ہر سال ایک زرق برق دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا یہ لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں رسول اسلامؐ کے قیام کی وجہ سے یہ چھوٹا سا فائدہ جاتا نہ رہے اس وجہ سے (اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر) انہوں نے تورات کی ان آیات میں تحریف کر دی جو اوصافِ پیغمبر کے بارے میں تھیں یہ وہی "ثمن قلیل" اور کم قیمت ہے جس کی طرف قرآن نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔[1]

تفسیر

یہودیوں کی دولت پرستی

خدا نے یہودیوں سے جو پیمان لئے تھے ان میں انبیاء الٰہی پر ایمان لانا اور ان کے فرامین کی اطاعت کرنا بھی شامل تھا۔

زیر نظر تین آیات میں ان احکام و قوانین کے نو حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو یہودیوں کو دیے گئے تھے:

پہلا یہ کہ ان آیات پر ایمان لاؤ جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی ہیں جب کہ یہ آیات ان اوصاف سے ہم آہنگ ہیں جو تمہاری توریت میں موجود ہیں (وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم)۔

قرآن اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے یعنی وہی بشارتیں جو تورات اور گذشتہ انبیاء نے اپنے پیروکاروں کو دی ہیں اور بتایا ہے کہ ان اوصاف کا نبی ظہور کرے گا اور اس کی آسمانی کتاب ان خصوصیات کی حامل ہوگی۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اس پیغمبر کی صفات اور قرآن پاک کی خصوصیات ان بشارتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں جو تمہاری کتب میں

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے سلسلے میں

موجود ہیں۔ اس ہر قسم کی مطابقت کے بعد اب تم کیوں اس پر ایمان نہیں لاتے۔

پھر کہا گیا ہے کہ تم آسمانی کتاب کا انکار کرنے والوں میں پہل نہ کرو (ولا تکونوا اول کافر بہ)۔

اگر مشرک اور عرب کے بت پرست کافر ہو جائیں تو زیادہ تعجب کی بات نہیں تعجب تو تمہارے کفر و انکار پر ہے اور مخالفت میں پہل کے لحاظ سے تم پیش پیش بھی ہو جب کہ تم ان کی زیادہ اطلاعات رکھتے ہو اہل کتاب بھی ہو۔ اس قسم کے پیغمبر کے بارے میں تمہاری آسمانی کتب میں سب بشارتیں دی جا چکی ہیں۔ اسی بنا پر تو تم ان کے ظہور سے پہلے ان کے بارے میں منادی کیا کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے ظہور کے بعد تم ان پر ایمان لانے والوں میں پہل کرتے تم نے کفر میں پہل کی ہے۔ بہت سے یہودی اصولی طور پر کچھ اس قسم کے تھے اور اگر ان میں یہ ضد نہ ہوتا تو بظاہر انہیں دوسروں کی نسبت پہلے ایمان لانا چاہیئے تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ تم میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو اور ایک سالانہ وظیفہ سے اس کا تبادلہ نہ کرو (ولا تشتروا بایٰتی ثمنا قلیلا)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کی آیات کو کسی قیمت پر بھی نہیں بیچنا چاہیئے چاہے کم ہو یا زیادہ لیکن یہ جملہ حقیقت میں ان یہودیوں کی کم ظرفی کی نشاندہی کرتا ہے جنہوں نے چھوٹے چھوٹے منافع کے لئے ہر چیز کو بھلا دیا اور وہ لوگ جو پیغمبر اسلامؐ کے قیام اور ان کی آسمانی کتاب کے بارے میں بشارت دیا کرتے تھے جب اپنے منافع کو خطرے میں دیکھا تو سب بشارتوں کا انکار کرنے لگے اور آیات تورات میں تحریف کر دی کیونکہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ اگر لوگوں کو حقیقت حال کا علم ہو گیا تو ان کی سرداری کا محل زمین بوس ہو جائے گا۔

اصولاً یہ پوری دنیا بھی اگر کسی کو ایک آیت الٰہی کے انکار کے بدلے مل جائے تو واقعاً یہ قیمت بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی تو بہرحال نابود ہونے والی ہے اور دار آخرت ابدی اور دائمی ہے لہٰذا ایک انسان کس طرح ان آیات الٰہی کو حقیر فوائد پر قربان کر دے۔

چوتھا حکم ہے کہ صرف مجھ سے ڈرو (وایای فاتقون)۔

اس بات سے نہ ڈرو کہ تمہاری روزی منقطع ہو جائے گی اور اس سے بھی نہ ڈرو کہ یہودیوں کی متعصب جماعت تمہارے خلاف قیام کرے گی بلکہ صرف مجھ سے یعنی میرے حکم کی مخالفت سے ڈرو۔

پانچواں حکم ہے کہ حق کو باطل سے مخلوط نہ کرو تاکہ کہیں لوگ اشتباہ میں جا پڑیں (ولا تلبسوا الحق بالباطل)۔

چھٹے فرمان میں حق کو چھپانے سے منع کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ جب کہ تم اسے جانتے اور اس سے آگاہ ہو (وتکتموا الحق وانتم تعلمون)۔

جس طرح حق کو چھپانا جرم اور گناہ ہے اسی طرح حق کو باطل سے ملانا اور انہیں ایک دوسرے سے مخلوط کرنا بھی حرام اور گناہ ہے کیونکہ نتیجے کے اعتبار سے دونوں عمل برابر ہیں۔ حق بات کرو چاہے تمہارے لئے نقصان دہ ہو اور باطل کو حق سے نہ ملاؤ چاہے تمہارے جلد ضائع ہو جانے والے منافع خطرے میں پڑ جائیں۔

آخر میں ساتویں، آٹھویں اور نویں حکم کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خصوصاً اجتماعی عبادت کو فراموش نہ کرتے ہوئے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین)۔

آخری حکم اگرچہ با جماعت نماز کے بارے میں ہے لیکن نماز کے تمام افعال میں سے صرف رکوع کو بیان کرتے ہوئے کہنا کہ رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ، شاید اس بناء پر کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع بالکل نہیں ہے یہ صرف مسلمانوں کی نماز ہے جس کے بنیادی ارکان میں رکوع شامل ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ نماز پڑھو بلکہ فرمایا: اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) یعنی فقط یہی نہ ہو کہ تم نماز پڑھتے رہو بلکہ ایسا کرو کہ آئین نماز معاشرے میں قائم ہو جائے اور لوگ عشق و دلدادگی کے ساتھ اس کی طرف جائیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "اقیموا" اس طرف اشارہ ہے کہ تمہاری نماز صرف اذکار اور اوراد ہی نہ ہو بلکہ اسے پہلے طور پر قائم کرو جس میں سے سب سے اہم قلبی توجہ، دل کا بارگاہِ خدا میں حاضر ہونا اور نماز کا انسان کی روح اور جان پر اثر انداز ہونا ہے[1]

در حقیقت ان آخری تین احکام کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ پہلا فرد کا خالق سے رشتہ بیان کرتا ہے (یعنی نماز) دوسرا مخلوق کا مخلوق سے ناتا قائم کرتا ہے (یعنی زکوٰۃ) اور تیسرا سب لوگوں کا خدا سے تعلق ظاہر کرتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) کیا قرآن تورات اور انجیل کے مندرجات کی تصدیق کرتا ہے: قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ بات نظر سے گزرتی ہے کہ قرآن گذشتہ کتب کے مندرجات کی تصدیق کرتا ہے۔ محل بحث آیات میں ہے "مصدقا لما معکم" اور سورہ کی آیات ۸۹ اور ۱۰۱ میں ہے:

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ

نیز سورہ مائدہ کی آیت ۴۸ میں ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ

ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی یہ کتاب اپنے سے پہلے والی آسمانی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔

ان آیات کو علماء یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت تورات اور انجیل کے عدم تحریف کی سند قرار دیتی ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے زمانے کی تورات اور انجیل میں اور موجودہ تورات اور انجیل میں مسلماً کوئی فرق نہیں اگر تورات اور انجیل میں تحریف ہوئی ہوتی تو یہ زمانہ پیغمبر سے پہلے کی بات ہوتی لیکن قرآن نے چونکہ اس تورات اور انجیل کے صحیح ہونے کی تصدیق

---

[1] المنار، ج ۲، ص ۲۹۳ و مفردات راغب، مادہ "قوم"

کی ہے جو آنحضرتؐ کے زمانے میں موجود تھی لہذا ہمیں چاہیئے کہ ان کتب کو غیر محرف آسمانی کتب کی حیثیت سے رسمی طور پر قبول کرلیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی مختلف آیات گواہی دیتی ہیں کہ انہی تحریف شدہ کتابوں میں جو اس وقت یہود و نصاریٰ کے پاس تھیں پیغمبر اسلامؐ اور ان کے دین کے متعلق نشانیاں موجود تھیں۔ یہ مسلم ہے کہ ان آسمانی کتب میں تحریف کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ کتب پوری کی پوری باطل اور خلافِ واقع ہیں بلکہ یقینی طور پر ان سب میں حقیقی تورات اور انجیل کا کچھ حصہ موجود تھا اور موجود ہے اور پیغمبر اسلام کے بارے میں انہی یا دیگر مذہبی کتب میں نشانیاں موجود تھیں جو یہود و نصاریٰ کے پاس تھیں (آج بھی ان میں کچھ ایسے اشارات موجود ہیں)۔ اس لحاظ سے پیغمبر کا قیام، آپ کی دعوت اور آپ کی آسمانی کتاب عملی طور ان تمام نشانیوں کی تصدیق کرتے تھے کیونکہ ان کے مطابق تھے۔

لہذا قرآن کی تورات اور انجیل کی تصدیق کرنا ان معنی میں ہے کہ نبی اکرمؐ کی نشانیاں، آپؐ کی دعوت اور آپؐ کا قیام جو قرآن میں موجود ہے ان نشانیوں کے مطابق ہے جو تورات اور انجیل میں ہیں۔

تصدیق بمعنی مطابقت کے معنی میں قرآن مجید کے دیگر مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے۔

مثلاً سورہ الصّٰفّٰت، آیہ ۱۰۵ میں ابراہیمؑ سے فرمایا گیا ہے:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا

آپ نے اپنے خواب کی تصدیق کردی

یعنی آپ کا عمل اس خواب کے مطابق ہے جو آپ نے دیکھا تھا۔

سورہ اعراف، آیہ ۱۵۷ میں ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ....

یہاں یہ حقیقت صراحت سے بیان ہوئی ہے یعنی "جو اوصاف وہ دیکھ رہے ہیں وہ اس کے مطابق ہیں جو انہوں نے تورات اور انجیل میں پائے ہیں...."

دوسری آیات میں یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کی نشانیاں ان گذشتہ کتب میں دیکھی گئی ہیں اور زیر بحث آیت جس کی تفسیر ہم پڑھ چکے ہیں یہ بھی اس حقیقت کی شاہد ہے اور وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ تھوڑی سی چیز کی خاطر بیان تک کہ ایک دعوت کے لئے انہوں نے صفات پیغمبر کے بارے میں تحریف کردی۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن اور رسول اسلامؐ نے عملی طور پر اپنی حقانیت کی ان نشانیوں کی تصدیق کی جو گذشتہ کتب میں موجود تھیں اور اس کے لئے کوئی معمولی سی دلیل بھی موجود نہیں کہ ان آیات نے تورات اور انجیل کے تمام مندرجات کی تصدیق کردی ہے جب کہ اس کے برخلاف قرآن مجید کی کئی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے تورات اور انجیل میں تحریف کردی تھی اور یہ خود ہماری گذشتہ گفتگو کا ایک زندہ شاہد ہے۔

فخر الاسلام جو کتاب انیس الاعلام کے مؤلف ہیں علماء نصاریٰ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علماء ہی میں مکمل کی تھی اور ان کے ہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب و غریب واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد و تقویٰ میں ممتاز تھا۔ کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اسی سے رجوع کرتے تھے۔ ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص ہی لگاؤ تھا۔ اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں صرف ایک صندوق خانے کی چابی اس نے اپنے پاس رکھا کرتی تھی..... اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جاکر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا۔ جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث و مباحثے میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ "فارقلیطا" اور یونانی زبان کے لفظ "پریکلتوس" کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے۔ ہر کسی کی الگ رائے تھی۔ واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں سے کس قول کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ فلاں مفسر کے قول کا جس نے اس کا معنی "متاز" بیان کیا ہے میں نے پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تونے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ ان تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو راسخون فی العلم کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتائیے۔ وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا۔ لیکن اس نام کے معنی معلوم ہو جانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔ میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی "احمد" اور "محمد" ہیں۔ اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے آؤ۔ میں کتابیں اس کے پاس لے آیا۔ یہ دونوں کتابیں رسول اسلام کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔ دونوں کتب میں لفظ "فارقلیط" کا ترجمہ "احمد" اور "محمد" کیا گیا تھا۔ اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرت کے ظہور سے پہلے علماء نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد و محمد ہیں۔ لیکن ظہور محمدؐ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقاء کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ

کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملے کا اس نے تین مرتبہ تکرار کیا
بس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم ۔ ۔ ۔ ۔ کون سا ہے۔ اس نے کہا: منحصر
ہے محمدؐ کی پیروی و اتباع میں۔ میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں۔ اس نے کہا ہاں
خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی) پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت
اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کرو ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ
کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمدؐ کا پیروکار ہوں اور علمار نصاریٰ
کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست کش
نہیں ہو سکتے ورنہ کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے[1]۔

آپ دیکھیں گے کہ علمار اہل کتاب نے پیامبر اسلام کے ظہور کے بعد اپنے شخصی منافع کی خاطر آنحضرتؐ کے نام اور نشانیوں کی اور توجیہات کر دی ہیں۔

۴۴۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۴۵۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ○

۴۶۔ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○

ترجمہ

۴۴۔ کیا تم لوگوں کو نیکی کی (اور اس پیغمبر پر جس کی صفات واضح طور پر تورات میں آئی ہیں ایمان لانے کی) دعوت دیتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ (آسمانی) کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

۴۵۔ صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو (استقامت اور اندرونی خواہشات پر کنٹرول کر کے پروردگار کی طرف توجہ سے قوت حاصل کرو اور خشوع کرنے والوں کے علاوہ دوسروں پر یہ کام گراں ہے۔

۴۶۔ وہ جو ایمان رکھتے ہیں کہ خدا سے ملاقات کریں گے اور اسی کی جانب لوٹ جائیں گے۔

تفسیر

دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت

اگرچہ مندرجہ بالا آیات، اسی طرح گذشتہ اور آئندہ آیات میں روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے لیکن مسلماً اس کا مفہوم

[1] اقتباس و اختصار از ہدایت دوم مقدمہ "انیس الاعلام"

وسعت کے اعتبار سے دوسروں کے بھی شامل حال ہے۔

مشہور مفسر، صاحب مجمع البیان، طبرسی کے بقول یہود کے علماء و فضلاء حضرت محمدؐ کی بعثت سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے کی دعوت اور آپؐ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن خود انہی نے آنحضرتؐ کے ظہور کے وقت ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

یہی عظیم مفسر نقل کرتے ہیں کہ علماء یہود اپنے ان وابستگان کو جو اسلام لا چکے تھے نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنے ایمان پر باقی اور ثابت قدم رہنا لیکن خود ایمان نہ لاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں ان کے اس طرز عمل کی مذمت کی گئی ہے کہا گیا ہے: کیا تم لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو (اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم)۔

باوجودیکہ آسمانی کتاب (توارت) کا مطالعہ کرتے ہو لیکن کیا کچھ بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ہو (وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون)۔

اسی طرح قرآن انہیں سرزنش کرتا ہے دوسروں کو ایمان کی وصیت کیوں کرتے ہو جب خود ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ پیغمبر کی نشانیاں اور خصوصیت توراۃ میں پڑھ چکے ہو۔

علماء، مبلغین اور راہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے لئے خاص طور پر یہ بنیادی بات ہے کہ وہ باقی لوگوں کی نسبت زیادہ تر اپنے عمل سے تبلیغ کریں جیسے کہ حضرت امام صادقؑ سے ایک مشہور روایت ہے:

کونوا دعاۃ الناس باعمالکم ولا تکونوا دعاۃ بالسنتکم

لوگوں کو عمل سے دعوت دو نہ کہ زبان سے۔ [1]

عملی دعوت کی گہری تاثیر کا سرچشمہ یہ ہے کہ اگر سننے والے کو معلوم ہو جائے کہ کہنے والا دل سے بات کر رہا ہے اور خود اپنے قول پر سو فی صد ایمان رکھتا ہے تو وہ اپنے دل کے کانوں سے اس کی بات سنے گا پھر اس کی باتیں بدن سے گزر کر نفس پر اثر کریں گی۔ کہنے والا اپنی بات پر ایمان رکھتا ہے، اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ خود اس پر دوسروں سے پہلے عمل کرتا ہے جیسے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ایھا الناس انی واللہ ما احثکم علی طاعۃ الا واسبقکم الیھا ولا انھاکم عن معصیۃ الا وانتھی قبلکم عنھا۔

اے لوگو! خدا کی قسم میں تمہیں کسی اطاعت کا شوق نہیں دلاتا جب تک پہلے خود اسے انجام نہ دے لوں اور کسی غلط کام سے تمہیں منع نہیں کرتا مگر یہ کہ پہلے خود اس سے رک جاتا ہوں۔ [2]

امام صادقؑ سے ایک روایت میں ہے:

---

[1] سفینہ، مادہ "عمل"۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۵

من اشد الناس عذابًا یوم القیامة من وصف عدلا و عمل بغیرہ

• وہ لوگ جن پر قیامت کے دن سخت عذاب ہوگا ان میں سے ایک وہ ہوگا جو حق اور عدل کی بات کرتا ہے لیکن خود اس کے خلاف عمل کرتا ہے[1]

یہودی علماء اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر پیامبر اسلامؐ کی رسالت کا اعتراف کرلیں گے تو اُن کی مادی امداد منقطع ہو جائے گی اور یہودی عوام ان کی پرواہ نہیں کریں گے لہٰذا تورات میں پیغمبر اسلامؐ کی جو صفات آئی تھیں انہوں نے اُن میں ردو بدل کر دیا۔

اس مقصد کے لئے کہ وہ اپنے دلی میلان کی طرف قدم بڑھائیں اور سربراہی و سرداری کو دماغ سے نکال دیں قرآن کہتا ہے: صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو یعنی استقامت اور اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کے ذریعے کامیابی حاصل کرو (واستعینوا بالصبر والصلوٰة)۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ کام خاشعین کے علاوہ دوسروں پر گراں ہے (وانها لکبیرة الا علی الخاشعین)۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں خاشعین کا یوں تعارف کراتا ہے (الذین یظنون انهم ملقوا ربهم و انهم الیه راجعون)[2] "یظنون" جس کا مادہ "ظن" ہے کبھی "گمان" اور کبھی "یقین" کے معنی میں آتا ہے۔ اس مقام پر یقیناً ایمان اور قطعی یقین کے معنی میں ہے کیونکہ لقاء اللہ اور اس خدا کی طرف بازگشت پر ایمان رکھنا انسان کے دل میں خشوع، خدا ترسی اور ذمہ داری کا احساس زندہ کر دیتا ہے اور یہ ایک ایسے معاد پر ایمان رکھنے کا نتیجہ ہے جو تربیت اور نشوونما کا باعث ہے جو ہر جگہ انسان کے سامنے اس بڑی عدالت کے دربار کی تصویر کشی کرتا ہے اور یہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور حق و عدالت کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں "ظن" گمان کے معنی میں ہو اور درحقیقت ایک قسم کا مبالغہ اور تاکید ہو کہ اگر بالفرض انسان اس عدالتِ عظمٰی پر ایمان نہیں رکھتا اور صرف اُس کے ہونے کا گمان رکھتا ہے تو بھی اس کے لئے کافی ہے کہ ہر قسم کی غلط کاری سے پرہیز کرے۔ درحقیقت یہ علماء یہود کو ایک قسم کی سرزنش ہے کہ اگر تمہارا ایمان صرف ظن و گمان کے درجے تک بھی ہو پھر بھی تمہیں ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس قسم کی تحریف سے دست کش ہو جانا چاہیئے۔

چند اہم نکات

(ا) لقاء اللہ سے کیا مراد ہے: لقاء اللہ کی تعبیر قرآن میں متعدد بار آئی ہے اور ہر بار اس سے مراد صحن قیامت کی حاضری ہے یہ تو واضح ہے کہ خدا سے ملاقات اس طرح سے حسی تو نہیں جیسے افرادِ بشر ایک دوسرے سے ملتے ہیں کیونکہ خدا

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۵۔

[2] راغب نے مفردات میں کہا ہے: "ظن" نام ہے اس اعتقاد کا جو دلیل اور قرینے سے حاصل ہو یہ اعتقاد کبھی قوی ہوتا ہے اور درجہ یقین تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کمزور ہوتا ہے جو گمان کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

جسم ہے نہ رنگ و مکان رکھتا ہے کہ ظاہری آنکھ سے اسے دیکھا جا سکے بلکہ مقصود میدانِ قیامت میں آثار قدرت، جزا و سزا، نجات اور عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے یا اس کا معنیٰ ایک قسم کا شہود باطنی و قلبی ہے کیونکہ انسان بعض اوقات ایسے مقام مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ خدا کو دل کی آنکھ سے اپنے سامنے دیکھتا ہے اس طرح کہ کوئی شک اور تردد باقی نہیں رہتا[1]۔

پاکیزگی، تقویٰ، عبادت اور تہذیب نفس کے نتیجے میں یہ حالت اس دنیا میں بھی بعض لوگوں کے لئے ممکن ہے جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہے کہ ذعلب یمانی نے جو حضرت علیؑ کے دوستوں میں سے ایک دانشمند تھے آپؑ سے پوچھا:

هل رئیت ربك

کیا آپؑ نے اپنے خدا کو دیکھا ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

افأعبد مالا اریٰ

کیا میں اس کی عبادت کروں گا جسے میں نے دیکھا ہی نہیں۔

اس نے وضاحت چاہی تو امامؑ نے مزید فرمایا:

لاتدركه العیون بمشاهدة العیان ولكن تدركه القلوب بحقائق الایمان۔

ظاہری آنکھیں تو اسے دیکھ نہیں سکتیں البتہ دل نورِ ایمان کے وسیلے سے اس کا ادراک کر سکتے ہیں[2]

باطنی شہود کی طاقت قیامت کے دن سب کو میسر ہو گی کیونکہ خدا کی عظمت و قدرت کے آثار اور نشانیاں اس وقت اس قدر عیاں ہوں گی کہ دل کا اندھا بھی اس پر قطعی ایمان لے آئے گا۔

(۲) مشکلات میں کامیابی کا راستہ: ترقی کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے دو بنیادی ارکان کی ضرورت ہے ایک طاقت ور اور مضبوط اندرونی قلعہ اور دوسرا بیرونی محکم سہارا، مندرجہ بالا آیات میں ان دونوں اساسی ارکان کو صبر اور صلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صبر، استقامت اور بردباری کے ساتھ مشکلات کے محاذ پر ڈٹ جانے کا نام ہے اور نماز خدا سے رابطے اور تعلق کا وسیلہ ہے جو ایک محکم اور مضبوط سہارا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اگرچہ صبر سے روزہ مراد لیا ہے لیکن مسلم ہے کہ صبر روزے ہی میں منحصر نہیں بلکہ یہاں روزے کا ذکر

---

[1] المنار، جلد ۱، صفحہ ۳۰۲ - المیزان جلد ۱، صفحہ ۱۵۲ - روح المعانی، جلد ۱، صفحہ ۲۴۸
دوسری آیات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے مثلاً
فمن کان یرجوا لقاء ربه فلیعمل عملاً صالحًا۔ (کہف - ۱۱۰)

[2] البلاغہ، خطبہ ۱۷۹

ایک واضح اور روشن مصداق کی حیثیت سے ہے کیونکہ یہ وہ عبادت ہے جس کے نتیجے میں انسان کے اندر قوی ارادہ اور یکجہتیاں پیدا ہوتا ہے اور ہوسرانیوں پر اس کی عقل کی حاکمیت مسلم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس آیت کے ذیل میں نقل کرتے ہیں کہ رسول اسلامؐ جب کسی ایسی مشکل سے دوچار ہوتے جو آپؐ کو بے آرام کردے تو آپؐ نماز سے مدد لیتے۔

امام صادقؑ سے ایک روایت میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب دنیا کے غموں میں سے کسی کا سامنا کرو تو وضو کرو اور مسجد میں جاکر نماز پڑھو اور پھر دعا کرو کیونکہ خدا نے خود ہی حکم دیا ہے: واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ[1]

نماز کی طرف توجہ اور پروردگار سے راز و نیاز انسان میں نئی قوت پیدا کر دیتا ہے۔

کتاب کافی میں امام صادقؑ سے روایت ہے:

کان علی اذا ھالہ امر فزع قام الی الصلوٰۃ ثم تلا ھذہ الآیہ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔

جب حضرت علیؑ کو کوئی سخت مشکل در پیش ہوتی تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرماتے: واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔

واقعاً نماز انسان کو قدرتِ لایزال سے مربوط کر دیتی ہے جس کے ہاں تمام مشکلات سہل و آسان ہیں اور یہی احساس باعث بنتا ہے کہ انسان حوادث کے مقابلے میں طاقتور اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

۴۷۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ○

۴۸۔ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ○

ترجمہ

۴۷۔ اے بنی اسرائیل! جن نعمتوں سے میں نے تمہیں نوازا ہے انہیں یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت بخشی ہے۔

۴۸۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص دوسرے کی جگہ جواب دہ نہ ہوگا، نہ سفارش قبول کی جائے گی، نہ ہی تاوان و بدلہ قبول ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جا سکے گی۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

یہودیوں کے باطل خیالات

ان آیات میں خدا نے دوبارہ رُوئے سخن بنی اسرائیل کی طرف کیا ہے۔ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے: اے بنی اسرائیل! جو نعمتیں میں نے تمہیں عطا کی ہیں ان کے بارے میں سوچو (یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم)۔

ان نعمتوں کا دامن بڑا وسیع ہے۔ ہدایت و ایمان سے لے کر فرعونیوں کے چنگل سے رہائی اور عظمت و استقلال کے دوبارہ حصول تک سب نعمتیں اس میں شامل ہیں۔

پھر یہ نعمت بھی کہ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل کی جو دراصل مختلف نعمتوں کا مرکب ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: میں نے تمہیں جہانوں پر فضیلت عطا کی (وانی فضلتکم علی العٰلمین)۔

شاید بعض لوگوں کا احتمال ہو کہ 'فضلتکم علی العٰلمین' کا مقصود یہ ہے کہ انہیں تمام جہانوں اور تمام ادوار میں برتری اور فضیلت دی گئی ہے لیکن قرآن کی دیگر آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ان کی سرزمین اور ان کے زمانے کے لوگوں پر فضیلت و برتری مراد ہے کیونکہ قرآن میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے پیدا کیے گئے ہو۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)

اس آیت کے مطابق پیامبر اسلامؐ کی امت بہترین اور افضل ترین ہے۔ ایک اور جگہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا

بنی اسرائیل جو کمزور سمجھے جاتے تھے انہیں ہم نے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا (اعراف۔ ۱۳۷)۔

واضح ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل پوری دنیا کے وارث نہ تھے لہٰذا مقصود یہ ہے کہ اپنے علاقے میں مشرق و مغرب کے وارث ہوئے لہٰذا عالمین پر ان کی فضیلت بھی اسی علاقے کے افراد کی مناسبت سے ہے۔

اگلی آیت میں قرآن نے یہودیوں کے باطل خیالات پر خط بطلان کھینچا ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد چونکہ پیغمبر تھے لہٰذا وہ ہماری شفاعت کریں گے یا یہ گمان کرتے تھے کہ گناہوں کا معاوضہ ادا کریں گے جیسے اس دنیا کا طریقہ ہے۔ قرآن کہتا ہے اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص دوسرے کی جگہ جزا نہیں پائے گا (واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا) اور نہ ہی اذن پروردگار کے بغیر کوئی سفارش و شفاعت قبول ہوگی (ولا یقبل منها شفاعة) نہ ہی تاوان و بدل قبول ہوگا (ولا یؤخذ منها عدل) اور نہ ہی کوئی شخص ان کی مدد کے لئے کھڑا ہوگا (ولا هم ینصرون)۔

خلاصہ یہ کہ اس عدالت کا قاضی و حاکم وہ ہوگا جو پاک عمل کے سوا کچھ قبول نہیں کرے گا۔ جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۸۸ اور ۸۹ میں ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

وہ دن جب نہ مال کام آئے گا نہ اولاد ہاں مگر وہ لوگ جو قلب سلیم لے کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوں گے۔

درحقیقت زیر بحث آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس دنیا میں اس طرح معمول ہے کہ مجرم سزا سے نجات پانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی ایک شخص دوسرے کا جرمانہ اپنے ذمے لے لیتا ہے اور اسے ادا کر دیتا ہے کبھی سفارش کو وسیلہ بنایا جاتا ہے اور ایسے اشخاص کو تیار کیا جاتا ہے جو اس کے گناہ کے سلسلے میں سفارش کریں اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو مجرم کوشش کرتا ہے کہ تاوان ادا کر کے اپنے آپ کو سزا سے بچالے کچھ بھی نہ ہو سکے تو دوستوں کی مدد سے دفاع کے لئے تیار ہو جاتا ہے تاکہ سزا کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

دنیا میں سزا سے بچنے کے لئے یہ مختلف طریقے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ عالم قیامت میں سزاؤں کے اصول دنیا سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی وہاں کارآمد نہیں ہوگی۔

راہِ نجات صرف یہ ہے کہ انسان ایمان و تقویٰ کے سائے میں پناہ لے اور پھر لطف پروردگار ہے۔

بت پرستوں اور اہل کتاب میں سے بگڑے لوگوں کے عقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خرافاتی عقائد ان کے درمیان کم نہیں تھے۔ مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف نقل کرتے ہیں:

مصر کے بعض علاقوں کے فضول لوگ میت کو غسل دینے والے کو کچھ رقم دیتے تھے اور اسے بہشت میں نقل و انتقال کی اجرت کہتے تھے[1]

یہودیوں کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے قربانی کرتے تھے اور اگر قربانی میسر نہ ہوتی تو کبوتروں کے ایک جوڑے کی قربانی کر دیتے تھے[2]

گذشتہ قوموں (احتمالاً ماقبلِ تاریخ کی) کے حالات میں ہے کہ وہ زیور، آلات اور میت کا اسلحہ اس کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں ان سے فائدہ اٹھا سکے[3]

قرآن اور مسئلہ شفاعت

اس میں شک نہیں کہ خدائی سزائیں اس جہان میں ہوں یا قیامت میں، ان میں انتقام کا پہلو نہیں ہے۔ وہ سب درحقیقت قوانین کے اجراء اور اطاعت کی ضمانت ہیں اور نتیجے کے طور پر تمام پہلوؤں میں ترقی اور تکامل ہے۔ لہٰذا جو چیز اس ضامن کو کمزور کرے اس سے احتراز و اجتناب ضروری ہے تاکہ لوگوں میں گناہ کی جرأت پیدا نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف واپس لوٹنے اور اصلاح کرنے کے راستے، گناہگاروں کے لئے کلی طور پر بند نہیں ہونے چاہئیں۔ شفاعت صحیح معنی کے لحاظ سے تعمیر اور اصلاح کے لئے ہے اور گناہگاروں اور ناپاکیوں سے آلودہ افراد کی واپسی کا وسیلہ ہے لیکن غلط مفہوم کے اعتبار سے گناہ کا شوق پیدا

---

[1] و [2] المنار، ج ۱، ص ۳۰۷

[3] المیزان، ج ۱، ص ۱۵۶

رنے اور جرأت دلانے کا سبب بنتی ہے۔

جو لوگ شفاعت کے مختلف پہلوؤں اور اس کے صحیح مفاہیم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھ سکے وہ بعض اوقات مسئلہ شفاعت کے سرے سے منکر ہو گئے ہیں اور شفاعت کو سلاطین اور ظالم حکام کے سامنے ایک دوسرے کی سفارش اور پارٹی بازی کے برابر سمجھتے ہیں اور بعض اوقات وہابیوں کی طرح مندرجہ بالا آیت کے الفاظ "لا یقبل منھا شفاعة" سے مراد یہ لیتے ہیں کہ قیامت میں کسی کی سفارش قابل قبول نہ ہو گی۔ دوسری آیات کی طرف توجہ کیے بغیر اسے دستاویز قرار دے کر شفاعت کا مکمل انکار کر دیتے ہیں۔

مخالفین شفاعت کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) شفاعت کا عقیدہ کوشش اور جستجو کی روح کو کمزور کر دیتا ہے۔

(۲) شفاعت کا عقیدہ پسماندہ اور طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔

(۳) شفاعت کا عقیدہ ایک قسم کا شرک ہے اور چند اشخاص کی پرستش کے مترادف ہے۔

(۴) شفاعت کا عقیدہ گناہ کا شوق دلاتا ہے اور ذمہ داریوں سے غفلت کا سبب بنتا ہے۔

(۵) شفاعت کے عقیدے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے احکام بدل جائیں اور خدا کا ارادہ و فرمان متغیر ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ ہم بتائیں گے کہ یہ اعتراضات اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ شفاعت کے قرآنی مفہوم کو عوام میں رائج بگڑی سفارشوں کی طرح سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ منفی اور مثبت جہات کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مفہوم شفاعت، فلسفۂ شفاعت، عالم تکوین میں شفاعت، قرآن و حدیث میں شفاعت اور شفاعت اور توحید و شرک کے متعلق بحث کی جائے تاکہ ہر قسم کا ابہام جو مندرجہ بالا اور دیگر آیات میں اس سلسلے میں دکھائی دیتا ہے دور ہو سکے۔

(۱) شفاعت کا حقیقی مفہوم: لفظ شفاعت "شفع" سے ہے جس کے معنی ہیں جفت اور "ضم الشئی الی مثلہ" ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز سے ملحق کرنا۔ اس کے مقابل ہے "وتر" جس کے معنی ہیں تک اور تنہا ہیں کسی برتر و قوی فرد کے ضعیف فرد کے ساتھ مدد کی خاطر مل جانے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ عرف اور شرع میں دو مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

الف۔ عرف عام میں شفاعت کا مفہوم یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا اپنے مقام، شخصیت اور اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ماتحت لوگوں کی سزا کے بارے میں صاحب قدرت شخص کا نظریہ بدل دے اسی طرح اپنے اثر و رسوخ سے کام لینا جب کہ اس کا لحاظ رکھا جاتا ہو یا جب لوگ اس سے خوف زدہ ہوں یا پھر کسی پر نوازشات کے ذریعے سے اثر ڈالنا یا کبھی مجرم کے گناہ اور استحقاق سزا سے متعلق فکری بنیادوں کو بدل دینا وغیرہ خلاصہ یہ کہ اس شفاعت سے مجرم یا ملزم کی روح یا فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سب اثرات اور تبدیلیوں کا تعلق اس شخص سے ہوتا ہے جس کے پاس شفاعت و سفارش کی جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

مذہبی نقطہ نظر سے ایسی شفاعت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ خدا کو تو اشتباہ نہیں ہوتا کہ اُس کے نظریے کو بدلا جاسکے نہ ہی وہ انسان جیسے میلانات رکھتا ہے کہ انہیں اُبھارا جاسکے نہ کسی کے اثر و رسوخ سے وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی سزا اور عذاب عدالت کے علاوہ کسی محور پر گردش کرتی ہے۔

ب۔ شفاعت کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو مذہبی منابع اور مصادر میں موجود ہے جس کا مقصد اس شخص میں تبدیلی پیدا کرنا ہے جس کی سفارش کی جارہی ہے۔ یعنی جس شخص کی شفاعت ہو رہی ہے اس نے ایسے اسباب فراہم کئے ہیں کہ وہ اس ناپسندیدہ کیفیت سے باہر نکل آیا ہے جس کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق تھا اور شفیع سے ربط کی وجہ سے اپنے آپ کو پسندیدہ کیفیت میں ڈھال چکا ہے جس کی وجہ سے وہ اس لائق اور مستحق ہوگیا ہے کہ اسے بخش دیا جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ ایسی شفاعت پر ایمان رکھنا ایک بلند مکتبِ تربیت ہے گنہگار اور آلودہ افراد کی اصلاح، بیداری اور آگاہی کا وسیلہ ہے۔

ہم دیکھیں گے کہ تمام اعتراضات، نکتہ چینیاں اور حملے شفاعت کی پہلی تفسیر پر ہوتے ہیں دوسری پر نہیں جو کہ ایک منطقی، معقول اور تربیت کرنے والا مفہوم ہے۔

شفاعت کی دو شکلوں کی یہ اجمالی تفسیر تھی جن میں سے ایک گناہ پر پردہ ڈالنا اور دوسری انسان کی اصلاح و تربیت کرنا ہے۔

(۱۱) عالم تکوین میں شفاعت: جو کچھ ہم نے صحیح اور منطقی شفاعت کے بارے میں کہا ہے اس کا مشاہدہ عالم تشریع کے علاوہ تکوین و خلقت کی دنیا میں بہت کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کی طاقت ور قوتیں ضعیف قوتوں سے مل جاتی ہیں اور انہیں اصلاحی اغراض کے راستوں پر آگے لے چلتی ہیں۔ سورج چمکتا ہے، بارش برستی ہے، بیج زمین کے دل میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی اندرونی استعداد کو بروئے کار لائے اور پہلی زندگی کی کونپلوں کو زمین سے باہر بھیجے، اس طرح کہ دانے کے چھلکے کا زندان چاک کیا جائے، ظلمت کدۂ خاک سے سر باہر نکالا جائے اور آسمان کی طرف آگے بڑھا جائے جس سے اس نے قوت حاصل کی تھی۔

زندگی کی اٹھان میں یہ سب بہاریں درحقیقت، شفاعت تکوینی کی ایک قسم ہیں اگر اس قسم کی شفاعت کے مشاہدے سے ہم عالم تشریع میں بھی اس کے قائل ہو جائیں تو ہم نے راہِ مستقیم اختیار کی ہے جس کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے۔

(۱۱۱) مدارک شفاعت: اب ہم مسئلہ شفاعت کے اصلی مدارک اور اولین دلائل کا ذکر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں مسئلہ شفاعت کے بارے میں اس عنوان سے تقریباً تیس مقامات پر گفتگو ہوئی ہے البتہ اس عنوان کے بغیر بھی اس کی بحثیں اور اس طرف اشارات موجود ہیں۔

وہ آیات جو قرآن میں اس مسئلے کے بارے میں ہیں چند شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

و۔ وہ آیات جو بطور مطلق شفاعت کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً

أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۔

اور

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

ان آیات میں مجرمین کے لئے ایمان و عمل صالح کے بغیر راہ نجات کی نفی کی گئی ہے وہ چاہے مادی عوض سے ہو یا تعلق کی بنیاد پر سابقہ دوستی کی وجہ سے ہو یا مسئلہ شفاعت کے حوالے سے بلکہ بعض مجرمین کے بارے میں تو ہے کہ:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ ۝

شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ (مدثر۔ ۴۸)

ب۔ وہ آیات جو شفیع کو صرف خدا میں منحصر قرار دیتی ہیں۔ مثلاً

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۝

اُس (خدا) کے سوا تمہارا کوئی ولی اور شفیع نہیں ہے۔ (سجدہ۔ ۴)

اور

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۝

کہئے کہ تمام شفاعتیں اللہ کے لئے مخصوص ہیں۔ (زمر۔ ۴۴)

ج۔ وہ آیات جو شفاعت کو اذن و فرمان خدا کے ساتھ مشروط قرار دیتی ہیں۔ مثلاً

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۝

کون ہے جو خدا کے حضور اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔ (البقرہ۔ ۲۵۵)

اور

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۝

اس کی بارگاہ میں کسی کو شفاعت سے فائدہ نہیں پہنچے گا مگر اسے جس کے لئے اجازت دی جائے گی۔ (سبا۔ ۲۳)

د۔ وہ آیات ہیں جن میں اس شخص کے لئے شرائط بیان کی گئی ہیں جس کی شفاعت کی جاتا ہے۔ بعض اوقات رضا و خوشنودی خدا کو شرط قرار دیا گیا ہے:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ۔ (انبیاء۔ ۲۸)

اس آیت کے مطابق شفاعت کرنے والے صرف ان کی شفاعت کر سکتے ہیں جو مقام ارتضٰی کے حامل ہوں۔ یعنی درگاہ خداوندی میں قبولیت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہوں۔

کبھی خدا کے ہاں عہد و پیمان کو شرط قرار دیا گیا ہے (یعنی توحید پر ایمان اور انبیاء کو صحیح طور پر پہچاننا)۔ مثلاً

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (مریم۔ ۸۷)

بعض اوقات شفاعت کے حصول کی صلاحیت کو بعض مجرمین سے سلب کر لینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً ذیل کی

آیت میں ظالمین سے شفاعت سلب کئے جانے کا اعلان ہے:

مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ؕ (مومن - ۱۸)

اس لحاظ سے عہد و پیمان الٰہی کا حامل ہونا یعنی ایمان اور مقام خوشنودیٔ خدا تک پہنچنا، اس کے نزدیک قابل قبول ہونا اور گناہوں مثلاً ظلم و ستم سے بچنا یہ شفاعت کی حتمی شرائط ہیں۔

(۱۷) شرائط شفاعت: خلاصہ یہ ہے کہ آیات شفاعت وضاحت سے نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام کی نظر میں مسئلہ شفاعت کوئی بے ضابطہ اور بلا شرط موضوع نہیں ہے بلکہ اسکی قیود و شرائط ہیں ایک طرف اس جرم کے لحاظ سے ہیں جس کے بارے میں شفاعت ہوتی ہے اور دوسری طرف اس شخص کے بارے میں ہیں جس کی شفاعت کی جاتی ہے۔ تیسری طرف اس شخص کے بارے میں شرائط ہیں جس نے شفاعت کرنی ہے یہ سب چیزیں مل کر شفاعت کے اصلی رخ اور اس کے فلسفے کو واضح کرتی ہیں۔

مثلاً ظلم و ستم جیسے گناہ شفاعت کے دائرے سے بالکل خارج کر دیئے گئے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ظالموں کے لئے کوئی شفیع مطاع نہیں ہے۔ اب اگر ظلم کی اس کے وسیع معنی کے لحاظ سے تفسیر کی جائے تو پھر شفاعت صرف ان مجرمین کے لئے منحصر ہوگی جو اپنے جرم پر نادم و پشیمان ہوں اور اس کے ازالے اور اصلاح کی راہ پر گامزن ہوں جیسا کہ بعد میں بعض احادیث کے حوالے سے بیان ہوگا۔ اس صورت میں شفاعت توبہ اور گناہ پر ندامت کے عمل میں ایک مددگار کا کردار ادا کرے گی (اور یہ جو بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ ندامت اور توبہ کے ہوتے ہوئے شفاعت کی ضرورت نہیں یہ ان کا اشتباہ ہے جس کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے)۔

ایک طرف سورہ انبیاء آیہ ۲۸ کے مطابق صرف وہ لوگ شفاعت کے ذریعے بخشے جائیں گے جو مقام ارتضیٰ تک پہنچے ہوں گے اور دوسری طرف سورہ مریم آیہ ۸۷ کے مطابق جو عہد الٰہی کے حامل ہوں گے۔

یہ دو عناوین جیسا کہ ان کے لغوی مفہوم سے اجمالاً اور اس سلسلے کی روایات سے تفصیلاً ظاہر ہوتا ہے یہ معنی رکھتے ہیں، کہ انسان کا خدا، حساب و میزان اور سزا و عذاب پر ایمان ہو، نیک اعمال کو اچھا اور برے اعمال کو برا سمجھتا ہو اور تمام کے درست یعنی منزل من اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہو اگر ایسا ایمان انسان کی فکر و نظر اور زندگی سے ظاہر ہوتا ہو جس کی نشانی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ان ظالمین اور سرکش لوگوں سے ممتاز کرے جو اسلام کی کسی مقدس اصل پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے پروگراموں پر تجدید نظر کرے تو پھر وہ شفاعت کا اہل ہوتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۶۴ میں شفاعت کے زیر سایہ گناہوں کی بخشش کے بارے میں یوں ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ○

اور اگر وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بارگاہ الٰہی میں توبہ و استغفار کرتے اور پیغمبر اکرم بھی ان کے لئے عفو و درگذر کی سفارش کرتا تو وہ دیکھتے کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت میں خود مجرمین کی توبہ و استغفار کو پیغمبر کی طرف سے مغفرت کی سفارش کا مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔

سورہ یوسف کی آیت ۹۷ اور ۹۸ میں ہے:

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِــٕيْنَ ○ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

انہوں نے اپنے باپ کی خدمت میں عرض کی کہ اللہ کے حضور ہماری مغفرت کی دعا کریں اور ہم اپنے خطا کار ہونے کے معترف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں جلد ہی اپنے پروردگار سے تمہاری مغفرت طلب کروں گا بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ برادرانِ یوسف نے باپ سے سفارش کے تقاضے سے قبل گناہ پر ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا۔

سورہ مومن، آیہ ۷، فرشتوں کی شفاعت کے بارے میں ہے کہ ان کی استغفار اور شفاعت صرف باایمان، راہِ خدا کے پیروکار اور حق کی اتباع کرنے والے لوگوں کے لئے ہے:

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○

اب پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ توبہ کرنے، سبیل الٰہی کی اتباع کرنے اور اس راہ پر قدم رکھنے کے باوجود شفاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب ہم حقیقتِ شفاعت کی بحث میں دیں گے۔

شفاعت کرنے والوں کے لئے بھی اس شرط کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حق کے گواہ ہونے چاہئیں:

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (زخرف - ۸۶)

اس لحاظ سے ضروری ہے کہ جن کی شفاعت ہونا ہے وہ شفاعت کرنے والے سے ربط اور تعلق برقرار رکھیں اور وہ ربط ہے قول و فعل سے حق کی طرف متوجہ ہونا جو خود اصلاً اور راہِ حق میں تمام صلاحیتیں صرف کرنے کے لئے ایک عامل ہے۔

(۷) احادیثِ اسلامی اور شفاعت: روایاتِ اسلامی میں شفاعت کے سلسلے میں بہت سے تعبیرات موجود ہیں جو مندرجہ بالا آیات قرآنی کے مفہوم کی تکمیل کرتی ہیں اور بعض اوقات بہت صریح ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ تفسیر برہان میں امام کاظمؑ کے واسطے سے حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرمؐ سے سنا:

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی

میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے ہے۔

ابن عمیر جو راوی حدیث ہے کہتا ہے:

میں نے امام کاظمؑ سے پوچھا کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کی شفاعت کیسے ممکن ہے حالانکہ خداوند عالم فرماتا ہے "ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ" مسلم ہے کہ جو شخص کبائر کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ

ارتقٰی اور خوشنودیٔ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

جو با ایمان شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ طبعاً پشیمان ہوتا ہے اور نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ گناہ سے پشیمانی توبہ ہے اور جو شخص پشیمان نہ ہو وہ حقیقی مومن نہیں ہے اور اس کے لئے شفاعت بھی نہیں ہے اور ایک گناہ ایک ظلم ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے، ظالموں کے لئے دوست اور شفاعت کرنے والے نہیں ہیں۔[1]

صدر حدیث کا مضمون یہ ہے کہ شفاعت کبائر کے مرتکب لوگوں کے لئے ہے لیکن حدیث کا ذیل یہ واضح کرتا ہے کہ شفاعت کے قبول ہونے کی اصلی شرط یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس میں ایسا ایمان ہو جو مجرم کو ندامت، خود سازی، ازالۂ گناہ اور اصلاح کے مرحلے تک پہنچا دے اور ظلم، طغیان اور قانون شکنی سے اپنے آپ کو نکال لے اور اس کے بغیر شفاعت ممکن ہی نہیں ہے (غور کیجیے گا)۔

ب۔ کتاب کافی میں امام صادقؑ سے اس خط میں جو آپ نے متعدد امور کی صورت میں اپنے اصحاب کو لکھا تھا منقول ہے:

من سرہ ان ینفعہ شفاعۃ الشافعین عند اللہ فلیطلب الی اللہ ان یرضی عنہ[2]

اس روایت کا لب و لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اشتباہات کے ازالے کے لئے ہے جو شفاعت کے سلسلے میں حضرت صادقؑ کے بعض اصحاب کو خصوصاً اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو عموماً ہو گئے تھے۔ اس میں صراحت کے ساتھ گناہ کا شوق دلانے والی شفاعتوں کی نفی کی گئی ہے۔ روایت کے مطابق "جو شخص پسند کرتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو اسے چاہیئے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرے"۔

ج۔ ایک اور پر معنی حدیث حضرت صادقؑ سے یوں مروی ہے:

اذا کان یوم القیامۃ بعث اللہ العالم والعابد فاذا وقفا بین یدی اللہ عزوجل قیل للعابد انطلق الی الجنۃ وقیل للعالم قف تشفع للناس بحسن تادیبک لھم۔[3]

قیامت کے دن خدا تعالیٰ عالم اور عابد کو قبر سے اٹھائے گا۔ عابد سے کہے گا اکیلے بہشت میں چلے جاؤ لیکن عالم سے کہے گا جن لوگوں کی اچھی تربیت کی ہے ان کی شفاعت کرو۔

اس حدیث میں عالم نے جو ادب و اخلاق کی تعلیم دی ہے اور اس کے شاگرد جنہوں نے اس سے سبق حاصل کیا ہے کی

---

[1] تفسیر برہان، ج ۱، ص ۵۳

[2] نقل از بحار، ج ۳، ص ۳۰۴ (قدیم اشاعت)

[3] بحار، ج ۲، ص ۳۰۵ بحوالہ اختصاص مفید

شفاعت کے درمیان ایک ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ اس سے اس بحث کے تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

علاوہ ازیں شفاعت کا عالم سے مخصوص ہونا اور عابد سے اس کی نفی اس بات کی نشاندہی ہے کہ منطق اسلام کی رُو سے شفاعت کسی عہد و پیمان اور پارٹی بازی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکتب تربیت ہے اور اس جہان میں تربیت کی تصویر کشی ہے۔

(۷) **شفاعت کی معنوی تاثیر:** اس مقام پر شفاعت سے متعلق جو روایات ہم نے بیان کی ہیں وہ اس سلسلے کی روایات کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے جنہیں ہم نے اپنی بحث کی مناسبت سے انتخاب کیا ہے ورنہ شفاعت سے متعلق روایات تو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

نووی شافعی[۱] شرح صحیح مسلم میں قاضی عیاض جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ شفاعت متواترات میں سے ہے[۲]

یہاں تک کہ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) اور محمد بن عبدالوہاب (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے پیرو جو اس سلسلے میں سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور بہت متعصب ہیں ان روایات کے تواتر کے معترف ہیں۔

کتاب "فتح المجید" شیخ عبدالرحمن بن حسن کی تالیف ہے وہابیوں کی ایک مشہور کتاب ہے اور اب بھی حجاز کے بہت سے دینی مدارس میں درسی کتب کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس میں ابن قیم سے اس طرح منقول ہے:

> شفاعت مجرمین کے بارے میں نبی اکرمؐ سے احادیث متواتر ہیں۔ آپ کے اصحاب اور اہل سنت کا عموماً اس پر اجماع ہے ... اس کے منکر کو بدعتی سمجھتے ہیں اس پر تنقید کرتے ہیں اور اسے گمراہ شمار کرتے ہیں[۳]

اس سے قبل کہ اب ہم شفاعت کے اجتماعی اور روحانی اثرات پر بحث کریں اور چار بڑے اعتراضات کو فلسفۂ شفاعت کی روشنی میں حل کریں خدا پرستوں اور معتقدین شفاعت کی منطق کی نظر سے اس کے معنوی آثار دیکھتے ہیں کیونکہ یہ نظر اس مسئلے کے اجتماعی اور معنوی عکس العمل کے سلسلے میں آئندہ آنے والی بحث کو زیادہ واضح کر دیتی ہے[۴]

عقائد اسلامی کے علماء کے درمیان شفاعت کی تاثیر معنوی کے سلسلے میں بحث کچھ یوں ہے:

ایک گروہ "وعیدیہ" کے نام سے مشہور ہے (جن کا عقیدہ ہے کہ گناہان کبیرہ کے مرتکب افراد ہمیشہ جہنم میں رہیں گے)۔ ان کا اعتقاد ہے کہ گناہ کے آثار کو کم کرنے میں شفاعت اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کی تاثیر پیش رفت، تکامل معنوی اور جزا و ثواب کی زیادتی ہے۔

---

۱ ان کا نام یحییٰ بن شرف ہے۔ سات سو ہجری کے علماء میں سے ہیں چونکہ نویٰ شہر جو دمشق کے پاس ہے میں پیدا ہوئے اس لئے نووی مشہور ہوئے۔

۲ بحار، ج ۳، ص ۳۰۷

۳ فتح المجید ص ۲۱۱

۴ توجہ رہے کہ یہاں پر ہم خاص طور پر علماء عقائد کی منطق سے بحث کر رہے ہیں۔

تفضیلیہ (جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والے لوگ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے) معتقد ہیں کہ شفاعت گناہگاروں کے لئے ہے اور اس کے نتیجے میں سزا اور عذاب ختم ہو جاتا ہے۔

نہایت مشہور محقق نصیر الدین طوسی کتاب تجرید الاعتقادات میں دونوں کو برحق سمجھتے ہیں اور وہ دونوں آثار کے معتقد ہیں۔

علامہ حلی بھی محقق طوسی کی عبارت کی شرح میں کتاب کشف المراد میں اس عقیدے کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے شواہد پیش کرتے ہیں۔

شفاعت کے معنی اصل لغت کے اعتبار سے بیان کئے گئے ہیں اور اسی طرح شفاعت تکوینی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب کسی تردید و شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ محقق طوسی کا عقیدہ حقیقت و واقعیت سے نزدیک ہے۔

کیونکہ ایک طرف ـــ امام صادقؑ سے منقول مشہور روایت ہے:

ما من احد من الاولین والاخرین الا هو محتاج الی شفاعة محمد یوم القیامة[1]

اولین و آخرین میں کوئی بھی نہیں جو آنحضرتؐ کی شفاعت کا محتاج نہ ہو۔

اس حدیث کی رُو سے تو وہ اشخاص بھی جو گناہ سے توبہ کر چکے ہیں اور ان کا جرم بخشا گیا ہے۔ شفاعت کے محتاج ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب شفاعت کی تاثیر ہر دو پہلوؤں کے لئے ہو اور مقام و مرتبے کی بلندی کے لئے بھی کارآمد ہو۔ لہٰذا اگر بعض روایات میں ہے کہ نیک لوگوں کو شفاعت کی ضرورت نہیں تو اس سے مقصود ویسی شفاعت کی نفی ہے جو مجرمین اور گناہ گاروں کے لئے ہے۔

دوسری طرف ـــ ہم کہہ چکے ہیں کہ شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ قوی تر موجود ضعیف تر موجود کی مدد کے لئے اس سے مربوط و منضم ہو جائے۔ ممکن ہے یہ مدد نقاطِ قوت کی زیادتی یا نقاطِ ضعف کی کمی کے لئے ہو۔

جیسا کہ شفاعتِ تکوینی اور وہ موجودات جو سیر تکامل و پرورش میں ہیں ان میں یہ دو جنبے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض اوقات پست تر موجودات کو قوی تر موجودات کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ عوامل تخریب کو دور کریں۔ (جیسے گھاس کو آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کی آفات و بیماریاں دور کرے) اور کبھی ان کی ضرورت قوت کی زیادتی اور پیش رفت کے لئے ہوتی ہے (جیسے گھاس کو رشد و نمو کے لئے بھی سورج کی روشنی مددگار ہوتی ہے) اسی طرح درس پڑھنے والا شاگرد اپنے اشتباہات کی اصلاح کے لئے بھی استاد کی احتیاج رکھتا ہے اور اپنی معلومات بڑھانے کے لئے بھی۔ لہٰذا مختلف دلائل کے پیش نظر شفاعت دونوں قسم کے آثار رکھتی ہے اور صرف گناہ و جرم کے آثار کم کرنے میں منحصر نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے والوں کو شفاعت کی ضرورت کیوں ہے جب کہ مسلم مذہبی عقائد کے مطابق گناہ سے ندامت اور توبہ تنہا گناہ کی بخشش کا موجب ہے۔

اس موضوع کی دو دلیلیں ہیں:

---

[1] بحار اور دیگر کتب۔

۱۔ توبہ کرنے والے بھی معنوی مقامات کی بلندی، پرورش، تکامل اور ارتقاء کے لئے شفاعت کے محتاج ہیں۔

۲۔ بہت سے علماء کو ایک بہت بڑا اشتباہ تاثیر توبہ کے مسئلے میں پیش آتا ہے جو ایسے اشکالات کا سبب بنتا ہے وہ یہ کہ ان کا تصور یہ ہے کہ توبہ، ندامت اور گناہ سے پشیمانی، انسان کو گناہ سے قبل والی حالت کی طرف پلٹا دیتی ہے حالانکہ ہم اپنے مقام پر کہہ چکے ہیں کہ کئے ہوئے گناہ پر ندامت اور آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا عزم صمیم، توبہ کا صرف پہلا مرحلہ ہے اور وہ بالکل اس دوا کی طرح ہے جو بیماری ختم کردیتی ہے۔ واضح ہے کہ بخار دور ہو جانے اور بیماری کے جرثومے ختم ہو جانے سے اگرچہ بیمار اچھا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ایک عام آدمی کی حالت میں ہرگز نہیں آتا بلکہ اسے اپنے جسم کو پھر سے توانا بنانے کے لئے ایک مدت تک کوشش درکار ہے۔ پھر کہیں وہ بیماری سے پہلے والی حالت پر پہنچ پائے گا۔

بہ الفاظ دیگر توبہ کے مسئلے میں گناہ پر نادم ہونا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا یہ تو صرف پہلا مرحلہ ہے۔ اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ توبہ کرنے والا ہر لحاظ سے گناہ سے پہلے کی روحانی حالت میں لوٹ آئے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور ان سے ربط و تعلق اثر بخش ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے زندہ شاہد استغفار سے متعلق وہی آیات ہیں جن کی ہم پہلے ہی نشاندہی کر چکے ہیں کہ مجرم کی توبہ کے علاوہ پیامبرؐ کی استغفار بھی قبولیت توبہ کی شرط قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح برادران یوسفؑ کی توبہ کے ضمن میں حضرت یعقوبؑ کا ان کے لئے استغفار کرنا۔ سب سے واضح تو ملائکہ کا ان لوگوں کے لئے استغفار کرنا ہے جو صالح اور مصلح ہیں اور توبہ کرنے میں جن کے متعلق آیات پیش کی جا چکی ہیں۔

(۷) فلسفۂ شفاعت: مدارک شفاعت اور شفاعت کے مسئلے کی بحث سے ہم پر اس کا مفہوم واضح ہو چکا ہے۔ اب اس کے اجتماعی اور نفسیاتی فلسفوں کا سمجھنا مشکل نہیں رہا۔

شفاعت کی حقیقت کی طرف مکمل توجہ سے اس کے معتقدین پر مندرجہ ذیل اثرات کے مرتب ہونے کا امکان ہے۔

۱۔ مایوسی کی روح سے مقابلہ: جو لوگ سخت جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں وہ ایک طرف تو وجدانی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسری طرف درگاہِ خدا سے بخشش سے مایوس ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ گناہوں کی زندگی سے واپسی کا راستہ نہیں پاتے لہٰذا عملی طور پر کسی تجدید نظر کے لئے تیار نہیں ہوتے اور مستقبل کے افق کی تیرگی کو دیکھ کر وہ طغیان و سرکشی میں زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ اس طرح اسی عملی زندگی کے عنوان سے مقررات الٰہی کے بے سود ہونے کے قائل ہو جاتے ہیں بالکل اس بیمار کی طرح جو تندرستی سے مایوس ہو کر ہر چیز کی بندشوں سے بے پرواہ ہو جائے چونکہ اب وہ اسے بے دلیل اور بے اثر سمجھتا ہے۔

بعض اوقات وجدانی درد و تکلیف جو ایسے جرائم سے پیدا ہوتی ہے نفسیاتی خلل یا معاشرے سے بدلہ لینے کی تحریک کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ اسی معاشرے نے اسے اس طرح آلودہ کیا ہے۔ اس طرح گناہ گار ایک خطرناک عنصر میں تبدیل ہو کر معاشرے کے لئے دکھ اور تکلیف کا مرکز بن جاتا ہے۔

ایسے عالم میں شفاعت پر ایمان اس کے سامنے روشنی کا ایک دریچہ کھول دیتا ہے اور بخشے جانے کی امید دلا کر اسے اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ تجدید نظر اور گذشتہ کردار کے ازالے اور اصلاح کے لئے اسے شوق دلاتا ہے اس طرح معاشرے سے

قطع تعلق کی تحریک پیدا نہیں ہوتی اور نفسیاتی اطمینان اسے ایک سالم اور صالح عنصر میں تبدیل ہونے کا امکان مہیا کرتا ہے۔

اس بنا پر اگر ہم یہ کہیں کہ صحیح معنی والی شفاعت کی طرف توجہ ایک اصلاح کنندہ عامل ہے اور برائی سے رکنے کا سبب ہے اور ایک مجرم و گناہگار فرد کو صالح بنا دیتا ہے تو یہ فضول بات نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عمر قید کے قیدیوں کے لئے بھی سفارش اور بخشش کا دریچہ دنیا کے مختلف قوانین میں کھلا ہے تاکہ کہیں یاس و نا امیدی انہیں قید خانوں میں کسی خطرناک اقدام کی طرف جانے یا نفسیاتی خلل میں مبتلا نہ کرے۔

۵) شفاعت کی شرائط تعمیری اور اصلاح کنندہ ہیں: اس طرف متوجہ رہتے ہوئے کہ شفاعت اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے کئی پہلوؤں سے متعدد قیود و شرائط کی حامل ہے، جو لوگ اس اصل و بنیاد کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ مجبور ہیں کہ ان شرائط پر عملدرآمد کریں اور ظلم جیسے گناہوں سے جن کی وجہ شفاعت کی امید ختم ہو جاتی ہے پرہیز کریں اور اپنے پروگرام کو تبدیل کرکے اور جاتا ترنا کر شروع کریں۔ ایسے لوگ مقام ارتضیٰ تک رسائی اور عہد الٰہی کی پاسداری کے لئے (جس کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے) اپنے گناہوں سے باقاعدہ توبہ کرتے ہیں یا کم از کم توبہ کی منزل پر قیام کرتے ہوئے غلط کاری اور قانون الٰہی کی بندشوں کو توڑنے سے باز رہتے ہیں یا کم از کم ایسے افعال میں کمی کر دیتے ہیں اور اپنے اندر خدا اور بڑی عدالت پر ایمان کو زندہ رکھتے ہیں اور اس کے قوانین اور مقررات کا احترام کرتے ہیں۔

ایسے افراد اپنے اور شفاعت کرنے والے کے درمیان اپنے رشتے اور تعلق کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک قسم کا رابطہ چاہے کم ہی کیوں نہ ہو اپنے اور ان کے درمیان برقرار رکھتے ہیں یعنی جس طرح شفاعت تکوینی میں تاثیر تکامل کے لئے آمادگی، ربط اور تسلیم ضروری ہیں شفاعت تشریعی میں نتیجے تک پہنچنے کیلئے بھی اس قسم کی آمادگی اور تیاری ضروری ہے (غور کیجئے گا)۔

اس طرح کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ شفاعت اپنے صحیح مفہوم کے اعتبار سے مجرمین کے حالات کی تبدیلی اور اصلاح کے لئے نقش مؤثر ہے۔

(۶) اعتراضات کے جوابات: جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عرف عام کی شفاعت اور منطق اسلام کی شفاعت میں بہت فرق ہے ایک کی بنیاد اس کی فکر کو تبدیل کرتا ہے جس کے پاس شفاعت ہوتی ہے اور دوسری کی بنیاد اس شخص میں گوناگوں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جس کی شفاعت ہو رہی ہے۔

واضح ہے کہ پہلے معنی والی شفاعت تمام تر اعتراضات کا موجب ہے۔ اسی سے سعی و طلب کی روح مضمحل ہوتی ہے اور وہی گناہ کی طرف رغبت کا باعث بنتی ہے اور پسماندہ اور طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کی انعکاسی کرتی ہے نیز ایک قسم کے شرک یا انحراف کا سبب قرار پاتی ہے کیونکہ اگر ہمارا اعتقاد ہو کہ خدا کے علم میں تغیر آسکتا ہے اور جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس کی کسی ایسی بات کو خدا کے سامنے واضح کیا جا سکتا ہے جسے وہ نہیں جانتا اور اس کے علاوہ کوئی اور ایسا مبدا ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے وسیلے سے خدا کے غضب کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے یا اس کی محبت کو اس کے ذریعے اپنی طرف جذب کیا جا سکتا ہے یا پھر یہ اعتقاد رکھیں کہ خدا کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے بعض بندوں کے مقام و اہمیت کا محتاج ہو اور اس احتیاج کی

وجہ سے کسی مجرم کے بارے میں اُن کی شفاعت قبول کرے یا پھر ہمارا اعتقاد ہو کہ ممکن ہے وہ وسائط کے اثر و رسوخ سے ڈر جائے اور ان کی شفاعت قبول کرے تو یہ تمام امور ہمیں اصل توحید اور صفات خدا سے دور کر دیتے ہیں اور شرک و بت پرستی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔ یہ سب عرف عام والی شفاعت کی خصوصیات ہیں جو دراصل اس کے غلط معانی ہیں۔

مگر صحیح شفاعت کہ جس میں وہ شرائط، کوائف اور خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس میں ان عیوب میں سے کسی کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے وہ شفاعت گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی بلکہ ترک گناہ کا وسیلہ ہے۔ وہ سستی اور کاہلی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ روح اُمید پیدا کرکے نسانی قوتوں کو گذشتہ غلطیوں اور خطاؤں کی تلافی کے لئے مجتمع کر دیتی ہے۔ وہ گزشتہ کردار سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھنے دیتی بلکہ مجرموں، گناہگاروں اور زیادتی کرنے والوں کی اصلاح کا ایک مؤثر تربیتی وسیلہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایسی شفاعت شرک نہیں ہے بلکہ عین توحید ہے اور خدا کی طرف اور اس کی صفات کی طرف توجہ کا باعث ہے کیونکہ یہ دراصل اُس کے اذن اور فرمان سے مدد طلب کرنا ہے (پھر بھی غور کیجئے گا)۔

شفاعت اور مسئلہ توحید

مسئلہ شفاعت کی غلط تفسیروں کی وجہ سے دو گروہ اس کی مخالفت میں نمایاں ہوئے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے متضاد رُخ پر ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو مادیین جیسی فکر رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک مسئلہ شفاعت پردہ پوشی کا عامل ہے اور طلب سعی کو ختم کر دیتا ہے۔ ان کا جواب تفصیل سے گزر چکا ہے۔

دوسرا گروہ افراط کے شکار کوتاہ نظر مذہبی لوگوں کا ہے (جیسے وہابی حضرات) اور ان کے کچھ اور ہم فکر لوگ بھی ہیں۔ یہ لوگ شفاعت کے اعتقاد کو ایک قسم کا شرک اور آئینِ توحید سے انحراف سمجھتے ہیں۔ باوجودیکہ اس اشکال کو پیش کرنا موضوع بحث سے خارج ہے (اور اس سے مذہبی اشتعال کا اندیشہ ہو سکتا ہے) تاہم اس بحث کی تکمیل کے لئے ہم یہاں اس کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں۔

پہلے اس موضوع کی طرف توجہ ضروری ہے کہ وہابی حضرات جنہوں نے آخری دو صدیوں میں محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان کی رہبری میں سرزمین حجاز کو اپنے افکار کے زیر تسلط کر لیا ہے وہ اپنے متشدد تر عقائد میں جو زیادہ تر توحید کے سلسلے میں ہیں نہ صرف یہ کہ شیعوں کے مخالف ہیں بلکہ اکثر اہل تسنن مسلمانوں کے بھی سخت مخالف ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب نے اپنے نظریات ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم دمشقی متوفی ۷۲۸ھ، جو اس سے تقریباً چار سو سال قبل ہو گزرا ہے) سے لئے ہیں۔ وہ حقیقت میں ابن تیمیہ کے افکار و عقائد کا اجرا کرنے والا تھا۔

محمد بن عبدالوہاب ۱۱۶۰ سے اپنے سن وفات ۱۲۰۶ تک وہاں کے حاکموں کا ساتھ دیتے ہوئے حجاز کے بدوؤں اور بیابانوں میں گھومنے والی اقوام میں سخت تعصب کی آگ بھڑکاتا رہا۔ توحید کے دفاع اور شرک کے مقابلے کے نام پر اپنے مخالفین کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا اور اس طرح کاروبار حکومت اور سیاسی قیادت پر اپنے سیدھے طریقے سے تسلط جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں حجاز اور حجاز سے باہر بہت سے مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔

محمد بن عبدالوہاب کے مریدوں کی کشمکش علاقہ حجاز تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ۱۲۱۶ھ میں ٹھیک محمد بن عبدالوہاب کے انتقال کے دس سال بعد اُس کے مریداور پیروکار حجاز کے بیابانوں کے راستے نکلے اور بے خبری میں اچانک کربلا پر حملہ کر دیا۔ عید غدیر کی مناسبت سے شہر میں چھٹی تھی اور کربلا کے اکثر لوگ عید غدیر کے سلسلے میں نجف اشرف گئے ہوئے تھے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شہر کی دیوار توڑ دی اور شہر میں لوٹ مار مچادی۔ حرم امام حسینؑ اور دوسرے مقدس اسلامی مقامات کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان مقامات سے تمام ہیرے جواہرات، منقش پردے، نفیس ہدیے اور زینت کی دوسری چیزیں (لشکر یزید کی اتباع میں) لوٹ کر لے گئے۔

پچاس مسلمان ضریح کے قریب، پانچ سو صحن میں اور کثیر تعداد میں شہر کے دیگر مقامات پر شہید کر دیے جب کہ بعض لوگ اس موقع پر شہدائے کربلا کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ بیان کرتے ہیں بہت سے گھروں میں غارت گری کی گئی۔ یہاں تک کہ بوڑھے بچے اور عورتیں بھی اس ظلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔

۱۳۴۴ میں فقہائے مدینہ جو کاروبار حکومت میں دخل رکھتے تھے فتویٰ دیا کہ حجاز میں تمام بزرگان دین کی قبریں مسمار کر دی جائیں اور آٹھ شوال کو (متوکل عباسی کی پیروی میں) یہ حکم نافذ کر دیا گیا۔ قبر رسولؐ تو تمام مسلمانوں کی ناراضگی کے خوف سے محفوظ رہ گئی۔

خلاصہ یہ کہ اس مذہب کے پیروکار خود محمد بن عبدالوہاب کی طرح سخت مزاج، رحمدلی سے عاری، خود سر، لکیر کے فقیر اور متعصب ہیں۔ عقل و منطق کی بجائے شدت و سختی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ وہ تمام اسلام چند ایک مسائل کے لئے مقابلہ اور جنگ کرنا ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً شفاعت، زیارت اور توسل۔ عملی طور پر اسلام کے اہم اجتماعی اور معاشرتی مسائل خصوصاً جن کا تعلق عدالتِ اجتماعی اور سامراجی آثار کو ختم کرنے اور مادہ پرستی اور مذاہبِ الحادی کے عقل و منطق کے ساتھ مقابلے سے لوگوں کو دور رکھے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری دائرہ کار میں ان مسائل کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی اور دورِ حاضر کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ایک وحشت ناک جہالت اور لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بہر حال یہ لوگ مسئلہ شفاعت کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ رسول اسلام سے شفاعت طلب کرے۔ مثلاً وہ کہے یا محمد اشفع لی عند اللّٰہ (اے محمدؐ! اللہ کے ہاں میری شفاعت کیجئے) کیونکہ خدا کہتا ہے " وان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احداً (جن۔ ۱۸)

رسالہ کشف الشبہات، تالیف محمد بن عبدالوہاب میں یوں ہے:

اگر کوئی کہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا نے پیغمبر کو مقام شفاعت بخشا ہے اور آپ خدا کے اذن و فرمان سے شفاعت کر سکتے ہیں تو کیا حرج ہے کہ جو کچھ خدا نے انہیں بخشا ہے ہم اس کا تقاضا کریں۔

تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ درست ہے کہ خدا نے انہیں مقام شفاعت عطا کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے نہی کی ہے کہ ہم ان سے شفاعت طلب کریں۔ خدا نے کہا ہے " فلا تدعوا مع اللّٰہ احداً " (اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو)۔

علاوہ ازیں مقام شفاعت نبی کریم سے مخصوص نہیں ہے فرشتے اور دوستانِ خدا بھی اس مقام کے حامل ہیں تو کیا ہم ان سے بھی شفاعت طلب کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی اس طرح کہے تو اس نے خدا کے صالح بندوں کی پرستش و عبادت کی ہے [1]

یہی صاحب رسالہ "اربع قواعد" میں گفتگو کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے [2]

شرک سے نجات صرف چار قواعد جاننے سے ممکن ہے:

(i) وہ کفار جن سے نبی اکرمؐ برسرپیکار تھے یہ اقرار کرتے تھے کہ خدا ہی خالق و رازق اور وہی جہان ہستی کی تدبیر کرنے والا ہے۔ "قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ..... وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ" یعنی ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے اور کون تدبیر امر کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں اللہ۔ (یونس۔ ۳۱)

لیکن یہ اقرار انہیں ہرگز مسلمانوں کے زمرے میں داخل نہ کر سکا۔

(ii) وہ کہتے تھے بتوں کی طرف ہماری توجہ اور ان کی عبادت صرف قرب خدا اور شفاعت کے لئے ہے "وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ" یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔

(iii) پیغمبرؐ نے ان تمام لوگوں کی جو غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں نفی کر دی اور ان کے خلاف حکم دیا چاہے وہ فرشتوں، انبیاء اور صالحین کی عبادت کرتے تھے یا درختوں، پتھروں، سورج اور چاند کی۔ آپؐ ان کے درمیان کسی قسم کے فرق کے قائل نہ تھے۔

(iv) ہمارے زمانے کے مشرکین زمانۂ جاہلیت کے مشرکوں سے بدتر ہیں کیونکہ وہ اطمینان و راحت کے وقت بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن تنگی و سختی میں وہ صرف خدا کو پکارتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ

(لہٰذا جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالصتاً خدا ہی کو پکارتے ہیں ....) (عنکبوت۔ ۶۵)

لیکن ہمارے زمانے کے مشرکین راحت و اطمینان اور تنگی و سختی دونوں میں غیر خدا سے متوسل ہوتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ باقی تمام مسلمانوں کو جو ان کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں مشرک قرار دیتے ہیں وہ سنی ہوں یا شیعہ۔ یہ لوگ اس قدر جبر اور جسارت کے عادی ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کا خون اور مال اپنے لئے مباح اور حلال سمجھتے ہیں۔ انہیں قتل کرنا بغیر چون و چرا کے جائز سمجھتے ہیں جیسے پیدائش وہابیت سے اب تک انہوں نے بارہا اس کا عملی مظاہرہ کر دکھایا ہے۔

شیخ سلیمان بن لحمان کتاب "الہدیۃ السنیۃ" میں کہتا ہے:

---

[1] البراہین الجلیلہ ص۱۵ بحوالہ کشف الشبہات۔

[2] کشف الارتیاب۔ ص۱۴۳ بحوالہ اربع قواعد ص۲۴ تا ص۲۶

جو شخص فرشتوں، انبیاء، یا مثلاً ابن عباس اور ابو طالب یا ان جیسے اشخاص کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دے کہ وہ خدا کی بارگاہ میں اس کی شفاعت کریں کیونکہ یہ لوگ مقرب بارگاہ خدا ہیں جیسے کہ (بعض سمجھتے ہیں) بادشاہوں کے پاس شفاعت کرتے ہیں تو ایسے لوگ کافر اور مشرک ہیں اور ان کا خون اور مال مباح ہے اگرچہ وہ یہ کہتے ہیں "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ" اگرچہ وہ نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔[1]

جو سختی، سرکشی اور ڈھٹائی اس گفتگو سے برس رہی ہے وہ کسی شخص پر مخفی نہیں۔

مسئلہ شفاعت کے بارے میں وہابیوں کی جو منطق ان کے مذہب کے بانی محمد بن عبدالوہاب کے اقوال کے حوالے سے پیش کی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ شفاعت کے طرفدار مسلمانوں کو مشرک قرار دیتے ہوئے دو چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔

۱۔ انبیاء اور صلحاء کی شفاعت پر یقین رکھنے والے مسلمانوں کا قیاس زمانہ جاہلیت کے مشرکین پر کرتے ہیں۔

۲۔ قرآن نے غیر خدا کی عبادت و پرستش کی صریح نفی کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کا نام نہ لیں "فلا تدعوا مع اللہ احداً" (سورہ جن) اور یہ کہ تقاضائے شفاعت ایک قسم کی عبادت ہے۔

پہلی بات کے بارے میں کہنا چاہیے کہ اس قیاس میں وہ بہت بڑے اشتباہ کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ قرآن سے نیک اور صالح انبیاء و ملائکہ کے لئے مقام شفاعت ثابت ہے جیسا کہ گذشتہ بحثوں میں گذر چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسے اذن الٰہی پر موقوف قرار دیا ہے۔

یہ بات انتہائی غیر منطقی اور مضحکہ خیز ہے کہ ہم کہیں کہ خدا نے انہیں یہ مقام تو دیا ہے لیکن ہمیں منع کیا گیا ہے کہ اس حیثیت و مقام کو عمل میں لانے کا مطالبہ کریں چاہے وہ اذن خدا ہی سے کیوں نہ ہو۔

علاوہ ازیں قرآن میں برادران حضرت یوسفؑ کا باپ سے رجوع کرنا یا اسی طرح اصحاب پیغمبر کا رجوع اور آپؐ سے اپنے حق میں استغفار کا مطالبہ کرنا شمار کئے جا چکے ہیں۔

کیا پیغمبر سے یہ تقاضا کرنا کہ "اشفع لنا عند اللہ" (اللہ کے حضور ہماری شفاعت کیجئے) شفاعت کے روشن و واضح مصادیق میں سے نہیں ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا تھا۔

یا ابانا استغفرلنا

(اے والد بزرگوار! ہمارے لئے مغفرت طلب کیجئے) (یوسف - ۹۷)

جس چیز کو قرآن صراحت سے جائز سمجھتا ہے یہ لوگ اسے کیونکر شرک شمار کرتے ہیں اور اس کے معتقد کو مشرک نیز اس کے خون اور مال کو مباح سمجھتے ہیں اگر یہ چیز شرک ہے تو حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کیوں منع نہیں کیا۔

---

[1] البراہین الجلیۃ صفحہ ۳ بحوالہ الہدیۃ السنیۃ ص ۶۶

دوسری بات یہ ہے کہ بت پرستوں اور ان خدا پرستوں میں جو شفاعت باذن اللہ کا اعتقاد رکھتے ہیں کوئی شباہت موجود نہیں ہے کیونکہ بت پرست بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں شفیع قرار دیتے تھے جب کہ شفاعت کا عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں میں مسئلہ عبادت کا تعلق شفعاء سے بالکل نہیں بلکہ وہ فقط ان سے خدا کے دربار میں شفاعت کی درخواست کرتے ہیں۔ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے کہ شفاعت کی درخواست کا مسئلہ عبادت سے کوئی ربط نہیں۔

بت پرست خدائے یگانہ کی پرستش سے وحشت میں تھے اور کہتے تھے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

کیا اس نے کئی خداؤں کو ایک خدا قرار دیا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ (ص۔ ۵)

بت پرست عبادت کے لحاظ سے بتوں کو خدا کے برابر سمجھتے تھے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

خدا کی قسم ہم واضح گمراہی میں تھے جب کہ تمہیں رب العالمین کے مساوی سمجھتے تھے (شعراء۔ ۹۷، ۹۸)

جیسے کہ تاریخ واضح گواہی دیتی ہے بت پرست اپنی خلقت اور تقدیر میں بتوں کے عمل و دخل کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس عمل دخل کی مبدائیت کے قائل تھے جب کہ شفاعت کا اعتقاد رکھنے والے مسلمان یہ امور صرف خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور کسی موجود کے لئے بھی تاثیر میں استقلال کے قائل نہیں ہیں۔

اب مسلمانوں کو بت پرستوں جیسا قرار دینا بہت ہی ظالمانہ اور بعید از عقل و منطق کام ہے۔

باقی رہا دوسرا مطلب تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ "عبادت" کیا ہے۔ اگر عبادت کا مفہوم "ہر قسم کا خضوع و احترام کرنا" لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کسی قسم کا خشوع و احترام نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا

اسی طرح اگر عبادت کی تفسیر "ہر قسم کی درخواست و تقاضا کرنا" کی جائے تو ہر شخص سے درخواست و سوال اور تقاضا کرنا شرک اور بت پرستی قرار پا جائے حالانکہ یہ بھی عقل اور دین کی واضح راہنمائی کے خلاف ہے۔

عبادت کی تفسیر "کسی کا تابع اور پیرو ہونا" بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اجتماعی معاملات اور امور میں لوگ اپنے سربراہ کی پیروی کرتے ہیں جو زندگی کی ابجد کا حصہ ہے۔ جیسے انبیاء اور بزرگ رہبروں کی پیروی کرنا کسی دیندار کی لازمی ذمہ داریوں میں شمار ہوتی ہے۔

لہٰذا عبادت کا مفہوم ان تمام امور سے الگ اور جدا ہے اور وہ آخری حد کا خضوع اور تواضع ہے جو مطلق تعلق اور وابستگی کے ساتھ، بغیر کسی قید اور شرط کے، تسلیم کے عنوان سے "عابد" کی طرف سے معبود کے سامنے انجام پذیر ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل "عبد" ہے اور اس کا مفہوم لفظ عبد (بندہ) کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ درحقیقت عبادت کرنے والا اپنی عبادت کے ساتھ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ معبود کے سامنے تسلیم محض کے لئے حاضر ہے اور اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سمجھتا ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جو عبادت سے عرف اور شرع میں مراد لیا گیا ہے۔ تو کیا شفعاء سے شفاعت کے سوال میں اس

مفہوم عبادت کا کوئی اثر موجود ہے؟

باقی رہا دعا، اور غیر خدا کو پکارنا، جس سے کئی ایک آیات میں روکا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی کو آواز دینے سے منع کیا گیا ہے اور کسی کو اس کے نام سے پکارنا "یا حسن"، "یا احمد" کہنا ممنوع ہے یا شرک ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کسی کو پکارنا اور اس سے اس کام کی انجام دہی کی درخواست کرنا جو اس کی قدرت و طاقت میں ہو گناہ اور شرک نہیں۔ کیونکہ تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرنا اجتماعی زندگی کا حصہ ہے۔ تمام انبیاء اور ائمہ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے (یہاں تک کہ خود وہابی بھی اسے ممنوع نہیں جانتے)۔

قابلِ اعتراض صورت ممکن ہے وہی ہو جس پر ابن تیمیہ نے رسالہ "زیارۃ القبور" میں اعتراض کیا ہے:

مطلوب العبد ان کان لا یقدر علیه الا الله فسائله من المخلوق مشرک من جنس عباد الملائكة والتماثيل ومن اتخذ المسيح وامه الهين مثل ان يقول لمخلوق حي او ميت اغفر ذنبي او انصرني على عدوي او اشف مريضي ..... وان كان مما يقدر عليه العبد فيجوز طلبه منه في حال دون حال فان مسألة المخلوق قد تكون جائزة وقد تكون منهيا عنها قال الله تعالى: فاذا فرغت فانصب والى ربك فارغب۔ واوصى النبي (ص) ابن عباس اذا سئلت فاسئل الله اذا استعنت فاستعن بالله واوصى طائفة من اصحابه ان لا يسئل الناس شيئا وكان سوط احدهم يسقط من كفه فلا يقول لاحد ناولني اياه فهذا المنهي عنها والجائزة طلب دعاء المومن لاخيه[1]

بندے کی خواہش اگر ایسی ہے جس پر خدا کے علاوہ کوئی قدرت نہیں رکھتا تو ایسی حاجت کا مخلوق سے سوال کرنے والا مشرک ہے اور وہ ملائکہ، تماثیل، حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو خدا سمجھنے والوں میں سے ہے۔ مثلاً کسی زندہ یا مردہ مخلوق سے یہ کہنا کہ میرا گناہ بخش دو یا میرے دشمن کے خلاف میری مدد کرو.... اور اگر وہ حاجت ایسی ہے جس پر بندہ قدرت رکھتا ہے تو بعض اوقات اس سے طلب کرنا جائز ہوتا ہے اور بعض اوقات ناجائز کیونکہ مخلوق سے سوال کبھی جائز ہوتا ہے اور کبھی اس سے روکا گیا ہوتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: جب آپ فارغ ہو جائیں تو نصب کریں اور اپنے رب کی طرف ہی رغبت کریں۔ نبی اکرم نے ابن عباس کو وصیت کی کہ جب تمہیں سوال کرنا ہو تو خدا سے سوال کرو یا جب اعانت طلب کرنی ہو تو خدا سے اعانت طلب کرو اور آپ نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو وصیت کی تھی کہ وہ لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہ کریں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کا کوڑا اس کے ہاتھ سے گر جاتا تو کسی سے نہ کہتا کہ مجھے اٹھا کر دے دو تو یہ منہی عنہ (وہ ہے جس سے روکا گیا) ہے اور جائز یہ ہے کہ ایک مومن اپنے مومن بھائی سے دعا

---

[1] کشف الارتیاب ص۲۶۰ بحوالہ زیارۃ القبور ص۱۵۲

کی خواہش رہے۔
اس بناء پر اگر واقعاً کوئی خدا کا کام غیر خدا سے چاہے اور اسے اس کی انجام دہی میں مستقل سمجھے تو وہ مشرک ہے لیکن اگر اس سے شفاعت چاہے جو اس بندے ہی کا کام ہے اور خدا نے اسے یہ حق دیا ہے تو اس میں کسی قسم کا کوئی شرک نہیں ہے بلکہ عین ایمان اور توحید ہے۔ آیت: فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا " میں لفظ "مع" بھی اس کی واضح گواہی دے رہا ہے کہ یہاں مقصود ہے کسی کو خدا کے ہم پلہ سمجھ کر مؤثر مستقل خیال کرنا۔

خلاصہ یہ کہ اس بحث پر اصرار و تاکید کا مقصد یہ ہے کہ مفہوم شفاعت میں تحریف اور اسے مسخ کرنا نہ صرف مذہب پر اعتراض کرنے والوں کو مذہب پر تنقید کا بہانہ فراہم کرتا ہے بلکہ وہ عظیم مذہبی گروہوں میں تفرقہ اور اختلاف کا سبب بھی بنا ہوا ہے۔

۴۹۔ وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝

۴۹۔ ترجمہ

نیز یاد کرو اس وقت کو) جب تمہیں ہم نے فرعونیوں کے چنگل سے رہائی بخشی جو مسلسل تمہیں سخت ترین طریقے سے تکلیف و آزار پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کے سر کاٹ لیتے اور تمہاری عورتوں کو (کنیزی کے لئے) زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی۔

تفسیر

قرآن اس آیت میں ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے اللہ نے قوم بنی اسرائیل کو نوازا تھا وہ ستمگاروں کے چنگل سے آزادی جو خدا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔

انہیں یاد دلاتا ہے: وہ زمانہ یاد کرو جب تمہیں ہم نے فرعونیوں سے آزادی دلائی تھی (واذ نجینٰکم من اٰل فرعون) جو ہمیشہ شدید ترین طریقے سے تمہیں آزار دیتے تھے (یسومونکم سوء العذاب)۔

تمہارے بیٹوں کا گلا کاٹ دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو کنیزی اور خدمت کے لئے زندہ رہنے دیتے تھے (یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم)۔

اور یہ صورت حال تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی (وفی ذٰلکم بلاء من ربکم عظیم)۔

قرآن نے خصوصیت سے بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے ظلم کی تصویر کشی کرتے ہوئے "یسومونکم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یسومون فعل مضارع ہے اور مادہ "سوم" سے ہے جس کا اصل مطلب کسی چیز کے پیچھے جانا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ فعل مضارع عموماً دوام اور استمرار کے معنی دیتا ہے۔ اس گوسفند اور اونٹ کو "سائمہ" کہتے ہیں جو ہمیشہ

جنگل میں چرتے ہیں اور مالک کے گھر سے کبھی گھاس نہیں کھاتے۔

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل مسلسل فرعونیوں کے شکنجے میں مبتلا تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ ان کے بیگناہ بیٹوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ خود ہمیشہ ان کے ظلم میں گرفتار رہتے۔ وہ قبطیوں کے غلام، خدمت گار، خادم اور ساز و سامان کا حصہ شمار ہوتے تھے۔

یہ بات اہم ہے کہ قرآن اس کارروائی کو بنی اسرائیل کے لئے ایک سخت اور عظیم آزمائش قرار دیا ہے (بلاء کا ایک معنی آزمائش و امتحان ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ ان نامناسب اور خلاف فطرت امور کو برداشت کرنا ایک سخت آزمائش تھی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "بلاء" یہاں مجازات اور سزا کے معنی میں ہو کیونکہ بنی اسرائیل اس سے پہلے بہت قدرت و نعمت کے حامل تھے اور انہوں نے کفرانِ نعمت کیا لہٰذا خدا نے انہیں سزا دی۔

بعض مفسرین کی طرف سے ایک تیسرا احتمال بھی ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ "بلاء" نعمت کے معنی میں ہے یعنی فرعونیوں کے چنگل سے نجات تمہارے لئے ایک بہت بڑی نعمت تھی[1]

بہرحال فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کی آزادی کا دن ایک اہم تاریخی دن تھا جس کا قرآن نے بارہا تذکرہ کیا ہے[2] قرآن نے بیٹیوں کو زندہ رکھنے اور بیٹوں کے سر کاٹنے کو عذاب قرار دیا ہے اور اس ظلم سے آزادی کو اپنی نعمت شمار کیا ہے۔ گویا وہ انسانوں کو ابھار رہا ہے کہ وہ کوشش کریں کہ ہر قیمت پر اپنی صحیح آزادی حاصل کریں اور اس کی حفاظت کریں جیسا کہ حضرت علیؑ اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الموت فی حیاتکم مقهورین والحیاة فی موتکم قاهرین[3]

زندہ رہنا اور زبردست و مغلوب رہنا موت ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے موت انسان کی زندگی ہے۔

آج کی دنیا کا گذشتہ زمانے سے فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں فرعون ایک خاص استبداد کے ساتھ مخالف گروہ کے بیٹوں اور مردوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو چھوڑ دیتا تھا۔

---

[1] "بلاء" کے اصلی معنی ہیں کہنگی اور قدامت۔ آزمانے کو بھی "بلاء" کہا گیا ہے۔ کیونکہ جس چیز کی کئی مرتبہ آزمائش کی جائے اس میں کہنگی آجاتی ہے۔ غم و اندوہ کو بھی "بلاء" کہتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جسم و روح کو کہنہ و فرسودہ کر دیتا ہے۔ تکالیف اور مصائب کو بھی بلا کہتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جسم و روح کو کہنہ و فرسودہ کر دیتے ہیں۔ شر، بلی اور ذمہ داریوں کو بھی بلا کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انسان کے جسم و جان پر سنگین اثرات پیدا کرتی ہیں۔ آزمائش بعض اوقات نعمت کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی مصیبت کے ساتھ لہٰذا لفظ "بلاء" بھی کبھی اس معنی میں اور کبھی اس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] مزید توضیح تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں مطالعہ کیجئے۔

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۱

لیکن آج کی دنیا میں دوسرے طریقوں سے افراد انسانی کی روح مردانگی کو قتل کر دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو گناہوں میں غرق لوگوں کی شہوات کی قید میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

آخر کیوں فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا؟

یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں بعض مفسرین اس جرم اور ظلم کا سبب ایک خواب کو قرار دیتے ہیں جو فرعون نے دیکھا تھا لیکن اس کا مفصل جواب آپ سورہ قصص کی آیت ۴ کے تحت پڑھیں گے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا سبب فقط ایک خواب نہ تھا جو فرعون نے دیکھا بلکہ بنی اسرائیل کے طاقت ور ہونے اور حکومت چھین لینے کی وحشت و خوف بھی اس کام کا مددگار عنصر تھا۔

۵۰۔ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

۵۰۔ ترجمہ

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے دریا شگافتہ کیا اور تمہیں تو نجات دے دی مگر فرعونیوں کو غرق کر دیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

تفسیر

گزشتہ آیت میں فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کا ایک اجمالی اشارہ موجود تھا اور محل بحث آیت دراصل اس کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ نجات انہیں کس طرح ملی تھی جو خود ایک نشانِ اعجاز پروردگار کی بنی اسرائیل پر عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

فرمایا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو شق کیا (واذ فرقنا بکم البحر) تمہیں نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے (فانجینکم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون)۔

فرعونیوں کی دریا میں غرقابی اور بنی اسرائیل کی ان کے چنگل سے نجات کا ماجرا قرآن کی متعدد سورتوں میں ہے منجملہ ان کے اعراف آیہ ۱۳۶، انفال آیہ ۵۴، اسراء آیہ ۱۰۳، شعراء آیہ ۶۶، زخرف آیہ ۵۵ اور دخان آیہ ۱۷ سے بعد تک۔

ان سورتوں میں اس واقعے کی تقریباً تمام جزئیات کی تشریح کی گئی ہے لیکن مورد بحث آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی نظر رحمت و لطف کے لئے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے جو نیا نجات بخش آئین ہے صرف اشارہ کیا گیا ہے[1]

---

[1] مزید شرح تفسیر نمونہ کی جلد ۷، سورہ طٰہٰ آیت ۷۷ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

جیسا کہ تفصیل کے ساتھ اس واقعے کو آپ ان سورتوں میں پڑھیں گے کہ حضرت موسیٰ ایک مدت سے تبلیغ کرنے، فرعون اور فرعونیوں کو دعوت دینے، قسم قسم کے معجزات دکھانے اور ان کے قبول نہ کرنے پر مامور ہوئے کہ آدھی رات کے وقت بنی اسرائیل کو لے کر کوچ کر جائیں مگر جب وہ عظیم دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو اچانک دیکھا کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل اضطراب و وحشت میں گھر گئے۔ ان کے سامنے دریا اور غرقابی تھی اور پشت پر فرعون کا طاقتور لشکر جس کے مقابلے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ عصا دریا پر ماریں۔ دریا میں مختلف راستے پیدا ہو جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کی جمعیت دریا کی دوسری طرف پہنچ جاتی ہے۔ ادھر سے لشکر مخالف جو ان کا مسلسل پیچھا کر رہا تھا سارے کا سارا دریا میں داخل ہو جاتا ہے دریا کا پانی مل جاتا ہے اور وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لشکر فرعون کے مُردوں کے بدن پانی پر تیرنے لگتے ہیں اور بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ دشمن پانی میں غرق ہو گیا ہے۔

وہ حالتِ اضطراب و وحشت اور یہ نجات ہر دو غور طلب امور ہیں کہ انسان اس راحت و آرام کو جب اضطراب کے بعد دیکھے تو خدا کا شکر ادا کرے۔

قرآن چاہتا ہے کہ یہودیوں سے کہے کہ ہم نے جو تم پر اس قدر لطف و کرم کیا ہے اور تمہیں اس وحشت و اضطراب سے رہائی بخشی ہے تو کیوں تم رسولِ اسلام اور ہمارے دستور و احکام کی مخالفت کرتے ہو۔

اس آیت میں انسانوں کے لئے درس ہے کہ اگر وہ زندگی میں خدا پر بھروسہ کریں اور اس قوتِ لازوال پر اعتماد رکھیں اور صراطِ مستقیم میں کسی سعی و جستجو سے پیچھے نہ رہیں تو سخت ترین مواقع اور مشکلات میں خداوند عالم ان کا یار و مددگار ہو گا اور انہیں نجات دے گا۔

۵۱۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۵۲۔ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۵۳۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

۵۴۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ

۵۱۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا (اور وہ تم سے جدا ہو کر چالیس راتوں کے لئے وعدہ گاہ پر احکام لینے کے لئے آیا) پس تم نے بچھڑے کو (اپنے معبود کی حیثیت سے) منتخب کر لیا۔ حالانکہ اس کام سے تم (اپنے ہی اوپر) ظلم کر رہے تھے۔

۵۲۔ پھر ہم نے اس کام کے بعد تمہیں بخش دیا کہ شاید تم اس نعمت کا شکر ادا کرو۔

۵۳۔ نیز (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق و باطل کی تشخیص کا ذریعہ تھی کہ شاید تم ہدایت حاصل کرو۔

۵۴۔ اور (وہ وقت بھی) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم تم نے بچھڑے کا انتخاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے نفسوں کو قتل کرو۔ تمہارے پروردگار کی بارگاہ میں یہ کام تمہارے لئے بہتر ہے پھر خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ تواب و رحیم ہے۔

تفسیر

ان چار آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک پر ماجرا واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہودیوں کو اسی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ یہ آیات یہودیوں کی طویل تاریخ میں ان کی بہت بڑی کجروی کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور وہ ہے اصل توحید سے شرک اور بچھڑا پرستی کے ٹیڑھے راستے کی طرف ان کا سفر۔

انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ تم تاریخ میں ایک مرتبہ فاسدین کے گمراہ کرنے کے باعث ایسی سخت سرنوشت سے دوچار ہوئے تھے، اب بیدار رہو اور خالص توحید کا راستہ اسلام اور قرآن کے ذریعے تمہارے سامنے کھولا گیا ہے اسے فراموش نہ کرو۔

یہ آیات حضرت موسیٰ کے کوہ طور کی طرف جانے کے واقعے کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو چالیس شب و روز میں انجام پذیر ہوا اور یہ آیات بتاتی ہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کیسے گاؤ پرستی میں پڑ گئے۔ نیز حضرت موسیٰ کی کتاب ہدایت کے ساتھ واپسی، بنی اسرائیل کی نئے رنگ کی توبہ کا مسئلہ اور خدا کی طرف سے اس کی قبولیت کو بیان کرتی ہیں۔

پہلے کہتا ہے یاد کرو اس زمانے کو جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتوں کا وعدہ کیا (واذ وعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ)۔

جب وہ تم سے جدا ہوئے اور تیس راتوں کی میعاد چالیس ہو گئی تو ان کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو اپنے معبود کی حیثیت سے منتخب کر لیا حالانکہ اس عمل سے تم اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے (ثم اتخذتم العجل من بعدہ و انتم ظالمون)

اس ماجرے کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ سے بعد تک اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۸۶ سے بعد تک آپ پڑھیں گے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس کے بعد کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے چنگل سے نجات پاچکے اور فرعون اور اس کے پیروکار غرق ہو گئے تو حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ توارت کی تختیاں لینے تیس راتوں کے لئے کوہ طور پر جائیں لیکن بعد میں لوگوں کی آزمائش کے لئے دس راتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ سامری جو ایک مکار اور فریب کار آدمی تھا اس نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور بنی اسرائیل کے پاس جو سونا اور جواہرات فرعونیوں کی یادگار کے طور پر موجود تھے۔ ان سے ایک بچھڑا بنایا جس سے ایک خاص قسم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ بنی اسرائیل کو اس کی عبادت و پرستش کی دعوت دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک بڑی اکثریت اس سے مل گئی۔ حضرت ہارونؑ جو حضرت موسیٰؑ کے جانشین اور بھائی تھے ایک اقلیت کے ساتھ آئین توحید پر باقی رہے انہوں نے جس قدر کوشش کی کہ انہیں اس غلط راستے سے روکیں وہ نہ رک سکے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ہارونؑ کو ختم کرنے پر تیار ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس آئے اور اس عجیب صورت حال کو دیکھا تو انہیں سخت تکلیف اور دکھ پہنچا۔ انہوں نے ان لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی چنانچہ وہ اپنے برے کام کی برائی کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کرنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا کی طرف سے ایک نئے رنگ کی توبہ ان کے سامنے پیش کی جس کی تفصیل بعد کی آیات میں آئے گی۔

اگلی آیت میں خدا کہتا ہے کہ اس بڑے گناہ کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو (ثم عفونا عنکم من بعد ذالک لعلکم تشکرون)۔

اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور حق و باطل کی پہچان کا وسیلہ عطا کیا تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے (واذ اتینا موسی الکتاب والفرقان لعلکم تہتدون)۔

ممکن ہے کتاب و فرقان دونوں سے مراد توارت ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب توارت کی طرف اشارہ ہو اور فرقان ان معجزات کی طرف اشارہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اختیار میں دیئے تھے (کیونکہ فرقان کا اصلی معنی ہے وہ چیز جو حق کو باطل سے انسان کے لئے ممتاز کرے)۔

اس کے بعد اس گناہ سے توبہ کے سلسلے میں کہتا ہے: اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم تم نے بچھڑے کو منتخب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے (واذ قال موسیٰ لقومہ یاقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل)۔

اب جو ایسا ہو گیا ہے تو توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹ آؤ (فتوبوا الی بارئکم) بارئ کے معنی ہیں خالق۔ دراصل اس کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا۔ خالق چونکہ مخلوقات کو ہوا اصلی اور ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس سخت توبہ کا حکم وہی ذات دے رہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہاری توبہ اس طرح ہونی چاہیئے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو (فاقتلوا انفسکم)، یہ کام تمہارے لئے تمہارے خالق کی بارگاہ میں بہتر ہے (ذالکم خیر لکم عند بارئکم) اس ماجرے کے بعد خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی جو تواب و رحیم ہے (فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم)۔

عظیم گناہ اور سخت سزا

اس میں شک نہیں کہ سامری کے بچھڑے کی پرستش و عبادت کوئی معمولی بات نہ تھی وہ قوم جو خدا کی یہ تمام آیات دیکھ

چکی تھی اور اپنے عظیم پیغمبر کے معجزات کا مشاہدہ کر چکی تھی ان سب کو بھول کر پیغمبر کی ایک مختصر سی غیبت میں اصل توحید اور آئین خدا وندی کو پورے طور پر پاؤں تلے روندتے اور بت پرست ہو جاتے۔ اب اگر یہ بات ان کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے جڑ سے نہ نکالی جاتی تو خطرناک حالت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور ہر موقعے کے بعد اور خصوصاً حضرت موسیٰ کی زندگی کے بعد ممکن تھا ان کی دعوت کی تمام آیات ختم کر دی جاتیں اور اس عظیم قوم کی تقدیر مکمل طور پر خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

لہٰذا یہاں شدت عمل سے کام لیا گیا اور صرف پشیمانی اور زبان سے اظہار توبہ پر ہرگز قناعت نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف سے ایسا سخت حکم صادر ہوا جس کی مثال تمام انبیاء کی طویل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہ یہ کہ توبہ اور توحید کی طرف بازگشت کے سلسلے میں گناہگاروں کے کثیر گروہ کے لئے اکٹھا قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فرمان بھی ایک خاص طریقے سے جاری ہونا چاہیئے تھا اور وہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خود تلواریں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کو قتل کریں کہ ایک اس کا اپنا مارا جانا عذاب ہے اور دوسرا دوستوں اور شناساؤں کا قتل کرنا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰ نے حکم دیا کہ ایک تاریک رات میں وہ تمام لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی غسل کریں، کفن پہن لیں اور صفیں باندھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائیں۔

ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ یہ توبہ کیوں اس سختی سے انجام پذیر ہوئی۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا ان کی توبہ کو بغیر اس خونریزی کے قبول کر لیتا۔

اس سوال کا جواب گذشتہ گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اصل توحید سے انحراف اور بت پرستی کی طرف جھکاؤ کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا کہ اتنی آسانی سے درگذر کر دیا جاتا اور وہ بھی ان واضح معجزات اور خدا کی بڑی بڑی نعمتوں کے مشاہدے کے بعد۔

درحقیقت ادیان آسمانی کے تمام اصولوں کو توحید اور یگانہ پرستی میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس اصل کا متزلزل ہونا دین کی تمام بنیادوں کے خاتمے کے برابر ہے۔ اگر گاؤ پرستی کے مسئلے کو آسان سمجھ لیا جاتا تو شاید آنے والے لوگوں کے لئے سنت بن جاتا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے لئے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ضدی اور بہانہ ساز لوگ تھے لہٰذا چاہیئے تھا کہ ان کی ایسی گوشمالی کی جائے کہ اس کی چبھن تمام صدیوں اور زمانوں تک باقی رہ جائے اور اس کے بعد کوئی شخص بت پرستی کی فکر میں نہ پڑے اور شاید یہ جملہ ذٰلکم خیر لکم عند بارئکم یعنی یہ قتل و کشتار تمہارے خالق کے ہاں تمہاری بہتری کے لئے ہے، اسی طرف اشارہ ہو۔

۵۵۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

۵۶۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۵۵۔ اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم خدا کو آشکار (اپنی آنکھوں سے) دیکھے بغیر تم پر ہرگز ایمان نہیں

لائیں گے۔ اسی حالت میں تمہیں بجلی نے آن لیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔
۵۶۔ پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندگی بخشی کہ شاید خدا کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

تفسیر

یہ دو آیات خدا کی ایک اور بہت بڑی نعمت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ لوگ کس قدر ہٹ دھرم اور بہانہ ساز تھے اور کیسے خدا کے سخت عذاب نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا لیکن پھر خدا کا لطف و کرم ان کے شامل حال ہوا۔

فرماتا ہے: نیز یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس وقت تک ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو ظاہر بظاہر اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لیں (واذ قلتم یموسیٰ لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ)۔

ممکن ہے یہ خواہش ان کی جہالت کی وجہ سے ہو کیونکہ نادان لوگ اپنے محسوسات سے زیادہ کسی چیز کا شعور نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کو آنکھ سے دیکھیں یا پھر وہ ہٹ دھرمی اور بہانہ جوئی کی خاطر ایسا کرتے تھے جو اس قوم کی خصوصیت تھی اور اب بھی ہے۔

بہر حال انہوں نے صراحت سے حضرت موسیٰ سے کہا کہ جب تک خدا کو ظاہری آنکھ سے نہ دیکھ لیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں اس کے علاوہ چارہ کار نہ تھا کہ خدا کی ایک ایسی مخلوق انہیں دکھائی جاتی جسے دیکھنے کی تاب ان میں نہ ہو اور وہ جان لیں کہ ظاہری آنکھ تو اس سے بھی ناتواں ہے کہ وہ خدا کی تمام مخلوقات کو دیکھ سکے۔ چہ جائیکہ ذات پاک پروردگار کو دیکھے۔

چنانچہ چندھیا دینے والی چمک، رعب دار آواز اور زلزلے کے ساتھ بجلی آئی اور پہاڑ پر گری۔ اس نے سب کو اس طرح وحشت زدہ کر دیا کہ وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے جیسا کہ قرآن مندرجہ بالا جملے کے بعد کہتا ہے: پھر اس حالت میں صاعقہ نے تمہیں آلیا کہ تم دیکھ رہے تھے (فاخذتکم الصاعقۃ وانتم تنظرون)۔

حضرت موسیٰ اس واقعے سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ بنی اسرائیل کے بہانہ جو لوگوں کے لئے تو ستر افراد کا ختم ہو جانا ایک بڑا بہانہ تھا جس کی بنیاد پر وہ حضرت موسیٰ کی زندگی کو تیرہ و تار کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے خدا سے ان لوگوں کے لئے دوبارہ زندگی کی درخواست کی جسے اس نے قبول کر لیا جیسا کہ قرآن کی بعد والی آیت میں کہتا ہے: پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں نئی زندگی بخشی کہ شاید تم خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو (ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون)۔

اجمالی طور پر ان دو آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سورہ اعراف آیہ ۵۵ اور سورہ نساء آیہ ۱۵۲ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔[1]

بہر حال یہ داستان نشاندہی کرتی ہے کہ خدا کے عظیم انبیاء جاہل و بے خبر لوگوں کو دعوت دینے کی راہ میں کن کن عظیم مشکلات

---

[1] زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۲ کی طرف رجوع فرمائیے۔

سے دوچار ہوتے تھے۔ کبھی تو وہ لوگ قسم قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور کبھی اس سے بھی آگے قدم رکھتے تھے اور اس ظاہری آنکھ سے خدا کو دیکھنے کی خواہش کرتے اور قطعی کہتے کہ جب تک ہماری یہ تمنا انجام پذیر نہ ہو ہمارا ایمان لانا محال ہے اور جب خدا کی طرف سے کسی شدید ردعمل سے دوچار ہوتے پھر بھی ایک نئی مشکل درپیش ہوتی۔ اگر لطف خدا شاملِ حال نہ ہوتا تو ان بہانہ سازیوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔

ضمنی طور پر یہ آیت امکانِ رجعت اور اس دنیا میں دوبارہ زندگی گذارنے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ ایک مقام پر اس کا واقع ہونا دوسرے مواقع پر بھی اس کے ممکن اور واقع ہونے کے لئے دلیل ہے۔

بعض اہلسنت مفسرین جو یہ چاہتے ہیں کہ رجعت اور دوبارہ کی زندگی کو قبول نہ کیا جائے انہوں نے مندرجہ بالا آیت کی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ کے واقعہ "صاعقہ" میں مرجانے کے بعد خدا نے تمہیں بہت سی اولاد اور افزائش نسل دی ہے تاکہ تمہارا خاندان ختم نہ ہو۔[1]

لیکن یہ تو کہے بغیر بھی واضح ہے کہ یہ تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ خدا تو فرما رہا ہے:

وبعثنٰکم من بعد موتکم (تمہیں تمہاری موت کے بعد ہم نے اٹھایا)[2]

۵۷۔ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ
طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۷۔ اور ہم نے بادل کے ذریعے تم پر سایہ ڈالا اور من (درختوں کا مخصوص اور لذیذ شیرہ) وسلویٰ (کبوتر کی طرح کے مخصوص مرغ) کے ساتھ تمہاری تواضع کی۔ (اور ہم نے کہا) ان پاکیزہ نعمتوں سے جو ہم نے دی ہیں کھاؤ۔ انہوں نے ہم پر تو کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کیا ہے۔

تفسیر

جیسے سورہ مائدہ کی ۲۰ تا ۲۲ آیات سے ظاہر ہوتا ہے بنی اسرائیل جب فرعونیوں کے چنگل سے نجات پاچکے تو خداوند عالم نے

---

[1] تفسیر المنار ج ۱ ص ۳۲۲

[2] بعض مفسرین مثلاً آلوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے کہ موت سے یہاں مراد بے ہوشی ہے یعنی بنی اسرائیل صاعقہ عظیم دیکھنے سے بیہوش ہو گئے تھے پھر حکم خدا سے ہوش میں آگئے۔ بعض مفسرین نے توجیہ کرنے میں قدم کچھ آگے بڑھایا ہے اور موت کے معنی جہالت اور "بعث" کے معنی تعلیم کیے ہیں لیکن یہ آیات اور ان کی مثل دیگر آیات جو سورہ اعراف میں ہیں ان پر غور و فکر کرنے سے واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی توجیہ بھی ایک حقیقت پسند مفسر کو زیب نہیں دیتی۔

انہیں حکم دیا کہ وہ فلسطین کی مقدس سرزمین کی طرف جائیں اور اس میں داخل ہو جائیں لیکن بنی اسرائیل اس فرمان کے مطابق نہ گئے اور کہنے لگے جب تک ستمگار (قوم عمالقہ) وہاں سے باہر نہ چلے جائیں ہم اس زمین میں داخل نہیں ہوں گے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ حضرت موسیٰ سے کہنے لگے کہ تو اور تیرا خدا ان سے جنگ کرنے جاؤ جب تم کامیاب ہو جاؤ گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

حضرت موسیٰؑ ان کی اس بات سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور انہوں نے درگاہِ الٰہی میں شکایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چالیس سال تک بیابان (صحرائے سینا) میں اسی طرح سرگرداں رہے۔

ان میں سے ایک گروہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا۔ انہوں نے بارگاہِ خدا کا رخ کیا۔ خدا نے دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ جن میں سے بعض کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم نے تمہارے سر پر بادل سے سایہ کیا (وظللنا علیکم الغمام)۔ واضح ہے کہ وہ مسافر جو روزانہ صبح سے غروب تک سورج کی گرمی میں بیابان میں چلتا ہے وہ ایک لطیف سائے سے کیسی راحت پائے گا (وہ سایہ جو بادل کا ہو جس سے انسان کے لئے نہ تو فضا محدود ہوتی ہے اور نہ جو ہوا چلنے سے مانع ہو)۔ یہ صحیح ہے کہ بادل کے سایہ فگن ہونے کا احتمال ہمیشہ بیابان میں ہوتا ہے لیکن آیت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ایسا عام حالات کی طرح نہ تھا بلکہ وہ لطفِ خدا سے اکثر اس عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

دوسری طرف اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں چالیس سال کی طویل مدت سرگرداں رہنے والوں کے لئے غذا کی کافی و وافی ضرورت تھی۔ اس مشکل کو بھی خداوند عالم نے ان کے لئے حل کر دیا جیسا کہ اس آیت کے آخر میں کہتا ہے: ہم نے من و سلویٰ جو لذیذ اور طاقت بخش غذا ہے تم پر نازل کیا (وانزلنا علیکم المن والسلویٰ)۔ ان پاکیزہ غذاؤں سے جو تمہیں روزی کے طور پر دی گئی ہیں کھاؤ (اور حکم خدا کی نافرمانی نہ کرو اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو) (کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم) لیکن وہ پھر بھی شکر گزاری کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے (تاہم) انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کیا ہے (وما ظلمونا ولٰکن کانوا انفسہم یظلمون)۔

من و سلویٰ کی تفسیر مندرجہ ذیل نکات میں تفصیل سے بیان کی جائے گی۔

چند اہم نکات

(۱) آزاد ماحول کی زندگی: اس سے قطع نظر کہ بادل ان پر کیسے سایہ کرتا تھا اور من و سلویٰ کیا تھے، اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ایک بہت بڑی قوم کے لوگ جو سالہا سال سے کمزوری، ذلت اور زبوں حالی میں بغیر ارادہ و خواہش کے مجبوراً فرعونیوں کے محلات میں خدمت کرتے تھے یا ان کے کھیتوں اور باغوں میں زحمت و تکلیف اٹھاتے تھے طبعی بات ہے کہ وہ اس قابل نہ تھے کہ فوراً تمام گذشتہ اخلاق و عادات سے آزاد ہو کر انقلابی بنیاد پر ایک مستقل خدائی حکومت قائم کریں۔ بہرصورت اس قوم کے لئے ضروری تھا کہ گذشتہ رسومات کے خاتمے اور قابلِ اعتماد زندگی گذارنے کی تیاری کے لئے برزخ کا ایک زمانہ گزارے چاہے یہ زمانہ چالیس سال یا اس سے کم و بیش ہو۔ اگر قرآن اس کا سزا کے طور پر تعارف کراتا ہے تو بھی یہ اصلاح کرنے والی

اور بیدار کرنے والی سزا ہے کیونکہ خدا کی طرف سے جتنی سزائیں ہیں ان میں انتقام کا جذبہ کار فرما نہیں ہوتا۔

چاہیئے تھا کہ وہ سالہا سال اس بیابان جسے ان کی سرگردانی کی وجہ سے "تیہ" کہا جانے لگا تھا میں رہیں تاکہ ستمگروں کے ہر قسم کے تسلط سے دور رہیں اور ان کی نئی نسل توحیدی و انقلابی خصوصیات کے ساتھ پرورش پائے اور مقدس سرزمینوں پر حکومت کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

(۱۱) من و سلویٰ کیا ہے: مفسرین نے ان دو الفاظ کی تفسیر میں بہت سی باتیں کہی ہیں جن سب کے ذکر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کے لغوی معنی اور وہ تفسیر جو زیادہ فصیح نظر آتی ہے اور آیات کے قرائن سے زیادہ ہم آہنگ ہے بیان کریں۔

بعض کے بقول لغت میں "من" شبنم کی طرح کے ان چھوٹے چھوٹے قطرات کو کہتے ہیں جو درختوں پر گرتے ہیں اور میٹھا ذائقہ رکھتے ہیں۔[۱] یا بعض دوسروں کے بقول یہ ایک قسم کا صمغ (درخت کا شیرہ) ہے جس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا ذائقہ میٹھا لیکن ترشی سے ملا ہوا تھا۔

"سلویٰ" کے اصل معنی تو ہیں اطمینان اور تسلی۔ بعض ارباب لغت اور بہت سے مفسرین نے اسے ایک قسم کا پرندہ (بٹیر یا تیتر) قرار دیا ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ سے منقول ایک روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا:

"الکمأۃ من المن"

کھمبی کی قسم کی ایک چیز تھی جو اس زمین میں اگتی تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ "من" سے مراد وہ تمام نعمتیں جو خدا نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں اور سلویٰ وہ تمام عطیات ہیں جو ان کی راحت و آرام اور اطمینان کا سبب تھے۔

تورات میں ہے کہ "من" دھنیے کے دانوں جیسی کوئی چیز ہے جو رات کو اس سرزمین پر آگرتی تھی۔ بنی اسرائیل اسے اکٹھا کرکے پیس لیتے اور اس سے روٹی پکاتے تھے جس کا ذائقہ روغنی روٹی جیسا ہوتا تھا۔

ایک احتمال اور بھی ہے کہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے زمانے میں خدا کے لطف و کرم سے جو نفع بخش بارشیں برستی تھیں ان کے نتیجے میں درختوں سے کوئی خاص قسم کا صمغ اور شیرہ نکلتا تھا اور بنی اسرائیل اس سے مستفید ہوتے تھے۔

بعض دیگر حضرات کے نزدیک "من" ایک قسم کا طبیعی شہد ہے اور بنی اسرائیل اس بیابان میں طویل مدت تک چلتے پھرتے رہنے سے شہد کے مخزنوں تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ بیابان تیہ کے کناروں پر پہاڑ اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں کافی طبیعی شہد نظر آجاتا تھا۔

عہدین (توریت اور انجیل) پر لکھی گئی تفسیر سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے کہ مقدس سرزمین قسم قسم کے پھولوں

---

[۱] مفردات راغب، مادہ من

اور شگوفوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی لئے شہد کی مکھیوں کے چھتے ہمیشہ پتھروں کے سوراخوں، درختوں کی شاخوں اور ٹوٹوں کے کھوروں پر جا بیٹھے ہیں اس طرح سے بہت فقیر و مسکین لوگ بھی شہد کھا سکتے ہیں۔[1]

اب ہم سلویٰ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اسے شہد کے ہم معنی لیا ہے لیکن دوسرے تقریباً سب مفسرین نے اسے پرندے کی ایک قسم قرار دیا ہے یہ پرندہ اطراف اور مختلف علاقوں سے کثرت سے اس علاقے میں آتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے گوشت سے استفادہ کرتے تھے عہدین پر لکھی گئی تفسیر میں بھی اس نظریے کی تائید دکھائی دیتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> معلوم ہونا چاہیئے کہ بہت بڑی تعداد میں سلویٰ افریقہ سے چل کر شمال کو جاتے ہیں۔ جزیرہ کاپری میں ایک فصل میں ۱۶ ہزار کی تعداد میں ان کا شکار کیا گیا۔ یہ پرندہ بحیرۂ قلزم کے راستے سے آتا ہے۔ خلیج عقبہ اور سویز کو عبور کرتا ہے ہفتے کو جزیرہ سینا میں داخل ہوتا ہے اور راستے میں اس قدر تکان و تکلیف جھیلنے کی وجہ سے آسانی سے ہاتھ سے پکڑا جا سکتا ہے اور جب پرواز کرتا ہے تو زیادہ تر زمین کے قریب ہوتا ہے۔ اس حصے کے متعلق (تورات کے) سفر خروج اور سفر اعداد میں گفتگو ہوئی ہے۔[2]

اس تحریر سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سلویٰ سے مراد وہی پُر گوشت پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ اور اس کے ہم وزن ہوتا ہے اور یہ پرندہ اس سرزمین میں مشہور ہے۔ البتہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے دنوں میں ان پر خدا کا یہ خاص لطف و کرم تھا کہ یہ پرندہ وہاں کثرت سے ہوتا تھا تاکہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔

چند اہم نکات

(۱) "انزلنا" کیوں کہا گیا: توجہ رہے کہ انزلنا سے مراد ہمیشہ اوپر سے نازل کرنا نہیں ہوتا جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۶ میں ہے:

> اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ ؕ
>
> چوپایوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لئے نازل کئے۔

ہم جانتے ہیں کہ چوپائے آسمان سے نہیں اترے۔ اس بناء پر ایسے موقع پر یہ نزول مقامی کے معنی میں ہے یعنی وہ نعمت جو ایک برتر مقام سے پست مقام کو دی جاتے اور چونکہ یہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں لہذا انہیں نزول سے تعبیر کیا گیا ہے اور یا پھر یہ مادہ انزال سے مہمان نوازی کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انزال و نُزُل (بروزن رُسُل) پذیرائی کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ واقعہ آیہ ۹۳ میں دوزخیوں کے دو گروہوں میں سے ایک کے بارے میں ہے:

---

[1] قاموس کتاب مقدس، ص ۶۱۲

[2] قاموس کتاب مقدس ص ۴۹۳

فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝

لہذا حمیم (دوزخ کا جلانے والا مشروب) اُن کی پذیرائی کے لئے پیش کیا جائے گا۔

نیز سورہ آل عمران آیہ ۱۹۸ میں اہل بہشت کے بارے میں ہے:

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ

وہ ہمیشہ بہشت میں خدا کے مہمان ہوں گے۔

بنی اسرائیل چونکہ درحقیقت اس سرزمین میں خدا کے مہمان تھے لہذا من و سلویٰ کے لئے نزول کی تعبیر ہی ان کے بارے میں منطبق ہوتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں نزول اپنے اسی مشہور معنی میں ہو کیونکہ یہ نعمتیں خصوصاً (سلویٰ) پرندے اوپر ہی سے ان کی طرف آتے تھے۔

(ii) "غمام" کیا ہے: بعض غمام اور سحاب دونوں کو بادل کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں لیکن بعض کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غمام سفید رنگ کے بادلوں کو کہا جاتا ہے اور بعض اس کی تعریف میں کہتے ہیں کہ غمام وہ بادل ہے جو زیادہ سرد اور زیادہ نازک ہوتا ہے جب کہ سحاب بادلوں کے ایسے اکٹھ کو کہتے ہیں جو غمام کے مدمقابل ہے۔ غمام اصل میں مادہ غم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپانا۔ بادل کو غمام کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ صفحۂ آسمان کو چھپا دیتا ہے۔ اندوہ کو بھی غم کہنے کی یہی وجہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو اپنے پردے میں چھپا لیتا ہے۔[1]

بہرحال ممکن ہے یہ تعبیر اس لئے ہو کہ بنی اسرائیل بادل کے سائے سے مستفید ہو رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ بادلوں کی سفیدی کی وجہ سے روشنی بھی چھن چھن کر ان تک پہنچ رہی تھی۔

(iii) من و سلویٰ کی ایک اور تفسیر: بعض مفسرین نے من و سلویٰ کی معروف تفسیر کی بجائے ایک اور تفسیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "من" سے مراد ناشکر گزاروں پر احسانِ مطلق اور بے شمار خدائی نعمت ہے اور سلویٰ سے مراد دل کا وہ اطمینان ہے جو خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے چنگل سے نجات عطا کر کے مرحمت فرمایا تھا۔[2]

یہ تفسیر تقریباً تمام مفسرین، اسلامی روایات اور کتب عہدین کے خلاف ہونے کے علاوہ آیت کے متن سے بھی میل نہیں کھاتی کیونکہ قرآن من و سلویٰ کے ذکر کے فوراً بعد بلا فاصلہ کہتا ہے: "کلوا من طیبات ما رزقناکم" یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ من و سلویٰ کھانے والی چیزوں میں سے ہے یہ تعبیر نہ صرف اس آیت میں ہے بلکہ بعینہ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ میں بھی آئی ہے۔

۵۸۔ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

---

[1] روح المعانی، زیر نظر آیات کے ذیل میں و مفردات راغب مادہ "غم"

[2] پرتوی از قرآن، ج ۱، ص ۱۶۵

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝

۵۹۔ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

ترجمہ

۵۸۔ اور (یاد کرو) اس وقت کو جب ہم نے کہا: اس بستی (بیت المقدس) میں داخل ہو جاؤ اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ اور (مسجد بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ اور کہو: خدایا! ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ تاکہ ہم تمہیں بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے۔

۵۹۔ ظالم لوگوں نے اس قول کو بدل دیا اور اس کی جگہ ایک اور (استہزاء آمیز) جملہ کہنے لگے لہٰذا ہم نے ستمگروں پر اس نافرمانی کے باعث آسمان سے عذاب بھیجا۔

تفسیر

اس مقام پر ہمارا سابقہ بنی اسرائیل کی زندگی کے ایک اور مرحلے سے پڑتا ہے جو سرزمین مقدس میں ان کے داخلے سے مربوط ہے۔

پہلی آیت کہتی ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ان سے کہا کہ اس بستی (سرزمین قدس) میں داخل ہو جاؤ (واذ قلنا ادخلوا ھٰذہ القریۃ)۔

لفظ قریہ اگرچہ روزمرہ میں بستی کے معنی میں ہے لیکن قرآن اور لغت عرب میں ہر اس محل و مقام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ جمع ہوں چاہے وہ بڑے شہر ہوں یا بستیاں یہاں مراد بیت المقدس اور قدس کی سرزمین ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: اس کی فراواں نعمتوں میں سے جتنا چاہو کھاؤ (فکلوا منھا حیث شئتم رغداً) اور (بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ گزر جاؤ (وادخلوا الباب سجداً) اور کہو: خدایا! ہمارے گناہوں کو بخش دے (وقولوا حطۃ)۔ تاکہ ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں اور ہم نیک لوگوں کو زیادہ بدلہ دیں گے (نغفر لکم خطٰیکم و سنزید المحسنین)۔

متوجہ رہنا چاہیے کہ لفظ حطہ لغوی لحاظ سے جھاڑنے اور نیچے گرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ خدایا! ہم تجھ سے اپنے گناہوں کے گرنے کی خواہش کرتے ہیں۔

خدا نے انہیں حکم دیا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے یہ جملہ سچے دل سے زبان پر جاری کریں اور ان سے وعدہ کیا کہ اس حکم پر عملدر آمد کی صورت میں ان کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ شاید اسی مناسبت سے بیت المقدس کے

ایک دروازے کا نام باب الحطہ رکھا گیا ہے جیسا کہ ابوحیان اندلسی نے بیان کیا ہے:

باب سے مراد بیت المقدس کا ایک دروازہ ہے جو باب حطہ کے نام سے مشہور ہے[1]

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے کہ نیک لوگوں کے لئے مغفرت اور گناہوں کی بخشش کے ساتھ ساتھ ہم اجر میں مزید اضافہ کریں گے (وسنزید المحسنین)۔

بہر حال خداوند عالم نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ گناہوں سے توبہ کے لئے خدا کی بارگاہ میں خضوع کے طور پر یہ جملہ بھی سچے دل سے زبان پر جاری کریں جو توبہ اور تقاضائے عفو کی دلیل ہے اور ان سے وعدہ کیا کہ اس حکم پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ان کے گناہوں کو بخش دے گا بلکہ یہاں تک کہ ان کے پاک اور نیکوکار لوگوں کو گناہوں کی بخشش کے علاوہ دوسرا اجر بھی دیگا۔

لیکن جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کو جانتے ہیں، ان میں سے ایک گروہ نے یہ لفظ ادا کرنے کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کی بجائے استہزاء کے طور پر ایک نامناسب لفظ کہنے لگے لہٰذا قرآن کہتا ہے: رہے وہ لوگ جو ظالم و ستمگر تھے انہوں نے اس لفظ کو کسی اور لفظ سے بدل دیا۔ (فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم) ہم نے بھی ان ستمگروں پر ان کے فسق و گناہ کی وجہ سے آسمان سے عذاب اتارا (فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون)

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے لفظ "رجز" دراصل اضطراب، انحراف اور بدنظمی کے معنیٰ میں ہے۔ یہ تعبیر خصوصاً اونٹ کے لئے اس وقت استعمال ہوتی ہے جب وہ اپنے پاؤں کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب نامنظم طور پر رکھے۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:

"رجز" دراصل حجاز کی لغت میں عذاب کے معنیٰ میں ہے۔

وہ نبی اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو طاعون کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمائی:

انہ رجز عذب بہ بعض الامم من قبلکم

یہ ایک قسم کا عذاب ہے جو تم سے پہلے کی بعض امتوں پر نازل ہوا تھا[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض روایات میں زیر بحث آیت میں لفظ رجز کو ایک قسم کا طاعون کیوں قرار دیا گیا ہے، جو تیزی سے بنی اسرائیل میں پھیلا اور اس نے ایک گروہ کو ختم کر دیا۔

ممکن ہے کہا جائے کہ طاعون کی بیماری ایسی چیز نہیں ہے جو آسمان سے نازل ہو۔ ہو سکتا ہے بنی اسرائیل کی طرف طاعون کے جراثیم ان کے گرد چلنے والی ہوا میں موجود غلیظ گرد و غبار میں شامل ہوں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ طاعون کے دردناک عوارض

---

[1] صاحب تفسیر الکاشف نے زیر نظر آیت کے ذیل میں ابوحیان کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲ میں بھی لفظ رجز کے معنیٰ پر بحث کی گئی ہے۔

میں سے یہ بھی ہے کہ اس بیماری کے عالم میں لوگ گفتگو اور چلنے پھرنے میں بدنظمی اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں جو اس لفظ کے اصلی معنی کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مندرجہ بالا آیات میں "فانزلنا علیھم" کی بجائے "فانزلنا علی الذین ظلموا" (جنہوں نے ظلم کیا ہم نے ان پر عذاب نازل کیا) کہہ کر یہ واضح کرتا ہے کہ اس عذاب اور خدائی سزا نے صرف بنی اسرائیل کے ستمگاروں کو ہی اپنی گرفت میں لیا اور سب خشک و تر اس میں نہیں جکڑے گئے۔ اس کے علاوہ آخر آیت میں جملہ "بما کانوا یفسقون" آیا ہے تاکہ اس موضوع کی مزید تاکید ہو جائے کہ ان کا ظلم و فسق ہی ان پر سزا و عذاب کی علت اور سبب ہے۔

اس طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہ اس جملے کے مذکورہ صیغے نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ان برے اعمال پر مصر تھے اور ہمیشہ کے لئے ان پر کاربند تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ جب عادت کی شکل اختیار کر لے اور حالت و کیفیت کے طور پر معاشرے میں مرتکز ہو جائے تو اس وقت عذاب الٰہی نازل ہونے کا احتمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔

۶۰۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

ترجمہ

۶۰۔ اور (وہ زمانہ کہ) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنے عصا کو مخصوص پتھر پر مارو اچانک اس سے بارہ چشمے ابلنے لگے (اس طرح کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے) سب لوگ اپنے اپنے مخصوص چشمے کو پہچانتے تھے، (اور ہم نے کہا) خدا کی روزی میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرو اور نہ ہی فساد پھیلاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں بنی اسرائیل پر کی گئی ایک اور نعمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے (اس خشک اور جلانے والے بیابان میں جس وقت بنی اسرائیل پانی کی وجہ سے سخت تنگی میں مبتلا تھے) پانی کی درخواست کی (واذ استسقیٰ موسیٰ لقومہ)، تو خدا نے اس درخواست کو قبول کیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنا عصا مخصوص پتھر پر مارو (فقلنا اضرب بعصاک الحجر) اس پر اچانک پانی ابلنے لگا اور پانی کے بارہ چشمے زور و شور سے جاری ہو گئے (فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا)۔

بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے عین مطابق جب یہ چشمے جاری ہوئے تو ایک چشمہ ایک قبیلے کی طرف جھک جاتا تھا جس پر بنی اسرائیل کے لوگوں اور قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے چشمے کو پہچان لیا (قد علم کل اناس مشربھم)۔

یہ پتھر کس قسم کا تھا، حضرت موسیٰ کس طرح اس پر عصا مارتے تھے اور پانی اس میں سے کیسے جاری ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں

بہت کچھ گفتگو کی گئی ہے قرآن جو کچھ اس بارے میں کہتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ موسیٰؑ نے اس پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہوگئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک کوہستانی علاقے کے ایک حصے میں واقع تھا جو اس بیابان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ کی تعبیر "انبجست" اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابتدا میں اس پتھر سے تھوڑا تھوڑا پانی نکلا بعد میں زیادہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ ان کے جانور جو ان کے ساتھ تھے اور وہ کھیتی جو انہوں نے احتمالاً اس بیابان کے ایک حصے میں تیار کی تھی، سب اس سے سیراب ہوگئے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوہستانی علاقے میں پتھر کے ایک حصے سے پانی جاری ہوا البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ سب معجزے سے رونما ہوا۔

دوسرا قول جو کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک مخصوص قسم کا تھا جسے بنی اسرائیل اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے تھے۔ جہاں انہیں پانی کی ضرورت ہوتی اسے زمین پر رکھ دیتے اور حضرت موسیٰؑ اپنا عصا اس پر مارتے اور اس سے پانی جاری ہو جاتا تو قرآن کی آیات میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے اگرچہ بعض روایات میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔ تورات کی سترھویں فصل میں سفر خروج کے ذیل میں بھی یوں لکھا ہے:

> خدا نے موسیٰ سے کہا: قوم کے آگے آگے رہو اور اسرائیل کے بعض بزرگوں کو ساتھ لے لو اور وہ عصا جسے نہر پر مارا تھا ہاتھ میں لے کر روانہ ہو جاؤ۔ میں وہاں تمہارے سامنے کوہ حدیب پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور اسے پتھر پر مارو، اس سے پانی جاری ہو جائے گا۔ تاکہ قوم پی لے اور موسیٰؑ نے اسرائیل کے مشائخ اور بزرگوں کے سامنے ایسا ہی کیا۔[1]

بہرحال ایک طرف خداوند عالم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا اور دوسری طرف انہیں فراواں پانی عطا کیا اور ان سے فرمایا: خدا کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ پیو لیکن زمین میں خرابی اور فساد نہ کرو (کلوا واشربوا من رزق اللّٰہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

گویا یہ آیت انہیں متوجہ کرتی ہے کہ کم از کم ان عظیم نعمتوں کی شکرگزاری کے طور پر ضدی پن، ستمگری، انبیاء کو ایذا رسانی اور بہانہ سازی ترک کرو۔

چند اہم نکات

(۱) "تعثوا" اور "مفسدین" میں فرق: "تعثوا" کا مادہ "عثی" (بروزن مسی) ہے۔ جس کے معنی ہیں شدید فساد۔ البتہ یہ لفظ زیادہ تر اخلاقی اور روحانی مفاسد کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ مادہ "عیث" جو حسی کے طور پر اس کے مشابہ ہے زیادہ تر حسی مفاسد کے لئے بولا جاتا ہے۔ لہٰذا "لا تعثوا" کے معنی بھی "مفسدین" کے ہیں لیکن تاکید اور زیادہ شدت کے ساتھ۔

---

[1] فصل ۱۷، سفر خروج، جملہ ۵ و ۶۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ فساد ابتدا میں ایک چھوٹے سے نقطے سے شروع ہوتا ہے پھر اس میں وسعت اور پھیلاؤ آجاتا ہے اور اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک وہی چیز ہے جو لفظ "تعثوا" سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں "مفسدین" فساد انگیز پروگرام کے آغاز کی طرف اور "تعثوا" اس کے دوام و استمرار اور اسے وسعت دینے کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۱) بنی اسرائیل کی زندگی میں خلافِ معمول واقعات: بعض لوگ جو منطق اعجاز سے واقف نہیں وہ اتنے پانی اور اتنے چشموں کے ایک پتھر سے ابلنے اور جاری ہونے کو بعید شمار کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل جن کا اہم ترحصہ معجزاتِ انبیاء پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم اسے اپنے مقام پر بیان کر چکے ہیں، کوئی امر محال یا علت و معلول کے قانون میں کوئی استثناء نہیں ہے بلکہ صرف ایک خارق عادت چیز ہے یعنی اس علت و معلول کے خلاف ہے جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عالم ہستی اور نظامِ علت و معلول کو پیدا کرنے والا اس پر حاکم ہے نہ کہ اس کا محکوم خود ہماری روزمرہ زندگی میں موجودہ علت و معلول کے نظام کے استثنائی واقعات تھوڑے نہیں ہیں[1]

(۱۱۱) "انفجرت" اور "انبجست" میں فرق: زیر بحث آیت میں "انفجرت" استعمال ہوا ہے جب کہ سورہ اعراف آیہ ۱۶۰ میں اس کی جگہ "انبجست" آیا ہے۔ پہلے کا معنی ہے پانی کا سوتہ بہاؤ اور دوسرے کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا اور آرام سے جاری ہونا۔ ممکن ہے دوسری آیت اس پانی کے جاری ہونے کے ابتدائی مرحلے کی طرف اشارہ ہو تاکہ پریشانی کا سبب نہ بنے اور بنی اسرائیل اسے اپنے کنٹرول میں کر سکیں اور "انفجرت" اس کے آخری مرحلے کی طرف اشارہ ہو جس سے مراد تیز بہاؤ ہے۔

کتاب مفرداتِ راغب میں آیا ہے کہ "انبجاس" وہاں بولا جاتا ہے جہاں پانی چھوٹے سے سوراخ سے نکل رہا ہو اور انفجار اس وقت کہتے ہیں جب پانی وسیع جگہ سے باہر آرہا ہو جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں یہ تعبیر اس سے پوری طرح سازگار ہے۔

۶۱۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟

---

[1] مزید وضاحت کے لئے کتاب "رہبرانِ بزرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

۶۱۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ہی قسم کی غذا پر اکتفا کریں اپنے خدا سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین سے اگنے والی سبزیوں میں سے اور ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز اگائے۔ موسیٰ نے کہا: کیا بہتر غذا کے بجائے پست انتخاب کرتے ہو (اب اگر ایسا ہی ہے تو کوشش کرو اور اس بیابان سے نکل کر) کسی شہر میں داخل ہو جاؤ کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تو وہیں ہے۔ خداوند عالم نے ذلت و محتاجی (کی مہر) ان کی پیشانی پر لگا دی اور نئے سرے سے وہ غضب پروردگار میں مبتلا ہو گئے کیونکہ وہ آیات الٰہی سے کفر کرتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ گنہ گار، سرکش اور تجاوز کرنے والے تھے۔

تفسیر

ان نعمات فراواں کی تفصیل کے بعد جن سے خدا نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا، زیر نظر آیت میں ان عظیم نعمتوں کے بارے میں ان کے کفران اور ناشکرگزاری کی حالت کو منعکس کیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔ شاید تاریخ دنیا میں ایسی کوئی مثال ملے گی کہ کچھ لوگوں پر اس طرح سے الطاف الٰہی ہو لیکن انہوں نے اس طرح سے اس کے مقابلے میں ناشکرگزاری اور نافرمانی کی ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم سے ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی غذا پر قناعت کر لیں (من و سلویٰ کتنی ہی اچھی اور لذیذ غذا ہو ہم مختلف قسم کی غذا چاہتے ہیں) (واذ قلتم یموسیٰ لن نصبر علی طعام واحد) لہٰذا خدا سے خواہش کرو کہ وہ زمین سے جو کچھ اگایا کرتا ہے ہمارے لئے بھی اگائے سبزیوں میں سے، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز (فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلها وقثائها وفومها وعدسها وبصلها)۔

لیکن موسیٰ نے ان سے کہا: کیا تم بہتر کی بجائے پست تر غذا پسند کرتے ہو (قال اتستبدلون الذی هو ادنیٰ بالذی هو خیر)۔ جب معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر اس بیابان سے نکلو اور کسی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرو کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ وہاں ہے (اهبطوا مصرا فان لکم ما سالتم)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا نے ان کی پیشانی پر ذلت و فقر کی مہر لگا دی (وضربت علیهم الذلة والمسکنة) اور وہ دوبارہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے (وباءو بغضب من الله)۔

یہ اس لئے ہوا کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے (ذلک بانهم کانوا یکفرون بایات الله ویقتلون النبیین بغیر الحق)، یہ سب اس لئے تھا کہ وہ گناہ، سرکشی اور تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے (ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون)۔

چند اہم نکات

(۱) **یہاں مصر سے کون سی جگہ مراد ہے :** بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ لفظ مصر اس آیت میں اپنے کلی مفہوم کی طرف اشارہ ہے یعنی تم اس وقت اس بیابان میں ایک خود سازی کے اور آزمائشی پروگرام میں شریک تھے۔ یہاں قسم قسم کی غذائیں نہیں ہیں لہذا شہروں میں جاؤ، وہاں چلو پھرو وہاں ہر چیز موجود ہے لیکن یہ خود سازی کا اور اصلاحی پروگرام وہاں نہیں ہے۔ وہ اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے کبھی شہر مصر کی طرف واپس جانے کا تقاضا نہ کیا اور نہ کبھی اس کی طرف واپس گئے۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی تفسیر کی ہے البتہ اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ تمہارا اس بیابان میں رہنا اور اس ایک قسم کی غذا سے استفادہ کرنا تمہاری کمزوری، ناتوانی اور زبوں حالی کی وجہ سے ہے۔ تم طاقت ور ہو، دشمنوں کے ساتھ جنگ کرو، شام کے شہر اور سرزمین مقدس ان سے چھین لو تاکہ تمہیں تمام چیزیں میسر آسکیں۔[2]

اس آیت کی تیسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ مراد وہی ملک مصر ہے یعنی اگر تم ایک قسم کی غذا سے اس بیابان میں فائدہ اٹھاتے ہو تو اس کے بدلے تمہارے پاس ایمان ہے اور تم آزاد و خود مختار ہو اور اگر یہ چیزیں نہیں چاہتے تو پلٹ جاؤ اور دوبارہ فرعونیوں یا ان جیسے لوگوں کے غلام اور قیدی بن جاؤ تاکہ ان کے دسترخوان سے بچی ہوئی قسم قسم کی غذائیں کھا سکو۔ تم شکم سیری اور کھانے پینے کے پیچھے لگے ہوئے ہو یہ نہیں سوچتے کہ اس وقت تم غلام اور قیدی تھے اور آج آزاد اور سربلند ہو۔ اب اگر حقیقت میں تم کچھ چیزوں سے محروم بھی ہو تو یہ آزادی کی قیمت ہے جو ادا کر رہے ہو۔[3]

لیکن اس سلسلے میں پہلی تفسیر ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس دلیل کی بناء پر جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

(۲) **کیا نت نئی چیز کی خواہش انسانی مزاج کا خاصہ نہیں :** اس میں شک نہیں کہ نت نئی چیز کی خواہش انسان کی زندگی کے لوازمات اور خصوصیات میں سے ہے یہ بات انسانی زندگی کا حصہ ہے کہ وہ ایک قسم کی غذا سے اکتا جاتا ہے لہذا یہ کوئی غلط نہیں پھر آخر بنی اسرائیل کیوں تنوع کی درخواست پر لائق سرزنش قرار پائے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتے کے ذکر سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی میں کھانا، سونا، شہوت اور طرح طرح کی لذتیں بنیادی چیز نہیں ہیں ایسے اوقات بھی آتے ہیں کہ ان امور کی طرف توجہ انسان کو اس کی اصلی غرض اور اولین مقصد سے دور کر دیتی ہے جو در اصل ایمان، پاکیزگی، تقویٰ اور اصلاح ذات ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسان ان تمام چیزوں کو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ نت نئی چیز کی خواہش در حقیقت کل کے اور آج کے استعمارگروں کا ایک بہت بڑا جال ہے اور خصوصاً آج کے زمانے میں اس تنوع طلبی سے استفادہ کیا جاتا ہے اور انسان کو قسم قسم کی غذاؤں، لباس، سواری اور مکان کی

---

[1] علاوہ ازیں لفظ "مصر" کی تنوین اس کے نکرہ ہونے کی دلیل ہے لہذا اس سے شہر مصر مراد نہیں ہو سکتا۔

[2] تفسیر المنار، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[3] تفسیر فی ظلال

خواہش کا اسیر بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے اور ان چیزوں کی قید کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔

(۱۶) کیا من و سلویٰ ہر غذا سے بہتر تھا : اس میں شک نہیں کہ مختلف سبزیوں کی غذا جس کا بنی اسرائیل حضرت موسیٰ سے تقاضا کرتے تھے انتہائی قیمتی تھی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کو صرف ایک پہلو سے نہیں دیکھنا چاہیئے کیا یہ درست ہے کہ انسان مختلف قسم کی غذاؤں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو قیدی بنالے۔

جب کہ ایک قول کے مطابق "من" ایک پہاڑی شہد ہے یا شہد کی طرح کی ایک طاقت بخش اور مفید میٹھی چیز ہے یہ ایک مفید ترین اور طاقت سے بھرپور غذا تھی۔ اس میں تازہ گوشت میں موجود پروٹین کے اجزاء بھی ایک خاص پرندے سلویٰ کی صورت میں موجود تھے بلکہ وہ کئی جہت سے عام طور پر موجود پروٹین کے اجزاء سے بہتر تھے کیونکہ "من" کا ہضم ہونا بہت آسان ہے جب کہ سلویٰ کے ہضم کے لئے معدے کے کارخانے کو تھکا دینے والی فعالیت کی ضرورت ہے۔[1]

اس ضمن میں متوجہ رہنا چاہیئے کہ لفظ "فوم" جو بنی اسرائیل کے تقاضوں میں سے ہے بعض نے اس کے معنی گندم اور بعض نے لہسن بیان کئے ہیں البتہ ان میں سے ہر ایک خصوصی امتیاز رکھتا ہے لیکن بعض کا نظریہ ہے کہ گندم زیادہ صحیح ہے کیونکہ بعید ہے کہ انہوں نے ایسی غذا طلب کی ہو جس میں گندم نہ ہو۔[2]

(۱۷) ذلت کی مہر بنی اسرائیل کی پیشانی پر کیوں ثبت کی گئی : مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دو لحاظ سے خواری اور ذلت میں گرفتار ہوئے۔ ایک تو یہ ان کا کفر اختیار کرنا، احکام خدا کی خلاف ورزی کرنا اور توحید سے شرک کی طرف منحرف ہونا اور دوسرا یہ کہ وہ حق والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نمائندوں کو قتل کرتے تھے۔ یہ سنگدلی، قساوت اور قوانین الٰہی بلکہ نوع انسانی میں موجود تمام قوانین سے بے اعتنائی کی دلیل ہے جب کہ آج بھی یہودیوں کے ایک گروہ کے پاس وہ قوانین وضاحت سے موجود ہیں۔ یہی ان کی ذلت اور بدبختی کا سبب ہے۔[3]

یہودیوں کی سرنوشت اور ان کی ذلت آمیز زندگی کے بارے میں سورہ آل عمران آیہ ۱۱۲ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔[4]

---

[1] قرآن بر فراز قرون و اعصار، ص ۳

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] اس وقت جب کہ یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ لبنان کی اسلامی سرزمین یہودیوں کی دہشت انگیزیوں اور بربادی کی منظالم کی زد میں ہے۔ ہزاروں عورتیں بچے، بوڑھے اور جوان یہاں تک کہ ہسپتالوں کے بیمار وحشت انگیز طریقے سے جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ان کی لاشیں زمین پر بچھا دی ہیں۔ البتہ اس سنگدلی کا کفارہ انہیں عنقریب اسی دنیا میں ادا کرنا پڑے گا۔

[4] تفسیر نمونہ، ج ۲۔

۶۲- اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۶۲- جو ایمان لائے ہیں (مسلمان) اور یہودی نصاریٰ اور صابئین (حضرت یحییٰ، حضرت نوح یا حضرت ابراہیم کے پیروکار) جو بھی خدا اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح بجا لائے ان کی جزا و اجر ان کے پروردگار کے ہاں مسلم ہے اور ان کے لئے (آئندہ یا گذشتہ) کسی قسم کا خوف اور غم نہیں ہے اور ہر زمانے کے پیروکار جو اپنے عہد میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں ان کے لئے اجر ہے۔

تفسیر

بنی اسرائیل سے مربوط بحث میں در اصل قرآن ایک کلی اصول اور کلی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قدر و قیمت حقیقت و واقعیت کی ہے نہ کہ ظاہریت کی۔ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان خالص اور عمل صالح قابل قبول ہے۔ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں (مسلمان) اسی طرح یہودی، عیسائی اور صابئین (حضرت یحییٰ، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے پیروکار) جو بھی خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آئیں اور نیک عمل انجام دیں ان کا اجر و عوض پروردگار کے پاس مسلم ہے (ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصٰرٰی والصٰبئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم) لہٰذا انہیں آئندہ کا خوف ہے نہ گذشتہ کا غم (ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

یہ آیت تقریباً اسی عبارت کے ساتھ سورہ مائدہ کی آیہ ۶۹ میں آئی ہے اور کافی فرق کے ساتھ سورہ حج آیہ ۱۷ میں اس مفہوم کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت کے بعد کی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ یہودی اور عیسائی اتراتے تھے کہ ہمارا دین دیگر ادیان سے بہتر ہے اور وہ جنت کو بلا شرکت غیرے اپنے لئے مخصوص سمجھتے تھے اور شاید یہی فخر مسلمانوں کی ایک جماعت میں بھی تھا۔ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ ظاہری ایمان (اسلام) عمل صالح کے بغیر چاہے مسلمانوں کا ہو یا یہود و نصاریٰ یا کسی اور دین کے پیروکاروں کا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ خدا اور قیامت کے دن کی بڑی عدالت پر حقیقی اور خالص ایمان جو نیکی اور عمل صالح کے ساتھ ہو وہی خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کا حامل ہے۔ صرف یہی پروگرام جزا اور اطمینان و امان کا باعث ہے۔

ایک اہم سوال

بعض بہانہ ساز مذکورہ بالا آیت کو غلط افکار کے لئے دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ اسے صلح کل کے عنوان سے پیش

کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر مذہب کے پیرو کو اپنے ہی مذہب پر عمل کرنا چاہیئے لہٰذا ان کے نزدیک ضروری نہیں کہ یہودی، عیسائی یا دوسرے مذاہب کے پیروکار آج مسلمان ہو جائیں بلکہ اگر وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح انجام دیں تو کافی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے: ہم واضح طور پر جانتے ہیں کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ قرآن سورہ آل عمران آیہ ۸۵ میں کہتا ہے:

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ

اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اپنے لئے انتخاب کرے گا تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں قرآن یہود و نصاریٰ اور باقی ادیان کے ماننے والوں کو دعوت اسلام دینے والی آیات سے بھرا پڑا ہے۔ اگر مندرجہ بالا تفسیر صحیح ہو تو یہ قرآن کی بہت سی آیات سے صریح تضاد ہوگا لہٰذا ضروری ہے کہ اس آیت کے واقعی اور حقیقی معنی تلاش کئے جائیں۔

اس مقام پر دو تفسیریں سب سے زیادہ واضح اور مناسب نظر آتی ہے۔

(۱) پہلی یہ کہ اگر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے گروہ اپنی کتب کے مضامین پر عمل کریں تو مسلماً رسولِ اسلام پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان کتبِ آسمانی میں مختلف صفات و علامات کے ساتھ آپ کے ظہور کی بشارت موجود ہے جس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں آئے گی۔

سورہ مائدہ آیہ ۶۸ میں ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ

کہیے کہ اے اہل کتاب! تمہاری اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک تم تورات، انجیل اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے اسے قائم اور برقرار نہ رکھو (اور اس میں سے ایک رسول اسلام پر ایمان لانا ہے جن کے ظہور کی بشارت تمہاری کتب میں آچکی ہے)۔

(۲) دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس آیت کی نظر ایک سوال کی طرف ہے جو ابتدائے اسلام میں بہت سے مسلمانوں کو مدینہ میں درپیش تھا۔ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اگر راہِ حق و نجات فقط اسلام ہے تو ہمارے آباؤ اجداد کا کیا بنے گا۔ کیا پیغمبرِ اسلام کو نہ پہچاننے اور ان پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں سزا و عذاب کا سامنا ہوگا۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے خبر دی کہ جو شخص اپنے زمانے میں اس وقت کے برحق نبی اور کتاب آسمانی پر ایمان لے آیا ہو اور اس نے عمل صالح انجام دیا ہو وہ نجات یافتہ لوگوں میں سے ہے اور اس کے لئے فکر و تردد کی کوئی بات نہیں۔

لہٰذا ظہورِ مسیحؑ سے پہلے کے مومنین اور عمل صالح انجام دینے والے یہودی نجات یافتہ ہیں اور یہی صورت ظہور رسولِ اسلام سے پہلے کے عیسائی مومنین کی ہے۔

یہی مفہوم مذکورہ آیت کی شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

چند اہم نکات

(۱) حضرت سلمان کی عجیب و غریب سرگذشت: اس آیت کی تفسیر میں جو شان نزول بیان ہوا ہے اُسے یہاں ذکر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

تفسیر جامع البیان (طبری) جلد اول میں منقول ہے:

سلمان اہل جندیشا پور میں سے تھے۔ حاکم وقت کے بیٹے سے ان کی پکی اور نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی۔ ایک دن اکٹھے شکار کے لئے جنگل کی طرف گئے۔ اچانک ان کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ انہوں نے اس شخص سے اس کتاب کے متعلق کچھ سوالات کئے تو راہب نے اُن کے جواب میں کہا: یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں خدا کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی نافرمانی اور معصیت سے منع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں زنا، چوری اور لوگوں کا مال ناحق کھانے سے روکا گیا ہے۔ یہ وہی انجیل ہے جو عیسیٰ مسیح پر نازل ہوئی ہے۔

راہب کی گفتگو نے ان کے دل پر اثر کیا اور بہت تحقیق کے بعد وہ دونوں اس کے دین کے پیرو ہو گئے۔ اُس نے انہیں حکم دیا کہ اس سرزمین کے لوگوں کی ذبح کی ہوئی بھیڑ بکریوں کا گوشت حرام ہے۔

سلمان اور حاکم وقت کا بیٹا روزانہ اس سے مذہبی مسائل سیکھتے تھے۔ عید کا دن آگیا۔ حاکم نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں اشراف اور بزرگان شہر کو دعوت دی گئی اور اس سلسلے میں اس نے اپنے بیٹے سے بھی خواہش کی کہ وہ اس دعوت میں شرکت کرے لیکن اس نے قبول نہ کی۔ اُس نے بہت اصرار کیا تو لڑکے نے بتایا کہ یہ غذا میرے لئے حرام ہے۔ اس نے پوچھا تمہیں یہ حکم کس نے دیا ہے اس پر اُس نے راہب کا تعارف کرایا۔ حاکم نے راہب کو بلوایا اور اس سے کہا: چونکہ قتل ہماری نگاہ میں ایک بہت بڑا اور بُرا کام ہے لہٰذا ہم تمہیں قتل نہیں کرتے لیکن تم ہمارے علاقے سے نکل جاؤ۔

سلمان اور ان کے دوست نے اس موقع پر اس راہب سے ملاقات کی اور دوسری ملاقات کا پروگرام دیر موصل میں طے پایا۔

راہب کے چلے جانے کے بعد سلمان چند روز تو اپنے باوفا دوست کے منتظر رہے اور وہ بھی سفر کی تیاریوں میں سرگرم تھا لیکن سلمان آخر کار زیادہ صبر نہ کر سکے اور چل پڑے ...

موصل کے گرجے میں سلمان بہت زیادہ عبادت کرتے تھے راہب مذکور جو اس گرجے کا مالک تھا اس نے سلمان کو زیادہ عبادت سے روکنا چاہا اور کہا: کہیں تم ناکارہ ہی نہ ہو جاؤ۔ لیکن سلمان نے اس سے سوال کیا کہ زیادہ عبادت کی فضیلت زیادہ ہے یا کم عبادت کی؟ تو اس نے کہا کہ فضیلت تو زیادہ عبادت ہی کی زیادہ ہے۔

اس کے بعد وہ راہب جو گرجے کا مالک تھا اور وہاں پر موجود دوسرے راہبوں جتنی عبادت نہیں کر

سکتا تھا اس گرجے سے دوسری جگہ چلا گیا اور گرجے کے عالم کو سلمان کے بارے میں سفارش کر گیا۔

کچھ عرصے بعد گرجے کا وہ عالم بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے چلا اور سلمان کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہاں اس نے سلمان کو حکم دیا کہ دن میں علمائے نصاریٰ کے درس میں جائیں اور تحصیل علم و دانش کریں۔ وہ درس وہیں مسجد میں منعقد ہوتے تھے۔

ایک دن اس عالم نے سلمان کو رنجیدہ پایا تو اس کا سبب دریافت کرنے لگا۔ سلمان نے جواب میں کہا: نیکیاں تو گذشتہ لوگوں کے نصیب میں تھیں جو پیغمبران خدا کی خدمت میں رہتے تھے۔ عالم دین نے اسے بشارت دی کہ انہی دنوں ملت عرب میں ایک پیغمبر ظہور کرنے والا ہے جو تمام انبیاء سے برتر و بالا ہے۔ عالم مذکور نے مزید کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھے امید نہیں کہ میں انہیں مل سکوں لیکن تم جوان ہو تم انہیں پا سکو گے۔

مزید کہنے لگا: اس پیغمبر کی کئی ایک نشانیاں ہیں۔ ان میں سے خاص نشانی اس کے کندھے پر ہے۔ وہ صدقہ نہیں لیتا اور ہدیہ قبول کرتا ہے۔

موصل کی طرف واپسی کے دوران ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آنے کے نتیجے میں سلمان سے عالم دیر کہیں بیابان میں کھو گیا۔

حلب کے دو عرب قبیلے وہاں پہنچے۔ انہوں نے سلمان کو قید کر لیا اور اونٹ پر سوار کرکے مدینے لے آئے اور انہیں قبیلہ "جہینہ" کی ایک عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔

سلمان اور اس عورت کا ایک غلام باری باری اس عورت کا گلہ روزانہ چرانے کے لئے لے جاتے تھے سلمان نے اس مدت میں کچھ رقم جمع کر لی اور پیغمبر اسلام کی بعثت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک روز وہ ریوڑ چرانے میں مشغول تھے کہ ان کا ساتھی آیا اور کہنے لگا: تمہیں معلوم ہے آج ایک شخص مدینے میں آیا ہے جس کا خیال ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور خدا کا بھیجا ہوا ہے۔

سلمان نے اپنے ساتھی سے کہا: تم یہاں رہو، میں ہو کر آتا ہوں۔ سلمان شہر میں داخل ہوئے۔ پیغمبر اکرمؐ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ کے گرد چکر لگا رہے تھے اور منتظر تھے کہ پیغمبرؐ کا کرتہ آپؐ کے کندھے سے کسی طرح ہٹے اور آپؐ کے کندھے کے درمیان مخصوص نشان دیکھ سکیں۔ پیغمبرؐ ان کی خواہش کی طرف متوجہ ہوئے، آپؐ نے کرتہ اٹھایا تو سلمان نے وہ نشان (مہر نبوت) دیکھا یعنی پہلی نشانی دیکھ لی۔

پھر وہ بازار چلے گئے۔ کچھ گوشت اور روٹی خریدی اور رسول اللہؐ کی خدمت میں لے آئے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا کیا ہے۔ سلمان نے جواب دیا صدقہ ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں، غریب مسلمانوں کو دے دو تاکہ وہ اسے استعمال کریں۔

سلمان دوبارہ بازار گئے پھر کچھ گوشت اور روٹی خریدی اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں لے آئے۔

رسول اللہؐ نے پوچھا کیا ہے۔ سلمان نے جواب دیا ہدیہ ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ آنحضرتؐ اور حاضرین نے اس ہدیہ میں سے کھایا۔

سلمان پر مقصد واضح ہو گیا کیونکہ اسے اپنی تینوں نشانیاں مل گئیں۔ دورانِ گفتگو سلمان نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور دیر موصل کے راہبوں کے متعلق باتیں کیں۔ ان کی نماز، روزہ، پیغمبر پر ایمان اور آپؐ کی بعثت کے بارے میں ان کے انتظار کا حال سنایا۔ کسی نے سلمان سے کہا کہ اگر وہ پیغمبر کو پا لیتے تو آپؐ کی پیروی کرتے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریمؐ پر زیر بحث آیت نازل ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ادیانِ حق پر حقیقی ایمان رکھتے تھے لیکن وہ پیغمبر اسلامؐ کو نہیں پا سکے انہیں کیا اجر ملے گا۔

(۲) صابئین کون ہیں؟: مشہور عالم راغب مفردات میں لکھتا ہے:

یہ ایک گروہ ہے جو حضرت نوحؑ پیغمبر کا پیروکار تھا۔

ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ کرنا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ لوگ کسی آسمانی دین کے پیرو تھے اور خدا و قیامت پر ایمان رکھتے تھے۔

رہا کہ بعض لوگ انہیں مشرک اور ستارہ پرست کہتے ہیں یا بعض اور لوگ انہیں مجوسی کہتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ حج کی آیت ۱۷ مشرکین اور مجوسیوں کو صابئین کے مدمقابل قرار دیتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یوں ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ...

لہٰذا یہ مجوس اور مشرکین کے علاوہ ایک مستقل گروہ ہے۔

صابئین کون لوگ ہیں —— اس بارے میں مفسرین اور ادیان شناس لوگوں کے مختلف اقوال ہیں اور اس لفظ (صابئین) کا اصل مادہ کیا ہے۔ اس بارے میں بھی بحث ہے۔

شہرستانی نے کتاب "ملل و نحل" میں لکھا ہے کہ صابئہ "صبأ" سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ گروہ حق سے ٹیڑھا ہو گیا تھا اور یہ لوگ راہِ انبیاء سے منحرف ہو گئے تھے۔

"اس بنا پر انہیں "صابئہ" کہا گیا ہے۔

فیومی کی مصباح المنیر میں ہے کہ صبا، کا معنیٰ ہے: وہ شخص جو ایک دین سے نکل کر دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے۔ "فرہنگ دہخدا" میں اس بات کی تائید کی گئی ہے کہ یہ کلمہ عبری ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ "صابئین" جمع ہے "صابی" عبری کی اور اصل عبری (ص ب ع) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی میں ڈوب جانا یعنی تعمید کرنے والے[1]

جب اس لفظ کو عربی بنایا گیا تو اس کی "ع" ساقط ہو گئی اور "مغتسلہ" جو ایک فرقہ ہے اس آئین کے پیروکاروں

---

[1] غسل تعمید عیسائیوں کے ہاں بچوں اور نئے عیسائی ہونے والوں کو دیتے ہیں۔ مترجم

کے ایک مقام کا نام تھا جو خوزستان میں ہے وہ کلمہ "صابی" کا جامع اور صحیح ترجمہ ہے۔
جدید اور معاصر محققین بھی اسے عبری لفظ سمجھتے ہیں۔
"دائرۃ المعارف" فرانسیسی، جلد چہارم صفحہ ۲۲ میں اس لفظ کو عبری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس میں اس لفظ کے معنی پانی کے اندر جانا یا تعمید بیان کئے گئے ہیں۔
ژسینوس سلمانی کہتا ہے: یہ لفظ اگرچہ عبری ہے تاہم احتمال ہے کہ ایسی اصل سے مشتق ہو جس کا معنی ستارہ ہے۔
"کشاف اصطلاح الفنون" کا مؤلف کہتا ہے صابئین ایک گروہ ہے جس کے لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، زبور پڑھتے تھے اور قبلہ کی طرف منہ کرتے تھے۔
کتاب "التنبیہ والاشراف" ص ۱۹۹ پر امثال و حکم کا تذکرہ کرتے ہوئے ابتداء میں کہا گیا ہے کہ زرتشت نے جب مجوس آئین و دین گشتاسب کے سامنے پیش کیا اور اس نے قبول کیا اس سے قبل اس ملک کے لوگ "حنفاء" مذہب کے پیرو تھے۔ اور وہ صابئین تھے۔ یہ وہ مذہب ہے جسے "بوذاسب" نے "طہورس" کے زمانے میں پیش کیا تھا۔
اس گروہ کے بارے میں اختلافات اور ایسی گفتگو کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جمعیت تھوڑی تھی، وہ اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مصر تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ سے منع کرتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان کا مذہب خصوصی ہے عمومی نہیں اور ان کا پیغمبر انہی کی نجات کے لئے مبعوث ہوا ہے اور بس۔
یہی وجہ ہے کہ ان کی حالت ایک بھید ہی رہی اور ان کی جمعیت بھی روز بروز ختم ہوتی گئی اور یہ بھی کہ ان کے ہاں مفصل غسل اور طولانی تعمیدوں جیسے خاص احکام تھے یہ انہیں سردیوں اور گرمیوں میں انجام دینا پڑتے تھے۔ وہ اپنے ہم مذہب کے علاوہ کسی سے شادی حرام سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں حتی الامکان رہبانیت اور عورتوں سے ترک مباشرت کا تاکیدی حکم تھا اور مسلمانوں سے زیادہ میل جول کی وجہ سے اپنے مذہب کو بدل دیتے تھے۔

(۳) صابئین کے عقائد: ان کے مندرجہ ذیل اہم عقائد تھے:
ان کا اعتقاد تھا کہ پہلی مقدس آسمانی کتاب حضرت آدمؑ پر نازل ہوئی، پھر حضرت نوحؑ پر، ان کے بعد سامؑ پر، پھر رامؑ پر، اس کے بعد ابراہیم خلیل اللہؑ پر، پھر حضرت موسیٰؑ اور اس کے بعد یحییٰ بن زکریاؑ پر نازل ہوئی۔ وہ مقدس کتابیں جو ان کی نگاہ میں اہمیت رکھتی ہیں یہ ہیں:
۱۔ "کنیزا ربا" اس کتاب کو "سدرہ" یا "مصحف آدمؑ" بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب خلقت کی کیفیت اور موجودات کی پیدائش کے بارے میں بحث کرتی ہے۔
۲۔ کتاب "اورافشادہی" یا "سدرادہی"۔ یہ حضرت یحییٰؑ کی زندگی، ان کے احکامات اور تعلیمات کے بارے میں ہے۔
ان کا اعتقاد ہے کہ یہ کتاب جبرئیلؑ کے ذریعہ حضرت یحییٰؑ پر وحی و الہام ہوئی۔
۳۔ کتاب "قلستا" یہ شادی بیاہ کے مراسم کے بارے میں ہے۔
ان کے پاس اور بھی بہت سی کتابیں ہیں اختصار کے لئے ان سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔

محققین کے نزدیک اس دین کے پیروکاروں کی کیفیت دیکھ کر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یحیٰؑ بن زکریاؑ کے پیرو ہیں۔ اس وقت اس مذہب کے پیرو تقریباً پانچ ہزار افراد خوزستان (دریائے کارون کے کنارے)، اہواز، خرم شہر، آبادان اور شادگان وغیرہ میں رہتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے مذہب کو حضرت یحیٰؑ بن زکریاؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ مسیحی جنہیں "یحیٰؑ تعمید دہندہ" یا "یوحنای معمد" کہتے ہیں۔[1]

کتاب بلوغ الادب کا مؤلف کہتا ہے۔ صابئین ایک بہت بڑی قوم ہے اور ان کے بارے میں اختلاف اس مذہب کے افراد کی معرفت کے لحاظ سے ہے۔

سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جمعیت دو گروہوں مومن اور کافر میں تقسیم ہوتی ہے۔

یہ حضرت ابراہیم خلیلؑ کی وہی قوم ہے جس کی دعوت پر آپؑ مامور تھے۔ یہ لوگ "حران" میں جو صابئین کی سرزمین ہے زندگی گزارتے تھے اور دو طرح کے تھے صابئین حنیف اور صابئین مشرک۔

مشرک، ستاروں، آفتاب، ماہتاب . . . . کا احترام کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ نماز و روزہ کو بھی انجام دیتے تھے، کعبہ کو محترم سمجھتے تھے اور حج بھی بجالاتے تھے۔ یہ لوگ مردار، خون اور خنزیر کے گوشت نیز محارم سے نکاح کو مسلمانوں کی طرح حرام سمجھتے تھے۔ اس مذہب کے پیروکاروں میں سے کچھ لوگ بغداد میں حکومت کے اہم مناصب پر فائز تھے جن میں ایک ہلال بن محسن صابی بھی تھا۔

ان لوگوں نے اپنے گمان کے مطابق اپنے دین کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کی اچھائی لے لو اور اس کی برائی سے دور رہو۔ انہیں اسی بنا پر صابئین کہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو کسی دین کے تمام احکام کی انجام دہی کی قید سے سرکشی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ ایک لحاظ سے تمام ادیان کے موافق اور تمام ادیان کے مخالف ہیں۔

صابئین حنیف کا گروہ مسلمانوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اور ان کے مشرک بت پرستوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔

آخر بحث میں ہم دوبارہ ذکر کر دیں کہ اس گروہ کی دو قسمیں ہیں۔ صابئین مشرک اور صابئین حنیف۔ ان دونوں کے درمیان بہت مناظرے اور مباحثے ہوتے رہے ہیں۔[2]

مندرجہ بالا تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر کسی پیغمبر خدا کے پیروکار تھے اگرچہ جس سے وہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اس پیغمبر کے تعین میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ وہ بہت کم لوگ ہیں جو ختم ہونے کے قریب ہیں۔

۶۳۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے کتاب "آثار و حماسہ زرتشتی" کی طرف رجوع کریں۔

[2] اقتباس از بلوغ الادب ج ۲، ص ۲۲۸ و ۲۳۳۔

وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

۶۴- ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُم
مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○

ترجمہ

۶۳- اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا اور تمہیں کہا کہ) جو کچھ (آیات و احکام کی صورت میں) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) شاید اس طرح تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

۶۴- اس کے بعد پھر تم نے روگردانی کی اور اگر تم پر خدا کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

تفسیر

ان آیات میں بنی اسرائیل سے تورات میں شامل احکامات پر عمل کرنے کے عہد و پیمان اور پھر ان کی طرف سے اس پیمان کی خلاف ورزی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

کہا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا۔ (و اذ اخذنا میثاقکم) اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔ (ورفعنا فوقکم الطور) اور تمہیں کہا گیا کہ جو آیات الٰہی تمہیں دی گئی ہیں انہیں قدرت و قوت سے تھامو (خذوا ما اتینکم بقوۃ) اور اس میں جو کچھ ہے اسے غور و فکر سے دل میں یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) تاکہ پرہیزگار ہو جاؤ (واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون)۔

لیکن تم نے اپنے عہد و پیمان کو طاق نسیان کر دیا اور اس واقعے کے بعد روگرداں ہو گئے (ثم تولیتم من بعد ذلک) اور اگر خدا کا فضل و رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

چند اہم نکات

(۱) عہد و پیمان سے مراد: یہاں عہد و پیمان سے مراد و مقصود وہی ہے جس پر اس سورہ کی چالیسویں آیت میں بحث ہو چکی ہے اور آیت ۸۳ اور ۸۴ میں بھی ہو گی۔

اس عہد و پیمان میں یہ چیزیں شامل تھیں: پروردگار کی توحید پر ایمان رکھنا۔ ماں باپ، عزیز و اقارب، یتیم اور حاجتمندوں سے نیکی کرنا اور خونریزی سے پرہیز کرنا۔ یہ کلی طور پر ان صحیح عقائد اور خدائی پروگراموں کے بارے میں عہد و پیمان تھا جن کا تورات

میں ذکر کیا گیا تھا۔

سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ خدا نے یہودیوں سے پیمان لیا کہ وہ تمام انبیاء پر ایمان رکھیں گے اور ان کی کمک کریں گے اور راہ خدا میں صدقہ ادا کریں گے۔ نیز اس آیت کے آخر میں ضمانت دی گئی ہے کہ اس عہد پر عمل کریں گے تو اہل بہشت میں سے ہو جائیں گے۔

(۲) کوہ طور ان کے سروں پر مسلط کرنے سے کیا مقصود تھا: عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی، ابن زید کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں:

جس وقت حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے واپس آئے اور اپنے ساتھ تورات لائے تو اپنی قوم کو بتایا کہ میں آسمانی کتاب لے کر آیا ہوں جو دینی احکام اور حلال و حرام پر مشتمل ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے عملی پروگرام قرار دیا ہے۔ اسے لے کر اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس بہانے سے کہ یہ ان کے لئے مشکل احکام ہیں۔ یہودی نافرمانی اور سرکشی پر تل گئے۔ خدا نے بھی فرشتوں کو مامور کیا کہ وہ کوہ طور کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیں۔ اسی اثنا میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں خبر دی کہ عہد و پیمان باندھ لو، احکام خدا پر عمل کرو، سرکشی و بغاوت سے توبہ کرو تو تم سے یہ عذاب ٹل جائے گا ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ اس پر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ تورات کو قبول کیا اور خدا کے حضور سجدہ کیا۔ جب کہ ہر لحظہ وہ کوہ طور کے اپنے سروں پر گرنے کے منتظر تھے لیکن بالآخر ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

یہی مضمون سورہ بقرہ آیہ ۹۳ میں، سورہ نساء آیہ ۱۵۴ میں اور سورہ اعراف آیہ ۱۷۱ میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوہ طور کے بنی اسرائیل کے سروں پر مسلط ہونے کی کیفیت کے سلسلے میں مفسرین کی ایک جماعت کا اعتقاد ہے کہ حکم خدا سے کوہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور سائبان کی طرح ان کے سروں پر مسلط ہو گیا۔ (اعراف۔ ۱۷۱)[1] جب کہ بعض دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ میں سخت قسم کا زلزلہ آیا، پہاڑ اس طرح لرزنے اور حرکت کرنے لگا کہ جو لوگ پہاڑ کے دامن میں تھے انہوں نے پہاڑ کے ایک حصے کا سایہ اپنے سروں پر واضح طور پر دیکھا، ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی وقت وہ ان کے سروں پر آ گرے گا لیکن خدا کے لطف و کرم سے زلزلہ رک گیا اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہو گیا۔[2]

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا زلزلے اور شدید بجلی کے زیر اثر اپنی جگہ سے اکھڑ کر ان کے سروں کے اوپر سے بحکم خدا اس طرح گزرا ہو کہ چند لحظے انہوں نے اسے اپنے سروں پر دیکھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے لیکن یہ عذاب ان سے ٹل گیا اور وہ ٹکڑا کہیں دور جا گرا۔

---

[1] مجمع البیان اور بعض دیگر تفاسیر۔

[2] المنار زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(۳) کیا اس عہد و پیمان میں جبر کا پہلو ہے: اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ ان کے سروں پر پہاڑ کا مسلط ہونا ڈرانے دھمکانے کے طور پر تھا نہ کہ جبر و اضطرار کے طور پر ورنہ جبری عہد و پیمان کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔
لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ سرکش اور باغی افراد کو تہدید و سزا کے ذریعے حق کے سامنے جھکایا جائے۔ یہ تہدید اور سختی جو وقتی طور پر ہے ان کے غرور کو توڑ دے گی۔ انہیں صحیح غور و فکر پر ابھارے گی اور اس راستے پر چلتے چلتے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔

بہر حال یہ پیمان زیادہ تر عملی پہلوؤں سے مربوط تھا ورنہ عقائد کو تو جبر و اکراہ سے نہیں بدلا جا سکتا۔

(۴) کوہ طور: طور سے مراد یہاں اسم جنس ہے یا یہ مخصوص پہاڑ ہے۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں۔
بعض کہتے ہیں کہ طور اسی مشہور پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر وحی نازل ہوئی۔
لیکن بعض کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ طور لغوی معنی کے لحاظ سے مطلق پہاڑ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورہ اعراف کی آیہ ۱۷۱ میں جبل سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ

(۵) خذوا ما اتیناکم بقوۃ کا مفہوم: اس جملے کی تفسیر میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آنجنابؑ سے لوگوں نے پوچھا:

قوۃ الابدان او قوۃ القلب

قوت و طاقت آیات الٰہی تھامنے سے مراد قوت جسمانی ہے یا قوت معنوی۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

فیهما جمیعاً

جسمانی و معنوی سب طاقتیں مراد ہیں[1]

یہ حکم تمام آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے لئے ہے کہ ہر زمانے میں ان تعلیمات کی حفاظت و اجراء کے لئے مادی و روحانی دونوں قسم کی قوتوں اور توانائیوں کے ساتھ تیار رہیں۔

۶۵۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ○

۶۶۔ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

---

[1] تفسیر المیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ محاسن برقی۔

ترجمہ

۶۵۔ جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں حکم کی نافرمانی اور گناہ کیا۔ تمہیں ان کی حالت کا علم ہے کہ انہیں ہم نے دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں کر دیا۔

۶۶۔ ہم نے عذاب کے اس واقعے کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت قرار دیا ہے اور پرہیزگاروں کے لئے اسے نصیحت بنایا ہے۔

تفسیر

یہ دو آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح یہودیوں کی عصیان و نافرمانی کی روح اور مادی امور کی طرف ان کی شدید رغبت اور وابستگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پہلے کہا گیا ہے: تم ان کی حالت کو تو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن کے بارے میں نافرمانی اور گناہ کیا تھا (ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت)۔

نیز تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ہم نے ان کو کہا کہ دھتکارے ہوئے بندروں کی طرح ہو جاؤ (فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین)

ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے لوگوں کے لئے اور بعد کے زمانوں کے لئے بھی درس عبرت قرار دیا ہے (فجعلنٰھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا)۔

اور اسی طرح پرہیزگاروں کے لئے بھی پند و نصیحت قرار دیا ہے (وموعظۃ للمتقین)۔

اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے یہودیوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہفتہ کے دن تعطیل کیا کریں۔ ان میں سے کچھ لوگ دریا کے کنارے رہتے تھے اور آزمائش و امتحان کے طور پر انہیں حکم ملا کہ اس دن مچھلیاں نہ پکڑا کریں لیکن دوسرے دنوں کے برعکس ہفتہ کے دن مچھلیاں بڑی کثرت سے پانی کی اوپر والی سطح پر ظاہر ہو جاتی تھیں لہٰذا وہ کوئی حیلہ سوچنے لگے اور ایک قسم کے شرعی بہانے سے انہوں نے ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑ لیں۔ خدا تعالیٰ نے اس جرم کی سزا دی اور ان کے انسانی چہرے حیوانی شکل میں بدل گئے۔

ان کے چہروں کا مسخ اور تبدیل ہونا جسمانی طور پر تھا یا نفسیاتی و اخلاقی طور پر، نیز یہ کہ یہ لوگ کہاں رہتے تھے اور کون سے بہانے کے ذریعے انہوں نے مچھلیاں پکڑی تھیں۔ ان تمام سوالات کے جوابات اور اس سلسلے کے دوسرے مسائل اسی تفسیر کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۳ سے ۱۶۶ تک کے ذیل میں آئیں گے۔

جملہ کونوا قردۃ خاسئین[1] سرعت عمل سے کنایہ ہے یعنی ایک اشارے اور فرمان سے تمام نافرمانوں کے چہرے

---

[1] خاسئی "خسا" مادہ سے ہے جس کا معنی ذلت کے ساتھ دھتکارنا ہے۔ یہ لفظ اصل میں کتے کو دور کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں اس سے دھتکارنے کا وسیع تر معنی لیا گیا ہے جس میں حقارت شامل ہے لہٰذا اور دوسرے موارد پر بھی استعمال ہونے لگا۔

بدل گئے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں یوں منقول ہے:
ما بین یدیھا سے اس زمانے کی نسل اور ما خلفھا سے مراد ہم مسلمان ہیں یعنی یہ درسِ عبرت بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں بلکہ یہ تمام انسانوں کے لئے ہے[1]

۶۷۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا
أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○

۶۸۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ
وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ○

۶۹۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ
فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ○

۷۰۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ
شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○

۷۱۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ
مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا
كَادُوا يَفْعَلُونَ ○

۷۲۔ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ○

۷۳۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

۷۴۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۶۷۔ اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو (اور اس کے بدن کا ایک ٹکڑا اس مقتول کے ساتھ لگاؤ جس کا قاتل نہیں پہچانا جا رہا تاکہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے اور یہ شور و غوغا ختم ہو) وہ کہنے لگے کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ (موسیٰ نے) کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں (اور کسی سے مذاق و استہزاء کروں)۔

۶۸۔ وہ کہنے لگے (تو پھر) اپنے خدا سے یہ کہو کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ کس قسم کی گائے ہونا چاہیئے۔ اس نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ گائے نہ بوڑھی ہو کر جو کام سے رہ گئی ہو اور نہ بالکل جوان ہو بلکہ ان کے درمیان ہو جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو۔

۶۹۔ وہ کہنے لگے! اپنے خدا سے کہو ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ وہ کہنے لگا: خدا فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی ہو ایسے رنگ کی جو دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔

۷۰۔ وہ کہنے لگے اپنے خدا سے کہیئے وہ واضح کرے کہ وہ کس قسم کی گائے ہو کیونکہ یہ گائے تو ہمارے لئے مبہم ہو گئی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے۔

۷۱۔ اس نے کہا: خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے وہ تو اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے اور نہ ہی کھیتی سینچے، بھلی چنگی اور ایک رنگ کی ہو جس میں کوئی دھبہ تک نہ ہو۔ وہ کہنے لگے اب (جا کے) ٹھیک ٹھیک بیان کیا اور پھر انہوں نے (ایسی گائے تلاش کی) اور اسے ذبح کیا حالانکہ وہ مائل نہ تھے کہ اس کام کو انجام دیں۔

۷۲۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر (اس کے قاتل کے بارے میں) تم میں پھوٹ پڑ گئی اور خدا نے (اس گائے کے ذریعے جو مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) اسے آشکار کر دیا جسے تم چھپا رہے تھے۔

۷۳۔ پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے ساتھ لگاؤ (تا کہ وہ زندہ ہو کر قاتل کی نشاندہی کرے)، اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ سکو۔

۷۴۔ پھر اس واقعے کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ کچھ پتھر تو وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جن میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ان میں سے پانی کے قطرات ٹپکتے ہیں اور ان میں سے بعض خوفِ خدا سے (پہاڑ کی بلندی سے) نیچے گر جاتے ہیں (لیکن تمہارے دل نہ خوفِ خدا سے دھڑکتے ہیں اور نہ ہی وہ علم و دانش اور انسانی احساسات کا سرچشمہ ہیں) اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہم مختصر طور پر جو دیگر واقعات پڑھ چکے ہیں ان کے برعکس ان آیات میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ یہ واقعہ قرآن میں صرف ایک ہی دفعہ ذکر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اچھے بہت سے نکات بھی نظر آتے ہیں جو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ان میں سے بنی اسرائیل کی بہانہ سازی اس ساری داستان میں واضح ہے نیز حضرت موسیٰؑ کی گفتگو سے ان کے ایمان کے درجات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ تمام چیزوں سے قطع نظر یہ واقعہ مسئلہ معاد و قیامت کی زندہ سند اور گواہ ہے۔

پہلے ہم اس واقعے کی تشریح اور آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں بعد ازاں اس کے نکات کی طرف جائیں گے۔

جیسا کہ آیاتِ قرآن اور اقوال مفسرین سے ظاہر ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نامعلوم طور پر قتل ہو جاتا ہے اس کے قاتل کا کسی طرح پتہ نہیں چلتا۔ بنی اسرائیل کے قبائل کے درمیان جھگڑا اور نزاع شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے اور اپنے تئیں بری الذمہ قرار دیتا ہے، جھگڑا ختم کرنے کے لئے مقدمہ حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ آپ سے اس موقع پر مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس کا حل چاہتے ہیں۔ چونکہ عام اور معروف طریقوں سے اس قضیے کا فیصلہ ممکن نہ تھا اور دوسری طرف اس کشمکش کے جاری رہنے سے ممکن تھا بنی اسرائیل میں ایک عظیم فتنہ کھڑا ہو جاتا لہٰذا جیسا کہ آپ ان آیات کی تفسیر میں پڑھیں گے حضرت موسےٰ پروردگار سے مدد لے کر اعجاز کے راستے اس مشکل کو حل کرتے ہیں[1]

---

[1] اس طرف توجہ ضروری ہے کہ موجودہ توراۃ کی فصل ۲۱ سفر تثنیہ میں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ موجود ہے البتہ موجودہ توراۃ میں جو کچھ ہے وہ ایک حکم کی صورت میں ہے جب کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ واقعے کی ایک صورت میں ہے۔ بہرحال فصل ۲۱ میں پہلے جملے سے کر نویں جملے تک کی عبارت کچھ یوں ہے:

> اگر کسی مقتول کو ایسی زمین میں جو خداوند خدا نے تجھے میراث دی ہے۔ صحرا میں پڑا دیکھو اور معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا قاتل کون ہے۔ اس وقت تیرے مشائخ اور قاضی باہر جا کر ان شہروں کے فاصلے کی پیمائش کریں جو مقتول کے ارد گرد ہیں اور وہی شہر معتبر ہے جو مقتول کے زیادہ قریب ہے۔
>
> اس شہر کے مشائخ ہی اس گائے کو۔۔۔ تا ہموار اور ایسی جگہ لے جائیں جہاں کوئی کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔ وہیں وہ لوگ وہاں سے اس گائے کی گردن کاٹ دیں۔ بنی لیوی کے کاہن حضرات نزدیک آئیں۔ خداوند تیرے خدا نے انہیں منتخب کیا ہے تاکہ وہ اس کی خدمت کریں اور خدا کے نام کے ساتھ دعائے خیر کریں اور نزاع اور جھگڑے کا فیصلہ ان کے حکم کے مطابق ہو اور وہ شہر جو قتل کے نزدیک ہے اس کے تمام مشائخ اپنے ہاتھ اس گائے پر دھوئیں جو وہ ۔۔۔ وادی ۔۔۔

فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا (قاتل کو تلاش کرنے کے لئے پہلی گائے (جو تمہیں مل جائے اس) کو ذبح کرو (واذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ)۔

انہوں نے بطورِ تعجب کہا: کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو (قالوا اتتخذنا ھزوا)۔

موسیٰ نے ان کے جواب میں کہا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں (قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین)۔ یعنی استہزاء اور تمسخر کرنا نادان اور جاہل افراد کا کام ہے اور خدا کا رسول یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اس کے بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ استہزا و مذاق نہیں بلکہ سنجیدہ گفتگو ہے تو کہنے لگے: اب اگر ایسا ہی ہے تو اپنے پروردگار سے کہیئے کہ ہمارے لئے مشخص و معین کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی) "اپنے خدا سے کہو" ان کے سوالات میں یہ جملہ بتکرار آیا ہے۔ اس میں ایک طرح کا سوئے ادب یا سربستہ استہزاء و مذاق پایا جاتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے تھے۔ "ہمارے خدا سے دعا کیجئے" کیا وہ حضرت موسیٰؑ کے خدا کو اپنے خدا سے جدا سمجھتے تھے۔

بہر حال حضرت موسیٰؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: خدا فرماتا ہے ایسی گائے ہو جو نہ بہت بوڑھی ہو کہ بے کار ہو چکی ہو اور نہ ہی جوان بلکہ ان کے درمیان ہو (قال انہ یقول انھا بقرۃ لا فارض ولا بکر عوان بین ذالک)[1]۔

اس مقصد کے لئے کہ وہ اس سے زیادہ اس مسئلے کو طول نہ دیں اور بہانہ تراشی سے حکم خدا میں تاخیر نہ کریں اپنے کلام کے آخر میں مزید کہا: جو تمہیں حکم دیا گیا ہے (جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو (فافعلوا ما تؤمرون)۔

لیکن انہوں نے پھر بھی زیادہ باتیں بنانے اور ڈھٹائی دکھانے سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور کہنے لگے: اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما لونھا)۔

موسیٰؑ نے جواب میں کہا: وہ گائے ساری کی ساری زرد رنگ کی ہو جس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا لگے (قال انہ یقول انھا بقرۃ صفراء فاقع لونھا تسر النظرین)[2]۔

خلاصہ یہ کہ وہ گائے مکمل طور پر خوش رنگ اور چمکیلی ہو۔ ایسی دیدہ زیب کہ دیکھنے والوں کو تعجب میں ڈال دے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اسی طرح ہر مرتبہ بہانہ جوئی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کے دروازے پر ٹوٹ ہوئی ہے اور آواز کہیں کہ یہ خون ہمارے ہاتھوں نے نہیں بہایا اور ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ اے خداوند! اپنی قوم اسرائیل کو کہ جسے دوبارہ تو نے خرید کیا ہے بخش دے اور اپنی قوم اسرائیل کو خون ناحق سے منسوب نہ کر اور وہ خون ان کے لئے معاف ہو جائے گا۔ اس طریقے سے خون ناحق اپنے درمیان سے رفع کرے گا۔ کیونکہ خداوند کی نظر میں وہی درست ہے جسے تو عمل میں لائے گا۔ (عہد قدیم مطبوعہ ۱۸۷۸)

[1] "فارض" کے متعلق راغب مفردات میں کہتا ہے کہ یہ سن رسیدہ گائے کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ایسی بوڑھی جس سے بچہ نہ ہو سکے اور "عوان" کا معنی ہے درمیانی۔

[2] "فاقع" کا معنی ہے خالص، ایک جیسا زرد رنگ۔

مشکل میں ڈالتے گئے۔ پھر کہنے لگے اپنے پروردگار سے کہیے کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ گائے (کام کرنے کے لحاظ سے) کیسی ہونی چاہیئے۔ (قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی)۔ کیونکہ یہ گائے ہمارے لئے مبہم ہوگئی ہے (ان البقر تشابہ علینا) اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے (و انا ان شاء اللہ لمھتدون)۔

حضرت موسیٰ نے پھر سے کہا: خدا فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہو جو اتنی سدھائی ہوئی نہ ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے (قال انہ یقول انھا بقرۃ لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث) ہر عیب سے پاک ہو (مسلمۃ) حتیٰ کہ اس میں کسی قسم کا دوسرا رنگ نہ ہو (لا شیۃ فیھا)۔

اب کہ بہانہ سازی کے لئے ان کے پاس کوئی سوال باقی نہ تھا جتنے سوالات وہ کرسکتے تھے سب ختم ہوگئے تو کہنے لگے: اب تو نے حق بات کہی (قالوا الآن جئت بالحق)

پھر جس طرح ہوسکا انہوں نے وہ گائے مہیا کی اور اسے ذبح کیا لیکن در اصل وہ یہ کام کرنا نہ چاہتے تھے (فذبحوھا وما کادوا یفعلون)

اس واقعے کی جزئیات بیان کرنے کے بعد قرآن دوبارہ یہ تمام واقعہ بعد کی دو آیات میں مختصراً اس طرح بیان کرتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا پھر اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے اور خدا نے (ایک حکم کے ذریعے جو مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) جس چیز کو تم چھپائے ہوئے تھے آشکار کر دیا (و اذ قتلتم نفسا فادارءتم فیھا واللہ مخرج ما کنتم تکتمون)۔

پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارو (تاکہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے) (فقلنا اضربوہ ببعضھا) بے شک خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے (کذالک یحی اللہ الموتیٰ)۔

اور وہ تمہیں اپنی اس قسم کی آیات دکھاتا ہے تاکہ تم حقیقت کو پاسکو (و یریکم آیاتہ لعلکم تعقلون)۔

زیر بحث آیات میں سے آخری میں بنی اسرائیل کی قساوت اور سنگدلی کو بیان کیا گیا ہے: ان تمام واقعات کے بعد اور اس قسم کی آیات و معجزات دیکھنے کے باوجود تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہیں اور اس سے بھی زیادہ (ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ) کیونکہ کچھ پتھر تو ایسے ہیں جن میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں (وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار) یا پھر بعض وہ ہیں جن میں شگاف پڑ جاتا ہے اور ان میں سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگتے ہیں (و ان منھا لما یشقق فیخرج منہ الماء) اور کبھی ان میں سے کچھ پتھر (پہاڑ کی بلندی سے) خوف خدا کے باعث گر پڑتے ہیں (و ان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ) لیکن تمہارے دل تو ان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ان سے علم و عواطف کا چشمہ جوش مارتا ہے نہ محبت کے قطرات ٹپکتے ہیں اور نہ ہی یہ کبھی خوف خدا سے دھڑکتے ہیں۔

آخری جملے میں ہے: جو کچھ تم انجام دے رہے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (و ما اللہ بغافل عما تعملون)۔

یہ در اصل اس گروہ بنی اسرائیل اور ان کے خطوط پر چلنے والے تمام لوگوں کے لئے تہدید ہے۔

چند اہم نکات

(۱) زیادہ اور غیر مناسب سوالات: اس میں شک نہیں کہ سوالات مشکلات کے حل کی کلید ہیں اور جہل و نادانی کو دُور کرنے کا نسخہ ہیں لیکن ہر چیز کی طرح اگر یہ بھی حد سے تجاوز کر جائیں یا بے موقع کئے جائیں تو کجروی کی علامت ہیں اور نقصان دہ ہیں جیسے اس داستان میں ہم اس کا نمونہ دیکھ رہے ہیں۔

بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس گائے کی کوئی قید یا خاص شرط ہوتی تو مدلئے حکم دوا جب انہیں حکم دے رہا تھا اسی وقت بیان کر دیتا لہٰذا معلوم ہوا کہ اس حکم کو بجالانے کے لیے کوئی اور شرط نہ تھی اسی لئے لفظ "بقرۃ" اس مقام پر نکرہ کی شکل میں ہے لیکن وہ اس مسئلہ بنیاد سے بے پرواہ ہو کر طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ شاید وہ یہ چاہتے ہوں کہ حقیقت مشتبہ ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور یہ اختلاف اسی طرح بنی اسرائیل میں رہے۔ اور قرآن کا یہ جملہ "فذبحوھا وما کادوا یفعلون" بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی "انہوں نے گائے ذبح کر تو دی لیکن وہ چاہتے نہ تھے کہ یہ کام انجام پائے"۔

اس داستان کے سلسلے کی آیت ۲، سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کم از کم ایک گروہ قاتل کو جانتا تھا اور اصل واقعے سے مطلع تھا۔ شاید یہ قتل ان کے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا کیونکہ اس آیت میں ہے "واللہ مخرج ما کنتم تکتمون" یعنی "تم جسے چھپاتے ہو خدا اُسے آشکار کرنے گا"۔

ان سب سے قطع نظر ہٹ دھرم اور خود پسند قسم کے لوگ باتیں بنایا کرتے ہیں اور زیادہ سوالات کرتے ہیں اور ہر چیز کے لئے بہانہ سازی کیا کرتے ہیں۔ قرآن نشاندہی کرتے ہیں کہ اصولی طور پر وہ خدا کے متعلق معرفت رکھتے تھے اور نہ ہی حضرت موسیٰؑ کے مقام کو سمجھتے تھے اسی لئے تو ان سب سوالوں کے بعد یہ کہنے لگے "الان جئت بالحق" یعنی "اب تم حق بات لائے ہو" گویا اس سے پہلے جو کچھ تھا باطل تھا۔

بہر حال انہوں نے جتنے سوالات کئے خدا نے ان کی ذمہ داری کو اتنا ہی سخت تر کر دیا کیونکہ ایسے لوگ اسی قسم کے بدلے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسی لئے روایات میں ہے کہ جس مقام پر خدا نے خاموشی اختیار کی ہے وہاں پوچھ گچھ اور سوال نہ کرو کیونکہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔ اسی بناء پر امام علیؑ بن موسیٰؑ الرضا سے روایت ہے:

> اگر انہوں نے ابتدا ہی میں کوئی گائے منتخب کر لی ہوتی اور اسے ذبح کر دیتے تو کافی تھا۔
>
> ولکن شددوا فشدد اللہ علیھم
>
> لیکن انہوں نے سختی کی تو خدا نے بھی سخت رویہ اختیار کیا۔[1]

(۲) یہ تمام اوصاف کس لئے تھے: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ابتداء میں بنی اسرائیل کی ذمہ داری مطلق تھی اور اس میں

---

[1] المیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر عیاشی۔

کوئی قید اور شرط نہ تھی لیکن ان کی شدت اور ذمہ داری ادا کرنے میں پس و پیش نے ان کے لئے حکم کو بدل دیا اور وہ زیادہ سخت ہو گیا۔[1]

لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں جو شرائط اور قیود لگائی گئیں وہ انسانی برادری کی اجتماعی زندگی کی کسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں۔ گویا قرآن اس نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ ایک ایسی حیات بخش صورت کی ضرورت ہے جو ذلول نہ ہو یعنی بلا شرط تسلیم ہو اور قید و شرط کی وجہ سے بوجھل، اسیر اور ذبردست نہ ہو اور یونہی اس میں مختلف رنگ بھی نظر نہیں آنے چاہئیں بلکہ یک رنگ اور خالص ہو۔

جو لوگ رہبری اور معاشرے کو زندہ کرنے کے لئے اٹھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مردہ دلوں اور مردہ افکار کو زندہ کیا جائے انہیں دوسروں کا مطیع نہیں ہونا چاہیئے۔ مال و ثروت، فقر و تونگری، طاقت اور انفرادی قوت یہ چیزیں ان کے مقصد پر اثر انداز نہ ہوں۔ خدا کے علاوہ کوئی چیز ان کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ وہ صرف حق کے لئے سر تسلیم خم کریں۔ وہ دین و آئین کے پابند ہوں۔ ان کے وجود پر خدائی رنگ کے علاوہ کوئی رنگ اثر پذیر نہ ہو۔ ایسے ہی لوگ اضطراب اور تشویش کے بغیر لوگوں کے کام آسکتے ہیں لیکن اگر دل دنیا کی طرف مائل ہو اور دنیا کا غلام ہو، اس پر مادیت زنگ چڑھ گیا ہو اور اس رنگ کی وجہ سے وہ عیب دار ہو جائے تو ایسا شخص اس عیب اور نقص کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کر سکتا اور نہ حیات بخش صورت پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) قتل کا سبب کیا تھا: تواریخ اور تفاسیر سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا سبب مال تھا یا شادی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک ثروت مند شخص تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اس دولت کا وارث اس کے ایک چچا زاد بھائی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ دولت مند کافی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے چچا زاد بھائی نے بہت انتظار کیا کہ وہ دنیا سے چلا جائے تاکہ اس کا وارث بن سکے لیکن اس کا انتظار بے نتیجہ رہا لہٰذا اس نے اسے ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا اور بالآخر اسے تنہائی میں پا کر قتل کر دیا اور اس کی لاش سڑک پر رکھ دی اور گریہ و زاری کرنے لگا اور حضرت موسیٰؑ کی بارگاہ میں مقدمہ پیش کیا کہ بعض لوگوں نے میرے چچا زاد بھائی کو قتل کر دیا ہے۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ قتل کا سبب یہ تھا کہ اپنے چچا زاد بھائی کو قتل کرنے والے نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس نے یہ درخواست رد کر دی اور لڑکی کو بنی اسرائیل کے ایک نیک اور پاکباز جوان سے بیاہ دیا۔ شکست خوردہ چچا زاد نے لڑکی کے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا اور چھپ کر اسے قتل کر دیا اور حضرت موسیٰؑ کے پاس شکایت لے کر آیا کہ اس کا چچا زاد بھائی قتل ہو گیا اور اس کے قاتل کو تلاش کیا جائے۔

چونکہ قرآن کا طریق کار ہے کہ گذشتہ واقعات کو ہمہ گیر حیثیت سے اور قاعدہ و کلیہ کے طور پر تربیتی نقطۂ نظر سے بیان کرے لہٰذا ضمناً یہ بھی ممکن ہے اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ مفاسد کا سرچشمہ اور قتل و غارت کی وجہ دو موضوعات رہتے ہیں ایک ثروت و دولت اور دوسرا بے قید جنسی خواہشات۔

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل سے پہلے نسخ حکم مصالح کے پیش نظر جائز ہے اور شریعت موسیٰؑ میں بھی نسخ احکام ہوتا تھا۔ یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ کبھی سخت حکم سزا کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی دیگر بحثیں اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔

(۴) اس داستان کے عبرت خیز نکات : یہ عجیب داستان خدا کی ہر چیز پر لامتناہی قدرت کی دلیل کے علاوہ مسئلہ معاد پر بھی دلالت کرتی ہے۔ اسی لئے آیہ ۷۳ میں ہے: "کذٰلک یحیی اللّٰہ الموتیٰ" یعنی اسی طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے اور "و یریکم آیاتہ" وہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے "پروردگار کی قدرت و عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ آیت اس بات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ اگر خدا کسی گروہ پر غضبناک ہوتا ہے تو بیہودہ اور بے دلیل کے نہیں ہوتا کیونکہ اس واقعے میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے سامنے جو باتیں کہتے تھے وہ نہ صرف حضرت کے ساتھ انتہائی جسارت آمیز سلوک تھا بلکہ خدا تعالیٰ کی مقدس بارگاہ کے لحاظ سے بھی بے ادبی اور جسارت تھی۔

ابتدا میں کہتے ہیں "کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو" گویا خدا کے عظیم پیغمبر کو مذاق کا الزام دے رہے تھے، بعض اوقات کہتے "اپنے خدا سے خواہش کرو۔ گویا موسیٰ کا خدا ان کے خدا کے علاوہ کوئی اور تھا۔ جب کہ حضرت موسیٰ انہیں صراحت سے کہہ چکے تھے کہ "خدا نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر اس سوال کا جواب دے دو تو ہم ہدایت حاصل کر لیں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا بیان نامکمل اور گمراہی کا سبب ہے اور آخر میں کہتے ہیں "اب حق بات لے آئے ہو"

یہ سب باتیں ان کی جہالت، نادانی، خود خواہی اور ہٹ دھرمی پر دلالت کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ داستان ہمیں درس دیتی ہے کہ ہمیں سخت گیر نہیں ہونا چاہیئے تاکہ خدا بھی ہم پر سختی نہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ شاید گائے کو ذبح کرنے کے لئے اس لئے منتخب کیا گیا ہو کہ بچی کھچی گاؤ پرستی اور بت پرستی کی فکر ان کے دماغ سے نکل جائے۔

باپ سے نیکی

اس موقع پر مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اس قسم کی گائے اس علاقے میں ایک ہی تھی۔ بنی اسرائیل نے اسے بہت مہنگے داموں خریدا۔ کہتے ہیں اس گائے کا مالک ایک انتہائی نیک آدمی تھا جو اپنے باپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک دن جب اس کا باپ سویا ہوا تھا اسے ایک نہایت نفع بخش معاملہ درپیش آیا، صندوق کی چابی اس کے باپ کے پاس تھی لیکن اس خیال سے کہ تکلیف اور بے آرامی نہ ہو اس نے اسے بیدار نہ کیا لہٰذا اس معاملے سے صرف نظر کر لیا۔ بعض مفسرین کے نزدیک بیچنے والا ایک جنس ستر ہزار میں اس شرط پر بیچنے کو تیار تھا کہ قیمت فوراً ادا کی جائے اور قیمت کی ادائیگی اس بات پر موقوف تھی کہ خریدنے کے لئے اپنے باپ کو بیدار کر کے صندوقوں کی چابیاں اس سے حاصل کرے۔ وہ ستر ہزار میں خریدنے کو تو تیار تھا لیکن کہتا تھا کہ قیمت باپ کے بیدار ہونے پر ہی دوں گا۔ خلاصہ یہ کہ سودا نہ ہو سکا۔ خداوند عالم نے اس نقصان اور کمی کو اس طرح پورا کیا کہ اس جوان کے لئے گائے کی فروخت کا یہ نفع بخش موقع فراہم کیا۔

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ باپ بیدار ہوا تو اسے واقعے سے آگاہی ہوئی۔ اس نیکی کی وجہ سے اس نے وہ گائے اپنے بیٹے کو بخش دی اس طرح اسے وہ بے پناہ نفع میسر آیا[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج اول

رسولِ اسلام اس موقع پر فرماتے ہیں۔

انظروا الی البر ما بلغ باھلہ

نیکی کر دیکھو وہ نیکوکار سے کیا کرتی ہے ۱؎

۷۵۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○

۷۶۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۷۷۔ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ○

ترجمہ

۷۵۔ کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تم پر (یعنی تمہارے آئین کے احکامات پر) ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کلامِ خدا کو سنتا تھا اور سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتا تھا جب کہ وہ لوگ علم و اطلاع بھی رکھتے تھے۔

۷۶۔ جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے سے خلوت کرتے ہیں تو ان میں سے بعض دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان مطالب کو مسلمانوں کے سامنے کیوں دہراتے ہو جو خدا نے (رسولِ اسلام کی صفات کے بارے میں) تم سے بیان کئے ہیں کہ کہیں (قیامت کے دن) بارگاہِ الٰہی میں تمہارے خلاف وہ ان سے استدلال کریں کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

۷۷۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے واقف ہے۔

تفسیر

شانِ نزول

بعض مفسرین مندرجہ بالا آخری دو آیات کے شانِ نزول کے سلسلے میں امام باقرؑ سے اس طرح نقل کرتے ہیں۔

۱؎ تفسیر ثقلین جلد اول، ص ۹۴

یہودیوں کے ایک گروہ کے لوگ جو حقیقت کے دشمن نہ تھے۔ جب مسلمانوں سے ملاقات کرتے تو جو تورات میں پیغمبر اسلامؐ کی صفات کے متعلق آیا تھا انہیں سنا دیتے تھے۔ یہودیوں کے بڑے لوگ اس سے آگاہ ہوئے اور انہیں منع کیا اور کہا کہ محمدؐ کی وہ صفات جو تورات میں آئی ہیں تم انہیں ان کے سامنے بیان نہ کرو کہ کہیں خدا کے سامنے ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ بن جائیں۔ یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔[۱]

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ان آیات میں خدا بنی اسرائیل کا واقعہ چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کر رہا ہے اور ایک سبق آموز نتیجہ پیش کرتا ہے۔

کہتا ہے: تم کس طرح یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ قوم تم پر (یعنی تمہارے دین کے احکامات پر) ایمان لے آئے گی، حالانکہ ان میں سے ایک گروہ خدا کی باتیں سننے، سمجھنے اور ادراک کرنے کے بعد ان میں تحریف کر دیتا ہے۔ جب کہ ان لوگوں کو علم و اطلاع بھی ہے (افتطمعون ان یؤمنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلٰم اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ وھو یعلمون)۔

اگر تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ قرآن کے زندہ بیانات اور پیغمبر اسلامؐ کے اعجاز کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے تو اسے اہمیت نہ دو کیونکہ یہ انہی لوگوں کی اولاد ہیں جو قوم کے منتخب افراد کی حیثیت سے موسیٰ بن عمران کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے، انہوں نے خدا کی باتیں سنی تھیں اور اس کے احکام کو سمجھا تھا لیکن ان میں سے بعض جب لوٹ کر آئے تو کلام خدا میں تحریف کر دی۔

" قد کان فریق منھم " سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب تحریف کرنے والے نہ تھے۔ پھر بھی یہ اس بات کے لئے کافی تعداد تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں کے عناد و دشمنی پر تعجب نہ کیا جائے۔

اسباب النزول میں ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ جب کوہ طور سے واپس آیا تو لوگوں سے کہنے لگا کہ ہم نے خود سنا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہمارے فرامین کو جتنا بجا لا سکتے ہو انجام دو اور جنہیں بجا نہیں لا سکتے انہیں چھوڑ دو۔

بہرحال ابتدا میں یہ توقع بجا تھی کہ قوم یہود دوسروں سے پہلے اسلام کی آواز پر لبیک کہے گی کیونکہ مشرکین کے برخلاف وہ لوگ اہل کتاب تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے رسول اسلامؐ کی صفات بھی اپنی کتاب میں پڑھی تھیں لیکن قرآن کہتا ہے ان کے ماضی پر نظر کرتے ہوئے ان سے تمہاری توقع کا کوئی محل نہیں کیونکہ بعض اوقات کسی گروہ کی صفات اور مزاج کی کج روی اس بات کا سبب بنتی ہے کہ حق سے انتہائی قرب کے باوجود وہ اس سے دور رہے۔

بعد کی آیت اس حیلہ گر اور منافق گروہ کے متعلق ایک اور حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ان میں سے پاک دل لوگ جب مومنین سے ملاقات کرتے ہیں تو اظہار ایمان کرتے ہیں (اور پیغمبر کی وہ صفات جو ان کی کتب میں موجود ہیں ان کی خبر دیتے ہیں) (واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا) لیکن علیحدگی اور خلوت میں ان سے ایک گروہ کہتا ہے تم ان مطالب کو جو

---

[۱] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

خدا نے تورات میں تمہارے لئے بیان کئے ہیں مسلمانوں کو کیوں بتاتے ہو (واذا خلا بعضھم الی بعض قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم) کہیں قیامت کے دن خدا کے سامنے تمہارے خلاف ان سے استدلال کریں، کیا تم سمجھتے نہیں (لیحاجوکم بہ عند ربکم افلا تعقلون)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ آیت کی ابتداء یہودی منافقین کے سلسلے میں گفتگو کر رہی ہو، جو مسلمانوں کے سامنے ایمان کا دم بھرتے تھے اور تنہائی میں انکار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ یہودیوں میں سے پاک دل لوگوں کو بھی سرزنش کرتے ہیں کہ تم نے کتب مقدس کے اسرار سے مسلمانوں کو کیوں آگاہ کیا ہے۔

بہر حال یہ پہلی آیت کے بیان کی تائید کرتی ہے یعنی جس گروہ کے ذہنوں پر ایسے خیالات کا قبضہ ہے ان سے ایمان کی اتنی توقع نہ رکھا کرو۔

"فتح اللہ علیکم" سے مراد ممکن ہے خدا کا وہ فرمان و حکم ہو جو بنی اسرائیل کے پاس تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان کے لئے نئی شریعت سے متعلق خیر وبرکت کے دروازوں کے کھلنے کی طرف اشارہ ہو۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس منافق گروہ کا اللہ کے بارے میں ایمان اس قدر کمزور تھا کہ وہ اسے ایک مادی انسان کی طرح سمجھتے تھے اور تصور کرتے تھے کہ اگر کوئی حقیقت مسلمانوں سے چھپا لیں تو وہ خدا سے بھی چھپی رہے گی لہذا بعد کی آیت صراحت سے کہتی ہے: کیا یہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے (اولا یعلمون ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

۷۸۔ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

۷۹۔ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝

ترجمہ

۷۸۔ اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب خدا کو چند خیالات اور آرزوؤں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے اور انہوں نے فقط اپنے گمانوں سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔

۷۹۔ افسوس اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر سکیں، افسوس ہے ان پر اس چیز سے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور جو کچھ وہ کماتے ہیں ان پر اس کے لئے بھی افسوس ہے

شانِ نزول

وہ اوصاف پیغمبر جو تورات میں آئے تھے بعض علمار یہود نے انہیں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے یہ تبدیلی اپنے مقام و منصب کی حفاظت کی خاطر کی تھی اور ان منافع کی خاطر جو انہیں ہر سال عوام کی طرف سے ملتے تھے جب پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے اوصاف کو تورات میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق پایا۔ اس پر انہیں ڈر ہوا کہ اس حقیقت کے واضح ہونے کی صورت میں ان کے منافع خطرے میں پڑ جائیں گے لہذا انہوں نے تورات میں مذکور حقیقی اوصاف کی بجائے ان کے مخالف اوصاف لکھ دیئے۔ یہودی عوام نے وہ اوصاف کم و بیش سن رکھے تھے اس لئے وہ اپنے علمار سے پوچھتے کہ کیا یہ وہی پیغمبر موعود نہیں جس کے ظہور کی آپ ہمیں بشارت دیا کرتے تھے۔ اس پر وہ تورات کی تحریف شدہ آیات پڑھتے تھے تاکہ وہ خاموش ہو جائیں[1]

تفسیر

عوام کو لوٹنے کی یہودی سازش

گذشتہ آیات کے بعد محل بحث آیات یہودیوں کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ عوام اور حیلہ ساز علمار (البتہ ان میں سے کچھ علماء ایسے بھی تھے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو گئے)۔

قرآن کہتا ہے: ان میں سے ایک گروہ میں ایسے افراد ہیں جو علم نہیں رکھتے اور کتاب خدا میں سے چند ایک خیالات اور آرزوئیں اخذ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے اور انہوں نے صرف اپنے ظن و گمان سے وابستگی اختیار کر لی ہے (ومنهم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی وان هم الا یظنون)۔

امیون "امی" کی جمع ہے۔ یہاں یہ لفظ ان پڑھ اور لاعلم کے معنی میں استعمال ہوا یعنی جس حالت میں شکم مادر سے پیدا ہوا اسی طرح رہ گیا اور کسی استاد کے مدرسے کو نہیں دیکھا۔

ہوسکتا ہے یہ لفظ اس طرف اشارہ کر رہا ہو کہ کچھ مائیں جاہلانہ محبت اور الفت کی وجہ سے اپنی اولاد کو جدا نہیں کرتی تھیں اور اسے مدرسے جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں لہذا وہ لوگ بے علم رہ جاتے تھے[2]

امانی "امنیۃ" کی جمع ہے جس کا معنی "آرزو" ہے۔ ممکن ہے یہاں ان موہوم خیالات اور امتیازات کی طرف اشارہ ہو یہودی اپنے بارے میں جن کے قائل تھے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کہا کرتے تھے ہم خدا کی اولاد اور اس کے خاص دوست ہیں۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ۔ ۱۸)

---

[1] مجمع البیان میں زیر نظر آیت کے ذیل میں اجمالی طور پر یہ شان نزول بیان کی گئی ہے اور تفصیلی طور پر دیگر متعلقہ آیات کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

[2] "امی" کے معنی جلد ۴ (تفسیر نمونہ) میں سورہ اعراف آیہ ۱۵۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں۔

اور یہ بھی کہ کہا کرتے تھے کہ چند دن کے سوا جہنم کی آگ ہم تک ہرگز نہیں پہنچے گی (بعد کی آیات میں یہودیوں کی اس گفتگو پر بحث ہوگی)۔

یہ بھی احتمال ہے کہ "امانی" سے مقصود وہ تحریف شدہ آیات ہوں جو علماء یہود عوام کے ہاتھوں میں دے دیتے تھے اور شاید جملہ "لا یعلمون الکتاب" اس مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال اس آیت کا آخری حصہ "ان ھم الا یظنون" اس بات کی دلیل ہے کہ اساس و اصول دین اور مکتب وحی کو پہچاننے کے لئے ظن و گمان کی پیروی صحیح کام نہیں بلکہ لائق سرزنش ہے چاہیے کہ ہر شخص اس سلسلے میں تحقیق کے ساتھ کافی قدم اٹھائے۔

علمائے یہود کا ایک اور گروہ تھا جو اپنے فائدے کے لئے حقائق میں تحریف کر دیتا تھا جیسا کہ قرآن بعد کی آیت میں کہتا ہے: افسوس ہے ان لوگوں پر جو کچھ مطالب اپنے ہاتھ سے لکھ دیتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہیں (فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ) اور ان کی غرض یہ ہے کہ اس کام سے تھوڑی سی قیمت وصول کریں (لیشتروا بہ ثمنا قلیلا) افسوس ہے ان پر اس سے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں (فویل لھم مما کتبت ایدیھم) اور افسوس ہے ان پر اس سے جو وہ ان خیانتوں کے ذریعے کماتے ہیں (وویل لھم مما یکسبون)

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے وسیلہ بھی ناپاک اختیار کیا اور اس سے نتیجہ بھی غلط حاصل کرتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر جب کام حرام ہے تو کمائی بھی حرام ہوگی:

ان اللہ اذا حرم شیئا حرم ثمنہ

یقیناً جب اللہ نے کوئی چیز حرام قرار دی ہے تو اس کا مول بھی حرام کیا ہے۔

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کے ضمن میں حضرت صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے جو قابل غور نکات کی حامل ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

ایک شخص نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: یہودی عوام جب اپنے علماء کے بغیر اپنی آسمانی کتاب کے متعلق کوئی اطلاع نہ رکھتے تھے پھر علماء کی تقلید اور ان کے قول کو قبول کرنے پر خدا ان کی مذمت کیوں کرتا ہے اور کیا یہودی عوام اور ہمارے عوام میں جو اپنے علماء کی تقلید کرتے ہیں کوئی فرق ہے؟

امامؑ نے فرمایا: ہمارے عوام اور یہودی عوام کے درمیان ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے مساوات۔ جس لحاظ سے دونوں مساوی ہیں اس جہت سے خدا نے ہمارے عوام کی بھی اسی طرح مذمت کی ہے۔ رہی وہ جہت جس میں وہ ان سے مختلف ہیں وہ یہ ہے کہ یہودی عوام اپنے علماء کی حالت سے آشنا تھے وہ جانتے تھے کہ ان کے علماء جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، حرام اور رشوت کھاتے ہیں اور احکام الٰہی میں تغییر و تبدل کرتے ہیں۔ اپنی فطرت سے وہ یہ حقیقت جانتے تھے کہ ایسے لوگ فاسق ہیں اور یہ جائز نہیں کہ خدا اور اس کے احکام کے بارے میں ان کی باتیں قبول کی جائیں اور یہ بھی جانتے تھے

کہ انبیاء و مرسلین کے بارے میں ان کی شہادت قبول کرنا مناسب نہیں۔ اس بنا پر خدا نے ان کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء سے ظاہر بہ ظاہر فسق و فجور اور سخت تعصب دیکھیں اور انہیں دنیا و مال حرام پر حریص ہوتا دیکھیں پھر بھی جو شخص ان کی پیروی کرے وہ یہودیوں کی طرح ہے۔ خداوند عالم نے فاسق علماء کی پیروی کی وجہ سے ان کی مذمت کی ہے۔

فاما من کان من الفقهاء صائناً لنفسه حافظاً لدینه مخالفاً علی هواه مطیعاً لامر مولاه فللعوام ان یقلدوه۔

باقی رہے وہ علماء و فقہاء جو اپنی روح کی پاکیزگی کی حفاظت کریں، اپنے دین کی نگہداری کریں، ہوا و ہوس کے مخالف ہوں اور اپنے مولا و آقا کے فرمان کے مطیع ہوں عوام کو چاہیئے کہ ان کی تقلید کریں۔[1]

واضح ہے کہ حدیث احکام میں اندھی تقلید کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ عوام علماء کی رہنمائی میں علم و یقین کے حصول کے لئے پیروی کریں کیونکہ یہ حدیث پیغمبر کی پہچان کے ضمن میں ہے جو مسلماً اصول دین میں سے ہے اس میں اندھی تقلید جائز نہیں۔

۸۰۔ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۸۱۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

۸۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ؑ

ترجمہ

۸۰۔ اور انہوں نے کہا: چند دن کے سوا آتش جہنم ہم تک نہیں پہنچے گی۔ کہیئے کیا تم نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہوا ہے کہ خدا اپنے پیمان کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا پھر تم خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔

۸۱۔ ہاں جو لوگ گناہ کمائیں اور گناہ کے اثرات ان کے سارے جسم پر محیط ہوں وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۹۴ (کتاب القضاء، باب ۱۰) اور تفسیر صافی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۸۲۔ وہ لوگ جو ایمان لاچکے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ اہل جنت ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

تفسیر

بلند پروازی اور کھوکھلے دعوے

اس مقام پر قرآن یہودیوں کے بے بنیاد دعووں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انہیں مغرور کر رکھا تھا اور جو ان کی کجرویوں کا سرچشمہ تھا۔ قرآن نے یہاں اس کا جواب دیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: وہ کہتے ہیں جہنم کی آگ چند روز کے سوا ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی (وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ)۔

کہیئے: کیا خدا نے تم سے کوئی عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ خدا جس کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا پھر بغیر جانے کسی چیز کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہو (قل اتخذتم عند اللہ عھدا فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون)۔

ملت یہود کو اپنے بارے میں نسلی برتری کا زعم تھا اور یہ قوم سمجھتی تھی کہ جو وہ ہے وہی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو گنہگار ہیں انہیں فقط چند دن عذاب ہوگا اس کے بعد انہیں ہمیشہ کی جنت ملے گی۔ یہ اُن کی خود خواہی و خود پرستی کی واضح دلیل ہے۔

یہ امتیاز طلبی کسی بھی منطق کی رُو سے روا نہیں اور بارگاہ الٰہی میں اعمال پر جزا و سزا کے سلسلے میں تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہودیوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا جس کی بنا پر ان کے لئے جزا و سزا کے کلی قانون میں استثناء ہو جائے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت ایک منطقی بیان کے ذریعے اس غلط خیال کو باطل کرتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: تمہاری یہ گفتگو دو صورتوں میں سے ایک کی مظہر ہے یا تو اس سلسلے میں خدا کی طرف سے کوئی خاص عہد و پیمان ہوا ہے جب کہ ایسا پیمان تم سے ہوا نہیں یا پھر تم جھوٹ بولتے ہو اور خدا پر تہمت لگاتے ہو۔

بعد کی آیت ایک کلی و عمومی قانون بیان کرتی ہے جو ہر لحاظ سے عقلی و منطقی بھی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہاں وہ لوگ جو کسب گناہ کریں اور آثار گناہ ان کے سارے وجود کو ڈھانپ لیں وہ اہل دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (بلٰی من کسب سیئۃ و احاطت بہ خطیئتہ فاولٓئک اصحٰب النار ھم فیھا خٰلدون)۔ یہ ایک کلی قانون ہے۔ کسی قوم و ملت اور کسی گروہ و جمعیت کے گنہگاروں میں اور دیگر انسانوں میں موجود گنہ گاروں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔

رہے پرہیزگار مومنین تو ان کے بارے میں بھی ایک کلی قانون ہے جو سب کے لئے یکساں ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے۔ وہ اہل بہشت ہیں اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے

(والذین امنوا وعملوا الصٰلحٰت اولٰئک اصحٰب الجنۃ ھم فیہا خٰلدون)۔

چند اہم نکات

(۱) **غلط کمائی:** کسب اور اکتساب کا معنیٰ ہے جان بوجھ کر اپنے اختیار سے کوئی چیز حاصل کرنا۔ اس لحاظ سے "بلیٰ من کسب سیئۃ" ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے۔ جو علم، ارادہ اور اختیار سے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور "کسب" شاید اس لئے ہے کہ سرسری نظر میں گنہ گار گناہ کو اپنے نفع میں اور اس کے ترک کرنے کو اپنے نقصان میں سمجھتا ہے۔ ایسے لوگوں ہی کے بارے میں چند آیات کے بعد اشارہ ہوگا جہاں فرمایا گیا ہے:

انہوں نے آخرت کو اس دنیا کی زندگی کے لئے بیچ ڈالا اور ان کی سزا میں کسی قسم کی تخفیف نہیں ہے۔

(۲) "آثار گناہ نے احاطہ کر لیا ہے" سے کیا مراد ہے: لفظ خطیئۃ بہت سے مواقع پر ان گناہوں کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر سرزد نہ ہوئے ہوں لیکن محل بحث آیت میں گناہ کبیرہ کے معنی میں ہے[1] یا اس سے مراد ہے آثار گناہ[2] جو انسان کے دل و جان پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

بہر حال احاطہ گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس قدر گناہوں میں ڈوب جائے کہ اپنے لئے ایک ایسا قید خانہ بنالے جس کے سب سوراخ بند ہوں۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ابتداء میں ایک عمل ہوتا ہے پھر وہ ایک حالت و کیفیت میں بدل جاتا ہے۔ اس کا دوام و تسلسل ملکہ و عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جب وہ شدید ترین ہو جاتا ہے تو انسان کا تمام وجود گناہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب کسی قسم کا پند و نصیحت، موعظہ اور رہنماؤں کی رہنمائی اس کے وجود پر اثر انداز نہیں ہوتی اور حقیقت میں اپنے ہاتھوں اپنی یہ حالت بناتا ہے۔ ایسے اشخاص ان کیڑوں کی مانند ہیں جو اپنے گرد جالا تن لیتے ہیں جو انہیں قیدی بنا کر بالآخر ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

واضح ہے کہ ایسے لوگوں کا انجام ہمیشہ جہنم میں رہنے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

کچھ آیات ہیں جن کے مطابق خدا صرف مشرکین کو نہیں بخشے گا لیکن غیر مشرک قابل بخشش ہیں مثلاً:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء-۴۸)

ایسی آیات اور زیر بحث آیات جن میں ہمیشہ جہنم میں رہنے کا تذکرہ ہے اگر ان دونوں طرح کی آیات کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے گنہگار آخر کار گویا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور مشرک و بے ایمان ہو کر دنیا سے جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر کبیر از فخرالدین رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المیزان، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

(iii) نسل پرستی کی ممانعت: زیر بحث آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل پرستی کی روح جو آجکل دنیا میں بھی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ ہے اس زمانے میں یہودیوں میں موجود تھی اور وہ اپنے لئے بہت سے خیالی امتیازات کے کے قائل تھے۔ کتنے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کئی ہزار سال گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ نفسیاتی بیماری ان میں موجود ہے اور درحقیقت غاصب اسرائیلی حکومت کی پیدائش کا سبب بھی یہی نسل پرستی ہے۔

یہودی نہ صرف دنیا میں اپنی برتری کے قائل ہیں بلکہ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ نسلی امتیاز آخرت میں بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کے گنہ گار لوگ دوسری قوموں کے گنہ گاروں کے برعکس صرف تھوڑی سی مدت کے لئے خفیف سی سزا پائیں گے۔ انہی غلط خیالات نے انہی طرح طرح کے جرائم، بدبختیوں اور سیہ کاریوں میں مبتلا کیے رکھا ہے [1]

۸۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ○
۸۴۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاۗءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○
۸۵ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْھُمْ
وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

---

[1] سورہ نساء آیہ ۴۹ کے ذیل میں بھی جھوٹے امتیازات کی بحث تفسیر نمونہ جلد ۲ میں آئے گی۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

۸۶۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ع

ترجمہ

۸۳۔ اور (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا کہ تم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے اور ماں باپ، ذوی القربیٰ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کروگے اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کروگے۔ نیز نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ ادا کروگے۔ لیکن عہد و پیمان کے باوجود چند افراد کے سوا تم سب نے روگردانی کی اور (ایفائے عہد سے) پھر گئے۔

۸۴۔ اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے پیمان لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤگے اور ایک دوسرے کو اپنی سرزمین سے باہر نہیں نکالوگے، تم نے اقرار کیا اور تم خود (اس پیمان پر) گواہ تھے۔

۸۵۔ پھر تم ہو کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دیتے ہو اور گناہ و ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے ان پر تسلط حاصل کرتے ہو (اور یہ سب اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو تم نے خدا سے باندھا ہے)، لیکن اگر ان میں سے بعض قیدیوں کی شکل میں تمہارے پاس آئیں اور فدیہ دے دیں تو انہیں آزاد کر دیتے ہو حالانکہ انہیں باہر نکالنا ہی تم پر حرام ہے۔ کیا تم آسمانی کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لے آتے ہو اور کچھ سے کفر اختیار کرتے ہو۔ جو شخص (احکام و قوانین خدا میں تبعیض کا) یہ عمل انجام دیتا ہے اس کے لئے اس جہان کی رسوائی اور قیامت میں سخت ترین عذاب کی طرف بازگشت کے سوا کچھ نہیں اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

۸۶۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کے لئے آخرت کو بیچ دیا ہے لہٰذا ان کی سزا میں تخفیف نہیں ہو سکتی اور کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے عہد و پیمان کا ذکر تو کہیں کہیں آیا ہے لیکن اس بارے میں تفصیلی بیان نہیں ہوئی لیکن محل بحث آیت میں اس عہد و پیمان کی شقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر یا تمام کی تمام ان امور میں سے ہیں جنہیں ادیانِ الٰہی کے ثابت شدہ احکام کا نام دینا چاہیے کیونکہ تمام آسمانی ادیان میں یہ پیمان اور احکام موجود ہیں۔ ان آیات میں قرآن یہودیوں کو شدید سرزنش کر رہا ہے کہ تم نے اس پیمان کو کیوں توڑ دیا۔ قرآن انہیں یہ پیمان توڑنے کی

پاداش میں اس جہان کی رسوائی اور اس جہان کے شدید عذاب سے ڈرا رہا ہے۔

یہ پیمان جس کے بنی اسرائیل خود شاہد تھے اور اس کا اقرار کرتے تھے ان امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدائے یکتا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور کسی بت کے سامنے سر تعظیم نہیں جھکاؤ گے (واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللّٰہ)۔

۲۔ ماں باپ سے نیکی کرو گے (وبالوالدین احسانا)۔

۳۔ اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مدد طلب کرنے والے محتاجوں سے بھی نیکی کرو گے (وذی القربی والیتمٰی والمساکین)۔

۴۔ اجتماعی طور پر لوگوں کے ساتھ تمہارا سلوک اچھا ہوگا اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کرو گے (وقولوا للناس حسنا)۔

۵۔ نماز قائم کرو گے اور ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ رہو گے (واقیموا الصلوٰۃ)۔

۶۔ زکوٰۃ ادا کرنے اور محروم لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرو گے (واٰتوا الزکوٰۃ)۔

لیکن تم میں سے مختصر سے گروہ کے علاوہ سب نے اپنے عہد سے منہ موڑ لیا اور اپنے پیمان کو ایفا کرنے سے روگردانی کی (ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون)۔

۷۔ یاد کرو اس وقت کو جب تم سے ہم نے عہد لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے (واذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دماءکم)۔

۸۔ ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے باہر نہیں نکالو گے (ولا تخرجون انفسکم من دیارکم)۔

۹۔ اگر کوئی شخص تم میں سے جنگ کے دوران قید ہو جائے تو سب اس کی آزادی کے لئے مدد کرو گے، فدیہ دو گے اور اسے آزاد کراؤ گے (پیمان کا یہ مفہوم "افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" سے حاصل کیا گیا ہے جو بعد میں آئے گا)۔

پھر تم نے ان سب شرائط کا اقرار کیا اور اس پیمان پر خود گواہ ہوئے (ثم اقررتم وانتم تشھدون)۔

لیکن تم نے ان میں سے بہت سی شرائط کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ تم وہی تھے جو ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور اپنے میں سے کچھ لوگوں کو ان کی زمین سے نکال دیتے تھے (ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم وتخرجون فریقا منکم من دیارھم)۔ جب کہ اس گناہ اور تجاوز میں تم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے (تظاھرون علیھم بالاثم والعدوان) اور یہ سب کچھ اس عہد و پیمان کے خلاف تھا جو تم خدا سے باندھ چکے تھے۔

اس دوران میں جب ان میں سے بعض قیدیوں کی صورت میں تمہارے پاس آتے تو تم فدیہ دیتے اور انہیں آزاد کراتے تھے (وان یاتوکم اسٰری تفادوھم)، حالانکہ انہیں پہلے گھر ہی سے نکالنا تم پر حرام تھا (وھو محرم علیکم اخراجھم) اور تعجب کی بات یہ کہ فدیہ دینے اور قیدیوں کو آزاد کرانے میں تم تورات کے حکم اور پیمان الٰہی سے سند

حاصل کرتے تھے۔ کیا کتاب الٰہی کے بعض احکامات پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر اختیار کرتے ہو (افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض) یہ جو تم احکام الٰہی میں تبعیض و تفریق روا رکھے ہو اس کی جزا اس جہان کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں (فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا) اور قیامت کے دن ایسے لوگ سخت ترین عذاب کی طرف پلٹیں گے (ویوم القیٰمۃ یردون الی اشد العذاب) اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔ بلکہ اس نے تمہارے اعمال کی کلیات و جزئیات کو بڑی باریکی سے شمار کیا ہے اور اس کے مطابق تمہیں جلا دے گا۔

محل بحث آیت کے آخر میں اُن کے ان اعمال کا اصلی سبب بیان کیا ہے جو خلاف حقیقت ہیں۔ فرمایا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی ہے (اولٰئک الذین اشتروا الحیٰوۃ الدنیا بالاٰخرۃ) اسی بناء پر ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی اور کوئی ان کی مدد کے لئے کھڑا نہیں ہوگا (فلا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینصرون)۔

چند اہم نکات

(۱) آیات کا تاریخی پس منظر: جیسا کہ مفسرین نے نقل کیا ہے بنی قریظہ اور بنی نضیر جو یہودیوں کے دو گروہ تھے[۱] ان کی آپس میں قریبی رشتہ داری تھی تاہم دنیاوی منافع کی خاطر ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔ بنی نضیر، قبیلہ خزرج سے مل گئے تھے۔ جو مدینہ کے مشرکین کا قبیلہ تھا اور بنو قریظہ اوس کے ساتھ مل گئے تھے۔

ان دو قبیلوں کے درمیان جو جنگیں ہوتی تھیں ہر گروہ اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کرتا تھا اور اس طرح دوسرے گروہ کے خلاف لڑتا اور جب جنگ کی آگ سرد پڑ جاتی تو تمام یہودی جمع ہو جاتے اور ایک دوسرے سے اتحاد کرتے تاکہ فدیہ ادا کر کے اپنے قیدیوں کو آزاد کرالیں۔ اس عمل میں وہ تورات کے حکم اور قانون کو سند مانتے حالانکہ اوس و خزرج دونوں مشرک تھے اولاً ان کی مدد کرنا ہی جائز نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ وہی قانون جو فدیہ کا حکم دیتا ہے قتل کرنے سے بھی روکتا ہے[۲]۔ یہودی دیگر ہٹ دھرم اور نادان قوموں کی طرح ایسے بہت سے اعمال انجام دیتے تھے جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔

(۲) احکام الٰہی میں تبعیض، اس کا سبب اور نتیجہ: ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن مجید یہودیوں کی ایک دوسرے کے خلاف اعمال سرانجام دینے اور احکام الٰہی میں تبعیض و تفریق کرنے کی بناء پر سرزنش کر چکا ہے اور انہیں آخرت کے سخت

لہ جملہ "ما جزا" میں لفظ "ما" ممکن ہے نافیہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ استفہامیہ ہو لیکن نتیجے کے طور پر ہر دو طرح سے کوئی فرق نہیں۔

[۱] قریظہ و نضیر، اوس و خزرج کی طرح دو بھائی تھے جن میں سے ہر ایک کی نسل سے ایک گروہ پیدا ہوا۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، تفسیر المنار اور تفسیر فی ظلال میں زیر بحث آیات کے پس منظر میں یہی تاریخ بیان کی ہے۔

عذاب سے ڈرایا گیا ہے خصوصاً یہ کہ وہ چھوٹے چھوٹے احکام پر تو عمل کرتے ہیں لیکن اہم ترین احکام (مثلاً ایک دوسرے کا خون بہانے کی حرمت اور اپنے ہم مذہب لوگوں کو گھروں سے بے گھر نہ کرنے کے حکم) کی مخالفت کرتے تھے۔

دراصل وہ فقط ایسے احکام کی اہمیت کے قائل تھے جو ان کی دنیاوی زندگی کے لئے نفع بخش تھے۔ جہاں اُن کے منافع کا تقاضا ہوتا وہ ایک دوسرے کا خون تک بہا دیتے اور جب سب کے لیے خسارے اور نقصان کا احتمال ہوتا تو اپنی آئندہ احتمالی قید کے پیش نظر قیدیوں کو فدیہ ادا کر کے آزاد کرا لینے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے۔

اصولی طور پر ایسے قوانین پر انسان کا عمل جو اُس کے نفع میں ہیں۔ فرمانِ خدا کی اطاعت قرار نہیں پا سکتا کیونکہ اس عمل کا سبب خدا کا فرمان نہیں تھا بلکہ شخصی منافع کی حفاظت اس کا مقصود تھا۔ اطاعت گذار، عاصی و گنہ گار سے اس وقت ممتاز ہوتا ہے جب قانون کے مطابق عمل شخصی منافع کے خلاف ہو، مگر عوام کے نفع میں ہو۔ جو لوگ ایسے قوانین کی پیروی کرتے ہیں وہی صحیح لوگ ہیں اور جو تبعیض کرتے ہیں وہ واقعی سرکش ہیں لہذا اجرائے قوانین میں تبعیض (بعض پر عمل کرنا اور بعض پر نہ کرنا) بغاوت و سرکشی کی روح کی غماز ہے اور بعض اوقات ایمان نہ ہونے کی نشانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایمان کا اثر وہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں قانون کسی شخص کے شخصی منافع کے خلاف ہو ورنہ ان احکام الہٰی پر عمل کرنا جو انسان کے منافع کی حفاظت کرتے ہیں قابل فخر ہے نہ ایمان کی نشانی۔ لہذا مومنین اور منافقین کے درمیان ہمیشہ ایسے مواقع پر امتیاز کیا جاتا ہے۔ مومنین خدا کے تمام قوانین کے سامنے یکساں طور پر سر تسلیم خم کرتے تھے لیکن منافق تبعیض کے طرف دار رہتے ہیں اور احکام خدا میں فرق کا یہ سبب ہے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے ایسے عمل کا نتیجہ رسوائی، ذلت اور بدبختی ہے۔ وہ قوم جو مادی پہلو وہ بھی خاص شخصی فائدے کے حصول کے علاوہ اپنی فکر کا کوئی دریچہ کھلا نہیں رکھتی وہ جلد یا بدیر کسی طاقتور قوم کے چنگل میں گرفتار ہو جائے گی، عزت کی بلندی سے ذلت و پستی کے گڑھے میں جاگرے گی اور انسانی معاشروں میں رسوا ہو جائے گی۔ یہ تو ہے دنیاوی نظر سے۔ رہا آخرت کی نظر سے تو جس طرح قرآن کہتا ہے ایسے تبعیض کرنے والوں کے لئے سخت ترین سزا منتظر کھڑی ہے۔ ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ یہ قانون بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے اور آج ہم مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح مؤثر ہے۔

(iii) قوموں کی زندگی کے لئے بنیادی احکام: یہ آیات اگرچہ بنی اسرائیل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تاہم ایسے کلی قوانین کی حامل ہیں جو تمام دنیا کی قوموں کے لئے ہیں۔ قوموں کی زندگی، بقا، کامیابی اور شکست کے عوامل ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر ملت کی بقا اور سربلندی اس میں ہے کہ وہ اپنا سہارا خدا کو قرار دے جو سب سے بڑی طاقت و قوت ہے اور ہر حالت میں اس سے مدد لے یہ ایسی قدرت پر بھروسہ ہوگا جس کے لئے فنا و زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف اسی کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ اس طرح انہیں کسی کا خوف اور وحشت نہ ہوگی۔ ظاہر ہے ایسی قدرت و طاقت عظیم خالق کائنات کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی ایسا سہارا فقط خدا ہے (لا تعبدون الا اللہ)۔

دوسری طرف قوموں کی بقاء اور ہمیشگی کے لئے افراد ملت کے مابین خصوصی وابستگی ضروری ہے، ایسا یوں ممکن ہے کہ ہر شخص اپنے ماں باپ سے جن سے زیادہ قریب کی وابستگی ہے، عزیز و اقارب سے جو وابستگی کے اعتبار سے ایک فاصلے پر ہیں اور پھر معاشرے کے تمام افراد سے نیکی اور اچھائی کے ساتھ پیش آئے تاکہ سب ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں (وبالوالدین احسانا وذی القربیٰ .... وقولوا للناس حسنا)۔

قوم کے کمزور و ناتواں افراد کی تقویت روحانی اور مادی طور پر اس ہمیشگی میں کافی حصہ رکھتی ہے اور اس طرح دشمن کے لئے کوئی کمزور جگہ باقی نہیں رہتی اور قوم میں کوئی فرد مشکلات اور سختی میں نہیں رہتا کہ وہ ان مشکلات کے نتیجے میں اپنے آپ کو دشمن کے دامن میں جا گرائے (والیتمیٰ والمساکین)

ہر قوم کے زندہ رہنے کے لئے مالی و اقتصادی بنیاد کا استحکام بھی بڑا حصہ ادا کرتا ہے جو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انجام پذیر ہوتا ہے (واٰتوا الزکوٰۃ)۔

ایک طرف کامیابی کے لئے یہ امور ہیں اور دوسری طرف قوموں کی شکست اور بربادی کا راز اس وابستگی کے ٹوٹ جانے اور کشمکشوں اور اندرونی جنگ شروع ہونے میں ہے۔ وہ قوم جس میں داخلی جنگ شروع ہو جائے اور تفرقہ بازی کا پتھر اس میں پھینک دیا جائے، اس کے افراد ایک دوسرے کی مدد کی بجائے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جائیں، ایک دوسرے کے مال اور زمین پر قبضہ جمانے پر تل جائیں، ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے آستینیں الٹتے پھریں اور ہر گروہ دوسرے کو بے گھر کرنے اور اس کے مال پر تصرف کرنے کے لئے تیار کھڑا ہو تو وہ قوم جلد یا کچھ دیر میں نابود ہو جائے گی اور اس کا ملک ویران ہو جائے گا اور وہ بیچارگی و بدبختی کا شکار ہو جائے گی (لا تسفکون دمائکم ولا تخرجون انفسکم من دیارکم)۔

وہ قوم جو محروم و بے نوا افراد کی مدد اور دستگیری کی بجائے ان کا خون بہانے لگے، ان کی زمین اور مال پر تصرف کرے اور انہیں بے گھر کر دے وہ زندہ رہنے اور سربلند ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی (فما جزاء من یفعل ذٰلک منکم الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا)۔

قوموں کی بربادی اور زوال کے عوامل میں قوانین و احکام میں تبعیض بھی شامل ہے۔ یعنی جس میں ان کا فائدہ ہو بجا لائیں اور جس میں نقصان ہو اسے بھول جائیں (افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض)۔

۸۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ○

۸۸۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۸۷۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور پھر یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو واضح دلیلیں بخشیں اور روح القدس کے ذریعے ہم نے اس کی تائید کی۔ جس وقت بھی کوئی پیغمبر تمہاری خواہش کے خلاف آیا، تم اس کے مقابلے میں تکبر کرتے رہے (اور اس پر ایمان لانے سے احتراز کرتے رہے اور اسی پر بس نہیں کی) ان میں سے ایک گروہ کی تم نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کر دیتے رہے۔

۸۸۔ (آپ کی دعوت کے جواب میں وہ بطور استہزاء و تمسخر) کہتے ہیں ہمارے دل غلاف کے اندر ہیں (اور ہم تمہاری باتوں میں سے کچھ نہیں سمجھتے) (اور ہاں ایسا ہی ہے) خدا نے ان کے کفر کی بناء پر انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (اسی لئے وہ نہیں سمجھتے اور کسی چیز کا ادراک نہیں کر پاتے) اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر

ان آیات کے مخاطب تو بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ اپنے مفاہیم اور معیار کے اعتبار سے عمومیت کی حامل ہیں۔ اور دوسرے تمام لوگ بھی اس خطاب کا مصداق ہیں۔

قرآن کہتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب (تورات) دی (ولقد اٰتینا موسی الکتاب) اور پھر مسلسل یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے (وقفینا من بعدہ بالرسل)۔ ان پیغمبروں میں داؤدؑ، سلیمانؑ، یوشعؑ، زکریاؑ اور یحییٰؑ شامل ہیں۔

اور عیسیٰ بن مریم کو روشن دلائل دیے اور روح القدس کے ذریعے اس کی تائید کی (واٰتینا عیسی ابن مریم البینات وایدنٰہ بروح القدس)۔

لیکن ان عظیم مرسلین نے ان اصلاحی پروگراموں کے باوجود جب بھی کوئی بات تمہاری خواہش نفس کے خلاف کہی تو تم نے ان کے مقابلے میں تکبر اختیار کیا اور تم نے ان کی فرمانبرداری نہیں کی (افکلما جاءکم رسول بما لا تھوٰی انفسکم استکبرتم)۔

یہ ہوا و ہوس کی حاکمیت تم پر اس قدر غالب تھی کہ ان مرسلین میں سے کچھ کی تم نے تکذیب کی اور کچھ کو تو قتل ہی کر دیا (ففریقا کذبتم وفریقا تقتلون)۔

اگر تمہاری طرف سے یہ تکذیب اور جھٹلانا مؤثر ثابت ہوتا اور تمہارا مقصد اسی سے پورا ہو جاتا تو تم اسی پر اکتفا کر لیتے اور خدا کے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگتے۔

گزشتہ آیات کی تفسیر میں "احکام الٰہی میں تبعیض ...." کے ذیل میں ہم یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ ایمان کا معیار امر حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے مواقع تو وہ ہیں جو میلان طبع اور خواہش نفس کے خلاف ہوں ورنہ تو ہر ہوا پرست اور بے ایمان بھی ان احکام کے سامنے ہم آہنگی اور تسلیم کا مظاہرہ کرتا ہے جو اس کے میلان طبع اور فائدے کے مطابق ہیں۔

اس آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رہبرانِ الٰہی اپنی تبلیغ رسالت کی راہ میں ہوا پرستوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ صحیح رہبری اس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں اگر پیغمبر چاہیں کہ خود کو لوگوں کی آزادانہ ہوا و ہوس کے مطابق چلائیں تو پھر ان کا کام کسی کے پیچھے لگنا ہوا نہ کہ رہبری کرنا۔

دل کے اندھے، بے ایمان لوگ ان خدائی رہبروں کی دعوت جس کا مقصد سعادتِ بشر کے علاوہ کچھ نہ تھا کا استقبال کرنے کی بجائے اس قدر مزاحمت کرتے تھے کہ ان میں سے بعض کو قتل ہی کر دیتے تھے۔

بعد کی آیت کہتی ہے کہ یہ لوگ دعوتِ انبیاء یا آپ کی دعوت کے جواب میں تمسخر اور مذاق کے طور پہ کہتے ہیں ہمارے دل تو غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں اور ہم ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں پاتے (وقالوا قلوبنا غلف)۔[1]

اور ہے ایسا ہی — کیونکہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (اسی بنا پر وہ کسی بات کو سمجھ نہیں پاتے) اور ان میں بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں (بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلا ما یؤمنون)۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر والا جملہ ان یہودیوں کے بارے میں ہو جنہوں نے پیغمبرانِ خدا کی تکذیب کی یا انہیں قتل کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان یہودیوں کے متعلق ہو جو پیغمبر خدا کے ہم عصر تھے۔ آنحضرتؐ کی گفتگو کے جواب میں وہ انتہائی لاپرواہی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تاہم یہ آیت ہر صورت میں اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسان ہوا و ہوس کی پیروی کے زیرِ اثر اس طرح راندۂ درگاہِ خدا ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس راستے میں اسے حقیقت بہت کم نظر آتی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) مختلف زمانوں میں انبیاء کی پے در پے آمد: جیسا کہ کہا جا چکا ہے جب ہوا پرست اور بے ایمان لوگ انبیاء کی دعوت کو اپنی ہوا و ہوس اور ناجائز منافع سے ہم آہنگ نہیں پاتے تھے تو ان کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے خصوصاً لوگ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد ان کی تعلیمات کو طاقِ نسیاں کر دیتے۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ یاد دہانی کے لئے خدا کی جانب سے یکے بعد دیگرے مرسلین آتے رہیں تاکہ ان کا مکتب اور پیغام پرانا نہ ہونے پائے اور دستِ فراموشی کے حوالے نہ ہو جائے۔

سورہ مومنون آیہ ۴۴ میں ہے:

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا

پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ جب کوئی رسول کسی امت کے پاس آتا تو لوگ اس کی تکذیب

---

[1] غلف، اغلف کی جمع ہے جس کا معنی ہے۔ غلاف دار

کرتے (لیکن) ہم تو انہیں یکے بعد دیگرے بھیجتے ہی رہتے تھے۔

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں جہاں انبیاء کے بھیجنے کی غرض و غایت کی تشریح کی گئی ہے وہاں اس حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے:

فبعث فیھم رسلہ وواتر الیھم انبیائہ لیستأدوھم میثاق فطرتہ ویذکروھم منسی نعمتہ ویحتجوا علیھم بالتبلیغ ویثیروا لھم دفائن العقول۔

خدا نے اپنے رسولوں کو ان کی طرف مبعوث کیا اور اپنے انبیاء کو ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ لوگوں سے ان کے فطری عہد و پیمان کی ادائیگی کا مطالبہ کریں اور انہیں خدا کی فراموش شدہ نعمتیں یاد دلائیں اور انبیاء تبلیغات کے ذریعے لوگوں پر اتمام حجت کریں اور تاکہ عقول کے مخفی خزانے ان کی تعلیمات کے ذریعے آشکار ہوں۔

لہٰذا مختلف زمانوں اور صدیوں میں انبیاء خدا کے آنے کا مقصد خدا کی نعمتوں کی یاد دہانی کرانا، پیمان فطرت کی ادائیگی کی طرف توجہ دلانا اور گذشتہ انبیاء کی تبلیغات اور دعوتوں کی تجدید کرنا تھا تاکہ ان کی دعوتیں اور ان کے اصلاحی پروگرام متروک اور فراموش نہ ہو جائیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ پیغمبر اسلام کیونکر خاتم انبیاء ہیں اور ان کے بعد نبی کی کیوں ضرورت نہیں تو اس پر انشاءاللہ سورہ احزاب کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں بحث ہوگی۔

(ii) روح القدس کیا ہے؟: بزرگ مفسرین روح القدس کے بارے میں مختلف تفاسیر بیان کرتے ہیں۔ ہم یہاں چند ایک درج کرتے ہیں:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل ہے۔ اس تفسیر کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسٰی کی مدد کی۔

اس تفسیر کی شاہد سورہ نحل کی آیہ ۱۰۲ ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ۔

کہیے! روح القدس نے اسے تم پر حقیقت کے ساتھ نازل کیا۔

رہا یہ سوال کہ جبرائیل کو روح القدس کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں میں روحانیت کا پہلو چونکہ غالب ہے لہٰذا ان پر روح کا اطلاق بالکل طبیعی اور فطری ہے اور "قدس" اس فرشتے کے بہت زیادہ تقدس اور پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ کچھ دوسرے مفسرین کا عقیدہ ہے کہ روح القدس وہی ایک غیبی طاقت ہے جو حضرت عیسٰی کی تائید کرتی تھی اور اس مخفی خدائی طاقت سے وہ مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرتے تھے البتہ یہ غیبی طاقت ضعیف تر صورت میں تمام مومنین میں درجات ایمان کے تفاوت کے حساب سے موجود ہے۔ اور یہ وہی خدائی امداد ہے جو انسان کو اطاعات اور مشکل

کاموں کی انجام دہی میں مدد دیتی ہے اور گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں ایک شاعر اہلبیتؑ کے بارے میں ہے کہ جب وہ امامؑ کے سامنے اشعار پڑھ چکا تو آپؑ نے فرمایا:

انما نفث روح القدس علیٰ لسانك

روح القدس نے تیری زبان پر دم کیا ہے اور جو کچھ تو نے کہا ہے اسی کی مدد سے ہے۔[1]

۲۔ بعض مفسرین نے روح القدس کا معنی انجیل بیان کیا ہے۔[2]

ان میں سے پہلی دو تفاسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔

(iii) روح القدس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ: "قاموس" کتاب مقدس میں ہے:

روح القدس تیسرا اقنوم۔ اقانیم ثلاثہ الٰہیہ میں سے شمار ہوتا ہے اور اسے روح کہتے ہیں کیونکہ وہ مبدع اور مخترع حیات ہے اور مقدس اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے مخصوص کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مومنین کے دلوں کی تقدیس کرتا ہے۔ حضرت مسیح اور خدا سے اسے جو وابستگی ہے اس بناء پر اسے روح اللہ اور روح المسیح بھی کہتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک اور احتمال بھی آیا ہے اور وہ یہ ہے:

وہ روح القدس جو ہمیں تسلی دیتا ہے۔ وہ وہی ہے جو ہمیشہ ہمیں سچائی، ایمان اور اطاعت کے قبول و ادراک کی ترغیب دیتا ہے اور وہی ہے جو گناہ و خطا میں مرجانے والے لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور انہیں پاک و منزہ کرکے حضرت واجب الوجود کی عظمت و بزرگی کے لائق بناتا ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس کتاب مقدس قاموس کی عبارات میں دو معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے:

(۱) ایک یہ کہ روح القدس تین خداؤں میں سے ایک ہے جو کہ عقیدۂ تثلیث کے مطابق ہے اور یہ وہ مشرکانہ عقیدہ ہے جسے ہم ہر لحاظ سے مردود سمجھتے ہیں۔

(۲) دوسرا مفہوم اوپر بیان کی گئیں تین تفاسیر میں سے دوسری سے ملتا جلتا ہے۔

(iv) بے خبر اور غلاف میں لپٹے دل: مدینہ کے یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تبلیغات کا پوری کوشش سے مقابلہ کرتے اور آپؐ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اور جب بھی آپؐ کے بار دعوت سے بچنے کا کوئی

---

[1] رسول اکرمؐ نے حسان بن ثابت سے بھی غدیر خم کے موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر فرمایا تھا:

لن یزال معك روح القدس ما ذببت عنا

جب تک ہمارا دفاع کرو گے روح القدس تمہارے ساتھ رہے گا۔

سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۴۹۵، مادہ کمیت

[2] تفسیر المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بہانہ ملتا اس سے پورا فائدہ اٹھاتے اس آیت میں ان کی ایک گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے تھے ہمارے دل پردے اور غلاف میں لپٹے ہیں۔ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات وہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے لیکن قرآن کہتا ہے: بات یہی ہے کہ جو وہ کہہ رہے ہیں کیونکہ کفر و نفاق کے باعث اُن کے دل بے خبری، ظلمت، گناہ اور کفر کے پردوں میں لپیٹے جا چکے ہیں اور خدا نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

سورہ نساء آیہ ۱۵۵ میں بھی یہی مفہوم مذکور ہے:

وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

اور ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دل غلاف میں لپٹے ہیں اس لئے تمہاری بات سمجھ نہیں پاتے لیکن یہ تو اس بناء پر ہے کہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ لہٰذا ان میں سے چند ایک کے علاوہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۸۹۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

۹۰۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

ترجمہ

۸۹۔ اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے۔ جو ان یہودیوں کے پاس ہیں۔ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں تھے اور مشرکین کی زیادتیوں کے مقابلے میں) فتح کی امید رکھتے تھے (کہتے تھے کہ اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

۹۰۔ انہوں نے اپنے نفسوں کو بُری قیمت پر بیچا ہے کیونکہ غلط کاری کے مرتکب ہوتے ہوئے وہ ان آیات سے کافر

ہوگئے ہیں جو خدا کی بھیجی ہوئی ہیں (چونکہ پیغمبر اسلام بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں) اور خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے فضل سے اپنی آیات نازل کرتا ہے لہذا ان پر یکے بعد دیگرے خدا کا غضب نازل ہوا اور کافروں کے لئے ذلیل و خوار کرنے والی سزا اور بدلہ ہے۔

شان نزول

زیر نظر آیت کے بارے میں امام صادقؑ سے روایت ہے:

یہودیوں نے اپنی کتب میں دیکھ رکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کا مقام ہجرت "عیر" اور "اُحد" کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا۔ (یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اردگرد ہیں) یہودی اپنے علاقے چھوڑ کر رسولؐ کی ہجرت کی سرزمین کی تلاش میں نکلے اس دوران وہ "حداد" نامی پہاڑ تک پہنچے اور کہنے لگے "حداد" ہی اُحد ہے۔ وہیں سے وہ منتشر ہوگئے۔ ہر گروہ نے ایک جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ سرزمین "تیما" میں جا بسے بعض "فدک" میں قیام پذیر ہوئے اور کچھ "خیبر" میں رہنے لگے۔ (کچھ مدت بعد) تیما کے رہنے والوں نے اپنے دوسرے بھائیوں سے ملنا چاہا۔ اس اثنا میں ایک عرب وہاں سے گذرا۔ اُس سے انہوں نے سواریاں کرایہ پر لیں۔ عرب کہنے لگا میں تمہیں "عیر" اور "احد" کی پہاڑیوں میں سے لے جاؤں گا۔ اس سے کہنے لگے جب ان دو پہاڑوں کے درمیان پہنچو تو ہمیں آگاہ کرنا۔ وہ عرب جب سرزمین مدینہ میں پہنچا تو اس نے انہیں بتایا کہ یہ جگہ کوہ عیر اور کوہ اُحد کے درمیان ہے۔ پھر اس نے اشارے سے بتایا کہ یہ عیر ہے اور یہ اُحد ہے۔ یہودی اس کی سواریوں سے اتر پڑے اور کہنے لگے ہم اپنے مقصد تک آپہنچے ہیں۔ اب ہمیں تیری سواریوں کی ضرورت نہیں، اب تو جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائیوں کو خط لکھا کہ ہم نے وہ زمین تلاش کر لی ہے تم بھی ہماری طرف کوچ کرو۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم چونکہ یہاں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ گھر بار اور مال و منال کا اہتمام کر چکے ہیں اور یہاں سے اس سرزمین کا کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہیں جس وقت پیغمبر موعود ہجرت کرکے آئیں گے ہم بھی تمہارے پاس آجائیں گے۔

وہ سرزمین مدینہ ہی میں رہے اور بہت مال و دولت جمع کر لی۔ یہ خبر "تبع" نامی ایک بادشاہ کو پہنچی۔ اس نے آکر ان سے جنگ کی۔ یہودی اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہوگئے۔ اُس نے ان سب کا محاصرہ کر لیا۔ پھر انہیں امان دے دی۔ وہ بادشاہ کے پاس آئے۔ "تبع" نے کہا مجھے یہ سرزمین پسند آئی ہے اور میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جواب میں کہا: ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سرزمین ایک پیغمبر کا مقام ہجرت ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی شخص بادشاہ کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا۔ تبع کہنے لگا کہ میں اپنے خاندان میں سے کچھ لوگ یہاں چھوڑ دیتا ہوں تاکہ جب وہ پیغمبر آئے یہ اس کی

مدد کریں۔ لہٰذا اس نے دو مشہور قبائل "اوس" اور "خزرج" کو یہاں ٹھہرا دیا۔ جب ان قبیلوں نے خوب مال و دولت جمع کر لیا۔ تو یہودیوں کے مال پر تجاوز کرنے لگے۔ یہودی ان سے کہا کرتے تھے، جب محمد مبعوث ہوں گے تو تمہیں ہمارے علاقے سے نکال دیں گے۔

جب حضرت محمدؐ مبعوث ہوئے تو اوس اور خزرج آپ پر ایمان لے آئے جو انصار مشہور ہوئے مگر یہودیوں نے آپ کا انکار کیا۔ آیت "وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا" کا یہی مفہوم ہے۔

وہی لوگ جو خاص عشق و محبت کی وجہ سے، رسول اللہؐ پر ایمان لانے کے لئے آئے تھے جو اوس و خزرج کے مقابلے میں فخر کرتے تھے کہ ایک رسول مبعوث ہوگا اور ہم اس کے یار و مددگار ہوں گے۔ جب رسول اللہؐ کی ہجرت ہوئی اور آپؐ نے ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی، وہی قرآن جو تورات کی تصدیق کرتا تھا، تو وہ اس سے کفر کرنے لگے۔

تفسیر

ان آیات میں بھی یہودیوں اور ان کی زندگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہے یہ لوگ رسولِ خدا پر ایمان لانے کے شوق اور دل بستگی کے ساتھ مدینہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ تورات میں پیغمبرؐ کی نشانیوں کو دیکھتے تھے اور بے چینی سے آپؐ کے ظہور کا انتظار کرتے تھے لیکن جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب (قرآن) آئی جو ان علامتوں کے مطابق تھی جو یہودیوں کے پاس تھیں حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس پیغمبرؐ کے ظہور کی خوشخبری دیتے تھے اور پیغمبرؐ کے ظہور کے ذریعے دشمنوں پر فتح پانے کی امید لگائے بیٹھے تھے اور جب کہ وہ کتاب اور پیغمبر کو پہلے سے پہچانتے تھے پھر بھی اس سے کفر اختیار کر بیٹھے (ولما جاءھم کتٰب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ)۔

کافروں پر خدا کی لعنت ہو (فلعنۃ اللہ علی الکافرین)۔

بعض اوقات انسان کسی حقیقت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے لیکن اس کے قریب پہنچ کر جب اسے اپنے ذاتی فائدے کے خلاف پاتا ہے تو ہوا و ہوس کے نتیجے میں اسے ٹھوکر مار دیتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے بلکہ کبھی تو اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

لیکن یہودیوں نے تو انتہائی خسارے کا سودا کیا۔ جو لوگ پیغمبر موعود کی پیروی کے لئے اپنے علاقے کو چھوڑ کر، بہت سی مشکلات جھیل کر سرزمین مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے تاکہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں، جب موقع آیا تو منکرین اور کافرین کی صف میں کھڑے ہو گئے لہٰذا اس مقام پر قرآن کہتا ہے، دیکھیں بری قیمت پر انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کیا (بئسما اشتروا بہ انفسھم)۔

وہ حسد کی بنا پر اس چیز سے کافر ہو گئے جو خدا نے نازل کی تھی۔ انہیں اعتراض تھا کہ کیوں خدا اپنے فضل سے

جس شخص پر چاہتا ہے اپنی آیات نازل کر دیتا ہے (ان یکفروا بما انزل الله بغیا ان ینزل الله من فضله علی من یشاء من عباده)۔

گویا اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر موعود بنی اسرائیل میں سے اور خود انہی میں سے ہوگا لیکن جب کسی اور پر قرآن نازل ہوا تو انہیں تکلیف پہنچی اور وہ سیخ پا ہو گئے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: لہٰذا خدا کے غضب نے یکے بعد دیگرے انہیں گھیر لیا اور کافروں کے لئے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے (فباءو بغضب علی غضب ط وللکفرین عذاب مهین)۔

چند اہم نکات

(۱) خسارے کا سودا: درحقیقت یہودیوں نے ایک خسارے کا سودا کیا تھا۔ کیونکہ ابتداء میں وہ اسلام اور اسلام کے پیغمبر موعود کے داعی تھے۔ یہاں تک کہ تمام مشکلات جھیل کر مدینہ کی زندگی انہوں نے اسی مقصد کے لئے انتخاب کی تھی۔ لیکن پیغمبر خدا کے ظہور کے بعد صرف اس بناء پر کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں یا آپ کی وجہ سے ان کے ذاتی منافع خطرے میں پڑ گئے تھے، وہ آپ کے کافر و منکر ہو گئے اور یہ بہت زیادہ خسارے اور نقصان کا معاملہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد کو نہ پہنچے بلکہ اپنی تمام قوتیں اور طاقتیں صرف کر کے اس کے برعکس حاصل کرے اور خدا کا غضب اور ناراضی بھی الگ اٹھانی پڑے۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے ارشادات میں ہے:

لیس لانفسکم ثمن الا الجنة فلا تبیعوها الا بها[1]

تمہارے نفسوں کی قیمت جنت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی لہٰذا اپنے نفسوں کو اس کے علاوہ کسی چیز کے بدلے نہ بیچو۔

مگر یہودی اس گراں بہا سرمایہ کو مفت میں گنوا بیٹھے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ سودا ان کے اصل وجود کا بیان کیا گیا ہے یعنی حق و حقیقت سے منکر و کافر ہیں تاکہ اپنی حقیقت ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ کیونکہ کفر کے ساتھ ان کے وجود کی قیمت بالکل گر جاتی ہے گویا اپنی شخصیت گنوا بیٹھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان غلاموں کی طرح ہیں جنہوں نے اپنا وجود زنگ کر اسے دوسرے کی قید میں دے دیا ہو چنانچہ وہ ہوا و ہوس کے قیدی اور شیطان کے بندے ہیں۔

لفظ "اشتروا" اگرچہ عموماً خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی بیچنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ لغت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ بیچنے ہی کے معنی میں ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۴۵۶۔

اپنا وجود مال و متاع کی طرح بیچا ہے اور اس کے بدلے غضب پروردگار یا کفر و حسد خریدا ہے۔

(ا ا) فباءو بغضب علیٰ غضب: بنی اسرائیل جب صحرائے سینا میں سرگرداں تھے اس عالم کی سرگذشت کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وباءو بغضب من اللہ (وہ غضب خدا کی طرف پلٹے) اس کے بعد مزید کہتا ہے: یہ خدا کا غضب ان پر انبیاء کے قتل اور آیاتِ خدا سے کفر کی وجہ سے تھا۔

سورہ آل عمران آیہ ۱۱۲ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ یہودی آیاتِ الٰہی سے کفر اور قتل انبیاء کی وجہ سے غضب الٰہی کا شکار ہوئے یہ پہلا غضب ہے جو انہیں دامن گیر ہوا۔

ان کے باقی ماندہ افراد نے پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد ان سے اپنے بڑوں والی روش ہی جاری رکھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے آئین کے خلاف تھے بلکہ ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اسی طرز عمل کی وجہ سے ایک نئے غضب نے انہیں گھیر لیا اسی لئے فرمایا: فباءو بغضب علیٰ غضب۔

دراصل لفظ "باءو" کا معنی ہے وہ لوٹے اور انہوں نے سکونت اختیار کی اور یہ کنایہ ہے استحقاق پیدا کرنے سے۔ یعنی انہوں نے غضب پروردگار کو اپنے لئے منزل و مکان کی طرح انتخاب کیا۔

یہ سرکش و باغی گروہ حضرت موسیٰ کے قیام سے پہلے اور پیغمبر اسلام کے ظہور سے قبل دونوں مواقع پر ایسے قیام کے سختی سے طرفدار تھے لیکن دونوں قیاموں کے روبہ عمل ہونے کے بعد وہ اپنے عقیدے سے پھر گئے اور یکے بعد دیگرے اپنی جان کے بدلے غضب خدا خرید لیا۔

۹۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ
يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ
اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

۹۲۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ
اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

۹۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۗ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۗ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ
بِكُفْرِهِمْ ۗ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

۹۱۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس چیز پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوئی (اس پر نہیں جو دوسری قوموں میں سے کسی پر نازل ہو) اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کر لیتے ہیں جب کہ وہ حق ہے اور ان آیات کی تصدیق کرتا ہے جو ان پر نازل ہوئی ہیں۔ کہیئے کہ اگر سچ کہتے ہو تو پھر اس سے پہلے انبیاء کو قتل کیوں کیا کرتے تھے۔

۹۲۔ نیز موسیٰ تمہارے لئے سب معجزات لے کر آئے (تو پھر کیوں تم نے) بعد ازاں بچھڑے کو منتخب کر لیا اور اس عمل سے تم نے (اپنے اوپر) ظلم کیا۔

۹۳۔ اور تم سے ہم نے وہ پیمان لیا اور تم پر کوہ طور بلند کیا (اور تم سے کہا) یہ قوانین و احکام جو ہم نے تمہیں دیے ہیں انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو اور صحیح طرح سے سنو۔ تم نے کہا، ہم نے سن لیا ہے اور پھر نافرمانی کی ہے اور کفر کے نتیجے میں بچھڑے کی محبت سے تمہارے دلوں کی آبیاری ہوئی اگر تم ایمان رکھتے ہو تو کہہ دو کہ تمہارا ایمان تمہیں کیسا برا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کی تفسیر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودیوں نے ان زحمتوں اور مشکلوں کے باوجود جو انہوں نے تورات کے پیغمبر موعود تک پہنچنے کے لئے جھیلیں۔ اب حسد کی وجہ سے، یا اس بناء پر کہ یہ پیغمبر بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے یا اس لئے کہ ان کے ذاتی فائدے خطرے میں پڑ جائیں گے یا پھر اور وجوہات کے باعث اس کی اطاعت اور اس پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا۔

زیر بحث آیات میں سے پہلی میں یہودیوں کے اس تعصب نسلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ فرمایا: جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں ہم تو اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے (نہ کہ دوسری قوموں پر) اور اس کے علاوہ سے کفر اختیار کریں گے (واذا قیل لھم اٰمنوا بما انزل اللہ قالوا نؤمن بما انزل علینا و یکفرون بما وراءہ)۔

وہ انجیل پر ایمان لاتے ہیں قرآن پر بلکہ وہ فقط نسلی امتیاز اور اپنے ذاتی فائدے نظر میں رکھے ہوئے ہیں جب کہ قرآن جو محمدؐ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے اور ان نشانیوں اور علامتوں کے مطابق ہے جو پیغمبر موعود کے بارے میں وہ اپنی کتاب میں پڑھ چکے ہیں (وھو الحق مصدقاً لما معھم)۔

اس کے بعد قرآن ان کے جھوٹ سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: اگر تمہارے ایمان نہ لانے کا بہانہ یہ ہے کہ محمدؐ تم میں سے نہیں ہے تو پھر گذشتہ زمانے میں اپنے انبیاء پر ایمان کیوں نہیں لاتے ہو اور کیوں انہیں قتل کرتے رہے ہو اگر سچ کہتے ہو اور ایمان دار ہو (قل فلم تقتلون انبیاء اللہ من قبل ان کنتم مؤمنین)۔

اگر وہ سچے دل سے ایمان لائے ہوتے تو خدا کے عظیم انبیاء کو قتل نہ کرتے کیونکہ تورات تو انسانی قتل کو بہت بڑا گناہ قرار دیتی ہے۔

علاوہ ازیں خود یہ کہنا کہ ہم تو صرف ان قوانین و احکام پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوتے ہوں، دراصل اصولِ توحید اور شرک کا مقابلہ کرنے کے مفہوم سے واضح کجروی ہے۔ یہ ایک طرح کی خود خواہی اور خود پرستی ہے شخصی صورت میں ہو یا نسلی شکل میں۔ توحید اس لئے ہے کہ ایسے خیالات کو وجود انسانی میں سے جڑ سے اکھاڑ پھینکے تاکہ انسان خدا کے قوانین کو صرف اس لئے قبول کرے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اگر خدائی احکامات صرف اس شرط پر قبول کئے جائیں کہ وہ خود ہم پر نازل ہوں تو حقیقت میں یہ شرک ہے نہ کہ ایمان اور یہ کفر ہے نہ کہ اسلام اور اس طرح احکام قبول کرنا ہرگز ایمان کی دلیل نہیں ہے۔ اسی لئے تو مندرجہ بالا آیت میں ہے: اذا قیل لھم اٰمنوا بمآ انزل اللہ۔ یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ۔ اس آیت میں نہ محمدؐ کا نام ہے نہ موسیٰ و عیسیٰ کا۔

ان کے کذب کو ظاہر کرنے کیلئے قرآن صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بعد کی آیت میں ان کے خلاف ایک اور سند پیش کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: موسیٰ نے تمام معجزات و دلائل تمہارے سامنے پیش کئے لیکن تم نے اس کے بعد بچھڑے کو منتخب کیا اور اس کام کی وجہ سے تم ظالم و ستمگار شمار ہوئے (ولقد جاءکم موسیٰ بالبینٰت ثم اتخذتم العجل من بعدہ وانتم ظٰلمون)۔

اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم اپنے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہو تو پھر یہ بچھڑے کی پرستش اور وہ بھی توحید پر واضح دلائل کے بعد کیا ہے۔ یہ کیسا ایمان ہے جو صرف موسیٰ کے اوجھل ہونے اور کوہ طور پر جانے سے تمہارے دلوں سے زائل ہو گیا اور کفر نے ایمان کی جگہ اور بچھڑے نے توحید کا مقام حاصل کر لیا۔ بے شک اس کام سے تم نے اپنے اوپر، معاشرے پر اور آئندہ نسلوں پر ظلم کیا ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں ان کے دعویٰ کے بطلان پر ایک اور سند پیش کی گئی ہے اس ضمن میں کوہ طور کے عہد و پیمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا: ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا اور تم سے کہا کہ جو حکم ہم تمہیں دیں اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور صحیح طور سے سنو لیکن تم نے کہا ہم نے سن کر اس کی مخالفت کی (واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ واسمعوا قالوا سمعنا وعصینا)۔

بے شک ان کے دلوں کی بچھڑے کی محبت سے آبیاری ہوئی اور کفر نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا (واشربوا فی قلوبھم العجل بکفرھم)۔

شرک اور دنیا پرستی نے جس کی مثال سامری کے بنائے ہوئے سونے کے بچھڑے سے ان کی محبت ہے، ان کے تار و پود میں اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا اور ان کے سارے وجود میں اس کی جڑیں پہنچ گئی تھیں۔ اسی بنا پر وہ خدا کو بھول گئے تھے۔

عجیب مسخرہ پن ہے یہ کیسا ایمان ہے جو خدا کے پیغمبروں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے جو بت پرستی اور بچھڑے کی پرستش کو بھی روا جانتا ہے اور خدا سے باندھے ہوئے محکم میثاقوں کو طاقِ نسیاں کر دیتا ہے۔

اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تمہیں کیسے برے احکام دیتا ہے (قل بئسما یامرکم بہ ایمانکم ان کنتم مومنین)۔[1]

چند اہم نکات

(۱) "قالوا سمعنا و عصینا" کا مفہوم: اس کا معنی ہے "ہم نے سنا اور معصیت کی"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زبان سے یہ الفاظ کہتے ہیں بلکہ ظاہراً اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے اس واقعیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ ایک عمدہ کنایہ ہے جو روزمرہ گفتگو میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) "واشربوا فی قلوبھم العجل" کا مفہوم: یہ بھی ایک عمدہ کنایہ ہے جو یہودی قوم کی حالت بیان کرتا ہے۔

جیسا کہ مفردات راغب میں ہے کلمہ "اشراب" کے دو معانی ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ "اشربت البعیر" کے باب سے ہو یعنی "میں نے اونٹ کی گردن میں رسی باندھی" اس معنی کے لحاظ سے مندرجہ بالا جملہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ "محبت و وابستگی کی مضبوط رسی نے ان کے دلوں کو بچھڑے سے باندھ دیا"۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اس کا مادہ "شراب" سے ہو جس کا معنی ہے "آبیاری کرنا" اور "دوسرے کو پانی دینا"۔ اس صورت میں لفظ "حب" مقصود ہو گا۔ یوں مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہو گا "بنی اسرائیل نے اپنے دلوں کی بچھڑے کی محبت سے آبیاری کی"۔

یہ اہل عرب کی عادات کا حصہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق سخت قسم کا تعلق یا زیادہ کینہ ظاہر کرنا چاہیں تو مندرجہ بالا تعبیر ہی کی طرح کا انداز اختیار کرتے ہیں۔

اس سے ضمناً ایک اور نکتہ بھی نکلا کہ بنی اسرائیل کے ان غلط کاموں پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اعمال ان کے دلوں کی اس سرزمین کا حاصل ہیں جس کی شرک کے پانی نے آبیاری کی گئی ہے اور جو سرزمین ایسے پانی سے سیراب ہو اس سے خیانت، قتل انبیاء اور گناہ و ظلم کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس بات کی اہمیت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جب موجودہ دین یہود میں موجود قتل کی قباحت اور انسان کے قتل کی برائی کے احکام پر نظر جاتی ہے جنہیں خاص اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہودیوں کا دین اس ظلم کو اس قدر برا سمجھتا تھا کہ قاموس کتاب مقدس صفحہ ۷۰۰ کی تحریر کے مطابق قتل عمد اور

---

[1] بنی اسرائیل کے پیمان نیز اس کی تشریح اور خصوصیات اسی سورہ کی آیت ۵۱ اور ۶۳ میں بیان ہو چکی ہیں۔

اس کی قباحت اسرائیلیوں کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ وہ قتل کر دئیے جانے کے بعد اور مدتوں ایسے شہروں میں پناہ لینے کے بعد بھی جنہیں پناہ گاہ کہا جاتا تھا اور مقامات مقدسہ پر التجا کے باوجود بھی قاتل بری الذمہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس سے ہر صورت میں قصاص لیا جاتا۔

یہ تو کسی عام انسان کے قتل کے بارے میں ہے چہ جائیکہ خدا کے انبیاء کا قتل۔ پس اگر بنی اسرائیل تورات پر ایمان رکھتے تو انبیاء کو قتل نہ کرتے۔

۹۴۔ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۹۵۔ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ○

۹۶۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۹۴۔ کہہ دو اگر (جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو) خدا کے ہاں آخرت کا گھر دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر مرنے کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

۹۵۔ لیکن وہ برے اعمال کی صورت میں جو آگے بھیج چکے ہیں ان کے باعث کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے اور خدا ظالموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔

۹۶۔ انہیں سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے یہاں تک کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر لالچی (دولت جمع کرنے اور اس دنیا کی) زندگی پر پاؤ گے (یہاں تک کہ) ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار سال عمر پائے حالانکہ یہ طولانی عمر (بھی) اسے خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی اور خدا ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔

تفسیر

خود پسند گروہ

قرآن مجید کی مختلف آیات کے علاوہ بھی یہودیوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بلند نسل سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہی انسانی معاشرے کے منتخب پھول ہیں اور بہشت انہی کے لئے بنائی گئی ہے اور جہنم کی آگ

ان سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی، وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آنچہ خوباں ہمہ دارند انہا تنہا دارند یعنی تمام عالم کی اچھائیاں انہی میں جمع ہیں۔

ان کی یہ موشگافیاں، خود خواہی قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے، جن میں یہودیوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

سورہ مائدہ کی آیت ۱۸ میں ہے:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط

یعنی۔ ہم خدا کے فرزند اور خاص دوست ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۱ میں ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط

یعنی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہودی اور عیسائی کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جا سکتا۔

سورہ بقرہ کی آیہ ۸۰ میں ہے:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط

چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ ہمیں نہیں چھوئے گی۔

یہ موہوم خیالات ایک طرف تو انہیں ظلم و زیادتی اور گناہ و طغیان کی طرف مائل کرتے اور دوسری طرف تکبر، خود پسندی اور خود کو سب سے بلند سمجھنے کی دعوت دیتے۔

مندرجہ بالا آیات میں قرآن مجید انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر خدا کے ہاں باقی لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر موت کی تمنا کرو اگر سچ کہتے ہو۔ قل ان کانت لکم الدار الاٰخرۃ عند اللہ خالصۃ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین۔

یعنی کیا تم مائل نہیں ہو کہ جوار رحمت خدا میں جا کر پناہ لو اور جنت کی بے شمار نعمتیں تمہارے اختیار میں ہوں۔ کیا تم اپنے محبوب کے دیکھنے کے آرزو مند نہیں ہو۔

یہودی چاہتے تھے کہ وہ یہ بات کہہ کے مسلمانوں کو آزردہ خاطر کریں کہ بہشت تو یہودیوں کے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ ہم تو دوزخ میں تھوڑے دن جلیں گے اور یا کہتے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی ہوگا۔ قرآن نے ان کے اس جھوٹ سے پردہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ جب وہ دنیا کی زندگی کو کسی طرح ترک کرنے کو تیار نہیں تو یہی ان کے جھوٹے ہونے کی محکم دلیل ہے۔

واقعاً اگر انسان کا دار آخرت کے بارے میں وہی ایمان ہو جو بزعم خود یہودیوں کا تھا تو وہ اس دنیا سے کیسے لو لگا سکتا ہے اور کیسے اس کے حصول کے لئے ہزاروں گناہوں کا مرتکب ہو سکتا ہے اور وہ موت سے یہاں تک کہ اپنے مقصد

کی راہ میں بھی کیسے ڈر سکتا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے۔ اپنے آگے بھیجے ہوئے بُرے اعمال کی وجہ سے وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے (ولن یتمنوہ ابداً بما قدمت ایدیھم) اور خدا ستمگاروں سے واقف ہے (واللہ علیم بالظّٰلمین)۔

جی ہاں ـــ وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال ناموں میں کیسی سیاہیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے قبیح اور سنگین گناہوں سے مطلع تھے۔ خدا بھی ان ظالموں کے اعمال سے آگاہ ہے۔ اسی لئے ان کے لئے آخرت کا گھر عذاب، سختی اور رسوائی کا گھر ہے اور اسی بناء پر وہ اس کی خواہش نہیں رکھتے۔

محل بحث آیت مادی چیزوں کے متعلق اُن کی شدید حرص کا تذکرہ یوں کرتی ہے: انہیں تم اس زندگی پر سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ (ولتجدنھم احرص الناس علی حیٰوۃ ج)۔ یہاں تک کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر (ومن الذین اشرکوا ج)۔ مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی میں حریص، دنیا پر قبضہ کرنے میں حریص، سب کچھ اپنے لئے سمجھنے میں حریص یہاں تک یہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص ہیں حالانکہ مشرکین کو فطری طور پر مال جمع کرنے میں سب سے زیادہ حریص ہونا چاہیئے۔

ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہزار سال تک زندہ رہے (یود احدھم لو یعمر الف سنۃ ج) زیادہ ثروت جمع کرنے کے لئے یا سزا کے خوف سے۔

ہاں ـــ وہ موت سے ڈرتے ہیں اور ہزار سالہ عمر کی تمنا کرتے ہیں لیکن یہ طولانی عمر بھی انہیں عذاب خدا سے نہیں بچا سکے گی (وما ھو بمزحزحہ من العذاب ان یعمر ط)۔

اگر وہ گمان کرتے ہیں کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ نہیں ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ خدا ان کے اعمال کے بارے میں بصیر و بینا ہے (واللہ بصیر بما یعملون)۔

چند اہم نکات

(۱) ہزار سال عمر کی تمنا: توجہ رہے کہ ہزار سال سے مراد ہزار سال کا عدد نہیں بلکہ یہ طولانی عمر سے کنایہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عدد تکثیر ہے ذکر عدد تعداد۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہزار کا عدد اس زمانے میں عربوں کے نزدیک سب سے بڑا عدد تھا اور اس سے بڑے عدد کا ان کے پاس کوئی نام نہیں تھا لہٰذا سب سے بڑا مبالغہ یہی شمار ہوتا تھا۔[1]

(۲) "علیٰ حیٰوۃ"، نکرہ کی صورت میں یہ تعبیر کچھ مفسرین کے قول کے مطابق تحقیر کے لئے ہے یعنی انہوں نے دنیا کی زندگی سے دل وابستہ کر رکھا ہے یہاں تک کہ اس جہان کی پست ترین زندگی کو بھی جو بدبختی میں گزرے وہ آخرت کے گھر پر ترجیح دیتے ہیں۔[2]

---

[1] المنار جلد ۱ صفحہ ۳۸۴

[2] المیزان ج ۱ ص ۲۳۱ و المنار ج ۱ ص ۳۹۰۔

(iii) یہودیوں کی نسل پرستی: اس میں شک نہیں کہ بہت سی جنگوں اور خونریزیوں کا سرچشمہ نسل پرستی تھی خصوصاً دنیا کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم جو تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ انسانی جانوں کی تباہی اور آبادی کی ویرانی کا باعث ہوئیں اس میں آلمانیوں (نازیوں) کی نسل پرستی کے جنون سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اگر طے ہو جائے کہ دنیا کے نسل پرستوں کی صف بندی کی جائے یا فہرست مرتب کی جائے تو یہودی پہلی لائن میں ہوں گے۔

اس وقت بھی انہوں نے جو حکومت اسرائیل کے نام سے تشکیل دی ہے اسی نسلی تفاخر کی بنیاد پر ہے اور اس کی تشکیل میں وہ کیسے کیسے مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کی بقا کے لئے کیسی کیسی دہشت ناکیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

حالت تو یہ ہے کہ دین موسوی کو بھی اپنی نسل میں محصور سمجھتے ہیں اور نسل یہود کے علاوہ کوئی یہودی مذہب قبول کرے تو یہ ان کیلئے کوئی قابل توجہ بات نہیں اسی لئے تو وہ دیگر اقوام میں اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج نہیں کرتے اسی وجہ سے وہ ساری دنیا میں نفرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں کیونکہ دنیا کے لوگ ایسے اشخاص کو ہرگز پسند نہیں کرتے جو دوسروں کے مقابلے میں اپنے نسلی امتیاز کے قائل ہوں۔

اصولی طور پر نسل پرستی شرک کی ایک قسم ہے اسی لئے تو اسلام سختی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے جن کا امتیاز فقط تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔

(iv) موت سے خوف کی بنیاد: زیادہ تر لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور اس سے خوف زدہ ہیں۔ تحلیل و تجزیہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی دو میں سے کوئی ایک بنیاد ہے:

(۱) بہت سے لوگ موت کو فنا، عدم اور ہلاکت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان فنا اور ہلاکت سے خوف کھاتا ہے اور اگر انسان کے لئے موت کا یہی مفہوم ہو تو یقیناً موت سے گریزاں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بہترین حالات اور کامیابیوں کے درجہ کمال کے وقت بھی زندگی کے خاتمے کا خیال زندگی کے شہد کو زہر بنا دیتا ہے اور انسان ہمیشہ اس فکر سے پریشان رہتا ہے۔

(۲) وہ لوگ جو موت کو وجود کی انتہا نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک وسیع تر اور عالی تر گھر کی زندگی کے لئے تمہید سمجھتے ہیں لیکن اپنے اعمال کی وضع، تباہ کاریوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے موت سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ موت کو اپنے برے اعمال کے نتائج تک پہنچنے کی ابتدا سمجھتے ہیں اسی لئے محاسبہ الٰہی اور سزا سے بھاگتے ہوئے وہ چاہتے ہیں کہ جتنا ہو سکے موت کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔

مندرجہ بالا آیت دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لیکن ۔۔۔ خدا کے پیغمبر ایک طرف موت کے بعد ہمیشہ کی زندگی کا ایمان لوگوں کے دلوں میں زندہ کرتے ہیں اور موت کا وہ دہشت ناک چہرہ جو فنا و نابودی کی نشاندہی کرتا ہے اسے بدل کر اس کا حقیقی چہرہ پیش کرتے ہیں جو

دراصل عالی ترین زندگی کا دریچہ ہے اور دوسری طرف پاکیزہ عمل کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اعمال کی سزا کی وجہ سے جو وحشت ہے وہ زائل ہو جائے اسی لئے تو صاحب ایمان لوگ موت سے کسی قسم کا خوف نہیں رکھتے۔

۹۷۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○

۹۸۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ
لِّلْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۹۷۔ (وہ کہتے ہیں: چونکہ وہ فرشتہ جو تم پر وحی لے کر آتا ہے جبرائیل ہے اور ہماری جبرائیل سے دشمنی ہے۔ لہٰذا ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے) کہیے: جو جبرائیل کا دشمن ہے (در حقیقت خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکم خدا سے آپ کے دل پر قرآن اتارا ہے وہ قرآن جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور مومنین کیلئے ہدایت و بشارت ہے۔

۹۸۔ جو شخص خدا، فرشتوں، خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں، جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے (خدا اس کا دشمن ہے) کیونکہ خدا کافروں کا دشمن ہے۔

شان نزول

کہتے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ میں تشریف لائے تو ایک دن ابن صوریا (ایک یہودی عالم) فدک کے یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ آپؐ کے پاس آئے اور آنحضرت سے مختلف سوالات کئے اور وہ نشانیاں جو آپؐ کی نبوت و رسالت کے بارے میں تھیں تلاش کرنے لگا منجملہ ان کے انہوں نے کہا:

اے محمدؐ! آپ کو نیند کس طرح آتی ہے کیونکہ ہمیں پیغمبر موعود کی نیند کے متعلق اطلاع مل چکی ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

تنام عيناى وقلبى يقظان۔

یعنی۔ میری آنکھ تو سو جاتی ہے لیکن میرا دل بیدار رہتا ہے۔

وہ کہنے لگے:

آپ نے سچ کہا ہے اے محمدؐ!

پھر بہت سے سوال کیے۔ بعد ازاں ابن صوریا نے کہا:

ایک بات رہ گئی ہے اگر اس کا صحیح جواب دے دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی پیروی کریں گے۔ ذرا بتائیے کہ جو فرشتہ آپ پر وحی لے کر آتا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

جبرئیل۔

ابن صوریا نے کہا:

وہ تو ہمارا دشمن ہے وہ تو جہاد اور دشمنوں سے جنگ کے بارے میں سخت احکام لے کر آتا ہے لیکن میکائیل ہمیشہ سادہ اور راحت بخش احکام لاتا ہے اگر آپ کی وحی کا فرشتہ میکائیل ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔[1]

تفسیر

بہانہ ساز قوم

آیت کی شان نزول دیکھنے سے دوبارہ اس بہانہ ساز قوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے پیغمبر اعظم حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے لے کر آج تک یہی روش اختیار کئے رکھی ہے اور ہر زمانے میں حق کے زیر بار آنے کی بجائے بہانے تلاش کئے ہیں۔

یہاں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں بہانہ صرف یہ ہے کہ چونکہ جبرئیل آپ پر وحی لانے والا فرشتہ ہے جو خدا کے سخت احکام لاتا ہے لہٰذا ہم ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ہم اس کے دشمن ہیں اگر میکائیل ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا اور آسان تھا کہ ہم ایمان لے آئیں۔

ان سے پوچھا جائے کہ کیا خدا کے فرشتے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کیا اصولاً وہ خواہش کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنی طرف سے کچھ کہتے ہیں؟ وہ تو قرآن کے مطابق ایسے ہیں:

لَا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ

یعنی — جو کچھ خدا حکم دیتا ہے وہ وہی انجام دیتے ہیں۔ (تحریم-۶)

ان بہانہ سازیوں کا جواب زیر نظر آیات میں اس طرح دیتا ہے: ان سے کہہ دو جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے وہ

---

[1] مجمع البیان میں یہ حدیث ابن عباس کے حوالے سے موجود ہے۔ دوسری تفاسیر مثلاً فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر، المیزان، المنار وغیرہ میں بھی (کچھ اختلاف کے ساتھ) یہ روایت موجود ہے۔

درحقیقت خدا کا دشمن ہے کیونکہ اس نے تو خدا کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا ہے (قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ)۔

وہ قرآن جو گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے (مصدقا لما بین یدیہ)۔

وہی جو مومنین کے لئے ہدایت و بشارت کا سبب ہے (وھدی وبشری للمومنین)۔

اس آیت میں دراصل اس گروہ کو تین واضح جواب دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ جبرئیل کوئی چیز اپنی طرف سے نہیں لاتا جو کچھ ہے "باذن اللہ" ہے۔

دوسرا یہ کہ گذشتہ کتب میں سے صداقت اور درستی کی نشانیاں اس میں موجود ہیں کیونکہ یہ انہی نشانیوں کے مطابق ہے (مصدقا لما بین یدیہ) یعنی اس کا کوئی جواز نہیں کہ تم تورات پر تو ایمان لے آؤ لیکن قرآن سے کفر اختیار کرو جو تورات کی نشانیوں کے مطابق ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان کے مضامین ہم آہنگ ہیں اور یہ بات قرآن کی سچائی کی ترجمان ہے اور یہ قرآن مومنین کے لئے ہدایت وبشارت کا سبب ہے۔[1]

اگلی آیت میں یہی مضمون مزید تاکید و تہدید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ فرماتا ہے: جو شخص خدا، فرشتوں، خدا کے پیغمبروں، جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے۔ خدا اس کا دشمن ہے کہ خدا کافروں کا دشمن ہے (من کان عدوا للہ وملئکتہ ورسلہ وجبریل و میکل فان اللہ عدو للکفرین)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان میں تشکیک و تفاوت نہیں ہے جو اللہ، فرشتے، خدا کے رسول، جبرئیل و میکائیل بلکہ کسی فرشتے کا دشمن ہے اور جو ان میں تشکیک و تفاوت کا قائل ہے پروردگار اس کا دشمن ہے۔

یہ الفاظ دیگر احکام الٰہی جو نوع انسانی کے لئے سودمند اور تکامل بخش ہیں خدا کی طرف سے فرشتوں کے ذریعے پیغمبروں پر نازل ہوتے ہیں اب اگر ذمہ داریاں مختلف ہوں تو تقسیم کار کے فرق کو تضاد کار تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب ایک ہی راہ مستقیم پر ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ یہودی اور دیگر منکرین قرآن یہ بہانہ لیں کہ انہوں نے جبرئیل، دیگر ملائکہ اور پیغمبروں کی دشمنی اختیار کر کے ایک بڑے طاقتور کی دشمنی مول لی ہے۔ قرآن کہتا ہے جو ان سے دشمنی رکھے خدائے بزرگ اس کا دشمن ہے کہ بے شک خدا کافروں کا دشمن ہے۔

رہی "قلب" کی بحث کہ قرآن میں اس سے کیا مراد ہے تو یہ اسی سورہ کی آیت ۷ کے ذیل میں آچکی ہے۔

جبرئیل و میکال

جبرئیل کا نام تین مرتبہ اور میکال کا نام ایک مرتبہ اسی مقام پر آیا ہے[2] انہی آیات سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے

---

[1] المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] جبرئیل کا نام سورہ بقرہ کی آیت میں دو مرتبہ اور سورہ تحریم، آیہ ۴ میں ایک مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

کہ دونوں فرشتے بزرگ اور مقرب الٰہی ہیں۔ مسلمانوں کی عمومی تحریروں میں جبرئیل "ہمزہ" کے ساتھ اور میکائیل "ہمزہ" اور "یا" کے ساتھ آتا ہے لیکن متن قرآن میں جبریل اور میکال ہے۔

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ جبریل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل "جبرئیل" ہے جس کا معنی ہے "مرد خدا" یا "قوت خدا" (جبر کا معنی قوت یا مرد ہے اور ئیل کا معنی خدا ہے)

محل بحث آیات کے مطابق جبرئیل پیغمبر کے لئے وحی کا قاصد تھا اور آپ کے قلب مبارک پر قرآن نازل کرنے والا تھا جب کہ سورۂ نحل کی آیہ ۱۰۲ کے مطابق روح القدس وحی لاتا تھا اور سورۂ شعراء، آیہ ۱۹۱ میں ہے کہ روح الامین تدریجاً قرآن پیغمبر اکرم پر لاتا رہا لیکن جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے روح القدس اور روح الامین سے مراد جبرئیل ہی ہیں۔

ہمارے پیش نظر ایسی احادیث ہیں جن کے مطابق جبرئیل مختلف شکلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوتے رہے اور مدینہ میں جبرئیل زیادہ تر دحیہ کلبی کی شکل میں آنحضرتؐ کے سامنے ظاہر ہوتے تھے جو ایک خوبصورت جوان تھا۔

سورۂ نجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جبرئیل کو دو مرتبہ (اس کی اصلی شکل میں) دیکھا ہے۔[1]

اسلامی کتب میں جن چار فرشتوں کا عموماً مقرب بارگاہ الٰہی شمار کیا گیا ہے وہ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل ہیں۔ جن میں سے جبرئیل بلند مرتبہ ہیں۔

یہودیوں کی کتب میں بھی جبرئیل اور میکال کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ منجملہ ان کے کتاب دانیال میں جبرائیل کو شیطانوں کے سربراہ کو مغلوب کرنے والا اور میکائیل کو قوم اسرائیل کا حامی کہا گیا ہے لیکن بعض کے بقول کوئی ایسی چیز جو جبرئیل کی یہودیوں سے دشمنی پر دلالت کرے دسترس میں نہیں آئی[2] اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں یہودیوں کا جبریل سے اظہار دشمنی ایک بہانہ تھا تاکہ اس کے ذریعے اسلام قبول کرنے سے بچ جائیں یہانتک کہ ان کی مذہبی کتب میں بھی اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۹۹۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ○

۱۰۰۔ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۱۰۱۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

---

[1] اعلام قرآن، ص ۲۲۵

[2] اعلام قرآن، ص ۶۲۹

ترجمہ

۹۹۔ تیرے لیے ہم نے روشن نشانیاں بھیجیں اور سوائے فاسقین کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔
۱۰۰۔ اور کیا جب بھی (یہودی) کوئی پیمان (خدا و رسول سے) باندھتے ان میں سے ایک گروہ اسے پس پشت نہیں ڈال دیتا تھا (اور اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا) اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔
۱۰۱۔ اور جب بھی خدا کی طرف سے کوئی رسول ان کی طرف آیا جب کہ وہ ان نشانیوں کے مطابق بھی تھا جو ان کے پاس تھیں اور ان میں سے ایک جماعت نے جو حامل کتاب (اور عالم) لوگوں پر مشتمل تھی خدا کی کتاب کو ایسے پس پشت ڈال دیا گویا وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔

شان نزول

مندرجہ بالا پہلی آیت کے سلسلے میں ابن عباس سے شان نزول منقول ہے کہ ابن صوریا نے ڈھٹائی اور عناد کی بنا پر پیغمبر اسلام سے کہا:

تمہاری لائی ہوئی کوئی چیز ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور خدا نے تم پر کوئی واضح نشانی نازل نہیں کی کہ ہم تمہاری اتباع کریں۔

اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی اور اسے صراحت سے جواب دیا۔[1] یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شان نزول آیات کے مفاہیم کو کبھی محدود نہیں کرسکتا اور ان کی کلیت و عمومیت میں کمی نہیں ہوتی اگرچہ ان کے آغاز کا سبب وہی ہوتا تھا۔

تفسیر

پیمان شکن یہودی

زیر بحث پہلی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کافی دلیلیں، روشن نشانیاں اور واضح آیات پیغمبر اکرم کے پاس تھیں۔ جو لوگ انکار کرتے وہ دراصل آپ کی دعوت کی حقانیت کو جان چکے تھے لیکن مخصوص اغراض کی خاطر مخالفت میں کھڑے ہوجاتے۔ قرآن کہتا ہے: ہم نے تم پر آیات بینات نازل کیں اور فاسقین کے سوا کوئی ان سے کفر نہیں کرتا (ولقد انزلنا الیک ایٰت بینٰت وما یکفر بھا الا الفٰسقون)۔

آیات قرآن پر غور و فکر کرنے سے ہر پاک دل اور حق جو انسان کے لئے راستے واضح اور روشن ہوجاتے ہیں اور ہر کوئی ان آیات کے مطالعے سے پیغمبر اسلام کی صداقت اور قرآن کی عظمت کو پالیتا ہے لیکن اس حقیقت کو صرف وہی

---

[1] مجمع البیان و تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا دل گناہ کے اثر سے سیاہ نہ ہو چکا ہو اور تعجب نہیں کہ فاسق لوگ فرمان خدا کی اطاعت سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنی صحیح فطرت کو تسلسل گناہ کے باعث گنوا بیٹھتے ہیں، وہ کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کے بعد یہودیوں کے ایک گروہ کی ایک بہت قبیح صفت یعنی ایفائے عہد کی عدم پاسداری اور پیمان شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا جب کبھی انہوں نے خدا اور پیغمبر سے عہد و پیمان باندھا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت نہیں ڈال دیا اور اس کی مخالفت نہیں کی (اوکلما عٰھدوا عھدًا نبذہ فریق منھم) بے شک وہ ایسے ہی ہیں اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے (بل اکثرھم لا یؤمنون)۔

خدا نے کوہ طور پر ان سے یہ عہد لیا تھا کہ تورات کے احکام پر عمل کریں گے لیکن انہوں نے یہ عہد توڑ دیا اور اس پر عمل نہیں کیا۔ ان سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ پیغمبر موعود (پیغمبر اسلام جن کے آنے کی بشارت تورات میں موجود تھی) پر ایمان لے آئیں، انہوں نے اس عہد پر بھی عمل نہیں کیا۔

جب پیغمبر اسلام مدینہ میں آئے تو بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں سے عہد و پیمان ہوا کہ وہ آپ کے دشمن کی مدد نہیں کریں گے لیکن آخرکار انہوں نے یہ عہد بھی توڑ دیا اور جنگ احزاب (خندق) میں اسلام کے خلاف مشرکین مکہ کا ساتھ دیا۔

بنیادی طور پر یہودیوں کی اکثریت کا پرانا طریقہ اور سنت ہے کہ وہ اپنے عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتے۔ ہم آج بھی واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ صہیونیوں اور اسرائیل کا مفاد جہاں خطرے میں ہو بین الاقوامی معاہدوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ زیر بحث آیات میں سے آخری اس موضوع کو صراحت سے اور گویا تاکید سے بیان کرتی ہے۔ فرمایا: خدا کا بھیجا ہوا ان کے پاس آیا جو ان نشانیوں کے مطابق تھا جو ان کے ہاں موجود تھیں، ان میں سے ایک جماعت جو صاحب کتاب لوگوں (علماء) پر مشتمل تھی اس نے کتاب خدا کو ایسے پس پشت ڈال دیا گویا انہیں علم ہی نہ تھا (ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتٰب کتٰب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون)۔

مندرجہ بالا ابحاث میں قرآن نے اپنی دیگر بحثوں کی ایک جمعیت کی اکثریت کے گناہ کی وجہ سے سب کو قابل ملامت قرار نہیں دیا بلکہ "فریق" اور "اکثریت" کے الفاظ استعمال کر کے اقلیت کے تقویٰ و ایمان کے حصے کی حفاظت کی ہے اور حق طلبی و حق جوئی کی یہی راہ و رسم ہے۔

۱۰۲۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ
بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ
وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○
۱۰۳۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَوْ كَانُوا
يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۱۰۲۔ (یہودی) اس کی پیروی کرتے ہیں جو سلیمان کے زمانے میں شیاطین لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے سلیمان (نے کبھی بھی جادو سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے اور وہ) کافر نہیں ہوئے۔ لیکن شیاطین نے کفر کیا ہے اور لوگوں کو اس جادو کی تعلیم دی۔ جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا وہ دونوں فرشتے جادو کرنے کا طریقہ (لوگوں کو اسے باطل کرنے کے طریقے سے آگاہ کرنے کے لئے) سکھاتے تھے وہ کسی کو کوئی بھی چیز سکھانے سے پہلے اسے کہتے تھے کہ ہم تیری آزمائش کا ذریعہ ہیں، کہیں کافر نہ ہو جانا (اور ان تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا) لیکن وہ ان دو فرشتوں سے وہ مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں (نہ یہ کہ اس تعلیم سے جادو کے اثر کو باطل کرنے کے لئے استفادہ کریں) مگر وہ حکم خدا کے بغیر کبھی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ وہ صرف انہی چیزوں کو سیکھتے جو ان کے لئے نقصان دہ تھے اور انہیں ان کا کوئی فائدہ نہ تھا اور یقیناً وہ یہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال و متاع کا خریدار ہو اُسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا اور کاش وہ یہ جانتے کہ کس قدر قبیح اور ناپسندیدہ تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچتے تھے۔

۱۰۳۔ اگر وہ توجہ کرتے اور ایمان لے آتے اور پرہیزگاری کو اپنا شیوہ بناتے تو خدا کے پاس جو اس کا بدلا تھا وہ ان کے لئے بہتر تھا۔

تفسیر

سلیمانؑ اور بابل کے جادوگر

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں کچھ لوگ آپ کے ملک میں سحر و جادو کا عمل کرنے لگے حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ تمام تحریریں اور اوراق جمع کرکے ایک مخصوص جگہ پر رکھ دو (انہیں محفوظ رکھنا شاید اس

بنا پر تھا کہ ان میں سحر و جادو کو باطل کرنے کے لئے مفید مطالب بھی تھے۔

حضرت سلیمان کی رحلت کے بعد کچھ لوگوں نے انہی تحریروں کو باہر نکالا اور جادو کی ترویج شروع کر دی۔ بعض نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہنے لگے کہ سلیمان بالکل پیغمبر نہ تھے بلکہ وہ اسی سحر اور جادو کی مدد سے ان کے ملک پر قابض تھے اور اسی سے وہ خارقِ عادت امور انجام دیتے تھے۔

بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے بھی ان کی پیروی کی اور جادوگری کے بہت زیادہ دلدادہ ہو گئے یہاں تک کہ توراۃ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب پیغمبر اسلامؐ نے ظہور فرمایا اور آیاتِ قرآنی کے ذریعے خبر دی کہ سلیمانؑ خدا کے پیغمبروں میں سے تھے تو یہودیوں کے بعض احبار و علماء کہنے لگے:

"کیا محمد پر حیرت نہیں جو کہتا ہے سلیمان پیغمبرانِ خدا میں سے تھا جب کہ وہ تو جادوگر تھا"۔

یہودیوں کی یہ گفتگو خدا کے ایک بزرگ پیغمبر پر تہمت و افتراء تھی یہاں تک کہ اس کا لازمی نتیجہ حضرت سلیمانؑ کی تکفیر تھا کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق تو سلیمان ایک جادوگر تھے اور غلط طور پر اپنے آپ کو پیغمبر کہتے تھے۔

قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ سلیمان ہرگز کافر نہ تھے بلکہ شیاطین اور لوگوں کو جادو سکھانے والے کافر ہو گئے تھے[1]۔

پہلی زیر بحث آیت یہودیوں کی برائیوں کے ایک اور پہلو کا پتہ دیتی ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت سلیمانؑ کو جادوگری کا الزام دیا تھا: فرمایا: یہ (یہودی)، اس کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین سلیمانؑ کے زمانے میں لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے (واتبعوا ما تتلوا الشیٰطین علیٰ ملک سلیمان)۔

ممکن ہے "واتبعوا" کی ضمیر پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں، یا حضرت سلیمانؑ کے زمانے کے یہودیوں یا دونوں کی طرف اشارہ ہو لیکن گذشتہ آیات سے مناسبت کے لحاظ سے یہ پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔

شیاطین سے بھی ممکن ہے سرکش انسان یا جن یا دونوں مراد ہوں۔

بہر حال اس گفتگو کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: سلیمان کبھی کافر نہیں ہوئے (وما کفر سلیمان)۔ انہوں نے کبھی جادو کو ذریعہ بنایا اور نہ بلا وجہ اپنی رسالت کا دعویٰ کیا۔

لیکن شیاطین کافر ہوئے ہیں اور انہی نے جادو کی تعلیم دی ہے (ولکن الشیٰطین کفروا یعلمون الناس السحر)۔

پھر وہ مزید کہتا ہے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل ہوا (وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت)[2]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۲، اور مجمع البیان زیر نظر آیت کے ذیل میں (تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔

[2] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "ما انزل" کا عطف "ما تتلوا" پر ہے اور جو تفسیر اوپر بیان ہوئی ہے وہ اسی بنیاد پر ہے لیکن بعض "السحر" پر عطف سمجھتے ہیں اور بعض "ما" کو بھی نافیہ قرار دیتے ہیں۔

گویا انہوں نے دو طرف سے جادو کی طرف ہاتھ بڑھایا ایک تو شیاطین کی تعلیم سے جو حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تھے اور دوسرا خدا کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کے ذریعے سے جو لوگوں کو جادو باطل کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

ان دو خدائی فرشتوں کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جادو کا اثر زائل کرنے کا طریقہ سکھائیں لہٰذا وہ کسی بھی شخص کو کچھ سکھانے سے پہلے کہہ دیتے تھے کہ ہم تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں، کافر نہ ہو جانا (اور ان تعلیمات سے غلط فائدہ نہ اٹھانا) (وما یعلمٰن من احد حتی یقولا انما نحن فتنة فلا تکفر)۔

یہ دو فرشتے اس زمانے میں لوگوں کے پاس آئے جب جادو کا بازار گرم تھا اور لوگ جادوگروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اور ان فرشتوں نے جادوگروں کے جادو کو باطل کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھایا۔

چونکہ کسی چیز (مثلاً بم) کو بے کار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے سے اس چیز (مثلاً بم کی ساخت) سے آگاہ ہو پھر ہی اسے بیکار کرنے کا طریقہ سیکھے لیکن یہودیوں میں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں نے اسے زیادہ سے زیادہ جادو پھیلانے کا ذریعہ بنا لیا اور اتنا آگے بڑھے کہ ایک عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کو بھی متہم کیا کہ اگر مادی عوامل ان کے زیر فرمان ہیں اور جن وانس ان کی فرمانبرداری کرتے ہیں تو یہ سب جادو کی وجہ سے ہے۔

بدکار لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے بُرے مسلک اور پروگرام کی توجیہ کے لئے بزرگوں کو اسی مسلک کا پیرو ہونے کا اتہام دیتے ہیں۔

بہرحال وہ اس خدائی آزمائش میں کامیاب نہ ہو سکے وہ ان دو فرشتوں سے ایسے مطالب سیکھتے تھے جن کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال سکیں (فیتعلمون منهما ما یفرقون به بین المرء وزوجه)۔

مگر خدا کی قدرت ان تمام قدرتوں پر حاوی ہے لہٰذا وہ حکم خدا کے بغیر ہرگز کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے (وما هم بضارين به من احد الا باذن الله)۔

وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لئے مضر ہوتیں اور نفع بخش نہ ہوتیں (ویتعلمون ما یضرهم ولا ینفعهم)۔

انہوں نے اس اصلاحی خدائی پروگرام کی تحریف کر دی اور بجائے اس کے کہ وہ اسے اصلاح اور جادو کے مقابلے کا ذریعہ بناتے فساد کا ذریعہ بنا ڈالا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسے مال و متاع کا خریدار ہو اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا (ولقد علموا لمن اشتراه ما له فی الاٰخرة من خلاق ثث)[1]

بے شک کتنی بُری اور قبیح تھی وہ چیز جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو بیچ رہے تھے اے کاش ان میں علم ودانش ہوتی (ولبئس ما شروا به انفسهم لو کانوا یعلمون)۔

---

[1] "خلاق" کا اصل معنیٰ تو "خلق وعادت" ہے لیکن کبھی "نصیب" اور "حصہ" کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

انہوں نے جان بوجھ کر اپنی اور اپنے معاشرے کی سعادت و نیک بختی کو ٹھکرا دیا اور کفر و گناہ کے گرداب میں غوطہ زن ہو گئے حالانکہ اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدا کے ہاں سے جو بدلہ اور ثواب انہیں ملتا وہ ان کے لئے ان تمام امور سے بہتر ہوتا۔ اے کاش وہ متوجہ ہوتے (ولو انھم اٰمنوا واتقوا لمثوبة من عند الله خیر لو کانوا یعلمون)۔

چند اہم نکات

(۱) ہاروت اور ماروت کا واقعہ: بابل میں نازل ہونے والے فرشتوں کے بارے میں لکھنے والوں نے کئی قصے کہانیاں اور افسانے تراشے اور خدا کے ان دو بزرگ فرشتوں کے سر تھوپ دیئے حتی کہ انہیں خرافات اور افسانوں کا عنوان بنا دیا گیا اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کسی دانشمند کے لئے اس تاریخی واقعہ کی تحقیق اور مطالعہ بہت مشکل ہو گیا لیکن جو کچھ زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور عقلی و تاریخی لحاظ سے صحیح ہے نیز مصادر حدیث کے مطابق ہے، ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

سرزمین بابل پر سحر اور جادوگری اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی اور لوگوں کی پریشانی اور تکلیف کا باعث بن چکی تھی خدا نے دو فرشتوں کو انسانی صورت میں مامور کیا کہ وہ جادو کے عوامل اور اسے باطل کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھائیں تاکہ وہ جادوگروں کے فساد اور شر سے محفوظ رہ سکیں۔

• لیکن یہ تعلیمات بہرحال غلط مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہیں کیونکہ فرشتے مجبور تھے کہ جادوگروں کا جادو باطل کرنے کے لئے پہلے جادو کے طریقے کی تشریح کریں تاکہ لوگ اس طرح اس کی پیش بندی کر سکیں اس وجہ سے ایک گروہ جادو کا طریقہ سیکھنے کے بعد خود جادوگروں کی صف میں شامل ہو گیا اور لوگوں کے لئے نئی زحمت کا سبب بنا حالانکہ وہ فرشتے لوگوں کو تنبیہ کرتے تھے اور ان کے لئے صراحتاً کہتے تھے کہ یہ تمہارے لئے ایک طرح کی آزمائش ہے اور یہاں تک کہا کہ اس سے غلط فائدہ اٹھانا ایک طرح کا کفر ہے لیکن پھر بھی وہ لوگ ایسے کاموں میں پڑ گئے جو انسانوں کے لئے ضرر اور نقصان کا باعث تھے[۱]

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ بہت سی احادیث اور اسلامی مصادر سے لیا گیا ہے اور عقل و منطق سے بھی اس کی ہم آہنگی آشکار ہے۔ منجملہ ان کے ایک حدیث وہ بھی ہے جو عیون اخبار الرضا میں ہے (ایک طریق سے خود امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے اور دوسرے طریق سے امام حسن عسکریؑ سے منقول ہے) یہ حدیث واضح طور پر اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مورخین اور دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) لکھنے والے حضرات یہاں تک کہ بعض مفسرین بھی اس ضمن میں جعلی افسانوں کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ بعض لوگوں میں خدا کے ان دو معصوم فرشتوں

---

[۱] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ وسائل ج ۱۲، ص ۱۰۶ و ۱۰۷۔

کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے انہوں نے بھی ذکر کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو فرشتے تھے خدا نے انہیں زمین پر اس لئے بھیجا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اگر وہ انسانوں کی جگہ ہوتے تو وہ بھی گناہ سے نہ بچ پاتے اور خدا کی نافرمانی کرتے لہذا وہ دونوں بھی زمین پر اترنے کے بعد بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ستارہ زہرہ کے بارے میں بھی افسانہ تراشا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خرافات اور بے بنیاد بکواس ہیں۔ قرآن ان امور سے پاک ہے اگر مندرجہ بالا آیات کے متن میں ہی غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کا بیان ان باتوں سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔

(۱) "ہاروت" اور "ماروت" الفاظ کی حیثیت سے: ایک لکھنے والے کے نظریے کے مطابق ہاروت اور ماروت ایرانی الاصل نام ہیں وہ کہتا ہے کہ اس نے ارمنی کتاب میں "ہرروت" کا معنی "زرخیزی" اور "مروت" کا معنی "بے موت" دیکھا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ کوہ ماذیس (کوہ آرارات) کے دو خداؤں کے نام ہیں۔ اس کا نظریہ ہے کہ ہاروت وماروت انہی دو الفاظ سے ماخوذ ہیں[۱] لیکن اس استنباط کے لیے کوئی واضح علامت و دلیل نہیں ہے۔

اوستا میں ہے:

ہرورات جو خرداد ہی ہے اور اسی طرح امروات جس کا معنی بے موت ہے جو کہ مرداد ہے[۲]

دھخدا نے اپنی لغت میں جو کچھ لکھا ہے وہ آخری معنی سے کچھ ملتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض کے نزدیک تو ہاروت وماروت بابل کے رہنے والے دو مرد تھے۔

بعض نے تو انہیں شیاطین قرار دے دیا ہے حالانکہ مندرجہ بالا آیت واضح طور پر ان مفاہیم کو رد کرتی ہے (مگر یہ کہ آیات کی تفسیر و توجیہ اُس کے ظاہری مفہوم کے خلاف کر دی جائے)۔

(۲) فرشتہ انسان کا معلم کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم اور متعدد روایات کے مطابق جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہاروت وماروت خدا کے دو فرشتے تھے جو جادوگروں کی اذیت و آزار کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو تعلیم دینے آئے تھے، تو کیا فرشتہ انسان کا معلم ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب انہی احادیث میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ خدا نے انہیں انسانوں کی شکل و صورت میں بھیجا تھا تاکہ وہ یہ کام انجام دے سکیں۔

یہ حقیقت سورہ انعام کی آیت ۹ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا

اور اگر ہم فرشتے کو اپنا رسول بناتے تو اسے بھی مرد کی صورت میں بھیجتے۔

---

[۱] اعلام قرآن، ص ۶۵۵

[۲] یاد رہے کہ خرداد اور مرداد دو ایرانی مہینوں کے نام ہونے کے علاوہ دو فرشتوں کے ناموں کی حیثیت سے معروف ہیں۔ (مترجم)

(۶) کوئی شخص اذنِ خدا کے بغیر کسی چیز پر قادر نہیں: مندرجہ بالا آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جادوگر اذنِ پروردگار کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس میں جبر و اجبار کا مفہوم نہیں یہ توحید کے ایک اساسی اصول کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اس جہان کی تمام قدرتوں کا سرچشمہ قدرتِ خدا ہے۔ یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اس کے اذن و فرمان کے بغیر نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جادوگر عالم آفرینش میں خدا کے ارادے کے برعکس دخیل ہوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خدا کی سلطنت میں کوئی اُسے محدود کر دے بلکہ یہ تو خواص و آثار ہیں جو مختلف موجودات میں پیدا کئے گئے ہیں بعض ان سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض غلط اور یہ آزادیٔ اختیار بھی انسانوں کی آزمائش اور ان کے تکامل کے لئے ایک زینہ ہے۔

(۷) جادو کیا ہے اور کس وقت سے ہے: جادو کسے کہتے ہیں اور یہ کس زمانے سے وجود میں آیا ہے یہ ایک وسیع بحث ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جادو بہت قدیم زمانے سے لوگوں میں رائج ہے۔ اس کی بالکل صحیح تاریخ دستیاب نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کس شخص نے پہلی مرتبہ جادوگری کو وجود دیا تھا۔ لیکن سحر کے معنی اور اس کی حقیقت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جادو خارقِ عادت افعال کی ایک قسم ہے۔ یہ اپنی طرف سے انسانی وجود میں کچھ آثار پیدا کر سکتا ہے اور بعض اوقات آنکھوں کا دھوکا اور ہاتھ کی صفائی ہے اور صرف نفسیاتی و خیالی پہلو رکھتا ہے۔ لغت میں سحر کے دو معانی مذکور ہیں:

۱۔ فریب، طلسم، شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی۔ قاموس میں سحر کردن کا معنی لکھا ہے دھوکا دینا۔

۲۔ ہر کل مالطف دق۔ یعنی وہ جس کے عوامل نظر نہ آتے ہوں اور پوشیدہ ہوں۔

معرداتِ راغب، جو قرآن کے مفرد الفاظ کے لئے مخصوص ہے، میں تین معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ فریب اور حقیقت و واقعیت کے بغیر خیالات جیسے شعبدہ بازی اور ہاتھ کی صفائی۔

۲۔ شیاطین کو مخصوص طریقے سے بلانا اور ان سے مدد لینا۔

۳۔ بعض نے ایک معنی اور بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے کچھ وسائل سے بعض اشخاص و موجودات کی ماہیت اور شکل بدل دینا۔ مثلاً انسان کو جادو کے ذریعے حیوانی شکل میں تبدیل کر دینا۔ لیکن یہ بات خواب و خیال سے زیادہ نہیں ہے اور اس کی کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے۔[۱]

قرآن میں لفظ سحر اور اس کے مشتقات مختلف سورتوں مثلاً طٰہٰ، شعراء، یونس، اعراف وغیرہ میں آئے ہیں اور یہ خدا کے پیغمبروں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کے حالات کے ضمن میں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں سحر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

---

[۱] مفرداتِ راغب (سحر)

۱۔ وہ مقام جہاں سحر سے مقصود دھوکا، ہاتھ کی صفائی، شعبدہ بازی اور فریب نظر ہے اور کوئی حقیقت نہیں مثلاً:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى۔

یوں لگتا تھا جیسے ان (جادوگروں) کی رسیاں اور لاٹھیاں اس (موسیٰ) کی طرف دوڑ رہی ہوں۔ (طٰہٰ، ۶۶)

ایک اور آیت یوں ہے:

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ۔

جب انہوں نے رسیوں کو پھینکا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا۔ (اعراف۔ ۱۱۶)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے اور یہ نہیں کہ جادوگر چیزوں میں تصرف کر سکیں اور اپنا اثر باقی رکھ سکیں بلکہ یہ تو ان کے ہاتھ کی صفائی اور فریب نظر ہے کہ لوگوں کو حقیقت کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔

(ب) قرآن کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سحر کی بعض اقسام واقعاً اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً زیر بحث آیت جس میں ہے کہ وہ جادو سیکھتے تھے تاکہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالیں۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ

ایک اور بات جو مندرجہ بالا آیات میں تھی کہ وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لئے مضر ہوتیں اور نفع بخش نہ ہوتیں:

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جادو کی تاثیر صرف نفسیاتی پہلو رکھتی ہے یا اس کا جسمانی اور خارجی اثر بھی ممکن ہے۔ زیر بحث آیات میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسی لئے بعض کا نظریہ ہے کہ جادو کا اپنا اثر صرف خیالی اور نفسیاتی لحاظ سے ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جادو کی تمام یا بعض قسمیں ایسی ہیں جن میں چیزوں کے کیمیائی اور طبیعاتی خواص سے فائدہ اٹھا کر سادہ لوح عوام کو دھوکا دیا جاتا ہے اور انہیں بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے جادو کی تاریخ میں ہے کہ جادوگر اپنی رسیوں اور چھڑیوں میں کسی مخصوص کیمیائی مواد (مثلاً احتمال ہے کہ سیماب وغیرہ ہوگا) کا استعمال کیا کرتے تھے اور پھر یہ چیزیں سورج کی تپش یا کسی اور حرارت کے ذریعے حرکت میں آجاتی تھیں اور تماشائی سمجھتے تھے کہ وہ جاندار ہو گئی ہیں ایسا جادو ہمارے زمانے تک میں نایاب نہیں ہے۔

جادو اسلام کی نظر میں

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جادو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا اسلام کی نگاہ میں کوئی اشکال نہیں رکھتا۔

اس سلسلے میں تمام فقہاء اسلام کہتے ہیں جادو سیکھنا اور جادوگری کرنا حرام ہے۔

اس ضمن میں اسلام کے بزرگ رہنماؤں سے احادیث بھی وارد ہوئی ہیں جو ہماری معتبر کتب میں منقول ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

من تعلم شیئا من السحر قلیلاً او کثیراً فقد کفر وکان اٰخر عهده بربه...[1]

جو شخص کم یا زیادہ جادو سیکھے وہ کافر ہے اور خدا سے اس کا رابطہ اسی وقت بالکل منقطع ہو جائے گا۔

لیکن اگر جادوگر کے جادو کو باطل کرنے کے لئے سیکھنا پڑے تو اس میں کوئی اشکال نہیں بلکہ بعض اوقات کچھ لوگوں پر اس کا سیکھنا واجب کفائی ہو جاتا ہے تاکہ اگر کوئی جھوٹا مدعی اس ذریعے سے لوگوں کو دھوکا دے یا گمراہ کرے تو اس کے جادو کو باطل کیا جاسکے اور اس کا جھوٹ فاش کیا جاسکے۔

جادوگر کا جادو باطل کرنے اور اس کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لئے جادو سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، اس کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے منقول ہے جو یوں ہے:

ایک جادوگر جادو کے عمل کی اجرت اور مزدوری لیتا تھا۔ وہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ میرا پیشہ جادوگری ہے اور میں اس کے بدلے اجرت لیتا ہوں اور میری زندگی کے اخراجات اسی سے پورے ہوتے ہیں۔ اسی کی آمدنی سے میں نے حج کیا ہے لیکن اب میں توبہ کرتا ہوں تو کیا میرے لئے راہ نجات ہے۔ امام صادقؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جادو کی گرہیں کھول دو لیکن گرہیں باندھو نہیں۔[2]

جادو تورات کی نظر میں

کتب عہد قدیم (تورات اور اس سے ملحق کتب) کی رو سے بھی جادوگری ناجائز اور بہت ہی قبیح ہے۔

تورات میں ہے:

جنوں کی طرف توجہ نہ کرو اور جادوگروں کے بارے میں جستجو نہ کرو کہ کہیں ان سے ناپاک نہ ہو جاؤ

---

[1] وسائل الشیعہ، باب ۲۵، من ابواب ما یکتسب بہ

[2] وسائل الشیعہ باب ۲۵، من باب ما یکتسب بہ، حدیث نمبر ۱

اور خداوند تمہارا خدا میں ہوں۔[1]

توراۃ میں ایک اور مقام پر ہے:

جو شخص جنّوں اور جادوگروں کی طرف توجہ کرے یہاں تک کہ زنا کے راستے سے ان کی پیروی کرے میں اپنے عتاب کا رُخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے اُسے اس کی قوم سے منقطع کر دوں گا۔[2]

کتاب مقدس قاموس میں اس بارے میں ہے:

اور بہت ہی واضح ہے کہ جادو کے لئے شریعت موسوی میں کوئی واسطہ نہیں بلکہ شریعت ان اشخاص کو جو جادو کے ذریعے مشورہ طلب کرتے تھے شدید ترین قصاص کے ساتھ منع کرتی ہے۔

لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود قاموس کتاب مقدس اعتراف کرتی ہے کہ اس کے باوجود یہودی جادو سیکھتے تھے اور توراۃ کے برخلاف اس پر اعتماد کرتے تھے کیونکہ گذشتہ تحریر کے بعد عبارت یوں آگے بڑھتی ہے:

مگر اس کے باوجود یہ فاسد مادہ یہودی قوم میں داخل ہو گیا اور یہ قوم اس کی معتقد ہو گئی اور لوگ حاجت و ضرورت کے وقت اس کی پناہ حاصل کرتے تھے۔[3]

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے:

یہودی کتاب خدا کی طرف پشت کرتے ہیں۔

جادو ہمارے زمانے میں

آج علوم کا ایک سلسلہ موجود ہے۔ گذشتہ زمانے میں جادوگر ان سے استفادہ کرکے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے وہ اجسام کے طبیعاتی اور کیمیائی خواص کو بروئے کار لاتے تھے جیسا کہ حضرت موسٰی کے زمانے کے جادوگروں کے واقعے کے ذیل میں بیان ہوا ہے کہ وہ اشیاء کے ان خواص سے استفادہ کرتے تھے۔ پہلے انہوں نے کچھ چیزیں سانپ کی شکل کی بنا لیں پھر کسی چیز مثلاً پارہ اور اس کی ترکیبات کی مدد سے انہیں حرکت میں لے آئے۔ البتہ اجسام کے طبیعاتی اور کیمیائی خواص سے استفادہ کرنا ہرگز ممنوع نہیں بلکہ جتنا زیادہ ہو سکے ان سے آگاہی حاصل کی جائے اور زندگی میں ان سے استفادہ کیا جائے لیکن آج بھی اگر ان کے مخفی خواص سے دھوکا دینے، بیوقوف بنانے اور غلط راہوں پر چلانے کا کام لیا جائے تو یہ امر جادو ہی کہلائے گا۔

اجسام و عناصر کے خواص کے علاوہ علوم کا ایک اہم حصہ ہے جس میں مقناطیسی خواب ہپناٹزم (HYPNOTISM)

---

[1] لاویان ۱۹: ۳۱

[2] لاویان ۲۰: ۶

[3] قاموس کتاب مقدس، ص ۴۷۱، تالیف امریکی مؤلف مسٹر ہاکس۔

مانیٹیزم (MANIATISM) اور ٹیلی پیتھی (TELEPATHY) (دوسرے افکار منتقل کرنا) بھی ثابت شدہ علوم میں شامل ہیں جن سے زندگی کے بہت سے مراحل میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن جادوگران سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان علوم کو دھوکا دہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آج بھی یہ علوم اگر کوئی شخص بے خبر لوگوں سے غلط فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کرے تو اسے جادو ہی کہیں گے۔

خلاصہ یہ کہ جادو کا ایک وسیع مفہوم ہے اس ضمن میں جو کچھ پہلے اور اب بیان کیا ہے یہ سب جادو کے مفہوم میں شامل ہے۔

یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی بہت مضبوط ہے اور نفسیاتی ریاضتوں کے ذریعے اور قوی ہو جاتی ہے اور یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اپنے گرد و پیش کے موجودات پر اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ سفیانی اور ریاضت کرنے والے لوگ خارق عادت کام انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ کچھ ریاضتیں بھی جائز اور کچھ ناجائز ہیں۔ جو ریاضتیں جائز ہیں وہ پاک نفوس میں اصلاحی اور تربیتی قوت پیدا کرتی ہیں۔ جب کہ غیر مشروع اور ناجائز ریاضتیں شیطانی قوت پیدا کرتی ہیں۔ ممکن ہے دونوں خارق عادت چیز کا سبب بنیں جو پہلی صورت میں مثبت اور اصلاحی ہوگی۔ جب کہ دوسری صورت میں مخرب یا کم از کم فضول و بیہودہ ہوگی۔

۱۰۴۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

۱۰۵۔ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

ترجمہ

۱۰۴۔ اے ایمان والو! (جب پیغمبر سے قرآن کی آیات سمجھنے کے لئے مہلت مانگو تو) "راعنا" نہ کہا کرو بلکہ "انظرنا" کہا کرو (کیونکہ پہلا لفظ "ہمیں مہلت دیجئے" کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور "ہمیں بیوقوف بنایئے" کا معنی بھی دیتا ہے جو دشمنوں کو بات کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے) اور جو کچھ تمہیں حکم دیا جاتا ہے اسے سنو اور کافروں (نیز استہزا کرنے والوں) کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۱۰۵۔ اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے تمہیں کوئی خیر و برکت نصیب ہو حالانکہ خدا

جسے چاہتا ہے اپنی خاص رحمت سے نوازتا ہے اور خدا بخشنے والا اور بڑے فضل والا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے کہ صدر اسلام کے مسلمان جب آنحضرتؐ سے گفتگو میں مشغول ہوتے اور آپؐ آیات واحکام الٰہی بیان کررہے ہوتے تو کبھی کبھی درخواست کرتے کہ ذرا آہستہ گفتگو فرمائیں تاکہ وہ مطلب اچھی طرح سمجھ سکیں اور اپنے سوالات و معروضات بھی پیش کرسکیں۔ اس درخواست کے لیے وہ لفظ "راعنا" استعمال کرتے۔ اس لفظ کا مادہ "الرعی" ہے۔ جس کا معنی ہے "مہلت دینا" لیکن یہودی اس کا معنی ایک اور مادہ "الرعونۃ" کے حوالے سے کرتے جس کا معنی ہے "بیوقوف اور احمق ہونا" (پہلی صورت میں اس کا مفہوم تھا "ہمیں مہلت دیجئے" لیکن دوسری صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے "ہمیں بیوقوف بنائیے") یہاں یہودیوں کے ہاتھ بات آگئی۔ وہ اسی جملے سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمان کہتے اور پیغمبر اور مسلمانوں سے استہزاء اور مذاق کرتے۔

پہلے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور غلط فائدہ اٹھانے کا یہ سلسلہ روکنے کے لیے مومنین کو حکم دیا کہ "راعنا" کی بجائے "انظرنا" استعمال کرو جو یہی مفہوم ادا کرتا ہے لیکن بہت دھرم دشمن (یہودی) کے لیے سند نہیں ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "راعنا" یہودیوں کی زبان میں ایک طرح کی گالی تھی اور اس کا مفہوم تھا "سنو کہ ہرگز نہیں سنوگے" یہ جملہ کہہ کر وہ ہنستے تھے۔

کچھ مفسرین نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہودی "راعنا" کی بجائے "راعینا" کہتے تھے جس کا معنی ہے "ہمارا چرواہا" اور پیغمبر کے لئے یہ جملہ استعمال کرکے اپنا مقصد پورا کرتے تھے[1]

تفسیر

دشمن کے ہاتھ بہانہ مت دو

شانِ نزول میں جو بات بیان کی گئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے۔ اے ایمان والو! جب پیغمبر سے آیات قرآن سمجھنے کے لئے مہلت مانگو تو "راعنا" نہ کہو بلکہ "انظرنا" کہو (کیونکہ اس کا بھی مفہوم وہی ہے لیکن دشمن کے لئے سند نہیں بنتا) (یاایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا) اور جو حکم تمہیں دیا جارہا ہے اسے سنو۔ کافروں اور استہزاء کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے (واسمعوا و للکٰفرین عذاب الیم)۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے پروگراموں میں دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آنے دیں یہاں تک کہ ایک

---

[1] تفسیر قرطبی، تفسیر المنار، فخر رازی اور تفسیر ابوالفتوح رازی۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

چھوٹا سا جملہ جو غلط مقاصد میں دشمن کے لئے مقام بحث بن سکے اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے۔ قرآن مخالفین کی طرف سے مومنین سے غلط فائدے اٹھانے کی روک تھام کی نصیحت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک لفظ تک ایسا نہ کہیں جس کے ایسے مشترک معنی ہوں کہ دشمن جس کے دوسرے معنی کو غلط استعمال کر سکے اور مومنین کی نفسیاتی کمزوری کا باعث بنے۔ جب دامن کلام اور تعبیر سخن وسیع ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ انسان ایسے جملے استعمال کرے جو قابل تحریف ہوں اور غلط مفاد کا باعث ہوں۔

جب اسلام اتنی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے ہاتھ کوئی ایسا بہانہ دیا جائے تو بڑے بڑے مسائل میں مسلمانوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے۔ اب بھی ہم سے کبھی ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جو داخلی دشمن کے لئے یا بین الاقوامی مجالس میں بری تفسیر کا سبب ہوتے ہیں اور لاؤڈ اسپیکر پر دشمن کے پراپیگنڈا کے لئے سود مند ہوتے ہیں۔ ایسے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ایسے کاموں سے پرہیز کریں اور بلاوجہ داخلی اور خارجی دشمنوں کے ہاتھ بہانہ نہ دیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "راعنا" مندرجہ بالا پس منظر کے علاوہ ایک غیر مودبانہ انداز کا بھی حامل ہے کیونکہ "راعنا" مراعات کے مادہ (باب مفاعلہ) سے ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ہماری اعانت کرو ہم تم سے مراعات کریں گے چونکہ یہ غیر مودبانہ تعبیر تھی (علاوہ ازیں یہودی بھی اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے) قرآن نے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا تاکہ ایک تو زیادہ مودبانہ لفظ استعمال کریں اور دوسرا دشمن کے ہاتھ بہانہ نہ دیں[1]

بعد کی آیت مشرکین اور اہل کتاب کی مومنین سے کینہ پروری اور عداوت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ فرمایا: اہل کتاب کفار اور اسی طرح مشرکین پسند نہیں کرتے کہ خدا کی طرف سے کوئی خیر و برکت تم پر نازل ہو (مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم)

لیکن یہ تمنا آرزو سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ خداوند عالم اپنی رحمت اور خیر و برکت جس شخص سے چاہتا ہے مخصوص کر دیتا ہے (واللہ یختص برحمتہ من یشآء) اور خدا بخشش اور فضل عظیم کا مالک ہے (واللہ ذوالفضل العظیم)۔

بے شک دشمن اپنے شدید کینہ اور حسد کے باعث پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں پر یہ اعزاز اور عطیۂ الٰہی دیکھیں کہ خدا کی طرف سے ایک عظیم پیغمبر ایک بہت عظیم آسمانی کتاب کے ساتھ ان کے نصیب ہو لیکن کیا کوئی فضل و رحمت خدا کو کسی پر نازل ہونے سے روک سکتا ہے۔

ایک نکتہ

یا ایھا الذین امنوا کا دقیق مفہوم: قرآن مجید میں ۸۹ مقامات پر یہ پُر اعجاز اور روح پرور خطاب

---

[1] تفسیر فخر رازی اور المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

نظر آتا ہے۔ مندرجہ بالا پہلی وہ آیت ہے جس میں اس خطاب سے عزت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تعبیر ان آیات کے ساتھ مخصوص ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور مکہ کی آیات میں اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پیغمبر اکرمؐ کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے مسلمانوں کی حالت میں ثابت قدمی آگئی تھی، وہ ایک مستقل اور باا ثر جمعیت کی صورت میں نظر آنے لگے تھے اور انہیں پراگندگی سے نجات مل گئی تھی لہٰذا خداوند عالم نے انہیں "یا ایھا الذین امنوا" کے خطاب سے نوازا ہے۔

یہ تعبیر ضمناً ایک اور نکتے کی بھی حامل ہے اور وہ یہ کہ اب تم ایمان لے آئے ہو اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہو اور اپنے اللہ سے اطاعت کا عہد و پیمان باندھ چکے ہو لہٰذا اس کے تقاضے کے مطابق اس جملے کے بعد جو حکم آرہا ہے اس پر عمل کرو بہ الفاظ دیگر تمہارا ایمان تم پر لازم قرار دیتا ہے کہ ان قوانین کے کاربند رہو۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بہت سی اسلامی کتب میں جن میں اہل سنت کی کتابیں بھی شامل ہیں پیغمبر اسلام سے یہ ایک حدیث منقول ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

ما انزل اللہ آیۃ فیھا یا ایھا الذین امنوا الا و علی رأسھا و امیرھا۔

خدا نے کسی مقام پر قرآن کی کوئی آیت نازل نہیں کی جس میں یا ایھا الذین امنوا ہو مگر یہ کہ اس کے رئیس و امیر حضرت علیؑ ہیں[1]

۱۰۶۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۱۰۷۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

ترجمہ

۱۰۶۔ ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کے نسخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر یہ کہ اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسی کوئی آیت لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۰۷۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کی ملکیت خدا کے لئے ہے (اور وہ حق رکھتا ہے کہ بھلائی کے مطابق احکام میں

---

[1] در منثور میں یہ حدیث ابو نعیم کی حلیۃ الاولیاء کے حوالے سے ابن عباس کی سند سے منقول ہے۔

ہر قسم کا تغیر و تبدل کر سکے) اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں (اور وہی ہے جو تمہارے تمام مصالح کا تعین کرتا ہے)۔

تفسیر

ان آیات میں بھی مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی سازشوں اور وسوسوں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ کبھی تو مسلمانوں سے وہ کہتے تھے دین تو یہودیوں کا دین ہے اور کبھی کہتے قبلہ تو یہودیوں ہی کا قبلہ ہے اسی لئے تو تمہارا پیغمبر ہمارے قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتا ہے لیکن جب قبلہ کا حکم بدل دیا گیا اور اس سورہ کی آیت ۱۴۴ کے مطابق مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھیں۔ اب یہودیوں کے ہاتھ پہلے والی بات تو نہ رہی لیکن وہ نیا راگ الاپنے لگے اور کہنے لگے: اگر قبلہ اول صحیح تھا تو یہ دوسرا حکم کیا ہے اور اگر دوسرا حکم صحیح ہے تو پھر تمہارے پہلے اعمال باطل ہیں۔ قرآن ان آیات میں ان کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے اور مومنین کے دلوں کو روشن کرتا ہے[۱]۔
قرآن کہتا ہے: ہم کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کی تنسیخ کو تاخیر میں نہیں ڈالتے مگر اس سے بہتر یا اس جیسے کسی دوسرے حکم کو اس کی جگہ نافذ کر دیتے ہیں (ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا) اور خدا کے لئے یہ آسان ہے، کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (الم تعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر)۔

بعد کی آیت میں اس کی تاکید کی گئی ہے: کیا جانتے نہیں ہو کہ آسمانوں اور زمینوں کی حکومت خدا کے لئے ہے (الم تعلم ان اللہ لہ ملک السمٰوٰت والارض)۔

وہ حق رکھتا ہے کہ مصالح کے مطابق اپنے احکام میں ہر قسم کا تغیر و تبدل کرے اور وہ اپنے بندوں کے مصالح سے زیادہ آگاہ اور زیادہ بصیر ہے۔

اور کیا تم جانتے نہیں ہو کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں ہے (وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر)۔

حقیقت میں اس آیت کا پہلا جملہ احکام میں خدا کی حاکمیت اور بندوں کے تمام مصالح کی تشخیص میں اس کی قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ ان حالات میں مومنین کو نہیں چاہیئے کہ وہ ان خود غرض لوگوں کی باتوں کی طرف کان دھریں جو نسخ احکام کے مسئلہ میں شک و تردد کرتے ہیں۔

دوسرا جملہ ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہے جو خدا کے علاوہ اپنے لئے سہارے کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ عالم ہستی میں اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں۔

---

[۱] یہ بھی احتمال ہے کہ مندرجہ بالا آیات کا تعلق قبلہ کی تبدیلی سے نہ ہو بلکہ بعض دیگر احکام اسلام کے تغیر و نسخ سے ہو جیسا کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اور سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں ذکر کیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) کیا احکام شریعت میں نسخ جائز ہے: لغت کی نظر سے نسخ کا معنیٰ ہے ختم کرنا اور زائل کرنا اور شریعت کی منطق میں نسخ ایک حکم بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرنے کو کہتے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہجرت کے سولہ ماہ بعد تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے اس کے بعد قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا اور انہیں پابند کیا گیا کہ اب نماز کے وقت کعبہ کی طرف رخ کیا کریں۔

۲۔ سورۂ نساء آیہ ۱۵ میں بدکار عورتوں کی سزا کے سلسلے میں حکم دیا گیا تھا کہ چار گواہوں کی شہادت پر انہیں گھر میں بند کردیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائیں یا خدا ان کے لئے کوئی اور راستہ مقرر کردے۔

یہ آیت سورہ نور کی آیہ ۲ سے منسوخ ہو گئی اور اس آیت کی رو سے ان کی سزا سو تازیانے مقرر ہوئی۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر پہلا حکم مصلحت کا حامل تھا تو پھر اسے منسوخ کیوں کیا گیا اور اگر اس میں مصلحت نہیں تھی تو ابتداء میں نافذ کیوں کیا گیا۔ بہ الفاظ دیگر کیا تھا اگر ابتداء ہی سے ایسا حکم نازل ہوتا کہ نسخ اور تغیر کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس سوال کا جواب علماء اسلام بہت پہلے اپنی کتب میں دے چکے ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ کچھ اپنی توضیح کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ زمانے اور علاقے کے لحاظ سے انسان کی ضروریات بدل جاتی ہیں۔ ایک دن ایک پروگرام اس کی سعادت کا ضامن تھا لیکن دوسرے دن ممکن ہے حالات بدل جانے سے وہی پروگرام اس کے راستے کا کانٹا بن جائے۔ ایک دن ایک دوا بیمار کے لئے بہت مفید ہے اور ڈاکٹر اس کے استعمال کا حکم دیتا ہے جب کہ دوسرے دن بیمار کے کچھ صحت مند ہو جانے کی وجہ سے ممکن ہے یہی دوا اس کے لئے نقصان دہ ہو لہٰذا ڈاکٹر اس دوا کو ترک کرنے اور اس کی بجائے دوسری دوا استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ممکن ہے اس سال طالب علم کے لئے کچھ دروس اصلاحی اور مفید ہوں لیکن یہی دروس آئندہ سال یا بعد کے چند سال کے لئے بے فائدہ ہوں۔ معلم کو چاہیئے کہ ایسا پروگرام اور نصاب مرتب کرے جو ہر سال کی اپنی ضروریات کے مطابق ہو۔

اگر ہم تکامل انسان کی روش اور مختلف معاشروں کی طرف توجہ دیں تو یہ بات زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ کبھی ایک پروگرام مفید اور اصلاحی ہوتا ہے اور کبھی وہی نقصان دہ اور لازمی طور پر قابل تغیر ہوتا ہے خصوصاً اجتماعی، نظریاتی اور عقائدی انقلابات کے آغاز میں پروگراموں کی تبدیلی کی ضرورت مختلف اوقات میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

البتہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ احکام الٰہی کے اساسی ارکان کے اصول بالکل تبدیل نہیں ہوتے وہ ہر جگہ ایک جیسے رہتے ہیں۔ توحید، عدالتِ اجتماعی کے اصول اور اس قسم کے سینکڑوں احکام ہیں جو تبدیل نہیں ہوتے تغیر تو جزئیات کو

دوسرے درجے کے احکام میں ہوتا ہے۔

اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ممکن ہے مذاہب کا تکامل اس مقام پر پہنچ جائے کہ آخری مذہب خاتم ادیان کے عنوان سے نازل ہو اور اس طرح کہ اب احکام کی تبدیلی کی اس میں کوئی گنجائش نہ ہو۔[1]

مشہور اگرچہ یہی ہے کہ یہودی نسخ کے کلی طور پر منکر ہیں اور وہ اسی بناء پر مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر معترض تھے لیکن وہ مجبور ہیں کہ اپنے مذہب کی بنیادی کتب کی روشنی میں نسخ کو تسلیم کریں کیونکہ تورات کے مطابق جس وقت نوح کشتی سے نیچے اترے تو خدا نے ان کے لئے تمام جانور حلال کردیے لیکن یہی حکم موسیٰ کی شریعت میں منسوخ ہو گیا اور کچھ حیوانات حرام ہو گئے۔

تورات کے سفر تکوین، فصل ۹، شمارہ ۳ میں ہے:

ہر حرکت کرنے والا جو زندہ ہے وہ تمہاری خوراک ہوگا اور یہ سب سبزہ زار کی گھاس کی طرح ہم نے تمہیں دیے ہیں۔

(۱۱) لفظ "آیت" سے کیا مراد ہے: لغت میں "آیت" نشانی اور علامت کو کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

۱۔ قرآن کے جملے اور فقرے جو خاص علامات کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کئے گئے ہیں وہ آیت کے نام سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے:

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ط

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں۔ (بقرہ ۲۵۲)

۲۔ معجزات کا ذکر آیت کے عنوان سے ہوا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ کے مشہور معجزہ ید بیضا کے بارے میں ہے:

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ

ہاتھ گریبان میں بغل کے نیچے تک لے جاؤ جب وہ باہر نکلے گا تو سفید چمکنے والا بے عیب و نقص ہوگا اور یہ ایک اور معجزہ ہے۔ (طٰہٰ-۲۲)

۳۔ خداشناسی کی دلیل یا قیامت کی نشانی کے لئے بھی لفظ آیت قرآن میں آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ

رات اور دن کو ہم نے خداشناسی کے لئے دو دلیلیں قرار دیا۔ (بنی اسرائیل-۱۲)

قیامت پر استدلال کے موقع پر فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط

---

[1] اس موضوع کی پوری تفصیل انشاء اللہ آپ سورۂ احزاب کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاهَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝

اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک اور سُونی پڑی ہوئی ہے لیکن جب اس پر (بارش کا) پانی برستا ہے تو وہ حرکت میں آتی ہے اور اس کے سبزے اُگنے لگتے ہیں۔ وہی ذات جس نے زمین کو زندہ کیا ہے۔ مُردوں کو بھی زندہ کرے گی۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(حٰم السجدۃ۔ ۳۹)

۴۔ آنکھوں کو متاثر کرنے والی چیزوں کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ مثلاً اس آیت میں بلند و عالی محلات کے بارے میں ہے:

اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِیۡعٍ اٰیَةً تَعۡبَثُوۡنَ ۝

کیا ہر بلند جگہ پر عمارتیں بناتے ہو تاکہ ان میں مصروف لہو و لعب رہ سکو۔ (شعراء۔ ۱۲۸)

واضح ہے کہ ان مختلف معانی میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے "نشانی"۔ البتہ زیر بحث آیات میں قرآن نے کہا ہے "ہم اگر ایک آیت منسوخ کرتے ہیں تو اس جیسی یا اس سے بہتر لے آتے ہیں"۔ یہاں آیت سے مراد حکم ہے۔ اگر ایک منسوخ ہوا تو اس سے بہتر نازل ہوگا یا اگر ایک نبی کا معجزہ منسوخ ہوا تو بعد والے نبی کو زیادہ واضح معجزہ دیا جاتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بعض روایات میں مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہے کہ نسخ آیت ایک امام کی وفات اور اس کی جگہ دوسرے کی تقرری کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہ مفہوم زیرِ نظر آیت کا ایک مصداق ہے[1]

(۱۱) "ننسھا" کی تفسیر: "ننسھا" کا لفظ محل بحث آیات میں "ننسخ" پر عطف ہے۔ اس کا مادہ "انساء" ہے۔ یہاں یہ لفظ تاخیر کرنے، حذف کرنے اور اذہان سے زائل کرنے کے معنی میں آیا ہے[2]

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ "نسخ" کو سامنے رکھتے ہوئے اس لفظ کا مفہوم کیا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ یہاں مقصد یہ ہے کہ اگر ہم کسی آیت کو منسوخ کریں یا اس کی تنسیخ میں بعض مصالح کے پیش نظر تاخیر کریں تو ہر صورت میں اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آئیں گے۔ اس بناء پر لفظ "نسخ" تھوڑی مدت کے نسخ کے لئے اور "ننسھا" دراز مدت کے نسخ کے لئے ہے۔

(۱۷)۔ "او مثلھا" کی تفسیر: مندرجہ بالا بات کو پیش نظر رکھیں تو فوراً سوال پیدا ہوگا کہ "او مثلھا" سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی حکم پہلے جیسے حکم کی طرح کا ہے تو فضول نظر آتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک چیز منسوخ کر کے اس جیسی ہی دوسری چیز لائی جائے ناسخ کو منسوخ سے بہتر ہونا چاہیئے تاکہ نسخ قابل قبول ہو۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اوّل ص۱۱۹

[2] پہلی صورت میں مادہ "نساء" سے اور دوسری صورت میں مادہ "نسی" سے ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ مثل سے مراد یہ ہے کہ ایسا حکم اور قانون پیش کیا جائے جس کا اثر بھی گذشتہ زمانے میں گذشتہ قانون کا سا ہو۔
اس کی توضیح یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ایک حکم آج کئی آثار و فوائد کا حامل ہو لیکن کل اس سے یہ آثار کھو جائیں۔ اس صورت میں اسے منسوخ ہو جانا چاہیئے اور اس کی جگہ نیا حکم آنا چاہیئے جو اگر اس سے بہتر نہ ہو تو کم از کم اس جیسے آثار کا حامل ہو اور یہ چیز زمانے اور حالات سے وابستہ ہے کہ کبھی گذشتہ حکم کی طرح کا قانون چاہیئے اور کبھی اس سے بہتر۔ اس طرح کسی قسم کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

۱۰۸۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

ترجمہ

۱۰۸۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے (نامعقول) سوال کرو جو اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے (اور اس بہانے سے ایمان لانے سے روگردانی کرو)۔ جو شخص ایمان سے کفر کا تبادلہ کرے (اور ایمان کی بجائے اسے قبول کر لے) وہ (عقل و فطرت کی) راہ مستقیم سے گمراہ ہو چکا ہے۔

شانِ نزول

کتب تفاسیر میں اس آیت کی شانِ نزول کے سلسلے میں متعدد مطالب نظر آتے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔

۱۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ وہب بن زید اور رافع بن حرملہ رسولِ خداؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے خدا کی طرف سے کوئی خط ہمارے نام پیش کیجئے تاکہ ہم اسے پڑھ کر ایمان لے آئیں یا ہمارے لئے نہریں جاری کیجئے تاکہ ہم آپ کی پیروی کریں۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ عرب کے ایک گروہ نے پیغمبر اسلامؐ سے اسی طرح کے تقاضے کئے جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ سے کئے تھے انہوں نے کہا ہمیں ظاہر بظاہر خدا کی نشاندہی کرو کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اور ایمان لے آئیں۔

۳۔ بعض نے لکھا ہے کہ ایک گروہ عرب نے پیغمبر اکرمؐ سے تقاضا کیا کہ ان کے لئے ذاتِ انواط سے ایک مخصوص درخت مقرر کر دیں۔ تاکہ وہ اس کی پرستش کر سکیں جیسے بنی اسرائیل کے جاہلوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا:

اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ

ہمارے لئے ایک بت مقرر کردیں جیسے بت پرستوں کے پاس ہیں۔ (اعراف-۱۳۸)

مندرجہ بالا آیت ان کے جواب میں نازل ہوئی۔

تفسیر

بے بنیاد بہانے

اس آیت کے مخاطب اگرچہ یہودی نہیں ہیں بلکہ کمزور ایمان والے مسلمان یا مشرکین ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ یہودیوں کی سرگذشت سے بغیر متعلق بھی نہیں۔

غالباً قبلہ کی تبدیلی کے بعد کی بات ہے کہ کچھ مسلمانوں اور مشرکین نے یہودیوں کے پراپیگنڈا کے زیر اثر پیغمبر اسلامؐ سے چند بے محل اور نامعقول تقاضے کئے جن کے نمونے شانِ نزول میں بیان ہو چکے ہیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں ایسے سوالوں سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے وہی نامعقول تقاضے کرو جو اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے ہیں، تاکہ ان بہانہ سازیوں سے ایمان سے رُخ پھیر سکو (ام تریدون ان تسئلوا رسولکم کما سئل موسیٰ من قبل)۔

چونکہ ایک طرح سے یہ ایمان سے کفر کا تبادلہ ہے لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے: جو شخص ایمان کی بجائے کفر کو قبول کرے وہ راہِ مستقیم سے گمراہ ہو گیا ہے (ومن یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سواء السبیل)۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلام علمی اور منطقی سوالات سے منع کرتا ہے یا دعوتِ نبی کی حقانیت سمجھنے کے لئے معجزہ طلبی سے روکتا ہے کیونکہ فہم و ادراک اور ایمان کے یہی ذرائع ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جو بہانہ سازی اور دعوتِ پیغمبر سے بچنے کے لئے بے بنیاد سوالات کرتے تھے اور خود خواہ معجزات کا ذکر کرتے تھے۔ جب کہ پیغمبر کافی دلائل و معجزات ان کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نئے طور سے آتا اور نئی خارقِ عادت چیز کا تقاضا کرتا۔ حالانکہ معجزہ اور خارقِ عادت کوئی بازیچۂ اطفال تو نہیں ہے وہ اس قدر ضروری ہے کہ جس سے پیغمبروں کے کلام کی سچائی کا اطمینان ہو سکے ورنہ پیغمبر معجزات کا کاروبار تو نہیں کرتے کہ وہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور ہر آنے والا ان سے معجزہ طلب کرتا رہے۔

علاوہ ازیں کبھی تو وہ بالکل نامعقول تقاضے کرتے تھے مثلاً خدا کو آنکھ سے دیکھنا یا بت بنا کر دینا۔ درحقیقت قرآن لوگوں کو یہ تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم اسی طرح کے نامعقول تقاضے کرتے رہے تو تمہارے سر پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قومِ موسیٰ کے سر پر آیا تھا۔

۱۰۹- وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا ۚ

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ
اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
۱۱۰۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۗ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۰۹۔ بہت سے اہل کتاب اس حسد کی بنا پر جو ان کے وجود میں جڑ پکڑ چکا ہے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام و ایمان کے بعد پہلی حالت کی طرف پھیر دیں حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے۔ تم انہیں معاف کر دو اور ان سے درگذر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا فرمان (جہاد) بھیجے۔ یقیناً خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۱۱۰۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (اور ان دو ذرائع سے اپنے معاشرے کی روح اور جسم کو طاقتور بنالو اور جان لو کہ) ہر کار خیر جو اپنے لئے (دار آخرت کی طرف) آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں موجود پاؤ گے۔ خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم حاسد

بہت سے اہل کتاب ایسے تھے کہ صرف اس پر بس نہ کرتے تھے کہ خود دین اسلام قبول نہ کریں بلکہ انہیں اصرار تھا کہ مومنین بھی اپنے ایمان سے پلٹ آئیں اور اس کا سبب حسد کے سوا کچھ نہ تھا۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا: بہت سے اہل کتاب حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام پر ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں حالانکہ ان پر حق مکمل طور پر واضح ہو چکا ہے (ود کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق)۔

اس مقام پر قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ایسے بگڑے اور تباہ کن تقاضوں کے مقابلے میں تم انہیں معاف کر دو اور ان سے درگذر کرو یہاں تک کہ خدا خود اپنا فرمان بھیجے کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (فاعفوا واصفحوا

حتی یاتی اللہ بامرہ ان اللہ علی کل شیئ قدیر)۔

حقیقت میں مسلمانوں کو ایک ٹیکنیکل حکم دیا گیا ہے کہ ان مخصوص حالات میں عفو و درگذر کے ہتھیار سے استفادہ کریں اور اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح میں لگے رہیں اور فرمانِ خدا کا انتظار کرتے رہیں۔

بہت سے مفسرین کے بقول یہاں فرمانِ خدا سے مراد فرمان جہاد ہے جو اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگ ابھی ہر پہلو سے اس کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی لئے تو بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ یہ آیت جہاد کی آیات کی وجہ سے منسوخ ہو گئی۔ جن کی طرف بعد میں اشارہ ہو گا۔

لیکن اسے نسخ قرار دینا شاید صحیح نہ ہو کیونکہ نسخ کا معنیٰ ہے کہ ظاہراً تھوڑی مدت کے لئے کوئی حکم جاری ہوتا ہے اور شریعت قرار پاتا ہے لیکن باطناً موقت ہے جب کہ یہاں آیت میں عفو و درگذر کا حکم ایک محدود شکل میں آیا ہے وہ اس زمانے تک محدود ہے جب تک جہاد کے متعلق فرمانِ الٰہی نہیں آیا۔ بعد کی آیت جس میں مومنین کو دو اہم اصلاحی احکام دیے گئے ہیں، ایک نماز جو انسان اور خدا کے درمیان مضبوط ربط پیدا کرتی ہے اور دوسرا زکوٰۃ جو معاشرے کے افراد کے لئے ایک دوسرے سے وابستگی کی رمز ہے اور یہ دونوں امور دشمن پر کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ فرمایا: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور ان دو ذرائع سے اپنی روح اور جسم کو طاقت بخشو (واقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ)۔

مزید فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ جو نیکی کے کام تم کرتے ہو اور جو مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہو وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ جو نیکیاں تم آگے بھیجتے ہو انہیں خدا کے ہاں (دارِ آخرت میں) موجود پاؤ گے (وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ)۔ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے (ان اللہ بما تعملون بصیر) وہ پورے طور پر جانتا ہے کہ کون سا عمل تم نے خدا کے لئے انجام دیا ہے اور کون سا اس کے غیر کے لیے۔

چند اہم نکات

(۱) "فاعفوا" اور "اصفحوا": "اصفحوا" کا مادہ "صفح" ہے اس کا معنی ہے دامن کوہ، تلوار کا عرض اور رخسار اور یہ لفظ عموماً منہ پھیرنے اور صرف نظر کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

لفظ "فاعفوا" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روگردانی، غصہ اور بے اعتنائی کے لئے نہیں بلکہ بزرگانہ درگزر کے طور پر ہے۔ یہ دو تعبیریں ضمناً نشاندہی کرتی ہیں کہ مسلمان اس وقت بھی اس قدر قدرت و طاقت رکھتے تھے کہ عفو و درگزر نہ کرتے اور دشمن کو ضروری سزا دیتے لیکن خدا تعالیٰ نے ان کو پہلے عفو و درگزر کا حکم دیا ہے تاکہ وہ ہر لحاظ سے تیاری کر لیں یا اس لئے کہ دشمن اگر قابل اصلاح ہیں تو ان کی اصلاح ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں دشمن کے مقابلے میں شروع میں کبھی خشونت اور سخت گیری نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ یہ اخلاقِ اسلامی کا ضروری حصہ ہے کہ پہلے عفو و درگزر

سے کام لیا جائے اگر وہ مؤثر نہ ہو تو پھر سختی کو بروئے کار لایا جائے۔

(ii) "ان اللہ علی کل شیء قدیر" کا جملہ: ہو سکتا ہے یہ جملہ اس مقام پر اس طرف اشارہ ہو کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ غیر مادی طریقوں سے تمہیں ان پر کامیابی دیدے لیکن انسانی زندگی کا مزاج اور عالم آفرینش کی طبیعت متقضی ہیں کہ ہر کام تدریجاً اور مقدمات فراہم ہونے پر انجام پذیر ہو۔

(iii) "حسدا من عند انفسھم" کا مفہوم: (یعنی ان کا سبب وہ حسد ہے جو ان کی اپنی طرف سے ہے) ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ بعض اوقات حسد کا مقصد تو ذاتی غرض ہوتی ہے لیکن اسے دین کا رنگ دے دیا جاتا ہے یہاں جو حسد ہے اس میں تو یہ پہلو بھی نہیں بلکہ فقط ذاتی غرض پر مبنی ہے[1]

۱۱۱- وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۱۱۲- بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۱۱- وہ کہتے ہیں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ تو صرف ان کی تمنا ہے کہیے کہ اگر سچے ہو تو (اس دعوی پر) اپنی دلیل پیش کرو۔

۱۱۲- جی ہاں! جو بھی خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرلے اور نیکوکار ہو تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس مسلم ہے۔ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (لہٰذا جنت اور سعادت کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہے)۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات میں قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کے ایک اور فضول اور نامعقول دعوی کی طرف اشارہ کرکے انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے۔ کہتا ہے: وہ (یہود و نصاری) کہتے ہیں کہ یہودی و نصاری کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا (وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری)[2]

---

[1] تفسیر المنار، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] اگرچہ لفظ "قالوا" بصورت واحد ہے لیکن معلوم ہے کہ دو گروہوں کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک کا دعوی الگ ہے یہود کہتے ہیں جنت ہمارے لئے مخصوص ہے اور عیسائی کہتے ہیں ہمارے لئے مخصوص ہے۔

قرآن دونوں گروہوں کے دعویٰ کا ایک ہی جگہ جواب دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: یہ تو ان کی فقط آرزو ہے جو کبھی پوری نہ ہوگی (تلک امانیھم)۔ پھر پیغمبر کو مخاطب کرکے فرماتا ہے: (قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین)۔ یعنی اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرو۔

یہ حقیقت ثابت ہونے کے بعد کہ ان کے پاس ان کے دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں اور ان کے لیے اختصاص جنت کا دعویٰ صرف خواب و خیال ہے جو ان کے سروں پر سوار ہے جنت میں داخل ہونے کا اصلی و حقیقی قانون کلی بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے: ہاں تو جو خدا کے سامنے سرتسلیم خم کرلے اور نیکو کار ہو اس کا اجر و ثواب اس کے پروردگار کے ہاں مسلم ہے (بلیٰ من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ)۔ اس لئے ایسے اشخاص کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

لہٰذا جنت، اجر و ثواب الٰہی اور سعادت دائمی کا حصول کسی گروہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ یہ سب کچھ ان کے لئے ہے جن میں دو شرطیں پائی جاتی ہوں۔

۱۔ اول یہ کہ وہ حکم کے سامنے تسلیم محض ہوں، ایمان و توحید ان کے دل پر سایہ فگن ہو اور احکام الٰہی میں کسی قسم کی تبعیض اور چون و چرا کے قائل نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ جو احکام ان کے فائدے کے ہوں وہ تو قبول کرلیں اور جو ان کے خلاف ہوں انہیں پس پشت ڈال دیں بلکہ وہ مکمل طور پر تسلیم حق ہوں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ان کے ایمان کے آثار عمل اور کار خیر کی انجام دہی کی صورت میں ظاہر ہوں۔ وہ سب سے نیکی کریں اور تمام پروگراموں میں نیک ہوں۔

اس بیان سے در اصل قرآن یہودیوں کی نسل پرستی اور عیسائیوں کے نامعقول تعصبات کی نفی کرتا ہے اور کسی خاص گروہ میں سعادت و خوش بختی کے منحصر ہونے کو باطل قرار دیتا ہے۔ نیز صرف ایمان اور عمل صالح کو نجات کا معیار قرار دیتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) امانیھم: یہ امنیہ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ایسی آرزو جس تک انسان رسائی حاصل نہ کر سکے لیکن یہاں تو اہل کتاب میں سے مدعیان کی صرف ایک آرزو تھی یعنی جنت کی ان کے لئے تخصیص۔ چونکہ یہ آرزو کئی آرزوؤں کا سرچشمہ تھی اور اصطلاحاً کئی شاخیں اور پتے رکھتی تھی اس لئے جمع کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔

(۲) اسلم وجھہ: یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اسلام کی "وجہ" کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ (اپنے چہرے کو خدا کے سامنے خم کرنا)۔ یہ اس سبب سے ہے کہ کسی کے سامنے سپردگی کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ انسان پورے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے متوجہ ہو۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "وجہ" کا معنی ذات ہو یعنی اپنے پورے وجود کے ساتھ فرمان پروردگار کے سامنے سرتسلیم خم کریں۔

(iii) بے دلیل دعووں سے بے اعتنائی: مندرجہ بالا آیات میں یہ نکتہ بھی ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ کسی مقام پر بھی بے دلیل باتوں کے پیچھے نہ جائیں اگر کوئی بھی شخص کچھ دعویٰ کرے تو اس سے دلیل مانگیں اور یوں اندھی تقلید کے سامنے بند باندھ دیں تاکہ ان کے معاشرے میں منطقی فکر کی حکمرانی ہو۔

(iv) وھو محسن: مسئلہ تسلیم کے بعد "وھو محسن" ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان راسخ نہ ہو نیکی اپنا وسیع مفہوم نہیں پا سکتی۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ایسے انسان کے لئے نیکی ایک جلد گزر جانے والا فعل نہیں بلکہ وہ ان کی صفت بن چکی ہے اور ان کی ذات کی گہرائی میں اتر چکی ہے۔

راہِ توحید کے راہیوں کے لیے خوف و غم نہیں:

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور کسی سے گھبراتے نہیں لیکن بیہودہ مشرک ہر چیز سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ان کی اور اس کی گفتگو، بدحالی، فضول رسم و رواج اور ایسی ہی بہت سی چیزیں ہیں جن سے وہ خوفزدہ رہتے ہیں۔

۱۱۳- وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۳- یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی (خدا کے ہاں) کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور عیسائی (بھی) کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں (اور وہ باطل پر ہیں) حالانکہ دونوں گروہ خدا کی کتاب پڑھتے ہیں (اور انہیں ایسے تعصبات اور کینوں سے علیحدہ رہنا چاہیے)۔ نادان (اور مشرک) لوگ بھی ان کی سی باتیں کرتے ہیں۔ خداوند عالم قیامت کے دن ان کے اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے:

جب نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا تو علماء یہود کا ایک گروہ

بھی وہاں موجود تھا۔ عیسائیوں اور ان کے درمیان آنحضرتؐ کے سامنے ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔ رافع بن حرملہ جو ایک یہودی تھا اس نے عیسائیوں کی طرف منہ کرکے کہا: تمہارے دین کی کوئی اساس نہیں ہے نیز اس نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اور انجیل کا انکار کیا۔ نجران کے عیسائیوں میں سے ایک شخص نے بعینہ یہی جملہ اس کے جواب میں کہا: کہنے لگا: یہودیوں کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں اور اس نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت اور ان کی کتاب توریت کا انکار کیا۔ اسی اثناء میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور دونوں گروہوں کو ان کی غلط اور نادرست گفتگو پر ملامت کی [1]

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم نے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کے کچھ بے دلیل دعووں کو ملاحظہ کیا۔ زیر بحث آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بے دلیل دعوے کا نتیجہ تضاد ہوتا ہے اور ہر گروہ اپنی اجارہ داری کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ارشاد ہے: یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کی خدا کے ہاں کوئی اہمیت و حیثیت نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کی کوئی وقعت نہیں اور وہ باطل پر ہیں (وقالت الیهود لیست النصٰری علی شیءٍ وقالت النصٰری لیست الیهود علی شیءٍ)

۔لیست .... علی شیءٍ ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ وہ درگاہ الٰہی میں کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتے یا ان کے مذہب کی کوئی حیثیت نہیں۔

مزید فرمایا: یہ ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ آسمانی کتاب پڑھتے ہیں (وھم یتلون الکتٰب) یعنی کتب خدا جن سے وہ حقائق سمجھ سکتے ہیں، کے حامل ہونے کے باوجود صرف تعصب، عناد اور ڈھٹائی کی باتیں کرنا تعجب انگیز ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے حضرت مسیحؑ کے آنے کے بارے میں جو بشارتیں دی ہیں ان کی طرف توجہ کریں تو یہودی بغیر تعصب کے ان کی نبوت قبول کر سکتے ہیں اور عیسائی بھی انجیل کی تعلیمات اور حضرت مسیحؑ کی گفتگو سامنے رکھیں تو توراۃ اور حضرت موسیٰؑ کی نبوت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ میں حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی تکمیل کے لئے آیا ہوں۔

قرآن مزید کہتا ہے: نادان مشرکین بھی ان کی سی باتیں کہتے تھے (حالانکہ یہ اہل کتاب ہیں اور وہ بت پرست ہیں) (کذٰلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم)۔

درحقیقت اس آیت میں قرآن نے تعصب کے اصل سرچشمہ کا ذکر کیا ہے جو جہل و نادانی ہے کیونکہ نادان انسان ہمیشہ اپنی زندگی کے گرد ہی محصور رہتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتے اور بچپن سے جس مذہب سے آشنا ہوں اپنے دل کو سختی سے اسی کے ساتھ منسلک رکھتے ہیں چاہے وہ فضول اور بے بنیاد ہو اور اس کے علاوہ ہر چیز کا

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر المنار مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔

انکار کر دیتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ہے: اس اختلاف کا فیصلہ اللہ آخرت میں خود کرے گا۔ (فاللہ یحکم بینھم یوم القیٰمۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

آخرت وہ مقام ہے جہاں حقائق زیادہ روشن اور واضح ہو جائیں گے۔ ہر چیز کے اسناد و مدارک آشکار ہو جائیں گے اور وہاں کوئی شخص حق کا انکار نہیں کر سکے گا۔ اس وقت تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ گویا قیامت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اختلافات باقی نہ رہیں گے۔

مندرجہ بالا آیت میں ضمناً یہ بھی ہے کہ خدا مسلمانوں کو تسلی دیتا ہے کہ اگر ان مذاہب کے پیروکار تمہارے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں اور تمہارے دین کو جھٹلاتے ہیں تو اس کی ہرگز پرواہ نہ کرو وہ تو خود کو بھی قبول نہیں کرتے ان میں سے ہر ایک دوسرے پر نفی کی لاٹھی چلاتا ہے۔ اصولی طور پر تعصب کا سرچشمہ جہل و نادانی ہے اور تعصب اجارہ داری کی خواہش کا تابع ہے۔

۱۱۴۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۴۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو مساجد میں خدا کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی ویرانی و بربادی میں کوشاں ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ خوف و وحشت کے بغیر یہ لوگ ان مقامات میں داخل ہوں بلکہ مسلمان انہیں ان مقامات مقدسہ سے روک دیں اور انہیں وہاں نہ آنے دیں، ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

شانِ نزول

کتاب "اسباب النزول" میں ابن عباس سے یوں منقول ہے:

یہ آیت مطلوس بن رومی اور اس کے عیسائی ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے جنگ کی، تورات کو آگ لگائی، ان کی اولاد کو قید کر لیا، بیت المقدس کو ویران کر دیا اور اس میں مردہ چیزیں پھینک دیں۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں ابن عباس سے ناقل ہیں:

بیت المقدس کو خراب کرنے اور تباہ و برباد کرنے کی کوشش مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

امام صادقؑ سے بھی ایک روایت منقول ہے جس میں ہے:

یہ آیت قریش کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ پیغمبر اسلام کو شہر مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے منع کر رہے تھے۔

بعض نے اس آیت کی تیسری شان نزول ذکر کی ہے کہ اس سے مراد وہ جگہیں اور مکانات ہیں جو مکہ میں نماز کے لئے مسلمانوں کے پاس تھے اور مشرکین نے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے وقت انہیں ویران کر دیا تھا۔[1]

کوئی مانع نہیں کہ آیت کا نزول ان تمام حوادث و واقعات کے ضمن میں ہو۔ لہٰذا ان میں سے ہر شان نزول مسئلے کے ایک پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تفسیر شان ہائے نزول کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت کا رخ سخن تین گروہوں یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی طرف ہے اگرچہ گذشتہ آیات میں زیادہ تر یہودیوں کے بارے میں بحثیں آئی ہیں اور کہیں کہیں نصاریٰ کی طرف بھی اشارہ ہے۔

قبلہ کی تبدیلی کے معاملے کے بارے میں یہودی وسوسہ ڈال کر کوشش کرتے تھے کہ مسلمان بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں تاکہ اس سلسلے میں انہیں برتری حاصل رہے اور اس طرح مسجد الحرام اور کعبہ کی رونق بھی کم ہو سکے۔[2]

مشرکین مکہ بھی پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک کر عملاً اس خدائی عمارت کی بربادی کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔

عیسائی بھی بیت المقدس پر قبضہ کر کے اس میں وہ ناپسندیدہ اعمال سرانجام دیتے تھے جن کا ذکر ابن عباس کی روایت میں آچکا ہے تاکہ اسے برباد کر سکیں۔

ان تینوں گروہوں اور ایسے تمام اشخاص جو اس راہ پر قدم اٹھاتے ہیں کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے: اس شخص سے بڑھ کے کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں خدا کا نام لینے سے روکتے ہیں اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں (ومن اظلم ممن منع مسٰجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعیٰ فی خرابہا)۔ یوں قرآن ایسی رکاوٹ کو ظلم عظیم اور یہ کام کرنے والوں کو ظالم ترین افراد قرار دیتا ہے۔ اور واقعاً اس سے بڑا کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ درگاہ توحید کو برباد کرنے کی کوشش کی جائے، لوگوں کو حق تعالیٰ کی یاد سے روکا جائے اور معاشرے میں فساد برپا کیا جائے۔

آیت مزید کہتی ہے: مناسب نہیں کہ یہ لوگ خوف و وحشت کے بغیر ان مکانات میں داخل ہوں (اولٰئک ما

---

[1] مجمع البیان اور المیزان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

کان لھم ان یدخلوھا الا خائفین ؕ

یعنی دنیا کے مسلمانوں اور توحید پرستوں کو چاہیئے کہ وہ اس مضبوطی سے قیام کریں کہ ان ستمگروں کے ہاتھ ان مقدس مقامات سے دور ہو جائیں اور ان میں سے کوئی بھی علی الاعلان بلا خوف ان مقامات مقدسہ میں داخل نہ ہو سکے۔

مندرجہ بالا جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ستمگران مراکز عبادت کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکیں گے۔ بلکہ آخر کار ان میں بلا خوف قدم بھی نہیں رکھ سکیں گے جیسا کہ مسجد الحرام کے بارے میں مشرکین مکہ کے ساتھ ہوا۔

آخر میں ایسے عظیم ستمگروں کے لئے دنیا و آخرت میں ہلا دینے والی سزا کا ذکر ہے۔ فرمایا: ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے (لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم)۔ وہ لوگ جو خدا اور خدا کے بندوں میں جدائی ڈالنا چاہتے ہیں ان کا یہی انجام ہے۔

چند اہم نکات

(۱) مساجد کی ویرانی کی راہیں: اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت کا مفہوم وسیع اور کافی پھیلا ہوا ہے اور کسی زمان و مکان سے مخصوص نہیں ہے جیسے دیگر آیات ہیں جو اگرچہ خاص حالات میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم تمام زمانوں کے لئے مسلم ہے۔ اس بنا پر ہر شخص اور ہر وہ گروہ جو کسی طرح مساجد الٰہی کی تباہی و ویرانی کی کوشش کرے یا اس میں ذکر خدا اور عبادت سے روکے وہ اسی رسوائی اور عذاب عظیم کا مستحق ہو گا۔ جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ مساجد میں داخل ہونے اور ان میں ذکر پروردگار کو روکنے اور ان کی ویرانی و بربادی کی کوشش کا صرف یہ مطلب نہیں کہ بیلچے یا ایسے کسی ہتھیار سے مسجد کو تباہ کیا جائے بلکہ ہر وہ عمل جس کا نتیجہ مسجد کی ویرانی اور اس کی رونق میں کمی ہو اس میں شامل ہے۔

آیت "انما یعمر مساجد اللہ ...." (توبہ-۱۸) کی تفسیر میں تفصیل سے آئے گا کہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق تعمیر اور آبادی سے مراد مساجد کی عمارتیں بنانا ہی نہیں بلکہ مساجد میں جانا اور وہاں کی مذہبی محافل و مجالس جو یاد خدا کا باعث ہیں کی طرف توجہ رکھنا بھی تعمیر کے مفہوم میں شامل ہے بلکہ یہی اس کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس بنا پر جو چیز یاد خدا سے لوگوں کی غفلت کا باعث بنے اور جس سے لوگ مساجد سے دور ہوں وہ بہت بڑا ظلم ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ اس دور میں نادان، خشک مزاج اور عقل و منطق سے عاری متعصبین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو چاہتا ہے کہ احیائے توحید کے بہانے ان مساجد اور عبادات کو برباد کر دے جو آئمہ اہل بیتؑ، بزرگان اسلام اور صلحائے دین کی قبور پر واقع ہیں اور ہمیشہ یاد خدا کا مرکز ہیں۔ زیادہ تعجب تو اس پر ہے کہ یہ بے منطق ستمگر احیائے توحید اور رد شرک کے نام پر یہ افعال انجام دیتے ہوئے بہت سے گناہان کبیرہ کا ارتکاب کر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں فرض کریں کہ کسی مرکز مقدس پر کوئی غلط کام سر انجام پا رہا ہے تو اس کام کو روکا جانا چاہیئے نہ کہ ان مراکز توحید کو برباد کرنا چاہیئے۔

(۱) سب سے بڑا ظلم : دوسرا نکتہ جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے یہ ہے کہ خداوند عالم ان اشخاص کو ظالم ترین قرار دیتا ہے اور واقعاً ایسا ہے کیونکہ مساجد کی تباہی و بربادی اور مراکزِ توحید سے لوگوں کو روکنے کی کوشش کا نتیجہ بے دینی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کام کا نقصان ہر برے عمل سے زیادہ ہے۔ اور اس کا بُرا اور غلط انجام بہت دردناک ہے۔

قرآن میں دیگر مقامات پر بھی لفظ "اظلم" (یعنی۔ زیادہ ظالم) استعمال ہوا ہے۔ ان تمام امور کا نتیجہ شرک ہے اور توحید کی نفی ہے۔

۱۱۵۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۵۔ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ جدھر بھی رُخ کرو خدا موجود ہے اور خدا بے نیاز و دانا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے سلسلے میں مختلف روایات منقول ہیں۔

۔ ابن عباس کہتے ہیں :

اس آیت کا تعلق قبلہ کی تبدیلی سے ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ جب بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ مقرر ہوا تو یہودیوں نے بُرا منایا اور مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ کیا قبلہ بھی بدلا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں انہیں جواب دیا گیا کہ دنیا کے مشرق و مغرب کا مالک خدا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت مستحب نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی جب انسان کسی سواری پر سوار ہو تو سواری کا رُخ کچھ بھی ہو (چاہے پشت بہ قبلہ ہو) مستحب نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

کچھ اور حضرات نے جابر سے نقل کیا ہے :

پیغمبر اکرمؐ نے کچھ مسلمانوں کو ایک جنگ پر بھیجا۔ رات کے وقت جب تاریکی چھا گئی تو وہ سمت قبلہ نہ پہچان سکے اور سب نے مختلف سمتوں کی طرف نماز پڑھ لی۔ طلوعِ آفتاب پر انہیں معلوم ہوا کہ سب نے سمت قبلہ کے بغیر نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام سے سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ ایسی صورت میں ان کی نماز صحیح ہے (البتہ اس حکم کی کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مندرج ہیں)۔

کوئی مانع نہیں کہ جتنی شان ہائے نزول اوپر ذکر ہوئی ہیں وہ سب اس آیت کے لئے صحیح ہوں اور یہ آیت قبلہ کی تبدیلی، سواری پر نماز نافلہ کی ادائیگی اور جب قبلہ کی پہچان نہ ہو رہی ہو تو نماز واجب کی ادائیگی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ علاوہ ازیں کوئی آیت شانِ نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم کو حکم کلی کی صورت میں لیا جانا چاہیئے اور بسا اوقات اس سے مختلف قسم کے احکام حاصل ہو سکتے ہیں۔

تفسیر

جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے

گذشتہ آیت میں ان ظالمین سے متعلق گفتگو تھی جو مساجد الٰہی کی آبادی سے روکتے تھے اور انہیں ویران کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ زیر نظر آیت اس بحث کا تتمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مشرق و مغرب خدا کے ہیں اور جس طرف رخ کرو خدا موجود ہے (وللّٰہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ)

ایسا نہیں کہ اگر تمہیں مساجد اور مراکز توحید میں جانے سے روک دیا جائے تو خدا کی بندگی کی راہ بند ہو جائے گی۔ اس جہان کے مشرق و مغرب اس کی ذات پاک سے تعلق رکھتے ہیں اور جس طرف رُخ کرو وہ موجود ہے۔ اسی طرح قبلہ کی تبدیلی جو بعض خاص وجوہ کے پیش نظر انجام پائی ہے اس سلسلے میں کوئی اثر نہیں رکھتی۔ کیا کوئی جگہ ہے جو خدا سے خالی ہو اصولاً تو خدا بے مدیل و بے نیاز اور عالم و دانا ہے (ان اللّٰہ واسع علیم)۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں مشرق و مغرب سے مراد دو مخصوص سمتیں نہیں بلکہ یہ تمام اطراف کے لئے کنایہ ہے جیسے ہم کہا کرتے ہیں کہ دشمنوں نے عداوت سے اور دوستوں نے خوف سے حضرت علیؑ کے فضائل چھپائے لیکن اس کے باوجود مشرق و مغرب آپ کے فضائل سے بھرے پڑے ہیں (یعنی تمام اطراف اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں) اور شاید خصوصیت سے مشرق و مغرب کا ذکر اس لحاظ سے ہے کہ انسان سب سے پہلے انہی سمتوں کو پہچانتا ہے اور باقی جہات ان کے ذریعے پہچانی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا

جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا ہم نے انہیں زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا۔ (اعراف - ۱۳۷)

چند اہم نکات

(۱) فلسفہ قبلہ: یہاں سب سے پہلے جو سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جدھر رُخ کریں اگر اُدھر خدا ہے تو پھر قبلہ کے تعین کی کیا ضرورت ہے۔

اس ضمن میں بعد میں بھی گفتگو ہوگی کہ قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ خدا کی ذات پاک کو کسی معین سمت میں محدود سمجھا جائے بلکہ انسان چونکہ مادی وجود ہے اور مجبور ہے کہ کسی ایک ہی طرف نماز پڑھے لہٰذا حکم دیا گیا کہ سب کے سب (استثنائی مقامات کے علاوہ) ایک ہی طرف نماز پڑھیں تاکہ لوگوں کی صفوں میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے اور انتشار و پراگندگی کی روک تھام ہو سکے۔ ضمناً یہ بات بھی ہے کہ قبلہ کے لیے جو سمت معین ہوئی ہے (یعنی کعبہ) وہ ایک مقدس نقطہ ہے اور قدیم ترین مراکز توحید میں سے ہے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے افکار توحید بیدار ہوتے ہیں۔

(ii) **وجہ اللہ**: اس سے مراد خدا کا چہرہ نہیں بلکہ لفظ "وجہ" یہاں ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(iii) مختلف روایات میں اس آیت سے اُن لوگوں کی نماز صحیح ہونے کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے۔ جنہوں نے اشتباہ یا تحقیق نہ ہو سکنے کی وجہ سے خلافِ قبلہ نماز پڑھی ہو مزید برآں اس سے سواری پر نماز پڑھنے کے جواز کے لئے بھی استدلال کیا گیا ہے (مزید توضیح اور تفصیل کے لئے وسائل الشیعہ، کتاب الصلوٰۃ، ابواب قبلہ کی طرف رجوع کریں)۔

۱۱۶۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○

۱۱۷۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

ترجمہ

۱۱۶۔ (یہود، نصاریٰ اور مشرکین) کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے، وہ تو پاک و منزہ ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اس کے سامنے سرنگوں ہے (سب اس کے بندے ہیں اور کوئی بھی اس کا فرزند نہیں)۔

۱۱۷۔ آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا وہی ہے اور جب کسی چیز کو وجود عطا کرنے کا فرمان جاری کرتا ہے تو اس کیلئے کہتا ہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

تفسیر

یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کی خرافات

یہودی، عیسائی اور مشرک سب یہ بیہودہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا کوئی بیٹا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۳۰ میں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝

یہودی کہتے ہیں عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں جو گذشتہ کافروں کی گفتگو جیسی ہے۔ خدا انہیں قتل کرے، کیسے جھوٹ بولتے ہیں۔

سورۂ یونس آیہ ۶۸ میں بھی مشرکین کے بارے میں ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ

وہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے وہ تو پاک و منزہ ہے۔

اسی طرح قرآن کی دیگر بہت سی آیات میں بھی اس ناروا نسبت کا ذکر موجود ہے۔

زیر نظر پہلی آیت اس بے ہودگی کے خلاف کہتی ہے: وہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا ہے، وہ تو ان ناروا نسبتوں سے پاک و منزہ ہے (وقالوا اتخذ اللّٰہ ولدا سبحٰنہ)۔ خدا کو کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے لئے بیٹے کا انتخاب کرے۔ کیا وہ محتاج ہے، محدود ہے، اسے مدد کی ضرورت ہے یا اسے بقائے نسل کی احتیاج ہے جب کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کے لئے ہے (بل لہ ما فی السمٰوٰت والارض) اور سب کے سب اس کے سامنے سرنگوں ہیں (کل لہ قٰنتون)۔

وہ نہ صرف عالم ہستی کی موجودات کا مالک ہے بلکہ تمام انسانوں اور زمین کا موجد و خالق بھی وہی ہے (بدیع السمٰوٰت والارض)۔ حتیٰ کہ پہلے کی کسی منصوبے کے بغیر اور کسی مادہ کی احتیاج کے بغیر ہی اس نے ان سب کو تخلیق کیا ہے۔

اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے حالانکہ جب کسی چیز کے وجود کا حکم صادر فرماتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے (واذا قضٰی امرًا فانما یقول لہ کن فیکون)۔

چند اہم نکات

(۱) عدم فرزند کے دلائل: خدا کا بیٹا ہونا بے شک ان لوگوں کے کمزور افکار کی پیداوار ہے جو تمام امور میں خدا کو اپنے محدود وجود پر قیاس کرتے ہیں۔

مختلف دلائل کی بناء پر انسان بیٹے کا محتاج ہے۔ ایک طرف تو اس کی عمر محدود ہے اور بقائے نسل کے لئے بیٹا ضروری ہے۔ دوسری طرف اس کی قدرت محدود ہے۔ خصوصاً بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں اسے معاون و مددگار کی ضرورت ہے جو بیٹے کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے۔ تیسرا یہ کہ انسانی نفسیات میں محبت و انس کی خواہش کے پیش نظر ضروری ہے کہ کوئی اس کا

مونس و مددگار ہو۔ یہ مقصد بھی اولاد کے ذریعے پورا ہو جاتا ہے۔ واضح ہے کہ خدا کے ہاں ان میں سے کوئی بھی بات کچھ مفہوم نہیں رکھتی کیونکہ وہ تو عالم ہستی کو پیدا کرنے والا، تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا اور ازلی و ابدی ہے۔ علاوہ ازیں جسم صاحب اولاد ہونے کا لازمہ ہے اور خدا اس سے بھی منزہ ہے۔[1]

(۱۱) "کن فیکون" کی تفسیر: یہ تعبیر قرآن کی بہت سی آیات میں آئی ہے۔ ان میں سورہ آل عمران ۴۷ اور ۵۹، سورہ انعام آیہ ۷۳، سورہ نحل آیہ ۴۰، سورہ مریم آیہ ۳۵ اور سورہ یٰسین آیہ ۸۲ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ جملہ خدا کے ارادہ تکوینی اور امر خلقت میں اس کی حاکمیت کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "کن فیکون" (ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتا ہے) سے مراد یہ نہیں کہ خدا کوئی لفظی فرمان "ہو جا" کی صورت میں صادر فرماتا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کو وجود عطا فرمانے کا ارادہ کرتا ہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی، پیچیدہ ہو یا سادہ، ایک ایٹم (ATOM) کے برابر ہو یا تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہو کسی علت کی احتیاج کے بغیر وہ ارادہ خود بخود عمل جامہ پہن لیتا ہے۔ اس ارادہ اور موجود کی پیدائش کے درمیان لحظے کا فاصلہ بھی نہیں ہوتا۔

اصولی طور پر کوئی زمانہ اس کے درمیان نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے حرف فا (فیکون میں) جو عموماً تاخیر زمانی کے لئے آتا ہے البتہ ایسی تاخیر جو اتصال کی توام ہو، جہاں صرف تاخیر رتبہ کے لحاظ سے ہے (جیسا کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ معلول اپنی علت سے رتبے کے لحاظ سے تو متاخر ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے نہیں)۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ارادہ الہی آنی الوجود ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جیسا وہ ارادہ کرے موجود اسی طرح وجود پاتا ہے۔[2]

مثلاً۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ آسمان اور زمین چھ ادوار میں معرض وجود میں آئیں تو یقیناً بغیر کسی کمی بیشی کے وہ اسی مدت میں وجود پذیر ہوں گے اور اگر ارادہ کرے کہ ایک لحظے میں موجود ہوں تو سب کے سب ایک لحظے میں وجود پا جائیں گے یہ وہ جانتا ہے کہ کیسا ارادہ کرے اور کیا مصلحت ہے۔

یا مثلاً۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ بچہ شکم مادر کی جنین میں نو ماہ اور نو دن میں اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے تو لحظہ بھر کی کمی بیشی کے بغیر یونہی انجام پذیر ہوگا اور اگر ارادہ کرے کہ تکامل کا یہ دور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے بھی کم مقدار میں پورا کرے تو یقیناً ایسا ہی ہوگا کیونکہ خلقت کے لئے اس کا ارادہ علت تامہ ہے اور علت تامہ و معلول کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ نہیں ہو سکتا۔

(۱۱۱) کوئی چیز کیسے عدم سے وجود میں آتی ہے: لفظ "بدیع" کا مادہ ہے "بدع" جس کا معنی ہے بغیر کسی سابقہ کے کسی چیز کا وجود میں آنا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کو خدا نے بغیر کسی مادے اور بغیر کسی

---

[1] سورہ انبیاء آیہ ۲۶، تفسیر نمونہ میں اس ضمن میں مزید بحث کی گئی ہے۔

[2] یعنی ارادہ الہی سے کوئی چیز آناً فاناً وجود میں آجاتی ہے۔ (مترجم)

پہلے نمونے کے وجود بخشا ہے۔

اب یہ سوال ہوگا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے جب کہ عدم وجود کی ضد ہے۔ لہذا یہ کیسے علت اور منشاء وجود ہو سکتا ہے۔ کیا واقعاً یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ نیستی سبب ہستی ہو۔ مسئلہ ابداع پر مادیین کا یہ پرانا اعتراض ہے۔

اس کا جواب پیش خدمت ہے:

پہلے مرحلے میں تو یہ اعتراض خود مادہ پرستوں پر بھی وارد ہوتا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ جہان قدیم اور ازلی ہے اور کوئی چیز بھی آج تک اس میں سے کم نہیں ہوئی اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں کئی تغیرات آئے ہیں جن سے مادے کی یہ صورت بدلی ہے جو ہمیشہ بدلتی رہتی۔ گویا صورت بدلتی ہے نہ کہ مادہ۔

اب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ مادے کی جو موجودہ صورت ہے یقیناً وہ پہلے تو نہ تھی۔ اب یہ صورت کیسے وجود میں آئی کیا عدم سے وجود میں آئی۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر عدم کیسے وجود صورت کا منشاء ہو سکتا ہے۔

مثلاً ایک نقاش قلم اور سیاہی سے کاغذ پر ایک بہترین منظر بناتا ہے۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ اس کا جوہر اور سیاہی تو پہلے سے موجود تھی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ منظر (صورت) جو پہلے موجود نہ تھا کس طرح وجود میں آیا۔ جو جواب وہ "صورت" کے عدم سے پیدا ہو جانے کے متعلق دیں گے وہی جواب ہم مادہ کے سلسلے میں دیں گے۔

دوسرے مرحلے میں قابل توجہ امر یہ ہے کہ لفظ "سے" کی وجہ سے اشتباہ ہوا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عالم نیستی سے ہستی میں آیا ہے کا مطلب ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میز لکڑی سے بنائی گئی ہے جس میں میز بنانے کے لئے لکڑی کا پہلے ہونا ضروری ہے تاکہ میز بن سکے جب کہ عالم نیستی سے ہستی میں آیا ہے کا معنیٰ یوں نہیں بلکہ اس کا معنیٰ ہے کہ عالم پہلے موجود نہ تھا بعد میں وجود پذیر ہوا۔

• فلسفے کی زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہر موجود ممکن (جو اپنی ذات سے وجود نہ رکھتا ہو) کو اپنی تشکیل کے لئے دو پہلو درکار ہیں "ماہیت" اور "وجود"۔

"ماہیت" ایک اعتباری معنیٰ ہے کہ جس کی نسبت وجود و عدم کے ساتھ مساوی ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ قدر مشترک جو کسی چیز کے وجود اور عدم کو دیکھنے سے دستیاب ہو اس کا نام ماہیت ہے۔ مثلاً یہ درخت پہلے نہیں تھا۔ اب وجود رکھتا ہے۔ جو چیز وجود و عدم سے ثابت ہو وہ ماہیت ہے لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ خدا عالم کو عدم سے وجود میں لایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عالم حالت عدم کے بعد حالت وجود میں آگیا ہے دوسرے لفظوں میں ماہیت کو حالت عدم سے حالت وجود میں لایا گیا ہے[1]

۱۱۸۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ

---

[1] مزید وضاحت کے لئے کتاب "آفریدگار جہان" کی طرف رجوع کریں۔

قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ○

۱۱۹۔ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ○

ترجمہ

۱۱۸۔ بے علم افراد کہتے ہیں خدا ہم سے بات کیوں نہیں کرتا اور کوئی آیت ونشانی خود ہم پر کیوں نہیں نازل کرتا۔ ان سے پہلے بھی لوگ ایسی باتیں کرتے تھے۔ ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ لیکن ہم (کافی تعداد میں اپنی) آیات اور نشانیاں (حقیقت کے متلاشی) اہل یقین کے لئے روشن اور واضح کرچکے ہیں۔

۱۱۹۔ ہم نے تجھے حق کے ساتھ (اہل دنیا کو اچھائیوں اور برائیوں کے مقابلے میں) بشارت اور تہدید کے لئے بھیجا اور (اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد) تو اہل جہنم کی گمراہی پر جواب دہ نہیں ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات کی ابتداء میں یہودیوں کی بہانہ سازیوں کی مناسبت سے ایک اور گروہ کی بہانہ سازیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ظاہراً یہ مشرکین عرب ہی کے بارے میں ہے۔

فرمایا: بے علم لوگ کہتے ہیں خدا ہمارے ساتھ باتیں کیوں نہیں کرتا اور کیوں آیت اور نشانی خود ہم پر نازل نہیں ہوتی (وقال الذین لا یعلمون لولا یکلمنا اللہ او تاتینا ایۃ ط)۔

دراصل یہ لوگ جنہیں قرآن "الذین لا یعلمون" کے عنوان سے یاد کررہا ہے دو غیر منطقی خواہشیں رکھتے تھے:

۱۔ خدا ہم سے براہ راست بات کیوں نہیں کرتا۔

۲۔ کیوں آیت اور نشانی خود ہم پر نازل نہیں ہوتی۔

غرور، ہٹ دھرمی اور خود پسندی پر مبنی ان باتوں کے جواب میں قرآن کہتا ہے، ان سے پہلے بھی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے تھے، ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن جو حقیقت کے متلاشی اور اہل یقین ہیں۔ ان کے لئے ہم نے (کافی مقدار میں) آیات اور نشانیاں واضح کی ہیں (کذلک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم قد بینا الآیات لقوم یوقنون)۔

اگر واقعاً ان کا مقصد حقیقت وواقعیت کو سمجھنا ہے تو یہی آیات جو پیغمبر اکرمؐ پر ہم نے نازل کی ہیں روشن نشانی ہیں آپ کے صدق کلام کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک شخص پر براہ راست اور مستقلاً آیات نازل ہوں اور اس کا کیا مطلب ہے کہ خدا بلا واسطہ مجھ سے باتیں کرے۔

ایسی ہی گفتگو سورہ مدثر آیہ ۵۲ میں بھی ہے:

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۙ

ان میں سے ہر ایک یہ آرزو لئے بیٹھا ہے کہ چند اوراق آیات اس پر نازل ہوں۔

کیسی نامناسب خواہش ہے؟

اس کے علاوہ کہ اس کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان آیات کے ذریعے جو آپ پر نازل ہوئیں پیغمبر اکرمؐ کی صداقت کا اثبات سب لوگوں پر ممکن تھا، یہ خود پسند مشرک ایک بنیادی نکتے سے بے خبر تھے اور وہ یہ کہ ہر شخص پر آیات و معجزات نازل نہیں ہو سکتے اس کے لئے خاص قسم کی شائستگی، آمادگی اور روح کی پاکیزگی ضروری ہے۔

یہ بالکل ایسے ہے کہ شہر میں بچھے ہوئے سب بجلی کے تار قوی ہوں یا بہت ہی کمزور، یہ آرزو کریں کہ وہی بجلی جو بہت زیادہ طاقت ور ہے اور جو سب سے پہلے مضبوط تاروں میں منتقل ہوئی ان کی طرف منتقل ہو جائے۔ یقیناً یہ توقع انتہائی غلط اور ناروا ہو گی۔ وہ انجینیر جس نے ان تاروں کو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے تیار کیا ہے ان کی صلاحیت (CAPACITY) معین کی ہے ان میں سے بعض بجلی بننے والے مقام سے بلاواسطہ منسلک ہیں اور بعض بالواسطہ۔

بعد کی آیت کا رخ سخن پیغمبرؐ کی طرف ہے جو بتاتی ہے کہ خواہ مخواہ کی معجزہ طلبیوں اور دیگر بہانہ سازیوں کے سلسلے میں آپ کی ذمہ داری کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے تجھے حق کے ساتھ (دنیا کے لوگوں کو) بشارت دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجا ہے (انا ارسلناك بالحق بشيرا و نذيرا)۔ تمہاری ذمہ داری ہے ہمارے احکام تمام لوگوں کے سامنے بیان کرنا ان کے سامنے معجزات پیش کرنا اور عقل و منطق سے حقائق واضح کرنا۔ اس دعوت کے ذریعے نیک لوگوں کو شوق و رغبت دلاؤ اور بدکاروں کو ڈراؤ تمہارے ذمے فقط یہی ہے۔

یہ پیغام پہنچائے جانے کے بعد اگر اب ان میں سے کوئی گروہ ایمان نہ لائے تو تم اہل جہنم کی گمراہی کے ذمے دار نہیں ہو (ولا تسئل عن اصحاب الجحيم)۔

چند اہم نکات

(۱) ان کے دل ایک جیسے ہیں: مندرجہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے کہ بہانہ سازیاں اور حیلہ گریاں کوئی نئی نہیں ہیں بلکہ پہلی کمزور قومیں بھی یہی کچھ کرتی رہی ہیں گویا ان کے دل بھی اُن کے دلوں جیسے ہیں۔ یہ تعبیر اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زمانہ گذرنے کا اور انبیاء کی تعلیمات کا یہ اثر تو ہونا چاہیئے کہ آنے والی نسلیں آگاہی اور علم کی زیادہ حصہ دار ہوں اور بہانہ سازیاں اور بے بنیاد باتیں جو انتہائی جہالت و نادانی کی نشانی ہیں انہیں کنارے لگا دیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس تکاملی پروگرام سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا اور اسی طرح کی ڈفلی بجا رہے ہیں۔ گویا ان سے اُن کا ہزاروں سالہ تعلق ہے اور زمانہ بیت جانے سے ان کے افکار و نظریات میں ذرا سی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

(۱) خوشخبری دینا اور ڈرانا۔ دو اہم تربیتی اصول: خوشخبری دینا اور ڈرانا دوسرے لفظوں میں تشویق و تہدید تمام تربیتی اور معاشرتی پروگراموں کی بنیاد ہیں۔ اچھے کام کی انجام دہی پر جزا کی رغبت اور بُرے کام کی انجام دہی پر سزا کا خوف ضروری ہے تاکہ راہِ خیر پر چلنے کا زیادہ سے زیادہ ولولہ و جذبہ پیدا ہو اور قدم بُرے راستے پر اٹھنے سے باز رہ سکیں۔

صرف شوق دلانا فرد یا معاشرے کے تکامل کے لئے کافی نہیں کیونکہ انسان اگر صرف بشارتوں کا اُمیدوار ہو اور ان پر مطمئن ہو جائے تو ممکن ہے کہ جرائم کی طرف ہاتھ بڑھائے چونکہ اسے اطمینان ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل عیسائی فدا کا عقیدہ رکھتے ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ ان کے گناہوں کا فدیہ ہو گئے ہیں۔ ان کے رہبر کبھی انہیں جنت کی سند بیچتے ہیں اور کبھی خدا کی طرف سے ان کے گناہ بخش دیتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگ آسانی سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

قاموس کتاب مقدس میں ہے:

فدا نیز اشارہ ہے مسیح کے گران بہا خون کے کفارہ کی طرف جب کہ ہم سب کے گناہ ان پر رکھ دیئے گئے اور ہمارے گناہوں کے ضمن میں انہوں نے اپنے آپ کو صلیب کے لئے پیش کر دیا۔

یہ منطق اس تحریف شدہ مذہب کے پیروکاروں کے لئے گناہوں میں جسارت و جرأت کا سبب بنتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو سمجھتے ہیں کہ تشویق ہی انسان کے لئے (چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا) کافی ہے اور تنبیہ و تہدید اور سزا و عذاب کا ذکر بالکل ایک طرف رکھ دینا چاہیئے وہ بڑے اشتباہ کا شکار ہیں جیسا کہ وہ لوگ جو تربیت کی بنیاد صرف خوف و تہدید پر رکھتے ہیں اور تشویق کے پہلوؤں سے غافل ہیں وہ بھی گمراہ اور بے خبر ہیں۔

یہ دونوں گروہ انسان کو پہچاننے میں اشتباہ اور غلطی کر گئے ہیں وہ متوجہ نہیں کہ انسان خوف اور اُمید، ذات کی محبت، زندگی سے عشق اور فنا و نابودی سے نفرت کا مجموعہ ہے۔ وہ کشش منفعت اور دفع ضرر کا مرکب ہے۔ وہ انسان جو ان دونوں پہلوؤں کا حامل ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کی تربیت کی بنیاد صرف ایک پہلو پر رکھی جائے۔

ان دونوں میں ایک توازن ضروری ہے۔ اگر تشویق و امید حد سے بڑھ جائے۔ تو جرأت و غفلت کا باعث ہے اور اگر خوف و اندیشہ حد سے گذر جائے تو اس کا نتیجہ یاس و نا امیدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآن میں نذیر و بشیر یا انذار و بشارت کا ایک ساتھ ذکر ہے بلکہ یہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کبھی بشارت کو انذار پر مقدم رکھا گیا ہے اور کبھی انذار کو بشارت پر۔ زیر بحث آیت میں "بشیراً و نذیراً" ہے اور سورہ اعراف آیہ ۱۸۸ میں ہے:

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝

میں ایمان لانے والے کے لئے نذیر اور بشیر ہوں۔

البتہ اکثر آیات قرآن میں بشیر، بشارت یا مبشر کو مقدم رکھا گیا ہے اور کم آیات میں نذیر مقدم ہے۔ ممکن ہے یہ اس لئے ہو کہ مجموعی طور پر رحمتِ خدا اس کے عذاب پر سبقت رکھتی ہے:

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۱۲۰۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ

۱۲۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ

ترجمہ

۱۲۰۔ یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ (ان کی غلط خواہشات کے سامنے طرح تسلیم خم نہ کریں اور) ان کے (تحریف شدہ) مذہب کی پیروی نہ کریں۔ کہیے ہدایت کامل صرف خدا کی ہدایت ہے۔ اگر آگاہی کے بعد بھی ان کی ہوا و ہوس کی پیروی کی تو خدا کی طرف سے تمہارے لیے کوئی سرپرست و مددگار نہ ہوگا۔

۱۲۱۔ وہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور وہ اسے غور سے پڑھتے ہیں، پیغمبر اسلام پر ایمان لے آئیں گے اور جو ان سے کفر اختیار کریں گے وہ خسارے میں ہیں۔

شان نزول

پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے:

مدینہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کا خیال تھا کہ قبلہ کے بارے میں پیغمبر اسلام ہمیشہ ان سے موافقت رکھیں گے جب خدا نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا۔ تو وہ پیغمبر اکرم سے مایوس ہو گئے (اس دوران شاید مسلمانوں میں سے بعض لوگ بھی معترض تھے کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو یہود و نصاریٰ کی رنجش کا باعث ہو)۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ قبلہ کی ہم آہنگی کا معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ گروہ تم

ملہ تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخر رازی (کچھ فرق کے ساتھ)

سے کبھی راضی نہیں ہوگا جب تک تم ان کے مذہب کو پورے طور پر تسلیم نہ کر لو۔

بعض دوسرے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ چاہتے تھے کہ ان دونوں گروہوں کو راضی کیا جائے شاید یہ اسلام قبول کر لیں اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کیونکہ وہ کسی قیمت پر آپ سے راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کی پیروی نہ کرنے لگیں۔[1]

دوسری آیت کی شانِ نزول میں مختلف روایات ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت ان افراد کے بارے میں ہے جو جناب جعفر ابن ابی طالب کے ساتھ حبشہ سے آئے تھے اور وہ لوگ وہاں جا کر جناب جعفرؓ سے مل گئے تھے۔ ان کی تعداد چالیس تھی۔ بتیس افراد حبشہ سے تھے اور آٹھ افراد شام کے راہب تھے جن میں مشہور راہب بحیرا بھی شامل تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں میں سے چند افراد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام، سعید بن عمرو اور تمام بن یہودا وغیرہ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔[2]

تفسیر

وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے

گذشتہ آیت میں پیغمبر اسلام کی رسالت کا ذکر ہے جس میں بشارت اور تنبیہ شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہٹ دھرم گمراہوں کے بارے میں آپ سے کوئی جواب طلبی نہ ہوگی۔ مندرجہ بالا آیات میں یہی بحث جاری ہے۔ پیغمبر اسلام سے فرمایا گیا ہے کہ آپ یہودیوں اور عیسائیوں کی رضامندی حاصل کرنے پر زیادہ اصرار نہ کریں کیونکہ وہ ہرگز آپ سے راضی نہ ہوں گے مگر یہ کہ اُن کی خواہشات کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مذہب کی پیروی کی جائے (ولن ترضیٰ عنك الیهود ولا النصٰرٰی حتی تتبع ملتهم)۔ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان سے کہیے کہ ہدایت صرف ہدایت الٰہی ہے (قل ان هدی الله هو الهدیٰ)۔ وہ ہدایت جس میں خرافات اور پست و نادان افراد کے افکار کی آمیزش نہ ہو یقیناً ایسی ہی خالص ہدایت کی پیروی کرنا چاہیے۔

مزید فرمایا: اگر آپ ان کے تعصبات، ہوا و ہوس اور تنگ نظریوں کو مان لیں جب کہ وحی الٰہی کے سائے میں آپ پر حقائق روشن ہو چکے ہیں تو خدا کی طرف سے آپ کا کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہ ہوگا (ولئن اتبعت اهوائهم بعد الذی جاءك من العلم ما لك من الله من ولی ولا نصیر)۔

ادھر جب یہود و نصاریٰ میں سے کچھ لوگوں نے جو حق کے متلاشی تھے پیغمبر اسلام کی دعوت پر لبیک کہی اور اس

---

[1] تفسیر ابوالفتوح اور مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آئین و دین کو قبول کر لیا تو سابق گروہ کی مذمت کے بعد قرآن انہیں اچھائی اور نیکی کے حوالے سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اور انہوں نے اسے غور سے پڑھا ہے اور اس کی تلاوت کا حق ادا کیا ہے (یعنی فکر و نظر کے بعد اس پر عمل کیا ہے) وہ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لے آئیں گے (الذین اٰتینٰھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ اولٰئک یؤمنون بہ)۔ اور جو ان کے کافر و منکر ہو گئے ہیں انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں (ومن یکفر بہ فاولٰئک ھم الخاسرون)۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی آسمانی کتاب کی تلاوت کا واقعاً حق ادا کیا ہے اور وہی ان کی ہدایت کا سبب ہے کیونکہ پیغمبر موعود کے ظہور کی جو بشارتیں انہوں نے ان کتب میں پڑھی تھیں وہ پیغمبر اسلام پر منطبق دیکھیں اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا اور خدا نے بھی ان کی قدردانی کی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) لئن اتبعت اھواءھم: اس جملے سے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مقام عصمت پر فائز ہونے کے باوجود کیا ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیات میں ایسی تعبیریں بار بار نظر آتی ہیں اور یہ کسی طرح سے بھی انبیاء کے مقام عصمت کی نفی نہیں کرتیں کیونکہ ایک طرف تو ان میں جملہ شرطیہ ہے اور جملہ شرطیہ شرط کے وقوع کی دلیل نہیں دوسری طرف عصمت انبیاء کو گناہ سے جبراً تو نہیں روکتی بلکہ پیغمبر و امام گناہ پر قدرت رکھتے ہیں اور ارادہ و اختیار کے حامل ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کے دامن گناہ سے کبھی آلودہ نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہے کہ اگرچہ خطاب پیغمبرؐ کو ہے لیکن ہو سکتا ہے مراد سب لوگ ہوں۔

(۲) دشمن کی رضا کا حصول: انسان کو چاہیئے کہ وہ پرکشش اخلاق سے دشمنوں کو بھی حق کی دعوت دے لیکن یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن میں کچھ لچک اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کبھی حرف حق قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ایسے لوگوں کی رضا حاصل کرنے کی فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کہا جائے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو جہنم میں جائیں اور ان پر فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

(۳) ہدایت صرف ہدایت الٰہی ہے: مندرجہ بالا آیات سے ضمنی طور پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ قانون جو انسان کی سعادت کا سبب بن سکتا ہے فقط قانون و ہدایت الٰہی ہے (ان ھدی اللّٰہ ھو الھدیٰ) کیونکہ انسان کا علم جتنا بھی ترقی کرے پھر بھی وہ کئی پہلوؤں سے جہالت، شک اور ناپختگی کا حامل ہو گا۔

ایسے ناقص علم کی بنیاد پر جو ہدایت ہوگی وہ کامل نہ ہو سکے گی۔ ہدایت مطلقہ تو اسی کی طرف سے ممکن ہے جو علم مطلق کا حامل ہو اور جہالت و ناپختگی سے ماوراء ہو اور وہ صرف خدا ہے۔

(۱۷) حق تلاوت کیا ہے؟ : یہ بہت ہی پر معنی تعبیر ہے جو مندرجہ بالا آیات میں آئی ہے۔ یہ جملہ قرآن مجید اور دیگر کتب آسمانی کے سلسلے میں واضح راستہ متعین کرتی ہے۔ ان آیات الٰہی کے مفہوم کے ضمن میں مختلف گروہ ہیں۔ ایک گروہ کو پورا اصرار ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ الفاظ و حروف کو صحیح مخارج سے ادا کیا جائے یہ گروہ مضمون اور معانی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا چہ جائیکہ اس پر عمل کی طرف توجہ دے۔ قرآن کے مطابق ایسے لوگوں کی مثال اس جانور کی سی ہے جس پر کتابیں لاد دی جائیں۔

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ - ۵)

دوسرا گروہ وہ ہے جو الفاظ کی سطح سے کچھ اوپر گیا ہے۔ وہ معانی پر بھی غور کرتا ہے، قرآن کی باریکیوں اور نکات میں فکر کرتا ہے اور اس کے علوم سے آگاہی حاصل کرتا ہے لیکن عمل کے معاملے میں صفر ہے۔

ایک تیسرا گروہ ہے جو حقیقی مومنین پر مشتمل ہے۔ یہ گروہ قرآن کو کتاب عمل اور زندگی کے مکمل پروگرام کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ اس کے الفاظ پڑھنے، اس کے معانی پر فکر کرنے اور اس کے مفاہیم سمجھنے کو عمل کرنے کا مقدمہ اور تمہید سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے لوگ قرآن پڑھتے ہیں تو ان کے بدن میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں نیا عزم، نیا ارادہ، نئی آمادگی اور نئے اعمال پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہے حق تلاوت۔

امام صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک عمدہ حدیث منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

يرتلون اٰياته ويتفقهون به ويعملون باحكامه ويرجون وعده ويخافون وعيده ويعتبرون بقصصه ويأتمرون باوامره وينتهون بنواهيه ما هو والله حفظ اٰياته ودرس حروفه وتلاوت سوره ودرس اعشاره واخماسه — حفظوا حروفه واضاعوا حدوده وانما هو تدبر اٰياته والعمل بارکانه قال الله تعالیٰ کتاب انزلناه اليك مبارك ليدبروا اٰياته۔

مقصود یہ ہے کہ وہ اس کی آیات غور سے پڑھیں۔ اس کے حقائق کو سمجھیں، اس کے احکام پر عمل کریں، اس کے وعدوں کی امید رکھیں اس کی تنبیہوں سے ڈرتے رہیں۔ اس کی داستانوں سے عبرت حاصل کریں، اس کے اوامر کی اطاعت کریں، اس کے نواہی سے بچے رہیں — خدا کی قسم مقصد آیات حفظ کرنا، حروف پڑھنا، سورتوں کی تلاوت کرنا اور اس کے دسویں اور پانچویں حصوں کو یاد کرنا نہیں ہے ان لوگوں نے حروف قرآن تو یاد رکھے مگر اس کی حدود کو پامال کر دیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں غور و فکر کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے : یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں۔

۱۲۲۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○

۱۲۳- وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ
لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۲- اے بنی اسرائیل میں نے تمہیں جو نعمت دی ہے اسے یاد کرو اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی (لیکن تم نے اس مقام سے استفادہ نہیں کیا اور گمراہ ہو گئے)۔

۱۲۳- اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی جگہ پر بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ اس سے کوئی عوض قبول نہ کیا جائے گا، کوئی شفاعت و سفارش اس کے لئے فائدہ مند نہ ہوگی اور نہ ہی (کسی طرف سے) ایسے لوگوں کی مدد کی جائے گی۔

تفسیر

قرآن کا روئے سخن پھر بنی اسرائیل کی طرف ہے۔ ان پر جو نعمتیں نازل ہوئیں قرآن ان کا ذکر کرتا ہے خصوصاً وہ فضیلت جو خدا نے ان کے زمانے کے لوگوں پر انہیں عطا کی تھی وہ یاد دلائی گئی ہے۔

فرماتا ہے: اے بنی اسرائیل! ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کیں اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر (اس زمانے میں موجود سب لوگوں پر) فضیلت بخشی (یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العٰلمین)۔

لیکن کوئی نعمت جواب دہی اور ذمہ داری کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ ہر نعمت عطا کرنے کے بعد خدا کسی ذمہ داری اور کسی عہد و پیمان کا بوجھ انسان کے کندھے پر رکھتا ہے لہٰذا بعد کی آیت میں تنبیہ کرتا ہے اور کہتا ہے: اس دن سے ڈرو جب کسی شخص کو دوسرے کی بجائے جزا کا سامنا نہ ہوگا (واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا) اور کوئی چیز تاوان و فدیہ کے طور پر قبول نہ کی جائے گی (ولا یقبل منها عدل) اور (اذن خدا کے بغیر) کوئی سفارش سود مند نہ ہوگی (ولا تنفعها شفاعة) اگر سمجھو کہ خدا کے علاوہ وہاں کوئی انسان کی مدد کر سکتا ہے تو یہ غلط فہمی ہے کیونکہ وہاں کسی شخص کی مدد نہ کی جا سکے گی (ولا هم ینصرون) لہٰذا جنہیں تم نجات کی راہیں سمجھتے ہو وہ سب مسدود ہیں اور شاید دنیا میں تم انہی کا سہارا لیتے ہو۔ صرف اور صرف ایک راستہ کھلا ہے اور وہ ایمان و عمل صالح نیز گناہوں پر توبہ اور اپنی اصلاح کا راستہ ہے۔

چونکہ اس سورہ کی آیہ ۴۷ اور ۴۸ میں بھی بعینہ یہی مسائل بیان ہوئے ہیں (تعبیرات کے کچھ اختلاف کے ساتھ) اور وہاں ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں لہٰذا یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۲۴۔ وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ○

ترجمہ

۱۲۴۔ (وہ وقت یاد کرو) جب خدا نے ابراہیمؑ کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان سے عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے تو خدا نے ان سے کہا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام و رہبر قرار دیا۔ ابراہیمؑ نے کہا: میری نسل اور خاندان میں سے (بھی ائمہ قرار دے)۔ خدا نے فرمایا: میرا عہد (مقام امامت) ظالموں کو نہیں پہنچتا (اور تمہاری اولاد میں سے جو پاک اور معصوم ہیں وہی اس مقام کے لائق ہیں)۔

تفسیر

اس آیت سے لے کر آگے تک (بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی کا موضوع شروع ہونے تک) اٹھارہ آیات ہیں جن میں خدا کے پیغمبر عظیم اور علمبردار توحید حضرت ابراہیمؑ، خانہ کعبہ کی تعمیر اور توحید و عبادت کے اس مرکز کا تذکرہ ہے۔

دراصل ان آیات کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ یہ آیات قبلہ کی تبدیلی کے موضوع کے لئے مقدمہ کا کام دیں۔ مسلمان جان لیں کہ یہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر بت شکن کی یادگار ہے۔ اگر مشرکوں اور بت پرستوں نے اسے آج بت خانے میں تبدیل کر رکھا ہے تو یہ ایک سطحی آلودگی ہے اس سے کعبہ کے مقام و منزلت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

۲۔ یہودی اور عیسائی یہ دعوے کرتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور ان کے دین کے وارث ہیں۔ یہ آیات (دیگر بہت سی آیات سے مل کر جو یہودیوں کے بارے میں گذر چکی ہیں) واضح کر دیتی ہیں کہ وہ لوگ ابراہیمی آئین سے بیگانہ ہیں۔

۳۔ مشرکین عرب بھی اپنے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان اٹوٹ رشتہ بتاتے تھے انہیں بھی یہ سمجھانا مقصود تھا کہ تمہارے اور اس بت شکن پیغمبر کے پروگرام میں کوئی ربط نہیں۔

زیر بحث آیت میں پہلے فرماتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدا نے ابراہیمؑ کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں اچھی طرح کامیاب ہوئے (واذا ابتلی ابراهیم ربه بکلمات فاتمهن)۔

یہ آیت حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اہم ترین موڑ یعنی ان کی بڑی بڑی آزمائشوں اور ان میں ان کی کامیابی کے متعلق گفتگو کرتی ہیں۔ وہ آزمائشیں جنہوں نے ابراہیمؑ کی عظمت، مقام اور شخصیت کو مکمل طور پر نکھار دیا اور ان کی شخصیت کی بلندی کو روشن کر دیا جب ابراہیمؑ ان امتحانات سے کامیاب ہو گئے تو وہ منزل آئی کہ خدا انہیں انعام دے تو فرمایا: میں نے

تمہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیا (قال انی جاعلک للناس اماماً)۔

ابراہیم نے درخواست کی میری اولاد اور خاندان سے بھی آئمہ قرار دے۔ تاکہ یہ رشتۂ نبوت و امامت منقطع نہ ہو اور صرف ایک شخص کے ساتھ قائم نہ رہے (قال و من ذریتی)۔ خدا نے اس کے جواب میں فرمایا: میرا عہد یعنی مقام امامت ظالموں تک ہرگز نہیں پہنچے گا (قال لاینال عھدی الظٰلمین)۔ یعنی ہم نے تمہاری درخواست قبول کرلی ہے لیکن تمہاری ذریت میں سے صرف وہ لوگ اس مقام کے لائق ہیں جو پاک اور معصوم ہیں۔

چند اہم نکات

اس آیت میں چند ایسے اہم موضوعات ہیں جن کے بارے میں گہری نظر سے تحقیق کی ضرورت ہے:

(ا) "کلمات" سے کیا مراد ہے: آیات قرآن سے اور ابراہیمؑ کے وہ نظر نواز اعمال جن کی خدا نے تعریف کی ہے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلمات (وہ جملے جو خدا نے ابراہیمؑ کو سکھائے) دراصل ذمہ داریوں کا ایک گراں اور مشکل سلسلہ تھا جو خدا نے ابراہیمؑ کے ذمے کیا اور اس مخلص پیغمبر نے انہیں بہترین طریقے سے انجام دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات میں یہ امور شامل تھے:

۱۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جانا جہاں کوئی انسان نہ بستا تھا۔

۲۔ بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانا اور فرمان خدا سے اسے قربان کرنے کے لئے پر عزم آمادگی کا مظاہرہ کرنا۔

۳۔ بابل کے بت پرستوں کے مقابلے میں قیام کرنا، بتوں کو توڑنا اور اس تاریخی مقدمے میں پیش ہونا اور منجنیق آگ میں پھینکا جانا اور ان تمام مراحل میں اطمینان و ایمان کا ثبوت دینا۔

۴۔ بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا اور اپنی زندگی کے سرمائے کو ٹھوکر مارنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا۔

ایسے اور بھی بہت سے امور ہیں۔[1]

یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہت سخت اور مشکل آزمائش تھی لیکن ابراہیمؑ ایمانی قوت کے ذریعے ان تمام میں پورا اترے اور ثابت کیا کہ وہ مقام امامت کی اہلیت رکھتے تھے۔

(ii) امام کسے کہتے ہیں: زیر بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو مقام امامت بخشا گیا وہ مقام نبوت و رسالت سے بالاتر تھا۔ اس کی توضیح کے لئے امامت کے مختلف معانی بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ امامت کا معنٰی ہے صرف دنیاوی امور میں لوگوں کی قیادت و پیشوائی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں)۔

---

[1] تفسیر المنار میں ابن عباس کے حوالے سے منقول ہے کہ انہوں نے قرآن کی چار سورتوں کی مختلف آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے لئے گئے امتحانات کو شمار کیا ہے جو تیس بنتے ہیں۔ (المنار۔ زیر نظر آیت کے ذیل میں)۔

۲۔ امامت کا معنی ہے امور دین و دنیا میں پیشوائی (اہل سنت ہی میں بعض اس کے قائل ہیں)۔

۳۔ امامت کا معنی ہے دینی پروگراموں کا ثابت ہونا جس میں حدود و احکام الٰہی کے اجراء کے لئے حکومت کا وسیع مفہوم شامل ہے اس طرح ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت و پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔

تیسرے معنی کے لحاظ سے یہ مقام رسالت و نبوت سے بلند تر ہے کیونکہ نبوت و رسالت خدا کی طرف سے خبر دینا، اس کا فرمان پہنچانا اور خوشخبری دینا اور تنبیہ کرنا ہے لیکن منصب امامت میں ان امور کے ساتھ ساتھ اجرائے احکام اور نفوس کی ظاہری باطنی تربیت بھی شامل ہے (البتہ واضح ہے کہ بہت سے پیغمبر مقام امامت پر بھی فائز تھے)۔ درحقیقت مقام امامت دینی منصوبوں کو عملی شکل دینے کا نام ہے۔ یعنی ایصال الی المطلوب، مقصود تک پہنچانا، اجرائے قوانین الٰہی کے لحاظ سے اور تکوینی ہدایت کے اعتبار سے یعنی تاثیر باطنی اور نفوذ روحانی۔ یہ وہ شعاع نور ہے جو انسانی دلوں کو روشنی بخشتی ہے اور انہیں ہدایت کرتی ہے۔

اس لحاظ سے امام بالکل آفتاب کی طرح ہے جو اپنی شعاعوں سے سبزہ زاروں کی پرورش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝

وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ رحمت بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکال لے جائے اور وہ مومنین پر مہربان ہے۔ (احزاب۔ ۴۳)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کی خاص رحمتیں اور فرشتوں کی غیبی امداد مومنین کی تاریکیوں سے نور کی طرف رہبری کرتی ہے۔

یہ بات امام پر صادق آتی ہے۔ امام اور مقام امامت کے حامل عظیم پیغمبر مستعد و آمادہ افراد کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں جہالت و گمراہی سے نکال کر نور و ہدایت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زیر بحث آیت میں امامت کے مذکورہ تیسرے مفہوم ہی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ قرآن کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامت کے مفہوم میں ہدایت بھی شامل ہے۔ جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیت ۲۴ میں ہے:

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا٘ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ۝

ہم نے انہیں امام بنایا تاکہ ہمارے فرمان کے مطابق ہدایت کریں۔ اس لئے کہ وہ صبر و استقامت رکھتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔

یہ ہدایت ارائۃ الطریق — راستہ دکھانا — کے معنی والی نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم مرحلہ امامت سے پہلے مقام نبوت و رسالت اور ارائۃ الطریق کے مفہوم کی ہدایت کے منصب پر تو قطعاً و یقیناً فائز تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو منصب امامت سخت آزمائشوں سے گزرنے اور یقین، شجاعت اور استقامت کے مراحل طے کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوا وہ بشارت، ابلاغ اور انذار کے معنی سے ماوراء مقام ہدایت کا حامل ہے۔ لہٰذا وہ ہدایت جو امامت کے مفہوم میں داخل

ہے ایصال الی المطلوب، روح مذہب کو عملی شکل دینا اور نفوس آمادہ کی تربیت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ اتخذ ابراھیم عبدًا قبل ان یتخذہ نبیا و ان اللّٰہ اتخذہ نبیًا قبل ان یتخذہ رسولًا و ان اللّٰہ اتخذہ رسولًا قبل ان یتخذہ خلیلًا و ان اللّٰہ اتخذہ خلیلًا قبل ان یتخذہ امامًا فلما جمع الاشیاء قال انی جاعلک للناس اماما فمن عظمھا فی عین ابراھیم قال ومن ذریتی قال لاینال عھدی الظٰلمین قال لا یکون السفیہ امام التقی۔

خداوند عالم نے نبی بنانے سے قبل ابراہیمؑ کو عبد قرار دیا اور اللہ نے انہیں رسول بنانے سے پہلے نبی قرار دیا اور انہیں خلیل بنانے سے قبل اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ امام بناتا انہیں اپنا خلیل بنایا جب یہ تمام مقامات و مناصب انہیں حاصل ہو چکے تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بناتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عظیم دکھائی دیا تو انہوں نے عرض کیا: خدایا میری اولاد سے بھی امام قرار دے ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں تک نہ پہنچے گا۔ بے وقوف شخص متقی لوگوں کا امام نہیں ہو سکتا۔[1]

(iii) نبوت، رسالت اور امامت میں فرق: آیات میں موجود اشارات اور احادیث میں وارد ہونے والی مختلف تعبیرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مامور لوگ مختلف منصبوں پر فائز تھے:

۱۔ مقام نبوت — یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنا۔ لہٰذا نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہو اور جو کچھ وحی کے ذریعے معلوم ہو لوگ چاہیں تو انہیں بتا دے۔

۲۔ مقام رسالت — یعنی مقام ابلاغ وحی، تبلیغ و نشر احکام الٰہی اور تعلیم و آگہی سے نفوس کی تربیت۔ لہٰذا رسول وہ ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ماموریت کے حلقے میں جستجو اور کوشش کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے اور لوگوں تک اس کا فرمان پہنچائے۔

۳۔ مقام امامت — یعنی رہبری و پیشوائی اور امور مخلوق کی باگ ڈور سنبھالنا۔ درحقیقت امام وہ ہے جو حکومت الٰہی کی تشکیل کے لئے ضروری توانائیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ احکام خدا کو عملاً جاری اور نافذ کر سکے اور اگر فی الوقت باقاعدہ حکومت کی تشکیل ممکن نہ ہو تو جس قدر ہو سکے اجرائے احکام کی کوشش کرے۔

بالفاظ دیگر امام کا کام اور ذمہ داری احکام و قوانین الٰہی کا اجراء ہے جب کہ رسول کی ذمہ داری احکام الٰہی کا ابلاغ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رسول کا کام ارائۃ الطریق ہے اور امام کی ذمہ داری ایصال الی المطلوب ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ رسول اسلامؐ کی طرح بہت سے پیغمبر تینوں عہدوں پر فائز تھے۔ وحی وصول کرتے تھے، فرامین

---

[1] اصول کافی، جلد اول، باب طبقات الانبیاء والرسل والائمۃ، صفحہ ۱۳۳

خداوندی کی تبلیغ کرتے نیز تشکیلِ حکومت اور اجرائے احکام کی کوشش کرتے اور باطنی طور پر بھی نفوس کی تربیت کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ امامت ہر جہت سے مقامِ رہبری کا نام ہے وہ مادی ہو یا معنوی، جسمانی ہو یا روحانی اور ظاہری یا باطنی۔ امام حکومت کا سربراہ، لوگوں کا پیشوا، مذہبی رہنما، اخلاق کا مربی اور باطنی ہدایت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اپنی مخفی اور معنوی قوت سے امام اہل افراد کی سیر تکامل[1] کے لئے باطنی رہبری کرتا ہے، اپنی علمی قدرت کے ذریعے ناداں وجاہل افراد کو تعلیم دیتا ہے اور اپنی حکومت کی طاقت سے یا دیگر اجرائی طاقتوں سے اصول عدالت کا اجراء کرتا ہے۔

(۱) امامت یا حضرت ابراہیمؑ کی آخری سیر تکامل: امامت کی حقیقت کے بارے میں ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخصیت مقامِ تبلیغ و رسالت کی حامل ہو لیکن منصبِ امامت پر فائز نہ ہو۔ کیونکہ اس منصب کے لئے ہر پہلو سے بہت زیادہ اہلیت و لیاقت کی ضرورت ہے اور یہ وہ مقام ہے جسے ابراہیمؑ تمام امتحانات کے بعد حاصل کر سکے اس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امامت حضرت ابراہیمؑ کے لئے سیر تکامل کی آخری منزل تھی۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ امامت کا مطلب ہے کسی شخص کا خود سے اہل اور نمونہ ہونا، تو حضرت ابراہیمؑ مسلماً آغازِ نبوت سے ایسے ہی تھے اور جو سمجھتے ہیں کہ امامت کا مقصد دوسرے کے لئے نمونہ اور ماڈل ہونا ہے تو یہ صفت ابراہیمؑ بلکہ تمام انبیاء و مرسلین میں ابتدائے نبوت سے موجود ہوتی ہے اسی لئے تو سب کہتے ہیں کہ پیغمبر کو معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے اعمال اور کردار دوسروں کے لئے نمونہ قرار پاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مقامِ امامت ان چیزوں سے کہیں بلند ہے یہاں تک کہ نبوت و رسالت سے بھی بالاتر ہے اور یہ وہ مقام و منصب ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اس کی اہلیت کا امتحان دینے کے بعد بارگاہِ الٰہی سے حاصل کیا۔

زیر بحث آیت کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جو ہماری بات پر شاہد ہیں:

۱۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

اور ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ (انبیاء-۷۳)

۲۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ

جب انہوں نے استقامت دکھائی تو ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ (سجدہ-۲۴)

پہلی آیت جو بعض انبیاء و مرسلین کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور دوسری جس میں بنی اسرائیل کے کچھ انبیاء کا ذکر ہے نشاندہی کرتی ہیں کہ امامت کا تعلق ہمیشہ سے ایک خاص قسم کی ہدایت سے رہا ہے جو فرمانِ خدا کے مطابق ہے۔

(۷) ظلم کسے کہتے ہیں؟: "لاینال عھدی الظالمین" میں جس ظلم کا ذکر ہے وہ فقط دوسروں پر ظلم ڈھانا نہیں

---

[1] سیر تکامل: ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ اس سفر کو اصطلاح میں سیر تکامل کہتے ہیں۔ (مترجم)

بلکہ یہاں ظلم کا تذکرہ عدل کے مقابلے میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔
عدالت کا حقیقی معنی ہے "ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا" اس بناء پر ظلم کا مفہوم یہ ہوگا: کسی شخص یا چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جس کے وہ اہل نہیں ہے"۔

لہٰذا ذمہ داری اور عظمت کے لحاظ سے امامت اور مخلوق کی ظاہری و باطنی رہبری ایک بہت بڑا مقام ہے۔ ایک لمحہ کا گناہ اور نافرمانی بلکہ سابقہ غلطی بھی اس مقام کی اہلیت چھن جانے کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ سے مروی احادیث میں حضرت علیؑ کے لئے رسولؐ اسلام کے خلیفہ بلا فصل ہونے کے ثبوت میں محل بحث آیت سے استدلال کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ دوسرے لوگ تو زمانہ جاہلیت میں بت پرست تھے مگر وہ شخص جس نے آنِ واحد کے لئے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا وہ صرف حضرت علیؑ تھے۔ مثلاً:

۱۔ ہشام بن سالم امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

قد کان ابراهیم نبیاً ولیس بامام حتی قال الله انی جاعلك للناس اماماً فقال و من ذریتی قال لاینال عهدی الظالمین من عبد صنماً او وثناً لایکون اماماً۔

منصب امامت پر فائز ہونے سے پہلے حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے فرمایا: میں تجھے انسانوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا: میری اولاد میں سے بھی امام قرار دے۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا جنہوں نے بتوں کی پرستش کی ہے وہ امام نہیں ہو سکتے[1]

۲۔ ایک اور حدیث عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

خداوند عالم نے ابراہیمؑ سے فرمایا:

لا اعطیك عهداً للظالم من ذریتك قال یارب ومن الظالم من ولدی الذی لا ینال عهدك قال من سجد لصنم من دونی لا اجعله اماماً ابداً ولا یصلح ان یکون اماماً۔

میں امامت کا عہد تیری اولاد میں سے ظالموں کو نہیں بخشوں گا۔ ابراہیم نے عرض کیا: وہ ظالم کہ جن تک یہ منصب نہیں پہنچ سکتا کون ہیں؟ خدا نے فرمایا: وہ شخص ظالم ہے جس نے بت کو سجدہ کیا ہو۔ میں ایسے کو ہرگز امام نہیں بناؤں گا اور نہ ہی وہ امام بننے کی صلاحیت رکھتا ہے[2]

(۷) امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیئے: زیر بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام (ہر لحاظ سے لوگوں کے رہبر کے مفہوم کے اعتبار سے) خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیئے کیونکہ امامت ایک قسم کا خدائی عہد

---

[1] اصول کافی ج ۱، باب طبقات الانبیاء والرسل، حدیث ۱
[2] امالی از شیخ مفید و مناقب ابن مغازلی (جیسا کہ تفسیر المیزان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے)۔

پیمان ہے اور واضح ہے کہ جسے خدا معین کرے گا اس پیمان کے ایک طرف خود خدا ہوگا۔

یہ بھی ظاہر ہوا کہ جن لوگوں کے ہاتھ ظلم و ستم سے رنگے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں کہیں ظلم کا نشان موجود ہے۔ چاہے اپنے اوپر ظلم ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ ایک لمحے کے لئے بت پرستی کی ہو وہ امامت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اصطلاح میں کہتے ہیں کہ امام کو اپنی تمام زندگی میں معصوم ہونا چاہیئے۔

کیا خدا کے سوا کوئی صفتِ عصمت سے آگاہ ہوسکتا ہے :-

اگر اس معیار پر جانشین پیغمبر کا تعین کیا جائے تو حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا۔

تعجب کی بات ہے کہ المنار کے مؤلف نے حضرت ابوحنیفہ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت منصوراولادِ علیؑ کے شایانِ شان ہے، اسی بناء پر وہ حاکم وقت (منصور عباسی) کے خلاف مظاہرات کو جائز سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے خلفائے بنی عباس کی حکومت میں انہوں نے منصبِ قضاوت قبول کرنے سے انکار کردیا۔

المنار کا مؤلف اس کے بعد مزید لکھتا ہے کہ آئمہ اربع سب کے سب اپنے وقت کی حکومتوں کے مخالف تھے اور انہیں مسلمانوں کی حکمرانی کے لئے اہل نہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ ظالم و ستمگر تھے۔[1]

لیکن یہ بات باعث تعجب ہے کہ ہمارے زمانے میں بہت سے علماء اہل سنت ظالم و جابر اور خود سر حکومتوں کی تائید کرتے ہیں اور انہیں تقویت پہنچاتے ہیں جب کہ یہ سب پر آشکار ہے کہ ان حکومتوں کے روابط ان دشمنانِ اسلام سے ہیں جن کا ظلم و فساد کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صرف اتنی سی بات نہیں بلکہ انہیں اولوالامر اور واجب الاطاعت سمجھتے ہیں۔

(vii) دو سوال اور ان کا جواب :-

۱۔ امامت کے مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امام کا کام ایصال الی المطلوب اور الٰہی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے پھر اس مفہوم نے بہت سے انبیاء یہاں تک کہ سرکار رسالت اور ائمہ طاہرین کے ہاتھوں عملی شکل تو اختیار نہیں کی بلکہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ گنہگار اور گمراہ لوگ برسر اقتدار رہے۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ امام مجبور کرکے لوگوں کو حق تک پہنچاتا ہے بلکہ اپنے اختیار، آمادگی اور اہلیت سے لوگ امام کے ظاہری و باطنی کمالات سے ہدایت حاصل کرتے ہیں یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ آفتاب زندہ موجودات کی نشوونما کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا یہ کہ بارش کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہے یہ مسلم ہے کہ یہ تاثیر عمومی پہلو رکھتی ہے لیکن صرف ان موجودات کے لئے جو یہ اثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ اور نشوونما حاصل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تفسیرِ امامت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر امام پہلے نبی اور رسول ہو اس کے بعد مقام امامت پر فائز ہو جب کہ جناب رسالت مآب کے معصوم جانشین تو ایسے نہ تھے۔

---

[1] المنار ج ۱، ص۴۵۷ ، ص۴۵۸

اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ امام پہلے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہو بلکہ اگر امام سے پہلے کوئی شخصیت نبوت، رسالت اور امامت تمام مناصب کی حامل ہو (جیسا کہ پیغمبر اسلام تھے) تو اس کا جانشین منصب امامت میں اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی جاری رکھ سکتا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ جب نئی رسالت کی ضرورت نہ ہو جیسا کہ پیغمبر اسلام کے بعد کیونکہ وہ خاتم انبیاء ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وحی الٰہی کے نزول کا مرحلہ اور تمام احکام کا ابلاغ انجام کو پہنچ چکا ہو اور صرف نفاذ کی منزل باقی ہو تو جانشین پیغمبر اجرائے احکام کا کام جاری رکھ سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں کہ وہ خود نبی یا رسول ہو[1]

(viii) **حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی عظیم شخصیت:** حضرت ابراہیمؑ کا نام قرآن مجید میں ۶۹ مقامات پر آیا ہے اور ۲۵ سورتوں میں ان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ قرآن میں اس عظیم پیغمبر کی بہت مدح و ثنا کی گئی ہے اور ان کی بلند صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کی ذات ہر لحاظ سے راہنما اور اسوہ ہے اور وہ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے۔

خدا کے بارے میں ان کی معرفت، بت پرستوں کے بارے میں ان کی منطق، جابر و قاہر بادشاہوں کے سامنے ان کا انتھک جہاد، حکم خدا کے سامنے ان کا ایثار اور قربانیاں، طوفان، حوادث اور سخت آزمائشوں میں ان کی بے نظیر استقامت، صبر اور حوصلہ اور ان جیسے دیگر امور — ان میں سے ہر ایک مفصل داستان ہے اور ان میں مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے۔

قرآنی ارشادات کے مطابق وہ ایک نیک اور صالح[2]، فروتنی کرنے والے[3]، صدیق[4]، بردبار[5] اور ایفائے عہد کرنے والے[6] تھے۔ وہ ایک بے مثال شجاع اور بہادر تھے۔ بہت زیادہ سخی تھے۔ سورہ ابراہیم کی تفسیر میں، خاص طور پر اس کے آخری حصے میں انشاء اللہ آپ اس سلسلے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

۱۲۵۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

ترجمہ

۱۲۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے خانۂ کعبہ کو انسانوں کے لوٹ آنے کا مقام، مرکز اور جائے امن قرار دیا اور (اسی مقصد کی تجدید کے لیے تم مقام ابراہیم کو اپنے لئے مقام نماز کی حیثیت سے انتخاب کرو۔ نیز ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ

---

[1] بعض لوگ درجہ بدرجہ مراحل طے کرتے ہیں مثلاً پہلے انہیں چھوٹے عہدوں پر لگایا جاتا ہے تاکہ تجربات و امتحانات کے بعد وہ بڑے عہدوں تک پہنچیں لیکن کبھی ایسے ذی استعداد لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کی صلاحیت و استعداد کو دیکھتے ہوئے انہیں بلندترین منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ (مترجم)

[2] ص۔ ۴۷ [3] نحل۔ ۱۲۲ [4] مریم۔ ۴۱ [5] توبہ۔ ۱۱۴ [6] ...

کو حکم دیا کہ میرے گھر کا طواف کرنے والوں، اس گھر کے خادموں، اور اس میں سجدہ کرنے والوں (نماز گزاروں) کے لئے اسے پاک و پاکیزہ رکھو۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے مقام بلند کا ذکر تھا۔ اب خانہ کعبہ کی عظمت کا تذکرہ ہے جو انہی کے ہاتھوں تعمیر اور تیار ہوا۔ فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مثابہ (لوگوں کے پلٹ آنے کا مقام اور توجہ کا مرکز) اور مقام امن و امان قرار دیا (واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس و امنا)۔

مثابہ اصل میں ثوب سے ہے جس کا معنٰی ہے کسی چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ آنا۔ چونکہ خانہ کعبہ موحدین کا مرکز تھا۔ وہ ہر سال اس کی طرف آتے تھے جہاں وہ نفقط جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی توحید اور فطرت اوّل کی طرف پلٹتے تھے اس لئے کعبہ کو مثابہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز انسان کا گھر ہمیشہ اس کی بازگشت کا مرکز اور آرام و آسائش کا مقام ہوتا ہے۔ لفظ مثابہ میں ایک قسم کا قلبی آرام و آسائش کا مفہوم بھی داخل ہے۔ لفظ "امنا" جو اس کے بعد آیا ہے اس مفہوم کی تاکید کرتا ہے۔ خصوصاً لفظ "للناس" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مرکز امن و امان تمام جہانوں کے لئے ایک عمومی پناہ گاہ ہے۔ یہ درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کی ایک درخواست کی قبولیت کا مظہر ہے جو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں کی تھی جیسا کہ اگلی آیت میں آئے گا (رب اجعل ھٰذا بلدا امنا پروردگارا! اس جگہ کو محل امن و امان قرار دے)۔

اس کے بعد فرمایا: مقام ابراہیم کو اپنی نماز کی جگہ کے طور پر انتخاب کرو (واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّی)۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ مقام ابراہیمؑ سے کون سی جگہ مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے تمام حج مقام ابراہیمؑ ہے۔ بعض عرفہ، مشعر الحرام اور تینوں جمرات کو مقام کا نام دیتے ہیں۔ بعض تمام حرم مکہ کو مقام ابراہیمؑ شمار کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر آیت، روایات اسلامی اور بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق یہاں مشہور مقام ابراہیمؑ کی طرف اشارہ ہے جو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک جگہ ہے جس کے پاس طواف کے بعد جا کر حجاج نماز طواف بجا لاتے ہیں۔ اس بنا پر مصلٰی سے مراد بھی یہی مقام نماز ہے۔

اس کے بعد اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ سے خانہ کعبہ کی طہارت کے بارے میں لیا گیا تھا۔ فرمایا: ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا اور انہیں وصیت کی کہ میرے گھر کو اس کا طواف کرنے والوں، اس کے پڑوس میں رہنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں (نماز گزاروں) کے لئے پاک رکھو (وعھدنا الٰی ابراھیم و اسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعٰکفین والرکع السجود)۔

یہاں طہارت و پاکیزگی سے کیا مراد ہے۔ اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں بتوں کی پلیدگی سے پاک کرنا مقصود ہے۔ بعض کہتے ہیں ظاہری نجاستوں سے پاک رکھنا مراد ہے، خصوصاً خون اور قربانی کے جانوروں کی اندرونی غلاظتوں سے کیونکہ بعض جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں طہارت کا معنٰی خانۂ توحید کی تعمیر کے وقت خلوص نیت ہے۔ لیکن چونکہ کوئی دلیل

موجود نہیں جس کی بنا پر یہاں طہارت کے مفہوم کو کسی ایک چیز میں محدود کریں لہٰذا یہاں خانۂ توحید کو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگیوں سے پاک رکھنا مراد لیا جانا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کے حوالے سے خانۂ خدا کو مشرکین سے پاک رکھنے کا حکم ہے اور بعض میں بدن کی صفائی اور اسے آلودگیوں سے پاک رکھنا مراد لیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) امن و امان کی اس پناہ گاہ کے اجتماعی اور تربیتی اثرات: مندرجہ بالا آیت کے مطابق خانہ خدا (خانہ کعبہ) کا تعارف خدا کی طرف سے ایک پناہ گاہ اور مرکز امن و امان کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس سرزمین مقدس میں ہر قسم کے نزاع و کشمکش، جنگ و جدل اور خونریزی کے بارے میں اسلام میں نہایت سخت احکام موجود ہیں۔ ان احکام کے مطابق نہ صرف انسان چاہے وہ کسی طبقے سے ہوں اور کسی حالت میں ہوں یہاں امن میں رہیں بلکہ جانور اور پرندے بھی امن و امان میں رہیں اور کوئی بھی ان سے مزاحم نہ ہو۔

وہ دنیا جہاں ہمیشہ نزاع اور کشمکش رہتی ہے وہاں ایک ایسے مرکز کا قیام لوگوں کی مشکلات حل کرنے کے لئے ایک اہم کردار ادا کرنے کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اس خطہ کا جائے امن ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ لوگ تمام اختلافات کے باوجود اس کے جوار میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ سکیں، ایک دوسرے سے مذاکرات کر سکیں اور اس طرح اہم ترین مسائل حل کر سکیں۔ دشمنیوں اور جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے اس طرح سے مذاکرات کا دروازہ کھولا گیا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جھگڑنے والے طرفین یا ایک دوسرے کی مخالف حکومتیں چاہتی ہیں کہ جھگڑا ختم کریں اور اس مقصد کے لئے مذاکرات کریں لیکن انہیں کوئی ایسا مشترکہ پلیٹ فارم نظر نہیں آتا جو دونوں کے لئے مقدس و محترم ہو اور مرکز امن و امان ہو لیکن اسلام اور بعض گذشتہ آسمانی مذاہب میں اس کی پیش بندی کی گئی ہے۔ اسلام میں مکہ کو ایسے ہی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

اس وقت مسلمان جن جان لیوا کشمکشوں اور اختلافات میں مبتلا ہیں اس سرزمین کے تقدس اور امنیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذاکرات کا دروازہ کھول سکتے ہیں اور یہ مقام مقدس جو دلوں میں خاص قسم کی نورانیت اور روحانیت پیدا کرتا ہے اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں کیا جا رہا۔[1]

(۲) خانہ خدا کا نام: مندرجہ بالا آیت میں خانہ کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر واضح ہے کہ خداوند عالم جسم رکھتا ہے اور نہ اسے گھر کی ضرورت ہے۔ اس اضافت اور نسبت سے مراد نسبت اعزازی ہے۔ کسی چیز کے بزرگی اور عظمت کو بیان کرنے کے لئے اسے خدا سے منسوب کیا جاتا ہے اسی معنی میں ماہ رمضان کو شہر اللہ اور خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔

۱۲۶۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ

---

[1] سرزمین مکہ کے جائے امن ہونے کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ سورہ ابراہیم، آیہ ۳۵ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۱۲۶۔ (اور یاد کرو) اس وقت کو جب ابراہیمؑ نے عرض کیا: پروردگارا! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں (قسم قسم کے) میووں سے روزی دے۔ (ہم نے ابراہیم کی اس دعا کو قبول کیا۔ اور مومنین کو انواع و اقسام کی برکات سے بہرہ ور کیا) کہا وہ جو کافر ہو گئے تھے انہیں تھوڑا سا فائدہ دیں گے پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف کھینچ کے لے جائیں گے اور ان کا انجام کتنا برا ہے۔

تفسیر

بارگاہ خدا میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواستیں

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے اس مقدس سرزمین کے رہنے والوں کے لئے پروردگار سے دو اہم درخواستیں کی ہیں۔ ایک کی طرف گذشتہ آیت کے ذیل میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

قرآن کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے عرض کیا پروردگار! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے (واذ قال ابراهیم رب اجعل هٰذا بلدا امنا)۔

جیسا کہ گذشتہ آیت میں ہے کہ ابراہیمؑ کی یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں اور خدا نے اس مقدس سرزمین کو امن و امان کا ایک مرکز بنایا اور اسے ظاہری و باطنی طور پر سلامتی بخشی۔

ان کی دوسری درخواست یہ تھی کہ اس سرزمین کے رہنے والوں کو جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں طرح طرح کے ثمرات سے نوازنا (وارزق اهله من الثمرات من امن منهم باللّٰه والیوم الاخر)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ابراہیمؑ پہلے امنیت کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے بعد اقتصادی عنایات کی درخواست کرتے ہیں یہ بات اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب تک کسی شہر یا ملک میں امن و سلامتی کا دور دورہ نہ ہو کسی ستھرے اور صحیح اقتصادی ماحول کا امکان نہیں ہو سکتا۔

ثمرات سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن ظاہراً ثمرات ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ جس میں ہر قسم کی مادی نعمات شامل ہیں۔ چاہے وہ پھل ہوں یا دیگر غذائی چیزیں بلکہ کئی ایک روایات کے مطابق تو اس کے مفہوم میں معنوی نعمات بھی شامل ہیں۔

امام صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ھی ثمرات القلوب

اس سے مراد دلوں کے میوے ہیں۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پروردگار اس سرزمین کے رہنے والوں کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ تقاضا صرف ان کے لئے کیا ہے جو توحید اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جملہ لاینال عھدی الظالمین (جو گذشتہ آیات میں گذر چکا ہے) سے شاید وہ یہ حقیقت جان چکے تھے کہ ان کی آنے والی نسلوں میں سے کچھ لوگ شرک اور ظلم و ستم کی راہ اختیار کریں گے لہذا بارگاہ الٰہی میں ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنی دعا سے مستثنیٰ رکھا۔

لیکن۔ تعجب کی بات ہے کہ ابراہیمؑ کے اس تقاضے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہم انہیں ان ثمرات میں سے تھوڑا سا بہرہ دیں گے مگر انہیں بالکل محروم نہیں کیا جائے گا (قال ومن کفر فامتعہ قلیلا)۔ آخرت میں انہیں عذاب جہنم کی طرف کھینچ کرلے جایا جائیگا اور یہ کیسا برا انجام ہے (ثم اضطرہ الی عذاب النار وبئس المصیر)۔

حقیقت میں یہ پروردگار کی صفت رحمانیت یعنی رحمت عامہ ہے۔ اس کی نعمت کے وسیع دسترخوان اور خزانہ غیب سے یہودی اور عیسائی بھی استفادہ کرتے ہیں لیکن آخرت کا گھر جو رحمت خاص کا گھر ہے وہاں ان کے لئے رحمت اور نجات نہیں ہے۔

۱۲۷۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

۱۲۸۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ
اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

۱۲۹۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ۧ

ترجمہ

۱۲۷۔ اور (یاد کرو) اس وقت کو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (اور کہتے تھے) اے ہمارے

پروردگار! تو ہم سے قبول فرما کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۲۸۔ پروردگارا! ہمیں اپنے فرمان کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والا قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایسی امت بنا جو تیرے حضور سرتسلیم خم کرنے والی ہو، ہمیں اپنی عبادت کا راستہ دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو تواب اور رحیم ہے۔

۱۲۹۔ پروردگارا! ان کے درمیان انہی میں سے ایک نبی مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے۔ کیونکہ تو توانا اور حکیم ہے (اور تو اس کام پر قدرت رکھتا ہے)۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر نو

قرآن کی مختلف آیات، احادیث اور تواریخ اسلامی سے واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بلکہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں موجود تھا کیونکہ سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۷ میں حضرت ابراہیم جیسے عظیم پیغمبر کی زبانی یوں آیا ہے:

رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ

پروردگارا! میں اپنی ذریت میں سے (بعض کو) اس بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسا رہا ہوں۔

یہ آیت واضح طور پر گواہی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے شیر خوار بیٹے اسماعیلؑ اور اپنی زوجہ کے ساتھ سرزمین مکہ میں آئے تو خانہ کعبہ کے آثار موجود تھے۔

سورہ آل عمران کی آیہ ۹۶ میں بھی ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيۡتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا۔

پہلا گھر جو عبادت خدا کی خاطر انسانوں کے لیے بنایا گیا وہ سرزمین مکہ میں تھا۔

یہ مسلم ہے کہ عبادت خدا اور مرکز عبادت کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے نہیں پڑی بلکہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

اتفاقاً زیر بحث آیت کی تعبیر بھی اسی معنی کو تقویت دیتی ہے۔ فرمایا: یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ (جب اسماعیل کچھ بڑے ہو گئے تو) خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے اور کہتے تھے پروردگار! ہم سے قبول فرما تو سننے والا اور جاننے والا ہے (واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم)۔

آیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس کے ستون بلند کر رہے تھے۔

نہج البلاغہ کے مشہور خطبہ قاصعہ میں بھی ہے:

الا ترون ان اللہ سبحانہ اختبر الاولین من لدن آدم الی الاخرین من ھذا العالم

باحجار.... فجعلها بیته الحرام ثم امر آدم وولدان یطوفوا به....

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے آدم سے لے کر آج تک کچھ پتھروں کے ذریعے امتحان لیا... (وہ پتھر کہ) جنہیں اپنا محترم گھر قرار دیا پھر آدم اور اولاد آدم کو حکم دیا کہ اس کے گرد طواف کریں[1]۔

مختصر یہ کہ آیات قرآن اور روایات تاریخ کی اس مشہور بات کی تائید کرتی ہیں کہ خانہ کعبہ پہلے پہل حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بنا۔ پھر طوفان نوحؑ میں گر گیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں اس کی تعمیر نو ہوئی[2]۔

حضرت ابراہیمؑ کی کچھ مزید دعائیں

زیر نظر دو آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ خدا سے پانچ اہم درخواستیں کرتے ہیں۔ یہ التجائیں جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت کی گئیں اس قدر قدر آمیز اور معنوی و مادی زندگی کی ضروریات کی جامع ہیں کہ انسان کو خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کی روحانی عظمت سے آشنا کرتی ہیں۔

پہلے عرض کرتے ہیں: پروردگارا! ہمیں ہماری ساری زندگی میں اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا قرار دے (ربنا واجعلنا مسلمین لك)۔

پھر تقاضا کرتے ہیں: ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان امت قرار دے جو تیرے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو (ومن ذریتنا امة مسلمة لك)۔

پھر درخواست کرتے ہیں: اپنی پرستش و عبادت کی راہ ہمیں دکھا اور ہمیں اس سے آگاہ فرما (وارنا مناسکنا)۔

پھر خدا کے حضور توبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہماری توبہ قبول کرے اور اپنی رحمت کا رخ ہماری طرف فرما کہ تو تواب اور رحیم ہے (وتب علینا انك انت التواب الرحیم)۔

اس کے بعد دعا کرتے ہیں: پروردگارا! انہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما (ربنا وابعث فیھم رسولا منھم) تاکہ وہ تیری آیات ان کے سامنے پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے (یتلوا علیھم ایاتك ویعلمھم الکتاب والحکمة ویزکیھم)۔ یقیناً تو توانا اور حکیم ہے اور ان تمام کاموں کی قدرت رکھتا ہے (انك انت العزیز الحکیم)۔

---

[1] یعنی اسے اپنی توجہات کا مرکز قرار دیں۔ (مترجم)

[2] المنار کے مؤلف نے اس بات سے انکار کیا ہے۔ اس کے نزدیک خانہ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہیں حالانکہ یہ بات نہ فقط یہ کہ روایات و تاریخ سے میل نہیں کھاتی بلکہ خود آیات قرآن سے بھی موافقت نہیں رکھتی۔

چند اہم نکات

(۱) انبیاء کی غرض بعثت: مندرجہ بالا آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی دعا کے ساتھ ان کی بعثت کے تین مقاصد بیان کئے ہیں:

۱۔ پہلا مقصد لوگوں کے سامنے آیات خدا کی تلاوت ہے۔ یہ دراصل ان آیات کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ آیات محمدؐ، جاذب نظر اور دلوں کو بھانے والی ہیں اور وحی کی صورت میں قلب پیغمبرؐ پر نازل ہوئی ہیں۔ تلاوت کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان آیات کے ذریعے خوابیدہ نفوس کو بیدار کرے۔ آیت میں لفظ "یتلوا" استعمال ہوا ہے جس کا مادہ تلاوت سے ہے۔ اس کا لغوی معنی ہے پے درپے لانا۔ جب عبارتوں کو ایک دوسرے کے بعد اور صحیح نظم و ترتیب سے پڑھیں تو عرب اسے تلاوت کہتے ہیں۔ لہٰذا منظم پے درپے تلاوت دراصل تعلیم و تربیت کے لئے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد تعلیم کتاب و حکمت شمار کیا گیا ہے کیونکہ علم و آگاہی کے بغیر تربیت ممکن نہیں تربیت دراصل نیسرا مرحلہ ہے۔ کتاب و حکمت میں اس لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد آسمانی کتاب ہو اور حکمت سے مراد وہ علوم، اسرار، علل اور مقاصد احکام ہوں جن کی پیغمبرؐ کی طرف سے تعلیم دی جاتی ہے۔

۳۔ تیسرا مقصد تزکیہ بیان کیا گیا ہے۔ تزکیہ کا معنی لغت میں نشو و نما بھی بیان کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ خاص طور پہ قابل توجہ ہے کہ انسانی علوم محدود ہیں اور ان میں بھی ہزاروں ابہام اور خطائیں موجود ہیں۔ انسان جو کچھ جانتا ہے اس کی صحت کا کامل یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے پیشتر اپنے علوم کی غلطیاں دیکھ چکا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ پیغمبر ان خدا صحیح علوم جو ہر قسم کی غلطی سے مبرا ہو مبداء وحی سے حاصل کرکے لوگوں کے درمیان تشریف لائیں تاکہ لوگوں کی غلطیوں کا ازالہ کریں اور جو باتیں انہیں معلوم نہیں ان کی انہیں تعلیم دیں اور جو کچھ وہ جانتے ہیں اس کے بارے میں انہیں اطمینان دلائیں۔

دوسری بات جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ ہماری نصف شخصیت کی تشکیل عقل و خرد سے ہوتی ہے اور نصف شخصیت طبائع، میلانات اور خواہشات سے بنتی ہے۔ اس لئے ہمیں جتنی تعلیم کی ضرورت ہے اتنی ہی تربیت کی احتیاج ہے ہماری عقل خود کو بھی تکامل و ترقی کی ضرورت ہے اور ہمارے باطنی طبائع کو بھی صحیح تربیت و پرورش کے لئے رہبری کی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو پیغمبرؐ معلم بھی ہیں اور مربی بھی، تعلیم دینا بھی انہی کا کام ہے اور تربیت کرنا بھی۔

(۱۱) تعلیم مقدم ہے یا تربیت: یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن میں چار مقامات پر انبیاء کی غرض بعثت کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے تین مقامات پر تربیت تعلیم سے مقدم ہے[۱] اور صرف ایک جگہ

---

[۱] بقرہ آیہ ۱۵۱، آل عمران آیہ ۱۶۴، جمعہ آیہ ۲۔

(زیر بحث آیت میں) تعلیم کا ذکر تربیت پر مقدم ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عموماً جب تک تعلیم نہ ہو تربیت نہیں ہوتی۔ اس بناء پر جہاں تعلیم تربیت سے مقدم ہے وہاں تو اس کی وضع طبیعی کی طرف اشارہ ہے لیکن زیادہ تر مقامات جہاں تربیت مقدم ہے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ غرض و مقصد تربیت ہے کیونکہ ہدف اور حقیقی مقصد تربیت ہی ہے اور باقی سب مقدمات ہیں۔

(iii) پیغمبر انہی میں سے ہو: مندرجہ بالا آیت میں لفظ "منھم" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ افراد انسانی کے رہبر اور مربی کے لئے ضروری ہے کہ اسی کی نوع و جنس سے ہو۔ انہی صفات اور بشری طبائع کا حامل ہو تاکہ وہ عملی پہلوؤں سے ان کے لئے بہترین نمونہ بن سکے کیونکہ واضح ہے کہ اگر ان کی نوع و جنس سے نہ ہو تو نہ وہ ان کی ضروریات، تکالیف، مشکلات اور انسانوں کے مختلف مسائل کو سمجھ پائے گا اور نہ ہی انسان اسے اپنے لئے نمونہ بنا سکیں گے۔

۱۳۰- وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ
فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝
۱۳۱- اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۳۲- وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۳۰- نادان و بیوقوف لوگوں کے سوا کون شخص (اس پاکیزگی اور روشنی کے باوجود) دین ابراہیم سے روگردانی کرے گا۔ اس دنیا میں ہم نے انہیں منتخب کیا ہے اور دوسرے جہان میں بھی وہ صالحین میں سے ہیں۔

۱۳۱- (یاد کرو وہ وقت) جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا اسلام لے آؤ (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو) تو انہوں نے پروردگار کے فرمان کو دل و جان سے قبول کر لیا اور) کہا میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

۱۳۲- ابراہیم اور یعقوب نے (اپنی عمر کے آخری اوقات میں) اپنے بیٹوں کو اس دین کی وصیت کی (اور ہر ایک نے اپنے فرزندوں سے کہا) اے میرے بیٹو! خدا نے اس آئین پاک کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور تم دین اسلام کے علاوہ کسی پر نہ مرنا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیم کی شخصیت کا کچھ تعارف کرایا گیا ہے ان میں حضرت ابراہیم کی بعض خدمات اور کچھ درخواستیں جو ان کے معنوی پہلوؤں کی جامع تصویر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ

حضرت ابراہیم اس قابل ہیں کہ عالمین کے تمام طالبان حق انہیں اپنے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیں۔ چاہیئے کہ ان کے مکتب کو ایک انسان ساز مکتب تسلیم کرکے اس سے استفادہ کیا جائے۔ اسی بنیاد پر زیر نظر آیات میں گفتگو اس طرح سے آگے بڑھتی ہے: احمق نادان افراد کے سوا کون شخص ابراہیم کے آئین پاک سے روگردانی کرے گا۔ (ومن یرغب عن ملة ابراھیم الا من سفه نفسه)۔

کیا یہ حماقت اور بیوقوفی نہیں کہ انسان اس پاک و روشن دین کو چھوڑ دے اور کفر اور شرک اور فساد کی گمراہیوں میں جا پڑے۔ وہ آئین جو انسان کی روح و فطرت سے آشنا و سازگار ہو اور عقل و خرد سے ہم آہنگ ہو اور وہ آئین جس میں آخرت بھی ہو اور دنیا بھی اسے چھوڑ کر ایسے منصوبوں کے پیچھے لگنا جو دشمن عقل، مخالف فطرت اور دین و دنیا کی تباہی کا باعث ہوں حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

مزید فرمایا: ہم نے دنیا میں ابراہیم کو (ان عظیم خصوصیات و امتیازات کی بناء پر) منتخب کیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا (ولقد اصطفینٰه فی الدنیا وانه فی الاٰخرة لمن الصٰلحین)۔

ابراہیم خدا کے چنے ہوئے اور صالحین کے سردار ہیں۔ اسی بناء پر انہیں اسوہ و نمونہ قرار دیا جانا چاہیئے۔ بعد کی آیت میں اسی مفہوم پر تاکید کرتے ہوئے ابراہیم کی برگزیدہ صفات میں سے ایک خصوصیت جو حقیقت میں ان تمام صفات کی بنیاد ہے کا تذکرہ کیا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ ہمارے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔ انہوں نے کہا میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوں (اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العٰلمین)۔

ہاں وہ ابراہیم جو فداکاری کا سراپا اور ایثار کا پتلا ہے جب اپنے ہی اندر سے آواز فطرت سنتا ہے کہ پروردگار اس سے فرمارہا ہے کہ سر تسلیم خم کرو تو وہ فوراً سر تسلیم خم کرتا ہے۔ ابراہیم اپنی فکر و ادراک سے سمجھتے اور دیکھتے ہیں کہ ستارے، آفتاب اور ماہتاب سب نکلتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں اور قانون آفرینش کے تابع ہیں لہٰذا کہتے ہیں کہ یہ میرے خدا نہیں ہیں۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

میں نے اپنا رخ خدا کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدہ کی راہ میں اپنے تئیں خالص کر دیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (انعام۔۷۹)

گذشتہ آیات میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل جب خانہ کعبہ تعمیر کر چکے تو قبولیت اعمال کی دعا کے بعد جو پہلی درخواست کی وہ یہ تھی کہ واقعاً وہ فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم ہوں اور ان کی اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھ کھڑی ہو۔ درحقیقت نوع انسانی بلکہ تمام مخلوق میں پہلی بات جو کسی کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے وہ خلوص اور پاکیزگی ہے۔ اسی لئے جب حضرت ابراہیم نے کامل طور پر اپنے تئیں فرمان حق کے سامنے سرنگوں کر لیا تو محبوب خدا ہو گئے اور خدا نے انہیں چن لیا اور اسی عنوان سے ان کا اور ان کے مکتب کا تعارف کرایا۔ حضرت ابراہیم نے آغاز زندگی سے آخر

تک ایسے ایسے کام کئے ہیں جو کم نظیر ہیں بلکہ بعض تو بے نظیر ہیں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں سے ان کا لاجواب جہاد اور ان کا آگ میں کود جانا کہ جس سے ان کا سخت ترین دشمن نمرود تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بے اختیار بول اٹھا:

من اتخذ الھا فلیتخذ الھا مثل اله ابراھیم

اگر کوئی خدا کا انتخاب کرنا چاہے تو وہ ابراہیم کے خدا جیسا خدا منتخب کرے[1]

اسی طرح بیوی اور شیر خوار بچے کو اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں سرزمین مقدس میں لا کر چھوڑ دینا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اپنے جوان بیٹے کو قربان گاہ پر لے جانا ان میں سے ہر امر حضرت ابراہیم کی راہ و روش کو جاننے کے لئے ایک نمونہ ہے۔

جو وصیت اور نصیحت آپ نے اپنی آخری عمر میں اپنے فرزندان گرامی سے کی وہ بھی نمونہ ہے جس کا ذکر زیر نظر آیات میں سے آخر میں آیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ اور یعقوب نے عمر کے آخری لمحات میں اپنی اولاد کو توحید کے مکتب مقدس کی وصیت کی (ووصی بھا ابراھیم بنیه و یعقوب)۔

ہر ایک نے اپنی اولاد سے کہا: اے میرے فرزندو! خدا نے اس آئین توحید کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے (یٰبنی ان اللہ اصطفٰی لکم الدین)۔

اس وصیت ابراہیمی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن گویا اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا کہ اے انسان! تم فقط آج کے لئے اپنی اولاد کے لئے جواب دہ نہیں بلکہ اس کے آئندہ کے بھی جواب دہ ہو۔ اس جہان سے آنکھیں بند کرتے وقت اپنی اولاد کی مادی زندگی ہی کے لئے فکر نہ کرو بلکہ ان کی معنوی و روحانی زندگی کے لئے بھی فکر کرو۔

یہ وصیت حضرت ابراہیمؑ ہی نے نہیں کی بلکہ ان کے پوتے حضرت یعقوب نے بھی اپنے دادا کی اس روش کو جاری رکھا اور انہوں نے بھی اپنی آخری عمر میں اپنی اولاد کو سمجھایا کہ دیکھو! تمہاری کامیابی و کامرانی اور سعادت ایک چھوٹے سے جملے میں پوشیدہ ہے اور وہ ہے حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔

تمام انبیاء میں یہاں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت یعقوبؑ کا ذکر آیا ہے شاید یہ اس مقصد کے لئے ہو کہ یہود و نصاریٰ کہ جن میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی طرح اپنے تئیں حضرت یعقوبؑ سے وابستہ کرتے ہیں انہیں سمجھایا جائے کہ تمہارا شرک آلود طور طریقہ اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی تمہاری ہٹ اس شخصیت کے طریقے سے نہیں ملتی جس سے اپنا ربط جوڑتے ہو۔

۱۳۳۔ اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبْرٰھٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰھًا

---

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۳۹

وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

۱۳۴۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۔ کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا، میرے بعد کس کی پرستش کروگے۔ انہوں نے کہا، آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا خدا ہے اور ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

۱۳۴۔ (بہر حال) وہ ایک امت تھے کہ گزشتہ زمانے میں ان کے اعمال ان سے مربوط تھے اور تمہارے اعمال بھی خود تم سے مربوط ہیں اور ان کے اعمال کی باز پرس کبھی تم سے نہ ہوگی۔

شانِ نزول

یہودیوں کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا کہ حضرت یعقوب نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو اسی دین کی وصیت کی جس کے یہودی معتقد ہیں (اس کی تمام تحریفوں کے ساتھ)، خدا تعالیٰ نے ان کے اس عقیدے کی تردید میں یہ آیات نازل کیں۔[1]

تفسیر

سب نے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں

جیسا کہ شانِ نزول میں ہے آیت کے ظاہر سے بھی یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی گفتگو کے دوران منکرین اسلام کا ایک گروہ حضرت یعقوب سے کوئی غلط بات منسوب کرتا تھا۔ قرآن ان کے اس بے دلیل دعویٰ کے متعلق کہتا ہے: کیا تم یعقوب کی موت کے وقت موجود تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو ایسی وصیت کی تھی (ام کنتم شہداء اذ حضر یعقوب الموت)۔

جو بات تم ان سے منسوب کرتے ہو وہ تو نہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے اس وقت اپنے بیٹوں سے گفتگو کی یہ تھی کہ انہوں نے پوچھا، میرے بعد کس چیز کی پرستش وعبادت کروگے (اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی) انہوں نے جواب میں کہا: آپ کے خدا کی اور اس اکیلے خدا کی جو آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا خدا ہے (قالوا نعبد الٰهک و الٰه اٰبآئک ابراهیم و اسمٰعیل و اسحٰق الٰها واحدا)۔ اور ہم اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (و

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی

نحن له مسلمون)۔

یعقوبؑ نے توحید اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی وصیت نہیں کی اور یہی اصول تمام حقائق تسلیم کرنے کی بنیاد ہے۔ زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت حضرت یعقوبؑ کو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ پریشانی تھی اور اس فکر کے آثار ان کی پیشانی سے ہویدا تھے اور آخرکار اس خلش کو وہ زبان پر لائے اور پوچھا: میرے بیٹو! میرے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے۔ خصوصاً پوچھا کس چیز کی، یہ نہیں کہا کس شخص کی کیونکہ ان کے گرد و پیش ایسے لوگ رہتے تھے جو بت پرست تھے اور کئی ایک چیزوں کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ یعقوب چاہتے تھے کہ وہ جان لیں کہ کیا اس طور طریقے کی طرف تو کسی کا رجحان اس کے دل کی گہرائیوں میں موجود نہیں۔ لیکن بیٹوں کے جواب کے بعد انہیں سکون قلب نصیب ہوا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت یعقوبؑ کے باپ یا دادا نہیں تھے بلکہ ان کے چچا تھے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ لغت عرب میں کبھی کبھی لفظ "اب" جس کا معنی باپ ہے چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں اگر یہ لفظ آزر کے لئے استعمال ہوا ہے تو یہ اس مفہوم کے منافی نہیں کہ آزر ابراہیمؑ کا والد نہ تھا بلکہ چچا تھا۔

زیر نظر دوسری آیت گویا یہودیوں کے ایک اشتباہ کی نفی کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے آباء و اجداد، ان کے اعزازات اور خدا کے ہاں ان کی عظمت پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور اپنے بارے میں سمجھتے کہ اگر وہ گناہگار ہوں تو بھی ان بزرگوں کی وجہ سے نجات یافتہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے: بہر حال وہ ایک امت تھے جو گزر گئے ہیں اور ان کے اعمال ان سے وابستہ ہیں اور تمہارے اعمال خود تمہارے ساتھ مربوط ہیں (تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم)۔ تم کبھی ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں (جیسا کہ وہ تمہارے اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں) (ولا تسئلون عما كانوا يعملون)، لہٰذا بجائے اس کے کہ تم اپنی توانائی اپنے بزرگوں کے متعلق ایسے فخر و مباہات کی تحقیق میں صرف کرو اپنے عقیدہ اور عمل کی اصلاح کرو۔

اگرچہ بظاہر اس آیت کے مخاطب اہل کتاب اور یہودی ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ حکم انہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہم مسلمان بھی اس کے حقیقی مفہوم کے مخاطب ہیں۔[1]

۱۳۵۔ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

۱۳۶۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ

---

[1] مسلمانان گرامی اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائیں۔ (مترجم)

إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَآ أُوتِيَ النَّبِيُّونَ
مِن رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝
۱۳۷۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَآ آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي
شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ

۱۳۵۔ (اہل کتاب) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ یا عیسائی تاکہ ہدایت پالو کہہ دیجئے (یہ تحریف شدہ مذاہب ہرگز ہدایت بشر کا سبب نہیں بن سکتے) بلکہ ابراہیم کے خالص دین کی پیروی کرو وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے۔

۱۳۶۔ کہیے ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء اسباط پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو پروردگار کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (نسلی تعصبات اور ذاتی اغراض ہمارے لئے سبب نہیں بنتیں کہ ہم بعض کو قبول کریں اور بعض کو چھوڑ دیں)۔

۱۳۷۔ اگر وہ بھی اس پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر روگردانی کریں گے تو وہ حق سے جدا ہوں گے اور خدا تم سے ان کے شر کو دور کرے گا وہ سننے والا اور دانا ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے:

چند یہودی علماء اور نجران کے کچھ عیسائی علماء مسلمانوں سے بحث مباحثہ کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے تئیں دینِ حق پر قرار دیتا اور دوسرے کی نفی کرتا تھا۔ یہودی کہتے کہ ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰ دیگر انبیاء سے برتر ہیں اور ہماری کتاب بہترین کتاب ہے۔ اسی طرح عیسائی دعویٰ کرتے تھے کہ مسیح بہترین رہنما ہیں اور انجیل بہترین کتاب ہے۔ ان دو مذاہب کے پیروکاروں میں سے ہر ایک مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دیتا تھا۔ یہ آیات اسی موقع پر ان کے جواب میں نازل ہوئیں۔

تفسیر

صرف ہم حق پر ہیں

خود پرستی اور محدود محوری کا اکثر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان حق کو فقط اپنی ذات میں منحصر سمجھتا ہے اور باقی سب کو باطل

پرست قرار دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لے جیسا کہ محل بحث پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اہل کتاب کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی بن جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے (وقالوا کونوا ھودا او نصاریٰ تھتدوا)۔

کہیئے کہ تحریف شدہ مذاہب اس قابل نہیں کہ وہ ہدایت بشر کا سبب بنیں بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خالص دین کے پیروکار بنو تاکہ ہدایت حاصل کرو۔ وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے (قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین)۔

صحیح دیندار افراد وہ ہیں جو خالص توحید کے پیروکار ہیں وہ توحید جو کسی قسم کے شرک سے آلودہ نہ ہو اور پاک و صاف دین کو بگڑے دین سے ممتاز کرنے والی اہم ترین بنیاد توحید خالص ہی ہے۔

اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ خدا کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہ کریں اور سب کی تعلیمات کا احترام کریں کیونکہ دین حق کے اصول سب کے ہاں ایک ہی جیسے ہیں۔ موسیٰؑ و عیسیٰؑ بھی ابراہیمؑ کے آئین حق کے پیروکار تھے جو شرک سے پاک تھا، اگرچہ ان کے دین میں نادان پیروکاروں نے تحریف کر دی اور اسے شرک آلودہ کر دیا (یہ گفتگو اس بات کے خلاف نہیں کہ آج ہمیں اپنی شرعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے آخری آسمانی دین کی پیروی کرنا چاہیئے یعنی صرف اسلام کی نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور کی جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے)۔ اسی لئے بعد کی آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے کہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں جو اس کی طرف سے ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور بنی اسرائیل کے اسباط پیغمبروں پر نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا ہے (قولوا اٰمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم)۔ خلاصہ یہ کہ ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے اور فرمان حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون)۔

خود محوری، نسلی تعصبات اور ایسی دیگر چیزیں ہمارے لئے اس بات کا موجب نہیں بنتیں کہ ہم کچھ کو مان لیں اور کچھ کا انکار کر دیں۔ وہ سب خدائی معلم ہیں جنہوں نے مختلف تربیتی طریقوں سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے قیام کیا لیکن سب کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ تھا توحید خالص اور حق و عدالت کے سائے میں نوع بشر کی ہدایت، اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنے خاص زمانے میں بعض مخصوص ذمہ داریوں اور خصوصیات کا حامل تھا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اگر یہ لوگ ان امور پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پالیں گے (فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا)۔ اگر روگردانی کریں گے تو حق سے جدا ہیں (وان تولوا فانما ھم فی شقاق)۔

اگر وہ نسلی و خاندانی تعصبات اور ایسی دیگر چیزوں کو مذہب میں داخل نہ کریں اور خدا کے تمام پیغمبروں پر بلا استثناء ایمان لے آئیں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں اور اگر یہ صورت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے حق کو چھوڑ دیا ہے اور

باطل کے پیچھے رواں ہیں۔

لفظ "شقاق" دراصل شگاف، نزاع اور جنگ کے معنی میں ہے اور اس مقام پر اس سے مراد کفر، گمراہی، حق سے دوری اور باطل کی طرف توجہ لیا گیا ہے اور ان سب معانی کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ گذشتہ آیت کے نازل ہونے اور حضرت عیسیٰؑ کا باقی انبیاء کی صف میں ذکر آنے کے بعد عیسائیوں کی ایک جماعت کہنے لگی کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ حضرت عیسیٰؑ دیگر انبیاء کی طرح تھے وہ تو خدا کے بیٹے تھے لہٰذا زیر نظر آیات میں سے تیسری آیت نازل ہوئی اور انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ گمراہی اور کفر کا شکار ہیں۔ بہر حال آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے کہ وہ دشمن کی سازشوں سے ہراساں نہ ہوں فرمایا: خدا ان کے شر کو ان سے دور کرے گا کہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کی سازشوں سے آگاہ ہے (فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم)۔

چند اہم نکات

(۱) دعوتِ انبیاء کی وحدت: آیاتِ قرآنی میں بارہا اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر ایک ہی ہدف اور غرض رکھتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے کیونکہ سب ایک ہی منبع وحی و الہام سے فیض حاصل کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ خدا کے تمام پیغمبروں کا ایک جیسا احترام کریں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ یہ بات اس کی نفی نہیں کرتی کہ خدا کی طرف سے آنے والی نئی شریعت گذشتہ شریعتوں کی ناسخ ہوتی ہے۔ آئینِ اسلام آخری آئین ہے کیونکہ خدا کے پیغمبر معلمین کی طرح تھے اور ان میں سے ہر ایک انسانی معاشرے کی علیحدہ جماعتوں (CLASSES) میں تربیت کے لئے آئے اور واضح ہے کہ جب ایک جماعت (CLASS) کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے تو طلباء دوسرے معلم کے پاس اور اوپر کی جماعت میں چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ آخری پیغمبر کے پروگراموں کو جو دین کے تکامل کا آخری مرحلہ ہے عملی شکل دیں۔

(۲) اسباط کون تھے: بسط، سبط اور انبساط کا معنی ہے کسی چیز کا آسانی سے پھیلاؤ۔ درخت کو کبھی کبھی سَبَط (بروزن شَجَر) کہتے ہیں، کیونکہ اس کی شاخیں آسانی سے پھیل جاتی ہیں۔ اولاد اور خاندان کی شاخوں کو سَبط اور اسباط کہتے ہیں اور اس کی وجہ وہ پھیلاؤ اور وسعت ہے جو نسل میں پیدا ہوتی ہے۔

اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے خاندان اور قبائل ہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں سے پیدا ہوئے چونکہ ان میں سے بھی انبیاء ہوئے ہیں لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں اسباط کو بھی ان افراد کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے جن پر آیات نازل ہوئیں۔ اس وجہ سے اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل یا اولادِ یعقوب میں سے وہ قبائل ہیں جن میں انبیاء آئے۔ اس سے مراد خود حضرت یعقوبؑ کے بیٹے نہ تھے کہ جس بناء پر کہا جا سکے کہ وہ سب کے سب نبوت کی اہلیت نہ رکھتے تھے کیونکہ وہ تو اپنے بھائی کے معاملے میں گناہ کے مرتکب ہوئے تھے۔

(iii) حنیف : حنیف کا مادہ ہے حنف (بروزن ہدف) جس کا معنی ہے گمراہی سے درستی اور راستی کی طرف میلان رجحان پیدا کرنا۔ اس کے برعکس ہے جنف یعنی راستی سے کجی کی طرف جھکنا۔ توحید خالص کے پیروکار چونکہ شرک سے منہ موڑ کر اس حقیقی اساس کی طرف مائل ہیں اس لئے انہیں حنیف کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حنیف کا ایک معنی ہے مستقیم اور صاف۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ مفسرین نے "حنیف" کی جو مختلف تفسیریں کی ہیں مثلاً: بیت اللہ کا حج، حق کی پیروی، حضرت ابراہیم کی پیروی، خلوص عمل وغیرہ سب کی بازگشت اسی جامع مفہوم کی طرف ہوتی ہے۔

۱۳۸۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○

۱۳۹۔ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ
وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○

۱۴۰۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً
عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۴۱۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ
عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۳۸۔ خدائی رنگ (ایمان، توحید اور اسلام کا رنگ قبول کریں) اور خدائی رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے اور ہم صرف اس کی عبادت کرتے ہیں۔

۱۳۹۔ کہیے: کیا تم ہم سے خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہی تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور ہم تو خلوص سے اس کی عبادت کرتے ہیں (اور ہم مخلص موحد ہیں)۔

۱۴۰۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباط یہودی یا عیسائی تھے۔ کہیے تم بہتر جانتے ہو یا خدا (اور باوجودیکہ تم جانتے ہو کہ وہ یہودی یا عیسائی نہ تھے کیوں حقیقت چھپاتے ہو) اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم و ستمگر ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت کو چھپائے اور خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

۱۴۱۔ (بہرحال) وہ ایک امت تھے جو گزر گئے۔ جو انہوں نے کیا ہے وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ تمہارے لئے ہے۔ تم ان کے اعمال کے جوابدہ نہیں ہو۔

تفسیر

غیر خدائی رنگ دھو ڈالو

گذشتہ آیات میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو تمام انبیاء کے پروگراموں کے سلسلے میں جو دعوت دی گئی تھی اس ضمن میں فرماتا ہے: صرف خدائی رنگ قبول کرو (جو ایمان اور توحید کا خالص رنگ ہے) (صبغۃ اللّٰہ)[1]۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: کونسا رنگ خدائی رنگ سے بہتر ہے اور ہم تو فقط اس کی پرستش و عبادت کرتے ہیں (اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں) (ومن احسن من اللّٰہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون)۔

اس طرح قرآن حکم دیتا ہے کہ نسلی، قبائلی اور ایسے دیگر رنگ جو تفرقہ بازی کا سبب ہیں ختم کر دیں اور سب کے سب صرف خدائی رنگ میں رنگ جائیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کا معمول تھا کہ وہ اپنی اولاد کو غسل تعمید دیتے تھے اور کہتے تھے اس خاص رنگ سے غسل دینے سے نومولود کے وہ ذاتی گناہ دھل جاتے ہیں جو اسے حضرت آدم سے ورثے میں ملے ہیں۔

قرآن اس بے بنیاد منطق پر خط بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ خرافات، بیہودگی اور تفرقہ اندازی کے ظاہری رنگوں کی بجائے رنگِ حقیقت اور رنگ الٰہی قبول کرو تاکہ تمہاری روح اور نفس ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو۔ واقعاً یہ کیسی خوبصورت اور لطیف تعبیر ہے۔ اگر لوگ خدائی رنگ قبول کر لیں یعنی وحدت، عظمت، پاکیزگی اور پرہیزگاری کا رنگ، عدالت، مساوات، برادری اور برابری کا رنگ اور توحید و اخلاص کا رنگ اختیار کر لیں اور اس سے تمام جھگڑے، کشمکش (جو کئی رنگوں میں اسیر ہونے کا سبب ہیں) ختم کر سکتے ہیں اور شرک، نفاق اور تفرقہ بازیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

امام صادقؑ سے مروی متعدد احادیث میں انہی طرح طرح کے رنگوں کو دور کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ یہ روایات اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"صبغۃ اللّٰہ سے مراد اسلام کا پاکیزہ آئین ہے"[2]

یہودی وغیرہ بعض اوقات مسلمانوں سے حجت بازی کرتے اور کہتے کہ پیغمبر ہماری قوم میں مبعوث ہوتے تھے۔ ہمارا دین قدیم ترین ہے اور ہماری کتاب آسمانی کتابوں میں سے زیادہ پرانی ہے اگر محمدؐ بھی پیغمبر ہوتے تو ہم ہی میں سے مبعوث ہوتے اور کبھی کہتے کہ عربوں کی نسبت ہماری نسل ایمان و وحی قبول کرنے کے لئے زیادہ آمادہ ہے کیونکہ عرب تو بت پرست تھے۔

---

[1] عرب جس مقام پر صبغۃ اللّٰہ کہتے ہیں اس سلسلے میں مفسرین نے کئی احتمالات بیان کئے ہیں جن میں سے تین واضح ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے (صبغنا صبغۃ اللّٰہ) دوسرا یہ کہ ملت ابراہیم کی جگہ آیا ہو جو گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ تیسرا یہ کہ فعل محذوف کا مفعول ہو (اتبعوا صبغۃ اللّٰہ)۔

[2] نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۳۲۔

جب کہ ہم نہ تھے کبھی وہ خود کو خدا کی اولاد کہتے کہ بہشت تو فقط ہمارے لئے ہے۔ قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں ان سب خیالات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے۔ قرآن پہلے پیغمبر سے یوں خطاب کرتا ہے: ان سے کہیے کہ خدا کے بارے میں تم ہم سے گفتگو کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے (قل اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا و ربکم)۔

پروردگار کسی نسل یا قبیلے کے لئے ہی نہیں وہ تو تمام جہانوں اور تمام عالم ہستی کا پروردگار ہے۔ یہ بھی جان لو کہ ہم اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور اعمال کے علاوہ کسی شخص کے لئے کوئی وجہ امتیاز نہیں (ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم)۔ فرق یہ ہے کہ ہم خلوص سے اس کی پرستش کرتے ہیں اور خالص موحد ہیں لیکن تم میں سے بہت سوں نے توحید کو شرک آلود کر رکھا ہے (ونحن لہ مخلصون)۔

اس کے بعد کی آیت میں ان بے بنیاد دعووں میں سے کچھ کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اسباط سب یہودی یا عیسائی تھے (ام تقولون ان ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط کانوا ھودًا او نصاریٰ)۔ کہیے تم بہتر جانتے ہو یا خدا (قل ءانتم اعلم ام اللہ)۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ تم بھی کم و بیش جانتے ہو کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے بہت سے پیغمبر دنیا میں آئے اور اگر نہیں جانتے تو پھر بغیر اطلاع کے ان کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت، گناہ اور حقیقت سے پردہ پوشی ہے اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اپنے پاس موجود خدائی شہادت چھپائے (ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ)۔ مگر یہ جان لو کہ خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔

تعجب ہے کہ جب انسان ہٹ دھرمی اور تعصب کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر مسلمات تاریخ تک کا انکار کر دیتا ہے۔ مثلاً یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبروں تک کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا پیروکار شمار کرتے ہیں جب کہ وہ ان سے پہلے دنیا میں آئے اور یہاں سے چل بسے۔ وہ ایسی واضح حقیقت و واقعیت کو چھپاتے ہیں جس کا تعلق لوگوں کی قسمت اور دین و آئین سے ہے۔ اس لئے قرآن انہیں ظالم ترین افراد قرار دیتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں کہ کچھ لوگ جان بوجھ کر حقائق کو چھپاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں ایسے لوگوں کے نظریات کا ایک اور جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا: فرض کرو یہ سب دعوے سچے ہیں تو بھی وہ ایسے لوگ تھے جو گزر گئے ہیں ان کا دفتر اعمال بند ہو چکا ہے، ان کا زمانہ بیت چکا ہے اور ان کے اعمال انہی سے تعلق رکھتے ہیں (تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت) اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو اور ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہوگی (ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون)۔

مختصر یہ کہ ایک زندہ قوم کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کا سہارا لے اور ان پر بھروسہ کرے نہ کہ اپنے گروہ بہت بزرگوں کی تاریخ کا سہارا لے۔ ایک انسان کو صرف اپنی فضیلت و منقبت پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ باپ کی فضیلت سے اسے کیا ملنا چاہیے وہ کتنا ہی صاحب فضل کیوں نہ ہو۔

۱۴۲۔ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ

۱۴۲۔ عنقریب کم عقل لوگ کہیں گے (مسلمانوں کو) ان کو پہلے قبلہ سے کس چیز نے روگردان کیا۔ کہہ دو: مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

قبلہ کی تبدیلی کا واقعہ

اس آیت اور اس کے بعد کی چند آیات میں تاریخ اسلام کی ایک اہم تبدیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے لوگوں میں ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں اور چند ماہ تک مدینہ میں پیغمبر اسلام حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد قبلہ بدل گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں۔ مدینہ میں کتنے ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی جاتی رہی اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ یہ مدت سات ماہ سے لے کر سترہ ماہ تک بیان کی گئی ہے لیکن یہ جتنا عرصہ بھی تھا اس دوران یہودی مسلمانوں کو طعن زنی کرتے رہے کیونکہ بیت المقدس دراصل یہودیوں کا قبلہ تھا وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں بلکہ ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ یہ باتیں پیغمبر اکرم اور مسلمانوں کے لئے ناگوار تھیں۔ ایک طرف وہ فرمانِ الٰہی کے مطیع تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے طعنے ختم ہونے کو نہ آتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اکرم آسمان کی طرف دیکھتے تھے گویا وحی الٰہی کے منتظر تھے۔ اس انتظار میں ایک عرصہ گذر گیا یہاں تک کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا۔ ایک روز مسجد بنی سالم میں پیغمبر نماز ظہر پڑھا رہے تھے۔ دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ جبرئیل کو حکم ہوا کہ پیغمبر کا بازو تھام کر ان کا رخ انور کعبہ کی طرف پھیر دیں۔[1]

اس واقعے سے یہودی بہت پریشان ہوئے اور اپنے پرانے طریقے کے مطابق ڈھٹائی، بہانہ سازی اور طعن بازی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پہلے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کا کوئی اپنا قبلہ نہیں یہ ہمارے پیروکار ہیں۔ لیکن جب خدا کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے پھر زبان اعتراض دراز کی۔ چنانچہ محل بحث آیت میں قرآن کہتا ہے: بہت جلد کم عقل لوگ کہیں گے ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے (سیقول السفہاء

---

[1] مجمع البیان، ج ۱، صفحہ ۲۲۳

من الناس ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا) مسلمانوں نے اس سے کیوں اعراض کیا ہے جو گذشتہ زمانے میں انبیاء سلف کا قبلہ رہا ہے۔ اگر پہلا قبلہ صحیح تھا تو اس تبدیلی کا کیا مقصد اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر تیرہ سال اور چند ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے کیوں نماز پڑھتے رہے ہیں۔

خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے: ان سے کہہ دو عالم کے مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے (قل للہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم)۔

ان حیلہ بازوں کے جواب میں یہ ایک قطعی اور واضح دلیل تھی کہ بیت المقدس اور کعبہ سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ خدا کا ذاتی طور پر تو کوئی گھر نہیں ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ فرمان خدا کا پاس کیا جائے۔ جس طرف خدا حکم دے اُدھر نماز پڑھی جائے وہ مقام مقدس و محترم ہے اور کوئی جگہ حکم خدا کے بغیر ذاتی اہمیت نہیں رکھتی۔ حقیقت میں قبلہ کی تبدیلی آزمائش اور تکامل کے مراحل میں سے ہے ان میں سے ہر ایک ہدایت الٰہی کا مصداق ہے اور وہی ہے جو انسانوں کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) سفہاء: سفہاء جمع ہے سفیہ کی۔ اصل میں اس کا معنی وہ شخص ہے جس کا بدن ہلکا پھلکا ہو اور آسانی سے اِدھر اُدھر ہو جائے۔ اہل عرب جانوروں کی کم وزن رسیوں کو جو ہر طرف حرکت کرتی رہتی ہیں سفیہ کہتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں یہ لفظ کم ذہن شخص کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہ کم عقلی امور دین میں ہو یا امور دنیا میں۔

(۲) نسخ احکام: پہلے کہا جا چکا ہے کہ مختلف زمانوں میں نسخ احکام اور تربیتی پروگراموں کی تبدیلی کوئی نیا مسئلہ یا عجیب و غریب چیز نہیں کہ اس پر اعتراض ہو سکے۔ لیکن اس بات کو یہودیوں نے اسلام سے انکار کرنے کے لئے بڑی بات بنا دیا۔ اور اس سلسلے میں بہت پراپیگنڈا کیا۔ قرآن نے انہیں منطقی اور دندان شکن جواب دیئے اور وہ مجبوراً خاموش ہو گئے اس سلسلے کی آیات آپ ابھی ملاحظہ کریں گے۔

۱۴۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۴۳۔ (جیسے تمہارا قبلہ درمیانی ہے) اسی طرح خود تمہیں بھی ہم نے ایک درمیانی امت بنایا ہے (جو ہر لحاظ سے افراط و تفریط کے درمیان حد اعتدال میں ہے) تاکہ لوگوں کے لئے تم ایک نمونے کی امت بن سکو اور پیغمبر تمہارے سامنے نمونہ ہو اور ہم نے وہ قبلہ (بیت المقدس) کہ جس پر تم پہلے تھے فقط اس لئے قرار دیا تھا کہ وہ لوگ جو پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت دی ہے دشوار تھا (یہ بھی جان لو کہ تمہاری وہ نمازیں جو پہلے قبلہ کی طرف رخ کرکے ادا کی تھیں صحیح ہیں) اور خدا ہرگز تمہارے ایمان (نماز) کو ضائع نہیں کرتا کیونکہ خدا لوگوں پر رحیم اور مہربان ہے۔

تفسیر

زیر نظر آیت میں قبلہ کی تبدیلی کے فلسفے اور اسرار کی طرف کچھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا: (جس طرح تمہارا قبلہ درمیانی ہے) اسی طرح تمہیں ہم نے درمیانی امت قرار دیا ہے (وکذالک جعلناکم امۃ وسطا) ایسی امت جو کندرو ہو نہ تندرو، افراط میں ہو نہ تفریط میں بلکہ ایک نمونہ ہو۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کا قبلہ کیسے درمیانی قبلہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی تقریباً مشرق کی طرف کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ زیادہ تر عیسائی قومیں مغربی ممالک میں رہتی ہیں اور حضرت عیسٰی کی جائے ولادت (بیت المقدس) میں ہے اس لئے وہ مشرق کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہیں اس لحاظ سے مشرقی سمت کلی طور پر ان کا قبلہ شمار ہوتی ہے اور یہودی جو زیادہ تر شامات، بابل اور دیگر ایسے علاقوں میں رہتے تھے کہ انہیں تقریباً مغرب کی طرف رخ کرنا پڑتا تھا اس لحاظ سے مغربی سمت ان کا قبلہ تھا لیکن اس وقت کے مسلمان جو مدینہ میں رہتے تھے ان کے لئے کعبہ جنوب کی سمت میں اور مشرق و مغرب کے درمیان بنتا تھا جو ایک درمیانی خط شمار ہو گیا۔

یہ مطالب دراصل لفظ کذالک سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ مفسرین نے اس کی دیگر تفاسیر بھی بیان کی ہیں جو بحث و تمحیص کے قابل ہیں۔

بہر حال — قرآن چاہتا ہے کہ اسلام کے تمام پروگراموں کے باہمی تعلق کا ذکر کرے اور وہ یوں کہ نہ صرف مسلمانوں کا قبلہ درمیانی ہے بلکہ اس کے تمام پروگرام اس خوبی کے حامل ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، غرض یہ ہے کہ تم ایک ایسی امت جو گواہ (اور ایک نمونہ کی حامل ہو قرار پاؤ پیغمبر بھی ایک گواہ (اور ایک نمونہ) ان کر تمہارے سامنے موجود ہو) لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

امت مسلمہ کا ساری دنیا کے لئے گواہ ہونا اور اسی طرح پیغمبر کا مسلمانوں پر گواہ ہونا یہ تعبیر ممکن ہے اسوہ اور نمونہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ گواہوں کا انتخاب ہمیشہ ان لوگوں میں سے کیا جاتا ہے جو نمونہ ہوں یعنی ان عقائد، معارف اور

تعلیمات کی وجہ سے جس کے تم حامل ہو ان کے ذریعے ایک ایسی امت بنو جو نمونہ ہو جیسے پیغمبر تمہارے درمیان ایک نمونہ، ماڈل اور اسوہ ہیں۔ یعنی تم اپنے عمل اور پروگرام کے ذریعے گواہی دیتے ہو کہ انسان دیندار بھی ہو سکتا ہے اور دنیا کے ساتھ بھی وابستہ رہ سکتا ہے۔ انسان معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے معنوی اور روحانی پہلوؤں کی مکمل حفاظت کر سکتا ہے اور دین و دنیا ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ تم ان عقائد اور پروگراموں کے ذریعے گواہی دیتے ہو کر دین و علم اور دنیا و آخرت نہ صرف یہ کہ متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں۔

اس کے بعد قرآن تبدیلی قبلہ کی ایک اور رمز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے اس قبلہ (بیت المقدس) جس پر تم قبل ازیں تھے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ پیغمبر کی پیروی کرنے والے جاہلیت کی طرف پلٹ جانے والوں سے ممتاز ہو جائیں (وما جعلنا القبلة التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیه)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ وہ افراد جو آپ کی پیروی کرتے ہیں بلکہ فرمایا: وہ لوگ جو رسول خدا کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تم رہبر اور فرستادہ خدا ہو اس لئے انہیں بغیر کسی قید و شرط کے تمہارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ قبلہ کے سلسلے میں پیروی تو آسان سی بات ہے اگر اس سے بڑھ کر بھی کوئی حکم لے تو اس میں چون وچرا کرنا شرک اور بت پرستی کے دور کے عادات و رسوم کے ترک نہ کئے جانے کی دلیل ہے۔

من ینقلب علی عقبیه - اس کا مطلب ہے پاؤں کے پچھلے حصے پر پلٹ جانا۔ یہ رجعت پسندی اور پسماندگی کی طرف اشارہ ہے۔

مزید فرماتا ہے: اگرچہ یہ کام ان لوگوں کے سوا جنہیں خدا نے ہدایت کی تھی دشوار تھا (وان کانت لکبیرة الا علی الذین ھدی الله)۔

واقعاً جب تک خدائی ہدایت نہ ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات اہم ہے کہ تسلیم حقیقت اس کا نام ہے کہ ایسے احکام جاری ہوں تو کسی سنگینی و سختی کا احساس تک نہ ہو بلکہ چونکہ حکم اس کی طرف سے ہے لہٰذا شہد سے شیریں تر معلوم ہو۔

وسوسہ ڈالنے والے دشمن یا نادان دوست خیال کرتے تھے کہ ہو سکتا ہے قبلہ بدل جانے سے پہلے اعمال باطل ہو جائیں اور اجر و ثواب برباد ہو جائے اس کے لئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: خدا ہرگز تمہارا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا کیونکہ خداوند تعالیٰ انسانوں کے لئے رحیم و مہربان ہے (وما کان الله لیضیع ایمانکم ان الله بالناس لرء وف رحیم)۔

اس کے احکام طبیب کے نسخوں کی طرح ہیں۔ ایک روز ایک نسخہ نجات بخش ہے اور دوسرے دن دوسرا۔ ہر ایک اپنی جگہ درست اور سعادت و تکامل کا ضامن ہے لہٰذا قبلہ کی تبدیلی تمہاری گذشتہ یا آئندہ کی نمازوں کے لئے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہ بنے کیونکہ وہ سب کی سب صحیح تھیں اور صحیح ہیں۔

چند اہم نکات

(۱) قبلہ کی تبدیلی کے اسرار:۔ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی ان سب کے لئے اعتراض کا موجب بنی جن کا گمان تھا کہ ہر حکم کو مستقل رہنا چاہیئے۔ وہ کہتے تھے اگر ہمارے لئے ضروری تھا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں تو پہلے دن یہ حکم کیوں نہ دیا گیا اور اگر بیت المقدس مقدم ہے جو گذشتہ انبیاء کا بھی قبلہ شمار ہوتا ہے تو پھر اسے کیوں بدلا گیا۔

دشمنوں کے ہاتھ بھی طعن زنی کا میدان آگیا۔ شاید وہ کہتے تھے کہ پہلے تو انبیاء ماسبق کے قبلہ کی طرف نماز پڑھتا تھا لیکن کامیابیوں کے بعد اس پر قبیلہ پرستی نے غلبہ کر لیا ہے لہٰذا اپنی قوم اور قبیلے کے قبلہ کی طرف پلٹ گیا ہے۔ یا کہتے تھے کہ اس نے دھوکا دینے اور یہود و نصاریٰ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پہلے بیت المقدس کو قبول کر لیا اور جب یہ بات کارگر نہ ہو سکی تو اب کعبہ کی طرف رخ کر لیا ہے۔

واضح ہے کہ ایسے وسوسے اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں ابھی نور علم نہ پھیلا ہو اور جہاں شرک و بت پرستی کی رسمیں موجود ہوں کیسا تذبذب و اضطراب پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے زیر نظر آیت میں قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ یہ مومنین اور مشرکین میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک عظیم آزمائش تھی۔ خانہ کعبہ اس وقت مشرکین کے بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا حکم دیا گیا کہ مسلمان وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیا کریں تاکہ اس طرح مشرکین سے اپنی صفیں الگ کر سکیں لیکن جب مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی حکومت و ملت کی تشکیل ہو گئی اور مسلمانوں کی صفیں دوسروں سے مکمل طور پر ممتاز ہو گئیں تو اب یہ کیفیت برقرار رکھنا ضروری نہ رہا۔ لہٰذا اس وقت کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا جو قدیم ترین مرکز توحید اور انبیاء کا بہت پرانا مرکز تھا۔

ایسے میں ظاہر ہے کہ جو کعبہ کو اپنا خاندانی معنوی اور روحانی سرمایہ سمجھتے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے مشکل تھا اور اسی طرح بیت المقدس کے بعد کعبہ کی طرف پلٹنا لہٰذا اس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی تاکہ شرک کے جتنے آثار ان میں باقی رہ گئے تھے اس کٹھالی میں پڑ کر جل جائیں اور ان کے گذشتہ شرک آلود رشتے ناطے ٹوٹ جائیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اصولی طور پر تو خدا کے لئے مکان نہیں ہے۔ قبلہ تو صرف وحدت اور صفوں میں اتحاد کی ایک رمز ہے اور اس کی تبدیلی کسی چیز کو دگرگوں نہیں کر سکتی۔ اہم ترین امر تو خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور تعصب اور ضد پرستی کے بتوں کو توڑنا ہے۔

(۲) امت اسلامی ایک درمیانی امت ہے:۔ لغت میں وسط کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان حد اوسط۔ اس کا ایک اور معنی ہے جاذب نظر، خوبصورت، عالی اور شریف۔ ظاہراً ان دونوں معانی کی ایک ہی حقیقت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ شرافت، زیبائی اور عظمت عموماً اسی چیز میں ہوتی ہے جو افراط و تفریط سے دور ہو اور مقام اعتدال پر ہو۔

قرآن نے امت مسلمہ کے لئے اس مقام پر کیسی عمدہ تعبیر بیان کی ہے کہ اسے درمیانی اور معتدل امت کا نام

دیا ہے۔

یہ امت معتدل ہے — عقیدہ کے لحاظ سے کہ راہِ غلو اپناتی ہے نہ تقصیر و شرک کی راہ چلتی ہے، جبر کی طرفدار ہے نہ تفویض کی، صفاتِ الٰہی کے بارے میں تشبیہ کا عقیدہ رکھتی ہے نہ تعطیل کا — یہ امت معتدل ہے — معنوی و مادی قدروں کے لحاظ سے — نہ کلی طور پر دنیائے مادہ میں غرق ہے کہ معنویت اور روحانیت کو بھول جائے اور نہ ہی عالم معنویت و روحانیت میں ایسے ڈوبی ہوئی ہے کہ جہان مادہ سے بالکل بے خبر ہو جائے — یہ امت معتدل ہے — اور — یہودیوں کے اکثر گروہوں کی طرح نہیں کہ جو مادی اغراض کے سوا کچھ نہیں جانتے — اور — نہ عیسائی راہبوں کی طرح جو تارک دنیا ہی بنے رہتے ہیں — یہ امت معتدل ہے علم و دانش کی نظر سے — اس طرح نہیں کہ اپنی معلومات پر جمود کا شکار ہو جائے اور دوسروں کے علوم کی پذیرائی نہ کرے اور نہ اس طرح احساس کمتری میں مبتلا ہے کہ ہر آواز کے پیچھے گم جائے — یہ امت معتدل ہے — روابط اجتماعی کی نظر سے اس طرح کہ اپنے گرد حصار بنا کر ساری دنیا سے الگ نہیں ہو جاتی اور نہ اپنی اصالت و استقلال کو ہاتھ سے جانے دیتی ہے کہ مشرق و مغرب کے فریب خوردہ لوگوں کی طرح ان اقوام ہی میں گم ہو جائے — یہ امت معتدل ہے — اخلاقی طور طریقوں میں، عبادت و تفکر کے لحاظ سے — غرض یہ امت ہر جہت سے معتدل ہے۔

ایک حقیقی مسلمان صرف ایک جہت کا انسان نہیں ہوتا بلکہ مختلف جہات سے وہ کمالِ انسانیت کا نمونہ ہوتا ہے گویا — صاحب فکر، با ایمان، منصف مزاج، مجاہد، شجاع، بہادر، مہربان، فعال اور غیر حریص ہوتا ہے۔

عدد وسط ایسی تعبیر ہے جو ایک طرف امت اسلامی کے گواہ ہونے کا اظہار کرتی ہے کیونکہ خطِ وسط پر موجود لوگ دائیں بائیں کے تمام منحرف خطوط کو جانتے ہیں اور دوسری طرف اس میں اس مفہوم کی علت و سبب بھی پوشیدہ ہے یعنی فرماتا ہے اگر تم پوری دنیا کی مخلوق کے شاہد ہو تو اس کی دلیل تمہارا اعتدال اور امت وسط ہونا ہے۔[1]

(۱۱) وہ امت جو ہر لحاظ سے نمونہ بن سکتی ہے: وہ تمام چیزیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں کسی امت میں جمع ہو جائیں تو یقیناً وہ حق و حقیقت کا ہمراہِ اول دستہ بن جائے کیونکہ اس کے پروگرام حق کو باطل سے ممتاز کرنے کے لئے میزان و معیار ہوں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ کئی ایک روایات میں منقول ہے کہ اہل بیتؑ نے فرمایا:

نحن الامۃ الوسطی و نحن شہداء اللّٰہ علی خلقہ و حججہ فی ارضہ ... نحن الشہداء علی الناس ... الینا یرجع الغالی و بنا یرجع[2] المقصر۔

ہم امت وسط ہیں ہم مخلوق پر شاہدانِ الٰہی ہیں اور زمین پر اس کی حجت ہیں ... ہم ہیں لوگوں پر گواہ .... غلو کرنے والوں کو ہماری طرف پلٹنا چاہیئے اور تقصیر کرنے والوں کو چاہیئے کہ یہ راہ چھوڑ کر ہم سے آملیں۔[3]

---

[1] المنار، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
[2] تھا ہوا یہاں 'یرجع' کی بجائے 'یلحق' ہونا چاہیئے (مترجم)۔
[3] نور الثقلین، ج۱، ص۱۳۴۔

جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں ایسی روایات آیت کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں بلکہ اس امت میں نمونہ و اسوۂ کے اکمل مصادیق کا تعارف کراتی ہیں اور ایسے نمونوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو پہلی صف میں موجود ہیں۔

(۱۷) "لنعلم" کی تفسیر: لنعلم (تاکہ ہم جان لیں) اور ایسے دیگر الفاظ جو قرآن میں خدا کے لئے استعمال ہوئے اس معنیٰ میں نہیں کہ خدا ایک چیز پہلے سے نہیں جانتا اور اس کے بعد اس سے آشنا ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد اس چیز کا ثابت ہونا اور خارجی شکل میں ظاہر ہونا ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ خداوند عالم ازل سے تمام حوادث و موجودات سے واقف ہے اگرچہ وہ اشیاء تدریجاً عالم وجود میں آتی ہیں لہٰذا ان حوادث و موجودات کا حدوث اس کے علم و دانش میں کسی قسم کی زیادتی کا باعث نہیں بنتا بلکہ وہ بھی چیز کو پہلے سے جانتا تھا اس ذریعے سے وہ عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک انجینئر ایک بلڈنگ کا نقشہ تیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کام کو اس مقصد کے لئے انجام دیتا ہوں تاکہ جو نتیجہ میری نظر میں ہے اسے دیکھوں یعنی اپنے علمی نقشے کو عملی جامہ پہناؤں (البتہ خدا کا علم انسانی علم سے بہت مختلف ہے لیکن یہ مثال کسی حد تک مسئلے کو واضح کر دیتی ہے)۔

وان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللہ ــــ البتہ خلاف عادت قدم اٹھانا اور بے جا احساسات کے زیر اثر نہ آنا بہت مشکل ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو واقعاً خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۷) قبلہ کا فلسفہ: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بنیادی طور پر قبلہ کی طرف منہ کرنے کا مقصد کیا ہے کیا خدا زمان و مکان سے ماوراء و بالاتر نہیں۔ کیا قرآن خود نہیں کہتا:

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

جدھر رخ کرو خدا کو پا لوگے۔

اس بناء پر کسی ایک طرف رخ کرنے کا اثر و نتیجہ کیا ہے اور وہ بھی اس اصرار سے کہ جہت قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو چاروں طرف نماز پڑھنا چاہیئے تاکہ یہ یقین پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی ذمہ داری ادا کر چکے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ــــ

اسلام کے نزدیک اتحاد کی بہت اہمیت ہے اور اسلام ہر ایسے حکم کو واجب یا کم از کم مستحب قرار دیتا ہے جو ہم آہنگی اور وحدت کا سبب بنے۔ اب اگر رُخ قبلہ معین نہ ہوتا اور ہر شخص کسی ایک طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا تو عجیب نقشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات کا پرستش و عبادت سے بہت پرانا تعلق ہے۔ اس لئے کتنی اچھی بات ہے کہ ایک تو وحدت کی حفاظت کے لئے اور دوسرا عبادت کے اصلی مراکز کی طرف زیادہ توجہ کے لئے ایک ہی نقطے کو قبلہ کے طور پر منتخب کر لیا جائے۔ تاکہ تمام اہل جہان عبادت کے وقت اپنے افکار کو ایک ہی نقطے پر مرکوز کر لیں اور اس طرح ایسے لاتعداد دائرے کھینچ

دیں کہ جن کا ایک ہی مرکزِ عبادت ہو تا کہ وہ ان کی وحدت کی رمز بن جائے۔

۱۴۴۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۴۴۔ ہم تمہارے چہرے کو دیکھتے ہیں جب تم آسمان کی طرف پھیرتے ہو (اور قبلہ نما کے تعیین کے لیے فرمانِ خدا کے انتظار میں رہتے ہو)۔ اب تمہیں اس قبلہ کی طرف جس سے تم خوش ہو پھیر دیتے ہیں۔ اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف کر لو اور تم (مسلمان) جہاں کہیں ہو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر دو۔ جنہیں آسمانی کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکم جو ان کے پروردگار کی طرف سے صادر ہوا ہے درست ہے (کیونکہ وہ اپنی کتب میں پڑھ چکے ہیں کہ رسولِ اسلام دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے) اور (وہ جو اس آیات مخفی رکھتے ہیں) خداوند عالم ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

جہاں کہیں ہو کعبہ کی طرف رخ کر لو

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے بیت المقدس مسلمانوں کا عارضی قبلہ تھا لہٰذا پیغمبر اسلامؐ انتظار میں تھے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہو خصوصاً اس بناء پر کہ پیغمبر اکرمؐ کے ورودِ مدینہ کے بعد یہودیوں نے اس بات کو اپنے لیے سند بنا لیا تھا اور ہمیشہ مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں اور ہم سے پہلے یہ قبلے کے متعلق کچھ جانتے بھی نہ تھے، اب ہمارے قبلہ کو قبول کر لینا ہمارا مذہب قبول کر لینے کی دلیل ہے۔ یہ اور ایسے دیگر اعتراضات کرتے رہے۔

محلِ بحث آیت میں اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم دیکھتے ہیں کہ تم منتظر نگاہوں سے مرکزِ نزولِ وحی، آسمان کی طرف دیکھتے ہو (قد نری تقلب وجھك فی السماء) اب ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیتے ہیں جس سے تم خوش ہو (فلنولینك قبلة ترضٰها)۔ ابھی سے اپنا چہرہ مسجد الحرام اور خانہ کعبہ کی طرف پھیر دو (فول وجھك شطر المسجد الحرام)۔ نہ فقط مدینہ میں بلکہ جہاں کہیں بھی تم (مسلمان) ہو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف پھیر دو (وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ)۔

جیساکہ بیان کیا جاچکاہے کہ روایات کے مطابق قبلہ کی یہ تبدیلی نماز ظہر کی حالت میں واقع ہوئی جو ایک حساس اور اہم مقام ہے۔ وحی خدا کے قاصد نے پیغمبرؐ کے بازوؤں کو پکڑ کر آپؐ کا رُخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور مسلمانوں نے بھی فوراً اپنی صفوں کو پھیر لیا یہاں تک ایک روایت میں ہے کہ عورتوں نے اپنی جگہ مردوں کو اور مردوں نے اپنی جگہ عورتوں کو دے دی (یاد رہے کہ بیت المقدس شمال کی جانب تھا جب کہ کعبہ جنوب میں واقع تھا)۔

یہ امر قابل غور ہے کہ گذشتہ کتب میں پیغمبر اسلامؐ کی نشانیوں میں سے ایک قبلہ کی تبدیلی بھی تھی۔ اہل کتاب نے چونکہ پڑھ رکھا تھا کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے (یصلی الی القبلتین) اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں اس حکم کے بعد مزید فرمایا: وہ کہ جنہیں آسمانی کتاب دی گئی جانتے ہیں کہ یہ حکم حق ہے اور پروردگار کی طرف سے ہے (وان الذین اوتوا الکتٰب لیعلمون انہ الحق من ربھم)۔

علاوہ ازیں یہ امر کہ پیغمبر اسلامؐ اپنے گرد و پیش کی عادات سے متاثر نہیں ہوئے اور کعبہ جو بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس علاقے کے تمام عربوں کے احترام کا مرکز تھا ابتداء میں نظر انداز کر دیا اور ایک محدود اقلیت کا قبلہ اپنا لیا یہ خود ان کی دعوت کی صداقت اور ان کے پروگراموں کے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل تھا۔

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: خدا ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما یعملون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ قبلہ کی تبدیلی کو آپؐ کی صداقت کی نشانی کے طور پر تسلیم کر لیتے جس کا ذکر گذشتہ کتب میں آچکا تھا، اسے چھپانے لگے ہیں۔ الٹا پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ خدا ان کے اعمال اور نیتوں سے خوب آگاہ ہے۔

چند اہم نکات

(۱) نظم آیات: زیر بحث آیت کے مفاہیم واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ پہلی آیت سے قبل نازل ہوئی ہے لیکن قرآن میں اس کے بعد موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات قرآن، تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں۔ بلکہ بعض اوقات کچھ ایسی مناسبتیں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ آیت جو بعد میں نازل ہوئی تھی پہلے آجاتی ہے۔ ان وجوہات میں مطالب کی اولیت اور اہمیت بھی شامل ہے۔

(۲) پیغمبر اکرمؐ کا کعبہ سے خاص لگاؤ: مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ خصوصیت سے چاہتے تھے کہ قبلہ کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے اور آپؐ انتظار میں رہتے تھے کہ خدا کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی حکم نازل ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے آثار سے عشق تھا۔ علاوہ ازیں کعبہ توحید کا قدیم ترین مرکز تھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ بیت المقدس تو وقتی قبلہ ہے لیکن آپؐ کی خواہش تھی کہ حقیقی و آخری قبلہ جلد معین ہو جائے۔ آپؐ چونکہ حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کئے تھے، یہ تقاضا زبان تک نہ لاتے صرف منتظر نگاہیں آسمان کی طرف

لگائے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا کہ آپؐ کو کعبہ سے کس قدر عشق اور لگاؤ ہے۔
آسمان شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ وحی کا فرشتہ اوپر سے آپؐ پر نازل ہوتا تھا ورنہ خدا کے لئے کوئی محل و مقام ہے نہ اس کی وحی کے لئے۔

(iii) "شطر" کا معنی: دوسری بات جو اس مقام پر قابلِ غور ہے یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "کعبہ" کی بجائے "شطر المسجد الحرام" آیا ہے۔ یہ شاید اس بناء پر ہو کہ دور کے علاقوں میں نماز پڑھنے والوں کے لئے خانہ کعبہ کا حقیقی تعین بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا خانہ کعبہ کی بجائے جو اصلی قبلہ ہے مسجد الحرام کا ذکر کیا گیا ہے جو وسیع جگہ ہے۔ خصوصاً لفظ "شطر" کا انتخاب ہوا جس کا معنیٰ ہے جانب یا سمت۔ یہ اس لئے کہ اسلامی حکم پر عملدرآمد سب لوگوں کے لئے آسان ہو۔ علاوہ ازیں نماز جماعت کی طویل صفیں اکثر اوقات کعبہ کے طول سے بھی لمبی ہوتی ہیں۔ اس موقع کے لئے بھی شرعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دور کے رہنے والوں کے لئے صحیح حدود کعبہ یا مسجد الحرام کا تعین بہت مشکل کام ہے لیکن اس سمت منہ کر کے کھڑا ہونا سب کے لئے آسان ہے۔

(iv) ہمہ گیر خطاب: اس میں شک نہیں کہ قرآن ظاہراً پیغمبرؐ سے خطاب کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم عام ہے اور سب مسلمانوں کے لئے ہے (سوائے ان چند مواقع کے جن کے پیغمبرؐ سے مخصوص ہونے کی دلیل موجود ہے) اس بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو الگ اور مومنین کو الگ کیوں حکم دیا گیا ہے کہ مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

ممکن ہے یہ تکرار اس لئے ہو کہ قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ شور و غل کا حامل تھا۔ لہٰذا امکان تھا کہ نئے مسلمانوں کے ذہن شور و غل اور زہریلے اعتراضات کی وجہ سے تشویش کا شکار ہوتے اور وہ عذر کرتے کہ "فول وجھک" تو فقط پیغمبرؐ سے خطاب ہے اور اس طرح خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے کتراتے لہٰذا اس مقام پر ایک مخصوص خطاب کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے ایک عمومی خطاب کیا ہے تاکہ انہیں تاکید کرے کہ قبلہ کی تبدیلی کا یہ معاملہ مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم سب کے لئے یکساں ہے۔

(v) کیا قبلہ کی تبدیلی پیغمبرؐ کو خوش کرنے کے لئے تھی: قرآن کہتا ہے: "قبلة ترضها" (یعنی۔ وہ قبلہ جس سے تو خوش ہے) ممکن ہے اس سے یہ وہم پیدا ہو کہ یہ تبدیلی پیغمبرؐ کو خوش کرنے کے لئے تھی۔ لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے تو یہ وہم دور ہو جائے گا کہ یہ بیت المقدس تو عارضی قبلہ تھا اور پیغمبر اکرمؐ آخری قبلہ کے اعلام کا انتظار کر رہے تھے تاکہ ایک طرف تو یہودیوں کی زبان بندی ہو جائے اور دوسری طرف اہل حجاز آئین اسلام کی طرف زیادہ مائل ہوں کیونکہ وہ کعبہ سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے۔ ضمناً یہ بھی کہ یہ پہلا قبلہ تھا لہٰذا اس طرف رخ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام

ل بعض مفسرین نے کہا ہے کہ شطر کا ایک معنی "نصف" ہے اس مفہوم کی بناء پر شطر المسجد الحرام اور وسط المسجد الحرام ہم معنی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ مسجد حرام کے وسط میں ہے (تفسیر کبیر فخر رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

کوئی نسلی دین نہیں ہے اور یہ بھی کہ اس سے خانہ کعبہ میں بت پرستوں کے موجود بتوں کا بطلان بھی ظاہر ہو جاتا۔

(۱۱) کعبہ ایک عظیم دائرے کا مرکز ہے: اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر مسلمان نماز گزاروں کی صفوں کو دیکھے جو کعبہ رخ نماز پڑھ رہے ہیں تو اسے کئی دائرے نظر آئیں گے جن میں ایک دائرہ دوسرے کے اندر ہے یہاں تک کہ دائرے سمٹتے سمٹتے اصل مرکز یعنی کعبہ تک جا پہنچتے ہیں اس سے ایک وحدت و مرکزیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلامی قبلے کا تصور بلاشبہ عیسائیوں کے اس طریقہ کار سے کہیں معیاری ہے جس کے مطابق تمام عیسائیوں کو حکم ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں مشرق کی طرف رخ کر کے عبادت بجالائیں۔

یہی وجہ ہے کہ علم ہیئت اور علم جغرافیہ نے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں میں تیزی سے ترقی کی کیونکہ زمین کے مختلف حصوں میں قبلہ کا تعین اس علم کے بغیر ممکن نہ تھا۔

۱۴۵۔ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (وقف لازم)

ترجمہ

۱۴۵۔ قسم ہے کہ اگر تم ہر قسم کی آیت (دلیل اور نشانی) ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ تو یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور تم بھی اب کبھی ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کرو گے (اور وہ اب یہ تصور نہ کریں کہ دوبارہ قبلہ کی تبدیلی کا امکان ہے) اور ان میں سے بھی کوئی دوسرے کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتا اور اگر تم علم و آگاہی کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کرو تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

تفسیر

وہ کسی قیمت پر سر تسلیم خم نہیں کریں گے

آپ گذشتہ آیت کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب جانتے تھے کہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی تبدیلی اس طرف سے کہ پیغمبر اسلام پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ آپ کی حقانیت کی دلیل ہے کیونکہ وہ اپنی کتب میں پڑھ چکے تھے کہ پیغمبر موعود دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن بے جا تعصب اور سرکشی کے بھوت نے انہیں حق قبول کرنے نہ دیا۔

اصولی طور پر اگر انسان مسائل پر پہلے سے حتمی فیصلہ نہ کر چکا ہو وہ افہام و تفہیم کے قابل ہوتا ہے اور دلیل، منطق یا معجزات کے ذریعے اس کے نظریات میں تبدیلی آسکتی ہے اور اس کے سامنے حقیقت کو ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر

وہ پہلے سے اپنا موقف حتمی طور پر طے کرے۔ خصوصاً ہٹ دھرم، متعصب اور نادان لوگوں کو کسی قیمت پر نہیں بدلا جا سکتا۔ اسی لئے قرآن محل بحث آیت میں قطعی طور پر کہہ رہا ہے: قسم ہے کہ اگر تم کوئی آیت دلیل اور نشانی ان اہل کتاب کے لئے لے آؤ، یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے (ولئن اتیت الذین اوتوا الکتاب بکل ایۃ ما تبعوا قبلتک)۔

لہٰذا تم اس کام کے لیے اپنے آپ کو نہ تھکاؤ اور ان کی ہدایت کے درپے نہ ہو کیونکہ یہ کسی قیمت پر حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے اور ان میں اصلاً تلاش حقیقت کی روح ہی مردہ ہو چکی ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمام انبیاء کو کم و بیش ایسے افراد کا سامنا کرنا پڑا جو یا اہل ثروت اور با اثر تھے یا پڑھے لکھے منحرف یا بگڑے ہوئے جاہل و متعصب عوام تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: تم بھی ہرگز ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کرو گے (وما انت بتابع قبلتھم)۔ یعنی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے شور و غوغا، قیل و قال اور طعن و تشنیع سے دوبارہ مسلمانوں کا قبلہ بدل جائے گا تو یہ ان کی جہالت ہے بلکہ یہ قبلہ اب ہمیشہ کے لئے ہے۔

درحقیقت مخالفین کا شور و غل ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان پختہ ارادے سے کھڑا ہو جائے اور واضح کردے کہ وہ راہ حق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرے گا۔

مزید فرمایا: وہ بھی اپنے معاملے میں ایسے متعصب ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے قبلہ کا پیرو اور تابع نہیں (وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض) یعنی — یہودی عیسائیوں کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں نہ عیسائی یہودیوں کے قبلہ کی۔

پھر بطور تاکید اور زیادہ قطعیت سے پیغمبرؐ سے کہتا ہے: اگر علم و آگہی کے بعد، جو خدا کی طرف سے تمہیں پہنچ چکی ہے تم ان کی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ان کی پیروی کرنے لگے تو مسلماً ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظالمین)۔

قضیہ و شرطیہ صورت میں پیغمبرؐ سے خطاب، قرآن میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ درحقیقت ان کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ سب لوگ جان لیں کہ قوانین الٰہی میں کسی قسم کی تبعیض اور فرق و اختلاف قبول نہیں کیا جائے گا۔ عام لوگ تو ایک طرف خود انبیاء بھی ان سے ماوراء نہیں ہیں۔ اس بناء پر اگر بفرض محال پیغمبر بھی حق سے انحراف کرے تو وہ بھی عذاب الٰہی کا مستحق ہو گا۔ اگرچہ انبیاء کے بارے میں ایسا مفروضہ ان کے ایمان، بے پناہ علم اور مقام تقویٰ و پرہیزگاری کے پیش نظر ممکن العمل نہیں اور اصطلاح میں اسے یوں کہتے ہیں کہ قضیہ شرطیہ وجود شرط پر دلالت نہیں کرتا۔

۲۔ تمام لوگ اپنا احتساب کریں اور جان لیں کہ جب پیغمبر کے بارے میں یہ معاملہ ہے تو انہیں پوری کوشش سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہئیں اور دشمن کے انحرافی میلانات اور شور و غوغا کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہئیں اور شکست تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔

۳۔ یہ واضح ہو جائے کہ پیغمبر بھی اپنی طرف سے کسی تبدیلی اور الٹ پھیر کا اختیار نہیں رکھتا اور ایسا نہیں کہ وہ جو چاہے

کرے بلکہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے اور اس کے فرمان کے تابع ہے۔

۱۴۶- اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا
مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۞
۱۴۷- اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۞ ع

ترجمہ

۱۴۶- وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہیں وہ اس (پیغمبر) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اگرچہ ان میں سے ایک گروہ حق کو پہچاننے کے باوجود اسے چھپاتا ہے۔

۱۴۷- (قبلہ کی تبدیلی کا یہ فرمان) تمہارے پروردگار کا حکم حق ہے لہذا ہرگز تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

تفسیر

وہ پیغمبر اکرمؐ کو پورے طور پر پہچانتے ہیں:

گذشتہ ابحاث کے بعد اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے بارے میں زیر نظر آیات میں گفتگو فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اہل کتاب کے علماء پیغمبر کو اپنی اولاد کی مانند اچھی طرح پہچانتے ہیں (الذین اتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم)۔ اس پیغمبر کا نام، نشانیاں اور خصوصیات وہ اپنی مذہبی کتب میں پڑھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض کوشش کرتے ہیں کہ جان بوجھ کر حق کو چھپائے رکھیں (و ان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون)۔

ان میں سے ایک گروہ تو اسلام کی واضح نشانیوں کو دیکھ کر اسے قبول کر چکا ہے جیسا کہ عبداللہ بن سلام جو علماء یہود میں سے تھا اور بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا منقول ہے کہ وہ کہتا تھا:

انا اعلم بہ منی بابنی

میں پیغمبر اسلام کو اپنے فرزند سے بھی بہتر پہچانتا ہوں[1]۔

یہ آیت ایک عجیب و غریب حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلام کی جسمانی و روحانی صفات اور ان کے علاقے کی نشانیاں گذشتہ کتب میں اس قدر زندہ، روشن اور واضح تعین کر چکی ہیں کہ جن سے آپ کی پوری تصویر ان لوگوں کے ذہنوں

---

[1] المنار، ج ۲ اور تفسیر کبیر از فخرالدین رازی (ذیل آیت زیر بحث)

میں موجود تھی جو ان کتب سے وابستہ تھے۔ کیا کسی کو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کتب میں پیغمبر اسلامؐ کا کوئی نام و نشان نہ ہو اور پھر بھی پیغمبرؐ اس صراحت سے ان کے سامنے کہیں کہ میری تمام صفات تمہاری کتب میں موجود ہیں، اگر ایسا ہوتا تو کیا اہل کتاب کے تمام علماء پیغمبرؐ سے شدید اور صریح مقابلے پر نہ اتر آتے اور انہیں یہ نہ کہتے کہ یہ تم ہو اور یہ ہیں ہماری کتابیں، کہاں ہیں تمہارے وہ نام و صفات۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ان کا ایک عالم فقط اس بناء پر آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس لئے ایسی آیات صرف آپ کی سچائی اور حقانیت کی دلیل ہیں۔

اس کے بعد گذشتہ ابحاث کی تاکید کے طور پر قبلہ کی تبدیلی کے متعلق فرمایا: یہ فرمان تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، پس تم کبھی بھی تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا (الحق من ربک فلا تکونن من الممترین)۔ اس طرح اس جملے میں پیغمبرؐ کی دلجوئی کی گئی ہے اور انہیں تاکید کی گئی ہے کہ وہ دشمن کے زہریلے پراپیگنڈا کے سامنے ذرہ برابر بھی تردد و شک کو راہ نہ دیں۔ چاہے قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ ہو یا کوئی اور چاہے دشمن اس کے خلاف اپنی تمام قوتیں جمع کر لیں۔

اس گفتگو میں اگرچہ مخاطب پیغمبر اکرمؐ ہیں لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ درواقع میں تمام لوگ مراد ہیں۔ ورنہ مسلم ہے کہ وہ پیغمبر جس کا وحی سے دائمی تعلق ہو کبھی کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ وحی اس کے لئے شہود حسّی اور یقین کا درجہ رکھتی ہے۔

۱۴۸۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۴۸۔ ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے اس کے لئے معین کیا ہے (اس بناء پر اب قبلہ کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرو اور اس کی بجائے)، نیکیوں اور اعمال خیر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو۔ تم جہاں کہیں بھی ہوگے، خدا تمہیں (اچھے اور بُرے اعمال کی جزا یا سزا کے لئے قیامت کے دن) حاضر کرے گا، کیونکہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت یہودیوں کے جواب میں ہے جو قبلہ کی تبدیلی کے متعلق زیادہ شور و غل بپا کئے ہوئے تھے۔ فرمایا: ہر گروہ کا ایک قبلہ ہے جسے خدا نے معین کیا ہے (اور وہ اس کی طرف رُخ کرتا ہے۔ ولکل وجهة هو موليها)۔

انبیاء کی طویل تاریخ میں کئی ایک قبلے تھے اور ان کی تبدیلی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں۔ قبلہ کوئی اصول دین نہیں کہ جس میں تبدیلی و تغیر نہیں ہو سکتا اور نہ یہ کہ امور تکوینی کی طرح ہے کہ آگے پیچھے نہ ہو سکے لہذا قبلہ کے بارے میں زیادہ گفتگو

نہ کرو اور اس کی بجائے اعمال خیر اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ (فاستبقوا الخیرات)۔ بجائے اس کے کہ اس انفرادی مسئلے میں وقت صرف کرتے رہو خوبیوں اور پاکیزگیوں کی تلاش میں نکلو اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو کیونکہ تمہارے وجود کی قدر و قیمت نیک اور پاک اعمال ہیں۔

یہ مضمون بعینہ اس سورہ کی آیہ ۱۷۷ کی طرح ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۔

نیکی یہ نہیں کہ اپنے چہرے مشرق و مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ خدا، روز جزاء، ملائکہ، کتاب اور انبیاء پر ایمان لے آؤ (اور نیک اعمال بجالاؤ)۔

اب اگر تم اسلام یا مسلمانوں کو آزمانا چاہتے ہو تو ان پروگراموں میں آزماؤ نہ کہ قبلہ کی تبدیلی کے مسئلہ میں۔

اس کے بعد اعتراض کرنے والوں کو تنبیہ کرنے اور نیک لوگوں کو شوق دلانے کے لئے فرمایا: تم جہاں کہیں ہوگے خدا تم سب کو حاضر کرے گا (اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً) تاکہ نیک لوگوں کو عمل خیر کی جزا اور برے لوگوں کو عمل بد کی سزا دی جاسکے۔

ایسا نہیں کہ ایک گروہ تو بہترین کام انجام دیتا ہو اور دوسرا زہر اگلنے، تخریب کاری کرنے اور دوسروں کے کاموں کو خراب کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ کرتا ہو اور پھر دونوں ایک جیسے ہوں اور ان کے لئے کوئی حساب و کتاب اور جزا سزا نہ ہو۔ چونکہ ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے یہ عجیب ہو کر خدا خاک کے منتشر ذرات کو، وہ جہاں کہیں ہوں جمع کرے گا اور دوبارہ وہی انسان عرصہ وجود میں قدم رکھے لہذا بلا فاصلہ فرمایا: اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (ان اللہ علی کل شیئ قدیر) در حقیقت آیت کے آخر میں یہ جملہ اس سے پہلے والے جملے (اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً) کی دلیل ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **امام مہدیؑ کے یار و انصار جمع ہوں گے:** آئمہ اہل بیتؑ سے مروی ہے کئی ایک روایات میں "اینما تکونوا یأت بکم اللہ جمیعاً" سے اصحاب حضرت مہدیؑ مراد لئے گئے ہیں۔ منجملہ ان روایات کے کتاب روضہ کافی میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے اس جملہ کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد کیا:

یعنی اصحاب القائم الثلاث مائة والبضعة عشر رجلا هم والله الامة المعدودة قال یجتمعون والله فی ساعة واحدة قزع کقزع الخریف۔

اس سے مقصود اصحاب امام قائمؑ ہیں جو تین سو تیرہ افراد ہیں۔ خدا کی قسم "امت معدودہ" سے وہی مراد ہیں۔ بخدا موسم خریف کے بادلوں کی طرح سب ایک لمحے میں جمع ہو جائیں گے۔ جیسے وہ بادل تیز ہوا

کے نتیجے میں جمع ہو کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ [1]

امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے:

وذلك واللّٰه ان لو قام قائمنا یجمع اللّٰه الیه جمیع شیعتنا من جمیع البلدان۔

بخدا جب حضرت مہدی قیام کریں گے خدا سب شہروں سے ہمارے تمام شیعوں کو ان کے پاس جمع کر دے گا۔ [2]

اگر قبل اور بعد کے قرائن نہ ہوتے تو یہ تفسیر قابل قبول تھی لیکن ان قرائن کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ [3] آیت میں "هُوَ مُوَلِّيهَا" کی شباہت "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا" سے ہے لیکن فرض کریں کہ یہ آیت اسی تفسیر کی طرف اشارہ ہے تو یہ جبری قضا و قدر کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ وہ قضا و قدر ہے جو آزادی کے مفہوم سے موافقت رکھتی ہو گی۔ [4]

۱۴۹۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

۱۵۰۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

ترجمہ

۱۴۹۔ تم جس بھی جگہ (شہر اور مقام) سے نکلو (جب وقتِ نماز ہو تو) اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حکمِ حق ہے اور خدا تمہارے کردار سے غافل نہیں ہے۔

۱۵۰۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو اور تم (مسلمان)، جہاں کہیں ہو اپنا رخ اس کی طرف کرو تاکہ

---

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۳۹۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۳۳۱

[3] یعنی یہ روایات آیت کی باطنی تفسیر ہیں۔ (مترجم)

[4] مزید وضاحت کے لئے کتاب انگیزۂ پیدائش مذہب، فصل قضا و قدر سے رجوع کریں۔

لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل و حجت نہ ہو۔ (کیونکہ گزشتہ کتب میں پیغمبر کی جو نشانیاں آئی ہیں ان میں یہ بھی تھی کہ وہ پیغمبر دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا)۔ ان لوگوں کے سوا جو ظالم ہیں (وہ جو ہر صورت میں ہٹ دھرمی اور زہر اگلنے سے باز نہیں آتے لیکن) ان سے نہ ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرو (یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے تھی کہ میں تمہاری تربیت کروں، تمہیں تعصب کی قید سے نکالوں اور تمہیں استقلال عطا کروں) اور اپنی نعمت تم پر مکمل کردوں تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

تفسیر

یہ آیات تبدیلی قبلہ کے مسئلے اور اس کے بعد پیش آنے والے امور کے بارے میں ہیں۔

پہلی آیت میں ایک تاکیدی حکم کے طور پر فرماتا ہے: جس جگہ (شہر اور علاقے) سے نکلو نماز کے وقت اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلو (ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام)۔

پھر تاکید مزید کے طور پر فرماتا ہے: یہ حکم حق ہے اور تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے (وانہ للحق من ربک)۔

آیت کے آخر میں تنبیہ اور دھمکی کے طور پر سازش کرنے والوں سے کہتا ہے اور ساتھ ہی مومنین کو خبردار کرتا ہے: اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (وما اللہ بغافل عما تعملون)۔

پے در پے تاکیدوں کا یہ سلسلہ جو اگلی آیت میں بھی جاری رہے گا۔ اس حقیقت کی حکایت کرتا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ اور سابق حکم کی منسوخی ایک تازہ مسلمان گروہ کے لئے بہت گراں اور سنگین تھا نیز بیہودہ اور خشونت پسند دشمن کے لئے بھی زہر اگلنے اور پراپیگنڈا کرنے کا ذریعہ تھا۔

اس مقام پر اور ایسے دیگر تمام تحولات اور انقلابات کے موقع پر ایسی قطعی صراحت اور پے در پے تاکیدیں ہی شکوک و شبہات کا ازالہ کرسکتی ہیں۔ کسی گروہ کا قائد و رہبر اگر ایسے حساس مواقع پر اٹل فیصلہ، حتمی ارادہ اور ناقابل تبدیل عزم کے ساتھ اپنا موقف معین کرے تو اس سے دوستوں کا ارادہ بھی مستحکم ہوتا ہے اور دشمن بھی ہمیشہ کے لئے مایوس ہوجاتا ہے۔ قرآن میں یہ نکتہ بارہا وضاحت سے نظر آتا ہے۔ نیز یہ تاکیدات محض تکرار نہیں بلکہ ان کے ساتھ نئے احکام بھی ہیں جیسے گزشتہ آیت میں شہر مدینہ میں مسلمانوں کی قبلہ کے بارے میں ذمہ داری کا تعین ہوا تھا لیکن اس اور اگلی آیت میں مسافر نمازیوں کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ہر مقام اور علاقے کے بارے میں حکم واضح کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے کے بارے میں ہر مقام سے متعلق ایک عمومی حکم ہے۔ فرماتا ہے: جہاں سے نکلو اور جس طرف جاؤ، نماز کے وقت اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرلو (ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام)۔

یہ صحیح ہے کہ اس جملے میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے لیکن مسلماً اس کے مخاطب سب نماز پڑھنے والے ہیں

تاہم بعد کے جملے میں اس کی توضیح تاکید کے لئے فرماتا ہے : اور تم (مسلمان) جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اس کی طرف کرو (وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ)۔

پھر اسی آیت کے ذیل میں تین اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے :

۱۔ **مخالفین کو خاموش کرنا:** فرماتا ہے : یہ قبلہ کی تبدیلی اس لئے عمل میں آئی ہے تاکہ لوگ تمہارے خلاف حجت نہ لا سکیں (لئلا یکون للناس علیکم حجۃ) کیونکہ گذشتہ آسمانی کتب میں پیغمبر کی نشانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا۔ اگر قبلہ کی یہ تبدیلی صورت پذیر نہ ہوتی تو ایک طرف یہودیوں کی زبان مسلمانوں کے خلاف کھل جاتی اور وہ کہتے کہ تورات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پیغمبر موعود کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا لیکن محمدؐ میں یہ نشانی تو موجود نہیں اور دوسری طرف مشرکین اعتراض کرتے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ دینِ ابراہیم کو زندہ کرنے آیا ہے تو پھر خانہ کعبہ کو کیوں فراموش کر دیا جب کہ اس کی بنیاد ابراہیم نے رکھی ہے۔ لیکن قبلہ کی اس تبدیلی نے ان کے یہ اعتراضات ختم کر دیے۔ مگر ہمیشہ حیلہ باز اور ستم پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی منطق کو نہیں مانتے لہٰذا قرآن نے ان کے استثناء کو ملحوظ رکھا اور فرمایا: مگر ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے (الا الذین ظلموا منھم)۔

یہ کسی صراطِ مستقیم پر قائم نہیں ہیں۔ اگر تم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو تو کہتے ہیں یہ تو یہودیوں کا قبلہ ہے تم مسلمان اپنا کوئی مستقل قبلہ نہیں رکھتے اور اگر کعبہ کی طرف پلٹ آؤ تو کہتے ہیں کہ تم میں ثبات و بقاء نہیں ہے تمہارا باقی دین بھی بہت جلد تبدیل ہو جائے گا۔

یہ بہانہ ساز اور حیلہ گر حق کے نام پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی ظلم روا رکھتے ہیں کیونکہ ان کی ہدایت میں سدِ راہ بنتے ہیں۔

۲۔ **ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو:** قرآن اس ہیچ اور عشرت پسند گروہ کو ظالم قرار دینے کے بعد فرماتا ہے : ان کی زہریلی اور حوصلہ شکن باتوں سے ہرگز نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو (فلا تخشوھم واخشونی)۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ممکن تھا بعض لوگ ان سے وحشت زدہ ہوں۔

یہ تربیت توحید اسلامی کا ایک کلی اور بنیادی اصول ہے کہ خدا کے علاوہ (یا پھر فرمانِ حق کے سوا) کسی چیز یا شخص سے نہ ڈرنا ہر صاحبِ ایمان مسلمان کا شعار ہے۔ اگر روح و جان پر اس فکر کی حکمرانی ہو تو اہلِ ایمان کو کبھی شکست نہ ہوگی۔

لیکن وہ مسلمان نما جو اس حکم کے برعکس کبھی مشرقی طاقت سے خائف ہوں اور کبھی مغربی طاقت سے خوف زدہ، کبھی داخلی منافقین سے لرزاں ہوں کبھی خارجی دشمنوں سے ترساں ــــ یعنی خدا کے سوا ہر چیز اور ہر شخص سے ڈریں وہ ہمیشہ ذلیل حال، ذلیل اور شکست خوردہ رہیں گے۔

۳۔ **تکمیلِ نعمتِ خدا:** قبلہ کی تبدیلی کے ضمن میں آخری دلیل یوں بیان ہوئی ہے : یہ اس لئے ہوا کہ میں تمہاری

تربیت کروں، تمہیں تعصب کی قید سے چھڑاؤں اور اپنی نعمت تم پر تمام کروں تاکہ تمہاری ہدایت ہو سکے (ولاتم نعمتی علیکم ولعلکم تھتدون)۔

قبلہ کی تبدیلی درحقیقت مسلمانوں کے لئے ایک طرح کی تربیت اور تکمیل نعمت تھی تاکہ وہ نظم وضبط سے آشنا ہوں اور تقلید و تعصب سے دور ہو جائیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ خداوند عالم نے ابتداء میں مسلمانوں کی صفوں کو بت پرستوں سے ممتاز کرنے کے لیے حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو تاکہ ان کا مقام مشرکین کے مقابلے میں واضح ہو جائے کیونکہ مشرکین کعبہ کو سجدہ کرتے تھے جو اس وقت بہت بڑا بت خانہ بنا ہوا تھا لیکن ہجرت کے بعد جب حکومت اسلامی کی تشکیل ہو چکی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم صادر ہوا اور مسلمان توحید کے قدیم ترین مرکز کی طرف منہ کرنے لگے اور یوں تکامل تربیت کا ایک مرحلہ طے ہو گیا۔

۱۵۱۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؕ

۱۵۲۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ؑ

ترجمہ

۱۵۱۔ جس طرح (قبلہ کی تبدیلی کے ذریعے ہم نے تم پر اپنی نعمت کامل کی اسی طرح) ہم نے تمہارے درمیان تمہاری نوع اور جنس میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ تمہیں ہماری آیات پیش کرے، تمہاری پرورش و تربیت کرے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تمہیں بتائے۔

۱۵۲۔ تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور (نعمتوں کے جواب میں) کفران نعمت کا ارتکاب نہ کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیت کے آخری حصے میں خداوند عالم نے قبلہ کی تبدیلی کی ایک دلیل تکمیل نعمت اور ہدایت مخلوق بیان کی ہے۔ زیر بحث آیت میں لفظ "کما" اسی طرف اشارہ ہے کہ صرف قبلہ کی تبدیلی تمہارے لئے نعمت خدا نہیں بلکہ خدا نے تمہیں اور بھی بہت سی نعمتیں دی ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہاری نوع میں سے تمہارے لئے رسول بھیجا ہے۔ لفظ "منکم" (یعنی تمہاری جنس سے) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ وہ نوع بشر ہی سے ہے اور صرف بشر ہی بشر کے لئے مربی، رہبر اور نمونہ ہو سکتا ہے اور وہی اپنی نوع کی تکالیف، ضروریات اور مسائل سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یا یہ مقصد ہے کہ وہ تمہارے قبیلہ و خاندان میں سے ہے اور تمہارا ہم وطن ہے کیونکہ شدید نسلی تعصب کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ عرب

کسی ایسے پیغمبر کے زیر بار ہوتے جو ان کی نسل و قوم میں سے نہ ہوتا جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۱۹۸ اور ۱۹۹ میں ہے:۔

وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ۝

اگر ہم قرآن ایسے شخص پر نازل کرتے جو عرب نہ ہوتا اور وہ ان کے سامنے اسے پڑھتا تو یہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔

یہ ان کے لئے بہت اہم نعمت شمار ہوتی تھی کہ پیغمبر خود انہی میں سے تھے لیکن یہ تو ابتدائے کار کی بات تھی لیکن آخر میں قوم، قبیلہ، وطن اور جغرافیائی سرحدوں کا معاملہ اسلامی پروگراموں سے حذف کر دیا گیا اور اسلام کے حقیقی اور دائمی قانون کا اعلان کیا گیا جو وطن، مذہب اور نسل کی بجائے انسانیت کو متعارف کراتا ہے۔

اس نعمت کے تذکرے کے بعد چار دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہیں پیغمبرؐ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں۔

۱۔ وہ ہماری آیات تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے: (یتلوا علیکم اٰیٰتنا)۔ لفظ "یتلوا" لغت میں تلاوت کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے پے در پے لے آنا۔ اسی لئے جب عبارتیں کسی مسلسل صحیح نظام کے تحت بن رہی ہوں تو عرب اسے تلاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی پیغمبر خدا کی باتیں ایک صحیح اور مناسب نظام کے تحت پے در پے تمہارے سامنے پڑھتا ہے تاکہ تمہارے دلوں کو تیار کرے کہ وہ انہیں قبول کریں اور ان کے معانی سمجھیں۔ یہ منظم اور مناسب تلاوت تعلیم و تربیت کے لئے آمادگی پیدا کرتی ہے۔ جس کی طرف بعد کے جملوں میں اشارہ ہوگا۔

۲۔ وہ تمہاری تربیت و پرورش کرتا ہے: (و یزکیکم)۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ تزکیہ کا معنیٰ ہے بڑھانا اور نشوونما دینا۔ یعنی پیغمبر آیات خدا کے ذریعے تمہارے معنوی و مادی اور انفرادی و اجتماعی کمالات کو بڑھاتا ہے اور تمہیں نمو بخشتا ہے۔ تمہارے وجود کی شاخوں پر فضیلت کے پھول کھلاتا ہے اور زمانہ جاہلیت کی بری صفات جو تمہارے معاشرے کو آلودہ کئے ہوئے ہیں ان کے زنگ سے تمہارے وجود کو پاک کرتا ہے۔

۳۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے: (و یعلمکم الکتاب والحکمة)۔ اگرچہ تعلیم، تربیت پر مقدم ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے کہ اصل مقصد تربیت ہے اسے تعلیم سے پہلے بیان فرمایا چونکہ تعلیم تو مقصد کے لئے وسیلہ ہے۔

باقی رہا کتاب و حکمت کا فرق تو ممکن ہے کہ کتاب قرآن کی آیات اور وحی الٰہی کی طرف اشارہ ہو جو بصورت اعجاز پیغمبر پر نازل ہوئی اور حکمت سے مراد ہو پیغمبرؐ کی گفتگو اور تعلیمات جو حقائق قرآن کی وضاحت اور تفسیر کے لئے ہیں اور اس کے قوانین و احکام کو عملی شکل دینے کے لئے بیان فرمائی جاتی رہی ہیں۔ انہی تعلیمات کو سنت کہتے ہیں جن کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب احکام و قوانین کی طرف اور حکمت اسرار، فلسفہ، علل اور اس کے نتائج کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حکمت سے مراد وہ حالت اور استعداد ہے جو تعلیمات قرآن سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے انسان تمام امور کا حساب وکتاب رکھتا ہے اور ہر ایک کو اس کے مقام پر بجا لاتا ہے۔[1]

تفسیر المنار کا مولف یہ تفسیر ذکر کرکے کہ حکمت سے مراد سنت ہے اسے غیر صحیح قرار دیتا ہے اور اس کے لئے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۹ سے استدلال کرتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰىٓ اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط

یہ ایسے امور ہیں جنہیں تمہارا پروردگار حکمت میں سے تم پر وحی کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس اعتراض کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ حکمت کا مفہوم وسیع ہے لہٰذا ہو سکتا ہے یہاں آیات قرآن اور وہ اسرار مراد ہوں جو وحی کے ذریعے پیغمبر پر نازل ہوتے جہاں حکمت کا ذکر کتاب (قرآن) کے ساتھ آیا ہے (جیسے زیر نظر اور ایسی دیگر آیات) وہاں مسلماً حکمت سے مراد کتاب کے علاوہ کچھ اور ہے اور وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

۴۔ تم جو نہیں جانتے وہ تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے: (ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون)۔ یہ مفہوم اگرچہ گذشتہ جملے میں موجود ہے جس میں کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذکر ہے لیکن قرآن اسے خصوصیت سے الگ بیان کر رہا ہے تاکہ انہیں سمجھائے کہ اگر انبیاء و رسل نہ ہوتے تو بہت سے علوم ہمیشہ کے لئے مخفی رہتے۔ وہ فقط اخلاقی و اجتماعی رہبر نہیں ہیں۔ بلکہ علمی رہنما بھی ہیں ان کی رہنمائی کے بغیر انسانی علوم کسی پہلو میں پختگی ممکن نہ تھی۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت میں خدا نے اپنی پانچ نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ ہیں:

پہلی — پیغمبر کا نوع بشر ہی سے ہونا۔

دوسری — لوگوں کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرنا۔

تیسری اور چوتھی — تعلیم و تربیت کرنا۔ اور

پانچویں — لوگوں کو ان امور کی تعلیم دینا جو پیغمبر کے بغیر وہ نہیں جانتے تھے۔

خدا کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت سے صحیح طور پر استفادہ کیا جائے جو سپاس گزاری کا طریقہ ہے اور کفران نعمت نہ کیا جائے۔ فرماتا ہے: مجھے یاد رکھو تاکہ میں تمہیں یاد رکھوں اور میرا شکر بجا لاؤ اور کفران نعمت نہ کرو (فاذکرونی اذکرکم و اشکروالی ولا تکفرون)۔

واضح ہے کہ مجھے یاد کرو تاکہ میں تمہیں یاد کروں کا جملہ خدا اور بندوں کے درمیان کسی ایسے رابطے کی طرف اشارہ

---

[1] تفسیر فی ظلال، ج ۱، ص ۱۴۳۔

نہیں جیسے انسانوں کے درمیان ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں: تم ہمیں یاد کیا کرو ہم تمہیں یاد کیا کریں گے بلکہ یہ ایک تربیتی و تکوینی بنیاد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی مجھے یاد رکھو ۔۔۔ ایسی پاک ذات کی یاد جو تمام خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور اس طرح اپنی روح اور جان کو پاکیزہ اور روشن رکھو اور رحمت پروردگار کی قبولیت کے لئے آمادہ رہو۔ اس ذات کی طرف متوجہ رہنا اور اسے یاد رکھنا ہر قسم کی فعالیتوں میں زیادہ مخلص، زیادہ مصمم، زیادہ قوی اور زیادہ متحد کردے گا۔

اسی طرح شکر گزاری اور کفرانِ نعمت نہ کرنا کوئی تکلفاً نہیں اور یہ فقط کلمات کی زبان سے ادائیگی نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر نعمت کو ٹھیک اس کی جگہ پر صرف کرنا اور اسی مقصد کی راہ میں خرچ کرنا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے تاکہ یہ امر خدا تعالیٰ کی نعمت و رحمت میں اضافے کا باعث ہو۔

چند اہم نکات

(۱) "فاذکرونی اذکرکم" کی تفسیر میں مفسرین کی موشگافیاں: مفسرین نے اس جملے کی تشریح میں بہت سی باتیں کی ہیں۔ بندوں کے یاد کرنے اور خدا کے یاد کرنے سے کیا مراد، اس سلسلے میں بہت سے مفاہیم بیان کئے گئے ہیں جنہیں تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے دس موضوعات کے تحت جمع کیا ہے:

۱۔ مجھے اطاعت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں اپنی رحمت کے ذریعے تمہیں یاد کروں۔ اس مفہوم کی شاہد سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۲ ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

۲۔ مجھے دعا کے ساتھ یاد کرو تاکہ میں تمہیں اجابت کے ساتھ یاد کروں۔ اس کی شاہد سورہ مومن کی آیت ۶۰ ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

أُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔

مجھ سے دعا کرو تو میں قبول کروں گا۔

۳۔ مجھے ثنا و طاعت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہیں ثنا و نعمت سے یاد کروں۔

۴۔ مجھے دنیا میں یاد کرو تاکہ میں تمہیں آخرت میں یاد کروں۔

۵۔ مجھے خلوتوں میں یاد کرو تاکہ میں تمہیں اجتماعات میں یاد کروں۔

۶۔ مجھے نعمتوں کی فراوانی کے وقت یاد کرو میں تمہیں سختیوں میں یاد کروں گا۔

۷۔ مجھے عبادت کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہاری مدد کروں۔ اس کا شاہد سورہ الحمد کا یہ جملہ ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

۸۔ مجھے مجاہدت و کوشش کے ذریعے یاد کرو تاکہ میں تمہیں ہدایت کے ذریعے یاد کروں۔ اس کی شاہد سورۂ عنکبوت کی آیہ وہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ

جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

۹۔ مجھے صدق و اخلاص سے یاد کرو میں تمہیں نجات اور مزید خصوصیت سے یاد کروں گا۔

۱۰۔ میری ربوبیت کا تذکرہ کرو میں رحمت کے ساتھ یاد کروں گا (ساری سورۂ حمد اس معنیٰ کی شاہد بن سکتی ہے)۔[1]

ان میں سے ہر مفہوم آیت کے وسیع جلووں میں سے ایک جلوہ ہے اور زیر نظر آیت میں یہ تمام مفاہیم بلکہ ان کے علاوہ بھی مطالب شامل ہیں مثلاً:

مجھے شکر کے ساتھ یاد کرو تاکہ میں تمہیں فراوانیٔ نعمت سے یاد کروں۔ سورہ ابراہیم کی آیہ ۷ میں ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ

اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بے شک خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ تکوینی و تربیتی اثر رکھتی ہے۔ یاد خدا سے یہ اثر انسان تک پہنچتا ہے اور ان توجہات کے نتیجے میں روح و جان ان برکات کے نزول کی استعداد پیدا کر لیتی ہے جن کا تعلق یاد خدا سے ہے۔

(۱) ذکر خدا کیا ہے: یہ مسلم ہے کہ ذکر خدا سے مراد صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ زبان تو دل کی ترجمان ہے یعنی دل و جان سے اس کی ذات پاک کی طرف توجہ رکھا کرو۔ وہ توجہ جو انسان کو گناہ سے باز رکھے اور اس کے حکم کی اطاعت کے لئے آمادہ کرے۔ اسی بناء پر متعدد احادیث میں پیشوایانِ اسلام سے منقول ہے کہ ذکر خدا سے مراد عملی یاد آوری ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؑ کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ثلاث لا تطیقها هذه الامة: المؤاساة للاخ فی ماله وانصاف الناس من نفسه و ذکر الله علی کل حال ولیس هو سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر ولکن اذا ورد علی ما یحرم الله علیه خاف الله تعالیٰ عنده وترکه۔

تین کام ایسے ہیں جو یہ امت (مکمل طور پر) انجام دینے کی توانائی نہیں رکھتی: اپنے مال میں دینی بھائی کے ساتھ مواسات و برابری، اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں عادلانہ فیصلہ

---

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی، ج ۴، ص ۱۴۴ (مختصر تغییر اور کچھ اضافے کے ساتھ)۔

اور خدا کو ہر حالت میں یاد رکھنا اور اس سے مراد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی فعل حرام اس کے سامنے آئے تو خدا سے ڈرے اور اسے ترک کر دے[1]

۱۵۳۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝

۱۵۴۔ وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۳۔ اے ایمان والو! (زندگی کے سخت ترین حوادث کے موقع پر) صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ (کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

۱۵۴۔ جو راہِ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو، وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔

شانِ نزول

زیرِ نظر دوسری آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بعض مفسرین نے ابنِ عباس سے اس طرح نقل کیا ہے:

یہ آیت جنگ بدر میں قتل ہونے والوں کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ ان کی تعداد چودہ تھی۔ چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بعض لوگ اس طرح گفتگو کرتے کہ فلاں مر گیا — اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ شہداء کے لئے مردہ و میت کہنا صحیح نہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں تعلیم و تربیت اور ذکر و شکر کے متعلق گفتگو تھی۔ ان کے وسیع تر مفہوم جس میں اکثر دینی احکام شامل ہیں کو سامنے رکھتے ہوئے محل بحث پہلی آیت میں صبر و استقامت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جس کے بغیر گذشتہ مفاہیم کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔

پہلے فرمایا: اے ایمان والو! صبر و استقامت اور نماز سے مدد حاصل کرو (یایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ) اور ان دو قوتوں (استقامت اور خدا کی طرف توجہ) کے ساتھ مشکلات و سخت حوادث سے جنگ کے لئے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص۱۴۷ بحوالہ کتاب خصال۔

آگے بڑھو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (ان اللہ مع الصٰبرین)۔
بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صبر کا معنیٰ ہے بدبختیوں کو گوارا کرنا۔ اپنے آپ کو ناگوار حوادث کے سپرد کرنا اور عوامل شکست کے سامنے ہتھیار ڈال دینا لیکن صبر کا مفہوم اس کے برعکس ہے۔ صبر و شکیبائی کا معنی ہے ہر مشکل اور حادثے کے سامنے استقامت۔ اسی لئے بعض علماء اخلاق نے صبر کے تین پہلو بیان کئے ہیں۔

۱۔ اطاعت پر صبر (ان مشکلات کے مقابلے میں صبر کرنا جو اطاعت کی راہ میں پیش آئیں)۔
۲۔ گناہ پر صبر (سرکش و طغیان خیز گناہ اور شہوات پر ابھارنے والے اسباب کے مقابلے میں قیام کرنا)۔
۳۔ مصیبت پر صبر (ناگوار حوادث کے مقابلے میں ڈٹے رہنا، پریشان نہ ہونا اور حوصلہ نہ ہارنا)۔

ایسے موضوعات بہت کم ہیں جن کی صبر و استقامت کی طرح قرآن مجید میں تکرار و تاکید ہے۔ قرآن مجید میں تقریباً ستر مرتبہ صبر کے متعلق گفتگو ہوئی جن میں دس مقامات خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔
بڑے بڑے جوانمردوں کے حالات زندگی گواہ ہیں کہ ان کی کامیابی کا اہم ترین یا واحد عامل صبر تھا جو لوگ اس خوبی سے بے بہرہ ہیں وہ بہت سے مصائب و آلام میں شکست کھا جاتے ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی پیش رفت اور ترقی میں جس قدر کردار صبر ادا کرتا ہے۔ اتنا اسباب، استعداد اور ہوشیاری کا عمل دخل نہیں۔
اسی بناء پر قرآن مجید میں نہایت تاکیدی انداز سے اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن ایک مقام پر کہتا ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝

صابرین بے حساب اجر و جزا حاصل کریں گے (زمر ۔ ۱۰)

ایک اور مقام پر حوادث پر صبر کرنے کے بارے میں ہے:

ان ذلک من عزم الامور

یہ محکم ترین امور میں سے ہے۔

• در اصل استقامت اور پامردی انسان کے بلند ترین فضائل میں سے ہے اور اس کے بغیر باقی فضائل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسی لئے نہج البلاغہ میں ہے:

علیکم بالصبر فان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد ولا خیر فی جسد لا رأس معه ولا فی ایمان لا صبر معه۔

صبر و استقامت تمہارے لئے لازمی ہے کیونکہ ایمان کے لئے صبر کی وہی اہمیت ہے جو بدن کے لئے سر کی، جیسے سر کے بغیر بدن کا کوئی فائدہ نہیں ایسے ہی صبر کے بغیر ایمان میں کوئی پائیداری نہیں اور نہ اس کا کوئی نتیجہ ہے۔[1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۸۲۔

اسلامی روایات میں صبر کو اس لئے اعلیٰ ترین قرار دیا گیا ہے تاکہ انسان گناہ کے وسائل مہیا ہونے کے باوجود استقامت دکھائے اور لذتِ گناہ سے آنکھیں بند کرے۔

ابتدائی انقلابی مسلمان چاروں طرف سے طاقت ور، خونخوار اور بے رحم دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے لہٰذا محلِ بحث آیت میں انہیں خصوصیت سے حکم دیا گیا کہ مختلف حوادث کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیں۔ خدا پر ایمان کی صورت میں نتیجہ شخصی استقلال، اعتماد اور اپنی مدد آپ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام نے اس حقیقت کی بڑی وضاحت سے نشاندہی کی ہے کہ یہی تمام کامیابیوں کی حقیقی بنیاد تھی۔

دوسری چیز جو مندرجہ بالا آیت میں صبر کے ساتھ خصوصی اہمیت سے متعارف کرائی گئی ہے نماز ہے۔ اسی لئے اسلامی احادیث میں ہے:

كان عليٌ اذا اهاله امر فزع قام الى الصلوٰة ثم تلى هذه الآية واستعينوا بالصبر والصلوٰة۔

حضرت علیؑ کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور نماز کے بعد اس مشکل کو حل کرنے کے لئے نکلتے اور اس آیت کی تلاوت کرتے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ [1]

اس بات پر بالکل تعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ جب انسان ایسے سخت حوادث اور ناقابل برداشت مشکلات سے دوچار ہو تو وہ ان کے سامنے اپنی طاقت اور استطاعت کو ناچیز سمجھتا ہے اور قہراً وہ ایک ایسے سہارے کا محتاج ہوتا ہے جو ہر جہت سے غیر محدود اور لامتناہی ہو۔ نماز انسان کو ایسے ہی مبداء سے مربوط کر دیتی ہے اور اس کا سہارا پا کر انسان مطمئن دل سے آسانی کے ساتھ مشکلات کی خوفناک موجوں کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔

اسی لئے مندرجہ بالا آیت میں دراصل دو اصول سکھائے گئے ہیں ایک خدا پر بھروسہ کرنا جس کی طرف نماز اشارہ کرتی ہے اور دوسرا اپنی مدد آپ اور اپنے آپ پر اعتماد جسے صبر کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

پامردی، صبر اور استقامت کے مسئلے کے بعد دوسری آیت میں شہداء کی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس کا صبر و استقامت سے قریبی ربط ہے۔

پہلے ان لوگوں (شہداء) کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے فرمایا: جو راہِ خدا میں قتل ہوں اور شربتِ شہادت نوش کر لیں انہیں کبھی مردہ نہ کہو (ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات) اس کے بعد مزید تاکید سے فرمایا: بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور و ادراک نہیں رکھتے (بل احیاء ولکن لا تشعرون)۔

عموماً ہر تحریک میں ایک گروہ بزدل اور راحت طلب لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ایک طرف لے جاتا ہے اور کنارہ کش رہتا ہے۔ یہ لوگ اتنا ہی نہیں کرتے کہ خود کام نہ کریں بلکہ دوسروں کو بھی بد دل کرنے کی کوشش کرتے

---

[1] المیزان، ج ۱، ص ۱۵۲، بحوالہ کتاب کافی۔

ہیں۔ جب بھی کوئی ناخوشگوار حادثہ رونما ہوتا ہے تو یہ لوگ اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور اسے اس تحریک اور قیام کیلئے بے فائدہ اور بے صرف ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ اس سے غافل ہیں کہ آج تک کوئی مقدس مقصد اور گراں قدر مشن قربانی یا قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہوا اور یہ اس دنیا کی ایک سنت رہی ہے۔ قرآن کریم بارہا ایسے لوگوں کے متعلق بات کرتا ہے اور انہیں سخت سرزنش اور ملامت کرتا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کا ایک گروہ ابتدائے اسلام میں بھی تھا۔ جب کوئی شخص میدانِ جہاد میں شہادت کی سعادت حاصل کرتا تو یہ لوگ کہتے فلاں مرگیا اور اس کے مرنے پر اظہار افسوس کرکے دوسروں کے اضطراب کا سامان کرتے۔ خداوند عالم ایسی زہریلی گفتگو کے جواب میں ایک عظیم حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے اور صراحت سے کہتا ہے کہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کو مردہ کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں اور بارگاہِ خدا سے معنوی غذا اور روزی حاصل کرتے ہیں، ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور وہ اپنی کامیاب سرنوشت سے مکمل طور پر خوش و خرم ہیں لیکن تم لوگ جو عالم مادہ کی محدود چار دیواری میں محبوس و مقید ہو ان حقائق کا ادراک نہیں کرسکتے۔

چند اہم نکات

(۱) شہداء کی ابدی زندگی: شہداء کی زندگی کیسی ہے اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اہم ترین اختلاف یہ ہے کہ شہداء ایک طرح کی برزخی اور روحانی زندگی رکھتے ہیں کیونکہ ان کا جسم تو عموماً منتشر ہوجاتا ہے۔ امام صادقؑ کے ارشاد کے مطابق ان کی زندگی ایک مثالی جسم کے ساتھ ہے (وہ بدن جو عام مادے سے ماوراء ہے) لیکن اس بدن کے مشابہ ہے جس کی تفصیل سورہ مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں آئے گی جس میں فرمایا گیا ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔[1]

بعض مفسرین اسے شہداء کے ساتھ مخصوص ایک غیبی زندگی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس زندگی کی کیفیت اور انداز کا زیادہ علم نہیں رکھتے۔

کچھ مفسرین اس مقام پر حیات کو ہدایت اور موت کو جہالت کے معنی میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت کا معنی ہے کہ جو شخص راہ خدا میں قتل ہوجائے اسے گمراہ نہ کہو بلکہ وہ ہدایت یافتہ ہے۔

بعض شہداء کی دائمی زندگی کا مفہوم یہ قرار دیتے ہیں کہ ان کا نام اور مقصد زندہ رہے گا۔

جو تفسیر ہم بیان کرچکے ہیں اس کی طرف نظر کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کوئی احتمال بھی قابل قبول نہیں نہ اس کی ضرورت ہے کہ مجازی معنی میں آیت کی تفسیر کی جائے اور نہ برزخ کی زندگی کو شہداء سے مخصوص قرار دینے کی ضرورت ہے بلکہ شہداء ایک خاص قسم کی برزخی اور روحانی زندگی کے حامل ہیں انہیں رحمتِ پروردگار کی قربت

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۵۵۹۔ سورہ مومنون آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں۔

کا امتیاز حاصل ہے اور وہ طرح طرح کی نعمات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

(۱۱) مکتب شہید پرور، مسئلہ شہادت کی زیر نظر آیت اور قرآن کی دیگر آیات کے ذریعے اسلام نے ایک نہایت اہم اور تازہ عامل کے لئے میدان تیار کیا ہے۔ یہ وہ عامل ہے جس سے حق کے لئے باطل کے مقابلے میں جنگ کی سکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسا عامل ہے جس کی کارکردگی ہر قسم کے ہتھیار سے بڑھ کر ہے اور یہ ہر چیز سے زیادہ اثرانگیز ہے۔ یہ عامل ہر دور کے خطرناک ترین اور وحشتناک ترین ہتھیاروں کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے ملک ایران میں انقلاب اسلامی کی پوری تاریخ میں بڑی وضاحت سے دیکھی ہے کہ عشق شہادت ہر قسم کے ظاہری اسباب کی کمی کے باوجود مجاہدین اسلام کی کامیابی کا عامل بنا۔

اگر ہم تاریخ اسلام اور ہمیشہ رہنے والے انقلابات میں اسلامی جہاد اور مجاہدین کے ایثار و قربانی کی تفصیلات پر غور کریں جنہوں نے اپنے پورے وجود سے اس دین پاک کی سربلندی کے لئے جانفشانی دکھائی ہے، تو ہمیں نظر آئے گا کہ ان تمام کامیابیوں کی ایک اہم وجہ اسلام کا یہ عظیم درس ہے کہ راہ خدا اور طریق حق و عدالت میں شہادت کا معنی فنا، نابودی اور مرنا نہیں بلکہ اس کا مطلب ہمیشہ کی زندگی اور ابدی افتخار و اعزاز ہے۔

جن مجاہدین نے اس مکتب عظیم سے ایسا درس یاد کیا ہے ان کا مقابلہ کبھی عام جنگجوؤں سے نہیں کیا جا سکتا۔ عام سپاہی اپنی جان کی حفاظت کی فکر میں رہتا ہے لیکن حقیقی مجاہد کا منشاء اپنے مکتب کی حفاظت ہوتا ہے اور وہ پروانہ وار جان دیتا، قربان ہوتا اور فخر کرتا ہے۔

(۱۱۱) برزخ کی زندگی اور روح کی بقاء: اس آیت سے انسان کی حیات برزخ (موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کی زندگی) کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے جواب ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کی بقاء اور برزخ کی زندگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی۔

اس موضوع کی مزید تشریح، شہدا کی حیات جاوداں، خدا کے ہاں اس کا بدلہ اور راہ خدا میں قتل ہونے والوں کا عظیم مرتبہ تفسیر نمونہ جلد سوم (سورہ آل عمران آیہ ۱۶۹ کے ذیل) میں پڑھیے گا۔

۱۵۵۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۙ

۱۵۶۔ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

۱۵۷۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُهْتَدُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۵۔ یقیناً ہم تم سب کی خوف، بھوک، مالی و جانی نقصان اور پھلوں کی کمی جیسے امور سے آزمائش کریں گے اور صبر و استقامت دکھانے والوں کو بشارت دیجئے۔

۱۵۶۔ وہ جنہیں جب کوئی مصیبت آپہنچے تو کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ جائیں گے۔

۱۵۷۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ الطاف و رحمتِ الٰہی جن کے شامل حال ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

طرح طرح کی خدائی آزمائش

راہِ خدا میں شہادت، شہداء کی ابدی زندگی اور صبر و شکر جن میں سے ہر ایک خدائی آزمائش کے مختلف رُخ ہیں کے ذکر کے بعد اس آیت میں بطور کلی آزمائش اور اس کی مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے یقینی اور غیر مبدل ہونے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ امر مسلم ہے کہ ہم تمہیں چند ایک امور مثلاً خوف، بھوک، مالی جانی نقصان اور پھلوں کی کمی کے ذریعے آزمائیں گے (ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات)۔

چونکہ ان امتحانات میں کامیابی صبر و پائیداری کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا: اور بشارت دیجئے صبر و استقامت دکھانے والوں کو (وبشر الصٰبرین)۔

اور یہ ایسے افراد ہیں جو ان سخت آزمائشوں سے خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ انہیں بشارت دینا چاہیئے۔ باقی رہے سست مزاج اور بے استقامت لوگ تو وہ آزمائشوں کے مقامات سے روسیاہ ہو کر واپس آتے ہیں۔ بعد کی آیت صابرین کے بارے میں زیادہ تشریح کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے اشخاص ہیں کہ جب کسی مصیبت کا سامنا کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم خدا کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے (الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اس حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے کہ ہم اس کے لئے ہیں ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ نعمات زائل ہونے سے ہمیں کوئی دکھ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ تمام نعمتیں بلکہ خود ہمارا وجود اس سے تعلق رکھتا ہے۔ آج وہ ہمیں کوئی چیز بخشتا ہے اور کل واپس لے لیتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔

اس واقعیت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ ہم سب اسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جائیں گے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔ ان نعمتوں کا زوال اور ان عطیات کی کمی بیشی سب کچھ بہت جلد گذر جانے والی چیزیں ہیں اور یہ تکامل کا ذریعہ ہیں لہٰذا ان دو بنیادی اصولوں کی طرف توجہ کرنا صبر و استقامت کے جذبے کو بہت تقویت بخشتا

ہے۔
واضح ہے انا للہ و انا الیہ راجعون سے مراد صرف زبانی ذکر نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور روح کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اس کے مفہوم میں توحید و ایمان کی ایک دنیا آباد ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں عظیم امتحانات میں صبر کرنے والوں اور پامردی دکھانے والوں کے لئے خدا تعالیٰ کے عظیم لطف و کرم کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا لطف و کرم اور درود و صلوات ہے (اولٰئک علیھم صلوات من ربھم و رحمۃ)[1]۔

یہ الطاف اور رحمتیں انہیں قوت بخشتی ہیں کہ وہ اس پر خوف و خطر راستے میں اشتباہ اور انحراف میں گرفتار نہ ہوں۔

لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا: اور وہی ہدایت یافتہ ہیں (و اولٰئک ھم المھتدون)۔

ان چند آیات میں خدا کی طرف سے عظیم امتحان اور اس کے مختلف رخ نیز کامیابی کے عوامل اور امتحان کے نتائج کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) خدا لوگوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے: آزمائش اور امتحان کے مسئلے پر بہت گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے پہل جو سوال ذہن میں ابھرتا ہے یہ ہے کہ کیا آزمائش اور امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو چیزیں غیر واضح ہیں وہ واضح ہو جائیں اور ہماری جہالت و نادانی کے پڑدے میں کمی ہو سکے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر خداوند عالم جس کا علم تمام چیزوں پہ محیط ہے اور جو ہر شخص اور ہر شے کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین و آسمان کے غیوب کو اپنے بے پایاں علم سے جانتا ہے، کیوں امتحان لیتا ہے۔ کیا کوئی چیز اس سے مخفی ہے جو امتحان کے ذریعے آشکار ہو جائے گی۔

اس اہم سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیئے۔

آزمائش اور امتحان کا مفہوم خدا کے بارے میں اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو ہمارے درمیان مروج ہے۔ ہماری آزمائشوں کا مقصود وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی مزید معلومات حاصل کرنا اور ابہام و جہل کو دور کرنا لیکن خدا کی آزمائش درحقیقت پرورش و تربیت ہی کا دوسرا نام ہے جس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآن میں بیس سے زیادہ مقامات پر امتحان کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ یہ ایک قانون کلی ہے اور پروردگار کی جاری سنت ہے کہ وہ پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے (جسے قوت سے فعل تک پہنچنے کا عمل کہتے ہیں)۔ وہ بندوں کو

---

[1] المنار کا مؤلف لکھتا ہے کہ صلوات سے مراد بہت زیادہ تکریم، کامیابیاں، خدا کے ہاں مقام بلند اور بندگان خدا میں سربلندی ہے اور ابن عباس سے منقول ہے کہ اس سے مراد گناہوں کی بخشش ہے (المنار، ج ۲، ص ۴۰) لیکن واضح ہے کہ صلوات کا مفہوم وسیع ہے اس میں یہ تمام امور، رحمت کا سایہ اور نعمات الٰہی بھی شامل ہیں۔

تربیت دینے کے لئے آزماتا ہے جیسے فولاد کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اسے آب دینا کہتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ آدمی کو شدید حوادث کی بھٹی میں پرورش و تربیت کے لئے ڈالتا ہے اور اسے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

دراصل خدا کا امتحان اس تجربہ کار باغبان کی مانند ہے جو مستعد دانوں کو تیار زمینوں میں ڈالتا ہے۔ یہ دانے طبیعی عطیات سے استفادہ کرتے ہوئے نشوونما پاتے ہیں اور آہستہ آہستہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں، حوادث سے برسرپیکار رہتے ہیں اور سخت طوفان، کمر توڑ سردی اور جلا دینے والی گرمی کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاخوں پر خوبصورت پھول کھلتے ہیں یا وہ تنومند اور پرثمر درخت بن جاتے ہیں۔

فوجی جوانوں کو جنگی نقطۂ نظر سے طاقت ور بنانے کے لئے مصنوعی جنگ مشقیں کرائی جاتی ہیں اور انہیں طرح طرح کی مشکلات بھوک، پیاس، گرمی، سردی، دشوار حوادث اور سخت مسائل سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ قوی اور پختہ کار ہو جائیں۔ خدا کی آزمائشوں کی رمز بھی یہی ہے۔

قرآن مجید ایک مقام پر اس حقیقت کی تصریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

جو تمہارے سینوں میں ہے خدا اس کی آزمائش کرتا ہے تاکہ تمہارے دل مکمل طور پر خالص ہو جائیں اور وہ تمہارے سب اندرونی رازوں سے واقف ہے۔ (آل عمران۔ ۱۵۴)

حضرت امیرالمؤمنین علیؑ نے امتحانات الٰہی کی بڑی پُرمغز تعریف فرمائی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

وان کان سبحانہ اعلم بھم من انفسھم ولکن لتظھر الافعال التی بھا یستحق الثواب والعقاب

اگرچہ بندوں کی نفسیات خود ان سے زیادہ جانتا ہے۔ پھر بھی انہیں آزماتا ہے تاکہ اچھے اور برے کام ظاہر ہوں جو جزا و سزا کا معیار ہیں [1]

یعنی انسان کی اندرونی صفات ہی ثواب و عقاب کا معیار نہیں جب تک کہ وہ انسان کے عمل و کردار سے ظاہر نہ ہوں۔ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے تاکہ جو کچھ ان کی ذات میں پنہاں ہے وہ عمل میں آجائے اور استعداد، قوت سے فعل تک پہنچ جائے اور یوں وہ جزا یا سزا کا مستحق ہو جائے۔ اگر خدا کی آزمائش نہ ہوتی تو یہ استعدادیں ظاہر نہ ہوتیں اور انسانی شجر کی شاخوں پر اعمال کے پھل نہ لگتے۔ اسلامی منطق میں یہی خدائی آزمائش کا فلسفہ ہے۔

(۱۱) خدا کی آزمائش ہمہ گیر ہے: جہانِ ہستی کا نظام چونکہ تکامل، پرورش اور تربیت کا نظام ہے اور تمام موجودات تکامل کے سفر میں ہیں۔ درخت اپنی مخفی استعداد پھل کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں تو سمندر کی لہریں طرح

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۹۳

طرح کی معدنیات کو ظاہر کرتی ہیں جس سے سمندر کی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

اس عمومی قانون کے مطابق انبیاء سے لے کر عامۃ الناس تک تمام لوگوں کی آزمائش ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی استعداد ظاہر کریں۔ خدا کے امتحانات کی مختلف صورتیں ہیں بعض مشکل ہیں اور بعض آسان ہیں لہٰذا ان کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بہر حال آزمائش اور امتحان سب کے لئے ہے۔

قرآن مجید انسانوں کے عمومی امتحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○

کیا لوگوں کا گمان ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ (عنکبوت۔ ۲)

قرآن نے انبیاء کے امتحانات کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ

خدا نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ (بقرہ۔ ۱۲۴)

ایک اور مقام پر ہے:

فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ

جب سلیمانؑ کے ہیرو کار نے پلک جھپکنے میں دور کی مسافت سے تخت بلقیس حاضر کر دیا تو سلیمانؑ نے کہا یہ لطف خدا ہے تاکہ میرا امتحان کرے کہ کیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں۔ (سورۂ نمل۔ ۴۰)

(iii) **آزمائش کے طریقے:** مندرجہ بالا آیت میں ان امور کے چند نمونے بیان ہوئے ہیں جن سے انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ ان میں خوف، بھوک، مالی نقصان، جان دینا شامل ہیں لیکن آزمائش انہی طریقوں میں منحصر نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی قرآن میں الٰہی آزمائش کے کچھ طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً اولاد، انبیاء، احکام الٰہی حتٰی کہ بعض خواب بھی آزمائش ہی کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح تمام نیکیاں اور برائیاں بھی خدائی آزمائشوں میں شمار ہوتی ہیں:

وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ (انبیاء۔ ۳۵)

اس بناء پر زیر نظر آیت میں امتحانات کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ انہی پر بس نہیں بلکہ یہ خدائی آزمائشوں کے واضح نمونے ہیں۔

ظاہر ہے کہ امتحانات کے نتیجے میں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے ایک جو امتحانات میں کامیاب ہو جائے گا اور دوسرا جو رہ جائے گا۔ مثلاً اگر کہیں مرحلۂ خوف درپیش ہو تو ایک گروہ اپنے تئیں اس سے دور رکھتا ہے تاکہ اُسے کوئی تھوڑا سا ضرر بھی نہ پہنچے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسئولیت اور جواب دہی سے بچتے ہیں۔ دوستی کے وسیلے نکال کر یا بہانے بنا کر جنگوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ان کی بات نقل کی گئی ہے:

نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ ؕ

ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی ضرر نہ پہنچے۔ (مائدہ۔ ۵۲)

یہ کہہ کر وہ خدائی ذمہ داری سے روگردانی کر لیتے ہیں۔

کامیاب ہونے والے وہ لوگ ہیں جو خوف کے عالم میں ڈٹے رہتے ہیں اور ایمان و توکل کے ساتھ بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو جانثاری کے لیے پیش کرتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۝

جب لوگ اہل ایمان سے کہتے تھے کہ حالات خطرناک ہیں اور تمہارے دشمن تیار ہیں تم عقب نشین ہو جاؤ تو ان کے ایمان و توکل میں اضافہ ہو جاتا اور وہ کہتے ہمارے لئے خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔ (آل عمران۔ ۱۷۳)

مشکلات اور آزمائشی عوامل جن کا ذکر زیر بحث آیت میں آیا ہے مثلاً بھوک اور مالی و جانی نقصان، ان میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس سلسلے کے کچھ نمونے متن قرآن میں آئے ہیں جنہیں اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

(۱۷) آزمائشوں میں کامیابی کا راز: یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام انسان ایک وسیع خدائی امتحان میں شریک ہیں تو ان میں کامیابی کا راستہ کونسا ہے۔

محل بحث آیت اس سوال کا جواب دیتی ہے اور قرآن کی کئی ایک دیگر آیات بھی اس مسئلے کو واضح کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں اہم ہیں جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ امتحانات میں کامیابی کے لئے پہلا قدم وہی ہے جو اس چھوٹے سے پر معنی جملے میں بیان کیا گیا ہے: وبشر الصٰبرین۔ یہ جملہ صراحت کرتا ہے کہ اس راہ میں صبر و استقامت کامیابی کی رمز ہے اسی لئے صابرین اور با استقامت لوگوں کو کامیابی کی بشارت دی جا رہی ہے۔

۲۔ اس جہان کے حوادث، سختیاں اور مشکلیں گزر جانے والی ہیں اور یہ دنیا گزرگاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس امر کی طرف توجہ کامیابی کا دوسرا عامل ہے۔ جسے اس جملے میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

ہم خدا کے لئے ہیں اور ہماری بازگشت اسی کی طرف ہے۔

اصولی طور پر یہ جملہ جسے "کلمہ استرجاع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انقطاع الی اللہ یعنی تمام چیزوں اور تمام اوقات میں اس کی ذات پاک پر بھروسہ کرنا، کے عالی ترین درس کا نچوڑ ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بزرگان دین بڑے بڑے مصائب کے وقت قرآن سے الہام لیتے ہوئے یہ جملہ زبان پر جاری کرتے تھے تو یہ اس لئے ہوتا تھا کہ مصائب کی شدت انہیں ہلا نہ سکے اور خدا کی مالکیت اور تمام موجودات کی اس کی طرف بازگشت پر ایمان کے نتیجے میں وہ ان تمام حوادث کو گوارا کر لیں اور با استقامت رہیں۔

امیرالمومنین علیؑ اس جملے کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

ان قولنا "انا للہ" اقرار علی انفسنا بالملک وقولنا "وانا الیہ راجعون" اقرار علی انفسنا بالھلک۔

یہ جو ہم کہتے ہیں" انا للہ " تو یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اس کی ملکیت ہیں اور یہ جو کہتے ہیں" وانا الیہ راجعون" تو یہ اس کا اقرار ہے کہ ہم فنا اور ہلاک ہو جائیں گے۔

۲۔ قوت الٰہی اور الطاف الٰہی سے مدد طلب کرنا ایک اور اہم عامل ہے کیونکہ عام لوگ جب حوادث سے دوچار ہوتے ہیں تو توازن برقرار نہیں رکھ پاتے اور اضطراب میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن خدا کے دوستوں کا چونکہ واضح پروگرام اور ہدف ہوتا ہے لہٰذا وہ متحیر اور سرگرداں ہونے کی بجائے اطمینان و آرام سے اپنی راہ چلتے رہتے ہیں اور خدا بھی انہیں زیادہ روشن بینی عطا فرماتا ہے تاکہ انہیں صحیح راستے کے انتخاب میں اشتباہ نہ ہو جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ

جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

(عنکبوت۔ ۶۹)

۳۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ پر نظر رکھنا اور ان کے حالات کو سمجھنا خدائی آزمائشوں میں روح انسانی کی آمادگی اور ان امتحانوں میں کامیابی کے لئے بہت مؤثر ہے۔

انسان درپیش آنے والے مسائل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے تو ان سے مقابلے کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے لیکن اگر اس حقیقت کی طرف توجہ دی جائے کہ تاریخ کے طویل دور میں سب اقوام کے لئے تمام طاقت فرسا مشکلات اور خدا کی سخت آزمائشیں موجود رہی ہیں تو ہر قوم شکست کے امتحانات کا نتیجہ انسان کی استقامت میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

اسی بنا پر قرآن مجید پیغمبر کو رغبت دلانے نیز ان کی اور مومنین کی روحانی تقویت کے لئے گزشتہ لوگوں کی تاریخ اور ان کی زندگی کے دردناک حوادث کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے :

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ

اگر آپ سے طنز و استہزاء کیا جاتا ہے تو گھبرائیے نہیں گزشتہ پیغمبروں سے بھی جاہل لوگ ایسا کرتے رہے ہیں۔ (انعام۔ ۱۰)

ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا

اگر آپ کی تکذیب کی جاتی ہے تو تعجب کی بات نہیں۔ گزشتہ انبیاء کی بھی تکذیب کی گئی ہے لیکن انہوں نے مخالفین کی اس تکذیب کے مقابلے میں اور جب انہیں آزار و تکلیف پہنچائی گئی پامردی و استقامت دکھائی۔ آخر کار ہماری نصرت و مدد ان تک آپہنچی۔ (انعام۔ ۳۴)

۵۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا کہ یہ تمام حوادث خدا کے سامنے رونما ہو رہے ہیں اور وہ تمام امور سے آگاہ ہے پائیداری کے لئے ایک اور عامل ہے۔ جو لوگ کسی سخت مقابلے میں شریک ہوں جب انہیں احساس ہو کہ ہمارے کچھ دوست میدانِ مقابلہ کے اطراف میں موجود ہیں، مشکلات برداشت کرنا اُن کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ شوق و ذوق سے مشکلات کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

جب چند تماشائیوں کا وجود روحِ انسانی کو اتنا متاثر کر سکتا ہے تو اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا کہ خداوند عالم میدانِ آزمائش میں میری کاوشوں کو دیکھ رہا ہے، اس جہاد کو جاری رکھنے کے لئے کس قدر عشق و ولولہ پیدا کرے گا۔

قرآن کہتا ہے: جب حضرت نوحؑ کو اپنی قوم کی طرف سے نہایت سخت ردِعمل کا سامنا ہُوا تو انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا گیا۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا

ہمارے سامنے کشتی بناؤ۔ (ہود۔ ۳۷)

باعیننا (ہمارے علم کی آنکھوں کے سامنے) اس لفظ نے حضرت نوحؑ کو اس قدر قلبی قوت عطا کی کہ دشمنوں کا سخت رویہ اور استہزاء ان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہ کر سکا۔

سید الشہداء، مجاہدینِ راہِ خدا کے سردار حضرت امام حسینؑ سے یہی مفہوم منقول ہے۔ میدانِ کربلا میں جب آپؑ کے کچھ عزیز دردناک طریقے سے جامِ شہادت نوش کر چکے تو آپؑ نے فرمایا:

هون علی ما نزل بی انه بعین الله

میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ علمِ خدا کی نگاہوں کے سامنے انجام پا رہا ہے لہذا انہیں برداشت کرنا میرے لئے آسان ہے۔[1]

(۶) نعمت و بلا کے ذریعے امتحان: یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے کہ خدا کے امتحانات ہمیشہ سخت اور ناگوار حوادث کے ذریعے ہی ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات خدا فراواں نعمتوں اور زیادہ کامیابیوں کے ذریعے بھی اپنے بندوں کو آزماتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ

اور ہم تمہارا امتحان برائیوں اور اچھائیوں کے ذریعے لیں گے۔ (انبیاء۔ ۳۵)

ایک اور مقام پر حضرت سلیمانؑ کا قول ہے:

هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ

یہ میرے پروردگار کا فضل ہے۔ وہ چاہتا ہے مجھے آزمائے کہ میں اس نعمت پر اس کا شکر بجالاتا

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۵ ص ۴۶

ہوں کہ کفرانِ نعمت کرتا ہوں۔ (نمل - ۴۰)

چند دیگر نکات بھی اس مقام پر قابلِ توجہ ہیں:

(ا) یہ ضروری نہیں کہ سب لوگوں کو سب طریقوں سے آزمایا جائے بلکہ ممکن ہے ہر گروہ کا ایک چیز سے امتحان ہو کیونکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر حالات اور طبائع کا لحاظ ضروری ہے۔

(ب) ہو سکتا ہے کہ ایک انسان کچھ امتحانات سے تو احسن طور پہ کامیاب ہو جب کہ کچھ امتحانات میں سخت ناکامی سے دوچار ہو۔

(ج) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا امتحان دوسرے شخص کے امتحان کا ذریعہ ہو۔ مثلاً خداوند عالم کسی کو اس کے فرزند دلبند کی مصیبت میں ڈال کر آزماتا ہے اور یہی آزمائش دوسروں کو بھی میدان امتحان میں لے آتی ہے کہ وہ اس سے ہمدردی کے تقاضے پورے کرتے ہیں یا نہیں اور مصیبت زدہ کے درد والم میں اس کی کمک کی کوشش کرتے ہیں یا نہیں۔

(د) جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے خدائی امتحانات ہمہ گیر ہوتے ہیں یہاں تک کہ انبیاء بھی ان سے مستثنیٰ نہیں بلکہ ان کی آزمائش، ان کی مسئولیت اور جوابدہی کی سنگینی کے پیش نظر دوسروں سے کئی گنا سخت ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی کئی سورتوں کی آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انبیاء میں سے ہر کوئی اپنے حصے کے مطابق آزمائشوں کی گرم بھٹی میں ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں بعض تو مقامِ رسالت پر فائز ہونے سے پہلے ایک طویل عرصہ تک مختلف آزمائشوں میں مبتلا رہے۔ تاکہ مکمل طور پر قوی ہو جائیں اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی تیاری مکمل کر لیں[1]

مکتب انبیاء کے پیروکاروں میں بھی میدان امتحان میں صبر و استقامت کی ایسی درخشاں مثالیں موجود ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن سکتی ہیں۔

ام عقیل ایک دیہاتی مسلمان عورت تھی۔ اُس کے پاس دو مہمان آئے۔ اُس وقت اس کا بیٹا اونٹوں کے ساتھ صحرا کی طرف گیا ہوا تھا۔ اسی وقت اسے اطلاع ملی کہ ایک غضب ناک اونٹ نے اس کے بیٹے کو کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور وہ مر گیا ہے۔ بیٹے کی موت کی خبر لانے والے شخص کو اس مومنہ نے کہا سواری سے اترآؤ اور مہمانوں کی پذیرائی میں میری مدد کرو۔ اس کے پاس ایک بھیڑ تھی اُس نے وہ اُس شخص کو ذبح کرنے کے لئے دی۔ کھانا تیار ہو گیا اور مہمانوں کے پاس رکھ دیا گیا۔ وہ کھانا کھاتے اور اس کے صبر و استقامت پر تعجب کرتے۔ حاضرین میں سے ایک شخص کہتا ہے جب ہم کھانا کھانے سے فارغ ہو لئے تو وہ مومنہ ہمارے پاس آئی اور پوچھنے لگی تم میں سے کوئی شخص ہے جو قرآن سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایک شخص کہنے لگا: جی ہاں، میں علم رکھتا ہوں۔ وہ کہنے لگی: قرآن کی کچھ ایسی آیات تلاوت کرو جو میرے بیٹے کی موت پر میرے دل کی تسلی کا باعث بنیں۔ وہ کہتا ہے: میں نے ان آیات کی تلاوت کی:

---

[1] مقام رسالت پر فائز ہونے سے پہلے یہاں مراد اعلانِ رسالت سے قبل ہے۔ (مترجم)

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۞

اس عورت نے ان سے رخصت چاہی اور پھر قبلہ رُخ کھڑی ہوگئی اور چند رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد بارگاہِ الٰہی میں یوں گویا ہوئی۔

اللّٰھم انی فعلت ما امرتنی فانجزلی ما وعدتنی

خدایا! میں نے وہ کچھ کیا جس کا تو نے حکم دیا ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور تو نے جس رحمت وصلوات کا وعدہ کیا ہے وہ مجھے عطا فرما۔

اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر ایسا ہوتا کہ کوئی اس جہاں میں کسی کے لئے زندہ رہ سکتا۔ حاضرین میں سے ایک کہتا ہے: میں نے سوچا کہے گی، میرا بیٹا میرے لئے رہ جاتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کہہ رہی ہے: پیغمبرِ اسلام اپنی امت کے لئے باقی رہ جاتے۔[1]

۱۵۸۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۞

ترجمہ

۱۵۸۔ صفا و مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو لوگ خانہ خدا کا حج کریں یا عمرہ بجا لائیں ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کریں (اور سعی کریں اور مشرکین نے غیر مناسب طور پر ان پر جو بُت نصب کر رکھے ہیں ان سے دونوں مقاماتِ مقدسہ کی عظمت و حیثیت میں ہرگز کوئی کمی نہیں ہوتی) اور جو لوگ حکمِ خدا کی بجا آوری کے لئے اعمالِ خیر بجا لائیں خدا ان کا قدردان ہے اور ان کے کردار سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

ظہورِ اسلام سے قبل اور اسی طرح بعد تک بت پرست مشرکین مناسکِ حج ادا کرنے مکہ آتے تھے اور وہ مراسم

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ ۔ (مادہ صبر)

رج جن کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی، ان کے ساتھ کچھ خرافات اور شرک آلود اعمال بھی بجالاتے تھے۔ مراسم حج میں عرفات میں قیام، قربانی، طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا شامل تھا لیکن ان اعمال کی صورت کافی بگڑ چکی تھی۔ اسلام نے پھر سے اس پروگرام کی اصلاح کی۔ صحیح اور شرک سے پاک مراسم کو تو باقی رکھا لیکن خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا۔ ان اعمال و مناسک میں جو انجام دیے جاتے تھے وہ مشہور پہاڑیوں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا، یعنی چلنا بھی شامل تھا۔

شیعہ اور اہل تسنن دونوں کی بہت سی روایات میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین نے کوہ صفا پر ایک بہت بڑا بت نصب کر رکھا تھا جس کا نام اساف تھا۔ کوہ مروہ پر ایک اور بت گاڑا گیا تھا۔ جس کا نام نائلہ تھا۔ سعی کرتے وقت وہ ان دونوں پہاڑیوں پر چڑھتے اور ان بتوں کو متبرک سمجھتے تھے مس کرتے۔ مسلمان اس وجہ سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا کوئی ٹھیک بات نہیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے بتایا کہ صفا و مروہ اللہ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں اگر کچھ نادان اور بیوقوف لوگوں نے انہیں بتوں کی نجاست سے آلودہ کر رکھا ہے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ مسلمان سعی جیسے فریضہ کو ترک کردیں۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی۔ کچھ روایات کی بناء پر عمرۃ القضا (سات ہجری) کے وقت نازل ہوئی۔ اس سفر میں پیغمبرؐ کی مشرکین کے ساتھ ایک شرط یہ تھی کہ وہ ان دونوں بتوں کو صفا و مروہ سے اٹھالیں گے انہوں نے اس شرط پر عمل کیا لیکن دوبارہ اسی جگہ نصب کردیا۔ اس وجہ سے بعض مسلمان صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اس آیہ شریفہ نے انہیں منع کیا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع (پیغمبر اکرمؐ کے آخری حج سنہ ۱۰ھ) کے موقع پر نازل ہوئی۔ اگر یہ احتمال تسلیم کرلیا جائے۔ تو دوسری طرف یہ بھی مسلم ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ صفا و مروہ پر کوئی بت نہ تھا بلکہ مکہ کے گرد و پیش کہیں بھی بتوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔

لہٰذا — قابل تسلیم بات یہ ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں مسلمانوں کی یہ ناراضی پہلے کی بات ہے جب اساف اور نائلہ بت ان پر رکھے ہوئے تھے۔

تفسیر

جاہلوں کے اعمال تمہارے مثبت اعمال میں حائل نہ ہوں

مخصوص نفسیاتی حالات میں یہ آیت نازل ہوئی، جن کا ذکر کیا جاچکا ہے پہلے تو مسلمانوں کو خبر دی گئی کہ صفا و مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں (ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ)۔

اس مقدمہ اور تمہید کے بعد نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا ہے، جو لوگ خانہ خدا کا حج یا عمرہ بجالائیں ان کیلئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان طواف اور سعی کریں (فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان

یطوف بھما) مشرکین نے غلط طور پر ان خدائی شعائر کو جو بتوں سے آلودہ کر رکھا ہے ان سے ان دو مقدس مقامات کی اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی ۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : جو لوگ اطاعتِ خدا کے لئے نیک کام انجام دیں تو خدا بھی شاکر و علیم ہے (ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم ـــــ)

اللہ تعالیٰ اطاعت اور نیک کاموں کی انجام دہی کے بدلے اچھے عوض کے ذریعے بندوں کے اعمال کی قدردانی کرتا ہے اور شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کی نیتوں سے اچھی طرح واقف ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ کون لوگ بتوں سے وابستگی رکھتے ہیں اور کون ان سے بیزار ہیں ۔

چند اہم نکات

(۱) صفا و مروہ : صفا و مروہ مکہ کی دو چھوٹی سی پہاڑیوں کے نام ہیں ۔ مسجد الحرام کی توسیع کے باعث آج کل یہ مسجد کے مشرقی حصے میں حجر الاسود اور مقام ابراہیم کی سمت میں واقع ہیں ۔

یہ دونوں پہاڑیاں ایک دوسرے سے تقریباً ۴۲۰ میٹر کے فاصلے پر ہیں ۔ اس وقت یہ فاصلہ ایک چھتے ہوئے بڑے ہال کی شکل میں ہے اور حجاج کرام اس چھت کے نیچے سعی کرتے ہیں ۔ صفا پہاڑی کی بلندی پندرہ میٹر اور مروہ کی آٹھ میٹر ہے ۔

صفا اور مروہ اس وقت دو پہاڑیوں کے نام ہیں (اصطلاح میں علَم کو کہتے ہیں) لیکن لغت میں صفا کا معنیٰ ہے مضبوط اور صاف پتھر جس میں مٹی ، ریت اور سنگریزے نہ ہوں اور مروہ کا معنیٰ ہے مضبوط اور درشت پتھر ۔

شعائر جمع ہے شعیرہ کی ، جس کا معنیٰ علامت اور نشانی ہے ۔ شعائر اللہ وہ علامات ہیں جو انسان کو خدا کی یاد دلائیں اور کسی مقدس چیز کو نظروں میں نئے سرے سے اجاگر کریں ۔

اعتمر ، عمرہ کے مادہ سے ہے ، جس کا معنیٰ ہے کسی عمارت کے وہ اضافی حصے جو اس کے ساتھ ملائے جائیں تو اس کی تکمیل کا سبب بنیں ۔ لیکن اصطلاح شریعت میں عمرہ ان مخصوص اعمال کو کہا جاتا ہے جو حج کے موقع پر اضافے کے طور پر اور کبھی جداگانہ طور پر عمرہ مفردہ کے نام پر انجام دیئے جاتے ہیں ۔ عمرہ کئی ایک پہلوؤں سے حج سے مشابہت رکھتا ہے ۔

(۲) صفا و مروہ کے کچھ اسرار و رموز : یہ صحیح ہے کہ عظیم لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھنا اور سننا انسان کو کمال کی طرف لے جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ صحیح ، زیادہ عمیق اور گہرا طریقہ بھی موجود ہے اور وہ ہے ان مقامات کا مشاہدہ کرنا اور دیکھنا جہاں مردانِ خدا نے راہِ خدا میں قیام کیا اور وہ مراکز جہاں ایسے واقعات عملاً رونما ہوئے ۔

یہ مقامات و مراکز بذاتِ خود زندہ اور جاندار تاریخ ہیں ، تاریخ کی کتابیں تو خاموش اور بے جان ہیں ۔ ایسے مقامات پر انسان کے لئے زمانی فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور وہ خود کو اصل واقعہ میں شریک محسوس کرتا ہے اور اسے یوں لگتا ہے کہ وہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ۔

ایسے مشاہدات کا تربیتی اثر گفتگو اور مطالعۂ کتب سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ یہ مقامِ احساس ہے منزلِ ادراک نہیں ۔ یہ

مرحلہ تصدیق ہے مقام تصور نہیں اور یہ عینیت ہے ذہنیت نہیں۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عظیم پیغمبروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح جہاد کے مختلف میدانوں اور شدید آزمائشوں سے گزرے ہوں یہاں تک کہ قرآن نے ان کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝

یقیناً یہ بہت واضح اور عظیم امتحان اور آزمائش ہے۔ (الصّٰفّٰت - ۱۰۶)

یہی مبارزات اور سخت آزمائشیں تھیں کہ جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی ایسے تربیت و پرورش کی کہ "امامت" کا تاج انہی کے سر پر رکھا گیا۔

مراسم حج درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کے مبارزات کے میدانوں، توحید، بندگی، فداکاری اور اخلاص کی منازل کی دلوں پر پوری منظر کشی کرتے ہیں۔

ان مناسک کی ادائیگی کے وقت اگر مسلمان ان کی روح اور اسرار سے واقف ہوں اور ان کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دیں تو یہ تربیت کی ایک بڑی درس گاہ اور خداشناسی، پیغمبر شناسی اور انسان شناسی کا ایک مکمل دورہ ہے۔

اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے واقعے اور صفا و مروہ کے تاریخی پہلوؤں کی طرف لوٹتے ہیں۔

ابراہیمؑ بڑھاپے کی منزل کو جا پہنچے تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے خدا سے اولاد کی درخواست کی۔ عالم پیری ہی میں ان کی کنیز ہاجرہ کے بطن سے انہیں فرزند عطا ہوا جس کا نام انہوں نے اسماعیلؑ رکھا۔

آپ کی پہلی بیوی سارہ کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے علاوہ کسی خاتون کے بطن سے ابراہیمؑ کو فرزند ملے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ ماں بیٹے کو مکہ میں جا کر ٹھہرائیں جو اس وقت ایک بے آب و گیاہ بیابان تھا۔

ابراہیمؑ نے حکم خدا کی اطاعت کی اور انہیں سرزمین مکہ میں لے گئے جو ایسی خشک اور بے آب و گیاہ تھی کہ وہاں کسی پرندے کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ جب ابراہیمؑ انہیں چھوڑ کر تنہا واپس ہونے لگے تو ان کی اہلیہ رونے لگیں کہ ایک عورت اور ایک شیر خوار بچہ اس بے آب و گیاہ بیابان میں کیا کریں گے۔

اس خاتون کے گرم آنسو اور ادھر بچے کا نالہ و زاری۔ اس منظر نے ابراہیمؑ کا دل ہلا کے رکھ دیا۔ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا۔

خداوندا! میں تیرے حکم پر اپنی بیوی اور بچے کو اس جلا دینے والے بے آب و گیاہ بیابان میں تنہا چھوڑ رہا ہوں، تاکہ تیرا نام بلند اور تیرا گھر آباد ہو۔

یہ کہہ کر غم و اندوہ اور شدید محبت کے عالم میں الوداع ہوئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ماں کے پاس آب و غذا کا جو توشہ تھا ختم ہو گیا اور اس کی چھاتی کا دودھ بھی خشک ہو گیا۔ شیر خوار بچے کی بے تابی اور تضرع و زاری نے ماں کو ایسا مضطرب کر دیا کہ وہ اپنی پیاس بھول گئی۔ وہ پانی کی تلاش

میں اٹھ کھڑی ہوئی پہلے کوہِ صفا کے قریب گئی تو پانی کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ سراب کی چمک نے اسے کوہ مروہ کی طرف کھینچا تو وہ اس کی طرف دوڑی لیکن وہاں بھی پانی نہ ملا۔ وہاں ویسی چمک صفا پر دکھائی دی تو پلٹ کر آئی۔ زندگی کی بقاء اور موت سے مقابلے کے لئے اس نے ایسے سات چکر لگائے۔ آخر شیر خوار بچہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگا کہ اچانک اس کے پاؤں کے پاس انتہائی تعجب خیز طریقے سے زمزم کا چشمہ ابلنے لگا۔ ماں اور بچے نے پانی پیا اور موت جو یقینی ہو گئی تھی اس سے بچ نکلے۔

زمزم کا پانی گویا آب حیات تھا۔ ہر طرف سے پرندے اس چشمے کی طرف آنے لگے۔ قافلوں نے پرندوں کی پرواز دیکھی تو اپنے رُخ اس طرف موڑ دیے اور ظاہراً ایک چھوٹے سے خاندان کی فداکاری کے صلے میں ایک عظیم مرکز وجود میں آگیا۔

آج خانۂ خدا کے پاس اس خاتون اور اس کے فرزند اسماعیلؑ کا مسکن ہے۔ ہر سال تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد اطراف عالم سے آتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس مسکن کو جسے مقام اسماعیل کہتے ہیں اپنے طواف میں شامل کریں گویا اس خاتون اور اس کے بیٹے کے مدفن کو کعبہ کا جزو سمجھیں۔

صفا و مروہ کی سعی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ حق کا نام زندہ کرنے اور عظمت، استقلال اور آبادی کے لئے شیر خوار بچے تک کو جان کی بازی لگا دینا چاہیئے۔ صفا و مروہ کی سعی میں یہ سبق بھی پنہاں ہے کہ ناامیدیوں کے بعد بھی کئی امیدیں ہیں۔ اسماعیلؑ کی والدہ جناب ہاجرہ نے وہاں پانی کی تلاش جاری رکھی جہاں وہ دکھائی نہ دیتا تھا تو خدا نے بھی ایسے راستے سے انہیں سیراب کیا جس کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صفا و مروہ ہم سے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب ہمارے اوپر بت نصب تھے لیکن آج پیغمبر اسلام کی مسلسل کوششوں اور جد و جہد سے شب و روز ہمارے پہلو میں لا الٰہ الا اللہ کی صدا گونج رہی ہے۔

صفا و مروہ کی پہاڑیاں حق رکھتی ہیں کہ وہ فخر کریں اور کہیں کہ ہم پیغمبر اسلام کی تبلیغات کی پہلی منزل ہیں۔ جب مکہ شرک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا تو آفتاب ہدایت یہیں سے طلوع ہوا۔ اے صفا و مروہ کی سعی کرنے والو تمہارے دل میں یہ بات رہے کہ اگر آج ہزاروں افراد اس پہاڑی کے قریب پیغمبرؐ کی دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں تو ایک وقت وہ بھی تھا کہ نبی اکرمؐ اس پہاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے رہے تھے اور کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔ تم بھی حق کی راہ میں قدم اٹھاؤ اور اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملے جن سے مستقبل میں امید کی جا سکتی ہے تو مایوس نہ ہو جاؤ اور اپنے کام کو اسی طرح جاری رکھو۔

صفا و مروہ کی سعی ہمیں درس دیتی ہے کہ توحید کے اس مرکز اور آئین کی قدر و منزلت پہچانو کہ کتنوں نے اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر کے آج اس مرکز توحید کو تمہارے لئے محفوظ رکھا۔

اسی لئے خداوند عالم نے سب زائرین خانہ کعبہ پر واجب قرار دیا کہ مخصوص لباس اور مخصوص وضع قطع کے ساتھ جو ہر قسم کے امتیاز اور تشخص سے پاک ہو سات مرتبہ ان امور کی تجدید کے لئے ان دو پہاڑیوں کے درمیان چلیں۔ جو لوگ کبر

غرور کی وجہ سے عام لوگوں کے گزرنے کی جگہ پر ایک قدم اٹھانے کو تیار نہیں اور جو سڑکوں پر تیز رفتاری سے چلنا پسند نہیں کرتے وہی فرمان خدا کی اطاعت کے لئے کبھی آہستہ اور کبھی تیزی سے دوڑتے ہیں روایات کے مطابق یہ وہ جگہ ہے جہاں کے بارے میں دیے گئے احکامات متکبرین کو بیدار کرنے کے لئے ہیں۔

فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بہما و .... لغت میں حج کا معنی قصد بیان کیا گیا ہے لیکن قرآن اور احادیث میں اس کا مفہوم وہ مخصوص اعمال اور مناسک ہیں جو مسلمان مکہ میں انجام دیتے ہیں۔

جب قرآن یہ بتا چکا کہ صفا و مروہ دو عظیم نشانیاں ہیں، لوگوں کی بندگی کا مرکز اور شعائر الٰہی ہیں۔ مزید کہتا ہے:

جو شخص خانہ خدا کا حج کرے یا عمرہ انجام دے اس کے لئے کوئی حرج نہیں کہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان چکر لگائے یہ عمل طواف کے لغوی معنی کے خلاف نہیں کیونکہ کسی طرح کا بھی چلنا ہو اگر انسان واپس وہیں آ جائے جہاں سے ابتداء کی تھی تو یہ طواف ہے چاہے وہ حرکت دائرہ کی صورت میں ہو جیسے خانہ کعبہ کے گرد طواف یا دائرہ کی صورت میں نہ ہو جیسے صفا و مروہ کے درمیان۔

(iii) ایک سوال کا جواب: یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے چاہے حج کے اعمال بجا لا رہا ہوں یا عمرہ کے۔ لیکن "لا جناح" کے لفظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔

اس سوال کا جواب ان روایات سے واضح طور پر مل جاتا ہے جو شان نزول کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہیں۔ مسلمان یہ گمان کرتے تھے کہ ان دو پہاڑیوں پر ایک عرصہ تک اساف اور نائلہ بت رکھے رہے ہیں اور کفار سعی کرتے وقت انہیں مس کرتے تھے لہٰذا یہ اس قابل نہیں کہ مسلمان ان کے درمیان سعی کریں۔ اس آیت میں ان سے کہا گیا ہے کہ کوئی حرج نہیں تم سعی کرو چونکہ یہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہیں۔ لہٰذا "لا جناح"[1] دراصل اس کراہت اور ناپسندیدگی کو واضح طور پر دور کرنے کے لئے آیا ہے تاکہ اس کی اصل شرعی حیثیت واضح کرے۔ علاوہ ازیں قرآن میں بہت سے واجب احکام اس انداز سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً نماز مسافر کے بارے میں ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ

اگر سفر میں ہو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز قصر کر لو۔ (نساء-۱۰۱)

حالانکہ یہ واضح ہے کہ مسافر پر نماز قصر واجب ہے نہ یہ کہ قصر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ قاعدۃً لفظ "لا جناح" ان مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں سننے والے کا ذہن پہلے سے اس چیز کے بارے میں پریشان ہو اور وہ منفی احساسات رکھتا ہو لہٰذا قرآن کی یہ روش بعض واجب احکام بیان کرنے کے بارے میں بھی ہے۔

---

[1] "جناح" کا اصل معنی ہے ایک طرف میلان، چونکہ گناہ انسان کو حق سے منحرف اور باطل کی طرف مائل کر دیتا ہے اس لئے اسے جناح کہا جاتا ہے۔

امام باقرؑ نے بھی ایک حدیث میں اس روش کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں منقول ہے۔

(۶) تطوع کسے کہتے ہیں: لغت میں تطوع کا معنی ہے اطاعت قبول کرنا اور احکام ماننا۔ عرف فقہا میں تطوع مستحب اعمال کو کہا جاتا ہے اسی بنا پر اکثر مفسرین اسے مستحب حج، عمرہ یا طواف اور ہر قسم کے نیک مستحب عمل کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی جو شخص فرمانِ خدا کے تحت نیک عمل انجام دے تو خدا تعالیٰ اس کے کام سے آگاہ ہے اور اس کے بدلے میں اسے ضرور جزا دے گا۔

احتمال ہے کہ یہ لفظ گذشتہ جملوں کی تکمیل اور تاکید ہو اور تطوع سے مراد ہو وہاں اطاعت کرنا جہاں انسان کے لیے مشکل ہو۔

اس بنا پر اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو حج یا عمرۂ واجب میں صفا و مروہ کی سعی اس کی پوری زحمت کے ساتھ انجام دیں اور عربوں کے جاہلانہ اعمال کی وجہ سے پیدا شدہ باطنی میلان کے برخلاف اپنا حج مکمل کریں تو خدا انہیں ضرور جزا دے گا۔

(۷) "خدا شاکر ہے" کا مفہوم: ضمناً اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ شاکر کا لفظ پروردگار کے لیے لطیف تعبیر ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے نیک اعمال کے انتہائی احترام کی مظہر ہے اور جب خدا بندوں کے اعمال کے پیشِ نظر شکرگزار ہوتا ہے تو اس سے بندوں کی ایک دوسرے کے لیے اور خدا کے بارے میں ذمہ داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۵۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝

۱۶۰۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ

۱۵۹۔ جو لوگ ان واضح دلائل اور ذرائعِ ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے نازل کیا جب کہ اُن لوگوں کے لئے ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور نفرین کرتے ہیں۔

۱۶۰۔ مگر وہ جو توبہ کرتے ہیں اور لوٹ آتے ہیں اپنے بُرے اعمال کی اصلاح کر کے نیک اعمال انجام دیتے ہیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے آشکار کرتے ہیں تو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں کہ میں تواب و رحیم ہوں۔

شانِ نزول

جلال الدین سیوطی نے اسباب النزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد جن میں معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید شامل تھے نے علماء یہود سے تورات کے چند مطالب کے متعلق سوالات کئے جو پیغمبر کے ظہور سے مربوط تھے۔ انہوں نے اصل واقعے کو چھپایا اور وضاحت کرنے سے احتراز کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

ویسے تو روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن اس سے آیت کا کلی اور عمومی مفہوم محدود نہیں ہوتا اور یہ سب حقائق چھپانے والوں کے لئے عام ہے۔

یہ آیت شریفہ حقائق چھپانے والوں کی شدید مذمت اور سرزنش کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، جو لوگ واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے کتاب الٰہی کے ذریعے نازل کیا ہے اور جو ان لوگوں کے سامنے بیان کر دیا گیا ہے خدا لعنت بھیجتا ہے اور خدا ہی نہیں بلکہ تمام لعنت کرنے والے انہیں لعنت کرتے ہیں (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الهدیٰ من بعد ما بیناه للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنهم الله و یلعنهم اللّٰعنون)۔

یہ آیت بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے کہ خدا کے تمام بندے اور فرشتے اس کام سے بیزار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حق کو چھپانا ایسا عمل ہے جو حق کے تمام طرفداروں کے غم و غصے کو ابھارتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہوگی کہ علماء آیاتِ خدا کو اپنے شخصی منافع کے لئے چھپائیں اور لوگوں کو گمراہ کریں جب کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہیں۔

"من بعد ما بیناه للناس فی الکتاب" اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد درحقیقت زحمات انبیاء اور مردانِ خدا کی فداکاریاں کو برباد کرتے ہیں جو وہ آیاتِ الٰہی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لئے انجام دیتے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ "یلعن" آیت میں دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے فعل مضارع میں استمرار کا معنی شامل ہے۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا اور تمام لعنت کرنے والے ہمیشہ ایسے لوگوں پر لعنت اور نفرین کرتے رہتے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں اور یہ شدید ترین سزا ہے جو کسی انسان کو دی جا سکتی ہے۔

"بینات" اور "ہدیٰ" کا ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد وہ تمام روشن دلائل اور ہدایت کے وسائل ہیں جو لوگوں کی آگاہی، بیداری اور نجات کا سبب ہیں۔

---

[1] لباب النقول فی اسباب النزول ص ۲۴

کے دن آتشیں لجام (آگ کی لگام) اس کے منہ میں دی جائے گی۔[1]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض اوقات ضرورت اور لوگوں کا کسی مسئلے میں مبتلا ہونا خاموش رہنے کو بھی جرم بنا دیتا ہے۔

ایک اور حدیث جو امیر المومنین علیؑ سے مروی ہے بیان کی جاتی ہے۔

لوگوں نے آپؑ سے پوچھا:

من شر خلق اللّٰہ بعد ابلیس و فرعون

ابلیس اور فرعون کے بعد بدترین خلائق کون ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

العلماء اذا فسدوا هم المظهرون للاباطیل الکاتمون للحقائق وفیهم قال اللّٰہ عزوجل

اولئك یلعنهم اللّٰہ ویلعنهم اللّٰعنون۔

وہ بگڑے ہوئے علماء ہیں جو باطل کا اظہار اور حق کا اخفاء کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق خدا فرماتا ہے: ان پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی نفرین ہوگی۔[2]

(ii) **لعنت کیا چیز ہے:** لعن کا اصلی معنی ہے غصے سے دھتکارنا اور دور کرنا۔ اس بناء پر خدا کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ بندوں سے اپنی رحمت اور تمام عنایات و برکات دور کر دے جو اس کی جانب سے انہیں پہنچتی ہیں۔

بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ لعنت، آخرت میں عذاب و عتاب اور دنیا میں سلب توفیق کا نام ہے۔ یہ در اصل لعنت کا ایک مصداق ہے نہ یہ کہ یہ لفظ فقط ان دو معانی میں منحصر ہے۔

"لاعنون" یعنی لعنت کرنے والے۔ اس کا ایک وسیع معنی ہے۔ اس میں نہ صرف فرشتے اور مومنین شامل ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ہر وہ موجود جو زبان حال یا مقال سے کلام کرتا ہے اس میں داخل ہے۔ اس سلسلے کی چند روایات میں تو یہاں تک ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات حتیٰ کہ دریا کی مچھلیاں بھی طالبان علم و علماء کے لئے طلب خیر اور استغفار کرتی ہیں:

وانه یستغفر لطالب العلم من فی السماء و من فی الارض حتی الحوت فی البحر[3]

تو جہاں وہ موجودات طالب علموں کے لئے استغفار کرتے ہیں وہاں علم کو چھپانے والوں کے لئے یقیناً لعنت بھی کرتے ہیں۔

(iii) **تواب:** اس لفظ کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر انسان شیطانی وسوسوں سے فریب کھا کر توبہ توڑ دے تو بھی اس پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔ چاہیے کہ وہ پھر توبہ

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین ج ۱ ص ۱۴۹ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[3] اصول کافی۔ ج ۱، باب ثواب العالم والمتعلم حدیث اول۔

شانِ نزول

جلال الدین سیوطی نے اسباب النزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد جن میں معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید شامل تھے نے علماء یہود سے تورات کے چند مطالب کے متعلق سوالات کئے جو پیغمبر کے ظہور سے مربوط تھے۔ انہوں نے اصل واقعے کو چھپایا اور وضاحت کرنے سے احتراز کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

ویسے تو روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن اس سے آیت کا کلی اور عمومی مفہوم محدود نہیں ہوتا اور یہ سب حقائق چھپانے والوں کے لئے عام ہے۔

یہ آیت شریفہ حقائق چھپانے والوں کی شدید مذمت اور سرزنش کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ واضح دلائل اور ذرائع ہدایت کو چھپاتے ہیں جنہیں ہم نے کتابِ الٰہی کے ذریعے نازل کیا ہے اور جو ان لوگوں کے سامنے بیان ہو چکے ہیں ان پر خدا لعنت بھیجتا ہے اور خدا ہی نہیں بلکہ تمام لعنت کرنے والے انہیں لعنت کرتے ہیں (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الهدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنهم الله و یلعنهم اللعنون)۔

یہ آیت بڑی صراحت سے واضح کرتی ہے کہ خدا کے تمام بندے اور فرشتے اس کام سے بیزار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حق کو چھپانا ایسا عمل ہے جو حق کے تمام طرف داروں کے غم و غصے کو ابھارتا ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہوگی کہ علماء آیاتِ خدا کو اپنے شخصی منافع کے لئے چھپائیں اور لوگوں کو گمراہ کریں جب کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہیں۔

"من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب" اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد درحقیقت زحماتِ انبیاء اور مردانِ خدا کی فداکاریوں کو برباد کرتے ہیں جو وہ آیاتِ الٰہی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے لئے انجام دیتے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ "یلعن" آیت میں دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے فعل مضارع میں استمرار کا معنی شامل ہے۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا اور تمام لعنت کرنے والے ہمیشہ ایسے لوگوں پر لعنت اور نفرین کرتے رہتے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں اور یہ شدید ترین سزا ہے جو کسی انسان کو دی جا سکتی ہے۔

"بینات" اور "ہدیٰ" کا ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد وہ تمام روشن دلائل اور ہدایت کے وسائل ہیں جو لوگوں کی آگاہی، بیداری اور نجات کا سبب ہیں۔

---

[1] لباب النقول فی اسباب النزول ص ۲۱

قرآن کتاب ہدایت ہے لہٰذا یہ کبھی لوگوں کے لئے امید اور بازگشت کا دریچہ بند نہیں کرتی۔ اس لئے بعد کی آیت میں راہِ نجات اور گناہوں کی تلافی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسے شدید سزا کے مقابلے میں یوں بیان کیا گیا ہے: مگر وہ جو توبہ کرلیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں، اپنی برائیوں کی تلافی اور اعمال کی اصلاح کریں اور جو حقائق انہوں نے چھپا رکھے تھے لوگوں کے سامنے آشکار کردیں، بے شک میں ایسے لوگوں کو بخش دوں گا اور ان کے لئے اپنی اس رحمت کی تجدید کردوں گا جو ان سے منقطع کی جاچکی ہے کیونکہ میں بازگشت کنندہ اور مہربان ہوں (الا الذین تابوا واصلحوا وبینوا فاولئک اتوب علیھم وانا التواب الرحیم)۔

اگر دیکھا جائے "فاولئک اتوب علیھم" کے بعد "انا التواب الرحیم" کا آنا توبہ کرنے والوں کے لئے پروردگار عالم کی انتہائی محبت اور کمال مہربانی پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی فرماتا ہے: اگر وہ پلٹ آئیں تو میں بھی رحمت کی طرف پلٹ آؤں گا اور اپنی عنایات و نعمات جو ان سے منقطع کرچکا ہوں پھر سے انہیں عطا کروں گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یوں نہیں کہا کہ تم توبہ کرو تو میں تمہاری توبہ قبول کروں گا بلکہ کہتا ہے: تم توبہ کرو اور پلٹ آؤ تو میں بھی پلٹ آؤں گا۔ ان دونوں جملوں میں جو فرق ہے واضح ہے۔

علاوہ ازیں "وانا التواب الرحیم" کے ہر لفظ اور انداز میں اتنی مہربانی اور شفقت پائی جاتی ہے کہ یہ مفہوم کسی اور عبارت میں سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "انا" واحد متکلم کی ضمیر ہے جس کا معنی ہے "میں خود"۔ یہ ایسے مقامات پر آتا ہے جہاں کہنے والا براہِ راست سننے والے سے ربط رکھتا ہو خصوصاً اگر کوئی بزرگ ہستی یہ کہے کہ "میں خود یہ کام تمہارے لئے کروں گا" بجائے اس کے کہ وہ کہے "ہم اس طرح کریں گے" تو اس میں بہت فرق ہے۔ پہلے انداز میں جو لطف و کرم ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لفظ "تواب" بھی مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے بہت زیادہ پلٹ کر آنے والا۔ یہ انداز اس طرح امید کی روح انسان میں پھونک دیتا ہے کہ اس کی زندگی کے آسمان سے یاس و ناامیدی کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور جب لفظ "رحیم" بھی ساتھ ہو جو پروردگار کی خصوصی رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

چند اہم نکات

(۱) حق کو چھپانے کے نقصانات: وہ بات جو قدیم زمانے سے بہت مفاسد اور حق کشی کا باعث بنتی آرہی ہے اور جس کے مہلک اثرات آج تک جاری و ساری ہیں وہ ہے حق کو چھپانا۔ زیر بحث آیت اگرچہ ایک خاص واقعے کے متعلق نازل ہوئی لیکن جیسا کہ کہا جاچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا مفہوم ان سب پر محیط ہے جو ایسا کچھ بھی کردار ادا کرتے ہیں۔

جیسی منحصر بفرد تشدید و تہدید اور مذمت زیر نظر آیت میں حق کو چھپانے والوں کے لئے آئی ہے کسی اور کے لئے نہیں آئی اور کیوں نہ ہو، کیا ایسا نہیں کہ یہ قبیح عمل قوموں اور نسلوں کو گمراہی میں مبتلا کئے رکھتا ہے جیسا کہ اظہار حق امتوں کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔

انسان فطری طور پر حق کو چاہتا ہے اور جو حق کو چھپاتے ہیں وہ درحقیقت انسانی معاشرے کو فطری کمال تک پہنچنے سے باز رکھتے ہیں۔ ظہور اسلام کے وقت اور اس کے بعد اگر علماء یہود و نصاریٰ دونوں عہدوں (تورات، انجیل اور دیگر کتب مقدسہ) کی بشارتوں کو اظہار حقیقت کے طور پر آشکار کر دیتے اور اس سلسلے میں وہ جو کچھ جانتے تھے لوگوں تک پہنچا دیتے تو ہو سکتا تھا کہ تھوڑی سی مدت میں تینوں ملتیں ایک ہی پرچم تلے جمع ہو جاتیں اور اس وحدت کی برکات حاصل کرتیں اور یہی کام پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد اہل اسلام کے بعض علماء نے انجام دیا۔ وہ حق کو چھپاتے رہے ان کی وجہ سے ملت اختلاف کا شکار ہوئی اور اس میں شگاف پڑ گئے۔ آج تک ہم اسی کے نتیجے میں مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ یقیناً حق پوشی صرف اسی کا نام نہیں کہ آیات الٰہی اور علامات نبوت کو چھپایا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ چیز چھپانا ہے جس سے لوگ حقیقت و واقعیت تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کا مفہوم وسیع ہے۔

یہاں تک کہ کبھی وہاں بھی حق پوشی کا اطلاق ہوتا ہے جہاں بات کرنے کی ضرورت ہو اور خاموش رہا جائے۔ یہ اس مقام کے لیے ہے جہاں لوگوں کو سخت ضرورت ہو کہ انہیں حقیقت حال سے باخبر کیا جائے اور علماء اور آگاہ دانشور اس یقینی ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کو درپیش مسائل کے بارے میں حقائق کو مخفی رکھنا اس لئے کہ لوگ سوال کریں درست نہیں۔ تفسیر المنار کے مؤلف نے بعض لوگوں کے حوالے سے یہ جو لکھا ہے کہ سوال کی خاطر حقائق کو چھپایا جا سکتا ہے درست نظر نہیں آتا۔

خصوصاً اس بناء پر بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن فقط حق کو چھپانے کے مسئلے کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ وہ حقائق کے بیان اور اظہار کو ضروری شمار کرتا ہے۔

شاید اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض علماء نے حقائق بیان کرنے سے منہ بند کر رکھے ہیں۔ ان کا عذر ہے کہ ان سے تو کسی نے سوال نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ

خدا نے جنہیں کتاب عطا کی ہے ان سے عہد و میثاق لیا ہے کہ وہ اسے ضرور لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔ (آل عمران - ۱۸۷)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات فرعی مسائل میں سرگرم رہنا جس سے لوگ زندگی کے حقیقی مسائل کو فراموش کر بیٹھیں یہ بھی ایک قسم کی حق پوشی ہے۔ اگرچہ حق پوشی کا معنی یہ نہیں لیکن حقائق کو مخفی رکھنے کا فلسفہ اس پر بھی محیط ہے۔ احادیث اسلامی میں بھی ان علماء پر شدید ترین حملے کئے گئے ہیں جو حقائق کو چھپاتے ہیں۔ پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

من سئل عن علم یعلمه فکتمه الجم یوم القیامه بلجام من النار

اگر کسی شخص سے ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت

کے دن آتش جہنم کی ایک لگام اس کے منہ میں دی جائے گی۔[1]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض اوقات ضرورت اور لوگوں کا کسی مسئلے میں مبتلا ہونا بذات خود سوال بن جاتا ہے۔

ایک اور حدیث جو امیرالمومنین علیؑ سے مروی ہے بیان کی جاتی ہے:

لوگوں نے آپؑ سے پوچھا:

من شر خلق الله بعد ابلیس و فرعون

ابلیس اور فرعون کے بعد بدترین خلائق کون ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

العلماء اذا فسدوا ھم المظھرون للاباطیل الکاتمون للحقائق وفیھم قال الله عزوجل اولٓئك یلعنھم الله ویلعنھم اللٰعنون۔

وہ بگڑے ہوئے علماء ہیں جو باطل کا اظہار اور حق کا اخفاء کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق خدا فرماتا ہے: ان پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی نفرین ہوگی۔[2]

(ii) لعنت کیا چیز ہے: لعن کا اصلی معنی ہے غصے سے دھتکارنا اور دور کرنا۔ اس بناء پر خدا کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ بندوں سے اپنی رحمت اور تمام عنایات و برکات دور کردے جو اس کی جانب سے انہیں پہنچی ہیں۔

بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ لعنت، آخرت میں عذاب و عقاب اور دنیا میں سلب توفیق کا نام ہے۔ یہ دراصل لعنت کا ایک مصداق ہے نہ یہ کہ یہ لفظ ان دو معانی میں منحصر ہے۔

"لاعنون" یعنی لعنت کرنے والے۔ اس کا ایک وسیع معنی ہے جس میں نہ صرف فرشتے اور مومنین شامل ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ہر وہ موجود جو زبان حال یا مقال سے کلام کرتا ہے اس میں داخل ہے۔ اس سلسلے کی چند روایات میں تو یہاں تک ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات حتی کہ دریا کی مچھلیاں بھی طالبان علم و علماء کے لئے دعائے خیر اور استغفار کرتی ہیں:

وانہ یستغفر لطالب العلم من فی السماء ومن فی الارض حتی الحوت فی البحر۔[3]

تو جہاں وہ موجودات طالب علموں کے لئے استغفار کرتے ہیں وہاں علم کو چھپانے والوں کے لئے یقیناً لعنت بھی کرتے ہیں۔

(iii) تواب: اس لفظ کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر انسان شیطانی وسوسوں سے فریب کھا کر توبہ توڑ دے تو بھی اس پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔ چاہیئے کہ وہ پھر توبہ

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نورالثقلین ج ۱ ص ۱۲۹ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[3] اصول کافی، ج ۱، باب "ثواب العالم والمتعلم" حدیث اول۔

کرے اور خدا کی قربت چاہے اور حق کو طرف پھرے۔ یہ مرد خدا بہت زیادہ بازگشت کرنے والا ہے۔ اس کی رحمت و بخشش سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

۱۶۱۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

۱۶۲۔ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝

۱۶۳۔ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ

۱۶۱۔ جو لوگ کافر ہو جائیں اور حالت کفر ہی میں مر جائیں ان پر خدا، فرشتے اور تمام انسان لعنت کرتے ہیں۔

۱۶۲۔ وہ ہمیشہ کے لئے زیر لعنت اور رحمت خدا سے دور رہیں گے۔ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔

۱۶۳۔ تمہارا خدا اور معبود وہ اکیلا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں کیونکہ وہی بخشنے والا اور مہربان ہے (رحمت عام اور رحمت خاص کا مالک وہی ہے)۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم حق کو چھپانے کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ زیر نظر آیات میں بھی انہی کفار کی طرف اشارہ ہے جو ہٹ دھرمی، حق پوشی، کفر اور تکذیب حق کا سلسلہ موت آنے تک جاری رکھتے ہیں۔

فرمایا: وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور حالت کفر میں دنیا سے چل بسے ہیں ان پر خدا، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہوگی (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین)۔

یہ گروہ بھی حق کو چھپانے والوں کی طرح خدا، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کیونکہ یہ آخر عمر تک کفر پر مصر رہے ہے۔

مزید فرمایا: یہ ہمیشہ خدا اور بندگان خدا کی لعنت کے زیر سایہ رہیں گے۔ ان پر عذاب الٰہی کی تخفیف نہ ہوگی، نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی (خٰلدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون)۔

ان بدبختیوں کی وجہ سے چونکہ اصل توحید ختم ہو جاتی ہے۔ زیر نظر آخری آیت میں فرمایا: تمہارا معبود اکیلا خدا ہے (والٰھکم الٰہ واحد)۔ مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں (لا الٰہ الا ھو)

آیت کے آخر میں دلیل وعلت کے طور پر فرماتا ہے: وہ خدا بخشنے والا مہربان ہے (الرحمٰن الرحیم) بے شک وہ جس کی عام وخاص رحمت سب پر محیط ہے۔ جس نے مومنین کے لئے خصوصی امتیازات قرار دیئے ہیں یقیناً وہی لائق عبادت ہے نہ کوئی اور جو سرتاپا احتیاج ہے۔

چند اہم نکات

(۱) حالت کفر میں مرنا: قرآن مجید کی بہت سی آیات سے یہ نکتہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ حالت کفر اور حق سے دشمنی کرتے ہوئے دنیا سے جائیں ان کے لئے کوئی راہِ نجات نہیں ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ آخرت کی سعادت یا بدبختی تو براہِ راست ان ذخائر اور وسائل کا نتیجہ ہے جو ہم اس دنیا سے اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ جس شخص نے اپنے پر وبال کفر اور حق دشمنی میں جلا دیئے ہیں وہ یقیناً اُس جہان میں طاقتِ پرواز نہیں رکھتا اور دوزخ کے گڑھوں میں اس کا گرنا یقینی ہے کیونکہ دوسرے جہاں میں اعمال بجالانے کا کوئی موقع نہ ہوگا لہٰذا ایسا شخص ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔
یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص شہوت رانیوں اور ہوس بازیوں کی وجہ سے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں کھو بیٹھے اور آخری عمر تک نابینا رہے۔
واضح ہے کہ یہ بات ان کفار سے مخصوص ہے جو جان بوجھ کر کفر اور حق دشمنی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مسئلہ خلود کے بارے میں مزید توضیح سورہ ہود کی آیت ۱۰۷ اور ۱۰۸، جلد ۹ کے ذیل میں پڑھیے گا۔

(۲) خدا اپنی یکتائی میں یکتا ہے: مندرجہ بالا تیسری آیت میں خدا کی ایسی یکتائی بیان کی گئی ہے جو ہر قسم کے انحراف اور شرک کی نفی کرتی ہے۔ کبھی ایسے موجودات بھی نظر آتے ہیں جو ایسی صفات کے حامل ہیں جو منحصر بفرد ہیں اور اصطلاح کے مطابق یکتا ہیں۔ لیکن کچھ بغیر واضح ہے کہ وہ سب موجودات ایک یا چند صفات مخصوصہ میں تو ممکن ہے منحصر بفرد اور یکتا ہوں جب کہ خدا ذات وصفات اور افعال میں یکتا و اکیلا ہے۔ عقلی طور پر خدا کی یکتائی قابل تعدد نہیں۔ وہ ازلی و ابدی یکتا ہے۔ وہ ایسا یکتا ہے کہ اس پر حوادث اثر انداز نہیں ہوتے۔ اُس کی یکتائی ذہن میں بھی ہے اور خارج از ذہن بھی۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی یکتائی میں بھی یکتا ہے۔

(۳) کیا خدا کی لعنت کافی نہیں ہے: مندرجہ بالا آیات کے مطابق خدا کے علاوہ حق پوشی کرنے والوں پر سب لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑتی ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا خدا کی لعنت کافی نہیں ہے۔
اس سوال کا جواب واضح ہے کہ درحقیقت یہ ایک طرح کی تاکید ہے اور ایسے قبیح اور برے اعمال انجام دینے والوں کے لئے تمام جہانوں کی طرف سے تنفر و بیزاری کا اظہار ہے۔
اگر یہ کہا جائے کہ یہاں لفظ "ناس" بطور عموم کیوں استعمال ہوا ہے جب کہ جرم میں شریک لوگ تو کم از کم ایسے مجرموں پر لعنت نہیں کرتے۔
ہم کہیں گے ــــ حالت تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے اس عمل قبیح سے متنفر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص خود ان

کے بارے میں حق پوشی کرے تو یقیناً انہیں تکلیف ہوگی اور وہ اس پر نفرین کریں گے لیکن جہاں ان کے اپنے منافع کا معاملہ ہو وہاں یہ لوگ استثنائی طور پر چشم پوشی کرتے ہیں۔

۱۶۴۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ
الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ
مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ
الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۶۴۔ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں رات دن کے آنے جانے میں، انسانوں کے فائدے کے لئے دریا میں چلنے والی کشتیوں میں، خدا کی طرف سے آسمان سے نازل ہونے والے اس پانی میں جس نے زمین کو موت کے بعد زندگی دی ہے اور ہر طرح کے چلنے والے اس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہواؤں کے چلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہیں (خدا کی ذات پاک اور اس کی یکتائی کی) اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر رکھتے ہیں۔

تفسیر

آسمان و زمین میں اس کی ذات پاک کے جلوے ہیں

گذشتہ آیت سے توحید پروردگار کی بحث شروع ہوتی ہے۔ زیر نظر آیت درحقیقت خدا کی توحید کے مسئلے اور اس کی ذات پاک کی یکتائی پر ایک دلیل ہے۔

مقدمہ اور تمہید کے طور پر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ نظم و ضبط، علم، دانش اور عقل کے وجود کی دلیل ہے۔
خداشناسی کی کتب میں ہم اس بنیاد کی تشریح کر چکے ہیں کہ عالم ہستی میں جب نظم و ضبط کے مظاہر نظر پڑتے ہیں اور نظام قدرت کی ہم آہنگی اور وحدت عمل پر نگاہ جاتی ہے تو فوراً توجہ ایک اکیلے مبداء علم و قدرت کی مائل ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

مثلاً جب ہم آنکھ کے سات پردوں میں سے کسی ایک بناوٹ پر بھی غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ امر کسی بے شعور، اندھی اور بہری فطرت سے محال ہے کہ وہ ایسے اثر کا مبداء بن سکے اور جب ان سات پردوں کے باہمی ربط اور ہم آہنگی پھر آنکھ کی ساری مشینری کی انسانی بدن سے ہم آہنگی اور پھر ایک انسان کی دیگر انسانوں سے ہم آہنگی اور پھر پوری

انسانی برادری کی پورے نظام ہستی سے ہم آہنگی دیکھتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ہے اور یہ سب ایک ہی ذاتِ پاک کے آثارِ قدرت ہیں۔

ایک عمدہ اور اچھا اور پرمعنی شعر کیا ہمیں شاعر کے اعلیٰ ذوق اور سرشار طبیعت کا پتہ نہیں دیتا اور کیا ایک دیوان میں موجود چند قطعات کی کامل ہم آہنگی اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ سب ایک قادر الکلام شاعر کی طبیعت اور ذوق کے آثار ہیں۔

اس تمہید کو نظر میں رکھتے ہوئے اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اس آیت میں جہانِ ہستی کے نظم و ضبط کے چھ قسم کے آثار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس عظیم مبداء کے وجود کی نشانی ہے۔

۱۔ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں (ان فی خلق السمٰوٰت والارض) جی ہاں —— اس پُرشکوہ اور ستاروں بھرے آسمان کی خلقت، یہ عالم بالا کے کرات جن میں کروڑوں آفتاب درخشاں، کروڑوں ثابت و سیار ستارے جو تاریک رات میں پرمعنی اشاروں سے ہم سے بات کرتے ہیں اور وہ جنہیں بڑی بڑی دوربینوں سے دیکھا جائے تو ایک دقیق اور عجیب نظام دکھائی دیتا ہے ایسا نظام جس نے ایک زنجیر کے حلقوں کی طرح انہیں ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا ہے۔

اسی طرح زمین کی خلقت —— جہاں ہر قسم کے مظاہر حیات ہیں۔ جہاں مختلف انواع اور صورتوں میں لاکھوں نباتات اور جانور موجود ہیں۔ یہ سب اس ذاتِ پاک کی نشانیاں اور اس کے علم، قدرت اور یکتائی کے واضح دلائل ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ انسان کا علم و ادراک جتنا بڑھتا جا رہا ہے اتنی ہی اس عالم کی عظمت و وسعت اس کی نظر میں زیادہ ہوتی جا رہی ہے اور معلوم نہیں یہ وسعتِ علم کب تک جاری رہے گی۔

اس وقت کے علماء کہتے ہیں کہ عالم بالا میں ہزاروں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہمارا نظام شمسی ایک کہکشاں کا حصہ ہے۔ صرف ہماری کہکشاں میں کروڑوں آفتاب اور چمکتے ستارے موجود ہیں۔ علماء عصر کے اندازے کے مطابق ان میں لاکھوں مسکونی سیارے ہیں جن میں جاندار موجودات ہیں —— کیا ہی عظمت و قدرت ہے۔

۲۔ رات دن کے آنے جانے میں (واختلاف اللیل والنھار)۔

جی ہاں —— یہ رات دن کا اختلاف[1] اور ایک مخصوص تدریجی نظام کے ساتھ یہ روشنی اور تاریکی کی آمد و شد۔ اس سے پھر چار موسم وجود پاتے ہیں۔ نباتات اور دیگر زندہ موجودات اسی نظام کی وجہ سے تدریجی طور پر مراحل تکامل طے کرتے ہیں۔ اس ذاتِ پاک اور اس کی بلند صفات کے لئے یہ ایک اور نشانی ہے۔

۳۔ انسانوں کے نفع کی چیزیں لے کر کشتیاں دریا میں چلتی ہیں (والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس)۔

چھوٹی بڑی کشتیوں کے ذریعے انسان وسیع سمندروں میں چلتا ہے اور اپنے مقاصد کے لئے ان کے

---

[1] لفظ "اختلاف" ممکن ہے آمد و شد (آنے جانے) کے معنی میں استعمال ہوا ہو کیونکہ یہ "خلف" مادہ "خلافت" کے مادے سے ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کا جانشین ہونا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اختلاف رات اور دن کی کمی بیشی کی طرف اشارہ ہو اور دونوں معانی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ خاص نظام جو بہت سے واضح آثار کا حامل ہے اتفاقاً اور بغیر کسی عالم و قادر ذات کے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔

ذریعے زمین کے مختلف حصوں میں جاتا ہے۔ یہ سفر خصوصاً بادبانی کشتیوں کا سفر چند نظاموں کی وجہ سے ہے۔

ا۔ وہ ہوائیں جو ہمیشہ سطح سمندر پر رہتی ہیں۔ یہ ہوائیں عموماً زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی سے خط استواء کی طرف اور خط استواء سے قطب شمالی اور جنوبی کی طرف چلتی ہیں انہیں آلیزہ اور کاؤنٹر آلیزہ کہتے ہیں۔

ب۔ کچھ ہوائیں علاقوں کے لحاظ سے ایک معین پروگرام کے تحت چلتی ہیں اور کشتیوں کو یہ سہولت بہم پہنچاتی ہیں کہ وہ اس فراواں طبیعی دولت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھیں (اسی طرح لکڑی کی خاص طبیعی خاصیت ہے جس کی وجہ سے وہ پانی میں نہیں ڈوبتی یہ بھی پانی پر اجسام کے تیرنے کا سبب بنتی ہے)۔

زمین کے دونوں قطبوں میں غیر مبدل مقناطیسی خاصیت ہے جن کے حساب سے قطب نما کی سوئیاں حرکت کرتی ہیں۔ یہ بھی پانی پر چیزوں کی آمدورفت میں مددگار ہوتی ہے۔

ان سب کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک یہ سب نظام ایک دوسرے سے متحد نہ ہوں کشتیوں کی حرکت سے وہ بھرپور فوائد حاصل نہیں کئے جا سکتے جو کئے جاتے ہیں۔ [1]

یہ بات حیران کن ہے کہ دور حاضر میں مشینی کشتیوں کے بننے سے ان امور کی عظمت و نقطہ یہ کہ کم نہیں ہوئی بلکہ ان کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

آج کی دنیا میں دیو ہیکل سمندری جہاز اہم ترین ذریعۂ نقل و حمل شمار ہوتے ہیں۔ بعض جہاز تو شہروں کی طرح وسیع ہیں۔ ان میں میدان سیر و تفریح کے مراکز یہاں تک کہ بازار بھی موجود ہیں۔ ان کے عرشے پر ہوائی جہازوں کے اترنے کے لئے بڑے بڑے ایئرپورٹ تک موجود ہیں۔

۴۔ پانی جسے خدا آسمان سے نازل کرتا ہے، اس کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے اور اسی نے ان میں طرح طرح کے جانور پھیلا رکھے ہیں (وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دآبۃ)۔

بارش کے حیات بخش، تازہ اور بابرکت موتی اور اس طبیعی صاف و شفاف پانی کے قطرے ہر جگہ گرتے ہیں اور گویا زندگی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں اور اپنے ساتھ حرکت و برکت، آبادی اور نعمتوں کی فراوانی لاتے ہیں۔ یہ پانی جو ایک خاص نظام کے تحت گرتا ہے، تمام موجودات اور جاندار اس بے جان سے جان پاتے ہیں۔

یہ سب اس کی عظمت و قدرت کے پیغام بر ہیں۔

۵۔ ہواؤں کا ایک منظم طریقے سے چلنا (وتصریف الریاح)۔

ہوائیں نہ صرف سمندروں پر چلتی اور کشتیوں کو چلاتی ہیں بلکہ خشک زمینوں، پہاڑوں، دروں اور جنگلوں کو بھی اپنی جولان گاہ بناتی ہیں۔ کبھی یہ ہوائیں نر گھاس کے چھوٹے چھوٹے دانوں کو مادہ سبزہ زاروں پر چھڑکتی ہیں اور پیوند کاری و بارآوری میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ ہمارے لئے پھلوں کا تحفہ لاتی ہیں اور طرح طرح کے بیجوں کو وجود دیتی ہیں۔

---

[1] لفظ "فلک" کا معنی ہے کشتی۔ اس کا واحد اور جمع ایک ہی وزن پر ہے۔

بعض اوقات یہ ہوائیں سمندروں کی موجوں کو حرکت دے کر پانیوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ملاتی ہیں کہ سمندری موجودات کو حیات نو مل جاتی ہے۔

کبھی ہوائیں گرم علاقوں کی تپش سرد علاقوں میں کھینچ لاتی ہیں اور کبھی سرد علاقوں کی خنکی گرم علاقوں میں منتقل کر دیتی ہیں اور یوں زمین کی حرارت کو معتدل کرنے میں مؤثر مدد کرتی ہیں۔

کبھی یہ ہوائیں شہروں کی باد سموم کو جس میں آکسیجن نہیں ہوتی بیابانوں اور جنگلوں میں منتشر کر دیتی ہیں اور یوں نوع بشر کی زندگی کا سامان کرتی ہیں۔

گویا ہواؤں کا چلنا جس میں یہ تمام فوائد و برکات ہیں، اُس کے بے انتہا لطف و حکمت کی ایک اور نشانی ہے۔

۶۔ وہ بادل جو زمین و آسمان کے درمیان معلق و مسخر ہیں (والسحاب المسخر بین السماء والارض)۔

ایک دوسرے سے ٹکرانے والے یہ بادل جو ہمارے سروں کے اوپر گردش میں ہیں۔ اربوں ٹن پانی اٹھائے کشش ثقل کے قانون کے برعکس آسمان و زمین کے درمیان معلق ہیں اور اس پانی کو بغیر کوئی خطرہ پیدا کئے اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں۔

یہ اس کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے۔

علاوہ ازیں پانی کا یہ خزانہ اگر پانی نہ برساتا تو زمین خشک ہوتی، پینے کو ایک قطرہ پانی نہ ہوتا، سبزہ زاروں کے اگنے کے لئے کوئی چشمہ اور نہر نہ ہوتی ہر جگہ ویران ہوتی اور ہر مقام پر مردہ خاک پھیلی ہوتی ہوتی۔

یہ بھی اس کے علم و قدرت کا ایک اور جلوہ ہے۔

جی ہاں ـــــ یہ سب اس کی ذات پاک کی نشانیاں اور علامتیں ہیں لیکن ایسے لوگوں کے لئے جو عقل و ہوش رکھتے ہیں اور غور و فکر کرتے ہیں (لاٰیٰت لقوم یعقلون)۔ ان کے لئے نہیں جو بے خبر اور کم ذہن ہیں۔ نہ ان کے لئے جو آنکھیں رکھتے ہوئے بے بصیرت ہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے ہیں۔

۱۶۵۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَۙ
اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ ○

۱۶۶۔ اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا وَرَاَوُا الۡعَذَابَ وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ
الۡاَسۡبَابُ ○

۱۶۷۔ وَقَالَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ

كَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ
مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

ترجمہ

۱۶۵۔ بعض لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے لئے کسی اور معبود کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح دوست رکھتے ہیں جیسے خدا کو رکھنا چاہیئے اور ان سے محبت کرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں انہیں (اس محبت کی نسبت جو مشرکین کو اپنے معبودوں سے ہے) خدا سے شدید عشق و محبت ہے اور جنہوں نے ظلم کیا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی اور کو معبود قرار دے لیا ہے) جب وہ عذاب خدا کو دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ ہے نہ کہ ان خیالی معبودوں کے ہاتھ جن سے وہ ڈرتے ہیں) اور خدا کا عذاب اور سزا شدید ہے۔

۱۶۶۔ اس وقت (انسانی و شیطانی معبود اور) رہبر اپنے پیروکاروں سے بیزار ہوں گے۔ وہ عذاب خدا کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔

۱۶۷۔ تب پیروکار کہیں گے کاش ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تاکہ ہم بھی ان سے اسی طرح بے بیزاری اختیار کریں جس طرح آج یہ ہم سے بیزار ہیں۔ (ہاں) یونہی خدا انہیں ان کے اعمال حسرت دکھائے گا (اور انہیں اپنے اعمال سراپا یاس دکھائی دیں گے) اور وہ ہرگز (جہنم کی) آگ سے خارج نہیں ہوں گے۔

تفسیر

پہلے کی دو آیات میں وجود خدا اور اس کی توحید و یگانگت کو نظام خلقت اور اس کی ہم آہنگی کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے محل بحث آیات میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے ان واضح اور قطعی براہین سے چشم پوشی کی، شرک و بت پرستی اختیار کی اور متعدد خدا قرار دے لئے۔ یہ گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے خشک لکڑی کے زوال پذیر معبودوں کے سامنے سر تعظیم خم کیا ہے ان سے ایسا عشق کرتے ہیں جیسا عشق صرف خدا تعالیٰ کے لائق ہے جو تمام کمالات کا منبع و مرکز ہے اور تمام نعمات بخشنے والا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ اپنے لئے خدا کے علاوہ معبود انتخاب کرتے ہیں (ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً)[1] انہوں نے نہ صرف بتوں کو اپنا معبود قرار دے لیا تھا بلکہ ان کے اس طرح عاشق ہو گئے تھے جیسے خدا سے

---

[1] "انداد" جمع ہے "ند" کی جس کا معنی ہے "مثل" لیکن بعض اہل لغت کے بقول اس مثل کو ند کہتے ہیں جو دوسری چیز سے جوہری و اصلی شباہت رکھتی ہو جبکہ مثل کا مفہوم عمومی ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا کہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بت جوہر ذات میں خدا سے شباہت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جہالت و نادانی کی وجہ سے ان کے لئے خدائی صفات کے قائل تھے۔

محبت کی جاتی ہے (یحبونھم کحب اللہ)۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں (والذین اٰمنوا اشد حبا للہ) کیونکہ وہ فکر و نظر اور علم و دانش کے حامل ہیں اور وہ اس کی ذات پاک کو ہرگز نہیں چھوڑتے جو تمام کمالات کا منبع و مخزن ہے وہ اس کے اور اُس کے پیچھے نہیں جاتے۔ ان کے نزدیک خدا کی محبت، عشق اور لگاؤ کے مقابلے میں ہر چیز بے قیمت، ناچیز اور حقیر ہے وہ غیر خدا کو اس محبت کے بالکل لائق نہیں سمجھتے مگر یہ کہ یہ محبت اس کے لئے اور اُسی کی راہ میں ہو لہٰذا وہ عشق کے بحر بیکراں میں اس طرح غوطہ زن ہیں کہ بقول حضرت علیؑ:

فھبنی صبرت علی عذابک فکیف اصبر علی فراقک

پس فرض کیا کہ تیرے عذاب پر صبر کر لوں گا مگر تیرا فراق و جدائی کیسے برداشت کروں گا۔[۱]

اصولی طور پر حقیقی عشق و محبت ہمیشہ کسی کمال سے ہوتا ہے۔ انسان کبھی عدم اور نقص کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ وجود اور کمال کی جستجو میں رہتا ہے۔ اس لئے وہ ذات جس کا وجود اور کمال سب سے برتر، وسیع اور بے انتہا ہے عشق و محبت کے لئے سب سے زیادہ سزاوار ہے۔

خلاصہ یہ کہ جیسے مندرجہ بالا آیت کہتی ہے صاحبان ایمان کی خدا سے محبت، عشق اور وابستگی بت پرستوں کی اپنے خیالی معبودوں کی نسبت زیادہ حقیقی، گہری اور شدید ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو، کیونکہ جس نے حقیقت کو پا لیا ہے اور اس سے محبت کی ہے وہ ہرگز اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو خرافات و تخیلات میں گرفتار ہو۔ مومنین کے عشق کا سرچشمہ عقل، علم اور معرفت ہے اور کفار کے عشق کی بنیاد جہالت، خرافات اور خواب و خیال ہے۔ اسی لئے پہلی قسم کی محبت کبھی متزلزل نہیں ہو سکتی لیکن مشرکین کے عشق میں ثبات و دوام نہیں۔ لہٰذا آیت گرباری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ ظالم جب عذاب خدا کو دیکھیں گے اور جان لیں گے کہ تمام قدرتیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی عذاب شدید کا مالک ہے اس وقت اپنے اعمال کی پستی و حماقت اور اپنے کرتوتوں کے برے انجام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اعتراف و اقرار کریں گے کہ ہم عاجز اور منحرف لوگ تھے (ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للہ جمیعا و ان اللہ شدید العذاب)[۲]۔

بہرحال اس وقت جہالت، غرور اور غفلت کا پردہ اُن کی آنکھوں سے اٹھ جائے گا اور وہ اپنے اشتباہ اور غلطی کو جان لیں گے لیکن چونکہ ان کے لئے کوئی پناہ گاہ اور سہارا نہ ہوگا لہٰذا سخت بے چارگی میں وہ بے اختیار اپنے معبودوں اور رہبروں کے دامن تھامنے کو لپکیں گے مگر اس وقت ان کے گمراہ رہبران کو پیچھے دھکیل دیں گے اور وہ اپنے پیرو

---

۱ دعائے کمیل میں ہے۔

۲ بعض مفسرین نے لفظ "لو" کو تمنائی کہا ہے لیکن بہت سے اسے شرطیہ سمجھتے ہیں اس صورت میں اس کی جزا محذوف ہوگی اور جملہ یوں ہوگا۔ "لرأوا اسوء فعلھم و سوء عاقبتھم"

کاروں سے اظہارِ بیزاری کریں گے (اذا تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا)۔
اسی حالت میں وہ اپنی آنکھوں سے عذابِ الٰہی دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے (ورأوا العذاب وتقطعت بھم الاسباب)۔

واضح ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد پتھر اور لکڑی کے بت نہیں بلکہ وہ جابر و قاہر انسان اور شیاطین ہیں کہ مشرکین اپنے تئیں دست بستہ جن کے اختیار میں دے چکے ہیں لیکن وہ بھی اپنے پیروکارں کو دھتکار دیں گے۔

ایسے میں جب یہ گمراہ پیروکار اپنے معبودوں کی یہ کھلی بے وفائی دیکھیں گے تو اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہیں گے: کاش ہم دنیا میں پلٹ جائیں تو ان سے بیزاری اختیار کریں گے جیسے وہ آج ہم سے بیزار ہیں (وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرأ منھم کما تبرءوا منا)۔

لیکن اب کیا فائدہ معاملہ تو ختم ہو چکا ہے۔ اب دنیا کی طرف پلٹنا ممکن نہیں رہا۔ ایسی ہی گفتگو سورہ زخرف آیہ ۳۸ میں ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ ۝

قیامت کے دن جب وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو گمراہ کرنے والے رہبر سے کہیں گے:
اے کاش تیرے میرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ہاں اسی طرح ان کے اعمال ان سب کے لیے سبب حسرت و یاس بنا کر پیش کرے گا (کذلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم) اور وہ کبھی جہنم کی آگ سے نہیں نکلیں گے (وما ھم بخارجین من النار)۔

واقعاً وہ حسرت و یاس میں گرفتار ہونے کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں۔ ان اموال پر حسرت جو انہوں نے جمع کئے اور فائدہ دوسروں نے اٹھایا۔ ان بے پناہ وسائل پر حسرت جو نجات و کامیابی کیلئے ان کے ہاتھ میں تھے مگر انہوں نے ضائع کر دیئے اور ان معبودوں کی عبادت پر حسرت خدائے قادر و متعال کی عبادت کے مقابلے میں جن کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن یہ حسرت کس کام کی کیونکہ اب نہ عمل کا موقع ہوگا اور نہ یہ کمی کو پورا کر سکے گی بلکہ وہ تو سزا اور اعمال کا نتیجہ و ثمر دیکھنے کا وقت ہوگا۔

۱۶۸۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖ٘ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝

۱۶۹۔ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۶۸۔ اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے نشانِ پا کی پیروی نہ کرو بلکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۱۶۹۔ وہ تمہیں فقط برائیوں اور انحرافات کا حکم دیتا ہے۔ نیز (کہتا ہے کہ) جن امور کو تم نہیں جانتے انہیں خدا کی طرف منسوب کردو۔

شانِ نزول

ابنِ عباس سے منقول ہے کہ عرب کے بعض قبیلوں مثلاً ثقیف، خزاعہ وغیرہ نے بعض زرعی اجناس اور جانوروں کو بغیر کسی دلیل کے اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا (یہاں تک کہ ان کی تحریم کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے) اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں انہیں اس نازیبا عمل سے روکا گیا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں شرک و بت پرستی کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ شرک کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کو قانون ساز سمجھے اور نظام تشریع اور حلال و حرام اس کے اختیار میں قرار دیدے۔ محلِ بحث آیات میں ایسے عمل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ (یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبا)۔

اور شیطان کے نقوشِ قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا واضح دشمن ہے (ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مختلف غذاؤں سے فائدہ اٹھانے سے مربوط آیات قرآن میں کئی مقام پر ہیں اور عموماً ان میں دو قیود کا ذکر ہے حلال اور طیب۔ حلال وہ ہے جس سے روکا نہ گیا ہو اور طیب ان چیزوں کو کہتے ہیں جو پاک و پاکیزہ اور انسان کی طبع سلیم کے مطابق ہوں۔ طیب کے مدمقابل خبیث ہے جس سے مزاجِ انسانی نفرت کرتا ہے۔

خطوات جمع ہے خطوہ (بر وزن "قربہ") کی۔ اس کا معنی ہے قدم۔ خطوات الشیطان سے مراد وہ قدم ہیں جو شیطان اپنے مقصد تک پہنچنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اٹھاتا ہے۔

• "لا تتبعوا خطوات الشیطان" قرآن میں پانچ مقامات پر دکھائی دیتا ہے۔ دو مقامات پر غذا اور خدائی رزق سے استفادہ کرنے کے ضمن میں ہے۔ در اصل انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حلال نعمتوں کو بے محل استعمال نہ کریں اور نعمات الٰہی کو خدا کی اطاعت و بندگی کا ذریعہ قرار دیں نہ کہ طغیان، سرکشی اور فساد کا۔

شیطان کے نقوش پا کی پیروی حقیقت میں وہی بات ہے جو دیگر آیات میں حلال غذاؤں سے استفادہ کرنے کے حکم کے بعد ذکر ہوئی ہے۔ مثلاً

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

رزق الٰہی میں سے کھاؤ پیو مگر زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ (بقرہ۔ ۶۰)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ

وہ پاکیزہ رزق جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کھاؤ مگر اس میں طغیان و سرکشی نہ کرو۔

(طٰہٰ۔ ۸۱)

خلاصہ یہ کہ یہ عطیات اور اسباب اطاعت کے لئے تقویت بخش ہونے چاہئیں گناہ کا ذریعہ نہیں۔

"انہ لکم عدو مبین" قرآن حکیم میں دس سے زیادہ مرتبہ شیطان کے ذکر کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس واضح دشمن کے مقابلے میں اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں یکجا کرے۔

شیطان جس کا مقصد انسان کی بدبختی اور شقاوت کے سوا کچھ نہیں اگلی آیت اس کی انسان سے شدید ترین دشمنی کو بیان کرتی ہے۔ فرمایا: وہ صرف تمہیں طرح طرح کی برائیوں اور قباحتوں کا حکم دیتا ہے (انما یأمرکم بالسوء والفحشاء) نیز تمہیں آمادہ کرتا ہے کہ خدا پر افتراء باندھو اور جو چیز تم نہیں جانتے ہو اس کی خدا کی طرف نسبت دو (وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون)۔

ان آیات سے ظاہر ہوا کہ شیطان کے پروگراموں کا خلاصہ یہی تین امور ہیں۔ برائیاں، قباحتیں اور ذات پروردگار سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنا۔

"فحشاء" کا مادہ ہے "فحش" جس کا مطلب ہر وہ چیز ہے جو حد اعتدال سے خارج ہو کر فاحش کی شکل اختیار کر لے اس لحاظ سے تمام منکرات اور واضح قباحتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہ جو آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ عفت و پاکدامنی کے منافی افعال کے لئے استعمال ہوتا ہے یا ان گناہوں پر بولا جاتا ہے جو حد شرعی رکھتے ہیں تو یہ لفظ کے کلی مفہوم کے بعض واضح مصادیق ہیں۔

ان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون — ممکن ہے یہ ان حلال غذاؤں کی طرف اشارہ ہو جنہیں زمانہ جاہلیت کے عرب حرام قرار دے رکھا تھا اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے بلکہ بعض بزرگ مفسرین کے بقول اس طرز فکر کی رسومات تازہ مسلمانوں کے بعض گروہوں میں بھی باقی رہ گئی تھیں۔[1]

خدا کی طرف شریک و شبیہ کی نسبت دینا اس آیت کا زیادہ وسیع معنی ہے اور یہ بھی آیت کے مفاہیم میں شامل ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۴۲۵

بہر حال یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے امور کا مطلب علم کے بغیر بات کرنا ہے اور وہ بھی خدا کے مقابلے میں جب کہ یہ کام کسی منطق اور عقل و خرد کی رو سے صحیح نہیں۔

اگر لوگ اصولی طور پر اس بات سے پابند ہوں کہ وہ وہی بات کریں گے جس کا کوئی قطعی اور یقینی مدرک ہے تو انسانی معاشرے سے بہت سی بدبختیاں اور تکالیف دور ہو سکتی ہیں در حقیقت خدائی مذاہب میں جو خرافات شامل ہو گئے ہیں وہ اسی طرح بے منطق افراد کے ذریعے ہوئے ہیں۔ بگڑے ہوئے اعتقادات اور اعمال اسی بنیاد کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے ہیں لہٰذا خطوات شیطان کے مستقل عنوان کے تحت مندرجہ بالا آیت میں برائیوں اور قباحتوں کے ساتھ اس عمل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) اصل حلیت: یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ روئے زمین پر موجود تمام غذائیں بنیادی طور پر حلال ہیں اور حرام غذائیں صرف استثنائی پہلو رکھتی ہیں لہٰذا کسی چیز کا حرام ہونا دلیل کا محتاج ہے نہ کہ حلال ہونا۔ دوسری طرف قوانین تشریعی کو چونکہ قوانین تکوینی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے لہٰذا آفرینش و خلقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ زیادہ وضاحت سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے یقیناً اس میں کوئی فائدہ ہے اور وہ بندوں کے استفادہ کے لیے ہے لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں کہ کوئی چیز بنیادی طور پر حرام ہو۔ لہٰذا ہر وہ غذا جس کی حرمت پر کوئی صحیح دلیل موجود نہ ہو جب تک وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر باعثِ فساد اور ضرر رساں نہ ہو اس آیت شریفہ کی روشنی میں حلال ہے

(۲) تدریجی انحرافات: خطوات الشیطان (شیطان کے نقوش پا)— یہ الفاظ ایک دقیق تربیتی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ کجرویاں اور تباہ کاریاں آہستہ آہستہ انسان میں نفوذ کرتی ہیں نہ کہ دفعتاً۔ مثلاً جب کوئی نوجوان منشیات، قمار اور شراب سے آلودہ ہوتا ہے تو یہ معاملہ کئی مراحل کے بعد آتا ہے۔ پہلے وہ ایک تماشائی کے طور پر ایسے لوگوں میں شریک ہوتا ہے اور اس کے انجام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

دوسرے مرحلے پر وہ قمار بازی میں بغیر نفع یا نقصان کے شریک ہوتا ہے اور اسی طرح منشیات سے تکان دور ہونے یا علاج کے بہانے استفادہ کرتا ہے۔

تیسرے مرحلے میں وہ ان امور سے تھوڑا بہت فائدہ حاصل کرنے لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ بہت جلد ان سے صرفِ نظر کر لوں گا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے قدم اٹھتے ہیں۔

اور بالآخر وہ شخص ایک قمار باز اور نشے کا خطرناک عادی مجرم بن جاتا ہے۔ یہ شیطانی وسوسے عموماً آہستہ آہستہ، تدریجاً ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ کام فقط وہ ایک مشہور شیطان نہیں کرتا بلکہ شیطانی قوتیں اپنے غلط منصوبوں کو اسی طرح عملی جامہ پہناتی ہیں اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ پہلے قدم پر ہی ہوش میں آ کر شیطان کی ہمراہی سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔

احادیث اسلامی میں بے ہودہ خرافات اور بے منطق کاموں کو خطوات شیطان قرار دیا گیا ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کے لئے ذبح کرے گا۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

ذالك من خطوٰت الشيطان۔

یہ شیطانی اقدامات میں سے ہے[1]

ایک اور روایت میں امام صادقؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

جو شخص کسی ایسی چیز کو ترک کرنے کی قسم کھائے کہ جس کا انجام دینا بہتر ہے تو وہ ایسی قسم کی پرواہ نہ کرے اور اس کار خیر کو بجالائے۔ اس کا کفارہ بھی نہیں ہے اور وہ خطوات شیطان میں سے ہے۔[2]

ایک اور حدیث امام باقرؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

كل يمين بغير الله فهو من خطوٰت الشيطان

جو قسم غیر خدا کی کھائی جائے وہ خطوات شیطان میں سے ہے[3]

(iii) **شیطان پرانا دشمن ہے:** آیت کے آخر میں شیطان کو واضح دشمن قرار دیا گیا ہے۔ یہ یا تو اس دشمنی کی بنا پر ہے جو اسے پہلے دن سے حضرت آدمؑ سے تھی جب کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکم کی نافرمانی کرکے ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھا یا اس لئے ہے کہ قتل، جارحیت اور تباہ کاری پر مبنی اس کے دعوتیں، کرتوت اور طریقے سب پر واضح ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ایسے کام کسی دوست کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔ ایسے کام جن کا نتیجہ بدبختی اور پشیمانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ان کی دعوت ایک خطرناک دشمن کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے۔

یہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان سے اپنی دشمنی کا صراحت سے اعلان کیا ہے اور اس نے انسان کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور اُس نے کہہ رکھا ہے کہ:

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

مجھ سے ہو سکا تو سب کو گمراہ کر دوں گا۔ (حجر - ۳۹)

(iv) **شیطانی وسوسوں کی کیفیت:** یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت کہتی ہے شیطان تمہیں حکم دیتا ہے کہ برائیوں اور قباحتوں کی طرف جاؤ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ "امر" سے مراد شیطانی وسوسہ ہی ہے۔ حالانکہ برائی انجام دیتے وقت ہمیں اپنے وجود سے باہر سے کسی امر اور تحریک کا احساس نہیں ہوتا اور ہمیں شیطان کے گمراہ کرنے کی کسی کوشش کا داخلی احساس نہیں ہوتا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جیسے لفظ وسوسہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ ایک طرح کی وجود انسانی میں شیطانی تاثیر ہے۔

---

[1]، [2]، [3] المیزان، ج ۱، ص ۴۱۹

جو مخفی اور نا معلوم قسم کی ہے۔ بعض آیات میں اسے "وحی" اور "ایحاء" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۲۱ میں ہے:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ

شیاطین اپنے دوستوں اور ان لوگوں کو جو ان کے احکام قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں وحی کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وحی مخفی اور مرموز آواز ہے جس کی تاثیرات اکثر نامعلوم طرح کی ہیں۔

البتہ انسان خدائی الہامات اور شیطانی وسوسوں میں واضح تمیز کر سکتا ہے کیونکہ خدائی الہامات کی پہچان کی واضح علامت موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ خدائی الہامات چونکہ انسان کی پاک فطرت اور اس کے جسم و روح کی ساخت سے آشنا ہیں اس لئے جب وہ دل میں پیدا ہوتے ہیں تو انبساط و نشاط کی کیفیت بخشتے ہیں جب کہ شیطانی وسوسے انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہیں اس لئے جب وہ دل میں پیدا ہوتے ہیں اس وقت ایک طرح کی گھٹن، تکلیف اور سنگینی کا احساس پیدا ہوتا ہے اگر انسان کے رجحانات یہاں تک جا پہنچیں کہ برا کام انجام دیتے وقت اس میں یہ احساس پیدا نہ ہو تب بھی کام انجام دینے کے فوراً بعد یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے فرق شیطانی اور رحمانی الہامات کے درمیان۔

۱۷۰۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

۱۷۱۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۰۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں: ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباء و اجداد نہ کسی چیز کو سمجھتے ہیں اور نہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۱۷۱۔ کافروں کو دعوت دینے میں (تمہاری) مثال اس شخص کی سی ہے جو (بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو خطرات سے بچانے کے لئے) آواز دیتا ہے لیکن وہ صدا اور پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے (اور اس کی بات کی حقیقت اور مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے) وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لئے کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

تفسیر

آباؤ اجداد کی اندھی تقلید

یہاں مشرکین کی کمزور منطق حلال غذاؤں کی بلا جواز تحریم یا بطور کلی بت پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہم نے جس طریقے پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے اسی کی پیروی کریں گے (و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اٰباءنا)۔[1]

قرآن اس بیہودہ اور خرافاتی منطق کی فوراً خبر لیتا ہے جو آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے (اولو کان اٰباءھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون)۔ یعنی اگر وہ پڑھے لکھے اور ہدایت یافتہ لوگ ہوتے تو گنجائش تھی کہ ان کی پیروی کی جاتی لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ان پڑھ، نادان اور توہم پرست تھے کیا تُک ہے کہ ان کی پیروی کی جائے کیا یہ جاہل کی تقلید کا مصداق نہیں؟

قومیت اور قومی تعصبات کا مسئلہ بالخصوص جو آباؤ اجداد سے مربوط ہو مشرکین میں خصوصاً اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں میں عموماً پہلے دن سے موجود تھا اور آج تک جاری و ساری ہے لیکن خدا پرست اور صاحبانِ ایمان اس منطق کو رد کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے بہت سے مواقع پر آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور تعصب کی شدید مذمت کی ہے اور اس نے آنکھ کان بند کر کے آباؤ اجداد کی تقلید کرنے کو رد کر دیا ہے۔

اصولی طور پر اپنی عقل و فکر کو دست بستہ بڑوں کے سپرد کر دینے کا نتیجہ دقیانوسی رجعت پسندی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ عموماً بعد والی نسلیں گزشتہ نسلوں سے زیادہ علم و آگہی رکھتی ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ جاہلانہ طرز فکر آج بھی بہت سے افراد اور ملل پر حکمرانی کرتی ہے اور وہ لوگ اپنے بڑوں کی بتوں کی طرح پرستش کرتے ہیں اور بعض خرافاتی آداب و رسوم کو فقط اس لئے بے چون و چرا مان لیتے ہیں کہ یہ بزرگوں کے آثار ہیں اور انہیں لباس پہنا دیتے ہیں مثلاً قومیت کی حفاظت، تاریخی اسناد کا تحفظ وغیرہ۔ یہ طرز فکر ایک نسل کے خرافات دوسری نسل میں منتقل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ آنے والی نسلیں گزر جانے والوں کے آداب و سنن کا تجزیہ کریں اور ان میں سے جو عقل و منطق کے مطابق ہوں ان کی بڑے احترام سے حفاظت کریں اور جو بے بنیاد خرافات و موہومات ہوں انہیں دور پھینک دیں۔ اس سے بہتر کون سا کام ہو سکتا ہے اور ایسی تنقید گزشتہ لوگوں کے آداب و سنن میں ملی و تاریخی

---

[1] "الفینا" کا معنی ہے "ہم نے پایا" اور پیروی کی۔

اہمیت کی حامل چیزوں کی حفاظت کہلانے کی اہل ہے لیکن ہر پہلو سے انہیں قبول کر لینا اور اندھی تقلید کرنا سوائے خرافات پرستی اور رجعت پسندی کے کچھ نہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کے متعلق مندرجہ بالا آیت میں خدا فرماتا ہے: وہ نہ کسی چیز کو سمجھ سکتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔ یعنی دو قسم کے افراد کی پیروی کی جا سکتی ہے ایک وہ شخص جو علم اور عقل و دانش رکھتا ہو، دوسرا وہ جو خود صاحب علم نہیں تاہم اس نے کسی عالم کے علم و دانش کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن ان کے آباؤ اجداد خود صاحبانِ علم و دانش تھے نہ ان کا کوئی ہادی و رہبر تھا اور یہ واضح ہے کہ نادان و جاہل جب نادان و جاہل کی تقلید کرتا ہے تو یہی تقلید مخلوق کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔ ایسی تقلید پر ہزار لعنت ہے۔

بعد کی آیت کہتی ہے کہ یہ گروہ ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے کیوں حق کی طرف نہیں پلٹتا اور کیوں گمراہی و کفر پر اصرار کرتا ہے۔ فرمایا: اس کافر قوم کو ایمان لانے اور اندھی تقلید چھوڑنے کی دعوت دیتے ہوئے تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جو بھیڑوں اور دیگر جانوروں کو (خطرے سے نجات دلانے کے لئے) آواز دیتا ہے لیکن وہ ایک پکار اور صدا کے سوا کچھ نہیں سمجھ پاتے (ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء و نداء)۔

واقعاً وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں جو خیر خواہ اور دلسوز چرواہے کی داد و فریاد کو ایک ترانۂ سرد کے علاوہ نہیں سمجھتے جو ان کے لئے ایک وقتی تحریک ہی ہو سکتی ہے۔ آیت کے آخر میں تاکید اور مزید وضاحت کے لئے فرماتا ہے: وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے (صم بکم عمی فهم لا یعقلون)۔

جبھی تو وہ اپنے آباؤ اجداد کی غلط رسموں اور خرافاتی طریقوں سے چپٹے ہوئے ہیں اور ہر اصلاحی دعوت سے انہوں نے منہ موڑ رکھا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے۔ ان کے مطابق یہ اس طرح ہے: ان لوگوں کی مثال جو بتوں اور مصنوعی خداؤں کو پکارتے ہیں اس شخص کی سی ہے جو بے شعور جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ نہ وہ جانور چرواہے کی کسی بات کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ یہ مصنوعی معبود اپنے عبادت گزاروں کی باتیں سمجھتے ہیں کیونکہ یہ بت بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔

لیکن اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو منتخب کیا ہے اور روایاتِ اسلامی بھی اسی کی موید ہیں۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق آیت تقدیر کی محتاج ہے۔ گویا اصل میں یوں ہے "مثل داعی الذین کفروا الخ" یعنی کافروں کو ایمان کی دعوت دینے والے کی مثال اس چرواہے کی سی ہے۔ اس بناء پر صم بکم عمی فهم لا یعقلون ایسے لوگوں کی توصیف ہے جنہوں نے ادراک کے تمام آلات عملاً ضائع کر دیئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی آنکھ، کان اور زبان نہیں ہے بلکہ وہ اس سے چونکہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے گویا نہیں ہے۔

چند اہم نکات

(۱) پہچان کے آلات: اس میں شک نہیں کہ باہر کی دنیا سے انسان کا رابطہ آلات کا محتاج ہے جنہیں پہچان کے آلات کہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم آنکھ، کان اور زبان ہیں جو دیکھنے سننے اور بولنے کے کام آتے ہیں۔ اس لئے مندرجہ بالا آیت میں آلات تمیز سے استفادہ نہ کرنے والوں کو بہرا، گونگا اور اندھا قرار دینے کے بعد فاء تفریع کا استعمال نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور بلا فاصلہ ارشاد ہوتا ہے: اسی لئے وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔ اس طرح قرآن گواہی دیتا ہے کہ بنیادی طور پر علم و دانش کے اسباب آنکھ، کان اور زبان ہیں۔ آنکھ اور کان براہ راست ادراک کے لئے اور زبان دوسروں سے استفادہ کے لئے ہے۔

فلسفے میں بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ غیر حسی علوم کا سرچشمہ بھی ابتداً علوم حسی ہیں۔ یہ ایک وسیع بحث ہے اور یہ مقام اس کی تشریح کا نہیں ہے۔

آلات تمیز کی نعمت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کی گیارھویں جلد میں سورۂ نحل آیہ ۷۸ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۲) ینعق کا مفہوم: اس کا مادہ "نعق" ہے۔ اصل میں یہ کوے کی اس آواز کو کہتے ہیں جس میں شور نہ ہو۔ جب کہ "نغق" کوے کی اس آواز کو کہتے ہیں جس میں شور و غل ہو اور کوا گردن بھی بلند کئے ہو۔[1]

بعد ازاں "نعق" کے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اب اس کے معنی وہ آوازیں ہیں جو جانوروں کے سامنے نکالی جائیں۔ واضح ہے کہ وہ تو کلمات کے مفاہیم سے آگاہ نہیں ہوتے اور اگر ان پر کبھی کچھ اثر ہوتا ہے تو آواز اور الفاظ کی ادائیگی کے طرز و طریقہ سے ہوتا ہے۔

۱۷۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝

۱۷۳۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

---

[1] مجمع البیان، آیت محل بحث کے ذیل میں۔

ترجمہ

۱۷۲۔ اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک و پاکیزہ چیزیں (شوق سے) کھاؤ اور اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر بجالاؤ۔

۱۷۳۔ اس نے تم پر مردہ جانور، خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر (ذبح کرتے وقت) غیر خدا کا نام لیا گیا ہو حرام کیا ہے۔ پس جو شخص مجبور ہو کر، اگر وہ سرکشی و زیادتی کرنے والا نہ ہو ان میں سے کچھ کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

وہ بکرو یاں جو جڑ پکڑ چکی ہیں ان کی اصلاح کے لئے قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ مختلف طرزوں اور طریقوں کی تاکید و تکرار سے استفادہ کرتا ہے۔ ان آیات میں زمانہ جاہلیت میں مشرکین کی حرام کردہ حلال غذاؤں کے بارے میں دوبارہ گفتگو کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب روئے سخن مومنین کی طرف ہے جب کہ گزشتہ آیات میں تمام لوگ (یاایھا الناس) مخاطب تھے۔ فرماتا ہے: اے ایمان والو! ان پاکیزہ نعمتوں میں سے جو میں نے تمہیں روزی دی ہے اسے کھاؤ (یاایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم)۔ اگر خدا ہی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس کا شکر ادا کرو (واشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون) یہ پاک و حلال نعمتیں جو ممنوع نہیں ہیں، انسان کی فطرت سلیم کے موافق ہیں اور تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں تم ان سے کیوں استفادہ نہیں کرتے۔ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے یہ تمہیں قوت بخشتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تمہیں شکر و عبادت کے لئے پروردگار کی یاد دلاتی ہیں۔

اسی سورہ کی آیت ۱۶۸ — یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض — کا اگر اس آیت سے تقابل کیا جائے تو دو لطیف نکتے سمجھ میں آتے ہیں۔

۱۔ یہاں فرماتا ہے: من طیبٰت ما رزقنٰکم (پاک غذاؤں میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے)، جب کہ وہاں فرماتا ہے: مما فی الارض (جو کچھ زمین میں ہے) یہ فرق گویا اس طرف اشارہ ہے کہ پاکیزہ نعمتیں اصل میں اہل ایمان افراد کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور بے ایمان لوگ ان کے صدقے میں روزی حاصل کرتے ہیں۔ جیسے باغبان پانی تو پھلوں اور پھولوں کے لئے دیتا ہے لیکن کانٹے اور فضول گھاس پھوس بھی اس سے فائدہ اٹھا لیتی ہے۔

۲۔ عام لوگوں سے کہتا ہے: کھاؤ لیکن شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ جب کہ مومنین سے زیر نظر آیت میں کہتا ہے: کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔ یعنی صرف نعمتوں سے سوء استفادہ سے نہیں روکتا بلکہ حسن استفادہ کی شرط عاید کرتا ہے۔ درحقیقت عام لوگوں سے صرف یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ گناہ نہ کریں لیکن صاحبان ایمان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان نعمتوں کا بہترین استعمال کریں۔

ممکن ہے پاکیزہ غذاؤں سے استفادہ کرنے کے بارے میں متعدد آیات میں بار بار کی تاکید بعض لوگوں کے لئے تعجب

کا باعث ہو لیکن اگر زمانہ جاہلیت کی تاریخ پر نظر کی جائے تو یہ حیرت نہیں رہتی۔ ان لوگوں نے بیہودہ رسومات و آداب اختیار کر رکھے تھے۔ بغیر کسی دلیل کے جائز نعمتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا اور یہ بات ان میں اس طرح راسخ تھی کہ وہ ان امور کو دینی احکام کی طرح سمجھتے تھے بلکہ بعض اوقات تو بالصراحت ایسی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ اس لئے قرآن نے اتنی تاکید و تکرار کی ہے کیونکہ قرآن یہ بے بنیاد اور بے ہودہ افکار ان کے ذہنوں سے پوری طرح نکال دینا چاہتا ہے۔

طیب غذاؤں کا ذکر سب کو اس اسلامی حکم کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ آلودہ اور ناپاک غذاؤں سے پرہیز کریں جن میں سور کا گوشت، درندے، حشرات الارض اور نشہ آور چیزیں شامل ہیں اور یہ چیزیں اس زمانے کے لوگوں میں شدت و کثرت سے مروج تھیں۔

اس تفسیر کی چھٹی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۳۲ کے ضمن میں مومنین کے لئے پاکیزہ غذاؤں اور معقول زینتوں سے استفادہ کرنے کے متعلق تفصیلی بحث آئے گی۔

اگلی آیت میں حرام اور ممنوع غذاؤں کو واضح کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ہر طرح کے بہانوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے مردار کا گوشت، خون، سور کا گوشت اور اس جانور کا گوشت جسے ذبح کرتے ہوئے غیر خدا کا نام لیا جائے حرام کیا ہے (انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله)۔

یہاں پر چار طرح کے گوشت اور خون کی حرمت کا حکم ہے۔ یاد رہے کہ خون ان لوگوں کو بہت مرغوب تھا۔ ان میں سے بعض چیزوں میں تو ظاہری نجاست ہے جیسے مردار، خون اور سور کا گوشت اور بعض میں معنوی نجاست ہے جیسے وہ قربانیاں جو وہ بتوں کے لئے کیا کرتے تھے۔

آیت سے بالعموم اور لفظ "انما" جو کلمہ حصر ہے اور اصطلاحی طور پر حصر اضافی ہے سے بالخصوص ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد تمام محرمات کو بیان کرنا نہیں بلکہ اصل غرض بدعات کی نفی ہے جو بعض حلال غذاؤں کو حرام قرار دے کر انہوں نے جاری کی ہوئی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے کچھ پاکیزہ اور حلال گوشت خرافات اور توہمات کے نتیجے میں اپنے اوپر حرام قرار دیئے ہوئے تھے۔ لیکن غذا کی کمی کے وقت وہ مردار، سور کا گوشت اور خون تک استعمال کر لیتے تھے۔ قرآن انہیں بتاتا ہے کہ یہ تمہارے لئے حرام ہیں نہ کہ وہ (اور یہی حصر اضافی کا مطلب ہے)۔

بعض اوقات ایسی ضروریات پیش آتی ہیں کہ انسان بعض حرام چیزوں کے استعمال پر بھی مجبور ہو جاتا ہے لہذا قرآن اس استثنائی پہلو کے بارے میں کہتا ہے: لیکن جو شخص (اپنی جان کے تحفظ کے لئے) مجبور ہو کر انہیں کھا لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ ظالم و متجاوز نہ ہو (فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه)۔ اس بنا پر کہ کہیں اضطرار کو بہانہ ہی نہ بنا لیا جائے ان حرام غذاؤں کے کھانے میں زیادتی اور تجاوز روکنے کے لئے "غیر باغ ولا عاد" فرمایا گیا ہے۔

یعنی یہ اجازت صرف ان افراد کے لئے ہے جو ان محرمات کو لذت کے لئے نہ کھانا چاہیں اور اتنا ہی کھائیں جتنا حفظ جان کے لئے ضروری ہو اس سے تجاوز نہ کریں۔ باغ اور عاد اصل میں باغی اور عادی ہیں۔ باغی کا مادہ ہے "بغی"

جس کا معنی ہے طلب کرنا یہاں مقصود طلب لذت ہے اور عادی تجاوز کے معنی میں ہے۔

"غیر باغ ولا عاد" کی ایک اور تفسیر بھی ذکر ہے جو پیش کردہ مفہوم سے متضاد نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں معانی آیت کے مفہوم میں شامل ہوں۔ وہ تفسیر یہ ہے کہ "بغی" کا ایک معنی ظلم و ستم بھی ہے۔ لہذا مقصد یہ ہوا کہ حرام گوشت کھانے کی اجازت فقط ان لوگوں کے لئے ہے جو ظلم و ستم اور گناہ کا سفر نہ کر رہے ہوں (سفر کا ذکر اس لئے ہے کہ عموماً اضطراری کیفیت اور مجبوری کی حالت سفر میں ہی درپیش ہوتی ہے) لہذا اگر سفر گناہ کے لئے ہو اور مسافر حالت مجبوری کو پہنچ جائے کہ حفظ جان کے لئے اسے حرام غذا کھانی پڑے تو اس کا گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اگرچہ ان ستمگروں کے لئے بحکم عقل واجب ہے کہ جان کی حفاظت کے لئے ایسے حرام گوشت کھائیں لیکن یہ وجوب اُن کی مسئولیت اور ذمہ داری میں کمی نہیں کر سکے گا۔

وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں ہے جو امام مسلمین کے خلاف اقدام نہ کریں دراصل ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جیسے نماز مسافر کے احکام میں آیا ہے کہ نماز قصر صرف ان مسافروں کے لئے ہے جن کا سفر حرام نہ ہو۔ اسی لئے "غیر باغ ولا عاد" سے روایات میں دونوں احکام کے لئے استدلال کیا گیا ہے (یعنی نماز مسافر اور حالتِ اضطرار میں گوشت کھانے کے احکام)۔[1]

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا غفور و رحیم ہے (ان اللہ غفور رحیم) وہی خدا جس نے یہ گوشت حرام قرار دیے ہیں اسی نے اپنی رحمتِ خاص سے شدید ضرورت کے وقت ان سے استفادہ کرنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) حرام گوشت کی تحریم کا فلسفہ: اس میں شک نہیں کہ زیر نظر آیت میں جو غذائیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ وہ دیگر خدائی محرمات کی طرح ایک خاص فلسفے کی حامل ہیں۔ انسانی جسم و جان اور اس کی کیفیت اور وضع کی تمام تر خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ روایاتِ اسلامی میں ان میں سے ہر ایک کے نقصانات اور حرمت کے مضرات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نیز علوم انسانی کی پیش رفت نے بھی ان سے پردہ اٹھایا ہے۔

کتاب کافی میں مردار کے گوشت کے متعلق امام صادقؑ سے مروی ہے:

اما المیتة فانه لم ینل منها احد الا ضعف بدنه وذهبت قوته وانقطع نسله ولا یموت آکل المیتة الا فجاة

---

[1] امام صادقؑ سے ایک روایت ہے کہ آپؑ نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرمایا:

باغی سے مراد وہ ہے جو شکار کے پیچھے سیر و تفریح کے طور پر (نہ کہ ضرورت و احتیاج کے لئے) جائے اور عادی سے مراد چور ہے۔ یہ دونوں حق نہیں رکھتے کہ مردار کا گوشت کھائیں وہ ان کے لئے حرام ہے اور یہ نماز قصر بھی نہیں پڑھ سکتے۔ (وسائل الشیعہ ج ۵، ص ۵۰۹)

(یہ فرمانے کے بعد کہ یہ تمام احکام مصالح بشر کے ماتحت ہیں امام فرماتے ہیں) باقی رہا مردار کا گوشت تو جو کوئی بھی اُسے کھائے گا اس کا بدن کمزور ہوگا اور تکالیف میں مبتلا ہوگا۔ اس کی قوت و طاقت ختم ہو جائے گی اور نسل منقطع ہو جائے گی اور جو ہمیشہ مردار کا گوشت کھاتا رہے گا سکتے کے عالم میں مرے گا۔[1]

ممکن ہے یہ نقصانات اس لئے ہوں کہ مردار سے غذا ہضم کرنے کا نظام صحیح خون نہیں بنا سکتا۔ علاوہ ازیں مردار طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اسلام نے نہ صرف مردار گوشت کو حرام کہا ہے بلکہ اسے نجس بھی قرار دیا ہے تاکہ مسلمان مکمل طور پر اس سے دُور رہیں۔

دوسری چیز جو آیت میں حرام قرار دی گئی ہے خون ہے (والدم)۔ خون کا استعمال کرنا جسم کے لئے بھی نقصان دہ ہے اور اخلاقی طور پر بھی برا اثر ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ ایسے مختلف جراثیم کی پرورش کرتا ہے جو پورے بدن میں داخل ہو کر انسانی خون پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسے ہی اپنی کارگزاری کا مرکز بناتے ہیں۔ سفید رنگ کے گلبول[2] جو ملک بدن کے محافظ ہیں، ہمیشہ اس کے خون کے علاقے کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ جراثیم اس حساس علاقے میں نہ پہنچ پائیں کیونکہ یہ بدن کے تمام حصوں سے قریبی رابطہ رکھتا ہے۔ خصوصاً جب جریانِ خون رک جائے اور اصطلاح کے مطابق مر جائے تو سفید گلبول بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے جب جراثیم میدان خالی دیکھتے ہیں تو بڑی تیزی سے انڈے دیتے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ خون کا جریان رک جائے تو یہ انسان اور حیوان کے بدن کا غلیظ ترین حصہ ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

دوسری طرف آج علم غذا شناسی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غذائیں غدودوں پر اثر انداز ہونے کے علاوہ انسانی نفسیات اور اخلاق پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں جب کہ خون انسان میں ہارمون پر اثر انداز ہو کر سنگدلی پیدا کرتا ہے۔ یہ بات تو قدیم زمانے سے مسلمہ ہے کہ خونخواری انسان میں قساوت و سنگدلی پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بات ضرب المثل ہو گئی ہے کہ سنگدل کو خونخوار کہتے ہیں اسی لئے ایک حدیث میں ہے۔

جو لوگ خون پیتے ہیں وہ اس قدر سنگدل ہو جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور اولاد تک کو قتل کر ڈالیں۔[3]

تیسری چیز جس کا کھانا آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے سؤر کا گوشت (ولحم الخنزیر) ہے۔

اہل یورپ زیادہ تر خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ گوشت بے غیرتی کا نشان بن گیا ہے۔ یہ ایسا گھٹیا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۶، صفحہ ۳۱۰

[2] خون کے خلیے (WHITE BLOOD CELLS) جو جراثیم کو بدن میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ (مترجم)

[3] وسائل شیعہ، ج ۱۶، صفحہ ۳۱۰

جاتا ہے کہ علم جدید کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا کھانا جنسی امور میں بے حیائی اور لاابالی کا باعث ہے اور یہی اس کی نفسیاتی تاثیر ہے جو مشاہدے میں آچکی ہے۔

شریعتِ حضرت موسیٰؑ میں بھی سور کا گوشت حرام تھا۔ موجودہ اناجیل میں گناہگاروں کو سور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ داستانوں میں سور کو مظہرِ شیطان کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ سور غلیظ چیزیں کھاتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنا ہی پاخانہ کھا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی سب پر واضح ہو چکا ہے کہ اس پلید جانور میں دو قسم کے خطرناک جراثیم پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کو تریشین (TRICHIN) اور دوسرے کو کرم کدو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کا گوشت کھانے پر مصر ہیں۔

صرف ایک تریشین (TRICHIN) ہر ماہ پندرہ ہزار انڈے دیتا ہے اور انسان میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے مثلاً خون کی کمی، سردرد، ایک مخصوص بخار، اسہال، درد رماتیسی، اعصاب کا تناؤ، جسم میں خارش، بدن میں چربی کی کثرت، تھکن کا احساس، غذا چبانے اور نگلنے میں دشواری، سانس کا رکنا وغیرہ۔

ایک کلو گوشت میں چالیس کروڑ تک نوزائیدہ تریشین (TRICHINS) ہو سکتے ہیں۔

انہی وجوہ کے پیشِ نظر چند سال پیشتر حکومتِ روس نے اپنے ایک علاقے میں سور کا گوشت کھانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

جی ہاں ـــــ روشن بینی کے یہ احکام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جن کے تازہ جلوے نمایاں ہوتے ہیں ہمیشہ رہنے والے دین اسلام ہی کا خاصہ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آج کے جدید وسائل کے ذریعے ان تمام جراثیم کو مارا جا سکتا ہے اور سور کا گوشت ان سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صحت کے جدید وسائل کے ذریعے یا سور کے گوشت کو زیادہ حرارت سے پکانے کے ذریعے یہ کیڑے کافی ختم بھی کر دیئے جائیں تو بھی سور کے گوشت کا نقصان دہ اور مضر ہونا قابلِ انکار نہیں ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ تو مسلم ہے کہ ہر جانور کا گوشت اس کی صفات کا حامل ہوتا ہے اور غدودوں (GLANDS) اور ہارمونز (HORMONES) کے ذریعے کھانے والے اشخاص کے اخلاق پر اثرانداز ہوتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے سور کھانے والے پر سور کی بے لگام جنسی صفات اور بے حیائی جو اس کی واضح خصوصیات میں سے ہے اثرانداز ہو جائے۔ مغربی ممالک میں جو شدید جنسی بے راہ روی پائی جاتی ہے اس کا ایک اہم سبب اس گندے جانور کے گوشت کا استعمال بھی ہو سکتا ہے۔

چوتھی چیز جسے زیرِ نظر آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ گوشت ہیں جن پر ذبح کرتے وقت غیر خدا کا نام لیا جائے (وما اھل بہ لغیر اللہ)۔ وہ گوشت جنہیں کھانے سے منع کیا گیا ہے ان میں ان جانوروں کا گوشت بھی شامل ہے جو زمانہ جاہلیت کی طرح غیر خدا (بتوں) کے نام پر ذبح ہوتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذبح کے وقت خدا یا غیر خدا کا نام لینا بھی صحت و سلامتی کے نقطۂ نظر سے جانور کے گوشت

پر اثر انداز ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ضروری نہیں کہ خدا یا غیر خدا کا نام صحت کے نقطہ نظر سے گوشت پر اثر انداز ہو کیونکہ اسلام میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اس کے مختلف پہلو ہیں۔ بعض اوقات کسی چیز کو صحت اور بدن کی حفاظت کے لئے کبھی تہذیب روح کے لئے اور کبھی نظام اجتماعی کے تحفظ کے لئے حرام قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بتوں کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کے گوشت کی حرمت درحقیقت معنوی، اخلاقی اور تربیتی پہلو سے ہے۔

(ii) **تکرار و تاکید:** جن چار چیزوں کی حرمت کا ذکر بیان کیا گیا ہے قرآن میں چار مقامات پر اسی طرح آیا ہے۔ دو مرتبہ مکہ میں (انعام۔ ۱۴۵ اور نحل۔ ۱۱۵) اور دو مرتبہ مدینہ میں (بقرہ ۱۷۳ اور مائدہ ۳) یہ حکم نازل ہوا۔

یوں لگتا ہے کہ پہلی مرتبہ اوائل بعثت کا زمانہ تھا جب ان کی حرمت کی خبر دی گئی۔ دوسری مرتبہ پیغمبرؐ کے مکہ میں قیام کے آخری دن تھے۔ تیسری مرتبہ ہجرت مدینہ کے ابتدائی ایام تھے اور چوتھی دفعہ پیغمبرؐ کی عمر کے آخری دن تھے کہ سورہ مائدہ میں اسے بیان کیا گیا جو قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

نزول آیات کا یہ انداز جو بے نظیر یا کم نظیر ہے اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہے اور ان چیزوں میں موجود بہت زیادہ بدنی اور روحانی خطرات کی وجہ سے ہے اور اس بنا پر بھی کہ لوگ ان کے کھانے میں زیادہ مبتلا تھے۔

(iii) **بیمار کو خون دینا:** شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ مندرجہ بالا آیت میں خون کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ خون پینا حرام ہے لہٰذا اس سے مناسب فائدہ حاصل کرنے میں کوئی اشکال نہیں مثلاً کسی مجروح یا بیمار کو موت سے بچانے کے لئے خون دینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ان مقاصد کے لئے تو خون کی خرید و فروخت کی حرمت کے لئے بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کیونکہ یہ تو عقلی طور پر صحیح ہے اور عمومی احتیاج کے موقع پر فائدہ اٹھانے کے ضمن میں آتا ہے۔

۱۷۴۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ ۚ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

۱۷۵۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْہُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَہُمْ عَلَی النَّارِ ○

۱۷۶۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ○ ع ربع

ترجمہ

۱۷۴۔ وہ لوگ جو اُسے چھپاتے ہیں جسے خدا نے کتاب میں نازل کیا ہے اور وہ اُسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ سوائے آگ کے کچھ نہیں کھاتے (یہ تحفے اور اموال جو وہ اس ذریعے سے حاصل کرتے ہیں درحقیقت ایک جلانے والی آگ ہے) اور قیامت کے دن خدا ان سے بات نہیں کرے گا۔ نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۱۷۵۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت اور عذاب کو بخشش کی بجائے خرید لیا ہے۔ عذاب الٰہی کے مقابلے میں واقعاً یہ کتنے بے پرواہ اور سرد مہری کا شکار ہیں۔

۱۷۶۔ یہ (سب کچھ) اس لئے ہے کہ خدا نے (آسمانی) کتاب کو حق (کی نشانیوں اور واضح دلائل) کے ساتھ نازل کیا ہے اور جو اس میں اختلاف کرتے ہیں (اور حق کو چھپاتے ہیں اور اس میں تحریف کرکے اختلاف پیدا کرتے ہیں) (گہرے شگاف (اور پراگندگی) میں پڑے ہیں۔

شانِ نزول

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ بیشتر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات خاص طور پر ان علماء یہود کے بارے میں ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پیشتر لوگوں کو اپنی کتابوں میں سے آپ کی صفات اور نشانیاں بیان کرتے تھے لیکن ظہور پیغمبرؐ کے بعد جب انہوں نے لوگوں کو آپؐ کی طرف مائل و راغب ہوتے ہوئے دیکھا تو خوفزدہ ہوگئے کہ اگر انہوں نے اپنی روش کو برقرار رکھا تو ان کے منافع خطرے میں پڑ جائیں گے اور وہ تحفے اور دعوتیں جو انہیں مہیا ہیں ختم ہو جائیں گی تو وہ پیغمبرؐ کے وہ اوصاف جو تورات میں نازل ہو چکے تھے چھپانے لگے۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کی سخت مذمت کی گئی۔

تفسیر

دوبارہ حق پوشی کی مذمت

حق کو چھپانے کے بارے میں جو موضوع اسی سورہ کی آیہ ۱۵۹ میں گزر چکا ہے۔ زیر نظر آیات اس کی تاکید میں ہیں اگرچہ ان میں روئے سخن علمائے یہود کی طرف ہے لیکن جیسا کہ بارہا یاددہانی کرائی جا چکی ہے کہ آیات کا مفہوم کسی مقام پر بھی شانِ نزول سے مخصوص نہیں ہے۔ شانِ نزول تو حقیقت میں کلی اور عمومی مفہوم بیان کرنے کا ذریعہ ہے اور آیات کا ایک مصداق ہے۔ لہٰذا وہ تمام افراد جو احکام خدا اور لوگوں کی ضرورت کے حقائق کو چھپاتے ہیں اور مقام و مرتبہ یا دولت و ثروت کے حصول کے لئے اس عظیم خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں جان لینا چاہیئے کہ انہوں نے گراں بہا حقیقت ناچیز قیمت کے بدلے بیچ دی ہے کیونکہ حق پوشی کا ساری دنیا سے بھی مقابلہ کیا جائے تو سودا خسارے کا ہی ہوگا۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا کی نازل کردہ کتاب کو چھپاتے ہیں اور اسے معمولی قیمت پر بیچ دیتے ہیں آگ کے علاوہ کچھ نہیں کھاتے (ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار)۔

واقعاً اس طرح سے جو ہدیے وہ حاصل کرتے ہیں اور مال و منال کماتے ہیں وہ جلانے والی آگ ہے جو ان کے اندر داخل ہوتی ہے۔

ضمناً یہ تعبیر آخرت میں تجسم اعمال کے مسئلے کو دوبارہ واضح کرتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مال حرام جو اس طرح ہاتھ آتا ہے آگ ہے جو ان کے دلوں میں داخل ہوتی ہے اور قیامت میں وہ حقیقی شکل میں مجسم ہوگی۔

اس کے بعد ان کی ایک معنوی سزا کو بیان کیا گیا ہے جو مادی سزا سے کہیں زیادہ دردناک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا قیامت کے دن ان سے بات نہیں کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے (ولا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم)۔

سورۂ آل عمران آیہ ۷۷ میں بھی اس جیسی دردناک معنوی سزا کا ذکر ان لوگوں کے لئے کیا گیا ہے جو حقیر منافع کے لئے خدائی معاہدوں کو توڑتے ہیں اور اپنے عہد و پیمان کو پاؤں تلے روندڈالتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

جن لوگوں نے عہد الٰہی اور اپنی قسموں کو تھوڑے سے فائدے کی خاطر توڑ ڈالا ہے۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں قیامت کے دن اللہ ان سے بات کرے گا نہ ان پر نگاہِ لطف ڈالے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔

اس آیت اور محل بحث آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی روحانی لذت اور عطائے الٰہی ہے کہ آخرت میں خدا اہل ایمان سے اپنے لطف و کرم سے بات کرے گا۔ یہ وہ مقام ہے جو اس دنیا میں خدا کے پیغمبروں کو حاصل تھا۔ وہ پروردگار سے ہمکلام ہونے کی لذت سے بہرہ مند تھے۔ اہل ایمان اُس جہان میں اس نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ علاوہ ازیں خدا اُن پر نظر الطاف فرمائے گا اور عفو و رحمت کے پانی سے اُن کے گناہ دھو ڈالے گا اور انہیں پاک و پاکیزہ بنا دے گا۔ اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو کا یہ مفہوم نہیں کہ خدا زبان رکھتا ہے اور اس کا جسم ہے بلکہ وہ اپنی بے پایاں قدرت کے ذریعے فضا میں آواز کی لہریں پیدا کرے گا جو سمجھنے اور سننے کے قابل ہوں گی (جیسے وادی طور میں حضرت موسیٰ سے گفتگو ہوئی تھی)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الہام کے ذریعے، دل کی زبان سے وہ اپنے مخصوص بندوں سے بات کرے گا۔

بہرحال پروردگار کا یہ عظیم لطف و کرم اور اہم معنوی و روحانی لذت ان پاکیزہ بندوں کے لئے ہے جو زبانِ حق گو رکھتے

ہیں اور لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرتے ہیں۔ اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں اور وہ ان چیزوں کو حقیر مادی فوائد پر قربان نہیں کرتے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن خدا کچھ مجرمین اور کفار سے باتیں کرے گا۔ مثلاً

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝

دور ہو جاؤ، جہنم کی آگ میں دفع ہو جاؤ اور اب مجھ سے بات نہ کرو۔ (مومنون - ۱۰۸)

یہ گفتگو خدا ان لوگوں سے کرے گا جو آتش جہنم سے چھٹکارے کی درخواست کریں گے اور کہیں گے خداوندا! ہمیں اس سے نکال دے اور اگر ہم دوبارہ پلٹ گئے تو ہم ظالم و ستمگار ہیں (حاشیہ ۔۔۔ ۴۰، ۴۱)۔ اسی طرح مجرمین کے ساتھ بھی خدا کی گفتگو نظر آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محل بحث آیات میں گفتگو کرنے سے مراد وہ گفتگو ہے جو محبت اور خاص لطف و کرم سے ہوگی۔ اس سے حقارت سے ٹھکرانے اور راندہ درگاہ کرنے اور سزا کے طور پر خطاب مراد نہیں جو بجائے خود ایک دردناک عذاب ہے۔

یہ نکتہ بھی زیادہ وضاحت کا محتاج نہیں کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آیات الٰہی کو کم قیمت پر نہ بیچو تو اس سے یہ مراد نہیں کہ زیادہ قیمت پر بیچو بلکہ مقصد یہ ہے کہ حق پوشی کے مقابلے میں جو چیز بھی لی جائے وہ بے قدر و قیمت، ناچیز اور حقیر ہے۔

بعد کی آیت اس گروہ کی کیفیت کو زیادہ واضح طور پر بیان کرتی ہے اور اس کے نقصان دہ انجام اور نتیجۂ کار کی خبر دیتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں جو گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے عوض خرید لیتے ہیں (اولئك الذين اشتروا الضللة بالهدى والعذاب بالمغفرة)۔

اس طرح وہ دو طرفہ نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک طرف ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی انتخاب کرنا اور دوسری طرف رحمت و بخشش الٰہی کو ہاتھ سے دے کر اس کی جگہ دردناک عذاب خدا کو حاصل کرنا اور یہ ایسا سودا ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس کے پیچھے نہیں جاتا۔

اسی لئے آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے: واقعاً تعجب کی بات ہے کہ (وہ عذاب خدا کے سامنے کتنی بیباکی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں (فما اصبرهم على النار)۔

زیر بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ دھمکیاں اور عذاب کی وعیدیں جو حق کو چھپانے والوں کے لئے بیان کی گئی ہیں اس لئے ہیں کہ خدا نے آسمانی کتاب قرآن کو حقیقت اور واضح دلائل کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ ان خیانت کاروں کے لئے کسی شک اور ابہام کی گنجائش باقی نہ رہے (ذالك بان الله نزل الكتب بالحق)۔

اس کے باوجود لوگ نہیں چاہتے کہ اپنے مادی فوائد کی خاطر اس برے عمل سے دست بردار ہوں وہ توجیہ و تحریف میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی آسمانی کتب میں اختلاف پیدا کرتے ہیں تاکہ بزعم خود پانی کو گدلا کرکے اس میں سے مچھلیاں

پکڑ سکیں۔ اور ایسے لوگ جو کتاب آسمانی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں حقیقت سے کافی دور ہیں (و ان الذین اختلفوا فی الکتاب لفی شقاق بعید)۔

لفظ شقاق کا معنی ہے شگاف اور جدائی۔ یہ تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ایمان و تقویٰ اور اظہار حق انسانی معاشرے میں وحدت و اتحاد کی رمز ہے جب کہ کفر و خیانت اور اخفائے حقائق پراگندگی، جدائی اور شگافتگی کا سبب ہے اور اس سے مراد سطحی جدائی اور شگاف نہیں کہ جس سے صرف نظر کیا جا سکے بلکہ ایسی جدائی، پراگندگی اور شگاف ہے جس میں گہرائی ہو۔

۱۷۷۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۷۔ نیکی یہی نہیں کہ (نماز کے وقت) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو (اور تمام گفتگو قبلہ اور اس کی تبدیلی کے بارے میں کرتے رہو اور اپنا سارا وقت اسی میں صرف کر دو) بلکہ نیکی (اور نیکوکار) وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتاب اور انبیاء پر ایمان لے آئیں اور (اپنا) مال اس سے پوری محبت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، ضرورتمند مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں پر خرچ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، جب عہد و پیمان باندھیں تو اسے پورا کریں اور بے کسی، محرومی، بیماری اور میدان جنگ غرض ہر عالم میں استقامت و صبر کا مظاہرہ کریں یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بولتے ہیں (اور ان کی گفتار، کردار اور اعتقاد میں ہم آہنگی ہے) اور یہی پرہیزگار ہیں۔

شانِ نزول

قبلہ کی تبدیلی سے عام لوگوں میں بالعموم اور یہود و نصاریٰ میں بالخصوص شور و غوغا بپا ہو گیا تھا اور یہودیوں کے نزدیک

یہ بڑی سند افتخار تھی (کہ مسلمان ان کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں) اور اب یہ ہاتھ سے جاتی رہی تھی لہذا انہوں نے زبان اعتراض دراز کی۔ قرآن نے اس سورہ کی آیت ۱۴۲ ــــ سیقول السفہاء ــــ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت اس کی تائید میں نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ قبلہ کے مسئلے پر اتنی باتیں بنانا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر مسائل ہیں جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں ان مسائل کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

تفسیر

تمام نیکیوں کی اساس

جیسا کہ قبلہ کی تبدیلی سے متعلق آیات کے ذیل میں گذر چکا ہے عیسائی عبادت کے وقت مشرق کی طرف اور یہودی مغرب کی طرف منہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔ جو ان دونوں کے درمیان واقع ہے اور اُس علاقے میں جنوب کی طرف تھا۔ ہم نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ مخالفین اسلام ایک طرف سے شور بلند کرتے تھے اور نووارد مسلمان دوسری طرف متحیر تھے۔ مندرجہ بالا آیت کا رخ سخن ان دونوں کی طرف ہے فرمایا: نیکی صرف یہ نہیں کہ نماز کے وقت منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو اور اپنا سارا وقت اسی مسئلے پر بحث کرتے گزار دو (لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب)۔

بِرّ (بروزن ضد) ــــ اس کا اصل معنیٰ وسعت ہے۔ بعد ازاں نیکیوں، خوبیوں اور احسان کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ امور وجود انسانی میں محدود نہیں رہتے بلکہ وسعت پیدا کرکے دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

لفظ بَرّ (بروزن نر) وصفی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا معنیٰ ہے وہ شخص جو نیکوکار ہو۔ اصل میں اس کا معنیٰ ہے بیابان اور وسیع مکان چونکہ نیکوکار روحانی وسعت اور کھلے دل کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس خصوصیت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایمان، اخلاق اور عمل کے لحاظ سے نیکیوں کے اہم ترین اصول چند عنوانات کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: لیکن نیکی (اور نیک افراد) وہ لوگ ہیں جو خدا، روز قیامت، ملائکہ، آسمانی کتب اور انبیاء پر ایمان لے آئے ہیں (ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملائکۃ والکتٰب والنبیین)۔

نیکیوں اور خوبیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ انسان ایمان لائے مبداء و معاد پر، تمام خدائی پروگراموں پر، پیغمبروں پر (جو ان پروگراموں کی تبلیغ و اجراء پر مامور تھے) اور فرشتوں پر (جو اس دعوت کی تبلیغ کا واسطہ شمار ہوتے ہیں) یہ وہ اصول ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان کا سارا وجود روشن ہو جاتا ہے اور یہی ایمان تمام اصلاحی پروگراموں اور اعمال صالح کی طرف تحریک پیدا کرنے کے لئے قوی عامل ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ نیکوکار وہ لوگ ہیں.... بلکہ فرمایا: نیکی ــــ وہ لوگ ہیں.... یہ اس لئے

کہ ادبیاتِ عرب میں جب کسی چیز میں مبالغے اور تاکید کے آخری درجے کو بیان کرنا ہو تو اسے مصدر کی شکل میں لاتے ہیں بجائے صفت کے طور پر کہتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ عالمِ انسانیت کا عدل ہیں یعنی آپ ایسے عدالت پیشہ تھے کہ گویا سراپا عدل تھے اور سر سے پاؤں تک عدالت میں ڈوبے ہوئے تھے اس طرح کہ اگر آپؑ کی طرف نگاہ کی جائے تو عدل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ان کے مقابل میں کہا جاتا ہے کہ بنی امیہ ذلتِ اسلام ہیں گویا ان کا پورا وجود ذلت و خواری میں ڈھل چکا تھا۔ اس لئے زیرِ نظر تعبیر سے ایمانِ محکم اور ایمان کی بلند تر قوت و طاقت مراد ہے۔

ایمان کے بعد انفاق، ایثار اور مالی بخششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: چاہت و محبت کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو دیتے ہیں (واٰتی المال علی حبه ذوی القربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب)۔

اس میں شک نہیں کہ مال و دولت کی پرواہ نہ کرنا سب کے لئے آسان کام نہیں خصوصاً جب مقام ایثار ہو۔ کیونکہ اس کی محبت سب دلوں میں ہے۔ "علی حبه" اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس دلی خواہش کے باوجود استقامت دکھاتے ہیں اور خدا کے لئے اس خواہش سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہاں حاجت مندوں کے چھ طبقے بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے درجے میں وابستگان اور آبرو مند رشتہ دار ہیں، دوسرے طبقے میں یتیم اور مسکین ہیں۔ اس کے بعد وہ ہیں جن کی ضرورت وقتی ہے۔ مثلاً جن کا خرچ سفر میں ختم ہو جائے۔ اس کے بعد سائلین کا تذکرہ ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ تمام ضرورت مند سوال نہیں کیا کرتے بلکہ بعض ایسے غیرت مند ہیں جو ظاہراً اغنیاء کی طرح ہیں جب کہ باطنی طور پر سخت ضرورت مند ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن ایک اور مقام پر کہتا ہے:

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

ناواقف لوگ ان کی عفت و پاکدامنی کی وجہ سے انہیں اغنیاء اور تونگر خیال کرتے ہیں۔

(بقرہ - ۲۷۳)

آخر میں غلاموں کا ذکر ہے کہ اگرچہ ظاہراً ان کی مادی ضروریات ان کے مالک کے ذریعے پوری ہو رہی ہوتی ہیں لیکن وہ آزادی و استقلال کے محتاج ہیں۔

نیکیوں کی تیسری بنیاد قیامِ نماز شمار کی گئی ہے (واقام الصلٰوة)۔ نماز تمام شرائط اور اخلاص و خضوع سے ادا کی جائے تو انسان کو ہر قسم کے گناہ سے باز رکھتی ہے اور خیر و سعادت کا شوق پیدا کرتی ہے۔

چوتھا پروگرام زکوٰۃ اور دیگر واجب مالی حقوق کی ادائیگی ہے (واٰتی الزکٰوة)۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کئی مقامات پر ضرورت مندوں کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن واجب حقوق کی ادائیگی میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو واجب حقوق کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد کو تیار نہیں ہوتے اور وہ ایک پیسہ بھی کسی ضرورت مند کو دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ زیرِ بحث آیت میں ایک طرف مستحب امور پر خرچ کرنے والوں اور دوسری طرف واجب

حقوق ادا کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کو نیک لوگوں کی صف سے نکال دیتی ہے اور حقیقی نیک اسے قرار دیتی ہے جو اپنی ذمہ داری دونوں میدانوں میں ادا کرے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مستحب خرچ کے سلسلے میں علی حبہ (باوجودیکہ وہ مال و ثروت سے محبت رکھتے ہیں) کا ذکر ہے لیکن واجب زکوٰۃ کے ضمن میں یہ بات نہیں کیونکہ واجب مالی حقوق کی ادائیگی ایک الٰہی و اجتماعی ذمہ داری ہے اور منطق اسلام کی رو سے اصولی طور پر حاجت مند زکوٰۃ اور دیگر واجبات کی مقدار کے مطابق دولت مندوں کے اموال میں شریک ہیں اور شریک کو اس کے مال کی ادائیگی کے لئے ایسی تعبیر کی ضرورت نہیں۔

پانچویں خصوصیت ایفائے عہد و پیمان گردانی گئی ہے۔ فرمایا: وہ لوگ جو وعدہ کرلیں تو اپنے عہد و پیمان کو نبھاتے ہیں (والموفون بعھدھم اذا عٰھدوا) کیونکہ باہمی اعتماد اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہے۔ وہ گناہ جو اطمینان اور اعتماد کے رشتے کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں اور اجتماعی روابط کی بنیاد کو نیچے سے کمزور کر دیتے ہیں ان میں وعدے کی عدم پاسداری ہے۔ اسی لئے اسلامی روایات میں مسلمانوں کی ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ تین امور سب لوگوں کے بارے میں انجام دیں چاہے ان کے سامنے مسلمان ہو یا کافر اور نیک ہو یا بد۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ ایفائے عہد

۲۔ ادائے امانت اور

۳۔ ماں باپ کا احترام

ان نیک لوگوں کی چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو محرومیت، فقر و فاقہ، بیماری اور رنج و مصیبت کے وقت اور اسی طرح جنگ میں دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان سخت حوادث کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے (والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس)[1]۔

آیت کے آخر میں بات کو مجتمع کرتے ہوئے اور ان چھ بلند صفات پر تاکید کے طور پر فرمایا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو سچ بات کرتے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں (اولٰئک الذین صدقوا و اولٰئک ھم المتقون)۔

ان کی راست گوئی تو یہاں سے واضح ہوتی ہے کہ ان کے اعمال اور ان کا کردار ہر طرح سے ان کے اعتقاد اور ان کے ایمان سے ہم آہنگ ہے۔ ان کا تقویٰ و پرہیزگاری اس بات سے عیاں ہے کہ وہ ضرورتمندوں، محروموں، انسانی معاشرہ اور اپنی ذات کے بارے میں اپنی الٰہی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا چھ برجستہ صفات اصول اعتقاد و اخلاق اور عملی پروگراموں پر مشتمل ہیں۔ اصول اعتقاد کے سلسلے میں تمام بنیادی امور کا تذکرہ ہے اور عملی پروگراموں میں سے انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہے جو مخلوق کے

---

[1] بأساء کا مادہ ہے بؤس، اس کا معنی ہے فقر و فاقہ، ضراء کا معنی ہے درد و بیماری اور حین البأس کا مفہوم ہے وقت جنگ (المیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

خالق سے اور مخلوق کے مخلوق سے رابطے کا نمونہ ہے۔ اخلاقی امور میں سے ایفائے عہد اور استقامت و پائداری کا تذکرہ ہے جو تمام تر اعلیٰ اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۷۸۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰىؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰىؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

۱۷۹۔ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝

ترجمہ

۱۷۸۔ اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پس اگر کوئی اپنے (دینی) بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے (اور حکم قصاص خونبہا سے بدل جائے) تو اسے چاہیئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اور دیت کی وصولی میں دیت دینے والے کی حالت کو پیشِ نظر رکھے) اور قاتل بھی ولی مقتول کو اچھے طریقے سے دیت ادا کرے (اور اس کی ادائیگی میں حیل و حجت سے کام نہ لے) تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے اور اس کے بعد بھی جو تجاوز کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۱۷۹۔ اور قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے، اے صاحبانِ عقل و خرد! تمہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنا چاہیئے۔

شانِ نزول

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی عادت تھی کہ ان کے قبیلے کا ایک آدمی قتل ہو جاتا تو وہ پختہ ارادہ کر لیتے کہ حتی المقدور اس کا انتقام لیں گے اور یہ فکر یہاں تک آگے بڑھ چکی تھی کہ وہ تیار رہتے کہ ایک شخص کے بدلے قاتل کا سارا قبیلہ قتل کر ڈالیں مندرجہ بالا آیت کے ذریعے قصاص کا عادلانہ حکم بیان کیا گیا۔

اس زمانے کے دو مختلف دستوروں میں اسلام کا یہ حکم حدِ وسط تھا۔ اس دور میں بعض لوگ قصاص کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو جائز اور درست نہ جانتے تھے جب کہ بعض لوگ صرف دیت اور خونبہا کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اسلام نے مقتول کے اولیاء کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قصاص کا حکم دیا اور طرفین کی رضا اور قصاص کی معافی پر دیت کو ضروری قرار دیا۔

تفسیر

قصاص تمہاری حیات کا سبب ہے

ان آیات سے لے کر آگے کی کچھ آیات تک احکام اسلام کے ایک سلسلے کو واضح کیا گیا ہے۔ گذشتہ آیات نیکی کے بارے میں تھیں اور ان میں کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت بھی کی گئی تھی۔ زیر نظر آیات اس سلسلۂ بیان کی تکمیل کرتی ہیں۔

سب سے پہلے احترام خون کی حفاظت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو ربط معاشرہ کے ضمن میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کا یہ حکم جاہلیت کے رسم و رواج پر خط بطلان کھینچتا ہے۔ مومنین کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں قصاص کا حکم تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے (یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلٰی)۔

قرآن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی لازم الاجراء قوانین کو "کتب علیکم" (تم پر لکھ دیا گیا ہے) کے الفاظ سے بیان کرتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی انہی میں سے ہے۔ آئندہ کی آیات جو وصیت اور روزہ کے بارے میں ہیں، ان میں بھی یہی تعبیر نظر آتی ہے۔ بہر حال یہ الفاظ اہمیت اور تاکید مطلب کو پورے طور پر ادا کرتے ہیں کیونکہ ہمیشہ ان الفاظ کو رقم کیا جاتا ہے جو نگاہ و قدر و قیمت میں قطعیت رکھتے ہوں۔

قصاص مادہ قص (بروزن سد) سے ہے۔ اس کا معنی ہے جستجو اور کسی چیز کے آثار کی تلاش کرنا اور جو چیز پے در پے اور پیچھے بعد دیگرے آئے اُسے قصہ کہتے ہیں چونکہ قصاص ایسا قتل ہے جو پہلے قتل کے بعد قرار پاتا ہے اس لئے یہاں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

جیسا کہ شان نزول میں اشارہ ہو چکا ہے یہ احکام افراط و تفریط کے ان رویوں کے اعتدال پر لانے کے لئے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں کسی قتل کے بعد رونما ہوتے تھے۔ لفظ قصاص اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء مقتول حق رکھتے ہیں کہ وہ قاتل سے وہی سلوک کریں جس کا وہ ارتکاب کر چکا ہے لیکن آیت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آیت کا آخری حصہ مساوات کے مسئلہ کو زیادہ واضح کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (الحر بالحر والعبد بالعبد والانثٰی بالانثٰی)۔

بعد میں ہم واضح کریں گے کہ یہ مسئلہ مرد کے خون کی عورت کے خون پر برتری کی دلیل نہیں ہے بلکہ قاتل مرد سے بھی خاص شرائط کے ساتھ، مقتول عورت کے بدلے قصاص لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ واضح کرنے کے لئے کہ قصاص اولیاء مقتول کا ایک حق ہے مگر یہ کوئی الزامی حکم نہیں ہے بلکہ اگر اولیاء مائل ہوں تو قاتل کو بخش سکتے ہیں اور خون بہا لے سکتے ہیں یا چاہیں تو خون بہا بھی نہ لیں۔ مزید فرمایا کہ اگر کوئی اپنے دینی بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے (اور قصاص کا حکم طرفین کی رضا سے خون بہا میں بدل جائے)، تو اسے چاہیئے کہ پسندیدہ طریقے کی پیروی کرے (اور اس خون بہا کے لینے میں دوسرے پر سختی و تنگی روا نہ رکھے)، اور ادا کرنے والا بھی

دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے (فمن عفی لہ من اخیہ شیئ فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان)۔

ایک طرف اولیاء مقتول کو وصیت کی گئی ہے کہ اب اگر اپنے بھائی سے قصاص لینے سے صرف نظر کر چکے ہو تو خونبہا لینے میں زیادتی سے کام نہ لو شائستہ اور اچھے طریقے سے اور عدل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جسے اسلام نے ضروری قرار دیا ہے ایسی اقساط میں جن میں وہ ادائیگی کی قدرت رکھتا ہے وصول کرو۔

دوسری طرف "اداء الیہ باحسان" کے جملے میں قاتل کو بھی وصیت کی گئی ہے کہ وہ خونبہا کی ادائیگی میں نیکی اور اچھائی کی روش اختیار کرے اور بغیر کسی غفلت کے کامل اور برمحل ادا کرے۔ اس طرح دونوں کے لئے ذمہ داری اور راستے کا تعین کر دیا گیا ہے۔

آیت کے آخر میں بطور تاکید اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس کسی کی طرف سے حد سے تجاوز کیا جائے گا وہ شدید سزا کا مستحق ہوگا۔ فرمایا: تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے اور اس کے بعد بھی جو شخص حد سے تجاوز کرے، تو دردناک عذاب اس کے انتظار میں ہے (ذالک تخفیف من ربکم و رحمۃ فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم)۔

انسانی اور منطقی نقطۂ نظر سے قصاص اور عفو کا یہ ایک عادلانہ دستور ہے۔ ایک طرف اس حکم سے زمانہ جاہلیت کی فاسد روش کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں لوگ قصاص کے لحاظ سے کسی قسم کی برابری کے قائل نہ تھے اور ہمارے زمانے کے جلادوں کی طرح ایک شخص کے بدلے سینکڑوں افراد کو خاک و خون میں لوٹا دیتے تھے۔ دوسری طرف لوگوں کے لئے عفو و بخشش کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس حکم میں احترام خون میں کمی نہیں آنے دی گئی اور قاتلوں میں جسارت و بے باکی پیدا نہیں ہونے دی گئی اور اس آیت کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ معاف کرنے اور خون بہا لینے کے بعد طرفین میں سے کوئی بھی تجاوز کا حق نہیں رکھتا جب کہ زمانہ جاہلیت میں اولیاء مقتول معاف کر دینے اور خونبہا لینے کے باوجود بعض اوقات قاتل کو قتل کر دیتے تھے۔

بعد کی آیت مختصر اور پُر معنی عبارت سے مسئلہ قصاص سے متعلق بہت سے سوالوں کا جواب دیتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے صاحبان عقل و خرد! قصاص تمہارے لئے حیات بخش ہے، ہو سکتا ہے تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو (ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون)۔

دس الفاظ پر مشتمل یہ آیت انتہائی فصیح و بلیغ ہے یہ ایک شعار اسلامی کی صورت میں ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی عمدگی سے نشاندہی کرتی ہے کہ اسلامی قصاص میں کسی قسم کا انتقامی پہلو نہیں بلکہ یہ حیات و زندگی کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔

ایک طرف تو یہ معاشرے کی حیات ہے کیونکہ اگر قصاص کا حکم کسی طور پر بھی موجود نہ ہوتا اور سنگدل لوگ بے پرواہ ہوتے تو بے گناہ لوگوں کی جان خطرے میں رہتی۔ جن ملکوں میں قصاص کا حکم ختم کر دیا گیا ہے وہاں قتل کی وارداتوں میں تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ حکم قاتل کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کا تصور اسے قتل انسانی کے ارادے سے کافی حد تک باز رکھے گا اور اسے کنٹرول کرے گا۔ تیسری طرف برابری کا لزوم پے در پے کئی افراد کے قتل کو روکے گا۔ اور زمانہ

جاہلیت کے ان طور طریقوں کو ختم کرتا ہے جن میں ایک قتل کے بدلے کئی افراد کو قتل کر دیا جاتا تھا اور پھر اس کے نتیجہ میں آگے بہت سے افراد قتل ہوتے تھے اور اس طرح سے یہ حکم معاشرے کی زندگی کا سبب ہے۔

اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ قصاص کا مطلب ہے معاف نہ کرنا۔ یہ خود ایک دریچہ حیات کھلنے کے مترادف ہے نیز لعلکم تتقون ہر قسم کے تجاوز و تعدی سے پرہیز کرنے کے لئے تنبیہ ہے جس سے اسلام کے اس حکیمانہ حکم کی تکمیل ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

(۱) قصاص عفو ایک عادلانہ نظام ہے: ہر مقام و محل پر اسلام مسائل کی واقعیت اور ان کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اس نے بے گناہوں کا خون بہانے کے مسئلے میں ہر طرح سے افراط و تفریط سے بالاتر ہو کر حق مطلب ادا کیا ہے۔ اس نے یہودیوں کے تحریف شدہ دین کی طرح صرف قصاص کا سہارا نہیں لیا اور نہ ہی ایسی عیسائیت کی طرح صرف عفو و دیت کی راہ دکھائی ہے کیونکہ پہلا حکم انتقام جوئی کا باعث ہے اور دوسرا قاتلوں کی جرأت کا سبب ہے۔

فرض کریں قاتل و مقتول ایک دوسرے کے بھائی ہوں یا ان میں دوستی و اجتماعی تعلقات رہے ہوں تو اس صورت میں قصاص پر مجبور کرنا اولیاء مقتول کے لئے ایک نئے زخم کا باعث ہوگا خصوصاً ایسے لوگ جو انسانی جذبات سے سرشار ہوں انہیں قصاص پر مجبور کرنا ایک طرز سختی شمار ہوگا جب کہ اس حکم کو عفو و دیت میں محدود و محصور کر دینا بھی ظالموں کو مزید جری و بیباک بنانے کا باعث ہوگا۔

لہٰذا اسلام نے قصاص کو اصلی حکم قرار دیا ہے اور اسے معتدل بنانے کے لئے اس کے ساتھ عفو کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں مقتول کے اولیاء کو ان تین راستوں میں سے ایک اختیار کرنے کا حق ہے۔

۱۔ قصاص لے لیں۔

۲۔ خونبہا لئے بغیر معاف کر دیں۔

۳۔ خونبہا لے کر معاف کر دیں (البتہ اس صورت میں ضروری ہے کہ قاتل بھی راضی ہو)۔

(۲) کیا قصاص عقل اور انسانیت کے خلاف ہے: بعض لوگوں نے غور و فکر کئے بغیر اسلام کے جزا و سزا کے کچھ قوانین پر تنقید کی ہے۔ قصاص کے مسئلے پر خصوصاً بہت شور و غل ہے۔ مسئلہ قصاص پر مخالفین کے اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قاتل کا یہی جرم ہے کہ اس نے ایک انسان کو ختم کر دیا۔ قصاص لیتے وقت اسی عمل کا تکرار کیا جاتا ہے۔

۲۔ قصاص ایک انتقامی کارروائی اور سنگدلی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ صفت لوگوں میں سے ختم کی جانا چاہیئے جبکہ قصاص کے طرفدار انتقام جوئی کی اس ناپسندیدہ صفت میں نئی روح پھونکتے ہیں۔

۳۔ انسان کشی ایسا گناہ نہیں جسے عام اور صحیح و سالم لوگ انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا قاتل نفسیاتی طور پر کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ قصاص ایسے مریضوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔

۴۔ وہ مسائل جن کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے ان کا رشد اور نشوونما انسانی معاشرے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ وہ قانون جو آج سے چودہ سو سال پہلے جاری ہوا اسے آج کے ترقی یافتہ معاشرے میں جاری نہیں ہونا چاہیئے۔

۵۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ قصاص لینے کی بجائے قاتلوں کو قید کر دیا جائے۔ اور قید خانے میں ان کے وجود سے جزاً معاشرے کے فائدے کے لئے کام لیا جائے۔ اس طرح ایک طرف معاشرہ ان کے شر سے محفوظ رہے گا اور دوسری طرف ان سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

یہ ان اعتراضات کا خلاصہ ہے جو مسئلہ قصاص پر کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کا جواب پیش کیا جاتا ہے۔

آیاتِ قصاص میں غور و خوض کرنے سے یہ اشکالات دور ہو جاتے ہیں (وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ)۔

۱۔ بعض اوقات خطرناک افراد کو ختم کر دینا معاشرے کے رشد و تکامل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر مسئلہ قصاص حیات اور بقائے موجودات کا ضامن ہے۔ اس لئے قصاص کا جذبہ انسان اور حیوان کے مزاج اور طبیعت میں رکھ دیا گیا ہے۔

نظام طب ہو یا زراعت سب اسی عقلی اصول پر مبنی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بدن کی حفاظت کے لئے بعض اوقات فاسد اور خراب عضو کو کاٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح درخت کی نشوونما میں مزاحم شاخوں کو بھی قطع کر دیتے ہیں۔

جو قاتل کے قتل کو ایک شخص کا نقصان سمجھتے ہیں ان کی نظر انفرادی ہے اگر وہ اجتماعی نظر رکھتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ قانون قصاص باقی افراد کی حفاظت اور تربیت کا باعث ہے تو وہ اپنی گفتگو میں تجدید نظر کرتے: معاشرے میں سے ایسے خونخوار افراد کا خاتمہ مضر عضو اور شاخ کو کاٹنے کی طرح ہے جسے حکم عقل کے مطابق لازماً قطع کرنا چاہیئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج تک مضر اعضا اور شاخوں کو کاٹنے پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

۲۔ اصولی طور پر تشریع قصاص کا جذبۂ انتقام سے کوئی ربط نہیں کیونکہ انتقام کا معنیٰ ہے غضب کی آگ کو کسی شخصی مسئلے کی خاطر ٹھنڈا کرنا جب کہ قصاص کا مقصد معاشرے پر ظلم و ستم کے تکرار کو روکنا ہے اور اس کا ہدف اور غرض طلب عدل اور باقی بے گناہ افراد کی حمایت ہے۔

۳۔ تیسرا اعتراض ہے کہ قاتل یقیناً کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے اور عام لوگ ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں کہنا چاہیئے کہ بعض اوقات تو یہ بات بالکل صحیح ہے ایسی صورت میں اسلام نے بھی دیوانہ اور ایسے افراد کے لئے قصاص کا حکم نہیں دیا لیکن قاتل کو ہمیشہ بیمار قرار دینا بہت خطرناک ہے کیونکہ ایسے فساد کو ایسی بنیاد فراہم کرنا معاشرے کے ظالموں کو ایسی جرأت دلانا ہے جس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ اگر یہ استدلال کسی صحیح قاتل کے بارے میں ہے تو پھر یہی استدلال سب تجاوز کرنے والوں اور دوسروں کے حقوق چھیننے والوں کے لئے بھی صحیح ہونا چاہیئے کیونکہ عقل کامل رکھنے والا شخص کبھی دوسروں پر تجاوز نہیں کرتا۔ اس طرح تو سزا کے تمام قوانین کو ختم کر دینا چاہیئے اور تجاوز و تعدی کرنے والے سب افراد کو قید خانوں اور مقامات سزا سے نکال کر نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں داخل کر دینا چاہیئے۔

۴۔ رہا یہ سوال کہ معاشرے کی ترقی قانونِ قصاص کو قبول نہیں کرتی اور قصاص صرف قدیم معاشرے میں اثر رکھتا تھا لیکن

اس ترقی کے زمانے میں اقوامِ عالم قصاص کو خلافِ وجدان سمجھتی ہیں۔

اس کا جواب صرف ایک جملے میں یوں دیا جا سکتا ہے کہ یہ دعوٰی ان وسیع دہشت ناک جرائم اور میدانِ جنگ وغیرہ کے مقتولین کی تعداد کے مقابلے میں بہت بے وزن ہے اور خیالی پلاؤ کی طرح ہے۔ فرض کیا کہ ایسی دنیا وجود میں آجائے تو اسلام نے بھی قانونِ عفو کو قصاص کے ساتھ ہی صراحت سے بیان کر دیا ہے اور قصاص ہی کو اس سلسلے میں آخری طریقہ کار قرار نہیں دیا۔ مسلم ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں لوگ قاتل کو معاف کر دینے کو ہی ترجیح دیں گے لیکن موجودہ دنیا میں جس کے کئی تہوں میں چھپے ہوئے جرائم گذشتہ زمانوں سے زیادہ اور انتہائی وحشیانہ ہیں اس میں قانون قصاص کے خاتمہ کا مطلب جرائم و مظالم کے دامن کو وسعت دینے کے اور کچھ نہ ہوگا۔

۵۔ جیسا کہ قرآن کی تصریح موجود ہے۔ قصاص کی غرض و غایت صرف حیاتِ عمومی و اجتماعی اور قتل و فساد کے تکرار سے بچنا اور اسے روکنا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ قید خانہ اس سلسلے میں مطلوبہ کردار ادا نہیں کر سکتا (خصوصاً موجودہ زمانے کے قید خانے جن میں سے بعض کی کیفیت تو مجرموں کے گھروں سے کہیں بہتر ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مجرم کے قتل کا حکم ختم کر دیا گیا ہے وہاں تھوڑی ہی مدت میں جرائم اور قتل کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور قیدیوں کو بخش ہی دیا جائے اور انہیں آزاد کر دیا جائے تو جرائم پیشہ لوگ بڑے اطمینان اور آرام سے اپنے ہاتھ قتل اور ظلم سے رنگین کرتے رہیں۔

(۱۱) کیا مرد کا خون عورت کے خون سے زیادہ قیمتی ہے: ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں کہ آیاتِ قصاص میں حکم دیا گیا ہے کہ عورت کے قتل کے بدلے مرد سے قصاص نہیں لینا چاہیئے تو کیا مرد کا خون عورت کے خون سے گراں تر اور زیادہ قیمتی ہے۔ آخر ایک ظالم مرد سے عورت کے قتل پر قصاص کیوں نہ لیا جائے جب کہ دنیا کی نصف سے زیادہ انسانی آبادی عورتوں پر ہی مشتمل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ مرد سے عورت کے قتل کے بدلے قصاص نہ لیا جائے بلکہ جیسا کہ فقہ اسلامی میں تفصیل و تشریح سے موجود ہے عورت کے اولیاء عورت کے قتل کی صورت میں قصاص لے سکتے ہیں بشرطیکہ دیت کی آدھی مقدار ادا کر دیں۔ دوسرے لفظوں میں عورت کے قتل کی صورت میں قصاص نہ لینے سے مراد وہ قصاص ہے جو بلا کسی شرط کے ہو لیکن آدھی دیت ادا کرنے کی صورت میں مرد سے قصاص لینا اور اسے قتل کرنا جائز ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ حکم اس لئے نہیں کہ عورت مرتبہ انسانیت پر فائز نہیں یا اس کا خون کم قیمت ہے۔ یہ ایک بیجا اور غیر منطقی توہم ہے اور شاید یہ مفہوم خون بہا (خون کی قیمت) سے پیدا ہوا ہے۔ آدھی دیت تو صرف اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ہے جو مرد سے قصاص لینے کی صورت میں مرد کے خاندان کو پہنچتا ہے (غور کیجئے گا)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیادہ تر مرد ہی خاندان کا اقتصادی عضو مؤثر ہوتا ہے اور مرد ہی خاندان کے اخراجات اٹھاتا ہے اور مرد ہی اپنی اقتصادی کارکردگی سے خاندان کی زندگی کا کارخانہ چلاتا ہے۔ اس بناء پر مرد اور عورت کے ختم ہونے میں اقتصادی پہلو کا جو فرق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو مقتول مرد کے بے گناہ

پسماندگان اور ان کی اولاد آخر کس جرم میں خسارہ اٹھائیں گے۔ اسلام نے مرد سے عورت کے قتل کا قصاص لینے کی صورت میں آدھی دیت دینے کا قانون معین کر کے سب لوگوں کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے اور اس طرح ایک خاندان کو جو ناقابل تلافی نقصان ہو رہا تھا اس کا ازالہ کیا گیا ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ لفظ مساوات کے بہانے دوسرے کے حقوق پائمال ہوں جیسے اس شخص کی اولاد کے حقوق جس سے قصاص لیا جا رہا ہے۔

(۱۷) اس مقام پر لفظ "اخیہ" کا استعمال: ایک اور نکتہ جو یہاں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہاں لفظ اخیہ کا استعمال ہے۔ قرآن برادری کے رشتے کو انسانی معاشرے میں اتنا محکم سمجھتا ہے کہ اس کے نزدیک خون ناحق بہانے کے باوجود یہ برقرار رہتا ہے لہٰذا اولیاء مقتول کے انسانی جذبات کو ابھارنے کے لئے انہیں قاتل کے بھائی کہہ کر متعارف کراتا ہے اور اس طرح انہیں عفو و ملاطفت کا شوق دلاتا ہے۔ البتہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ہیجان اور غضب و غصے کی حالت میں ایسے عظیم گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اس پر پشیمان ہوں لیکن وہ مجرم جو اپنے کام پر فخر کریں اور نادم نہ ہوں، بھائی کہلانے کے لائق نہیں اور نہ ہی عفو و درگذر کے مستحق ہیں۔

۱۸۰۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝
۱۸۱۔ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝
۱۸۲۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۸۰۔ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو چاہیئے کہ وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے شائستہ طور پر وصیت کرے۔ یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

۱۸۱۔ پھر جس نے وصیت سن کر اسے بدل ڈالا اس کا گناہ (وصیت) بدلنے والے پر ہے۔ خدا تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۸۲۔ جس شخص کو خوف ہو کہ وصیت کرنے والے نے انحراف (بعض ورثہ کی طرف یک طرفہ میلان) یا گناہ (کسی غلط چیز

کے لئے وصیت) سے کام لیا ہے اور وہ ورثہ کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں (اور اس پر وصیت کی تبدیلی کا قانون لاگو نہ ہوگا) خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

شائستہ اور مناسب وصیتیں

گذشتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بعض مسائل بیان کرنے کے بعد ان آیات میں ایک لازمی حکم کے طور پر مالی معاملات میں وصیت کے کچھ احکام بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آجائے تو اپنے مال و منال کے سلسلے میں والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں مناسب اور شائستہ وصیت کرے (کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف)۔ آیت کے آخر میں مزید فرمایا: یہ پرہیزگاروں کے ذمے ایک حق ہے (حقا علی المتقین)۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے "کتب علیکم" ظاہراً وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے وصیت کے بارے میں مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگرچہ قوانین اسلام کی رو سے وصیت ایک عمل مستحب ہے لیکن چونکہ ایسا مستحب ہے جس کی تاکید بہت زیادہ ہے لہذا "کتب علیکم" کے جملے سے اس کا حکم بیان کیا گیا ہے اس لئے آیت کے آخر میں "حقا علی المتقین" آیا ہے اگر یہ وجوبی حکم ہوتا تو فرمایا جاتا "حقا علی المومنین"۔

کچھ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت میراث کے احکام نازل ہونے سے پہلے کی ہے۔ اس وقت اموال کے بارے میں وصیت کرنا واجب تھا۔ تاکہ ورثہ میں اختلاف و نزاع نہ ہو لیکن آیات میراث نازل ہونے کے بعد یہ وجوب منسوخ ہو کر ایک مستحبی حکم کی صورت میں باقی رہ گیا۔

حدیث جو تفسیر عیاشی میں اس آیت کے ذیل میں آئی ہے اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ آیت کا یہ حکم ضرورت کے ان مواقع کے لئے ہو جہاں وصیت کرنا ضروری ہے۔

لیکن ان تمام تفاسیر میں پہلی تفسیر حق و حقیقت کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں مال کی جگہ لفظ خیر استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی اچھی چیز اپنے ترکے میں چھوڑے تو وصیت کرے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں وہ دولت و ثروت جو شرعی طریقے سے حاصل کی جائے اور معاشرے کے فائدے کے لئے اچھی راہ پر صرف کی جائے خیر و برکت ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے غلط افکار پر خط بطلان کھینچتی ہے جو مال و دولت ہی کو بری چیز سمجھتے ہیں۔ اسلام ان کجرو زاہدوں سے بیزار ہے جو روح اسلام کو نہیں سمجھ سکے اور وہ زہد کو فقر و فاقہ کا دوسرا نام سمجھے ہوئے ہیں اور ان کے افکار اسلامی معاشرے میں جمود اور ذخیرہ اندوزوں کے سر اٹھانے کا سبب بنتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس ثروت و دولت کے مشروع اور جائز ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہے جس کے بارے میں وصیت

کا حکم دیا گیا ہے ورنہ انسان کا چھوڑا ہوا غیر شرعی ناجائز مال تو خیر نہیں بلکہ شر ہی شر ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اموال کافی تعداد میں ہوں ورنہ مختصر مال تو وصیت کا محتاج نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مختصر مال تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ انسان چاہے کہ اس کا تیسرا حصہ وصیت کے ذریعے الگ کر دیا جائے۔[1]

ضمناً "اذا حضر احدکم الموت" (جب تم میں سے کسی کے پاس موت آپہنچے) وصیت کے لئے فرصت کے آخری لمحات کو بیان کرتا ہے اگر تاخیر ہو جائے تو موقع جاتا رہے گا ورنہ کوئی مضائقہ نہیں کہ انسان پہلے سے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا وصیت نامہ تیار کرے بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل انتہائی مستحسن ہے۔

یہ انتہائی کوتاہ فکری ہے کہ انسان خیال کرے کہ وصیت کرنا فالِ بد ہے اور اپنی موت کو سامنے لانے کے مترادف ہے بلکہ وصیت تو ایک دور اندیشی اور ناقابلِ انکار حقیقت کی پہچان ہے اور اگر یہ طولِ عمر کا سبب نہ بنے تو عمر میں کمی کا تو ہرگز سبب نہیں ہے۔

زیر نظر آیت میں وصیت کو "بالمعروف" سے مقید کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وصیت ہر لحاظ سے عقل مندانہ ہو۔ لیکن معروف کا معنی ہے عقل و خرد کی پہچانی ہوئی (معروف عقلاء)۔

جس شخص کے لئے وصیت کی جا رہی ہو اس کے لئے مقدار کے لحاظ سے اور دیگر جہات سے ایسی ہو کہ عقلا اسے مرباہ سمجھیں نہ یہ کہ وہ تفرق اور نزاع کا باعث بن جائے۔

جب وصیت تمام مذکورہ صفات کی جامع ہو تو وہ ہر لحاظ سے محترم اور مقدس ہوگی اور اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل حرام ہے۔ اسی لئے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو کوئی وصیت سننے کے بعد اس میں تبدیلی کرے اس کا گناہ تبدیلی کرنے والے کے سر ہے (فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ) اور اگر ان کا گمان ہے کہ خدا ان کی سازشوں اور مخفی کارروائیوں سے بے خبر ہے تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں کیونکہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (ان اللہ سمیع علیم)۔

ممکن ہے یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ وصی (وہ شخص جو وصیت کرنے والے کی موت کے بعد وصیتوں پر عملدرآمد کے لئے ذمے دار ہے) کی خلاف ورزی کبھی وصیت کرنے والے کے اجر و ثواب کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہ اپنا اجر پا چکا ہے۔ گناہ کا طوق فقط وصی کی گردن کے لئے ہے جس نے وصیت کی مقدار، کیفیت یا اصل وصیت میں تبدیلی کی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مقصد یہ ہو کہ اگر وصی کی خلاف ورزی کی وجہ سے میت کا مال ایسے افراد کو دے دیا جائے جو اس کے مستحق نہیں اور وہ اس سے بے خبر بھی ہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ گناہ صرف وصی کو ہوگا جس نے دانستہ طور پر یہ غلط کام انجام دیا ہے۔

توجہ رہے کہ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے متضاد نہیں اور ممکن ہے آیت ان دونوں مفاہیم کے لئے ہو۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۱۵۹

اب یہ حکم اسلامی واضح ہو گیا کہ وصیتوں میں ہر طرح کا تغیر و تبدل جس صورت میں ہو اور جس قدر ہو گناہ ہے۔ لیکن ہر قانون میں کچھ استثنائی پہلو ہوتے ہیں۔ لہٰذا زیر نظر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: جب وصی کو وصیت کرنے والے میں انحراف اور کجروی کا اندیشہ ہو، یہ انحراف چاہے بے خبری سے ہو یا جان بوجھ کر آگاہی کے باوصف ہو اور وہ اس کی اصلاح کرے تو وہ گنہگار نہ ہوگا اور وصیت کی تبدیلی کا قانون اس پر لاگو نہ ہوگا۔ خدا بخشنے والا مہربان ہے (فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینهم فلا اثم علیه ان الله غفور رحیم)۔

اس بناء پر استثناء صرف ان مواقع کے لئے ہے جہاں وصیت شائستہ و مناسب نہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وصی تغیر کا حق رکھتا ہے۔ اگر وصیت کرنے والا زندہ ہے تو اپنا نقطۂ نظر اس کے گوش گزار کرے تاکہ وہ خود تبدیلی کرے اور اگر وہ مر گیا ہو تو خود یہ تبدیلی کرے اور تبدیلی کا یہ اختیار مندرجہ ذیل مواقع کے لئے منحصر ہے۔

۱۔ اگر وصیت کل ترکے کی ایک تہائی سے زیادہ ہو کیونکہ رسول اکرمؐ اور اہل بیتؑ سے بہت سی روایات میں منقول ہے کہ انسان ایک تہائی تک کے مال کی وصیت کرنے کا مجاز ہے اور اس سے زیادہ ممنوع ہے۔ ہمارے فقہا نے بھی فقہی کتب میں یہی فتویٰ دیا ہے۔[1]

اس بناء پر جن ناواقف لوگوں کا یہ معمول ہے کہ وہ تمام اموال وصیت کے ذریعے تقسیم کر دیتے ہیں کسی طرح بھی قوانین اسلام کی رو سے صحیح نہیں اور وصی پر لازم ہے کہ وہ اس کی اصلاح کرے اور ایک تہائی سے زیادہ اس طرح سے تقسیم نہ کرے۔

۲۔ اگر وصیت ظلم، گناہ اور غلط کام سے متعلق ہو۔ مثلاً کوئی وصیت کرے کہ اس کے مال کا کچھ حصہ مراکز فساد کو وسیع کرنے میں صرف کیا جائے اور اسی طرح اگر وہ وصیت کسی ترکِ واجب کا سبب بنے۔

۳۔ اگر وصیت پر عمل درآمد، نزاع، فساد اور خون ریزی کا سبب ہو تو یہاں بھی حاکم شرع کے حکم سے اصلاح ہو سکتی ہے۔ جنف (بروزن کنف) کا معنی ہے حق سے انحراف اور باطل کی طرف میلان۔ یہ وصیت کرنے والے کے جاہلانہ انحرافات اور کجرویوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور "اثم" گناہ عمد کی طرف اشارہ ہے۔

جملہ "ان الله غفور رحیم" جو اس آیت کے آخر میں آیا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وصی وصیت کرنے والے کے غلط کام کی اصلاح کے لئے اقدام کرے اور راہ حق کو کھول دے تو خدا اس کی خطا سے صرف نظر کرے گا۔

چند اہم نکات

(۱) وصیت کا فلسفہ: قانون میراث سے صرف کچھ معین رشتے دار بہرہ مند ہوتے ہیں جب کہ ممکن ہے خاندان کے اور افراد یا بعض اوقات قریبی دوست احباب مالی امداد کی سخت احتیاج رکھتے ہوں اسی طرح ورثہ میں سے بھی کبھی اس ....

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۶۱ (کتاب احکام الوصایا، باب ۱۰)۔

کا حصہ کسی کی ضروریات کی کفالت نہیں کر سکتا لہٰذا قانونِ اسلام کی جامعیت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ خلاء پر نہ ہو اسی لئے اس نے قانونِ میراث کے ساتھ ساتھ قانونِ وصیت بھی رکھا ہے اور مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصے کے متعلق اپنے بعد کے لئے کوئی مستحکم پروگرام بنائیں اور اسے اپنے مقصد میں صرف کریں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کوئی اچھا کام انجام دے۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اپنی مالی ضروریات کے پیشِ نظر ایسا نہیں کر پاتا تو عقل منطق واجب قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے ان اموال سے جن کے حصول کے لئے اس نے زحمت اٹھائی ہے کارِ خیر کے انجام دینے سے بالکل محروم نہ ہو۔

ان سب امور کی وجہ سے اسلام میں قانونِ وصیت رکھا گیا ہے اور اس کی اس حد تک تاکید کی گئی ہے کہ اسے ایک وجوبی اور ضروری حکم کی حد تک پہنچا دیا گیا ہے اور "حقا علی المتقین" کے جملے سے اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

وصیت صرف مندرجہ بالا امور میں منحصر نہیں بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے قرض اور امانتوں کے متعلق جو اسے سپرد کی گئی ہیں اور دیگر امور کے بارے میں اپنی وصیت کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس طرح سے کہ حقوق الناس اور حقوق اللہ میں سے اس کی کوئی ذمہ داری مبہم نہ رہ جائے۔

روایات اسلامی میں وصیت کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

مایبنغی لامرء مسلم ان یبیت لیلة الا وصیته تحت رأسه

کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ رات سوئے مگر اس کا وصیت نامہ اس کے سر کے نیچے نہ ہو[1]

سر کے نیچے ہونا، یہاں تاکید کے لئے ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وصیت نامہ تیار رکھنا چاہیئے۔

ایک اور روایت میں ہے:

من مات بغیر وصیة مات میتة جاهلیة

جو شخص بغیر وصیت کے مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔[2]

(۲) وصیت میں عدالت: مندرجہ بالا آیت میں وصیت میں تعدی و تجاوز نہ کرنے کا حکم آپ نے ملاحظہ کیا۔ اس سلسلے میں اسلامی روایات میں بھی ظلم و جور اور ضرر پہنچانے کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ ان روایات کے اجتماعی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وصیت کرنے کی بہت اہمیت ہے اسی طرح وصیت میں ظلم روا رکھنا بہت برا عمل ہے اور گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۵۲

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۵۲

من عدل فی وصیتہ کان کمن تصدق بہا فی حیاتہ ومن جار فی وصیتہ لقی اللہ عزوجل یوم القیامۃ وھو عنہ معرض۔

جو شخص اپنی وصیت میں عدل کرے وہ ایسے ہے جیسے اس نے اپنی زندگی میں یہ مال راہ خدا میں صدقہ کر دیا ہو اور جو اپنی وصیت میں ظلم و تعدی کرے قیامت کے دن پروردگار کی طرف سے نگاہ لطف و کرم اس سے اٹھالی جائے گی۔[۱]

وصیت میں ظلم و جور اور ضرر رسانی یہ ہے کہ انسان اپنے ترکے کے تیسرے حصے سے زیادہ وصیت کرے اور ورثہ کو ان کے جائز حق سے محروم کر دے یا بلا وجہ محبت و دشمنی کی بناء پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دے۔ اسی لیے اگر ورثہ زیادہ ضرورتمند ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ تیسرے حصے کی بھی وصیت نہ کی جائے اور ایسے مقام پر وصیت میں چوتھے یا پانچویں حصے تک کمی کی جا سکتی ہے۔[۲]

وصیت میں عدالت کے بارے میں اسلام کے پیشواؤں نے اپنے ارشادات میں اس حد تک تاکید کی ہے کہ ایک حدیث میں ہے:

انصار میں سے ایک شخص فوت ہو گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے باقی رہ گئے لیکن وہ مرتے وقت سارا مال راہ خدا میں صرف کر گیا یہاں تک کہ کچھ باقی نہ رکھا۔

پیغمبر اسلام اس واقعے سے آگاہ ہوئے تو فرمایا:

اس شخص سے تم نے کیا سلوک کیا۔

لوگوں نے عرض کیا:

ہم نے (اس کی نماز جنازہ پڑھ کر) اسے دفن کر دیا ہے۔

آپ نے فرمایا:

مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں اجازت نہ دیتا کہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ دیے ہیں تاکہ وہ گدائی کرتے پھریں۔[۳]

(iii) واجب اور مستحب وصیت: وصیت ذاتی طور پر مستحب ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے ممکن ہے بعض اوقات وجوب کی شکل اختیار کر لے مثلاً کسی نے واجب حقوق اللہ (زکوٰۃ و خمس وغیرہ) کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہو یا لوگوں کی کچھ امانتیں اس کے پاس پڑی ہوں اور عدم وصیت کی صورت میں احتمال ہو کہ ان کا حق ضائع ہو جائے گا

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۵۹

[۲] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۶۰

[۳] سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۶۵۹، مادہ وصیت۔

اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شخص کا معاشرے میں ایسا مقام ہے کہ اگر وہ وصیت نہ کرے تو ممکن ہے نا قابلِ تلافی نقصان ہو اور صحیح اجتماعی یا دینی نظام میں سخت نقصان و ضرر کا اندیشہ ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں وصیت کرنا واجب ہو جائیگا۔

(۴) زندگی میں وصیت کو بدلا جا سکتا ہے: قوانین اسلام کی رو سے وصیت کرنے والا اپنی پہلے سے کی گئی وصیت کا پابند نہیں بلکہ اپنی زندگی میں وہ اسے بدل بھی سکتا ہے۔ وہ وصیت کی مقدار اور کیفیت اور اپنے وصی کے سلسلے میں نظر ثانی کر سکتا ہے کیونکہ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ اس بارے میں مصلحتیں بدل گئی ہوں۔

(۷) وصیت ــ اصلاح کا ذریعہ: اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی وصیت کو اپنی گذشتہ کوتاہیوں کی اصلاح اور ان کے ازالے کا ذریعہ قرار دے۔ یہاں تک کہ اس کے عزیز و اقارب اور وابستگان میں سے اگر کچھ اس کی طرف سے سرد مہری اور بے رغبتی کا شکار تھے تو وصیت کے ذریعے ان سے اظہار محبت کرے۔

روایات میں ہے کہ آئمہ دین اپنے ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص طور پر وصیت کرتے تھے جو ان سے سرد مہری سے پیش آتے تھے اور مال کی کچھ مقدار وصیت کے ذریعے ان کے لئے مختص کر دیتے تھے تاکہ ٹوٹے ہوئے رشتے محبت کے ذریعے پھر سے جوڑ دیں۔ اسی طرح اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتے یا انہیں آزاد کرنے کی وصیت کر دیتے تھے۔

۱۸۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

۱۸۴- أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ
أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ
خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

۱۸۵- شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ
وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

ترجمہ

۱۸۳- اے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا، تاکہ تم پرہیزگار

بن جاؤ۔

۱۸۴۔ چند گنے چنے دن (روزہ رکھو) اور تم میں سے جو لوگ بیمار ہوں یا مسافر ہوں وہ ان کی بجائے دوسرے دنوں میں (روزوں کی) گنتی پوری کرلیں اور جو لوگ یہ کام انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً دائمی مریض اور بوڑھے مرد عورتیں) ضروری ہے کہ وہ کفارہ ادا کریں اور مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو لوگ کار خیر بجالائیں تو وہ ان کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

۱۸۵۔ (وہ چند گنے چنے دن) ماہ رمضان کے ہیں، اس میں قرآن نازل ہوا جس میں لوگوں کے لئے راہنمائی اور ہدایت کی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ پس جو شخص ماہ رمضان میں حضر میں ہو وہ روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو وہ دوسرے دنوں میں بجالائے۔ خدا تمہارے لئے راحت و آرام چاہتا ہے، زحمت و تکلیف نہیں۔ تم یہ دن پورے کرو اور خدا کی اس لئے بزرگی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ ہو سکتا ہے تم شکر گزار ہو جاؤ۔

تفسیر

روزہ تقویٰ کا سرچشمہ ہے:

چند اہم اسلامی احکام کے بیان کے بعد زیر نظر آیات میں ایک اور حکم بیان کیا گیا ہے جو چند اہم ترین اسلامی عبادات میں شمار ہوتا ہے اور وہ روزہ ہے۔ اسی تاکید سے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! روزہ تمہارے لئے اس طرح سے لکھ دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کی امتوں کے لئے لکھا گیا تھا (یاایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم)۔

ساتھ ہی اس انسان ساز اور تربیت آفرین عبادت کا فلسفہ چھوٹے سے پُر معنی جملے میں یوں بیان کرتا ہے: ہو سکتا ہے تم پرہیزگار بن جاؤ (لعلکم تتقون)۔

جی ہاں ــــ جیسا کہ اس کی تشریح میں آگے بیان کیا جائے گا کہ روزہ روح تقویٰ اور پرہیزگاری کی تربیت کے لئے تمام جہات سے ایک مؤثر عامل ہے۔

اس عبادت کی انجام دہی چونکہ مادی لذائذ سے محرومیت اور مشکلات سے وابستہ ہے۔ خصوصاً گرمیوں میں یہ زیادہ مشکل ہے اس لئے روح انسانی کو مائل کرنے اور اس حکم کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کے لئے مندرجہ بالا آیات میں مختلف تعبیرات کو استعمال کیا گیا ہے۔

پہلے "یاایھا الذین امنوا" سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ روزہ تم ہی سے مخصوص نہیں بلکہ گذشتہ امتوں میں بھی تھا اور آخر میں اس کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق اس پُر مشقت خدائی فریضہ کے اثرات سو فیصد خود انسان کے فائدے میں ہیں اس طرح سے ایک پسندیدہ اور خوشگوار موضوع بنا دیا گیا ہے۔ ایک حدیث

میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لذة ما فی النداء ازال تعب العبادة والعناء۔

یعنی ——— یا ایھا الذین اٰمنوا کے خطاب کی لذت نے اس عبادت کی تکان، سختی اور مشقت کو ختم کر دیا ہے [1]

روزے کی سنگینی اور مشکل میں کمی کے لئے بعد کی آیت میں چند احکام اور بیان کئے گئے ہیں۔

ارشاد فرمایا: چند گنے چنے دن روزہ رکھو (ایاما معدودات) ایسا نہیں کہ تم پورا سال روزہ رکھنے پر مجبور ہو یا یہ سال کا کوئی بڑا حصہ ہے بلکہ یہ تو سال کے ایک مختصر سے حصے میں تمہیں مشغول رکھتا ہے۔

دوسری بات جو اس آیت میں ہے یہ ہے کہ تم میں سے جو افراد بیمار ہیں یا مسافر ہیں کہ جن کے لئے روزہ باعث مشقت و زحمت ہے انہیں اس حکم میں رعایت دی گئی ہے کہ وہ ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھیں (سفر ختم ہو جانے اور بیماری سے صحت یابی کے بعد) (فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر)۔

تیسری بات یہ کہ جنہیں روزہ رکھنے میں انتہائی زحمت و تکلیف ہوتی ہے (مثلاً بوڑھے مرد، بوڑھی عورتیں اور دائمی مریض جن کے تندرست ہونے کی امید نہیں) ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں، بلکہ اس کی بجائے کفارہ ادا کرنے کے لئے مسکین کو کھانا کھلا دیں (وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین [2])

جو شخص اس سے زیادہ راہ خدا میں کھانا کھلانا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے (فمن تطوع خیراً

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "یطیقونه" کا مادہ ہے "طوق" جس کا اصلی معنی ہے وہ حلقہ جو گلے میں ڈالتے ہیں یا جو طبعی طور پر گردن میں ہوتا ہے (جیسے رنگدار حلقہ جو بعض پرندوں کے گلے میں ہوتا ہے) بعد ازاں یہ لفظ انتہائی توانائی اور قوت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یطیقونه کی آخری ضمیر روزے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنہیں روزے کے لئے انتہائی قوت اور توانائی خرچ کرنا پڑے اور روزہ رکھنے میں انہیں سخت زحمت اٹھانا پڑے جیسا کہ بڑے بوڑھے اور ناقابل علاج بیمار ہیں روزہ ان کے لئے معاف ہے اور وہ اس کی جگہ صرف فدیہ ادا کریں۔ لیکن بیمار اگر تندرست ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری ہے کہ قضا روزہ رکھیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یطیقونه کا معنی ہے کہ جو گذشتہ زمانے میں قوت و توانائی رکھتے تھے (کانوا یطیقونه) اور اب طاقت نہیں رکھتے (بعض روایات میں بھی یہ معنی کیا گیا ہے)۔

بہر حال مندرجہ بالا حکم منسوخ نہیں ہوا اور آج بھی پوری طاقت سے باقی ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ پہلے روزہ واجب تخییری تھا اور لوگوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا فدیہ دیں، آیت میں موجود قرائن اس کی تائید نہیں کرتے اور اس پر کوئی واضح دلیل بھی موجود نہیں ہے۔

فھو خیر لہ) لہ

آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ روزے کا تمہیں ہی فائدہ پہنچے گا، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو (وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

بعض چاہتے ہیں کہ اس جملے کو اس امر کی دلیل قرار دیں کہ روزہ ابتداء میں واجب تخییری تھا۔ مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا اس کی بجائے فدیہ دے دیں تاکہ آہستہ آہستہ روزے کی عادت پڑ جائے۔ بعد ازاں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور روزے نے وجوب عینی کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت روزے کے فلسفے کی تاکید کے طور پر آئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ عبادت بھی دوسری عبادات کی طرح خدا کے جاہ و جلال میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ اس کا تمام فائدہ خود انسانوں کو ہے۔ اس کی شاہد وہ تعبیرات ہیں جو قرآن کی دیگر آیات میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً:

ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ہ

یہ تمہارے لئے ہی بہتر ہے اگر تم جان سکو۔ (جمعہ-۹)

یہ آیت نماز جمعہ کے وجوب عینی حکم کے بعد (اجتماع شرائط کی صورت میں) آئی ہے۔

سورہ عنکبوت کی آیت ۱۶ میں ہے:

وَ اِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ہ

اور جب ابراہیم نے بت پرستوں کی طرف رخ کرکے کہا کہ خدا کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ "ان تصوموا خیر لکم" سب روزہ داروں کے لئے خطاب ہے نہ کہ کسی خاص طبقے کے لئے۔

زیر نظر آخری آیت روزے کے زمانے، اس کے کچھ احکام اور فلسفے کو بیان کرتی ہے۔ فرمایا: وہ چند گنے چنے دن جن میں روزہ رکھنا ہے ماہ رمضان کے ہیں (شھر رمضان) وہی مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا ہے (الذی انزل فیہ القرآن)۔ وہی قرآن جو لوگوں کی ہدایت کا سبب ہے، جو ہدایت کی نشانیاں اور واضح دلیلیں لئے ہوئے ہے اور جو حق و باطل کے امتیاز اور ان کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا معیار رکھتا ہے (ھدی للناس و بینات من الھدی والفرقان)۔

اس کے بعد مسافروں اور بیماروں کے بارے میں روزے کے حکم کو دوبارہ تاکیداً بیان کیا گیا ہے: جو لوگ ماہ رمضان میں حاضر ہوں انہیں تو روزہ رکھنا ہوگا مگر جو مسافر یا بیمار ہوں وہ اس کے بدلے بعد کے دنوں میں روزے رکھیں (فمن شھد

لہ "من تطوع خیراً" کو بعض نے مستحبی روزوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ روزے کی اہمیت اور فلسفے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے چاہیئے کہ رغبت کے ساتھ روزہ رکھا جائے نہ کہ اکراہ و جبر سے روزہ رکھا جائے۔

منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام اخر)۔

مسافر اور بیمار کے حکم کا تکرار اس سے پہلی اور اس آیت میں ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ مطلقاً روزہ نہ رکھنا کوئی اچھا کام نہیں اور ان کا اصرار ہے کہ بیماری اور سفر میں بھی روزہ رکھا جائے لہٰذا قرآن اس حکم کے تکرار سے لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جیسے صحیح و سالم افراد کے لئے روزہ رکھنا ایک فریضۂ الٰہی ہے ایسے ہی بیماروں اور مسافروں کے لئے افطار کرنا بھی فرمانِ الٰہی ہے جس کی مخالفت گناہ ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ روزے کی تشریع اور فلسفے کا بیان ہے۔ فرمایا: خدا تمہارے لئے راحت و آرام اور آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے زحمت و تکلیف اور تنگی نہیں چاہتا: (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ روزہ رکھنا اگرچہ ظاہراً سختی و پابندی ہے لیکن انجام کار انسان کے لئے راحت و آسائش اور آرام کا باعث ہے۔

ممکن ہے یہ جملہ اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ احکام الٰہی ستمگر اور ظالم حاکموں کے سے نہیں جنہیں بلا مشروط بجا لانے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن جہاں انسان کے لئے کوئی حکم بجالانا سخت مشقت کا باعث ہو وہاں حکم الٰہی کے تحت انسانی ذمہ داری کو سہل تر کر دیا جاتا ہے اسی لئے روزے کا حکم اپنی پوری اہمیت کے باوجود بیماروں اور مسافروں کے لئے اٹھا دیا گیا ہے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: غرض اور مقصد یہ ہے کہ تم ان روزوں کی تعداد کو مکمل کرو (ولتکملوا العدۃ) یعنی ہر صحیح و سالم انسان پر لازم ہے کہ وہ سال میں ایک ماہ کے روزے رکھے کیونکہ روزہ اس کے جسم و روح کی پرورش کے لئے ضروری ہے۔ اسی بنا پر ماہ رمضان میں اگر تم بیمار تھے یا سفر میں تھے تو ضروری ہے کہ اتنے ہی دنوں کی بعد میں قضا کرو تاکہ وہ تعداد مکمل ہو جائے یہاں تک کہ عورتوں پر ایام حیض کی نماز کی قضا تو معاف ہے لیکن روزے کی قضا معاف نہیں ہے۔

آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: تاکہ اس بناء پر کہ خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے تم اس کی بزرگی بیان کرو اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو (ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون)۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ خدا کی بزرگی بیان کرنے کے مسئلے کا ذکر بطور قاطع ہے (ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم) جب کہ شکر گذاری کے لئے لعل (شاید) کہا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس لیے ہو کہ اس عبادت کی انجام دہی بہر حال مقام پروردگار کی تعظیم ہے لیکن شکر کا مفہوم ہے نعمات الٰہی کو ان کی جگہ پر صرف کرنا اور روزے کے عملی آثار اور فلسفوں سے فائدہ حاصل کرنا۔ اس کی کئی ایک شرائط ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں شکر انجام نہیں پاتا اور ان میں سے زیادہ اہم حقیقتِ روزہ کی پہچان، اس کے فلسفوں سے آگاہی اور خلوصِ کامل ہے۔

---

[1] بعض نے "فمن شھد منکم الشھر" کی "مہینہ" ہلال کے ساتھ تفسیر کی ہے یعنی جو چاند دیکھے اس پر روزہ واجب ہے لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے حق وہی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں کہا گیا ہے اور جو قبل و بعد کے جملوں سے بھی ہم آہنگ ہے اور روایاتِ اسلامی کے بھی مطابق ہے۔

چند اہم نکات

(۱) روزے کے تربیتی و اجتماعی اثرات: روزے کے کئی جہات سے گوناگوں مادی اور روحانی آثار ہیں۔ جو اس کے ذریعے وجود انسانی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم اس کا اخلاقی پہلو اور تربیتی فلسفہ ہے۔ روح انسانی کو لطیف ترنا، ارادہ انسانی کو قوی کرنا اور مزاج انسانی میں اعتدال پیدا کرنا روزے کے اہم فوائد میں سے ہے۔

روزے دار کے لیے ضروری ہے کہ حالت روزہ میں آب و غذا کی دستیابی کے باوجود اس کے قریب نہ جائے اور اسی طرح جنسی لذات سے چشم پوشی کرے اور عملی طور پر ثابت کرے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی چراگاہ اور گھاس پھوس کی قید میں نہیں ہے۔ سرکش نفس کی لگام اس کے قبضے میں ہے اور ہوا و ہوس اور شہوات و خواہشات اس کے کنٹرول میں ہیں۔

حقیقت میں روزے کا سب سے بڑا فلسفہ یہی روحانی اور معنوی اثر ہے۔ وہ انسان کہ جس کے قبضے میں طرح طرح کی غذائیں اور مشروبات ہیں۔ جب اسے بھوک یا پیاس لگتی ہے وہ ان کے پیچھے جاتا ہے۔ وہ درخت جو باغ کی دیوار کی پناہ میں نہر کے کنارے اگے ہوتے ہیں نازپروردہ ہوتے ہیں۔ یہ حوادث کا مقابلہ بہت کم کر سکتے ہیں۔ ان میں باقی رہنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ اگر انہیں چند دن پانی نہ ملے تو پژمردہ ہو کر خشک ہو جائیں جب کہ وہ درخت جو پتھروں کے درمیان پہاڑوں اور بیابانوں میں اگتے ہیں۔ ان کی شاخیں شروع سے سخت طوفانوں، تمازت آفتاب اور کڑاکے کی سردی کا مقابلہ کرنے کی عادی ہوتی ہیں اور طرح طرح کی محرومیوں سے دست و گریباں رہتی ہیں۔ ایسے درخت ہمیشہ مضبوط، سخت کوش اور سخت جان ہوتے ہیں۔

روزہ بھی انسان کی روح اور جان کے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ یہ وقتی پابندیوں کے ذریعے انسان میں قوت مدافعت اور قوت ارادی پیدا کرتا ہے اور اسے سخت حوادث کے مقابلے کی طاقت بخشتا ہے۔ چونکہ روزہ سرکش طبائع و جذبات پر کنٹرول کرتا ہے لہٰذا اس کے ذریعے انسان کے دل پر نور و ضیا کی بارش ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ روزہ انسان کو عالم حیوانیت سے بلند کر کے فرشتوں کی صف میں جا کھڑا کرتا ہے۔ لعلکم تتقون (ہو سکتا ہے تم پرہیزگار بن جاؤ) ان تمام مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

مشہور حدیث ہے:

الصوم جنة من النار

روزہ جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے ڈھال ہے۔[۱]

ایک اور حدیث حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے پوچھا گیا کہ ہم کون سا کام کریں جس کی وجہ سے شیطان ہم سے دور رہے۔ آپؐ نے فرمایا:

الصوم يسود وجهه والصدقة تكسر ظهره والحب في الله والمواظبة على العمل الصالح

---

[۱] بحار الانوار، ج ۹۶، ص ۲۵۶

یقطع دابرہ والاستغفار یقطع وتینہ

روزہ شیطان کا منہ کالا کر دیتا ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ خدا کے لئے محبت اور دوستی نیز عمل صالح کی پابندی سے اس کی دم کٹ جاتی ہے اور استغفار سے اس کی رگِ دل قطع ہو جاتی ہے۔[1]

نہج البلاغہ میں عبادات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے حضرت امیرالمومنینؑ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں:

والصیام ابتلاء لاخلاص الخلق

اللہ تعالیٰ نے روزے کو شریعت میں اس لئے شامل کیا تاکہ لوگوں میں روحِ اخلاص کی پرورش ہو۔[2]

پیغمبر اکرمؐ سے ایک اور حدیث مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

ان للجنۃ باباً یدعی الریان لا یدخل منھا الا الصائمون

بہشت کا ایک دروازہ ہے جس کا نام ہے ریان (یعنی۔ سیراب کرنے والا) اس میں سے صرف روزہ دار ہی داخل جنت ہوں گے۔

حضرت صدوق مرحوم نے معانی الاخبار میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے اس دروازے کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ روزہ دار کو چونکہ زیادہ تکلیف پیاس کی وجہ سے ہوتی ہے جب روزہ دار اس دروازے سے داخل ہوگا تو وہ ایسا سیراب ہوگا کہ اسے پھر کبھی بھی تشنگی کا احساس نہ ہوگا۔[3]

(۲) روزے کے معاشرتی اثرات: باقی رہا روزے کا اجتماعی اور معاشرتی اثر، تو وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ روزہ انسانی معاشرے کے لئے ایک درس مساوات ہے۔ کیونکہ اس مذہبی فریضے کی انجام دہی سے صاحب ثروت لوگ بھوکوں اور معاشرے کے محروم افراد کی کیفیت کا احساس کر سکیں گے اور دوسری طرف شب و روز کی غذا میں بچت کرکے ان کی مدد کے لئے جلدی کریں گے۔

البتہ ممکن ہے بھوکے اور محروم لوگوں کی توصیف کرکے خداوند عالم صاحب قدرت لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو اور اگر یہ معاملہ حسی اور عینی پہلو اختیار کر لے تو اس کا دوسرا اثر ہو۔ روزہ اس اہم اجتماعی موضوع کو حسی رنگ دیتا ہے۔

ایک مشہور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ ہشام بن حکم نے روزے کی علت اور سبب کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا:

انما فرض اللہ الصیام لیستوی بہ الغنی والفقیر وذالک ان الغنی لم یکن لیجد مس الجوع

---

[1] بحارالانوار ج ۹۶، ص ۲۵۵

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۲۵۲

[3] بحارالانوار ج ۹۶، ص ۲۵۲

فیستوی الفقیر والغنی کلما اراد شیئاً قدر علیہ فاراد اللہ تعالیٰ ان یسوی بین خلقہ وان یذیق الغنی مس الجوع والالم لیرق علی الضعیف ویرحم الجائع۔

روزہ اس لیے واجب ہوا ہے کہ فقیر اور غنی کے درمیان مساوات قائم ہو جائے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ غنی بھی بھوک کا مزہ چکھ لے اور فقیر کا حق ادا کرے کیونکہ مالدار عموماً جو کچھ چاہتے ہیں ان کے لئے فراہم ہو سکتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان مساوات ہو اور مالداروں کو بھی بھوک اور درد و رنج کا ذائقہ چکھائے تاکہ وہ کمزور اور بھوکے افراد پر رحم کریں۔[1]

(iii) روزے کے طبی اثرات: طب کی جدید اور قدیم تحقیقات کی روشنی میں امساک (کھانے پینے سے پرہیز) بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے معجزانہ اثر رکھتا ہے جو قابل انکار نہیں۔ شاید ہی کوئی حکیم ہو جس نے اپنی مشہور تالیفات اور تصنیفات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہ کیا ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سی بیماریاں زیادہ کھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چونکہ مواد اضافی بدن میں جذب نہیں ہوتا جس سے مزاحم اور مجتمع چربیاں پیدا ہوتی ہیں یا یہ چربی اور خون میں اضافی شوگر کا باعث بنتی ہے۔ عضلات کا یہ اضافی مواد در حقیقت بدن میں ایک متعفن بیماری کے جراثیم کی پرورش کے لئے گندگی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

ایسے میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین حل یہ ہے کہ گندگی کے ان ڈھیروں کو امساک اور روزے کے ذریعے ختم کیا جائے۔ روزہ ان اضافی غلاظتوں اور بدن میں جذب نہ ہونے والے مواد کو جلا دیتا ہے۔ در حقیقت روزہ بدن کو صفائی شدہ مکان بنا دیتا ہے۔

علاوہ ازیں روزے سے معدے کو ایک نمایاں آرام ملتا ہے اور اس سے ہاضمے کی مشینری کی سروس ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ بدن انسانی کی حساس ترین مشینری ہے جو سارا سال کام کرتی رہتی ہے۔ لہذا اس کے لئے ایسا آرام بہت ضروری ہے۔ یہ واضح ہے کہ حکم اسلامی کی رو سے روزہ دار کو اجازت نہیں کہ وہ سحری اور افطاری کی غذا میں افراط اور زیادتی سے کام لے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ اس حفظان صحت اور علاج سے مکمل نتیجہ حاصل کیا جا سکے ورنہ ممکن ہے کہ مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ کیا جا سکے۔

ایک روسی دانشور الکسی سوفرین لکھتا ہے:

روزہ ان بیماریوں کے علاج کے لئے خاص طور پر مفید ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۷، باب اول، کتاب صوم ص ۳

خون کی کمی، انتڑیوں کی کمزوری، التہاب زائدہ[1] (APPENDICITIS) خارجی و داخلی تدم پھوڑے، تپ دق (T.B)، اسکلیروز، نقرس[2]، استسقاء[3] جوڑوں کا درد[4]، نفراستنی، عرق النساء[5]، خواز (جلد کا گرنا)، امراض چشم، شوگر، امراض جلد، امراض گردہ، امراض جگر اور دیگر بیماریاں۔

امساک اور فاقے کے ذریعے علاج صرف مندرجہ بالا بیماریوں سے مخصوص نہیں بلکہ وہ بیماریاں جو بدن انسانی کے اصول سے مربوط ہیں اور جسم کے خلیوں سے چپٹی ہوئی ہیں مثلاً سرطان، سفلیس اور طاعون کے لئے بھی یہ شفا بخش ہے۔

ایک مشہور حدیث پیغمبر اکرم سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

صوموا تصحوا

روزہ رکھو تاکہ صحت مند رہو[6]

پیغمبر اکرم سے ایک اور حدیث مروی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

المعدۃ بیت کل داء والحمیۃ رأس کل دواء

معدہ ہر بیماری کا گھر ہے اور امساک اعلیٰ ترین دوا ہے[7]

(۷) روزہ گذشتہ امتوں میں: موجودہ توریت اور انجیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزہ یہود و نصاریٰ میں بھی تھا جیسا کہ قاموس کتاب مقدس میں ہے:

روزہ کلیتہً تمام اوقات اور تمام زمانوں میں ہر گروہ، امت اور مذہب میں اندوہ و غم اور اچانک مصیبت کے موقع پر معمول تھا[8]

توریت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے چالیس دن تک روزہ رکھا۔ جیسا کہ لکھا ہے:

جب میں پہاڑ پر گیا تاکہ پتھر کی تختیاں یعنی وہ عہد والی تختیاں جو خدا نے تمہارے ساتھ منسلک کر دی ہیں حاصل کروں اس وقت میں پہاڑ میں چالیس راتیں رہا۔ وہاں میں نے نہ روٹی کھائی نہ

---

۱ ایک مرض جس میں بڑی آنت متورم ہو جاتی ہے اور اس میں سوزش ہوتی ہے۔ (مترجم)

۲ ایک قسم کا گنٹھیا، ایک شدید درد جو پاؤں کی انگلیوں سے اٹھا کرتا ہے۔ (مترجم)

۳ جلندر کی بیماری جس میں بہت پیاس لگتی ہے اور پیٹ دن بدن بڑھتا رہتا ہے۔ (مترجم)

۴ اسے وجع مفاصل کہتے ہیں۔ (مترجم)

۵ چوتڑوں سے ٹخنوں تک پہنچنے والا درد۔ (مترجم)

۶ کتاب روزہ روش نوین، ص ۶۵، اشاعت اول

۷ بحار الانوار، ج ۱۴ (قدیم)

۸ قاموس کتاب مقدس، ص ۴۲۷

پانی پیا۔[1]

یہودی جب توبہ کرتے اور رضائے الٰہی طلب کرتے تو روزہ رکھتے تھے:

اکثر اوقات یہودی جب سوچتے کہ خدا کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تواضع کا اظہار کریں تو روزہ رکھتے تاکہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرکے روزہ اور توبہ کے ذریعے حضرت اقدس الٰہی کی رضا و خوشنودی حاصل کریں۔[2]

احتمال ہے کہ روزہ اعظم یا کفارہ سال میں مخصوص ایک دن کے لئے جو جس کا یہودیوں میں رواج تھا۔ البتہ وہ دوسرے موقتی روزے بھی رکھتے تھے مثلاً اورشلیم کی بربادی کے وقت رکھا گیا روزہ وغیرہ۔[3]

جیسا کہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس دن روزے رکھے:

اس وقت عیسیٰ تربت روح کے ساتھ بیابان میں لے جائے گئے تاکہ ابلیس انہیں آزمائے۔ پس انہوں نے چالیس شب و روز روزہ رکھا اور وہ بھوکے رہے۔[4]

انجیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد حواریین روزہ رکھتے تھے جیسا کہ انجیل میں ہے:

انہوں نے اس سے کہا کہ کیا بات ہے کہ یحییٰ کے شاگرد ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں اور دعا کرتے رہتے ہیں جب کہ تمہارے شاگرد ہمیشہ کھاتے پیتے رہتے ہیں لیکن ایک زمانہ آئے گا جب داماد ان میں سے اٹھا لیا جائے گا اور وہ اس وقت روزہ رکھیں گے۔[5]

کتاب مقدس میں یہ بھی ہے:

اس بنا پر حواریین اور گذشتہ زمانے کے مومنین کی زندگی انکارِ لذات سے بے شمار زحمات اور روزہ داری سے بھری پڑی تھی۔[6]

(۴) **رمضان مبارک کی خصوصیت اور امتیاز:** کیا سبب ہے کہ ماہ رمضان روزے رکھنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے بلکہ اسی بنا پر اسے دوسرے مہینوں پر برتری حاصل ہے۔ زیر نظر آیت میں اس کی برتری کی وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن جو ہدایت اور انسانی رہبری کی کتاب ہے جس نے اپنے احکام اور قوانین کی صحیح روش کو غیر صحیح راستے سے

---

[1] تورات، سفر تثنیہ، فصل ۹، شمارہ ۹۔
[2] قاموس کتاب مقدس، ص ۴۲۰
[3] قاموس کتاب مقدس ص ۴۲۰
[4] انجیل متی، باب ۴، شمارہ ۱ و ۲
[5] انجیل لوقا، باب ۵، شمارہ ۳۳—۳۵
[6] قاموس کتاب مقدس ص ۴۲۰

جدا کر دیا ہے اور جو انسانی سعادت کا دستور لے کر آئی ہے اسی مہینے میں نازل ہوئی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ تمام عظیم آسمانی کتب تورات، انجیل، زبور، صحیفے اور قرآن اسی مہینے میں نازل ہوئیں۔
امام صادقؑ فرماتے ہیں:

تورات چھ رمضان، انجیل بارہ رمضان، زبور اٹھارہ رمضان اور قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے۔[1]

اس طرح ماہ رمضان عظیم آسمانی کتب کے نزول اور تعلیم و تدریس کا مہینہ ہے کیونکہ صحیح تربیت تعلیم اور مطالعہ سیکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

روزے کا تربیتی پروگرام زیادہ سے زیادہ اور گہری آگاہی کے ساتھ آسمانی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے تاکہ اس سے انسانی روح و بدن کی آلودگی گناہ دھل جائے۔

ماہ شعبان کے ایک آخری جمعہ کو پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اصحاب کو اس ماہ کے استقبال کے لئے آمادہ کرنے کی خاطر خطبہ دیا۔ اور اس کی اہمیت اس طرح ان کے گوش گزار کی:

اے لوگو! خدا کی برکت، بخشش اور رحمت کا مہینہ تمہاری جانب آ رہا ہے۔ یہ مہینہ تمام مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے دن دوسرے مہینوں کے دنوں سے اور اس کی راتیں دوسرے مہینوں کی راتوں سے بہتر ہیں۔ اس ماہ کے لمحے اور گھڑیاں دوسرے مہینوں کے لمحوں اور گھڑیوں سے برتر ہیں۔

یہ ایسا مہینہ ہے جس میں تمہیں خدا نے مہمان بننے کی دعوت دی ہے اور تمہیں ان لوگوں میں سے قرار دیا گیا ہے جو خدا کے اکرام و احترام کے زیر نظر ہیں۔ اس میں تمہاری سانسیں تسبیح کی مانند ہیں، تمہارا سونا عبادت ہے اور تمہارے اعمال اور دعائیں مستجاب ہیں۔ لہٰذا خالص نیتوں اور پاک دلوں کے ساتھ خدا سے دعا کرو تاکہ وہ تمہیں روزہ رکھنے اور تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ بدبخت ہے وہ شخص جو اس مہینے میں خدا کی بخشش سے محروم رہ جائے۔ اس ماہ میں اپنی بھوک اور پیاس کے ذریعے قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔ اپنے فقراء اور مساکین پر احسان کرو۔ اپنے بڑے بزرگوں کا احترام کرو اور چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ رشتہ داری کے ناتوں کو جوڑ دو۔ اپنی زبانیں گناہ سے روکے رکھو۔ اپنی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھنے سے بند رکھو جن کا دیکھنا حلال نہیں۔ اپنے کانوں کو ان چیزوں کے سننے سے روکے رکھو جن کا سننا حرام ہے اور لوگوں کے یتیموں پر شفقت و مہربانی کرو تاکہ وہ بھی تمہارے یتیموں سے یہی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۷، ابواب احکام شہر رمضان باب ۱۸، حدیث ۱۶

سلوک کریں۔[1]

(۱۱) قاعدہ لاحرج: مندرجہ بالا آیات میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا تمہارے لئے آسانی اور آرام چاہتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ تم زحمت و مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔

مندرجہ بالا آیات میں اس کا بیان روزے اور اس کے فوائد نیز مسافر اور بیمار سے متعلق ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ ایک کلی قاعدہ ہے تمام اسلامی احکام کے بارے میں ایک اصول معلوم ہو جاتا ہے اور یہی بات ایک مشہور قاعدے جسے قاعدۂ لاحرج کہتے ہیں کے لئے ایک ماخذ و مدرک ہے۔

اس قاعدے کے مطابق احکام اسلام کی بنیاد سخت گیری پر نہیں۔ اگر کوئی حکم کسی مقام پر شدید مشقت کا باعث ہو تو وقتی طور پر وہ حکم اٹھ جاتا ہے جیسا کہ ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ جب کبھی وضو کرنا یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا یا ایسا کوئی اور عمل انسان کے لئے مشقت و زحمت کا سبب ہو تو وضو کا حکم تیمم سے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم بیٹھ کر نماز پڑھنے سے بدل جائے گا۔

سورہ حج کی آیت ۷۸ میں ہے:

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

اسی نے تمہیں چن لیا اور اس نے تمہارے لئے دین کے سلسلے میں کوئی مشقت نہیں رکھی۔

پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث ہے:

بعثت علی الشریعة السمحة السهلة۔

میں ایسے دین و شریعت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں جسے انجام دینا اور اس پر عمل کرنا آسان ہے۔

---

[1] یہ وسائل الشیعہ جلد ۷ ابواب احکام شہر رمضان کے باب ۱۸ کی بیسویں حدیث ہے اس کا عربی متن یہ ہے:

فقال — ایها الناس انه قد اقبل الیکم شهر الله بالبرکة والرحمة والمغفرة شهر هو عند الله افضل الشهور، وایامه افضل الایام ولیالیه افضل اللیالی، وساعاته افضل الساعات، هو شهر دعیتم فیه الی ضیافة الله، وجعلتم فیه من اهل کرامة الله، انفاسکم فیه تسبیح، ونومکم فیه عبادة، وعملکم فیه مقبول، ودعاؤکم فیه مستجاب، فاسئلوا الله ربکم بنیات صادقة وقلوب طاهرة: ان یوفقکم لصیامه وتلاوة کتابه، فان الشقی من حرم غفران الله فی هذا الشهر العظیم، واذکروا بجوعکم وعطشکم فیه جوع القیامة وعطشه وتصدقوا علی فقرائکم ومساکینکم، ووقروا کبارکم وارحموا صغارکم، وصلوا ارحامکم، واحفظوا السنتکم، وغضوا عما لا یحل النظر الیه ابصارکم، وعما لا یحل الاستماع الیه اسماعکم، وتحننوا علی ایتام الناس یتحنن علی ایتامکم۔

یہ بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۱۸۶۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۶۔ اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو (ان سے کہو کہ) میں قریب ہوں پکارنے والے کی پکار پر میں اسے جواب دیتا ہوں۔ پس وہ میری دعوت اور پکار کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لے آئیں تاکہ انہیں راستہ مل سکے۔

شان نزول

کسی نے نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ کیا ہمارا خدا نزدیک ہے کہ ہم اس سے آہستہ سے مناجات کر سکیں یا دور ہے کہ بلند آواز سے پکاریں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور جواب دیا گیا کہ خدا اپنے بندوں کے نزدیک ہے۔[۱]

تفسیر

دعا اور تضرع و زاری

خدا کے ساتھ بندوں کے ارتباط کا ایک وسیلہ دعا اور تضرع و زاری ہے لہٰذا گذشتہ آیات میں چند اہم اسلامی احکام بیان کرنے کے بعد زیر بحث آیت میں اس کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ دعا خدا سے مناجات کرنے والے سب لوگوں کے لئے اپنے اندر ایک عمومی پروگرام لئے ہوئے ہے لیکن روزے سے مربوط آیات کے درمیان اس کا ذکر اسے ایک نیا مفہوم عطا کرتا ہے۔

روزہ داروں کی ذمہ داریاں بیان کرنے سے قبل اس آیت کے ذریعے قرآن روزے کے ایک اور راز کی طرف اشارہ کرتا ہے جو وہی قرب الٰہی ہے اور اس سے راز و نیاز کرنا ہے۔

اس آیت کا روئے سخن پیغمبر کی طرف ہے۔ فرمایا: جس وقت میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو کہہ دو کہ میں نزدیک ہوں (واذا سألک عبادی عنی فانی قریب)۔

اس سے زیادہ قریب کہ جس کا تم تصور کر سکتے ہو، تم سے تمہاری نسبت بھی زیادہ نزدیک اور تمہاری رگِ حیات سے بھی

۱؎ مجمع البیان، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

زیادہ قریب

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝

اور ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (ق۔ ۱۶)

اس کے بعد مزید فرمایا: جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) اس لئے میرے بندوں کو چاہیئے کہ وہ میری دعوت قبول کریں (فلیستجیبوالی) اور مجھ پر ایمان لے آئیں (ولیؤمنوابی)۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی راہ پالیں اور مقصد تک جا پہنچیں (لعلھم یرشدون)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خدا نے اس مختصر سی آیت میں سات مرتبہ اپنی ذاتِ پاک کی طرف اور سات ہی مرتبہ بندوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس طرح اللہ نے بندوں سے اپنی انتہائی وابستگی، قربت، ارتباط اور ان سے اپنی محبت کی عکاسی کی ہے عبداللہ بن سنان کہتا ہے میں نے امام صادقؑ سے سنا آپؑ نے فرمایا۔

دعا کیا کرو کیونکہ وہ خدا کی بخشش کی چابی ہے۔ اور ہر حاجت تک پہنچنے کے لئے وسیلے کی قوت ہے سب نعمتیں اور رحمتیں پروردگار کے پاس ہیں جن تک دعا کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا۔ کسی دروازے کو کھٹکھٹاتے رہو تو بالآخر وہ کھل جائے گا۔[1]

جی ہاں ۔۔۔ وہ ہم سے نزدیک ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سے دور ہو حالانکہ اس کا مقام ہمارے اور ہمارے دل کے درمیان ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ

اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ (انفال۔ ۲۴)

چند اہم نکات

(۱) دعا اور زاری کا فلسفہ: جو لوگ دعا کی حقیقت، اس کی روح، اس کے تربیتی و نفسیاتی اثرات کو نہیں سمجھتے وہ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ اعصاب کو کمزور اور بے حس کر دیتی ہے کیونکہ ان کی نظر میں دعا لوگوں کو فعالیت، کوشش، پیش رفت اور کامیابی کے وسائل کی بجائے اسی راہ پر لگا دیتی ہے اور انہیں سبق دیتی ہے کہ کوششوں کے بدلے اسی پر اکتفا کرو۔

معترضین کبھی کہتے ہیں کہ دعا اصولی طور پر خدا کے معاملات میں بے کار دخل اندازی ہے۔ خدا جیسی مصلحت دیکھے گا اسے انجام دے گا وہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمارے مصالح کو جانتا ہے پھر کیوں ہر وقت ہم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس سے سوال کرتے رہیں۔

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۴۶۸

کبھی کہتے ہیں کہ ان تمام امور کے علاوہ دعا، ارادہ الٰہی پر راضی رہنے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے منافی ہے۔

جو لوگ ایسے سوالات کرتے ہیں وہ دعا اور تضرع وزاری کے نفسیاتی، اجتماعی، تربیتی اور معنوی و روحانی آثار سے غافل ہیں۔ انسان ارادے کی تقویت اور دکھ درد کے دور ہونے کے لئے کسی سہارے کا محتاج ہے اور دعا انسان کے دل میں چراغ امید روشن کر دیتی ہے۔ جو لوگ دعا کو فراموش کئے ہوئے ہیں وہ نفسیاتی اور اجتماعی طور پر ناپسندیدہ رد عمل سے دوچار ہوتے ہیں۔

ایک مشہور ماہر نفسیات کا قول ہے کہ کسی قوم میں دعا و زاری کا نقصان اس ملت کی تباہی کے برابر ہے۔ وہ قوم جو احتیاج دعا کا گلا گھونٹ دے وہ عموماً فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔[1]

"البتہ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ صبح کے وقت دعا و زاری کرنا اور باقی سارا دن ایک وحشی جانور کی طرح گزارنا، بے ہودہ اور فضول ہے۔ دعا کو مسلسل جاری رہنا چاہیئے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اس کے گہرے اثر سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"[2]

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا کاہلی و سستی کا سبب بنتی ہے۔ وہ دعا کا معنی ہی نہیں سمجھے کیونکہ دعا کا یہ مطلب نہیں کہ طبیعی وسائل و اسباب سے ہاتھ کھینچ لیا جائے اور ان کی بجائے بس دست دعا بلند کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمام موجود وسائل کے ذریعے اپنی پوری کوشش بروئے کار لائی جائے اور جب معاملہ انسان کے بس میں نہ رہے اور وہ مقصد تک نہ پہنچ پا رہا ہو تو دعا کا سہارا لے۔ توجہ کے ساتھ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر امید اور برکت کی روح کو بیدار کرے اور اس مبداء عظیم کی بے پناہ نصرتوں میں سے اپنے لئے مدد حاصل کرے۔ لہٰذا دعا مقصد تک نہ پہنچ پانے اور رکاوٹوں کی صورت میں ہے نہ کہ یہ طبیعی عوامل کے مقابلے میں کوئی عامل ہے۔ مذکورہ ماہر نفسیات مزید لکھتا ہے:

"اس کے علاوہ کہ دعا اطمینان پیدا کرتی ہے یہ انسان کی فکر میں ایک طرح کی شگفتگی پیدا کرتی ہے اور باطنی انبساط کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات یہ انسان کے لئے بہادری اور دلاوری کی روح کی بیداری کے لئے محرک کا کام بھی دیتی ہے۔ دعا کے ذریعے انسان پر بہت سے علامات ظاہر ہوتے ہیں۔ نگاہ کی پاکیزگی، کردار کی متانت، باطنی انبساط و مسرت، پر اطمینان چہرہ، استعداد ہدایت اور استقبال حوادث سب دعا کے مظاہر ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو دعا کرنے والے کی روح کی گہرائی اور اس کے جسم میں چھپے ہوئے ایک خزانے کی ہمیں خبر دیتی ہیں۔ دعا کی قدرت سے پسماندہ اور کم استعداد لوگ بھی اپنی عقلی اور اخلاقی قوت کو بہتر طریقے سے کار آمد بنا سکتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو دعا کے حقیقی رخ کو پہچان سکیں۔"[3]

---

[1] نیائش الیکس کارل

[2] نیایش الیکس کارل

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ دعا تسلیم و رضا کے منافی ہے کیونکہ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ہم تشریح کر چکے ہیں دعا پروردگار کے فیض بے پایاں سے زیادہ سے زیادہ کسب کمال کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان دعا کے ذریعے پروردگار کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور فیض کے حصول کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے اور واضح ہے کہ تکامل کی کوشش اور زیادہ سے زیادہ کسب کمال کی سعی قوانین آفرینش کے سامنے تسلیم و رضا ہے نہ کہ اس کے منافی۔

علاوہ ازیں دعا ایک طرح کی عبادت، خضوع اور بندگی ہے۔ انسان دعا کے ذریعے ذات الٰہی کے ساتھ ایک نئی وابستگی پیدا کر لیتا ہے اور جیسے تمام عبادات تربیتی اثر رکھتی ہیں دعا بھی ایسے اثر کی حامل ہوتی ہے۔ چاہے قبولیت تک پہنچے یا نہ پہنچے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دعا امور الٰہی میں دخالت ہے اور جو کچھ مصلحت کے مطابق ہو خدا دیتا ہے وہ اس طرف متوجہ نہیں کہ عطیات خداوندی استعداد اور لیاقت کے مطابق تقسیم ہوتے ہیں، جتنی استعداد و لیاقت زیادہ ہوگی انسان کو عطیات بھی اسی قدر نصیب ہوں گے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ان عند اللہ عزوجل منزلۃ لا تنال الا بمسألۃ

خدا کے ہاں ایسے مقامات و منازل ہیں جو مانگے بغیر نہیں مل سکتے[1]

ایک صاحب علم کا قول ہے:

جب ہم دعا کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ایک ایسی لامتناہی قوت سے متصل و مربوط کر لیتے ہیں جس نے ساری کائنات کی اشیاء کو ایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھا ہے[2]

اسی صاحب علم کا کہنا ہے:

آج کا جدید ترین علم یعنی علم نفسیات (PSYCHOLOGY) بھی یہی تعلیم دیتا ہے جو انبیاء دیا کرتے تھے چنانچہ نفسیات کے ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دعا، نماز اور دین پر محکم ایمان —— اضطراب، تشویش، ہیجان اور خوف کو دور کر دیتا ہے جو ہمارے دکھ درد کا آدھے سے زیادہ حصہ ہے[3]

(۱) دعا کا حقیقی مفہوم: ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ دعا کا مقام وہ ہے جہاں قدرت و طاقت جواب دے جائے نہ وہ کہ جہاں طاقت و توانائی کی دسترسائی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اجابت و قبولیت کے قابل وہ دعا ہے جو اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۳۸

[2] آئین زندگی، ص ۱۵۶

[3] آئین زندگی ص ۱۵۲

[اذا دعاہ ویکشف السوء[1] (نمل۔ ۶۲) کے مطابق اضطرار اور تمام کوششوں اور مساعی کے بے کار ہو جانے پر ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ دعا ان اسباب و عوامل کی فراہمی کے لئے کی جاتی ہے جو انسانی بساط سے باہر ہوں اور ان کا تقاضا اس کی بارگاہ میں کیا جاتا ہے جس کی قدرت لامتناہی ہے اور جس کے لئے ہر فعل ممکن آسان ہے۔ لیکن چاہیئے کہ یہ درخواست فقط انسان کی زبان سے نہ نکلے بلکہ اس کے تمام وجود سے نکلے اور زبان اس سلسلے میں تمام ذرات ہستی اور اعضاء و جوارح کی نمائندگی کرے اور قلب و روح دعا کے ذریعے اُس سے قریبی تعلقات پیدا کرے۔ اُس قطرے کی طرح جو بے کنار سمندر سے مل جاتا ہے قدرت کے اس عظیم مبداء کے ساتھ اتصالِ معنوی حاصل کرلے۔ ہم جلد ہی اس ارتباط اور تعلق کے روحانی اثرات پر بحث کریں گے۔

البتہ متوجہ رہنا چاہیئے کہ دعا کی ایک قسم وہ بھی ہے جو قدرت و توانائی کے ہوتے ہوئے انجام پاتی ہے تاہم وہ دعا بھی اسباب ممکنہ کی قائم مقام نہیں ہو سکتی اور وہ دعا وہ ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس جہان کی تمام تدبیریں اور توانائیاں پروردگار عالم کی قدرت کے مقابلے میں استقلال نہیں رکھتیں دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف متوجہ رہا جائے کہ طبیعی عوامل اور اسباب کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اُس ذات بابرکات کی طرف سے ہے اور اس کے حکم و فرمان سے ہے۔ اگر کوئی دوا کے ذریعے شفا کا خواہاں ہوتا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ اس نے دوا کو یہ تاثیر بخشی ہے دیہ بھی ایک قسم کی دعا ہے جس کی طرف احادیث اسلامی میں اشارہ ہوا ہے، مختصر یہ کہ یہ دعا کی وہ قسم ہے جسے خود آگاہی اور فکر و نظر اور دل و دماغ کی بیداری کہا جا سکتا ہے یہ اس ذات سے ایک باطنی رشتہ ہے جو تمام نیکیوں اور خوبیوں کا مبداء و مصدر ہے۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات میں ہے۔

لا یقبل اللہ عزوجل دعاء قلب لاہ

خدا غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا[2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے یہی مضمون مروی ہے:

ان اللہ عزوجل لا یستجیب دعاء بظھر قلب ساہ[3]

یہ خود دعا کے فلسفوں کی ایک اساس ہے جس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

(iii) دعا کی قبولیت کی شرائط: دعا کی قبولیت کی شرائط کی طرف توجہ کرنے سے بھی بظاہر دعا کے پیچیدہ مسئلے کے سلسلے میں نئے حقائق آشکار ہوتے ہیں اور اس کے اصلاحی اثرات واضح ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چند احادیث

---

[1] اس آیت کا مفہوم یہ ہے: "کون ہے جو کسی مصیبت زدہ اور بے قرار کی دعا سنتا ہے اور اس کی فریاد رسی کرکے اسے مصیبت سے نجات دیتا ہے؟" (مترجم)

[2] و [3] اصول کافی، ج ۲، ص ۴۷۳

پیش خدمت ہیں:

۱: دعا کی قبولیت کے لئے ہر چیز سے پہلے دل اور روح کی پاکیزگی کی کوشش، گناہ سے توبہ اور اصلاح نفس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں خدا کے بھیجے ہوئے رہناؤں اور رہبروں کی زندگی سے الہام وہدایات حاصل کرنا چاہئیں امام صادقؑ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ایاکم ان یسئل احدکم ربہ شیئا من حوائج الدنیا والاٰخرۃ حتی یبدء بالثناء علی اللّٰہ والمدحۃ لہ والصلوٰۃ علی النبی واٰلہ ثم الاعتراف بالذنب ثم المسألۃ۔

جب تم میں سے کوئی اپنے رب سے دنیا وآخرت کی کوئی حاجت طلب کرنا چاہے تو پہلے خدا کی حمد وثنا اور مدح کرے، پیغمبر اور ان کی آل پر درود بھیجے پھر گناہوں کا اعتراف اور اس کے بعد سوال کرے۔[1]

۲: اپنی زندگی کی پاکیزگی کے لئے غصبی مال اور ظلم وستم سے بچنے کی کوشش کرے اور حرام غذا نہ کھائے۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من احب ان یستجاب دعائہ فلیطب مطعمہ ومکسبہ

جو چاہتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو اس کے لیے ضروری ہے اس کی غذا اور کسب وکار پاک و پاکیزہ ہو۔[2]

۳: فتنہ وفساد کا مقابلہ کرنے اور حق کی دعوت دینے میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک دیتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے:

لتأمرون بالمعروف ولتنھن عن المنکر او لیسلطن اللّٰہ شرارکم علی خیارکم فیدعوا خیارکم فلا یستجاب لھم۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرو ورنہ خدا تم سے بُروں کو تمہارے اچھے لوگوں پر مسلط کرے گا پھر تمہارے اچھے لوگ دعا کریں گے تو وہ ان کی دعا قبول نہیں کرے گا۔[3]

حقیقت میں یہ عظیم ذمہ داری جو ملت کی نگہبانی ہے اسے ترک کرنے سے معاشرے میں بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں بدکاروں کے لئے میدان خالی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں دعا اس کے نتائج کو زائل کرنے کے لئے بے اثر ہے کیونکہ یہ کیفیت ان کے اعمال کا قطعی اور حتمی نتیجہ ہے۔

۴: خدائی عہد وپیمان کو وفا کرنا بھی دعا کی قبولیت کی شرائط میں شامل ہے ایمان، عمل صالح، امانت اور صحیح کام

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۴۴۸ و ص ۴۴۹

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۴۴۸ و ص ۴۴۹

[3] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۴۴۹

اس عہد و پیمان کا حصہ ہیں۔ جو شخص اپنے پروردگار سے کیے گئے عہد کی پاسداری نہیں کرتا اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ پروردگار کی طرف سے اجابت دعا کا وعدہ اس کے شامل حال ہوگا۔

کسی شخص نے امیرالمؤمنین کے سامنے دعا قبول نہ ہونے کی شکایت کی۔ وہ کہنے لگا: خدا کہتا ہے کہ دعا کرو تو میں قبول کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی۔ اس کے جواب میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

ان قلوبکم خان بثمان خصال:

اولها انکم عرفتم الله فلم تؤدوا حقه کما اوجب علیکم فما اغنت عنکم معرفتکم شیئا۔

والثانیة انکم آمنتم برسوله ثم خالفتم سنته وامتم شریعته فاین ثمرة ایمانکم۔

والثالثه انکم قرأتم کتابه المنزل علیکم فلم تعملوا به وقلتم سمعنا واطعنا ثم خالفتم۔

والرابعة انکم قلتم تخافون من النار وانتم فی کل وقت تقدمون الیها بمعاصیکم فاین خوفکم۔

والخامسة انکم قلتم ترغبون فی الجنة وانتم فی کل وقت تفعلون ما یباعدکم منها فاین رغبتکم فیها۔

والسادسة انکم اکلتم نعمة المولی فلم تشکروا علیها۔

والسابعة ان الله امرکم بعداوة الشیطان وقال ان الشیطان لکم عدو فاتخذوه عدوا فعادیتموه بلا قول وواليتموه بلا مخالفته۔

والثامنة انکم جعلتم عیوب الناس نصب اعینکم وعیوبکم وراء ظهورکم تلومون من انتم احق باللوم منه فای دعاء یستجاب لکم مع هذا وقد سددتم ابوابه وطرقه فاتقوا الله واصلحوا اعمالکم واخلصوا سرائرکم وأمروا بالمعروف وانهوا عن المنکر فیستجیب لکم دعائکم۔

تمہارے دل و دماغ نے آٹھ چیزوں میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے تمہاری دعا قبول نہیں ہوتی:

پہلی: تم نے خدا کو پہچان کر اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لئے تمہاری معرفت نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

دوسری : تم اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر پر ایمان تو لے آئے ہو مگر اس کی سنت کی مخالفت کرتے ہو۔ ایسے میں تمہارے ایمان کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

تیسری : تم اس کی کتاب کو تو پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ زبانی تو کہتے ہو کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی مگر عملاً اس کی مخالفت کرتے ہو۔

چوتھی : تم کہتے ہو کہ ہم خدا کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی نافرمانیوں کی طرف قدم بڑھاتے ہو۔ تو پھر خوف کہاں رہا۔

پانچویں : تم کہتے ہو کہ ہم جنت کے شائق ہیں حالانکہ کام ایسے کرتے ہو جو تمہیں اس سے دور لے جاتے ہیں تو پھر رغبت و شوق کہاں رہا۔

چھٹی : خدا کی نعمتیں تو کھاتے ہو مگر شکر کا حق ادا نہیں کرتے ہو۔

ساتویں : اس نے تمہیں حکم دیا کہ شیطان سے دشمنی رکھو ــــــ اور تم اس سے دوستی کی طرح ڈالتے ہو۔

آٹھویں : تم نے لوگوں کے عیوب کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور اپنے عیوب پس پشت ڈال دیے ہیں۔

ان حالات میں تم کیسے امید رکھتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو جب کہ تم نے خود اس قبولیت کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو۔ اپنے اعمال کی اصلاح کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، تاکہ تمہاری دعا قبول ہو سکے[1]

اس سے ظاہر ہے کہ قبولیت دعا کا وعدہ خدا کی طرف سے مشروط ہے نہ کہ مطلق۔ شرط یہ ہے کہ تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو حالانکہ تم آٹھ طرح سے پیمان شکنی کر چکے ہو۔

مندرجہ بالا آٹھ احکام جو اجابت دعا کی شرائط ہیں انسان کی تربیت، اس کی توانائیوں کو اصلاح یافتہ بنانے اور ثمر بخش راہ پر ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

۵۔ دعا کی قبولیت کی ایک شرط یہ ہے کہ دعا عمل اور کوشش کے ہمراہ ہو۔ امیر المومنینؑ کے کلمات قصار میں ہے:

الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر

عمل کے بغیر دعا کرنے والا بغیر کمان کے تیر چلانے والے کی مانند ہے[2]

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۴۴۸ و ص ۴۴۹

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۳۳۷

اس طرف توجہ رکھی جائے کہ چلہ کمان تیر کے لئے عامل حرکت اور ہدف کی طرف پھینکنے کا وسیلہ ہے تو اس سے تاثیرِ دُعا کے لئے عمل کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

مندرجہ بالا پانچوں شرائط یہ واضح کر دیتی ہیں۔ کہ نہ صرف یہ کہ طبیعی عمل واسباب کی بجائے دعا نہیں ہوتی بلکہ قبولیتِ دعا کے لئے دعا کرنے والے کی زندگی میں ایک مکمل تبدیلی بھی ضروری ہے۔ اس کی فکر کو نئے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے اور اسے اپنے گذشتہ اعمال میں تجدید نظر کرنا چاہیئے۔

ان سب کی روشنی میں کیا دعا کو اعصاب کمزور کرنے والی اور کاہلی کا سبب قرار دینا بے خبری نہیں اور کیا یہ بعض مخصوص مقاصد کو بروئے کار لانے کی دلیل نہیں۔

۱۸۷۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۱۸۷۔ تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو (دونوں ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی حفاظت کا باعث ہو) خدا کے علم میں تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے (اور اس ممنوع کام کو تم میں سے کچھ لوگ انجام دیتے تھے) پس خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں بخش دیا۔ اب اُن سے ہمبستری کرو اور تمہارے لئے جو کچھ مقرر کیا گیا ہے اسے طلب کرو اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو اور جب تم مساجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ یہ حدودِ الٰہی ہیں ان کے نزدیک نہ جانا خدا اس طرح اپنی آیات کو لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ پرہیز گار ہو جائیں۔

شانِ نزول

روایاتِ اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ جب شروع میں روزے کا حکم نازل ہوا تو مسلمان صرف یہ حق رکھتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے کھانا کھالیں چنانچہ اگر کوئی شخص کھانا کھائے بغیر سو جاتا اور پھر بیدار ہوتا اس کے لئے کھانا پینا حرام تھا۔

ان دنوں ماہِ رمضان کی راتوں میں بھی ان کے لئے اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا مطلقاً حرام تھا۔ اصحابِ پیغمبرؐ میں سے ایک شخص جس کا نام مطعم بن جبیر تھا ایک کمزور انسان تھا۔ ایک مرتبہ افطار کے وقت گھر گیا۔ اس کی بیوی اس کے افطار کے لئے کھانا لینے گئی تو تھکان کی وجہ سے وہ سو گیا۔ جب بیدار ہوا تو کہنے لگا اب افطار کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ وہ اسی حالت میں رات کو سو گیا۔ صبح کو روزے کی حالت میں اطراف مدینہ میں خندق کھودنے کے لئے (جنگ احزاب کے میدان میں) حاضر ہو گیا۔ کام کے دوران میں کمزوری اور بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ اس کے سرہانے تشریف لائے اور اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے۔

نیز بعض جوان مسلمان جو اپنے آپ پر ضبط نہیں کر سکتے تھے ماہِ رمضان کی راتوں کو اپنی بیویوں سے ہم بستری کر لیتے تھے۔

ان حالات میں یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ رات بھر کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور اپنی بیویوں سے ہم بستری بھی کر سکتے ہیں۔

تفسیر

حکم روزہ میں وسعت

جیسا کہ آپ شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں ابتدائے اسلام میں ماہِ رمضان کے دن اور رات دونوں میں مسلمانوں کے لئے اپنی بیویوں سے اختلاط کرنا مطلقاً ممنوع تھا اور اسی طرح رات کو ایک مرتبہ سو جانے کے بعد کھانا پینا بھی ناجائز تھا اور شاید یہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کو آزمایا جائے اور انہیں احکام روزہ قبول کرنے کے لئے مائل کیا جائے۔

زیرِ نظر آیت روزے اور اعتکاف کے سلسلے میں چار اسلامی احکام پر مشتمل ہے پہلے مسلمانوں کے لئے وسعت پیدا کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ماہِ رمضان کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی بیویوں سے جنسی میل جول حلال کر دیا گیا ہے (احل لکم لیلۃ الصیام الرفث[1] الی نساءکم)۔

اس کے بعد اس موضوع کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو (ھن لباس لکم و انتم لباس لھنّ)۔

---

[1] رفث (بروزن قبس) کا معنی ہے جنسی مسائل پر گفتگو کرنا۔ اسی مناسبت سے خود جنسیات کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہاں یہی مفہوم میں ہے۔

لباس ایک طرف تو انسانی بدن کی سردی گرمی اور خطرناک چیزوں کے اثرات سے حفاظت کرتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے عیوب چھپاتا ہے اور پھر یہ انسانی بدن کی زینت ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں استعمال ہونے والی تشبیہ ان سب نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میاں بیوی ایک طرف سے ایک دوسرے کو بگرویوں سے بچاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے راحت و آرام کا سبب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے لئے زیب و زینت بھی بنتا ہے۔

یہ تعبیر میاں بیوی کے انتہائی معنوی و روحانی ربط و قربت کو بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں ان کی برابری کو بھی پورے طور پر واضح کرتی ہے۔ وہ تعبیر جو مرد کیلئے ہے وہی بغیر کسی تبدیلی کے عورت کے لئے بھی ہے۔

اس کے بعد اس قانون الٰہی کی تبدیلی کی علت اور سبب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ خدا جانتا تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے ہو اور تم میں سے بعض ممنوع کام انجام دیتے تھے۔ خدا نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں بخش دیا (علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم)۔ ہاں اس بنا پر کہ تم کہیں زیادہ گناہ سے آلودہ نہ ہو جاؤ خدا نے اپنے لطف و رحمت سے تمہارے لئے اس پروگرام کو آسان بنا دیا ہے۔ اس کی مدت و حدود میں کمی کر دی ہے۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے وہ طلب کر سکتے ہو (فالٰئن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم)۔

یہ مسلم ہے کہ اس آیت میں امر کا صیغہ وجوب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اجازت ہے اور ممنوعیت جسے اصولیین کی اصطلاح میں امر عقیب حظر کہتے ہیں کے جواز کی دلیل ہے۔

وابتغوا ما کتب اللہ لکم اس طرف اشارہ ہے کہ اس کے بعد اس وسعت اور تخفیف حکم سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ قوانین آفرینش کے مطابق حفظ نظام اور بقائے نسل کی راہ ہے۔

اس کے بعد دوسرا حکم بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے تمہارے لئے نمایاں ہو جائے (وکلوا واشربوا حتٰی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر)۔ اس طرح اب مسلمان حق رکھتے ہیں کہ وہ تمام رات کھانے پینے کی چیزوں سے استفادہ کریں۔

تیسرے حکم کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اس کے بعد روزے کو رات تک مکمل کرو (ثم اتموا الصیام الی الیل)۔ یہ جملہ روزہ داروں کے لئے دن بھر کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے باز رہنے کی تاکید کے طور پر ہے نیز یہ جملہ روزے کے آغاز اور انجام کی خبر بھی دیتا ہے اور وہ یہ کہ روزہ طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور رات کے آنے پر ختم ہوتا ہے۔

آخر میں چوتھا اور آخری حکم بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: مساجد میں اعتکاف کے دوران میں اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت نہ کرو (ولا تباشروھن وانتم عٰکفون فی المسٰجد)۔ اس حکم کا بیان گذشتہ حکم میں استثناء سے مشابہ ہے کیونکہ اعتکاف میں جس کی مدت کم از کم تین دن ہے روزہ رکھا جاتا ہے اس عرصے میں عورتوں سے نہ دن کو مباشرت کی اجازت ہے نہ رات کو۔

آخر میں تمام احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ خدائی حدود ہیں ان کے نزدیک نہ جانا (تلك حدود الله فلا تقربوها) کیونکہ سرحد کے قریب جانا وسوسے پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات سبب بنتا ہے کہ انسان حدود سے تجاوز کرکے مبتلائے گناہ ہو جائے۔

ہاں ـــــ خدا تو اسی طرح لوگوں کے لئے اپنی آیات کو واضح کرتا ہے کہ شاید وہ پرہیزگار ہو جائیں (کذلك یبین الله ایٰته للناس لعلهم یتقون)۔

چند اہم نکات

(۱) حدود الٰہی: جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں ہم نے پڑھا ہے روزے اور اعتکاف کے کچھ احکام بیان کرنے کے بعد انہیں خدائی سرحدیں قرار دیا گیا ہے۔ حلال و حرام کے درمیان سرحد، جائز و ممنوع کے درمیان سرحد۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ سرحدوں کو عبور نہ کرنا بلکہ کہا گیا ہے ان کے قریب نہ جانا کیونکہ سرحد کے قریب ہونے سے کبھی شہوت کی زیادتی کے باعث اور کبھی شک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انسان ان سے آگے گزر جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے "فلا تقربوها" اور شاید اسی بناء پر قوانین اسلامی میں ایسی جگہوں میں قدم رکھنے سے منع کیا گیا ہے جو انسان کی لغزش اور گناہ کا موجب اور سبب ہیں مثلاً مجالس گناہ میں شرکت حرام ہے چاہے خود انسان ظاہراً آلودۂ گناہ نہ ہو۔ اسی طرح اجنبی عورت سے خلوت کو حرام قرار دیا گیا ہے (کسی اجنبی خاتون کے ساتھ ایسی تنہائی جو مکمل طور پر علیحدہ ہو اور جہاں دوسرے لوگ آ جا نہ سکتے ہوں)۔

یہی مفہوم دوسری احادیث میں حمایت حمی (ممنوعہ علاقے کی چاردیواری کی حفاظت) کے عنوان سے بیان ہوا ہے پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

ان حمی الله محارمه فمن وقع حول الحمی یوشك ان یقع فیه

محرمات الٰہی اس کی چاردیواریاں ہیں اگر کوئی شخص ان حدود خانہ کے گرد اپنی بھیڑ بکریاں لے جاتے تو اس کا ڈر ہے کہ وہ ممنوعہ علاقے میں چلی جائیں[1]

اسی لئے اصولِ تقویٰ کے پابند اور پرہیزگار لوگ نہ صرف یہ کہ محرمات کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ حرام کے نزدیک بھی قدم نہیں رکھتے۔

(۲) اعتکاف: اعتکاف کا اصل معنی ہے محبوس ہونا اور کسی چیز کے پاس لمبی مدت تک رہنا شریعت کی اصطلاح میں مساجد میں عبادت کے لئے ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں جس کی کم از کم مدت تین دن ہے اور اس کی شرط روزہ دار ہونا اور بعض لذائذ کو ترک کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ عبادت روح کی پاکیزگی اور پروردگار کی طرف خصوصی توجہ کے لئے گہرا اثر رکھتی ہے۔ اس کے آداب و شرائط فقہی کتب میں مذکور ہیں۔ یہ عبادت ذاتی طور پر تو مستحب ہے لیکن چند ایک استثنائی مواقع پر وجوب کی شرط اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال زیر بحث آیت میں اس کی صرف ایک شرط کی طرف اشارہ ہوا ہے یعنی عورتوں سے مجامعت نہ کرنا۔

(دن اور رات دونوں میں منع) اور وہ بھی اس لئے کہ اعتکاف کا تعلق بھی روزے کے مسائل سے ہے۔

(iii) **طلوع فجر:** فجر کا اصل معنی ہے شگاف کرنا۔ طلوع صبح کو فجر اس لئے کہتے ہیں کہ گویا رات کا سیاہ پردہ پہلی صبح کی سفیدی سے چاک ہو جاتا ہے۔

زیر بحث آیات میں علاوہ ازیں "حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

> عدی بن حاتم نے پیغمبر اکرم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے سیاہ اور سفید دھاگے رکھے ہوئے تھے اور انہیں دیکھتا تھا تاکہ پہچان کرنے کے اول وقت کا اندازہ کر سکوں۔ پیغمبر اکرم اس گفتگو سے اتنے ہنسے کہ آپ کے دندان مبارک دکھائی دیئے۔
>
> آپ نے فرمایا: فرزند حاتم! اس سے مراد ہے صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے جو کہ وجوب روزہ کی ابتدا ہے [1]

ضمناً توجہ کرنی چاہیئے کہ اس تعبیر سے ایک اور نکتہ بھی واضح ہوتا ہے اور وہ ہے صبح صادق کو صبح کاذب سے پہچاننا۔ رات کے آخری حصے میں پہلے ایک بہت کم رنگ کی سفیدی آسمان پر عمودی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ جسے لومڑی کی دُم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اسی کو صبح کاذب کہتے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک صاف و شفاف سفیدی افق کے طور پر اور وہ بھی طول افق میں ظاہر ہوتی ہے جو سفید دھاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہی صبح صادق ہے جو روزے کے وقت کا آغاز اور ابتدائے نمازِ صبح کا وقت ہے۔

(iv) **ابتداء و انتہا تقویٰ ہی تقویٰ ہے:** یہ بات قابل توجہ ہے کہ احکام روزہ سے مربوط پہلی آیت میں بھی ہم نے اس کا آخری مقصد تقویٰ پڑھا ہے اور بعینہ یہی بات آخری آیت کے آخر میں بھی آئی ہے (لعلھم یتقون)۔

---

[1] مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ سالا پروگرام روح تقوی کی پرورش، اپنے آپ کو گناہ سے بچانے اور ملکۂ پرہیزگاری پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی میں شرعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس اجاگر کیا جائے۔

اختتامیہ

پروردگارا! ہم تیری بارگاہ میں سپاس گزاری اور نیازمندانہ شکر پیش کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں اس تفسیر کی جلد اول پر تجدید نظر کی توفیق بخشی تاکہ ہم اس کے نقائص کو امکانی حد تک دور کر سکیں۔ شاید ہم تیری اس عظیم آسمانی کتاب کو جتنا ہو سکے اپنے مسلمان بہن بھائیوں تک پہنچا سکیں۔

خداوندا! تیرا شکر ہے کہ تو نے اپنی حمایت ہمارے شامل حال کی کہ ہم نے تیرے عظیم اور بہت ہی قدر و منزلت والے ارشادات کی تفسیر کے لئے قدم اٹھایا۔

بارالٰہا! ہم سے یہ اعزاز و افتخار نہ چھین لینا تاکہ ہم ممکنہ حد تک اس کتاب کے باقی حصے کی تکمیل کر سکیں۔

خداوندا! تو نے اپنے مخصوص بندوں کے دل اس کتاب کی طرف مائل کر دیئے ہیں اور انہوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا ہے اور شاید ہمارے لئے وہ راتوں کی تاریکی میں یا دنوں میں دعائے خیر کرتے ہیں ——— ہم ان کے لئے تیرے سپاس گزار ہیں اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔

۱۴ مرداد ۱۳۶۱ ہجری شمسی

بمطابق

۱۵ شوال ۱۴۰۲ ہجری قمری

اختتام ——— جلد اول ——— تفسیر نمونہ

جلد اول تفسیر نمونہ کا ترجمہ صبح کے ساڑھے پانچ بجے بروز جمعرات، ۲۲ شوال ۱۴۰۲ ہجری بمطابق ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء قم مدرسہ محلہ عربستان میں اس حقیر پر تقصیر ——— سید صفدر حسین نجفی ولد سید غلام سرور نقوی کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا۔

والحمد للہ اولاً و آخراً و لہ الشکر والصلوٰۃ والسلام علی محمد و آلہ الطاہرین

۱۸۸۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ
اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۸۸۔ ایک دوسرے کے اموال آپس میں باطل (و ناحق) طریقے سے نہ کھاؤ اور گناہ کے ذریعے لوگوں کے مال کا ایک حصّہ کھانے کے لیے اس میں سے (کچھ مال) قاضیوں کو نہ دو جب کہ تم جانتے ہو۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بہت ناپسندیدہ عمل سے روکا گیا ہے۔ ان سے ارشاد ہوتا ہے: ایک دوسرے کے مال و دولت میں ناحق تصرف نہ کرو اور غیر صحیح طریقے سے مال پر قبضہ نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے مال میں تصرف کرنے اور اسے ناحق کھانے سے انہیں قاضیوں کے روبرو جانا پڑے اور پھر انہیں بھی ہدیہ رشوت کے طور پر کچھ پیش کرنے لگیں تاکہ لوگوں کا مال ظلم سے اپنی ملکیت بنا سکیں اس کام میں وہ دو بڑی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوتے ہیں

دوسروں کا حق کھانا اور رشوت دینا۔ رشوت کا مسئلہ اسلام کی نظر میں اتنا اہم ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

وامّا الرشا في الحكم فهو الكفر بالله العظيم۔

باقی رہا فیصلہ کرنے میں رشوت لینا۔ تو یہ خدائے عظیم سے کفر ہے۔ [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

لعن الله الراشي والمرتشي والماشي بينهما۔

خدا اپنی رحمت سے دور رکھے رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے کو

سورہ نساء کی آیت ۲۹ میں بھی ایسا ہی مفہوم بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "جائز اور صحیح راہ تجارت کے بغیر جو کچھ تم اپنے قبضے میں لیتے ہو اس میں تصرف نہ کرو"۔

زیر نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ اگر کچھ لوگ رشوت کے ذریعے عدالت میں کامیاب ہو جائیں تو نزاعی مال ان پر حرام ہوگا اور ظاہری طور پر کسی کے حق میں عدالت کے حکم سے وہ مال کا حقیقی مالک نہیں بن سکتا۔ صراحت سے رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ظاہری طریقے سے تمہارے درمیان فیصلہ کروں) ہو سکتا ہے بعض لوگ دلیل قائم کرنے میں زیادہ قابل ہوں اور میں ظاہری دلیل کی وجہ سے ان کے حق میں

---

[۱] وسائل، ج ۱۲، باب ۵، من ابواب ما یکتسب به۔

فیصلہ کردوں لیکن یہ جان لو کہ اگر میں کسی کے حق کا دوسرے کے لیے فیصلہ کر بھی دوں پھر بھی وہ جہنم کا ایک ٹکڑا اگر اُسے حاصل کرنے والا لگ جاتا ہے تو اُس میں تصرف کرے ورنہ اُسے چھوڑ دے ۔ ؎

رشوت خوری ـ ایک مصیبت

ایک عظیم مصیبت جو زمانۂ قدیم سے نوعِ انسانی کو دامن گیر ہے اور جو آج کل تو بڑی شدت سے رائج اور جاری وساری ہے، وُہ رشوت ہے ۔ عدالتِ اجتماعی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے اور آج بھی ہے ۔ اسی کے سبب وہ قوانین جو کمزوروں کے تحفظ کے ضامن تھے ۔ طاقتوروں کے ان مظالم کے حق میں استعمال ہوتے ہیں قانون جنہیں محدود کرنا چاہتا تھا کیونکہ طاقتور اور قوی لوگ تو ہمیشہ اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے منافع کی حفاظت کر سکتے ہیں یہ تو ضعیف اور کمزور لوگ ہی ہیں جن کے منافع اور حقوق کی حفاظت قانون کو کرنا ہے ۔ واضح ہے کہ اگر رشوت کا دروازہ کھلا رہے تو قوانین کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا کیونکہ قوی لوگ تو رشوت دینے کی قدرت رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں قوانین کمزور لوگوں کے حقوق پر ظلم و ستم اور تجاوز جاری رکھنے کے لیے ایک کھیل بن کر رہ جائیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں رشوت نفوذ کرے گی وہاں زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا اور ظلم و فساد ، ناانصافی اور تبعیض کا دور دورہ ہوگا اور قانون عدالت بلکہ نام باقی رہ جائے گا ۔ اسی لیے اسلام نے رشوت خوری کو پوری شدت کے ساتھ قباحت قرار دیا ہے ۔ اس کی مذمت کی ہے اور اُسے گناہانِ کبیرہ میں سے قرار دیا ہے ۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رشوت جیسی برائی اور قباحت دوسرے پُرفریب ناموں سے انجام پاتی ہے ۔ رشوت خوار اور رشوت دینے والا اس کے لیے ہدیہ ، حق و حساب ، حقِ زحمت اور انعام جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن واضح ہے کہ ناموں کی یہ تبدیلی کسی طرح بھی اس کی ماہیت اور حقیقت کو نہیں بدل سکتی ۔ ہر صورت میں جو بھی پیسہ اس طریقے سے وصول ہوگا وہ حرام اور ناجائز ہے ۔

نہج البلاغہ میں اشعث بن قیس کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے ۔ ایک مرتبہ وہ حضرت علیؑ کے محکمہ عدل میں اپنے مدمقابل پر کامیابی کے لیے رشوت لے کر آیا ۔ جو یوں کہ رات کے وقت ایک لذیذ حلوے سے بھرا ہوا برتن لے کر حضرت علیؑ کے دروازے پر آیا ۔ وہ اُسے ہدیہ قرار دے رہا تھا ۔ حضرت علیؑ نے غصے سے فرمایا :

"هبلتك الهبول اعن دين الله اتيتني لتخدعني .... والله لو اعطيت الاقاليم السبعة بما تحت افلاكها على ان اعصى الله في نملة اسلبها جلب شعيرة ما فعلته وان دنياكم عندي لاهون من ورقة في فم جرادة تقضمها مالعلي ولنعيم يفنى ولذة لا تبقى"

سوگوار تجھ پر روئیں ۔ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ مجھے فریب دے اور مجھے دینِ حق سے باز رکھے ۔ خدا کی قسم اگر سات اقلیم ان سب چیزوں کے سمیت جو ان کے آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں صرف اس کے

؎ فی ظلال ، ج ۱ ، ص ۲۵۲ ۔

ہے کہ کسی چیونٹی کے منہ سے جَو کا ایک چھلکا ظلم سے چھین لوں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا ۔ تمہاری یہ دُنیا میرے نزدیک ٹڈی کے منہ میں چبائے ہوئے پتے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے ۔ علی کو فنا ہونے والی نعمتوں اور جلد گزر جانے والی لذتوں سے کیا کام ۔

اسلام رشوت کی ہر شکل و صورت کو مذموم سمجھتا ہے ۔ پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ حیات کا ایک واقعہ ہے کہ آپؐ کو ایک مرتبہ خبر ملی کہ آپؐ کی طرف سے معین ایک حاکم نے ہدیہ کے نام پر رشوت قبول کر لی ہے ۔ آنحضرتؐ غضبناک ہوئے اور اس سے فرمایا ۔

"کیف تاخذ مالیس لک بحق ؟"

"تو وہ چیز کیوں لیتا ہے جو تیرا حق نہیں ہے ؟ ....

اُس نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے کہا :

"لقد کانت ھدیۃ یا رسول اللہ ؟"

"اے رسول خدا ! میں نے جو کچھ لیا وہ تو ہدیہ تھا "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"ارأیت لو قعد احدکم فی دارہ ولم نولہ عملا اکان الناس یھدونہ شیئا ؟"

"اگر تم گھروں میں بیٹھے رہو اور میری طرف سے کسی جگہ پر عامل و حاکم نہ بنو تو کیا پھر بھی لوگ تمہیں ہدیہ دیتے ہیں ؟"

اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا اور اس سے وہ ہدیہ لے کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور اُسے آپؐ نے معزول کر دیا [1]

اسلام نے تو یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ قاضی کہیں مخفی رشوتوں میں مبتلا نہ ہو جائے ۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ قاضی خود بازار میں نہ جائے

۱۸۹۔ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

ترجمہ

۱۸۹ — لوگ آپ سے مہینے میں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں ۔ کہیے کہ یہ تقسیم اوقات (اور طبیعی

[1] الامام علیؑ ، جلد ۱ ، ص ۱۵۵ ، ۱۵۶

تقویم) کا مظہر ہیں نیز یہ لوگوں (کے نظام زندگی) کے لیے اور حج کے وقت (کے تعین) کے لیے ہیں (اور جیسے زمانہ جاہلیت میں مروج تھا کہ حج کے موقع پر جب لوگ احرام باندھ لیتے تو پھر گھر کے دروازے سے اندر نہیں آتے تھے بلکہ عقب سے داخل ہوتے تھے) یہ نیک کام نہیں کہ عقب مکان سے اندر آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

شانِ نزول

منقول ہے کہ:

معاذ بن جبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سے بار بار یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ چاند کیسا ہے اور یہ تدریجاً بدر کامل کی صورت کیوں اختیار کرتا ہے اور پھر دوبارہ پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے؟

منقول ہے کہ:

"یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یہ چاند کس لیے ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔"

ان سوالات کے جواب میں محلِ نظر آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ چاند کی مختلف صورتیں انسانی نظام زندگی کیلئے بہت سے فوائد کی حامل ہیں۔

تفسیر

جیسا کہ اس آیت کی شانِ نزول میں آیا ہے کہ کچھ لوگ پیغمبر اسلامؐ سے چاند کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں خداوند عالم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ چاند کے آثار و فوائد بیان کریں۔ انہیں بتائیں کہ مہینوں کی ابتداء طلوع ہلال کی صورت میں اور پھر تدریجاً اس کی تبدیلی عبادت اور دینی فرائض کی انجام دہی نیز مادی نظام زندگی کے لیے بہت کار آمد ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ لوگ آسانی سے اپنے تجارتی امور اور دیگر پروگراموں کو ترتیب دے سکیں نیز وعدوں اور عہد و پیمان کے لیے وقت کا تعین کر سکیں۔ اس طرح روزہ رکھنے اور حج جیسی عظیم عبادت کی انجام دہی کے لیے مخصوص وقت ہے جس کے تعین کے لیے بہترین راستہ چاند ہی کی وضع و کیفیت ہے۔ چاند دیکھ کر لوگ ہمیشہ ابتداء، وسط اور آخرِ ماہ کی تشخیص کرسکتے ہیں اور اپنے امور کو اس کے مطابق ترتیب دے سکتے ہیں۔

حقیقت میں چاند ایک "طبیعی تقویم" ہے جو تمام افراد بشر کے لیے عام ہے۔ اس سے تمام لوگ چاہے وہ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ اور دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس سے نقطہ آغاز، وسط اور آخر ماہ ہی کو نہیں پہچانا جا سکتا بلکہ غور و خوض سے مہینے کے ہر دن کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔ واضح ہے کہ تقویم اور جنتری یعنی لوگوں کے لیے

تاریخ کے تعین کا دقیق ذریعہ نہ ہو تو اجتماعی زندگی کا نظام نہیں چل سکتا۔ اسی بنا پر خدائے بزرگ و برتر نے نظامِ زندگی کی بقاء کے لیے یہ عالمی تقویم عنایت فرمائی ہے۔

طبیعی اور فطری میزان اور پیمانے

قوانینِ اسلام کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ انہیں عموماً طبیعی اور فطری میزان کے مطابق قرار دیا گیا ہے کیونکہ طبیعی مقیاس ایک ایسا ذریعہ ہے جو سب لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور رفتارِ زمانہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتی جب کہ اس کے برعکس غیر طبیعی نظام اپنے مقیاس سب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہیں یہاں تک کہ دورِ حاضر میں بھی تمام لوگ مصنوعی مقیاسوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کبھی بالشت کو اور کبھی قدم کو، کبھی انگلی کی گرہوں کو اور کبھی انسان کے طول قامت کو پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح وقت کے تعین کے لیے غروبِ آفتاب، طلوعِ فجر، سورج کے نصف النہار سے گذر جانے اور چاند دیکھ لینے کو مختلف مواقع پر میزان قرار دیتا ہے۔

"لیس البر بان تأتوا البیوت من ظھورھا": یعنی گھر کی پشت سے گھر میں داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں حج کے متعلق گفتگو جاری ہے اور بتایا گیا ہے کہ حج کے اوقات کو چاند کے ذریعے معین کیا جا سکتا ہے۔ اب خداوندِ عالم نے حج کے موقع پر زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس سے منع فرمایا ہے۔ وہ لوگ جب احرام باندھ لیتے تو عام راستے اور گھر کی ڈیوڑھی سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ احرام باندھے ہوئے شخص کو گھر کے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر وہ گھر کی پچھلی طرف نقب لگاتے اور احرام کی حالت میں صرف وہیں سے داخل ہوتے۔ وہ اس عمل کو کارِ نیک سمجھ کر انجام دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل ایک طرح سے ایک عادت ترک کرنے کا اظہار تھا۔ احرام چونکہ عادات ترک کرنے کا نام ہے لہٰذا وہ خیال کرتے تھے کہ اس کی تکمیل اس عادت کے ترک کرنے سے ہونا چاہیئے۔[1]

لیکن قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ نیکی تقویٰ میں ہے نہ کہ ایسی بیہودہ عادات و رسوم میں اور پھر بلا فاصلہ حکم دیتا ہے کہ گھروں میں عمومی راستے ہی سے داخل ہوا کرو۔

البتہ آیت کا ایک وسیع تر اور زیادہ عام معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی بھی کام کے لیے ابتداء کی جائے چاہے وہ مذہبی اعمال میں سے ہو یا ان کے علاوہ چاہیئے کہ اس کے صحیح راستے سے اس میں داخل ہوا جائے نہ کہ انحرافی، الٹے اور غیر عادی طریقوں سے۔ یہی مفہوم جابر نے امام باقرؑ کے ارشاد سے نقل کیا ہے۔[2]

تفاسیر اہل بیتؑ میں اس آیت کے بارے میں ہے:

ہم ابواب خداوندی اور اس تک پہنچنے کا راستہ اور جنتِ الٰہی کی طرف بلانے والے ہیں۔[3]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے تمام مذہبی امور میں اس کے اصلی راستے سے داخل ہونا چاہیئے اور نظامِ حیات اہلِ بیتؑ ہی سے

---

[1] تفسیر بیضاوی۔ [2] مجمع البیان۔ [3] مجمع البیان۔

حاصل کرنا چاہیئے کیونکہ وحی انہی کے گھر میں اُتری ہے اور وہ مکتب وحی الٰہی کے تربیت یافتہ ہیں۔

"لیس البر بأن ......" یہ جملہ ہو سکتا ہے ایک اور لطیف نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو وہ یہ کہ معارف دینی کے متعلق سوال کرنے کی بجائے مہینے کے چاند کے بارے میں تمہارا سوال کرنا ایسے ہے گویا کوئی شخص گھر کے اصل دروازے کو چھوڑ کر اس کی پشت پر نقب زنی کر کے اس میں داخل ہو جو کتنا برا کام ہے۔

۱۹۰۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○

ترجمہ

۱۹۰۔ اور راہِ خدا میں تم اُن لوگوں سے قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ واقعہ یوں ہے کہ رسول خدا اپنے ...ہم اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے تیار ہوئے۔ جب سرزمین حدیبیہ پر (جو مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو مشرکین نے انہیں مکہ میں داخل ہونے اور مناسک عمرہ بجا لانے سے روکا۔ طویل سلسلۂ گفتگو کے بعد انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے صلح کر لی اور طے یہ پایا کہ رسول اللہؐ اگلے برس عمرہ ادا کرنے آئیں اور وہ ان کے لیے تین دن تک مکہ خالی کر دیں گے تاکہ آپؐ خانہ کعبہ کا طواف کر سکیں اگلے سال جب آپؐ مکہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہوئے تو ڈر تھا کہ شاید مشرکین وعدہ وفا نہ کریں اور رکاوٹ پیدا کریں۔ یوں جنگ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ اور آپ ماہ حرام میں جنگ کرنے پر خوش نہ تھے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ اگر دشمن جنگ شروع کر دے تو تم بھی اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن نے ان لوگوں سے قتال کا حکم صادر فرمایا ہے جو آغاز جنگ کریں اور مسلمانوں کے سامنے تلوار نکال لیں۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ دشمن کو خاموش کرنے کے لیے ہتھیار پر ہاتھ رکھا جائے اور ہر قسم کے دفاعی ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور حقیقت میں اب مسلمانوں کے صبر و تحمل کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اور اب وہ طاقت اور جانبازی سے اپنے حقوق کا دفاع کر سکتے ہیں

جنگ کیوں اور کس سے؟

اس آیت میں تین بنیادی نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ کے موقع کی اسلامی منطق کو مکمل طور پر واضح کرتے ہیں:

۱۔ جملہ "وقاتلوا فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ میں جنگ کرو) اسلامی جنگوں کے اصلی مقصد اور ہدف کو واضح کرتا ہے۔ انتقام، جاہ طلبی، حصول اقتدار، کشور کشائی، مال غنیمت اور دوسروں کی زمینوں پر قبضہ ان سب مقاصد کے لیے جنگ کرنا اسلام کی نگاہ میں مذموم ہے۔ صرف راہ خدا میں اور قوانین الٰہی کے پھیلانے کے لیے جہاد کرنا صحیح ہے یعنی حق، عدالت اور توحید کے لیے اور ظلم، فساد، انحراف اور کجروی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جہاد درست ہے۔

۲۔ جملہ "الذین یقاتلونکم" (اُن سے لڑو جو تم سے جنگ کریں) صراحت کرتا ہے کہ کن لوگوں سے جنگ کی جائے جب تک مدمقابل ہتھیار نہ اٹھائے اور جنگ کے لیے کھڑا نہ ہو جائے مسلمانوں کو پیش قدمی نہیں کرنا چاہیئے (سوائے چند استثنائی مواقع پر جن کے بارے میں دیگر آیات جہاد میں اشارہ کیا جائے گا)۔

اس آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کے علاوہ دیگر اشخاص (خصوصاً عورتوں اور بچوں) پر حملہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ جنگ کے لیے نہیں اٹھے لہٰذا انہیں محفوظ و مامون رہنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشوا حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام اپنی فوج کو یہ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"لا تقاتلوھم حتی یبدؤکم فانکم بحمد اللہ علی حجۃ وترککم ایاھم حجۃ اخری لکم"۔[1]

جب تک وہ حملہ نہ کریں تم جنگ کی ابتداء نہ کرنا کیونکہ تم حق کے پیروکار ہو اور ان کے خلاف تمہارے پاس حجت و دلیل موجود ہے۔ نیز جنگ کی ابتداء نہ کرنا تمہاری حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

۳۔ جملہ "ولا تعتدوا" (حد سے تجاوز نہ کرو) سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ کب تک جنگ کی جائے۔ اسلام میں جنگ خدا کے لیے اور اس کی راہ میں ہوتی ہے اور راہ خدا میں کسی قسم کی تعدی اور تجاوز نہیں ہونا چاہیئے اسی لئے دور حاضر کی جنگوں کے برعکس اسلام جنگی امور کے بارے میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی بہت تلقین کرتا ہے۔ مثلاً جو لوگ ہتھیار زمین پر رکھ دیں یا جو جنگ کرنے کی قوت کھو بیٹھیں یا جو اصولی طور پر جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جیسے بوڑھے، عورتیں اور بچے ان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیئے باغوں اور درختوں کو تباہ و برباد نہیں کرنا چاہیئے اور دشمن کے پینے کے پانیوں کو زہر آلود کرنے کے لیے زہریلا مواد استعمال نہیں کرنا چاہیئے (یعنی کیمیاوی ہتھیاروں اور جراثیم ہتھکنڈوں کے استعمال کی اجازت نہیں ہے)۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"فاذا کانت الھزیمۃ باذن اللہ فلا تقتلوا مدبراً ولا تصیبوا معوراً ولا تجھزوا علی جریح ولا تھیجوا النساء باذی وان شتمن اعراضکم وسببن امرائکم"۔[2]

جب خدا کی مدد سے دشمن کے لشکر کو شکست دے دو تو جو لوگ بھاگ کھڑے ہوں انہیں قتل نہ کرو اور زخمیوں کو نہ مارو۔ عورتوں کو اذیت و تکلیف نہ پہنچاؤ اگرچہ وہ تمہیں برا بھلا کہیں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں بکیں۔

اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے جہاد ہائے اسلامی کے بارے میں دشمنانِ اسلام کے بے بنیاد بے شمار اتہامات اور بہتانوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ مقاصد جنگ، جن سے جنگ کرنا ہے اور جہاد کے مختلف

---

[1] نہج البلاغۃ، عبدہ، مطبوعہ بیروت، ص ۴۵۳ [2] نہج البلاغۃ، عبدہ، ص ۴۵۳ مطبوعہ بیروت۔

کوائف و حالات کے بارے میں وضاحت کردی ہے۔ اس سے مخالفین کے اعتراضات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ دیگر آیات جہاد میں انشاء اللہ مزید تشریح و توضیح آئے گی۔

۱۹۱۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○

۱۹۲۔ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

ترجمہ

۱۹۱۔ اور انہیں (بت پرستوں کو جو کسی جرم و تجاوز سے منہ نہیں موڑتے) جہاں پاؤ قتل کر دو اور جہاں (مکہ) سے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں نکال باہر کرو اور فتنہ (و بت پرستی) قتل سے بھی بد تر ہے اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کرو جب تک وہ وہاں پر تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں پس اگر وہ تم سے جنگ کریں تو انہیں قتل کرو۔ یہی ہے کافروں کی جزاء

۱۹۲۔ اور اگر وہ رک جائیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ میں خدا تعالیٰ نے ان کفار مکہ کے بارے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کیا، انہیں ہر قسم کی اذیت و آزار پہنچائی اور انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ہزاروں جتن کیے۔

زیر نظر پہلی آیت میں اس حکم کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ان دشمنوں کو جہاں بھی آمادۂ پیکار دیکھو قتل کر ڈالو اور جیسے انہوں نے اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو مکہ سے باہر نکالنے اور آوارہ منزل کرنے کے لیے اقدام کیے ہیں۔ ان سے وہی سلوک کرو اور انہیں مکہ سے باہر نکال دو۔

• والفتنة اشد من القتل :

"اور فتنہ قتل سے بد تر ہے"

لغت کے لحاظ سے "فتنہ" کا ایک وسیع معنیٰ ہے۔ اس کے مفہوم میں ہر قسم کا مکر و فریب، فساد، شرک، گناہ اور رسوائی شامل ہے۔ اس آیت میں اس سے مراد وہی شرک اور بت پرستی ہے جو بہت سے اجتماعی مفاسد

اختلاف، پراگندگی، گناہ و فساد اور خونریزی کا سرچشمہ ہے۔

اس مفہوم کی شاہد ایک اور آیت ہے:

"قاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله"

ان سے جنگ کرو تاکہ فتنہ جڑ سے ختم ہو جائے اور سب واحد و یگانہ پرست ہو جائیں

اس بنا پر الفتنة اشد من القتل والے جملے کا معنی یہ ہوگا کہ بت پرستی کا مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے مکہ میں مروج بہت سے انفرادی و اجتماعی فسادات قتل کرنے اور مار دینے سے بھی سخت تر ہے کیونکہ ان امور نے خدا کے امن والے حرم کو آلودہ کر رکھا ہے۔ اس لیے خونریزی کے خوف سے شرک و بت پرستی سے جنگ کرنے سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے اور جیسے بھی ہو سکے پہلے صلح جوئی سے اور پھر شدت عمل اور سختی سے بت پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے فتنہ و فساد کی ریشہ کنی ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ مسلمانوں کو مسجد الحرام کا احترام کرنا چاہیئے۔ اس جگہ کا احترام جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کے مطابق جائے امن قرار دیا ہے۔ جب تک وہاں خود دشمن ہتھیار نہ اٹھائے اس وقت تک ان سے جنگ کرنے اور قتل کرنے کی اجازت نہیں لیکن اگر وہ مسجد الحرام کا احترام نہ کریں تو پھر مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے مسجد الحرام کے اندر بھی جنگ کر سکیں۔ البتہ پیش دستی نہیں کر سکتے اور نہ وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ خدا نے جسے جائے امن قرار دیا ہے اس کا احترام پامال کریں۔

آیت کے آخر میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ کفار کی سزا ہے کہ اگر وہ کسی مقدس جگہ پر تجاوز روا رکھیں تو انہیں سخت اور منہ توڑ جواب دیا جائے تاکہ وہ حرم کے تقدس اور احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

"فان انتهوا فان الله غفور رحيم"

"اگر وہ رک جائیں تو خدا پردہ پوشی کرنے والا مہربان ہے"

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ کفر سے دستبردار ہونے اور بت پرستی اور شرک کے مذہب کو پس پشت ڈال دینے سے خدا ان کی توبہ قبول کرے گا اور وہ مسلمانوں کے بھائی ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان سزاؤں اور تاوان سے بھی صرف نظر کرے گا جو مجرموں کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۳- وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ○

ترجمہ

۱۹۳- اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (اور بت پرستی اور لوگوں سے سلب آزادی کی حالت) باقی نہ رہے اور دین خدا کے لیے مخصوص ہو جائے۔ پس اگر وہ (اپنی غلط روش سے) دستبردار ہو جائیں (تو ان سے مزاحمت

نہ کرو کیونکہ، تعدی اور تجاوز ظالموں کے علاوہ کسی کا شیوہ نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں اسلامی جہاد کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے مطابق جنگ کا ہدف وہ اغراض نہیں ہیں جو عموماً جنگجو لوگوں کی ہوتی ہیں۔ اسلامی جہاد نہ زمین پر فرماں روائی اور کشور کشائی کے لیے ہے اور نہ غنائم پر قبضہ کرنے کے لیے۔ اس کا مقصد اپنے مال کی فروخت کے لیے منڈیوں کا حصول ہے نہ خام مال پر قبضہ اور نہ ہی یہ جہاد ایک نسل کی دوسری نسل پر فوقیت قائم کرنے کے لیے ہے بلکہ اس کا مقصد ہے فقط پروردگار کی خوشنودی کا حصول، اجتماعی عدالت کا قیام، ان لوگوں کی حمایت جو مکر و فریب اور گمراہی کی زد میں ہیں، انسانی معاشرے سے شرک اور بت پرستی کی بساط الٹنا اور احکام الٰہی کا نفاذ۔ اس بناء پر جیسا کہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے میں فتنہ باقی نہ رہے اور توحید پرستی کا دین تمام انسانی معاشروں میں رواج پا جائے۔

آیت کے ذیل میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ لوٹ آنے اور کفر، فساد اور بت پرستی سے دست بردار ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان سے متعرض نہ ہوں اور گذشتہ واقعات کا انتقام لینے کے درپے نہ ہوں اور ماضی کو بھول جائیں کیونکہ تعرض اور تجاوز فقط ستمگر اور ظالم لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

اسلامی جہاد کو حقیقت میں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ابتدائی جہاد آزادی

خداوند عالم کے احکام اور پروگرام نوع انسان کی سعادت، آزادی، تکامل، خوش بختی اور آسائش و آرام کے لیے ہیں اور اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کا یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ان احکام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اب اگر کوئی شخص یا گروہ ان احکام کی تبلیغ کو اپنے پست منافع سے مزاحم سمجھتے ہوئے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے تو انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے صلح و آشتی سے اور اگر اس سے ممکن نہ ہو تو قوت و طاقت سے اپنی دعوت کی راہ سے یہ رکاوٹیں ہٹا دیں اور اپنے لیے تبلیغ کی آزادی حاصل کریں۔

دوسرے لفظوں میں تمام معاشروں میں لوگ یہ حق رکھتے ہیں کہ راہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کی آواز سنیں اور ان کی دعوت قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ اب اگر کچھ لوگ ان کا یہ جائز حق چھیننا چاہیں اور انہیں اجازت نہ دیں کہ وہ راہ حق کی طرف پکارنے والوں کی پکار گوش دل سے سن سکیں اور فکری و اجتماعی قید و بند سے آزاد ہوں تو پھر ان پروگراموں کے طرفداروں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ حصول آزادی کے لیے ہر ذریعہ استعمال کریں۔ یہیں سے اسلام اور دیگر آسمانی ادیان میں "ابتدائی جہاد" کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔
اس طرح اگر کچھ لوگ مومنین پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے پرانے مذہب کی طرف لوٹ جائیں تو یہ دباؤ دور کرنے کے لیے بھی ہر ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دفاعی جہاد

بعض اوقات کسی فرد یا گروہ پر جنگ ٹھونسی جاتی ہے اور اس پر تجاوز کیا جاتا ہے یا دشمن اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اچانک

حملہ کردیتا ہے ایسی صورت میں حملے کا نشانہ بننے والے فرد یا گروہ کو تمام آسمانی اور انسانی قوانین دفاع کا حق دیتے ہیں ۔ اُسے حق پہنچتا ہے کہ ایسے میں جو کچھ اُس سے اپنے وجود کی بقاء کے لیے بن پڑے کرے اور اپنی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے ۔ جہاد کی اِس قسم کو دفاعی جہاد کہتے ہیں ۔ احد ، احزاب ، موتہ ، تبوک ، حنین اور بعض دیگر اسلامی جنگیں جہاد کے اسی حصے کا جزو ہیں اور یہ سب جنگیں دفاعی پہلو کی حامل ہیں ۔

۳۔ شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد

اسلام لوگوں کو یہ آخری اور بلند ترین دین انتخاب کرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے باوجود وہ عقیدے کی آزادی کو بھی محترم شمار کرتا ہے ۔ اسی لیے آسمانی کتب کی حامل قوموں کو اسلام نے کافی مہلت اور رعایت دی ہے کہ وہ مطالعہ اور غور و فکر سے دین اسلام کو قبول کریں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تب بھی ان سے اسلام ایک ہم پیمان اقلیت والا معاملہ کرتا ہے اور مخصوص شرائط کے ساتھ جو پیچیدہ بھی نہیں ان سے صلح و آشتی سے باہمی زندگی گذارتا ہے ۔

لیکن ـــــ شرک اور بت پرستی کوئی دین اور آئین نہیں اور نہ ہی وہ قابل احترام ہے بلکہ وہ تو ایک قسم کی بے ہودگی ، کجروی اور حماقت ہے ۔ دراصل وہ ایک فکری اور اخلاقی بیماری ہے جس کی ہر قیمت پر ریشہ کنی ضروری ہے ۔ دوسروں کی فکر و نظر کی آزادی اور احترام کے الفاظ ان کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن کے فکر و عقیدہ کی کم از کم کوئی صحیح بنیاد تو ہو لیکن کجروی ، بے ہودگی ، گمراہی اور بیماری تو کوئی ایسی چیز نہیں جسے محترم سمجھا جائے ۔ اسی لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جیسے بھی ہو انسانی معاشرے سے بت پرستی کی ریشہ کنی کی جائے چاہے اس کے لیے جنگ مول لینا پڑے ۔ بت خانے اور بت پرستی کے آثار صلح و صفائی سے نہ مٹ سکیں تو قوت و طاقت کے بل بوتے پر انہیں ویران و منہدم کیا جانا چاہیئے ۔

مدینہ میں جہاد کا حکم کیوں دیا گیا

ہم جانتے ہیں کہ جہاد ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں پر واجب ہوا ۔ اِس سے پہلے واجب نہ تھا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک تو مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ مسلح قیام عملاً خودکشی کے مترادف تھا اور دوسری طرف مکہ میں دشمن بہت زیادہ طاقتور تھا لہٰذا مکہ کے اندر ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا ۔

جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو بہت سے لوگ آپؐ پر ایمان لے آئے اور آپؐ نے اپنی دعوت مدینہ کے اندر اور باہر ہر طرف پھیلائی ۔ اس طرح آپؐ ایک مختصر سی حکومت کے قیام اور دشمن کے مقابلے میں ضروری وسائل جمع کرنے کے قابل ہو گئے مدینہ چونکہ مکہ سے کافی دور تھا اس لیے یہ امور آسانی سے انجام پا گئے ۔ انقلاب اور آزادی پسند قوتیں دشمن سے مقابلے اور دفاع کے لیے تیار ہو گئیں ۔

فتنہ کا قرآنی مفہوم

لفظ فتنہ اور اس کے مشتقات قرآن میں مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں ۔ ان میں سے چند یہ ہیں :

۱ ۔ آزمائش و امتحان ـــــ جیسے یہ آیت ہے

"احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون" [1]

[1] عنکبوت آیۃ ۲

کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا کافی ہے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان اور آزمائش نہیں ہوگی؟ (عنکبوت ۰۰۲)

۲۔ فریب دہی ـــــ ارشاد الٰہی ہے:

"یا بنی اٰدم لا یفتننکم الشیطان ......"

اے اولادِ آدم شیطان تمہیں مکر و فریب نہ دے (اعراف: آیت ۲۷۔)

۳۔ بلاء اور عذاب ـــــ فرمان الٰہی ہے:

"واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة."

(انفال: آیت ۲۵۔)

اس عذاب سے ڈرو جو فقط ظالموں ہی کے لیے نہیں، بلکہ اُن کے لیے بھی ہے جنہوں نے خود تو ظلم نہیں کیا لیکن ظلم ہوتا رہا اور وہ چپ سادھے رہے۔

۴۔ شرک، بت پرستی اور مومنین کی راہ میں رکاوٹ بننا ـــــ ارشاد ہوتا ہے:

"وقاتلوهم حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله."

(انفال: آیت ۳۹۔)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ شرک اور بت پرستی باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ سے مخصوص ہو جائے

۵۔ گمراہ کرنا اور گمراہی ـــــ سورۂ مائدہ میں ہے:

"ومن یرد الله فتنته فلن تملك له من الله شیئا."

(مائدة: آیت)

اور جسے خدا گمراہ کردے اور اس سے توفیق سلب کرلے تو تم اس کے مقابلے میں کوئی قدرت نہیں رکھتے

بعید نہیں کہ ان تمام معانی کی ایک ہی بنیاد ہو (جیسے مشترک الفاظ کی یہی صورت ہوتی ہے) اور وہ بنیاد یہ ہے کہ فتنہ کا اصل لغوی معنی ہے کہ سونے اور چاندی کو آگ کے دباؤ کے نیچے رکھنا تاکہ خالص اور ناخالص حصہ جدا ہو جائے۔ اس لیے جہاں کہیں دباؤ اور سختی ہو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً امتحان کے مواقع پر شدت اور مشکل درپیش ہوتی ہے جو انسان کے امتحان کا باعث بنتی ہے۔ عذاب بھی شدت کی ایک قسم ہے۔ فریب سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کیونکہ مختلف ذرائع سے کسی کو دھوکا دیکر دباؤ ہی ڈالا جاتا ہے۔ یہی حال کفر اور مخلوق کی ہدایت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک قسم کا دباؤ اور شدت پائی جاتی ہے۔

۱۹۴۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۴۔ حرام مہینہ حرام مہینے کے مقابلے میں (اگر دشمن اس کا احترام نہ کریں اور تم سے لڑیں تو تم بھی مقابلہ بالمثل

کا حق رکھتے ہو اور تمام حرام امور (قابل) قصاص ہیں اور (بطور کلی) جو شخص بھی تم پر تجاوز کرے تو اس کی طرح تم بھی اس پر تعدی کر سکتے ہو اور خدا سے ڈرتے رہنا (اور زیادتی نہ کرنا) اور جان لو کہ خدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

مشرکین جانتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ سے سن بھی چکے تھے کہ حرمت والے مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں اسلام کے نقطۂ نظر سے جنگ کرنا ناجائز اور خصوصیت سے مسجد الحرام اور مکہ میں تو اور بھی زیادہ غیر درست ہے نیز پیغمبر اسلام اس حکم کا احترام کرتے ہیں اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ مسلمانوں پر انہی مہینوں میں غفلت کی حالت میں حملہ کردیں اور وہ خود ان محرم مہینوں کے احترام سے بے پرواہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مقابلہ کریں اور یوں ہی رہا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

زیر بحث آیت نے ان کی سازش سے پردہ اٹھا دیا اور کہا کہ حرام مہینوں میں جنگ کا جواب انہی مہینوں میں دیا جائیگا حرام مہینوں میں مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ درحقیقت ان مہینوں کا احترام لوٹانے کے لیے ہی ہے۔

"والحرمات قصاص ....." واقع میں ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو حرام مہینوں میں جنگ کی اجازت دینے پر پیغمبر اکرمؐ پر اعتراض کرتے تھے یعنی نگاہ اسلام میں ماہ حرام کا احترام ان لوگوں کے مقابلے میں ہے جو اسے محترم سمجھیں لیکن جو اس کے احترام کو پامال کریں ان سے رعایت ضروری نہیں اور ان سے اس ماہ میں بھی جنگ کرنا جائز ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت واضح ہو جانے تو مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تاکہ مشرکین دوبارہ حرام مہینوں کا احترام زائل کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

اس کے بعد ایک کلی اور عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقابلہ بمثل ہر مسلمان شخص کا فریضہ ہے۔ تمام لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ظالم کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور جس قدر ظلم و تجاوز ان پر کیا گیا ہے اتنا ہی اس کا جواب دیں۔

یہ کام فطرت و آفرینش کے قوانین کے مطابق ہے۔ یہاں تک کہ بدن کے خلیے حملہ کرنے والے جراثیموں کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور مملکت بدن پر ان کے تجاوز اور حملے کا دفاع کرتے ہیں۔ نباتات بھی اسی طبیعی اور تکوینی قانون سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ حوادث، طوفانوں اور مختلف حملہ آوروں کے مقابلے میں استقامت دکھاتے ہیں اور ان حملوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

مسیحیت کہتی ہے: اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو بایاں بھی اُس کے سامنے کر دو اور اسے دوسرے تھپڑ کے لیے تیار کرو۔

اس کے برعکس اسلام کہتا ہے: جس قدر تم پر ظلم و تعدی ہو اس کا جواب اس طرح دو اور تسلیم کا معنی موت اور مقابلے کا معنی زندگی ہے۔ یہ ہے اسلام کی منطق (البتہ یہ امر دوستوں کو معاف کرنے اور ان سے درگذر کرنے کے منافی نہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے)

"واتقوا اللّٰہ واعلموا ان اللّٰہ مع المتقین"۔ اس جملے میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ جواب اور دفاع تجاوز کی مقدار سے زیادہ نہ ہو کیونکہ جواب دینے میں زیادتی حریم تقویٰ و پرہیزگاری سے بعید ہے۔

۱۹۵- وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

ترجمہ

۱۹۵- اور راہِ خدا میں خرچ کرو (اور خرچ نہ کرکے) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور نیکی کرو کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر

جس طرح جہاد میں مخلص، طاقتور اور تجربہ کار مردوں کی ضرورت ہے اسی طرح مال و دولت کی بھی احتیاج ہے کیونکہ جہاد میں روحانی و جسمانی آمادگی کی ضرورت ہے اور فوج کے لیے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ کی بھی احتیاج ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پہلے درجے کا عامل سرنوشت اور انجام جنگ کا تعین مجاہدوں اور جانبازوں ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن مجاہد کو وسائل کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس راہ میں خرچ نہ کرنا گویا اپنے تئیں ہلاکت و تباہی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

خصوصاً اس زمانے میں تربیت سے مسلمان جذبے اور عشق جہاد سے سرشار تھے لیکن فقیر و محتاج تھے اور اسباب جنگ مہیا کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے جیسا کہ قرآن نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور آپ سے درخواست کرتے تھے کہ ہمارے لیے سامان جنگ مہیا فرمائیں اور ہمیں میدان جنگ میں بھیجیں چونکہ اسباب مہیا نہ تھے لہٰذا وہ افسردہ اور غمگین روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ آتے:

"تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا الا یجدوا ما ینفقون"

آنکھوں میں اشک رواں لیے ہوئے لوٹ جاتے اور غم زدہ ہوتے کہ ان کے پاس مال کیوں نہیں جس سے وہ اسباب جنگ مہیا کریں اور میدان جنگ میں حاضر ہوں۔ (توبہ - ۹۲)

خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔

یہ آیت اگرچہ آیاتِ جہاد کے ذیل میں آئی ہے لیکن اس سے ایک کلی و اجتماعی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خرچ کرنا افراد معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انفاق اور خرچ کرنے کے عمل کو فراموش کر دیا جائے اور دولت ایک ہی طبقے کے پاس جمع ہو جائے تو ایک محروم اور بے نوا اکثریت وجود میں آجائے گی۔ زیادہ دیر یہ حالت قائم نہیں رہ سکے گی اور جلد ایک دھماکا ہوگا جس کے نتیجے میں انسان اور سرمایہ داروں کا مال جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اس سے خرچ کرنے اور ہلاکت سے بچنے کا باہمی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر انفاق اور خرچ کرنا محروموں اور محتاجوں سے پہلے سرمایہ داروں کے لیے مفید ہے یعنی دولت و ثروت کا اعتدال دولت و ثروت کا محافظ ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"حصنوا اموالکم بالزکوٰة"

زکوٰة دے کر اپنے مال کی حفاظت کرو۔

"واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین": آیت کے آخر میں احسان اور نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح جہاد و انفاق کے مرحلے سے احسان و نیکی کے مرحلے کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں احسان انسانیت کے تکامل و ارتقاء کے بلند ترین مرحلے کا نام ہے۔

آیت انفاق میں اس جملے کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ انفاق میں نیکی کی مکمل تصویر اور مہربانی کا پورا اظہار ہونا چاہیئے اور ہر قسم کے احسان جتلانے اور جن امور سے اس شخص کو رنج پہنچے جس سے نیکی کی گئی ہے، بچنا چاہیئے۔

۱۹۶۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۚ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا
اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ
وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ
لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۶۔ حج و عمرہ کو خدا کے لیے مکمل کرو اور اگر محصور ہو جاؤ (اور ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جن کے باعث مکہ میں داخل نہ ہو سکو مثلاً دشمن کا خوف ہو یا کوئی بیماری لاحق ہو جائے) تو جو قربانی فراہم ہو اسے ذبح کرو (اور احرام سے خارج ہو جاؤ) اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے (اور قربان گاہ میں ذبح نہ ہو جائے) اور اگر کوئی بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف و اذیت ہو (اور مجبور ہو کر وہ اپنا سر نہ منڈوائے) تو اسے چاہیئے کہ روزہ، صدقہ یا گوسفند کی صورت میں فدیہ اور کفارہ دے۔ جب (بیماری یا دشمن سے) مامون ہو جائیں تو جو لوگ عمرہ

ختم کرنے کے ساتھ ہی حج کا آغاز کردیں تو جو قربانی انہیں میسر ہو اسے ذبح کریں اور جن کے پاس نہیں ہے تو وہ تین دن حج کے دنوں میں اور سات دن واپس آکر روزے رکھیں ۔ یہ پورے دس دن ہیں البتہ یہ ایسے شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد الحرام کے پاس نہ ہوں (جو اہل مکہ اور اطراف مکہ میں سے نہ ہو) اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ سخت عتاب کرنے والا ہے ۔

تفسیر

لفظ "حج" قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے ۔ ان میں سے ہر موقع پر اس اہم امر سے مربوط کسی نہ کسی حکم یا معاملے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ مثلاً

(۱) تاسیسِ توحید حضرت ابراہیم نے خانۂ خدا کی تعمیر کر چکے تو ایک عام اعلان کے ذریعے آپ نے ساری دنیا کے لوگوں کو اس مقدس مقام کی زیارت کی دعوت دی ۔

"واذن فی الناس بالحج یأتوک رجالا وعلیٰ کل ضامر یأتین من کل فج عمیق"

لوگوں کو اعلانِ حج کی عام دعوت دیجئے کہ پیادہ اور لاغر اونٹوں پر سوار ہو کر دور دراز سے لوگ تمہارے پاس آئیں گے (حج ۲۷)

(۲) اسلام میں حج کی تشریع سورۂ آل عمران کی آیت ۹۷ کی وساطت سے ہوئی ہے :

"وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا"

ہر وہ شخص جو اپنے پیدل یا سواری کی طرف جانے کی استطاعت اور توانائی رکھتا ہے اس پر اس کے گھر کا حج فرض ہے ۔

(۳) وہ مہینے جن میں یہ عمل انجام پاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے :

"الحج اشهر معلومات"

مراسم حج کی ادائیگی معین مہینوں میں ہونا چاہیئے ۔

(۴) حدود و شرائط اور وہ اعمال جو مراسم حج میں انجام دینا چاہئیں ۔ زیر بحث آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے ۔

"واتموا الحج والعمرة للہ ...."

(۵) فلسفۂ اجتماع اور اس کے فوائد ـــــ ارشاد ہوتا ہے ۔

"لیشهدوا منافع لهم"

تاکہ وہ اس میں موجود اپنے لیے فوائد حاصل کریں (حج ۲۸)

ان میں سے ہر ایک بحث اپنے مقام پر آئے گی ۔ زیر بحث آیت میں چند ایک احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہیں یہاں بیان کیا جاتا ہے

عمرہ اور حج کے اعمال

حاجیوں پر خانۂ خدا کی زیارت کے لیے پہلے مراسم عمرہ اس ترتیب سے بجا لاتے ہیں :

معین نقطہ جنہیں میقات کہتے ہیں سے احرام باندھتے ہیں یعنی وہ عہد کرتے ہیں کہ احرام باندھے ہوئے شخص پر جو کام حرام ہیں، انہیں ترک کر دیں گے اور احرام کا لباس جو وہ ان سلے کپڑے کے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے پہن لیتے ہیں اور لبیک لبیک کہتے ہوئے خانۂ خدا کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور اس کے بعد اس جگہ پر جو مقام ابراہیم کے نام سے مشہور ہے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد صفا و مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں اور پھر اپنے کچھ بال یا ناخن کاٹنے سے احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔

مراسم حج بجا لانے کے لیے مکہ میں احرام باندھتے ہیں۔ نویں ذی الحج کو مکہ سے چار فرسخ دور بیابان عرفات کی طرف جاتے ہیں۔ اس دن زوال سے لے کر غروب آفتاب تک وہاں رہتے ہیں۔ یہاں اپنے پروردگار سے دعا و زاری کرتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد مشعر الحرام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ یہ مقام مکہ سے ڈھائی فرسخ دور ہے۔ رات اس مقدس وادی میں بسر کرتے ہیں اور طلوع آفتاب کے وقت اس سرزمین سے منیٰ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ یہ مقام مشعر الحرام سے قریب ہی ہے۔ یہ عید قربان کا دن ہے اسی دن ایک خاص جگہ "جمرۂ عقبہ" پر سات کنکریاں مارتے ہیں۔ اس کے بعد قربانی کرتے ہیں اور پھر سر کے بال منڈوا کر احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی دن یا اس کے بعد مکہ کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ وہاں طواف خانہ خدا۔ نماز طواف۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی۔ طواف نساء اور نماز طواف نساء بجا لاتے ہیں۔ گیارہ اور بارہ کی درمیانی رات منیٰ میں گزارتے ہیں۔ اس طرح مراسم حج انجام دیتے ہیں۔ یہ حج دراصل ایک تاریخی واقعہ ہے نیز اس کے مراسم تہذیب نفس سے مربوط مسائل اور اجتماعی و معاشرتی فلسفوں کی طرف کنایات و اشارات ہیں، ان میں سے ہر فلسفہ متعلقہ آیات کے ذیل میں تفصیل سے بیان ہوگا۔

اب اس امر کی طرف توجہ دی جانا چاہیئے کہ آیت کہتی ہے کہ تمام اعمال خدا کے لیے اور اس کے فرمان کے مطابق ہونا چاہئیں اور انہیں ظاہرداری، ریاکاری اور بتوں کے لیے نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بناء پر آیت کا پہلا جملہ " واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ " یہ بتاتا ہے کہ حج و عمرہ کے اعمال میں تقرب الٰہی کے سوا کوئی وجہ اور سبب نہیں ہونا چاہیئے۔

" فان احصرتم فما استیسر من الھدی " مزید کہتا ہے کہ اگر احرام باندھے ہوئے ہو اور پھر کوئی رکاوٹ مثلاً بیماری یا دشمن کا خوف لاحق ہو جائے اور عمرہ و حج کے اعمال نہ بجا لا سکیں تو ضروری ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قربانی ذبح کرو۔

توجہ رہے کہ اگر یہ رکاوٹ بیماری وغیرہ کی طرح کی ہو اور عمرہ مفردہ کا احرام باندھ رکھا ہے تو قربانی کو مکہ میں بھیجنا چاہیئے تاکہ وہاں ذبح کی جائے اور اگر دشمن کی طرف سے ممانعت ہوئی ہے تو جہاں ہیں وہیں قربانی کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ جیسے پیغمبر اکرمؐ نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔ اگر حج کا احرام باندھ رکھا ہے اور بیماری کا سامنا ہو تو قربانی منیٰ میں بھیجنا چاہیئے۔

" ولا تحلقوا رءوسکم حتّٰی یبلغ الھدی محلہ .... " حج میں جن کاموں کو انجام دینا ہے ان میں سے ایک سر کے بالوں کا منڈوانا ہے لیکن توجہ رہے کہ قربان گاہ میں قربانی ذبح ہونے سے پہلے تم یہ عمل بجا لانے کا حق نہیں رکھتے۔

مگر جس شخص کو کوئی بیماری یا کچھ اور رکاوٹیں درپیش ہیں جن کی وجہ سے اسے وقت سے پہلے سر منڈوانا پڑے اور اس کام کے

حیثیت نہ رکھتی ہو اس صورت میں ضروری ہے کہ فدیہ دے اور یہ فدیہ تین دن کے روزے یا چھ مساکین کو کھانا کھلانا اور یا ایک بھیڑ ذبح کرنا ہو سکتا ہے۔

"فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرة الی الحج ......" جب بیماری یا دشمن سے آسودہ خاطر ہو جاؤ اور حج تمتع انجام دینا چاہو تو اپنی استطاعت کے مطابق اونٹ، گائے یا بھیڑ کی قربانی دو۔ قربانی کا جانور نہ مل سکے یا مالی حالت اس کی اجازت نہ دے تو تین دن حج کے ایام میں، ساتویں، آٹھویں اور نویں کا دن اور سات دن واپس جانے کے بعد کل دس دن روزے رکھو۔

"تلک عشرة کاملة" معلوم ہے کہ تین اور سات کل دس دن بنتے ہیں۔ پھر بھی قرآن کہتا ہے: یہ دس دن کامل ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حرف واو "اگرچہ عام طور پر جمع کرنے کے لیے آتا ہے" کو تخییر کے لیے تلک عشرة کاملة سے تاکید دیا گیا ہے اور شاید لفظ کاملہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہو کہ دس دن کے روزے بطور کامل قربانی کا قائم مقام بن سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ دس کا عدد ایک لحاظ سے کامل ترین عدد ہے کیونکہ اعداد جب ایک سے شمار کرتے ہیں تو وہ دس تک اپنی صعودی سیر کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تو حقیقت میں دس اور کسی دس سے پیچھے والے عدد کی ترکیب ہے۔ مثلاً گیارہ "دس اور ایک" اور بارہ "دس اور دو"۔ سلہ

"ذالک لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام" یہ حج تمتع کا پروگرام ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد الحرام میں موجود یا اس کے قریب و جوار میں نہ ہوں۔ (فقہاء میں مشہور یہ ہے کہ جو شخص مکہ سے ۴۸ میل دور رہتا ہے حج تمتع اسکی ذمہ داری ہے لیکن جو مکہ سے اتنا دور نہیں اس کا فریضہ حج قران یا حج افراد ہے) اس مسئلے کی تفاصیل اور مدارک فقہی کتب میں موجود ہیں۔

آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور اس سلسلے میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو اور پروردگار کے شدید عقاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔

یہ تاکید شاید اس لیے ہے کہ حج ایک اہم اسلامی عبادت ہے اور اگر اس کے مراسم و اعمال پر پوری توجہ نہ دی جائے یا اس کی روح کو فراموش کر دیا جائے تو مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

حج وہ عبادت ہے جسے امیر المومنینؑ نے اسلام کا پرچم اور اہم شعار قرار دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپؑ نے وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"الله الله فی بیت ربکم لا تخلوه ما بقیتم فانه ان ترک لم تناظروا":

تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں جب تک زندہ ہو خانہ خدا سے دستبردار نہ ہونا کیونکہ اگر اس کی زیارت متروک ہو گئی تو تمہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور تمہارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

دشمنانِ اسلام کی طرف سے یہ جملہ بھی مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں: جب تک حج کی رونق برقرار ہے ہم ان پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔[1]

ایک اور دانشور کہتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہے اگر وہ حج کا معنی اور حقیقت نہ سمجھ سکیں اور دوسروں پر بھی افسوس ہے اگر وہ اس کا معنی سمجھ لیں۔

اس بحث کے آخر میں جس نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حج تمتع (وہ حج جو پہلے عمرہ سے شروع ہوتا ہے اور اس میں عمرہ کے تمام اعمال بجالانے کے بعد احرام سے نکل جاتے ہیں پھر نئے سرے سے حج کا احرام باندھتے ہیں اور اس کے مراسم بجالاتے ہیں) شریعتِ اسلام میں زیرِ نظر آیت کے مطابق مشروع ہے اور اس آیت کی منسوخی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ نیز اس سلسلے میں شیعہ اور اہل سنت کتب میں بہت سی روایات منقول ہیں۔ ان میں سے اہل سنت کے مشہور محدثین مثلاً نسائی نے اپنے سنن میں، احمد نے اپنے مسند میں، ابن ماجہ نے اپنے سنن میں، بیہقی نے اپنے مشہور سنن میں، ترمذی نے اپنی صحیح میں اور مسلم نے بھی اپنی مشہور کتاب میں تاکیدی روایات نقل کی ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا اور قیامت کے لیے باقی ہے۔

جو مشہور روایت حضرت عمر سے اس حج کی اور نکاح موقت کی حرمت کے بارے میں نقل ہوئی ہے، واضح ہے کہ صریح قرآن کے مقابلے میں وہ کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ کوئی شخص کسی حکم کو منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسی بنا پر اہل سنت کے بہت سے علماء نے بھی مذکورہ روایت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

۱۹۷۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ○

ترجمہ

۱۹۷۔ حج معین مہینوں میں ہے اور جو لوگ (احرام اور مناسکِ حج شروع کر لینے سے) حج اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں (انہیں توجہ رکھنی چاہیئے کہ) حج میں عورتوں سے جنسی ملاپ، گناہ اور جدال نہیں ہے اور جو اچھے کام تم انجام دیتے ہو، خدا انہیں جانتا ہے۔ زادِ راہ اور توشہ مہیا کرو کیونکہ بہترین زاد و توشہ پرہیزگاری ہے اور اے صاحبانِ عقل مجھ سے ڈرو۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن یاد دلاتا ہے کہ حج کا عمل معین مہینوں میں انجام پانا چاہیئے اور اسے سال بھر انجام نہیں دیا جا سکتا اور جیسا کہ کتب حدیث، تفسیر اور فقہ میں ہے کہ یہ عظیم عبادت صرف شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں انجام دی جا سکتی ہے

[1] شبہات حول الاسلام

اور بعض اعمال تو صرف ذی الحجہ کی نویں، دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخوں ہی میں انجام دیئے جا سکتے ہیں اور باقی اعمال اس پوری مدت میں انجام پا سکتے ہیں۔

"فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ......"

اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ جو لوگ احرام اور اعمال حج میں مشغول ہو کر اپنے اوپر حج واجب کر چکے ہیں انہیں اعمال حج بجا لاتے ہوئے جنسی ملاپ اور کوئی گناہ انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہیئے اور یونہی بے کار گفتگو، بے فائدہ بحث مباحثہ اور بے مصرف کشمکش ترک کر دینی چاہیے کیونکہ یہ ماحول اور مقام عبادت، خلوص اور مادی لذات کے ترک کرنے کا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے کہ جس سے روح کو قوت لینا چاہیئے اور جہان مادہ سے اسے کا ملاً جدا ہو جانا چاہیئے اور عالم مادہ سے ماوراء راستہ پانا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ اتحاد، اتفاق اور برادری کے رشتے کو محکم کرنا چاہیئے۔

"وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ"

جیسا بھی نیک عمل تم سے سرزد ہو خدا اُسے جانتا ہے اور یہ پہلی جزا اور ثواب ہے جو نیک شخص کو ملتا ہے کیونکہ ایک صاحب ایمان کی یہی مسرت تو بہت ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ پروردگار اس عمل کو جانتا ہے جسے اس نے اس کی خاطر انجام دیا ہے اور یہ بجائے خود بہت ہی لذت بخش ہے۔

"وتزودوا فان خیر الزاد التقوی"

آیت کے اس حصے میں زادِ راہ مہیا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں یمن کے لوگوں میں سے ایک گروہ خانہ خدا کی زیارت کے لیے چل کھڑا ہوتا تھا وہ کوئی زادِ راہ ساتھ نہ لیتا تھا۔ ان لوگوں کی منطق یہ تھی کہ ہم خدا کے گھر کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہمیں کھانا نہ دے حالانکہ خدا نے سب کو غذا اور مادی وسائل دیئے ہیں لہٰذا آیت کے اس حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ توشۂ راہ مہیا کرو اور غذا اپنے ساتھ اُٹھا کر لے جاؤ۔

اس کے علاوہ ایک معنوی مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس توشۂ سفر کے علاوہ ایک اور زادِ راہ کی بھی بہت ضرورت ہے جسے مہیا کرنا ہے اور وہ ہے پرہیزگاری اور تقویٰ۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ سفر حج میں معنوی زادِ راہ مہیا کرنے کے بہت مواقع ہیں جن سے غفلت نہیں برتنا چاہیئے وہاں اسلام کی عظیم تاریخ اور ابراہیم جیسے توحید کے علمبردار کی فداکاری کے مناظر اور پروردگار کے مخصوص جلوے یوں نظر آتے ہیں کہ کہیں اور اس طرح سے دکھائی نہیں دیتے۔ جن کی روح بیدار اور فکر زندہ ہے وہ ایک عمر کے لیے اس بے نظیر روحانی سفر سے معنوی اور روحانی توشہ فراہم کر سکتے ہیں۔

"واتقون یا اولی الالباب"

آیت کے اس حصے میں روئے سخن اہل فکر و نظر کی طرف ہے کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں کیونکہ یہی لوگ ان اعلیٰ تربیتی پروگراموں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جب کہ دوسرے لوگوں کی نظر اس کے ظاہری غلاف پر ہی ہوتی ہے۔

۱۹۸۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○

۱۹۹۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۹۸۔ کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے فضل سے (اور ایام حج میں اقتصادی منافع سے) فائدہ اٹھاؤ (کیونکہ حج کا ایک فلسفہ اسلامی اقتصادی معاشرے کی بنیاد رکھنا بھی ہے) اور جب میدان عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام کے پاس خدا کو یاد کرو اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے اگرچہ اس سے پہلے تم لوگ گمراہ تھے۔

۱۹۹۔ پھر اس جگہ سے کہ جہاں سے لوگ کوچ کرتے ہیں (سرزمین منیٰ کی طرف) کوچ کرو اور خدا سے طلب مغفرت کرو جو بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

موسم حج میں اقتصادی کارکردگی

زمانہ جاہلیت میں مراسم حج بجا لانے کے موقع پر معاملہ، تجارت، مسافروں کو لے جانا اور سامان لانا لے جانا حرام اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان فطری طور پر منتظر تھے کہ انہیں معلوم ہو کہ زمانہ جاہلیت والے احکام جوں کے توں باقی رہیں گے یا یہ کہ اسلام ان کے بے وقعت ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

محل بحث آیت نے ان دنوں میں معاملہ یا تجارت کے گناہ ہونے کو غلط قرار دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ موسم حج میں کسی قسم کا معاملہ یا تجارت کرنے میں کوئی مانع اور حرج نہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لوگ فضل خدا سے بہرہ ور ہوں اور کوئی نفع حاصل کریں اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں۔

اسلامی کتب اور منابع میں حج کے فلسفہ میں جہاں اس کے اخلاقی، سیاسی اور ثقافتی پہلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے

وہاں اس کے اقتصادی فلسفہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ دُنیا کے مختلف خطوں سے خانہ خدا کی طرف مسلمانوں کا سفر اور عالی تنظیم اسلامی کانفرنس کی تشکیل اسلامی معاشروں کی عام اقتصادی ترقی کی اساس بھی بن سکتی ہے۔

مسلمانوں کے اقتصادی ماہرین کو چاہیئے کہ مراسم حج سے پہلے یا بعد میں مل بیٹھیں اور ہم فکر اور ہم قدم ہو کر اسلامی معاشروں میں محکم اقتصادی طرح ڈالیں اور صحیح تجارتی مبادلات کے ساتھ اس طرح کا طاقتور اقتصادی ڈھانچہ وجود میں لائیں کہ جس کے باعث دشمنوں اور غیروں سے بے نیاز ہو جائیں اس بناء پر تجارتی معاملات اور مبادلات بجائے خود دشمنان اسلام کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی تقویت کا ذریعہ ہیں کیونکہ کوئی بھی قوم قوی اقتصاد کے بغیر مکمل استقلال حاصل نہیں کر سکتی لیکن یہ واضح ہے کہ یہ تجارتی کارگزاریاں حج کے عبادتی اور اخلاقی پہلوؤں کے ماتحت ہونا چاہئیں نہ کہ ان پر مقدم۔ یہ خوش بختی ہے کہ مسلمانوں کے پاس اعمال حج سے پہلے اور بعد کاموں کے لئے کافی وقت ہوتا ہے۔

ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ خدا نے لوگوں کو حج کرنے اور اپنے گھر کا طواف کرنے کا حکم کیوں دیا ہے اس پر آپ نے فرمایا:

> خدا نے انسانوں کو پیدا کیا .... اور انہیں ایک ایسے عمل (حج) کا حکم دیا جو اطاعت دین اور ان کے دُنیاوی فائدہ کا حامل ہے۔ موسم حج میں مسلمان شرق و غرب سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تاکہ وہ آپس میں شناسائی پیدا کریں اور ہر قوم دوسری اقوام کی تجارتوں اور فائدے ہوتے اقتصادی اموال سے استفادہ کرے اور نقل و حمل کرنے والے ساربان کرایہ دے کر اپنے منتقل ہونے والے ذرائع و اسباب سے بہرہ مند ہوں اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ پیغمبر کے آثار و اخبار سے آشنا ہوں تاکہ یہ آثار اس طرح نظروں اور فراموش نہ ہو جائیں۔ اگر بنا یہ ہو کہ ہر قوم صرف اپنے علاقے کے متعلق گفتگو کرے تو وہ ہلاک ہو جائیں شہر ویران ہو جائیں۔ فوائد اور تجارتی منافع ختم ہو جائیں اور اخبار و آثار پیغمبر نابود ہو جائیں .... یہ ہے حج کا فلسفہ[1]

"فاذا افضتم من عرفات ....."

قرآن مجید آیت کے اس حصے میں یہ حکم دیتا ہے کہ ان ذمہ داریوں اور اعمال کی انجام دہی کے بعد جو عرفات میں انجام دیئے جاتے ہیں مشعر الحرام کی طرف کوچ کریں جو مکہ سے تقریباً اڑھائی فرسخ کے فاصلے پر منیٰ اور عرفات کے درمیان واقع ہے اور وہاں جا کر ذکر و یاد خدا میں مشغول ہو جائیں۔

---

[1] حدیث کا عربی متن یہ ہے۔

"...... فقلت لہ ما العلۃ التی لاجلہا کلف اللہ العباد الحج والطواف بالبیت ؟

فقال ...... فجعل فیہ الاجتماع من الشرق والغرب لیتعارفوا ولینزع کل قوم من التجارات من بلد الی بلد ولینتفع بذلک المکاری والجمال .... ولو کان کل قوم انما یتکلمون علی بلادھم وما فیہا ھلکوا وخربت البلاد وسقطت الجلب والارباح ......" وسائل جلد ۸ کتاب الحج ابواب وجوبہ باب ۱ حدیث ۱۸

"واذکروہ کما ھداکم و........"

اس حصے میں قرآن متوجہ کرتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت کے شکرانے کے طور پر مشعر الحرام میں اس کی یاد میں رہو ایسی یاد جو اس ہدایت کے مطابق ہے جو خدا کی طرف سے ہے (اس بناء پر ہو سکتا ہے کہ لفظ کما یہاں ملما یا مثل کے معنی میں ہو)۔

اُس زمانے میں مسلمان اس عظیم نعمت یعنی ہدایت کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے کیونکہ اُن کا فاصلہ اس دور سے زیادہ نہ تھا۔ جب جزیرۃ العرب ہر طرف سے گمراہی میں گھرا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے تھا کہ خداوند عالم نے کس طرح انہیں اس پاک دین کی برکت سے ان تمام بدبختیوں، گمراہیوں اور سرگردانیوں سے نجات دی ہے "وان کنتم من قبلہ لمن الضالین."

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عرفات مکہ سے چار فرسخ کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض بیابان ہے۔ وہاں حاجی حضرات نویں ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے لے کر غروب تک ٹھہرتے ہیں۔

اس سرزمین کا نام عرفات کیوں ہے۔ اس بارے میں بہت سے پہلو مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا کی وحی کا قاصد جبرئیل حضرت ابراہیمؑ کو مناسک حج کی نشاندہی کروا رہا تھا تو حضرت ابراہیمؑ کہتے "عرفت" "عرفت" یعنی میں نے پہچان لیا" "میں نے پہچان لیا"۔

لیکن بعید نہیں کہ یہ نام رکھنا ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ یہ سرزمین جہاں سے مراحل حج شروع ہوتے ہیں معرفت پروردگار اور اس کی پاک ذات کو پہچاننے کے لیے بہت آمادہ اور تیار ماحول مہیا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ روحانی اور معنوی جذبہ جو انسان میں اس سرزمین میں داخل ہوتے وقت پیدا ہوتا ہے ایسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سب ایک ہی صورت میں، سب ایک انداز میں، سب بیابان نشیں، شہر کے شور و غل سے دور، مادی دنیا کے ہاؤ ہو سے پرے، زرق و برق دنیا سے اوجھل ایک آزاد اور گناہ سے پاک فضا میں آسمان کے سائے تلے اس جگہ جہاں فرشتۂ وحی کے پر چھوتے رہے جہاں سے جبرئیل کا زمزمہ، ابراہیم خلیل اللہ کی مردانہ وار پکار، پیغمبر اسلامؐ اور صدر اول کے مجاہدین کی حیات بخش صدا کی بھنبھناہٹ آج بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ مقام جہاں انسان نہ صرف یہ کہ عرفان پروردگار کے نشہ میں سرمست ہو جاتا ہے اور کچھ لمحوں کے لیے ساری مخلوق کی تسبیح کے سرور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے بلکہ اپنے وجود کے اندر اپنی کھوئی ہوئی ذات کو جس کی تلاش میں تھا پا لیتا ہے اور اپنی ذات کا عارف ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ جان لیتا ہے کہ وہ وہ شخص نہیں جو رات دن تلاش معاش میں حریصانہ کوہ و صحرا کی وسعتوں کو اپنے قدموں سے ماپتا رہتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا اس سے سیراب نہ ہوتا تھا یہاں وہ جان لیتا ہے کہ ایک اور گوہر اس کی روح کے اندر چھپا ہوا ہے جو دراصل اُس کے وجود کی حقیقت ہے۔

جی ہاں اس سرزمین کو عرفات کہتے ہیں۔ کس قدر عمدہ اور مناسب نام ہے۔

مشعر الحرام ـــــ کے نام کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ جگہ شعائر حج کا مرکز ہے اور ان عظیم و پرشکوہ آسمانی مراسم کی نشانی ہے۔

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ "مشعر" "شعور" کے مادہ سے ہے۔ اس تاریخی رات، دس ذی الحجہ کی رات، جب زائرین خانۂ خدا اور عرفات میں اپنا تربیتی پروگرام مکمل کرنے کے بعد ادھر کوچ کرتے ہیں۔ رات ڈھلے سے صبح تک نرم پتھروں پر تا صبح بسر آسمان تلے۔ ایک ایسی سرزمین پر جو محشر کبریٰ کا نمونہ اور قیامت عظمیٰ کا ایک منظر بنی ہوتی ہے۔ لوگ ہر طرف یوں پھیلے ہوتے ہیں جیسے ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر کی طوفانی موجیں ہوں۔ صبح تک لوگوں کی آوازیں اس سرزمین پر سنائی دیتی رہتی ہیں۔

جی ہاں آلائشوں سے پاک اس پاکیزہ اور جلا دینے والے ماحول میں، احرام کے معصومانہ لباس میں، نرم کنکریوں پر بیٹھا انسان اپنے اندر یوں محسوس کرتا ہے جیسے فکر و شعور کے تازہ چشمے ابل رہے ہوں اور ان کا پانی دل کی گہرائیوں میں گرتا ہو اور وہ اپنے اندر سے ان چشموں کی آواز صاف طور پر سن رہا ہو۔ ہاں اسی جگہ کو مشعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"ثم افیضوا من حیث افاض الناس"

رب جلیل نے اس آیت میں ایک امتیاز اور خصوصیت پر خط بطلان کھینچا ہے جس کے قریش مکہ اپنے بارے میں قائل تھے قریش اپنے تئیں "حمس" (بہادر، دلیر، متعصب) سمجھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو اولاد ابراہیمؑ اور سرپرست کعبہ قرار دیتے تھے۔

وہ کسی عرب کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے وہ کہتے تھے حرم مکہ سے باہر رہنے والوں کا احترام حرم میں رہنے والوں کے برابر نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو عرب ہماری قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوں گے۔ اسی بناء پر انہوں نے عرفات میں وقوف ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ محدودۂ حرم سے باہر تھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ وقوف حج اور دین ابراہیمؑ کا جزو ہے[2]

مندرجہ بالا آیت میں قرآن حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ سب ایک ہی جگہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے سب کے سب مشعر کی طرف آجائیں اور پھر وہاں سے سرزمین منیٰ کی طرف کوچ کریں۔

"واستغفروا اللہ"

مزید فرماتا ہے کہ خدا سے طلب مغفرت کرو اور زمانۂ جاہلیت کے ان افکار و خیالات سے کنارہ کشی کرو کیونکہ حج مساوات و برابری کا درس ہے اور یاد دلاتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۰۰۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ○

[1] حمس کا معنی ہے وہ افراد جو اپنے دین میں مستحکم ہوں۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۹ و ص ۲۱۲

۲۰۱۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

۲۰۲۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۲۰۰۔ اور جب اپنے مناسک (حج) انجام دے لو تو ذکرِ خدا کرو جیسے (زمانہ جاہلیت میں موہوم مفاخر پر فخر و مباہات کرتے ہوئے) اپنے آباء کو یاد کرتے رہے، ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (یہاں دو طرح کے لوگ ہیں) بعض کہتے ہیں خدایا ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

۲۰۱۔ بعض کہتے ہیں خداوند ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھائی سے نواز اور ہمیں (جہنم کی) آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۲۰۲۔ وہ اپنی کوشش (اور دعا) کا صلہ اور حصہ پائیں گے اور خدا جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

تفسیر

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مراسم حج کی انجام دہی کے بعد ایک اجتماع منعقد ہوا کرتا تھا اور لوگ اپنے باپ دادا کی طرف سے ملنے والے موہوم افتخارات خوب بیان کیا کرتے تھے۔ قرآن متوجہ کرتا ہے کہ اعمال حج بجالانے کے بعد خدا کو یاد کیا کرو اور اس عظیم اجتماع میں خدا اور اس کی وسیع و بے شمار نعمتوں پر گفتگو کیا کرو اور اپنے دلوں کو اس کی جانب مائل کرو اور اس یادِ خدا میں اتنا تو شوق و شغف اور سوز و گداز ہو جتنا زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء و اجداد کے فخر و مباہات کے ضمن میں ہوتا تھا بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے بارے میں تو زیادہ جوش و خروش اور گہرائی ہونا چاہیئے۔

"فاذکروا اللہ کذکرکم اٰباءکم او اشد ذکرا"۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدا سے مربوط رہنے میں ہے نہ کہ اپنے آباء و اجداد کے موہوم مفاخر و مباہات سے وابستگی میں۔

"فمن الناس من یقول ...."

اس کے بعد قرآن دو گروہوں کی کیفیت کو واضح کرتا ہے اور ان کے افکار و فہم کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادی منافع کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور انسان کے علاوہ خدا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا اور وہ کہتا ہے

"ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ" خدایا! ہمیں دُنیا کی نعمتیں بخش دے۔

ایسے لوگوں کا معنویت و روحانیت میں کوئی حصہ نہیں اور آخرت میں ان کے نصیب میں کچھ نہیں ۔ یہ لوگ اس ابدی و باقی اور ہمیشہ رہنے والے جہاں سے بے بہرہ ہیں ۔ جہاں انسان کو ہر چیز کی ضرورت ہوگی ۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جن کے افکار و نظریات فقط مادی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ حیات دنیا کو بھی معنوی تکامل وارتقاء کے لیے مقدمہ سمجھتے ہیں اور آخرت کے گھر کی سعادت کے بھی طلب گار ہیں ۔ یہ آیت درحقیقت اسلامی منطق کو مادی اور معنوی مسائل میں مشخص کرتی ہے اور جو لوگ صرف مادیات میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں ان لوگوں کی طرح مذموم قرار دیتی ہے جو دنیاوی زندگی پر کوئی نظر نہیں رکھتے نیز یہ آیت انسانوں کی اس جہان میں دردناک عذاب سے نجات بھی چاہتی ہے ۔

"وقنا عذاب النار"

"حسنہ" کا معنی ہے "نیکی" ۔ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے ۔ اس میں تمام مادی و معنوی نعمتیں شامل ہیں ۔ لیکن بعض احادیث میں حسنہ کے مفہوم کے بارے میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے ۔

"ومن اوتی قلبا شاکرا و لسانا ذاکرا و زوجة مؤمنة تعینه علی امر دنیاه و اخرته فقد اوتی فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة و وقی عذاب النار" [1]

جسے خدا شکر گزار دل دے ، یاد حق میں مشغول زبان بخشے اور صاحب ایمان بیوی عطا کرے جو امور دنیا و آخرت میں اس کی مددگار ہو اسے دنیا و آخرت کی نیکی بخشی ہے اور آتش جہنم کے عذاب سے بچایا ہے ۔

واضح ہے کہ اس حدیث میں عام مفہوم کی بعض خاص امور کے حوالے سے تفسیر کی گئی ہے اور اس میں بعض واضح مصادیق کی نشاندہی کی گئی ہے نہ کہ منحصراً اس کا بس یہی مفہوم ہے ۔

"اولئک لھم نصیب مما کسبوا واللہ سریع الحساب"

گذشتہ بحث کے بعد اس آیت میں ہے کہ دونوں گروہ اپنی کاوشوں کے نتیجے سے بہرہ ور ہوتے ہیں ، وہ بھی جو خدا سے صرف دنیا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو دنیا و آخرت کے خواستگار ہیں ۔ ان میں سے کوئی بھی محروم نہیں ہوتا البتہ ہر ایک کا صلہ اس کی خواہش تک محدود ہے ۔

حقیقت میں یہ آیات سورہ اسراء کی آیات ۱۸ اور ۲۰ کی طرح ہیں جن میں فرمایا گیا ہے :

جو شخص دنیا کا طالب ہے جتنی مقدار ہم چاہتے ہیں اسے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کو چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جبکہ ایمان بھی رکھتا ہے تو اس کی سعی نتیجہ بخش ہوگی اور ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا و بخشش پہنچے گی

خلاصہ یہ کہ انسان وہ کچھ پائے گا جو کچھ چاہے گا ۔

جو نکتہ یہاں باقی رہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں دعا کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا دعا

---

[1] مجمع البیان : آیت مذکورہ کے ذیل میں ۔

کو کسب و اکتساب کہا جا سکتا ہے؟

قرآن مجید میں ۶۷ مقامات پر مادہ "کسب" اور اس کے مشتقات کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ کسب جسمانی کاموں کے علاوہ روحانی اور قلبی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ میں ہے:

"ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم"

لیکن جو تمہارے دل کسب کرتے ہیں اس پر ہم تمہارا مواخذہ کریں گے

سورہ نساء کی آیہ ۱۱۱ میں ہے۔

"ومن یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ"

جو شخص کسب گناہ کرتا ہے وہ اپنے ہی نقصان میں کسب کرتا ہے۔

اس بناء پر دعا اور خواہش بھی ایک طرح کا کسب و اکتساب ہے۔ علاوہ ازیں حقیقی دعا صرف زبان سے نہیں بلکہ پورے وجود انسانی سے ہوتی ہے۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ لفظ "اولئک" صرف دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہو جو دنیا و آخرت دونوں کے درپے ہے جو مادیت و معنویت کو ایک دوسرے سے جدا دیتا ہے یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو نہ صرف مادی ہیں اور نہ صرف تارک دنیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مساعی نتیجہ و ثمر تک پہنچتی ہیں اور وہ ان سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کی زحمتیں اور کوشش رائیگاں جاتی ہیں۔

"واللہ سریع الحساب"

پروردگار کی جانب سے آیت کے آخری حصے میں سرعت حساب کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ خدا چشم زدن میں سب کا حساب کر دے گا:

"ان اللہ تعالٰی یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر" [1]

یہ اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم مخلوقات کی طرح نہیں ہے۔ مخلوقات کا وجود اور ہستی چونکہ محدود ہے اس لیے جب وہ ایک معاملے میں مشغول ہوں تو دوسرے سے غافل ہو جاتی ہیں جب کہ خدا تعالٰی یوں نہیں ہے۔

علاوہ ازیں محاسبہ کے لیے پروردگار کو کسی زمانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے اعمال کا اثر جسم و جان، ہمارے اردگرد کے موجودات، زمین اور ہوا کی موجوں میں باقی ہے۔

حقیقت میں معاملہ ان خودکار مشینوں کا سا ہے جن کی کارکردگی (out put) ان کے ساتھ ساتھ گھومنے والے نمبر سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، اس آیت کے ذیل میں۔

۲۰۳ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ
يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ
لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۰۳ — اور خدا کو معین دنوں (۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ) میں یاد کرو اور جو لوگ جلدی کریں اور (ذکر خدا کو) دو دنوں میں انجام دیں ان پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کریں (اور تین دن انجام دیں) ان پر بھی کوئی گناہ نہیں (یہ اُن کے لیے ہے) جو تقویٰ اختیار کریں۔ نیز خدا سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کی طرف محشور ہوگے۔

تفسیر

یہ آیت مراسم حج کے بعد ذکرِ خدا کا پروگرام پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق زمانہ جاہلیت کے موہوم مفاخر کی بجائے چند روز یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہئیں۔ یہ مدت کم از کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن ہے۔ سابق آیات کے قرینہ سے یہ دن عید قربان کے مراسم کے بعد ہیں اور یہ یقیناً ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ تاریخیں ہیں۔ روایات کی زبان میں ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ روشنی بخشنے والے دن ہیں جن میں ان بلند مرتبہ مذہبی مراسم کے ذریعے انسانی روح اور جان روشن ہو جاتی ہے۔

احادیث کے مطابق ۱۵ نمازوں کے فوراً بعد (جو عید کے روز نمازِ ظہر سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ کی نمازِ صبح تک ہیں) ان الہام بخش جملوں کا تکرار کیا جاتا ہے:

"اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر، وللّٰہ الحمد، اللّٰہ اکبر علیٰ ما ھدانا، اللّٰہ اکبر علیٰ ما رزقنا من بھیمۃ الانعام"

"فلا اثم علیہ" (اس پر کوئی گناہ نہیں) ہو سکتا ہے یہ جملہ دو اور تین دن کے ذکرِ خدا میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو یعنی اس تعداد میں سے جسے چاہو اختیار کرو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے (اور آیت سے ابتدائی طور پر بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے اس حصے میں خانہ خدا کے زائرین سے مطلق گناہ کی نفی ہو یعنی ایمان، خلوص اور توجہ سے مناسکِ حج انجام دینے سے جو ان اذکار سے مکمل ہوتے ہیں، زائرینِ کعبہ کے گذشتہ گناہوں کے آثار اور تہ در تہ

گناہ و معاصی اُن کے قلب و جان سے دُھل جائیں گے اور جب وہ اس عظیم تربیتی مکتب سے نکلیں گے تو ان کی روحیں آلائش گناہ سے پاک ہو چکی ہوں گی۔ "لمن اتقیٰ" یعنی۔ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں، کے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

۲۰۴۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

۲۰۵۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

۲۰۶۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

ترجمہ

۲۰۴— کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ جو دل میں چھپائے ہوئے ہیں خدا اس پر گواہ ہے اور (جبکہ) وہ سخت ترین دشمن ہیں۔

۲۰۵— (ان کی نشانی یہ ہے کہ) جب وہ رُخ پھیرتے ہیں (اور تیری بارگاہ سے نکلتے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ فصلوں اور چوپاؤں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (اس کے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ) خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔

۲۰۶— اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو (تو ان کا اصرار اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے) اور ضد اور تعصب انہیں گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ ان لوگوں کیلئے کافی ہے اور (جہنم) کیا بُری جگہ ہے۔

شان نزول

یہ آیات اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ وہ خوبصورت اور خوش بیان شخص تھا۔ وہ پیغمبر اکرمؐ سے دوستی کا اظہار کرتا تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ جب پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ کے پاس بیٹھتا تو اظہار ایمان کرتا اور منافق ہونے کے باوجود قسمیں کھاتا اور کہتا کہ میں آپؐ کو دوست رکھتا ہوں اور خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیغمبر بھی بظاہر اُسے تپاک سے ملتے اور اس سے اظہار لطف و محبت فرماتے۔

ایک مرتبہ اس کے اور قبیلہ ثقیف کے درمیان دشمنی ہوگئی۔ اُس نے ان پر شب خون مارا۔ اُن کے چوپائے مار ڈالے اور فصلوں کو آگ لگا دی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے کھیتوں سے گزرا اور انہیں آگ لگا دی اور ان کے چوپایوں کے پاؤں کاٹ دیئے۔ اِس طرح اس نے اپنے اندرونی نفاق کو ظاہر کیا اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیات سریہ رجیع کے بارے میں ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ مبلغین اسلام کی ایک جماعت پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے اطراف مدینہ کے لیے روانہ ہوئی تاکہ مختلف گروہوں سے ملاقات کرے۔ ایک نامردانہ سازش کے نتیجے میں وہ سب شہید ہوگئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلی شان نزول آیات کے مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ بہرحال آیات سے ملنے والا درس عمومی ہے اور سب کے لیے ہے۔

تفسیر

جیسا کہ شانِ نزول میں آیا ہے آیات بعض منافقین کے نفاق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے تئیں ان سے بچائے رہیں۔ فرمایا گیا ہے کچھ لوگ اپنی باتوں سے اظہارِ ایمان کرتے ہیں اور قسم کھا کر یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی باتیں اُن کے اعتقاد کی مظہر ہیں حالانکہ وہ اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ جب پیغمبرؐ کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو زمین میں فساد کرتے ہیں۔ کھیتوں کو اجاڑ دیتے ہیں اور انسانوں کو تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کے رُخِ کردار سے پردہ اُٹھاتا ہے اور اُن کے باطن کو پیغمبر اکرمؐ کے سامنے آشکار کرتا ہے اور فتنہ اور فساد میں اُن کی بڑھتی ہوئی فعالیت کے بارے میں نبی اکرمؐ سے کہتا ہے اگر یہ لوگ اپنے اظہارات میں سچے ہوتے تو فساد اور تخریب کاری کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ " واللہ لا یحب الفساد۔" رہا یہ امر کہ پیغمبر اکرمؐ ایسے افراد سے کشادہ روئی سے کیوں پیش آتے تھے تو وہ اس لیے کہ آپؐ مامور تھے کہ لوگوں کے ظواہر کو قبول کریں۔ جب تک کہ اُن سے کوئی مخالفت سرزد نہ ہوا اور ہونا بھی اس طرح چاہیئے۔

بعض کا احتمال ہے کہ جملہ " اذا تولی " سے مراد " حکومت " ہے کیونکہ لفظ " تولی " مادۂ ولایت سے ہے جس کا معنی حکومت ہے۔ اس مفہوم کی بنا پر آیت کی تفسیر یوں ہوگی کہ منافقین جب حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو فساد اور تخریب کاری کے ذریعے بندگانِ خدا پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل جاتی ہیں اور لوگوں کے مال و جان محفوظ نہیں رہتے جب انہیں اس بُرے عمل سے روکا جاتا ہے تو ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب میں اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ نصیحت کرنے والوں کے نصائح پر کان نہیں دھرتے بلکہ غرور اور اپنی مخصوص نخوت کے ساتھ حق

کے خلاف کاموں میں اضافہ کرتے ہیں ایسے افراد کو جہنم کی آگ کے سوا کوئی چیز رام نہیں کر سکتی "فحسبہ جہنم"...... یعنی جہنم اس کے لیے کافی ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت منافقین کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ ہے خشک تعصب اور ہٹ دھرمی جو انہیں بڑے سے بڑے گناہوں کی سرحد تک پہنچا دیتی ہے۔ "اخذتہ العزۃ بالاثم" جب کہ صاحبان ایمان حکومت ایمان کی پناہ میں اس بری صفت اور اس کے خطرناک آثار سے دور ہیں۔

۲۰۷۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ○

ترجمہ

۲۰۷۔ (علیؑ جیسے صاحب ایمان اور فداکار جنہوں نے ہجرت کی شب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سو کر گزاری) کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

شان نزول

اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی کہتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لیے حضرت علیؑ کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپؐ غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپؐ پر حملہ کرنے کے لیے آپؐ کے گھر کا چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے آپؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کے بستر پر لیٹ جائیں۔ اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی۔ اس وقت خداوند عالم نے جبرئیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے۔ تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علیؑ میرے پیغمبرؐ کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کر دے۔ زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ و نگہبان بن جاؤ۔

جب جبرئیل حضرت علیؑ کے سرہانے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تو جبرئیل کہہ رہے تھے سبحان اللہ، آفرین آپ پر اے علیؑ کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر و مباہات کر رہا ہے۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات "لیلۃ المبیت" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب پیغمبرؐ مشرکین سے چھپ کر ابوبکر کے ساتھ غار کی طرف جا رہے تھے یہ آیت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی جو اس وقت بستر رسولؐ پر سوئے ہوئے تھے۔

ابو جعفر اسکافی کہتے ہیں: جیسے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۲۷۰ پر لکھا ہے حضرت علیؑ کے پیغمبرؐ کے بستر پر سونے کا واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار غیر مسلموں اور کم ذہن لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔[1]

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں بیان ہو چکا ہے یہ آیت ہجرت کی رات حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی لیکن اس کا ایک کلی و عمومی مفہوم بھی ہے۔ یہ آیت چونکہ گذشتہ آیت "ومن الناس من یعجبک ...." کے مقابلے میں آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسانوں کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے سابق گروہ کے مقابلے میں ہے اور ان کی صفات بھی ان کی صفات کے مقابل ہیں۔ وہ لوگ خود غرض، خود پسند، ہٹ دھرم اور بغض و عناد رکھنے والے تھے ——————— اور منافقت کے ذریعے لوگوں میں اپنی عزت و آبرو بناتے تھے۔ وہ لوگ اپنے آپ کو دین کا خیر خواہ اور مومن ظاہر کرتے تھے لیکن ان کا کردار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور لوگوں کو ہلاک کرتے تھے جب کہ یہ دوسرا گروہ صرف خدا سے معاملہ کرتا ہے اور اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی خدا کے پاس بیچ دیتا ہے۔ یہ گروہ اس کی رضا کے سوا کسی چیز کا خریدار نہیں اور خدائی طرز کے علاوہ کسی طریقے سے عزت و آبرو کے حصول کا قائل نہیں۔ انہی انسانوں کی فداکاریاں ہیں جن کی وجہ سے دین و دنیا کے امور کی اصلاح ہوتی ہے، دین حق حقیقت زندہ و پائیدار ہے۔ حیات انسانی خوش گوار ہے اور شجر اسلام بار آور ہے۔

یہیں سے آیت کے صدر و ذیل کی مناسبت یعنی "واللہ رؤف بالعباد" کا مفہوم آشکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس قسم کے انسانوں کا لوگوں میں وجود اپنے بندوں پر خدا کی رأفت و مہربانی کا مظہر ہے اس لیے کہ اگر ایسے فداکار، اپنی پرواہ نہ کرنے والے جانباز اُن پست عناصر کے مقابلے میں نہ ہوتے تو ارکانِ دین اور اسلامی معاشرہ

---

[1] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۴۸ و صفحہ ۴۹ پر ہے کہ غزالی نے احیاء العلوم ج ۳ صفحہ ۲۲۳ پر صفوری نے نزہۃ المجالس ج ۲، صفحہ ۲۰۹ پر ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ ص ۳۳ سبط ابن جوزی نے تذکرہ خواص صفحہ ۲۱ پر، امام احمد نے مسند ج ۱ صفحہ ۳۳۱ پر تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۹۹ پر سیرۃ ابن ہشام ج ۲، صفحہ ۲۹۱ پر سیرۃ حلبی ج ۱ صفحہ ۲۹۱ تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۲۹ پر لیلۃ المبیت کے واقعہ کو نقل کیا ہے۔

پاش پاش ہو جاتا لیکن پروردگار مہربان ہمیشہ ان فداکار اور جانثار دوستوں کے ذریعے دشمنوں کی تباہ کاریوں کا ازالہ اور تلافی کرتا ہے جیسا کہ سورہ حج کی آیہ ۴۰ میں ہے۔

"ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد ....."

اگر خدا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے دفع نہ کرتا تو عبادت خانے، گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے (گھر) اور مسجدیں سب ویران ہو جاتیں۔

یہ نفع بخش معاملہ جو خدا والوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی مذکور ہے مثلاً سورہ توبہ کی آیہ ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة يقاتلون فى سبيل الله فيقتلون ويقتلون ...."

خدا مومنین سے ان کے نفوس اور مال خریدتا ہے تاکہ اس کے بدلے انہیں جنت دے دے۔ وہ راہ خدا میں جنگ کرتے، قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں ....

محل بحث آیت حضرت علیؑ کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کا ذکر اکثر اسلامی کتب میں آیا ہے۔ یہ فضیلت اس قدر عظیم اور نگاہوں میں کھٹکنے والی ہے کہ معاویہ جیسا خاندان رسالت کا سخت ترین دشمن بھی اس پر اتنا بے چین ہوا کہ اس نے سمرہ بن جندب کو چار لاکھ روپے کی پیش کش کر کے کہا کہ اس آیت کو جعلی حدیث کے ذریعے عبدالرحمٰن ابن ملجم کی فضیلت میں بیان کرو۔ اس ظالم منافق نے بھی ایسا کر دیا لیکن جب توقع اس بناوٹی حدیث کو ایک شخص نے بھی قبول نہیں کیا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں بیچنے والا انسان ہے اور خریدنے والا خدا ہے۔ مال و متاع نفس و جان ہے اور اس کی قیمت خوشنودی پروردگار ہے۔ یہ آیت دیگر ان آیات سے مختلف ہے جن میں لوگوں کی خدا سے تجارت بیان کی گئی ہے۔ وہاں قیمت بہشت اور دوزخ سے نجات ہے لیکن زیر نظر آیت میں مذکور گروہ جنت کو لالچ نہیں رکھتے نہ ہی دوزخ سے خوف زدہ ہیں (اگرچہ یہ دونوں چیزیں بڑی اہم ہیں) بلکہ ان کی پوری توجہ پروردگار کی خوشنودی کے حصول کی طرف ہے اور یہ سب سے بلند معاملہ ہے جو انسان انجام دے سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آیت "من تبعیضیہ" یعنی "ومن الناس" سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ افراد کا ذکر ہے جو یہ فوق العادہ کام کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسری آیات جن میں جان کے معاملے کے سلسلے میں جنت کا حصول یا جہنم سے نجات کا ذکر ہے اور ان میں عمومیت اور ملکیت کے پہلو کو دنظر رکھا گیا ہے۔ اشترى من المؤمنين میں اسی طرف اشارہ ہے۔

۲۰۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○
۲۰۹۔ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۲۰۸۔ اے ایمان والو! سب کے سب صلح و آشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲۰۹۔ اور اگر (ان سب ان نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد بھی تم سے لغزش ہو جائے (اور تم گمراہ ہو جاؤ، تو جان لو کہ (تم خدائی عدالت کے چنگل سے فرار اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ) خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

عالمی صلح و آشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے

"سلم" اور "سلام" لغت میں صلح و آشتی کے معنی میں ہے۔ یہ آیت تمام لوگوں کو امن و صلح کی دعوت دیتی ہے۔ آیت کا روئے سخن چونکہ مومنین کی طرف ہے اس لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صلح و آسائش صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے۔ ایمان کے بغیر یعنی مادی قوانین کے بھروسے پر دنیا سے جنگ و جدل اور پریشانی اور اضطراب کا ہرگز خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ ایمان کی معنوی قوت کے ذریعے اس بات کا امکان ہے کہ انسان تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپس میں بھائیوں کی طرح مل بیٹھیں اور عالمی حکومت تشکیل دیں اس طرح ہر روئے زمین پر صلح و آشتی کے ٹھنڈے سائے ڈالے جا سکتے ہیں۔

واضح ہے کہ مادی امور مثلاً زبان، نسل، ثروت و دولت، جغرافیائی حدود اور طبقہ بندی سب کے سب جدائی اور پراگندگی کے سرچشمے ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی عالمی امن قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقی امن تو قلوب انسانی میں

کسی محکم رشتے کا محتاج ہے اور یہ محکم رشتۂ اتصال صرف خدا پر ایمان کا نام ہے ۔ یہی رشتہ تمام اختلافات سے بلند و بالا ہے ۔ اسی لیے امن و صلح ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے جیسا کہ خود وجودِ انسانی میں اور اس کی روح میں اطمینان اور آسودگی ایمان کے بغیر میسر نہیں آسکتی ۔

"ولا تتبعوا خطوات الشیطان"

اسی سورہ کی آیہ ۱۶۷ میں اشارہ ہوچکا ہے کہ کجرویاں اور شیطانی وسوسے تدریجی طور پر رونما ہوتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک قرآنی تعبیر کے مطابق شیطان کے ایک قدم کی پیروی ہے ۔ یہاں بھی اسی حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے کہ انحرافِ حق، دشمنی، عداوت، نفاق، جنگ اور خونریزی ۔ انسان کے مزاج میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں ۔ صاحبِ ایمان افراد کو پہلے سے بیدار رہنا چاہیئے تاکہ وہ ان برائیوں کا مقابلہ کر سکیں ۔

عربوں کی ایک مشہور ضرب المثل ہے ۔

"ان بدو القتال اللطام"

"ایک تباہ کن جنگ کی ابتداء ایک تھپڑ سے ہوتی ہے ۔"

"انه لکم عدو مبین"

شیطان کی انسان سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔ ابتدائے آفرینش حضرت آدم علیہ السلام سے وہ انسان کی دشمنی کے لیے کمر بستہ ہے اور اس نے سوگند کھا رکھی ہے کہ وہ اس دشمنی کو اپنے حتمی نتیجے تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد اور عداوت باایمان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ۔ بلکہ یہ ان کے تکامل و ارتقاء کے لیے ایک رمز ہے ۔

"فان زللتم من بعد ما جاءتکم البینات"

پروگرام، راستہ اور مقصد سب واضح ہیں تو پھر لغزشوں اور شیطانی وسوسوں کی گنجائش نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر تم ان سب چیزوں کے باوصف راستے سے ہٹ جاؤ ۔ کجروی اختیار کرو تو مسلم ہے کہ اس میں تمہاری ہی کوتاہی ہے اور جان لو کہ خدا بھی عزیز (صاحبِ قدرت اور توانا) ہے اور کوئی شخص اس کی عدالت سے فرار اختیار نہیں کرسکتا اور وہ حکیم بھی ہے ۔ خلافِ عدالت کوئی حکم اور فیصلہ صادر نہیں کرتا ۔

۲۱۰ - هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّآ أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ[1] مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ○

---

[1] "ظلل" جمع ہے "ظلۃ" کی ۔ جس کا مطلب ہے ہر وہ چیز کہ جو سایہ فگن ہو ۔ اس بنا پر "ظلل من الغمام" کا معنی ہے سایہ فگن بادل ۔

ترجمہ

۲۱۰۔ کیا (شیطان کے پیروکار) یہ لوگ (ان تمام نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد) پھر بھی منتظر ہیں کہ خدا اور فرشتے بادل کے سائے میں ان کے پاس آئیں (اور انہیں نئے دلائل پیش کریں جب کہ یہ امر محال ہے) اور تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور تمام معاملات کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

یہ آیت اگرچہ قرآن کی پیچیدہ آیات میں سے نظر آتی ہے لیکن آیت کی تعبیرات میں دقت نظر اور غور و خوض سے ابہام دور ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں صدائے سخن چیز کی طرف ہے۔ گزشتہ بحث کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے کیا یہ سب نشانیاں اور واضح دلائل انسان کو لغزش سے بچانے اور عدو مبین (شیطان) کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ کیا وہ منتظر ہیں کہ خداوند عالم فرشتوں کی ہمراہی میں سایہ فگن بادلوں کی اوٹ میں ان کی طرف آئے اور انہیں زیادہ واضح دلائل پیش کرے؟ ایسا ہونا تو محال ہے کیونکہ خدا جسم نہیں ہے اور بالفرض محال ایسا ہو بھی تو اس کی ضرورت کیا ہے جب کہ تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور کوئی فروگذاشت واقع نہیں ہوئی (و قضی الامر) اور تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور سب امور کا سرانجام وہی ہے (و الی اللہ ترجع الامور)۔

اس بناء پر آیت کی ابتدا میں آنے والا استفہام، استفہام انکاری ہے یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں (علاوہ ازیں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ انسانی ہدایت کی ضرورت کو پہلے ہی پورا کیا جا چکا ہے)

اس تفسیر کی بناء پر آیت میں کسی قسم کی "تقدیر" موجود نہیں اور آیت کے اصل الفاظ تعبیر یہی ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اس استفہام کو استفہام انکاری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا اور اسے گنہگاروں اور شیطانی پروگراموں کی پیروی کرنے والوں کے لیے ایک طرح کی تہدید قرار دیا ہے (ان کے نزدیک یہ عذاب دنیا یا عذاب آخرت کی ایک دھمکی ہے) وہ لفظ 'اللہ' سے پہلے لفظ 'امر' کو مقدر سمجھتے ہیں۔ اس سے آیت کا مجموعی مفہوم اور معنی یہ ہوگا

> کیا وہ ٹیڑھے اعمال بجا لا کر چاہتے ہیں کہ خدا کا حکم اور فرشتے انہیں سزا دینے اور ان پر عذاب نازل کرنے کے لیے آ پہنچیں، وہ دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں اور ان کے کام کا خاتمہ ہو جائے۔ جب کہ ان کے اعمال کا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ بھی نہ ہوگا۔

۲۱۱۔ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۲۱۱۔ بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انہیں کیسی واضح نشانیاں دی تھیں (لیکن انہوں نے خدا کی عطا کردہ مادی و معنوی نعمتوں کو غلط طور پر صرف کیا) اور جو شخص اللہ کی نعمت پا کر اُسے تبدیل کردے (اور اُسے غلط امور میں صرف کرے وہ خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہوگا کہ) خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت بنی اسرائیل کی روش اور طور طریقوں کے بارے میں ہے کہ وہ واضح آیات اور نعمات الٰہی کے حصول کے بعد کیسے انہیں بدل دیتے تھے۔ کفرانِ نعمت کرتے تھے اور نتیجے کے طور پر وہ عذاب میں گرفتار ہوگئے۔

نعمت کی تبدیلی — کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود وسائل، توانائیاں اور مادی و معنوی صلاحیتیں تخریبی اور انحرافی راستوں، گناہ اور ظلم و ستم میں استعمال کرے۔ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو روحانی مربی بھی عطا فرمائے، ان میں سے طاقتور سربراہ بنائے اور ہر قسم کے مادی و معنوی اسباب اُن کے تصرف میں دیئے لیکن وہ نعمت کی تبدیلی میں گرفتار ہوگئے۔ اسی سے اُن کی زندگی تباہ و برباد ہوگئی اور قیامت میں بھی دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

نعمت کی تبدیلی کا مسئلہ بنی اسرائیل میں منحصر نہیں۔ اس زمانے میں بھی دنیائے صنعت اس عظیم بدبختی میں مبتلا ہے کیونکہ انسان کے اختیار میں اگرچہ آج بہت سی نعمتیں اور توانائیاں ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انسان کو نصیب نہیں ہوئیں لیکن انبیاء و مرسلین کی آسمانی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے وہ تبدیلیٔ نعمت کے عمل میں گرفتار ہے اور ان بہی نعمتوں کو وحشت ناک حد تک اپنی فنا اور تباہی کی راہ میں صرف کر رہا ہے۔

"سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" — یہ جملہ حقیقت میں اس لیے ہے کہ اُن سے نعمات الٰہی کا اعتراف کروایا جائے اور اس کے بعد انہیں پوچھا جائے کہ ان وسائل و ذرائع کے باوجود ایسا روزِ سیاہ تمہیں کیوں نصیب ہوا اور کیوں آج تم دُنیا میں پراگندہ و منتشر ہو۔

۲۱۲۔ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ

مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۲۱۲۔ دنیاوی زندگی کو کافروں کے لیے مزین کیا گیا ہے (لہٰذا) وہ صاحب ایمان لوگوں کا (کہ جو کبھی کبھی تہی دست ہوتے ہیں) تمسخر اڑاتے ہیں حالانکہ اہلِ ایمان قیامت میں ان سے بالاتر ہوں گے (کیونکہ قدریں وہاں آشکار ہوں گی اور وہاں وہ اپنی اصلی صورت میں ہوں گی) اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور اسلامی مفسر ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ آیت اشراف اور روسائے قریش کے ایک مختصر گروہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جن کی زندگی بہت شاہ خرچ اور خوشحال تھی۔ وہ صدر اول کے ثابت قدم عمار اور بلال جیسے مومنین کا تمسخر اڑاتے تھے کیونکہ وہ مادی لحاظ سے فقیر اور تہی دست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر پیغمبر کی کوئی شخصیت ہوتی اور وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے تو اشراف اور بڑے لوگ ان کی پیروی کرتے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں ان کی بے بنیاد باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

مذکورہ بالا شانِ نزول کے مطابق آیت قریش کے خود خواہ اور دنیا پرست اشراف کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ امر اس سے مانع نہیں کہ یہ گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کرتی ہے جو یہودیوں کے بارے میں تھی نیز یہ اس سے بھی مانع نہیں کہ یہ ایک کلیہ قاعدہ کے طور پر ہے اور ایک عمومی حکم جو سب کے لیے ہے بیان کرتی ہے۔ اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ کافروں کی نگاہ کا افق مادی دنیا کی چار دیواری سے بالاتر نہیں ہے اس لیے ان کے لیے مادی زندگی بہت دلپذیر، خوبصورت اور زیبا ہے اور یہی زندگی ان کے نزدیک تمام قدروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ایک مقیاس و میزان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پسماندہ، بیمار اور علیل فکر کے مطابق دولت و ثروت سے تہی افراد کی کوئی حیثیت و شخصیت نہ تھی لہٰذا وہ ان کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے۔ معنوی و انسانی اقدار اُن کی نظر میں ہیچ تھیں حالانکہ ان دو طرح کی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کی کوتاہ نظر ان بلندیوں اور زیبائشوں کو دیکھنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ ان کے جواب میں قرآن دو نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱۔ دوسرے جہان میں جہاں معنوی اور روحانی حقائق اور کمالات اپنی اصلی اور حقیقی صورت اختیار کرلیں گے وہاں مومنین ان سے بلند درجات پر فائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین کی تہہ میں چل رہے ہوں گے اور وہ آسمان کے اوپر ہوں گے

"والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ"

۲۔ علاوہ ازیں مادی فوائد سے لطف اندوز ہونا کسی کی منزلت کی نشانی اور ایمانی قدر و قیمت کی علامت نہیں ہے کیونکہ اس جہاں میں روزی کی تقسیم کفر و ایمان اور معنوی و انسانی اقدار کی بنیاد پر نہیں ہے۔

"واللہ یرزق من یشآء بغیر حساب"

آیت کے اس جملے میں ممکن ہے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان محرومیوں کی تلافی خداوند عالم یوں کرتا ہے کہ ان سے محروم افراد گناہ اور حرام سے آلودہ ہونے سے بچ جاتے ہیں یا پھر مخالفوں اور دشمنوں سے پُر ماحول میں بھی وہ ایمان لے آتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں آخرت کے گھر میں بے حساب رزق بخش جائے گا۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ زین (زینت دیا گیا) ــــ یہ لفظ فعل مجہول ہے، اس سے یہاں کیا مراد ہے اور اس کا فاعل کون ہے۔

کون ہے جو دنیاوی زندگی کو کافروں کی نگاہ میں زینت دیتا ہے۔ اس سوال کا جواب سورہ آل عمران کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے گا۔

۲۱۳۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

ترجمہ

۲۱۳ــــ (ابتداء میں) لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا (انسان کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گروہ اور طبقات پیدا ہوتے گئے) پھر ان میں اختلافات (اور تضادات) وجود میں آئے۔ خدا نے انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو بشارت دیں اور ڈرائیں نیز ان پر آسمانی کتاب بھی نازل کی جو انہیں حق کی

طرف دعوت دیتی تھی، یہ کتاب لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے تھی (ایمان والوں نے تو اس سے اختلاف نہیں کیا) صرف ایک گروہ نے حق سے انحراف اور ستمگری کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا جب کہ انہیں کتاب دی گئی تھی اور واضح نشانیاں ان تک پہنچ چکی تھیں۔ جو لوگ ایمان لاچکے تھے خدا نے اختلافی چیز میں اپنے حکم سے اُن کی رہبری کی (لیکن بے ایمان لوگ اسی طرح گمراہی اور اختلاف میں باقی رہے) اور خدا جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

ابتداء میں انسان کی زندگی اور معاشرہ سادہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب انسانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ منافع کا تضاد ابھرا اور اختلافات پیدا ہونے لگے۔ یہ مقام وہ تھا کہ راہنما اور قانون کی ضرورت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ خدا کے بھیجے ہوئے نمائندے لوگوں کو دوسرے جہاں کی زندگی کی طرف متوجہ کریں جو سیر تکامل اور سفر ارتقاء کا آخری مرحلہ ہے۔ ضروری تھا کہ وہ اُنہیں متنبہ کریں کہ موت کے بعد ایک اور جہان ہے جس میں لوگ اپنے کردار کی جزا و سزا سے دوچار ہوں گے۔ انبیاء کرام اس ذریعے سے اور ثواب کی بشارت اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرانے کے طریقے سے لوگوں کو احکام الٰہی کی طرف راغب کرتے تھے (فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین)۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسے صحیح قوانین کی ضرورت ہے جو اس کی سعادت کا سبب بنیں۔ اسی لیے خداوند عالم نے انبیاء کے پاس سعادت بخش قوانین بھیجے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کو ختم کریں۔ درحقیقت زیر نظر آیت ان مراحل کو بیان کرتی ہے جو انبیاء کی بعثت اور آسمانی احکام کے نزول پر منتہی ہوتے ہیں۔

پہلا مرحلہ: یہ مرحلہ ابتدائی سادہ زندگی پر مشتمل ہے جب انسان اجتماعی زندگی کا عادی نہ ہوا تھا اور فطرتاً تضاد اور تصادم وقوع پذیر نہ ہوتا تھا۔ قانون فطرت کے مطابق خدا کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے آسان و سادہ فرائض اُس کی بارگاہ میں انجام دیئے جاتے تھے۔

دوسرا مرحلہ: یہ وہ مرحلہ ہے جب انسانی زندگی اجتماعی شکل اختیار کرلیتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ انسان تکامل و ارتقاء کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس تکامل کے لیے اجتماعی و معاشرتی زندگی ناگزیر ہے۔

تیسرا مرحلہ: یہ تضاد و تصادم کا مرحلہ ہے اور معاشرتی زندگی میں اس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور نوع انسانی کے لیے انبیاء کے قوانین اور تعلیمات کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

چوتھا مرحلہ: اس مرحلے میں انبیاء خدا کی طرف سے نجات بشر کے لیے مامور کئے جاتے ہیں۔ افکار اور قلوب کو آمادہ کرنے کے لیے سب سے پہلے بشارت و نذارت کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے (یہ نیکو کاروں کو جزا کی بشارت دینے اور بدکاروں کو سزا سے ڈرانے کا پروگرام ہے) حب ذات اور خود پرستی کے زیر سایہ جب انسان نے بشارت

اور نذارت کا پروگرام تسلیم کرلیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ انبیاء کے پاس ایسی تعلیم ہے جو انسانی سرنوشت سے براہ راست مربوط ہے تو آسمانی کتب، احکام اور قوانین نازل ہونا شروع ہوئے تاکہ تضادات اور مختلف کشمکش (جو فکری، اجتماعی، اخلاقی اور نظریاتی بنیادوں پر تھیں) ختم ہو جائیں۔

" وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاءتھم البینات بغیا۔"

یہ جملہ دراصل تعلیمات انبیاء کے آغاز کے بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر انبیاء فکری، اجتماعی اور عقائد کے اختلافات کے حل کے لیے آتے ہیں تو ان کے آجانے کے بعد بھی کم و بیش اختلافات کیوں باقی رہتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ موجودہ اختلاف اور پہلے تضاد میں فرق ہے۔ پہلے اختلافات کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور بے خبری تھی اور یہ وجہ بعثت انبیاء سے ختم ہو گئی۔ لیکن بعد اذاں اختلافات کی بنیاد دیگر چیزیں مثلاً "بغی" یعنی ظلم و ستم، ہٹ دھرمی وغیرہ بن گئیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں نے اختلاف کی راہ پر اپنے سفر کو جاری رکھا ("من بعد ما جاءتھم البینات بغیا بینھم۔")

یہاں آکر لوگ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے:

مومنین ـــــ جو ہدایت اور حق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے اختلافات کو ختم کر دیا (فھدی اللہ الذین اٰمنوا ـــــ)۔ انہوں نے حکم خدا صراط مستقیم کو طے کر لیا۔ لیکن ـــــ

کفار ـــــ جوں کے توں اپنے اختلافات میں باقی ہیں۔

" واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔" یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی مشیت نیک اعمال اور لوگوں کی پاکیزگی کے مطابق ہے یعنی جو افراد حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں خدا بھی انہیں راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ انکی روشن فکری اور راہ ملاست کو پالینے کی توفیق میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں انبیاء کی وساطت سے راہ نجات اور راہ راست دکھاتا ہے۔

دین اور معاشرہ

مندرجہ بالا آیت سے ضمنی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ دین اور انسانی معاشرہ دو ایسی حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ کوئی معاشرہ مذہب اور قیامت پر ایمان رکھے بغیر صحیح زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایسے انسانی قوانین جن کا سرچشمہ ایمان نہیں وہ فقط ذاتی ذمہ داریوں کی نشاندہی تک محدود ہیں۔ وہ انسانی وجود پر گہرا اثر مرتب نہیں کرتے۔ ایسے قوانین اختلافات اور منافع کے تضاد کو ختم نہیں کر سکتے۔ ان آخری صدیوں کی آزمائشوں میں انسانی معاشروں میں یہی حقیقت اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے۔ ایمان سے بے بہرہ وہ دنیا جسے اصطلاح میں متمدن کہا جاتا ہے بہت سی

ایسی قباحتوں اور گناہوں کی مرتکب ہورہی ہے جو بھوڑا جت ایمان رکھنے والے گذشتہ پس ماندہ معاشروں میں دکھائی نہیں دیتے۔

زیر نظر آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حقیقی دین و مذہب کی پیدائش انسانی پیدائش کے ساتھ ساتھ نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے وجود کے ساتھ حقیقی دین و مذہب بھی وجود پذیر ہوا۔ اس بناء پر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ سب سے پہلے اولوالعزم اور صاحب دین و شریعت پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام۔

۲۱۴ - اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

ترجمہ

۲۱۴ ــ کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں جاؤ گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گذشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے (اور سب نے اس وقت اللہ سے مدد کا تقاضا کیا لیکن ان سے کہہ دیا گیا) آگاہ رہو کہ خدا کی مدد قریب ہی ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں جنگ احزاب میں جب مسلمانوں پر شدید خوف غالب آیا اور وہ محاصرے میں آگئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں انہیں صبر و استقامت کی دعوت دی گئی اور نصرت و مدد کا وعدہ کیا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمان شکست کھا گئے تو عبداللہ ابن ابی نے ان سے کہا کہ کب تک اپنے آپ کو قتل کرواتے رہو گے اگر محمدؐ پیغمبر ہوتا تو خدا اس کے اصحاب و انصار کو قید و بند اور قتل میں گرفتار نہ کرتا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

سخت حوادث خدائی سنت ہیں

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مومنین کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کا

حقیقی عامل اور سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا صرف اظہار کر دیا جائے اور اس کے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف، زحمت اور رنج والم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی کوششوں کے بغیر ہی خدا ان کے امور کو راہ پر ڈال دے گا اور ان کے دشمنوں کو نابود کر دے گا۔

اس غلط طرز فکر کے مقابلے میں قرآن حقیقی سنت اور خدا کی دائمی روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق تمام مومنین کو راہ ایمان میں پیش رفت کے لیے مشکلات اور تکالیف کا استقبال کرنا پڑے گا۔ اس راہ میں فداکاری کرنا پڑے گی۔ یہ مشکلات تو دراصل آزمائش اور امتحان ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی اور غیر حقیقی ایمان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ قرآن اس حقیقت کی بھی تصریح کرتا ہے کہ یہ آزمائشیں اور مشکلات عمومی قوانین کے تحت ہیں اسی بناء پر گزشتہ امتیں بھی ان سے دوچار ہوئیں۔

مثلاً فرعونیوں کے استعمار سے نجات کے لیے بنی اسرائیل کو خاص طور پر مصر سے نکلنا پڑا۔ وہ دریا اور لشکر فرعون کے درمیان گھر گئے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات اور مصائب میں گرفتار ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے تو اپنے ہاتھ پاؤں گنوا بیٹھے۔ لیکن سخت لمحات میں خدا کا لطف اُن کے شامل حال ہوا انہیں دشمنوں پر کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ بات بنی اسرائیل سے مخصوص نہ تھی مندرجہ بالا آیت میں الذین خلوا من قبلکم (وہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں) کے الفاظ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو سب کی سرنوشت ایک جیسی تھی۔ گویا یہ ایک سنت الٰہی ہے جو تکامل، ارتقاء اور تربیت کی ایک رمز ہے۔ تمام امتوں کو حوادث کی سخت بھٹیوں میں ڈالا جانا چاہیئے، انہیں پگھل کر فولاد کی طرح بھٹی سے باہر آنا چاہیئے اور پھر زیادہ اہم اور سخت تر حوادث سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیئے تاکہ زیادہ قابل افراد پہچانے جاسکیں اور نااہل لوگ الگ ہو جائیں اس طرح تصفیہ و تطہیر ہو جائے۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دی جانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آیت کے مطابق گذشتہ امتوں کو شدائد اور مشکلات اس طرح گھیر لیتی تھیں کہ اہل ایمان اور انبیاء ہم صدا ہو کر کہتے تھے: خدا کی مدد کہاں ہے؟ واضح ہے کہ ان کی مراد بارگاہ قدرت پر اعتراض کرنا نہ تھی بلکہ یہ تعبیر خود ایک قسم کی دعا اور تقاضا ہے۔

۲۱۵۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۗ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۱۵۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ ہر خیر و نیکی (اور فائدہ بخش مادی و معنوی سرمایہ) جو

تم خرچ کرتے ہو وہ ماں باپ، قریبیوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیئے اور جو کارِ خیر بھی تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے (اور ضروری نہیں کہ اسے ظاہر کرتے پھرو اور اسے یا اُسے بتاتے پھرو)۔

شانِ نزول

عمرو بن جموح ایک بوڑھا رئیس اور دولت مند تھا۔ اس نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں عرض کی کہ کس چیز سے اور کس کس کو صدقہ دوں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید میں بہت سی آیات راہِ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہیں۔ پروردگارِ عالم مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو خرچ کرنے اور محتاج و بے نوا لوگوں کی مدد کرنے کا شوق دلاتا ہے لیکن محل بحث آیت کی وضع کچھ اور ہی ہے۔ بعض افراد چاہتے تھے کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کس قسم کا مال خرچ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔

جواب میں اس سوال کی وضاحت کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ ہے مواقع اور اشخاص جن پر خرچ کرنا چاہیئے۔ آیت کی شانِ نزول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مسئلے (کیا کچھ خرچ کریں اور کن کن پر خرچ کریں) محل سوال تھے۔

پہلے معاملے کے ذیل میں خرچ کرنے کے لیے "خیر" کا لفظ استعمال کرکے سوال کا ایک کامل، جامع اور وسیع جواب دیا گیا ہے۔ یعنی ہر قسم کا کام، سرمایہ اور موضوع جو خیر ہو اور لوگوں کے لیے سود مند ہو، خرچ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں ہر طرح کا مادی و معنوی سرمایہ شامل ہے۔

سوال کے دوسرے رُخ کے ضمن میں یعنی کن کن پر خرچ کیا جائے فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نزدیکی رشتے داروں پر اور اُن سے بھی پہلے ماں باپ پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد یتیم، مساکین اور ابنائے سبیل (وہ مسافر جو دورانِ سفر میں اپنا زادِ راہ خرچ کر بیٹھے ہوں) پر خرچ کیا جائے۔ واضح ہے کہ نزدیکی رشتے داروں پر خرچ کرنا دیگر آثار کے علاوہ صلۂ رحمی اور رشتے ناتوں کے استحکام کا بھی باعث بنتا ہے۔

"وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم"

یہ جملہ گویا اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ خرچ کرنے والے اس بات پر اصرار نہ کریں کہ لوگ ان کا کام جان لیں۔ کیا ہی عمدہ ہے کہ زیادہ خلوص کی بنا پر اپنی عنایات اور عطیات کو پنہاں رکھیں کیونکہ وہ ذات جو بدلہ اور ثواب دے گی ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں جزا ہے اور اسی کے پاس سب کا حساب ہے۔

۲۱۶۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن
تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا

شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱۶۔ راہ خدا میں جہاد کرنا تم پر فرض کیا جا چکا ہے جب کہ تم اس سے اکراہ کرتے ہو اور اسے ناپسند کرتے ہو جب کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم جسے پسند کرتے ہو اس میں تمہاری بُرائی ہوتی ہے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر

گذشتہ آیت انفاق اور خرچ کے بارے میں تھی اور یہ آیت خون اور جان کی قربانی پیش کرنے کے بارے میں ہے فداکاری کے میدان میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں۔

آیت بیان کرتی ہے کہ دشمن سے جنگ کرنا تمہارے لیے حکماً ضروری ہے۔ اس عمل کا بجالانا تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے اور واجب قرار دے دیا گیا ہے لیکن انسان کو فطری طور پر سختی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے اور وہ شدائد اور مشکلات کو پسند نہیں کرتا۔ اُس کی رغبت خوشی اور راحت و آرام کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم یہ جملہ اسی انسانی مزاج کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دشمن سے جنگ اور نبرد آزمائی کا نتیجہ موت، جسمانی تکلیف اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ جنگ بدامنی اور بے آرامی کا باعث بنتی ہے اس لیے اصولی طور پر انسان کی نظر میں یہ سخت اور ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ہمیشہ کچھ ایسے فداکار موجود ہوتے ہیں جو مقدس مقاصد کیلئے کسی قسم کی جان کی بازی سے دریغ نہیں کرتے لیکن اکثر لوگ مذکورہ وجوہات کی بنا پر جہاد کو پسند نہیں کرتے پروردگار عالم قطعی لب و لہجہ میں اس طرز فکر کی مذمت کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اُن کے سامنے ایک دریچہ نہاں کھولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کاموں کے مصالح سے باخبر نہیں ہو۔ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ تمہاری پسندیدہ چیز کے پیچھے شر اور تمہاری ناپسندیدہ چیز کے پیچھے خیر نہیں ہے۔ خدا ہی اسرار مخفی سے آشنا ہے۔ البتہ مسلّم ہے کہ متقی اور زیرک لوگ (نہ کہ سطحی نظر رکھنے والے) ان احکام کے بعض اسرار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت خدا کے تکوینی اور تشریعی قوانین کی ایک بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان قوانین کے پیش نظر یہ آیت انسان میں انضباط اور تسلیم کی روح کی پرورش کرتی ہے۔ آیت کے مطابق انہیں یہ نہیں چاہیئے کہ انسان اپنی تشخیص و دریافت کا دارومدار قضاوت اور فیصلے پر رکھے۔ یہ مسلّم ہے کہ انسان کا علم ہر لحاظ سے محدود اور ناچیز ہے۔ انسانی مجہولات کے مقابلے میں انسانی علم دریا کے سامنے قطرے کی طرح ہے۔ اس لیے وہ قوانین جن کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور جو ہر لحاظ سے لامتناہی ہے انسان کو اس سے کبھی روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ انسان کو جان لینا چاہیئے کہ یہ تمام قوانین اُس کے فائدے اور منفعت کے لیے ہیں چاہے وہ تشریعی قوانین و احکام ہوں جیسے جہاد اور زکوٰۃ وغیرہا یا تکوینی ہوں جو بلا اختیار زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور ان سے بچنا ممکن نہیں جیسے موت، دوستوں اور عزیزوں کی مصیبت یا آئندہ کے اسرار کا انسان سے مخفی ہونا وغیرہ۔

۲۱۷۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ
فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ
مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ
دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ
فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○
۲۱۸ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۱۷ ـــ ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں تم سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہیئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا
(گناہ) ہے۔ لیکن راہ خدا اور دین حق سے لوگوں کو روکنا ۔ اللہ سے کفر اختیار کرنا ۔ مسجد الحرام کی بے حرمتی
کرنا اور اس میں رہنے والوں کو نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کے برا ہے اور فتنہ برپا کرنا (اور
ایسے ناساعد حالات پیدا کرنا جو لوگوں کو کفر کی طرف راغب کریں اور ایمان سے روکیں) قتل سے بدتر ہے
مشرکین تم سے ہمیشہ لڑتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بس میں ہو تو تمہیں دین سے برگشتہ کردیں لیکن جو
شخص دین سے پھر جائے اور حالت کفر میں مرجائے اس کے (گذشتہ) تمام نیک اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو
جائیں گے اور یہی اہل دوزخ ہیں اور اس میں سدا رہیں گے ۔

۲۱۸ ـــ جو ایمان لے آئے ہیں ، جنہوں نے ہجرت کی ہے اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے وہی رحمت خداوندی
کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا مہربان ہے ۔

شانِ نزول

کہتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن جحش کے سریۂ[1] کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:
جنگ بدر سے پہلے پیغمبر اسلام نے عبداللہ بن جحش کو بلایا۔ اُسے ایک خط دیا اور مہاجرین میں سے آٹھ آدمی اس کے ساتھ کئے۔ اُسے حکم دیا کہ دو دن راستہ چلنے کے بعد خط کو کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ اس نے دو دن کے سفر کے بعد خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

جب خط کھولو تو نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ) تک آگے جانا۔ وہاں قریش کے حالات پر نظر رکھنا اور جو کچھ صورتِ حال ہو ہمیں اس کی اطلاع دینا۔

عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے واقعہ بیان کیا اور مزید کہا کہ پیغمبرؐ نے راہ پر چلنے کے لیے تمہیں مجبور کرنے سے منع کیا ہے اس لیے جو شہادت کے لیے تیار ہے وہ میرے ساتھ آئے۔ دوسرے لوگ واپس چلے جائیں۔ سب اس کے ساتھ چل پڑے جب وہ نخلہ پہنچے تو قریش کے ایک قافلے کا سامنا ہوا۔ اس میں عمرو بن حضرمی بھی تھا۔ ماہ رجب (جو ماہِ حرام ہے) کا چونکہ آخری دن تھا اس لیے اُن پر حملہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

بعض کہنے لگے کہ اگر آج ہم اُن سے دستبردار رہے تو وہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور پھر ہم اُن سے تعرض نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر انہوں نے اُن پر بڑی بہادری سے حملہ کر دیا۔ عمرو بن حضرمی کو قتل کیا اور قافلہ دو قیدیوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے تمہیں یہ حکم تو نہیں دیا تھا کہ حرام مہینوں میں جنگ کرو۔ آپؐ نے مالِ غنیمت اور قیدیوں میں کوئی تصرف نہ کیا۔ مجاہدین کو بڑا رنج ہوا۔ دیگر مسلمانوں نے بھی انہیں سرزنش کی۔ مشرکوں نے بھی زبانِ طعن کھولی اور کہنے لگے کہ محمدؐ نے حرام مہینوں میں جنگ، خون ریزی اور قید و بند کو حلال شمار کیا ہے۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہو چکی تو عبداللہ بن جحش اور اس کے ساتھیوں نے یہ اظہار کیا کہ انہوں نے اس راستے میں جہاد کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا کیا انہیں مجاہدین کا اجر ملے گا، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔ ("ان الذین اٰمنوا والذین ھاجروا ....") [2]

تفسیر

جیسا کہ شانِ نزول سے ظاہر ہے یہ آیت حرام مہینوں میں جہاد کے بارے میں سوالات کا جواب ہے۔ قرآن صراحت سے حرام مہینوں میں حرمتِ جنگ کی خبر دیتا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ شمار کرتا ہے ("قتال فیہ کبیر")

---

[1] سریہ اسلامی جنگ کرنے والے اس گروہ کو کہتے ہیں جس میں خود پیغمبرؐ شریک نہ ہوں۔ بعض کے نزدیک پانچ سے تین سو افراد تک کے لشکر کو سریہ کہتے ہیں۔
توجہ رہے کہ سریہ "سری" سے ہے جس کا معنی ہے نفیس اور گراں بہا چیز۔ چونکہ جس لشکر کے ذمے یہ امر ہو وہ خصوصی اور منتخب ہوتا ہے لہٰذا اُسے یہ نام دیا گیا ہے۔
منجد کہتا ہے "سریہ" "سری" سے ہے اور اس کا معنی ہے رات کو چلنا۔ ایسے لشکر جو کہ غارت کرتے تھے اسے اس لیے سریہ کہتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اس بات کو قبول کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "سریہ" اُس دستے کو کہتے ہیں جو رات کے وقت روانہ ہو۔

[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۲۵۲۔

لیکن قرآن تاکید کرتا ہے کہ وہ مسلمان دستہ جس نے اشتباہ سے حرام مہینے میں جنگ کی پر اعتراض کا حق اُن مشرکین کو نہیں پہنچتا جو ایسے بڑے بڑے گناہ جان سے کر رہے ہیں جیسے خدا سے کفر کرنا، راہِ راست کی ہدایت سے لوگوں کو روکنا، مکہ میں ٹھہرے ہوئے اور سکونت پذیر افراد کو وہاں سے نکال دینا اور خدا کے حرم امن کے احترام کو پاؤں تلے روندنا جب کہ وہاں حیوانات اور گھاس تک کو محفوظ رہنا چاہیئے.

علاوہ ازیں مشرکین فتنہ برپا کرتے ہیں یعنی فاسد ماحول پیدا کرنے کے درپے ہیں جس میں کفر اور بت پرستی کی آمیزش ہے وہ حقیقت کے متلاشی لوگوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دین توحید کی طرف راغب ہونے سے روکنے کا گناہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بڑھ کر ہے ("والفتنۃ اکبر من القتل")

اس کے بعد قرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلمانوں کو مشرکوں کے پراپیگنڈا سے بچانے کے لیے قرآن انہیں متنبہ کرتا ہے کہ مشرک تو ہمیشہ اس کے درپے ہیں کہ اگر ہو سکے تو تمہیں دینِ اسلام سے پھیر لے جائیں۔ اس سلسلے میں پیشبندی کے طور پر قرآن الارم دیتا ہے کہ جو مسلمان دینِ حق سے پھر گیا اور حالتِ کفر میں جا مرا، کفر کے سبب اُس کے تمام نیک اعمال کا اجر اس جہان میں اور اُس جہان میں باطل ہو جائے گا۔ کفر ان اعمال کو ختم کر دے گا اور انکی خاصیت کو بدل دے گا۔ اس بنا پر ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذابِ الٰہی میں مبتلا رہے گا۔

یہ آیت اِس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ ممکن ہے بعض مجاہدین راہِ خدا مطلع نہ ہونے کی بنا پر یا کافی احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہات کے مرتکب ہوں۔ عبداللہ بن جحش کا واقعہ اس کی نظیر ہے لیکن خدا اُن کی بڑی خدمات اور صحیح مجاہدات کی بنا پر انہیں بخش دے گا ("واللہ غفور رحیم")

حبط، احباط اور تکفیر

۱۔ حبط — کا معنی ہے عمل باطل اور بے اثر ہو جانا جیسا کہ قرآن میں کہا ہے۔

"وحبط ما صنعوا فیہا و باطل ما کانوا یعملون"*

* انہوں نے جو کچھ تیار کر رکھا تھا وہ باطل اور بے اثر رہ گیا۔ (ہود — ۱۶)

۲۔ احباط — جیسا کہ متکلمین اور علماءِ عقائد نے کہا ہے، اس کا معنی ہے گذشتہ اعمال کا ثواب بعد کے گناہوں کی وجہ سے جاتا رہنا۔

۳۔ تکفیر — اس کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں کی سزا نیک اعمال کے اثر سے ختم ہو جاتی ہے

کیا حبط صحیح ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر و ارتداد حبطِ عمل کا سبب ہیں۔ قرآن کی دیگر آیات اور محلِ بحث آیت بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص حالتِ کفر میں دنیا سے چل بسے تو اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کا گناہ اتنا زیادہ ہے کہ گذشتہ تمام تر ثواب سے بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح اگر ایمان گناہوں کے بعد ہو اور آخر عمر تک باقی رہے تو گذشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے لیکن بحث اس بات پر ہے کہ وہ صاحب ایمان افراد جنہوں نے گناہ بھی کئے ہیں اور حکم خدا کی اطاعت بھی کی ہے اور بغیر توبہ کئے دنیا سے چلے گئے ہیں اُن کے بُرے اعمال اُن کے نیک اعمال کے ثواب کو ختم کر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس ضمن میں متکلمین اور علمائے عقائد کے درمیان اختلاف ہے۔

کچھ کہتے ہیں کہ احباط باطل ہے۔ اپنے اس نظریے پر علماء عقلی اور نقلی دونوں قسم کی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں

عقلی استدلال

جیسا کہ خواجہ نصیرالدین طوسی نے کتاب تجرید العقائد میں کہا ہے کہ احباط ظلم کی ایک قسم ہے کیونکہ کسی انسان کے پاس ثواب کم ہے اور گناہ زیادہ تو احباط کے بعد اس شخص کی طرح ہو جائے گا جس نے بالکل نیک کام نہ کیا ہو اور یہ اس کے لیے ایک قسم کا ظلم شمار ہوگا۔

نقلی استدلال

قرآن مجید کی بہت سی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ انسان اس جہان میں اپنے ہر نیک و بد عمل کا نتیجہ دیکھے گا۔ جب کہ مسئلہ احباط اس سے مختلف صورت پیش کرتا ہے۔ سورہ زلزال میں آیا ہے۔

"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" سورۃ زلزال

"یعنی جو شخص جتنی مقدار نیکی یا بدی کی کرے گا اسے دیکھے گا"

دوسرا گروہ معتزلہ کا ہے۔ یہ لوگ احباط کے قائل ہیں۔ انہوں نے آیات قرآن سے استدلال کیا ہے۔ سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے۔

"ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جہنم خالدین فیہا ابدا۔"

"جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں معذب ہوگا۔"

ابوہاشم معتزلی نے احباط و تکفیر کو ملا کر موازنہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک گناہ اور ثواب کو ملا کر دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے کم کو تفریق کرے باقی مقدار دیکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں کچھ اور نظریات بھی ہیں جن سے یہاں بحث نہیں ہو سکتی لیکن حق وہی ہے جسے علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اختیار کیا ہے۔ علامہ مجلسی کہتے ہیں۔

ثواب کا سقوط اس کفر کے ذریعے جو آخر عمر تک باقی رہے اور اس طرح سزا کا سقوط اس ایمان کے وسیلے سے جو موت تک ساتھ دے قابل انکار نہیں ہے۔ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بہت سے ایسے گناہ ہیں جن سے بہت سی اطاعتیں جاتی رہتی ہیں اور بہت سی اطاعتیں ایسی ہیں جو بہت سی برائیوں کو تلف کر دیتی ہیں اور اس سلسلے میں متواتر اخبار و احادیث ہیں[1]

توجہ رہے کہ سورۂ ہود کی آیت ۱۱۴ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ وہاں نماز کا حکم دینے کے بعد ایک قانون

[1] بحار، جلد ۵ جدید، ص ۳۳۲، ۳۳۲۔

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ
"ان الحسنات یذھبن السیئات"
"نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں"

سورہ حجرات میں آیا ہے
"ولا تجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم ...."

جیسے ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو پیغمبر کو اس طرح سے آواز نہ دو ورنہ تمہارے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ (حجرات - ۲)

پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے ابوذر سے فرمایا۔
"اتق اللہ حیث کنت وخالق الناس بخلق حسن واذا عملت سیئۃ فاعمل حسنۃ تمحوھا۔"

جہاں کہیں اور جس حال میں ہو خدا سے ڈرو اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ اور جب کبھی کوئی برا کام انجام دے بیٹھو تو بعد از ان کوئی اچھا کام بجا لاؤ جو اُسے محو کر دے۔[1]

نیک اعمال برے اعمال کے ذریعے نابود ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں بھی پیشوائے اسلام سے روایات منقول ہیں مثلاً "ایاکم والحسد فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب"[2]

حسد سے دور رہو کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

لیکن یہ تمام گناہوں اور اطاعتوں کے بارے میں کوئی قانون کلی نہیں صرف ان میں سے بعض سے مخصوص ہے اس طرح سے تمام آیات اور روایات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۲۱۹۔ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۱۹۔ تم سے شراب اور قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے (مادی نکتہ سے) لوگوں کے لیے ان میں منافع (بھی) ہیں (لیکن) ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے

[1] بحار، جلد ۷۱، ص ۲۴۲ [2] بحار، جلد ۷۳، ص ۲۵۵

اور تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ کہہ دو کہ تمہاری ضرورت سے جو زیادہ ہو۔ اس طرح خدا تمہارے لیئے آیات کو واضح کرتا ہے شاید تم فکر کرو۔

شانِ نزول

اصحاب کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کرنے لگا کہ شراب اور قمار کے بارے میں حکم بیان فرمائیے کیونکہ یہ عقل کو زائل اور مال کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

خمر کا معنی ہے "ڈھکنا"۔ ہر وہ چیز جو دوسری کو چھپا دے اور مخفی کر دے اسے خمار کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں ہر بہنے والی مسکر (مست کرنے والی) چیز کو خمر کہتے ہیں، چاہے وہ انگور سے لی جائے یا کشمش اور کھجور سے۔ بلکہ ہر قسم کا الکحل مشروب اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ البتہ لفظ خمر کا استعمال مائعات مسکر (یعنی بہنے والی نشہ آور چیزوں) پر اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ نشہ آور مائعات عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اچھے بُرے کی تمیز ختم کر دیتی ہیں۔

"میسر" کا مادہ ہے "یسر" اس کا معنی ہے سہل و آسان اور قمار بازی بظاہر لگتا ہے کہ اس کا حقیقی معنی سہل اور آسان ہی ہے اور چونکہ قمار باز شخص چاہتا ہے کہ مال و ثروت آسانی سے حاصل کرے اس بناء پر قمار کو بھی میسر کہا جاتا ہے

"قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من ......"

خداوند کریم نے آیت کے اس حصے میں حرمت شراب کے حکم کو نرمی اور مدارات کی آمیزش سے بیان فرمایا ہے۔ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہو یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے منفعت بھی ہے لیکن ان کا فائدہ ان کے نقصان کی نسبت بہت ہی کم ہے اور کوئی عقلمند شخص تھوڑے سے نفع کے لیے اتنا بڑا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کر سکتا ہے۔

اثم کیا ہے

"اثم" اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کی عقل اور روح میں وجود پذیر ہوتی ہے اور اُسے نیکیوں اور کمالات تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ اس نکتے کے پیش نظر آیت کا معنی کچھ یوں بنتا ہے کہ شراب اور قمار کی بدولت انسانی جسم اور روح بہت زیادہ نقصانات اور ضرر کا سامنا کرتے ہیں۔

ان دونوں برائیوں کے نقصانات کی طرف مزید توجہ دلانے کے لیے ہم علماء نفسیات اور ڈاکٹروں کی تازہ ترین تحقیق قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

الکحل کے مشروبات کے نقصانات

الکحل کا انسانی عمر پر اثر: مغرب کے ایک مشہور اسکالر کا نظریہ ہے کہ ۲۱ سے ۲۳ سالہ نوجوانوں میں شراب کے عادی ۵۱

مرنے والوں کے مقابلے میں شراب نہ پینے والوں میں سے دس افراد بھی نہیں مرتے۔

ایک اور مشہور اسکالر نے ثابت کیا ہے کہ بیس سالہ نوجوان جن کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ وہ پچاس سال تک زندہ رہیں گے شراب پینے کی وجہ سے ۳۵ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

بیمہ کمپنیوں کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ شرابیوں کی عمر دوسروں کی نسبت ۲۵ سے ۳۰ فیصد کم ہوتی ہے۔

شماریات کے ایک ادارے کے مطابق شرابیوں کی اوسط عمر ۳۵ سے ۵۰ سال ہے جبکہ اصول صحت کے تحت یہ اوسط ۶۰ سال سے زیادہ ہے۔

نسل انسانی میں شراب کا اثر: انعقادِ نطفہ کے وقت مرد نشے میں ہو تو الکوحل (ALCOALISM) کی ۳۵ بیماریاں بچے کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ عورت اور مرد دونوں نشے میں ہوں تو الکوحل (ALCOALISM) کی سو فیصد بیماریاں بچے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی بناء پر ضروری ہے کہ اولاد کے بارے میں شراب کے اثرات پر زیادہ توجہ دی جائے۔

ہم یہاں کچھ مزید اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

طبیعی وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں ۴۵ فیصد ماں باپ دونوں کی شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں

۳۰ فیصد باپ کی شراب نوشی کے باعث ہوتے ہیں۔

پیدائش کے وقت زندگی کی توانائی سے عاری سو بچوں میں ۶ شرابی باپ کی وجہ سے اور ۴۵ شرابی ماں کی وجہ سے اس طرح ہوتے ہیں۔

شرابی ماں کی وجہ سے ۳۰ فیصد اور شرابی باپ کی وجہ سے ۴۵ فیصد بچے کوتاہ قد پیدا ہوتے ہیں۔

شرابی ماؤں کی وجہ سے ۷۵ فیصد اور شرابی باپوں کی وجہ سے بھی ۷۵ فیصد بچے کافی عقلی اور روحانی توانائی سے محروم ہوتے ہیں۔

اخلاق پر شراب کے اثرات: شرابی شخص گھر والوں سے ہمدردی اور محبت کے جذبے سے عاری ہوتا ہے بیوی اور اولاد سے شرابی کی محبت کمزور ہوتی ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ شرابی باپ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں۔

شراب کے اجتماعی نقصانات: ایک انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کے مہیا کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۱ میں نیوان شہر کے شرابیوں کے اجتماعی جرائم کچھ اس طرح ہیں۔

عام قتل	۵۰ فیصد
مار پیٹ اور زخمی کرنے کے جرائم	۷۷.۸ فیصد
جنسی جرائم	۸۸.۸ فیصد

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے جرائم زیادہ تر حالتِ نشہ میں انجام پاتے ہیں۔

شراب کے اقتصادی نقصانات: روحی امراض کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے:

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومتیں شراب کے مالیاتی فوائد اور منافع کا حساب تو کرتی ہیں لیکن ان

اخراجات کو نظر میں نہیں رکھتیں جو شراب کے بُرے اثرات کی روک تھام پر اٹھتے ہیں۔

روحانی بیماریوں کی زیادتی۔ تنزل پذیر معاشرے کے نقصانات۔ قیمتی اوقات کا ضیاع۔ حالتِ نشہ میں ڈرائیونگ کے حادثات۔ پاک نسلوں کی تباہی۔ سستی۔ بے راہ روی۔ ثقافت و تمدن کی پسماندگی پولیس کی زحمتیں اور پکڑ دھکڑ۔ شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال۔ شراب سے متعلقہ جرائم کے لیے عدالتوں کی مصروفیات۔ شرابیوں کے لیے قید خانے اور شراب نوشی سے ہونے والے دیگر نقصانات کو جمع کیا جائے تو حکومتوں کو معلوم ہوگا کہ وہ آمدنی جو شراب سے ہوتی ہے ان نقصانات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

علاوہ ازیں شراب نوشی کے افسوسناک نتائج کا موازنہ صرف مال ودولت سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ فرزندوں کی موت۔ گھروں کی تباہی۔ تعلقات کی بربادی اور صاحبانِ فکر انسانوں کی دماغی صلاحیتوں کا نقصان۔ یہ سب کچھ پیسے کے مدمقابل نہیں رکھے جاسکتے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عالم کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ میخانوں کا آدھا دروازہ بند کردیں گی تو یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہوجائیں گے۔

جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے محل بحث آیت کا معنی اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے شراب کی تجارت میں نوع البشر کے لیے کوئی فائدہ ہو یا فرض کریں تو چند لمحوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غموں سے بے خبر ہوجاتا ہے تب بھی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت وسیع اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے فائدے اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

قمار بازی کے بُرے اثرات

ایسے افراد بہت کم ملیں گے جو قمار بازی کے زبردست نقصانات سے بے خبر ہوں۔ وضاحت کے لیے اس منحوس کاروبار اور گھروں کی بربادی کے باعث کام کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قمار بازی ہیجان انگیزی کا بہت بڑا ذریعہ ہے: تمام علماء نفسیات کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی ہیجانات اور اضطراب بہت سی بیماریوں کا باعث ہیں مثلاً وٹامن کی کمی۔ زخم معدہ، جنون و دیوانگی، کم و بیش اعصابی و روحانی بیماریاں وغیرہ۔

یہ بیماریاں زیادہ تر ہیجان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قمار بازی ہیجان کا سب سے بڑا عامل ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کا ایک اسکالر کہتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال دو ہزار افراد صرف قمار بازی کے ہیجان سے مر جاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لالواد وسطاً ایک پوکر[1] باز کا دل اوسطاً ایک منٹ میں سو سے زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی قمار بازی سے دل و دماغ پر سکتہ بھی طاری ہوجاتا ہے۔ قمار بازی یقینی طور پر جلد بڑھاپا لانے کا باعث بنتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کے بقول جو شخص قمار بازی میں مشغول ہے اس کا دل ہی تشنج کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اعضائے جسم سخت حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ شوگر کا مواد اس کے خون میں

---

[1] پوکر۔ یہ قمار بازی کی ایک قسم ہے

کرتا ہے، داخلی غدودوں میں خلل واقع ہوتا، چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ قمار بازی کے ختم ہونے پر جب جوا باز سوتا ہے تو اس کے اندر اعصابی جنگ جاری ہوتی ہے اور جسم پر بحران کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جواری اکثر اوقات اعصاب کی تسکین اور بدن کے آرام کے لیے شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا سہارا لیتا ہے اس طرح شراب اور قمار بازی کے نقصانات جمع ہو کر فزوں تر ہو جاتے ہیں۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ قمار باز ایک بیمار شخص ہے۔ یہ ہمیشہ روح کی نگرانی کا محتاج ہے۔ اسے ہمیشہ سمجھانا چاہیئے اور نفسیاتی ذریعوں سے اسے قمار بازی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے شاید اس طرح وہ اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو سکے۔

قمار بازی کا جرائم سے تعلق: عالمی اعداد و شمار کے ایک بہت بڑے ادارے نے ثابت کیا ہے کہ ۳۰ فیصد جرائم کا تعلق قمار بازی سے ہے اور ۷۰ فیصد دیگر جرائم کے عوامل میں بھی یہ حصہ دار ہے۔

قمار بازی کے اقتصادی نقصانات: ایک سال میں کئی ملین بلکہ کئی ارب ڈالر کی دولت دنیا میں اس راستے سے برباد ہوتی ہے۔ انسانی توانائیوں کا اس راستے میں ضیاع اس پر مستزاد ہے بلکہ یہ عمل تو دوسری معروفیات میں سے بھی تگ و دو اور دلچسپی چھین لیتا ہے۔

مونٹ کارلو جو دنیا میں قمار بازی کا مشہور مرکز ہے کے بارے میں اخبارات میں چھپا ہے کہ ایک شخص نے ۱۹ گھنٹے میں قمار بازی میں ۵۰ لاکھ تومان[1] ہارے۔ جب قمار خانے کے دروازے بند ہوئے تو وہ سیدھا جنگل کی طرف گیا اور ایک ہی گولی سے اپنا دماغ پاش پاش کر لیا۔ اس طرح اس نے خودکشی کر لی۔ نامہ نگار مزید لکھتا ہے کہ

"مونٹ کارلو کے جنگل ان پاکبازوں کی کئی خودکشیوں کے شاہد ہیں۔"

قمار بازی کے اجتماعی نقصانات: بہت سے جوا باز جیت بھی جاتے ہیں بعض اوقات ایک ہی گھنٹے میں دوسروں کے ہزاروں روپے ان کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ نتیجتاً وہ کوئی پیداواری اور اقتصادی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اسطرح اجتماعی پیداوار اور اقتصادی حالت لنگڑی ہو جاتی ہے۔ صحیح غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ قمار باز اور ان کے اہل و عیال معاشرے پر بوجھ ہیں، وہ معاشرے کو ذرہ بھر فائدہ پہنچائے بغیر اس کی کمائی کھاتے ہیں اور کبھی ہارنے کی صورت میں جواری چوری اور ڈاکہ زنی سے اپنی ہار کی تلافی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قمار بازی کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ بعض غیر مسلمان ملکوں کو بھی اسے قانوناً ممنوع قرار دینا پڑا اگرچہ وہاں بھی عملاً وسیع پیمانے پر جوا بازی کا کاروبار جاری ہے۔

مثلاً برطانیہ نے ۱۸۵۳ میں، امریکہ نے ۱۸۵۵ میں، روس نے ۱۸۵۴ میں اور جرمنی نے ۱۸۷۳ میں قمار بازی کے ممنوع ہونے کا اعلان کیا۔

اس بحث کے آخر میں بعض محققین کے پیش کردہ ذیل کے اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

(۱) جیب تراشی کی وارداتیں	:	۹۰ فیصد
(۲) اخلاقی جرائم	:	۱۰ فیصد

---

[1] تومان ایرانی کرنسی ہے (مترجم)

(۳) دنگا فساد کے واقعات : ۴۰ فیصد
(۴) جنسی جرائم : ۱۵ فیصد
(۵) طلاقیں : ۳۰ فیصد
اور (۶) خودکشی کے واقعات : ۵ فیصد ــــ قماربازی ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

قماربازی کی جامع تعریف کرنا چاہیں تو یوں ہوگی:

- دوسروں کے مال پر دھوکا، فریب اور جھوٹ سے قبضے کے لیئے
- تفریح کے نام پر
- اور کبھی بلا مقصد
- مال، عزت اور آبرو کی قربانی۔

یہاں تک تو ہم نے شراب اور قماربازی کے ناقابل تلافی نقصانات بیان کیے ہیں اب ایک اور نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم نے شراب پر سرزنش کیوں رکھی ہے اور اس کے ذکر کے وقت اس کے فوائد نقصانات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ زمانہ جاہلیت میں (بلکہ زمانے کی طرح) شراب اور قماربازی بہت عام تھی اور اگر اس طرف اشارہ نہ ہوتا تو ہوسکتا ہے بعض کوتاہ نظر یہ تصور کرتے کہ مسئلے کے ایک ہی پہلو کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔

علاوہ ازیں انسانی افکار ہمیشہ سود و زیاں کے محور کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں لہٰذا عظیم اخلاقی برائیوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیئے بھی اس انسانی منطق سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ضمناً محل بحث آیت ان ڈاکٹروں کے موقف کا جواب بھی ہے جو شراب کو بعض بیماریوں کے لیے مفید سمجھتے ہیں کیونکہ اس قسم کے اجتماعی فوائد کا اس کے نقصانات سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ ایک بیماری کے لیئے مثبت اثر ہو بھی تو بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ بھی ہوسکتی ہے۔ نیز روایات میں یہ جو آیا ہے کہ:

"خدا تعالیٰ نے شراب میں شفا نہیں رکھی"

شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔ "ویسئلونک ماذا ینفقون ......"

تفسیر درمنثور میں آیت کے اس حصے کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ دین حق کی ترقی کے لیئے خرچ کرو تو بعض اصحاب و انصارِ پیغمبرؐ نے آپؐ سے پوچھا کہ ہم نہیں جانتے کہ اپنے مال میں سے کتنی مقدار خرچ کریں۔ کیا سارے کا سارا مال خرچ کریں یا اس کا کچھ حصہ۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں "عفو" کا حکم دیا گیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ عفو سے یہاں کیا مراد ہے۔

"عفو" سے کیا مراد ہے

"عفو" کے لغت میں کئی معانی بیان کیئے گئے ہیں۔

______ "بخشش و عنایت"

______ "اثر زائل کرنا"

______ "کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ کرنا"

______ "ہر چیز کا وسط اور درمیان"

______ "کسی چیز کی اضافی مقدار"

اور ______ "مال کا بہترین حصّہ" یہ سب عفو کے مختلف معانی ہیں۔

تین پہلے معانی ظاہراً آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتے بلکہ آخری تین معانی میں سے یہاں کوئی اس کا مفہوم ہے یعنی خرچ کرنے میں حد وسط اور اعتدال کا خیال رکھنا، یا اپنی ضروریات سے اضافی مقدار خرچ کرنا (یہ دونوں معانی ایک ہی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کیونکہ اعتدال کو ملحوظ رکھنے کا معنی یہی ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال خرچ کیا جائے لہٰذا اپنی زندگی کو تباہ نہ کیا جائے)۔

اگر آخری معنی مراد لیا جائے تو آیت کا مضمون یہ ہے:

خرچ کرتے وقت گھٹیا اور بے قدر و قیمت مال کا انتخاب نہ کرو، بلکہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے اپنے مال کے بہترین حصّے کا انتخاب کرو۔

یہ معنی بھی پہلے دو معانی پر پوری طرح سے منطبق ہوتا ہے کیونکہ خرچ کرتے وقت حدِّ وسط اور اعتدال کو بھی مدِنظر رکھا جائے اور اچھے مال کا بھی انتخاب کیا جائے تو ان تمام معانی پر عمل ہو سکتا ہے۔

اسی لیے حادیان اسلام علیہم السلام نے اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے بعض اوقات لفظ "وسط" استعمال کیا ہے جیسا کہ تفسیر عیاشی اور کتاب کافی میں چھٹے پیشوائے اسلام امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

"عفو" یعنی حد وسط۔

اور کبھی اس کا معنی لفظ "فضل" سے کیا گیا ہے جس کا معنی ہے زیادتی، اضافہ۔ جیسا کہ مجمع البیان میں پانچویں پیشوائے اسلام حضرت امام باقرؑ سے منقول، آپؑ نے فرمایا

"العفو ما فضل عن قوۃ السنۃ"

عفو — وہ چیز ہے جو سال کے خارج سے بچ جائے۔

آیت میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ عفو اسی پہلے معنی میں ہو یعنی مغفرت اور دوسروں کی لغزشوں سے درگزر کرنا اگرچہ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے یہ احتمال کسی مفسر نے بیان نہیں کیا۔ اس احتمال کے مطابق آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

کہہ دو کہ بہترین انفاق اور خرچ کرنا یہ ہے کہ عفو درگزر کو خرچ کرو۔

چند امور ایسے ہیں کہ جن کے پیش نظر اس احتمال کا درست ہونا کچھ بعید بھی نہیں مثلاً جزیرۃ العرب کی وضع و کیفیت خصوصاً اہل مدینہ کی دشمنی اور کینہ پروری کی قدیم عادت اور ان پست حالات اور افراد میں پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک عفو و درگزر

کی اہمیت۔

اور پھر یہ مفہوم ان کے سوال کے بھی منافی نہیں ہے۔ انہوں نے مالی امور کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ بعض اوقات ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتے تھے جس سے زیادہ ضروری چیز کے بارے میں انہیں پوچھنا چاہیئے تھا تو قرآن سوال کے حوالے سے ان کی آمادگی اور پذیرائی سے استفادہ کرتے ہوئے جواب میں اس چیز کا تذکرہ کرتا ہے جو اہم تر ہوتی ہے یعنی ان کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے زیادہ اہم بات بیان کرتا ہے۔

یہ طرز انداز قرآن ہی سے مخصوص نہیں کیونکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہم سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے جب کہ وہ اس سے اہم مسائل بھولے ہوئے ہوتا ہے تو ہم بجائے اس کے کہ آسان اور سادہ سوال کا جواب دیں۔ اس کی ضرورت کے اہم مسائل کو تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔

دو قابلِ غور نکات

آیت کے آخری حصے میں ہے

"كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ"۔

"خدا اپنی آیات کو اسی طرح بیان کرتا ہے شاید تم غور و فکر کرو"

آیت کی ابتداء میں غور و فکر کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ"

اس تعبیر سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ انسان مامور ہے کہ خدا اور انبیاء کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اس کے باوجود اس کا فرض ہے کہ یہ اطاعت فکر و نظر سے انجام دے، نہ یہ کہ اندھا دھند اور بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرے۔ دوسرے لفظوں میں جتنا ہو سکے احکام الٰہی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرے اور انہیں صحیح شعور سے بجا لائے۔

البتہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ احکام الٰہی کی اطاعت ان کے فلسفے کے سمجھنے سے مشروط ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان احکام کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی روح اور اسرار کو جاننے کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ فقط عالم مادہ یا فقط عالم معنی ہی میں غور و فکر کرے، بلکہ دونوں پر غور و فکر کرے جسم کی ضروریات اور روح کے تقاضے۔ دونوں ملحوظ نظر رہیں دونوں کے تکامل اور پیش رفت کے وسائل کی تلاش کی جانا چاہیئے کیونکہ دنیا و آخرت ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک کی بربادی دوسرے کی ویرانی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شراب اور قمار بازی کی حرمت کا حکم اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی تشویق میں کیا ربط ہے۔ تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو:

۱۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان احکام کا فلسفہ اور ان کے اسرار انسانی فکر و نظر کو متاثر کرتے ہیں۔

۲۔ انفاق عمومی، مجموعی اور اُخروی پہلو رکھتا ہے اور شراب و قمار بازی زیادہ تر شخصی اور مادی پہلو رکھتے ہیں۔ لہذا ان احکام کے ذریعے انسان کو دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۲۰۔ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۲۲۰۔ (تاکہ) دنیا و آخرت میں (فکر کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر اپنی زندگی کو ان کی زندگی میں ملا لو (تو کوئی حرج نہیں) وہ تمہارے دینی بھائی ہیں (اور ان سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو) خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے اور اگر خدا چاہے تو تمہیں زحمت و تکلیف میں ڈال دے (اور حکم دے دے کہ یتیموں کی سرپرستی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی اور اموال کو علاً ان کے مال سے جدا رکھو لیکن خدا ایسا نہیں کرتا) کیونکہ وہ توانا اور حکیم ہے۔

شانِ نزول

تفسیر قمی میں امام صادقؑ اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب آیت

"ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن"

یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جانا۔ مگر یہ کہ یہ اُس کے حق میں بہتر ہو۔ (بنی اسرائیل - ۳۴)

اور آیہ

"ان الذین یاکلون اموال الیتامٰی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا"

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب واصلِ جہنم ہوں گے (نساء - ۱۰)

نازل ہوئیں کہ جن میں یتیموں کے مال و دولت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ اُن کے لیے مفید ہو اور اُن کا مال کھانے سے روکا گیا ہے تو جن کے گھروں میں یتیم تھے انہوں نے ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا اور انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو انہیں اپنے گھر ہی سے نکال دیا اور جنہوں نے ایسا نہ کیا اُن کے گھر میں بھی یتیموں

کی کیفیت نکالے جانے سے مختلف نہ تھی۔ اُن کے مال سے پکایا گیا کھانا اپنے کھانے سے نہ ملاتے۔ اُن کے لیے الگ کھانا پکتا، یتیم اپنے کمرے کے کونے میں الگ سے کھانا کھاتا، اس کا بچا ہوا کھانا پڑا رہتا تاکہ پھر بھوک لگنے پر اسی کو کھائے، وہ کھانا خراب ہو جاتا تو پھینک دیا جاتا۔

یہ سب اہتمام اس لیے کیا جاتا کہ کہیں مال یتیم کھانے کا جرم سرزد نہ ہو۔ یہ صورت حال سرپرستوں اور یتیموں دونوں کے لیے بہت مشکلات کا باعث تھی۔ ان حالات میں متاثر افراد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی خدمت میں اپنے احوال پیش کیے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید یتیموں کے سرپرستوں کو حکم دیتا ہے کہ یتیموں کی سرپرستی سے دست کش ہو جانا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اُن کی سرپرستی قبول کر لو اور ان کے کام انجام دو اور جو کام اُن کے فائدے میں ہو اور جس میں ان کی اصلاح اور بہتری سمجھو، ایسے انجام دو ("قل اصلاح لھم خیر")۔

اور اگر ان کی زندگی تمہاری زندگی سے مخلوط ہو تو اُن سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو۔ جب تمہارا مقصد ان کی بھلائی ہو تو ان کے مال اور کھانا تمہارے مال اور کھانے سے مل جائے تو کوئی اشکال نہیں (" و ان تخالطوھم فاخوانکم ")۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ بھلائی کا اظہار صحت عمل کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت میں اصلاح طلب ہو، تمہاری نیت یتیموں کی خدمت کرنا ہو ("واللہ یعلم المفسد من المصلح")

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خداوند عالم اگر چاہے تو تم پر معاملہ سخت کر سکتا ہے اور یتیموں کی سرپرستی کو لازمی قرار دینے کے باوجود تمہیں اپنے مال اور کھانے کو ان کے مال اور کھانے سے الگ رکھنے کا حکم دے سکتا ہے لیکن وہ قادر بھی ہے اور حکیم و دانا بھی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے بندوں پر سخت گیری کرے۔ ("ولو شاء اللہ لاعنتکم ان اللہ عزیز حکیم")۔

۲۲۱۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ

وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

ترجمہ

۲۲۱۔ مشرک اور بُت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں اُن سے نکاح نہ کرو (اگرچہ تمہیں کنیزوں ہی سے رشتہ تزویج کیوں نہ قائم کرنا پڑے کیونکہ) ایماندار کنیزیں آزاد بُت پرست عورت سے بہتر ہیں اگرچہ ان کی زیبائی، دولت، شخصیت اور وقعت، تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بُت پرست مردوں سے نہ بیاہو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں (اگرچہ تمہیں مجبوراً ایماندار غلاموں سے ہی کیوں نہ بیاہنا پڑیں کیونکہ) ایک صاحب ایمان غلام ایک بُت پرست مرد سے بہتر ہے اگرچہ (مال و مقام اور حسن و زیبائی میں) وہ تمہیں اچھا لگے۔ وہ تو آگ کو دعوت دیتے ہیں جب کہ خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے اور اپنی آیات لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے کہ شاید وہ یاد رکھیں۔

شان نزول

مرثد جو ایک بہادر انسان تھا پیغمبر اکرمؐ نے اسے مدینے سے مکے کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں پر موجود مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے آئے۔ وہ وہاں پیغمبرؐ کی انجام دہی کے لیے مکہ پہنچا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک خوبصورت عورت 'عناق' سے ہوگئی۔ اسے وہ زمانہ جاہلیت سے پہچانتا تھا۔ اس عورت نے گذشتہ زمانے کی طرح اسے گناہ کی دعوت دی لیکن مرثد چونکہ مسلمان ہو چکا تھا، اس کی خواہش کو قبول نہ کر سکا۔ اس عورت نے نکاح کا تقاضا کیا تو مرثد نے کہا کہ یہ معاملہ پیغمبر اکرمؐ کی اجازت پر موقوف ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے مدینے پلٹ آیا اور وہ واقعہ آنحضرتؐ کے گوش گزار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مشرک اور بت پرست عورتیں مسلمان مردوں کی ہمسری اور تزویج کے لائق نہیں۔

تفسیر

لفظ 'نکاح' لغت میں جنسی ملاپ اور عقد ازدواج دونوں معنی میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں عقد ازدواج ہی مراد ہے۔ اسلام کی نظر میں ازدواجی زندگی کی بہت اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ وراثت کے معاملات اور گھر کے تربیتی ماحول کے اولاد پر اثرات کے پیش نظر اسلام نے بیوی یا شوہر کے انتخاب میں مختلف شرائط معین کی ہیں۔

مشرک عورت مسلمان مرد کی کفو اور بیوی بننے کے اہل نہیں اور بالفرض وہ بیوی بن جائے تو بچے اس کے خیالات اور صفات بھی وراثت میں حاصل کریں گے اور اسی کی گود میں تربیت پائیں گے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بُرا ہی نکلے گا۔ لہٰذا قرآن اس آیت میں مشرک اور بُت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی ہے مشرکین اسلام سے بیگانہ ہوتے ہیں اگر وہ شادی کے ذریعے مسلمانوں کے گھروں میں راہ و رسم

پیدا کرلیں تو اسلامی معاشرہ ہرج و مرج اور داخلی دشمنوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس طرح کفر و اسلام کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گی۔ قرآن تو مشرک عورتوں کو صاحب ایمان کنیزوں کا ہم پلہ بھی قرار نہیں دیتا لیکن قرآن نے اُن کے لیے دروازہ بند بھی نہیں کیا۔ اُن سے جنسی تعلق کے قیام کی صورت وہ یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو اُن سے شادی بیاہ ہو سکتا ہے۔

مشرکین کون ہیں

قرآن میں "مشرکین" کا لفظ زیادہ تر بت پرستوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ لفظ آئے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ اس کے مفہوم میں بت پرست ضرور شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرکین کا لفظ اہل کتاب (یہود، نصاریٰ اور مجوس) کے مقابلے میں کیا ہے۔

بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ مشرک کے مفہوم میں یہود، نصاریٰ اور مجوس سمیت سب کفار شامل ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر فریق خدا کے شریک کا قائل ہے۔ نصاریٰ تثلیث کے قائل ہیں، مجوس ثنویت یا دوگانہ پرستی پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔

یہ عقائد اگرچہ شرک آور ہیں لیکن اس طرف دیکھتے ہوئے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرک، اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے، قرآنی اصطلاح میں اس کا مفہوم بت پرست ہی نکلتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے منقول ایک مشہور حدیث ہے۔ اس میں آپؐ نے اپنی وصیتوں میں فرمایا ہے کہ مشرکین کو حتمی طور جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اس میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ اہل کتاب جزیرۃ العرب سے نہیں نکالے گئے اور وہ جزیہ ادا کرکے ایک مذہبی اقلیت کے طور پر اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں اہل کتاب شامل نہیں ہیں۔

"ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم"

جس طرح مومن مردوں کو مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے اس جملے میں کافر اور مشرک مردوں سے مسلمان عورتیں بیاہنے سے روکا گیا ہے۔ نیز جس طرح مومن کنیزیں کافر آزاد عورتوں سے شادی کی نسبت بہتر ہیں چاہے کافر عورتیں حسن و جمال اور مال و منال میں بالاتر ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح صاحب ایمان غلام، خوبصورت اور بظاہر باحیثیت کافروں سے برتر اور بہتر ہیں لیکن مومن عورتوں کی شادی کافر مردوں سے اس وقت تک منع ہے جب تک وہ کافر ہیں اور اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو اُن سے شادی کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ بازگشت کا ایک راستہ ہے جس کی طرف آیت کی ابتداء میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

"اولٰئک یدعون الی النار واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ"

اس جملے میں اہلِ ایمان کی مشرک اور بت پرستوں سے شادی کرنے کی حرمت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ مشرک سے شادی کرنا اس لیے حرام ہے کہ مشرک انسان اپنے ساتھی کو بت پرستی اور ایسی ناپسندیدہ صفات کی دعوت دیتا ہے جن کا سرچشمہ بُت پرستی ہے خصوصاً بت پرست سے یہ معاشرت زنا کے حوالے سے بہت خطرناک ہے اور اس کے اثرات بہت زیادہ اور بہت گہرے ہیں۔ گویا بت پرست سے معاشرت کا انجام غضبِ خدا کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ بت پرستوں سے آشنائی خصوصاً شادی بیاہ کے دریچے سے خدا سے ناآشنائی کے مترادف ہے اور ان سے نزدیکی خدا سے دوری کا باعث ہے جب کہ مومنین اپنے ایمان اور سرچشمۂ زیبان سے پھوٹنے والی بلند صفات کی بدولت اپنے ساتھیوں کو ایمان اور فضیلت کی دعوت دیتے ہیں جس کا انجام جنت، مغفرت اور خدا کی بخشش ہے۔

مومنین کا رابطہ چونکہ خدا سے بہت گہرا ہے اس لیے آیت میں خدا نے مومنین کی بجائے اپنا نام لیا ہے۔ فرماتا ہے:

"واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ"

ممکن ہے خدا کی دعوت سے مراد بت پرستوں سے شادی کی حرمت کا حکم ہی ہو، جس کا نتیجہ جنت اور خدا کی مغفرت ہے اور اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ آیت دونوں مفاہیم کی حامل ہو۔

۲۲۲۔ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ○

۲۲۳۔ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○

ترجمہ

۲۲۲۔ اور تم سے خونِ حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ نقصان دہ اور ناپاکی کی ایک حالت ہے۔ لہٰذا ماہواری کے دوران میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرو (اور ان سے ہم بستری نہ کرو)۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ جاؤ اور جب وہ پاکیزہ ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے تمہیں حکم دیا ہے اُن سے ملاپ کرو۔ خدا توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو بھی خدا دوست رکھتا ہے۔

۲۲۲۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ جب چاہو تم اُن سے ملاپ کرو (لیکن کوشش کرو کہ اس طبیعی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیک اولاد کی پرورش کرو، اس طرح نیک تاثیر) اپنے لیے آگے بھیجو، خدا سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اُس سے ملاقات ضرور ہونا ہے اور مومنین کو رحمت کی بشارت دو۔

شانِ نزول

عورتیں ہر ماہ میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن نماز، روزہ سے فارغ رہتی ہیں۔ ان دنوں میں فقہی کتب میں درج مخصوص اوصاف کا خون رحم عورت سے خارج ہوتا ہے۔ اس حالت میں عورت کو حائض کہتے ہیں اور اس خون کو خونِ حیض کہا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا موجودہ دین حائض عورتوں سے مباشرت کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد احکام رکھتا ہے۔ یہ صورت ہر شخص کو سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایسی عورتوں کے ساتھ مردوں کا رہنا سہنا ہی بالکل حرام ہے۔ یہاں تک کہ ایک دسترخوان پر کھانے اور ایک کمرے میں رہنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے مطابق جس جگہ حیض والی عورت بیٹھی ہو وہاں مرد کو نہیں بیٹھنا چاہیئے اور بیٹھ جائے تو اپنا لباس دھوئے ورنہ وہ نجس ہے اور اگر اس کے بستر پر سو جائے تو لباس بھی دھوئے اور غسل بھی کرے۔ خلاصہ یہ کہ ان ایام میں عورت کو ایک ناپاک شے اور لازم الاجتناب وجود سمجھا جاتا ہے۔

یہودیوں کے اس گروہ کے برعکس عیسائی کہتے ہیں کہ عورت کی حالتِ حیض اور غیر حیض میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ حالتِ حیض میں بھی ان سے ہر طرح کی معاشرت، میل جول یہاں تک جنسی ملاپ پر بھی کوئی قدغن نہیں۔

مشرکین عرب، خصوصاً اہل مدینہ کم و بیش یہودیوں کے اخلاق و عادات سے مانوس تھے اور حائض عورتوں سے یہودیوں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ماہواری کے دنوں میں ان سے الگ رہتے تھے۔

اسی دینی اختلاف اور ناقابلِ معافی افراط و تفریط کے باعث بعض مسلمانوں نے پیغمبر اکرمؐ سے اس بارے میں سوال کیا اور جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصانات

"یسئلونک عن المحیض قل ھو اذی"۔

"محیض" مصدر میمی ہے اور یہاں حیض کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے پیغمبر! تم سے حیض اور اس کے احکام کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کے جواب میں کہو "ھو اذی" یعنی وہ تکلیف دہ اور ناپاک چیز ہے۔ درحقیقت یہ جملہ ماہواری میں عورت سے جنسی ملاپ کے اجتناب کے حکم کا فلسفہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس حالت میں عورتوں سے جنسی ملاپ تنفر کا باعث ہونے کے علاوہ بہت سے نقصانات کا بھی سبب بنتا ہے۔ ان نقصانات کو آج کی میڈیکل کی دنیا نے بھی ثابت کر دیا ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱ مرد اور عورت دونوں کا بانجھ ہونا
۲ آتشک اور سوزاک جیسی آمیزشی بیماریوں کے جراثیم کا پروان چڑھنا
۳ عورت کے تناسلی اعضاء کی زبردست گرمی اور موادِ حیض کا مرد کے عضوِ تناسل میں داخل ہونا جب کہ یہ مواد بدن کے داخلی جراثیموں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی بیماریاں اس طرح سے پیدا ہوتی ہیں جن کی تفصیلات میڈیکل کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں انہی وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر حائض عورتوں سے جنسی ملاپ سے منع کرتے ہیں۔

خونِ حیض کے دنوں میں رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور ان کا پانی بھی پتلا ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ دانی بھی رحم کی رگوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

تقریباً ماہواری کے آغاز پر ہی عورت کا نطفہ (OVUM) شیپور نالی (FALLOPIAN TUBE) سے گذر کر رحم میں داخل ہوتا ہے تاکہ مرد کا نطفہ داخل ہو تو ان کے اشتراک سے بچہ پیدا ہو سکے۔

مذکورہ خون کا ترشح ابتداء میں غیر منظم اور بے رنگ ہوتا ہے لیکن بہت جلدی منظم اور سرخ رنگ ہو جاتا ہے آخر میں یہ پھر کم رنگ اور غیر مرتب ہو جاتا ہے۔

اصولی طور پر ماہانہ عادت کے وقت نکلنے والا خون ہر ماہ رحم کی داخلی رگوں میں احتمالی بچے کی غذا کے لیے جمع ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر ماہ عورت کے رحم میں ایک چھوٹا سا انڈا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رحم کی داخلی رگیں آمادگی کی حالت میں نطفہ کی غذا کے لیے خون سے پر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت جب کہ انڈہ شیپور نالی سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے اگر اسپرماٹوزئید یعنی مرد کا نطفہ موجود ہو تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہاں رگوں میں موجود خون اس کی غذا میں صرف ہونے لگ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو رحم کا پانی پتلا ہونے لگتا ہے، رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور وہاں موجود خون، خونِ حیض کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایام میں جنسی ملاپ یقیناً نقصان دہ اور ممنوع ہے۔ کیونکہ اس خون کے اخراج کی حالت میں عورت کے رحم میں نطفہ قبول کرنے کے لیے کوئی طبیعی آمادگی نہیں ہوتی اور اسی بناء پر اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

"فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوهن"

اس آیت کا پہلا حصہ جس میں حائض عورتوں سے علیحدگی، اعتزال اور جنسی روابط سے ممانعت ہے۔ پہلی نظر میں یہودی مذہب کے موجودہ احکام سے شباہت رکھتا ہے لیکن "فاذا تطهرن فأتوهن من حيث امركم الله" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کنارہ کشی سے مراد فقط جنسی ملاپ ہے کیونکہ اس حصے میں خونِ حیض پاک ہونے کے بعد عورتوں سے جنسی ملاپ کی اجازت دی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام عورتوں کی ماہواری کے معاملے میں درمیانی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مقام پر اسلام کی راہ اور روش اعتدال پر مبنی ہے۔ اسلام افراط و تفریط سے پاک ہے۔ یہاں بھی یہودیوں کی تندروی پر اسلام نے گرفت کی ہے۔

ـــ SPERMATZIOD ـــ اقتباس از ۔۔۔

اسلام کے مطابق ماہواری کے عالم میں عورتوں سے معاشرت، میل جول اور نشست و برخاست میں کوئی ممانعت نہیں۔ فقط جنسی ملاپ کی ممانعت ہے یا اسلام نے اس موقع پر عیسائیوں کے طرزِ عمل کو بھی اختیار نہیں کیا جن کے نزدیک حیض اور غیر حیض ہر حالت میں عورتوں سے یکساں قسم کے تعلقات رکھنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اس طرح اسلام نے عورت کے احترام، اس کی شخصیت کی حفاظت اور اسے حقیر نہ سمجھنے اور دونوں کی صحت کے ضمن میں نقصان دہ امور سے بچنے کے لئے تدابیر اختیار کی ہیں۔

جنسی ملاپ کی اجازت

"فاذا تطہرن فأتوھن من حیث امرکم اللہ"۔

جب وہ پاک ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے حکم دیا ہے ان سے ملاپ کرو

آیت کا یہ حصہ حقیقت میں عورتوں سے جواز مباشرت کی وضاحت کے لیے ہے "اذا تطہرن" سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہواری سے پاک ہو جانے پر ہی عورتوں سے مباشرت جائز ہے کیونکہ یہ جملہ خون حیض کو آلودگی قرار دینے کے بعد آیا ہے یعنی جب وہ اس ناپاکی اور آلودگی سے پاک ہو جائیں تو حکم امتناعی ختم ہو جاتا ہے۔ "تطہرن" کا مفہوم ظاہراً عورتوں کا غسل کر لینا نہیں لیا جا سکتا کیونکہ آیت کی ابتداء میں وجوب غسل کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔

دوسرے لفظوں میں "حتیٰ یطہرن" جو اس سے پہلے کہا گیا ہے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ممنوعیت عورت کی ناپاکی کے زمانے میں ہے یعنی پاک ہونے کے بعد یہ ممنوعیت برطرف ہو جاتی ہے یہی مفہوم ہمارے بزرگ فقہاء نے فقہی مسائل میں لیا ہے۔ انہوں نے فتویٰ دیا ہے کہ خون سے پاک ہو جانے کے بعد غسل سے پہلے بھی جنسی ملاپ جائز ہے۔

مندرجہ بالا توضیح سے ثابت ہو چکا ہے کہ لفظ "تطہرن" غسل کرنے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ وجوب غسل تو ایک دوسری دلیل کے ذریعے ثابت ہوا ہے۔

"من حیث امرکم اللہ" اس بعد والے حصے میں کہا گیا ہے: جس طریق سے خدا نے حکم دیا ہے مباشرت کرو۔ ہو سکتا ہے یہ حصہ آیت کے گزشتہ حصے کی تاکید ہو یعنی صرف عورت کے پاک ہونے کی حالت میں مجامعت کرو۔ اس کے علاوہ نہ کرو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا زیادہ وسیع اور کلی مفہوم ہو یعنی پاک ہونے کے بعد بھی مباشرت کا عمل حکم پروردگار کی حدود کے اندر ہونا چاہیئے۔

ہو سکتا ہے اس فرمان میں پروردگار کا تکوینی حکم بھی شامل ہو اور تشریعی بھی کیونکہ خدا نے نوع انسانی کی بقاء کے لیے دو مخالف صنفوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھی ہے اس لیے جنسی ملاپ دونوں کے لیے ایک لذت رکھتا ہے لیکن مسلّم ہے کہ درحقیقت مقصد بقاء نسل تھا اور کشش اور لذت تو اس مقصد کے حصول کے لیے مقدمہ اور تمہید کی حیثیت سے ہے لہٰذا لذت جنسی کا حصول بقاء نسل کے حوالے سے ہی ہونا چاہیئے۔ اسی بناء پر استمناء یعنی جنسی ملاپ کے علاوہ منی نکالنا اور لواطت یعنی مرد کا مرد سے بدکاری کرنا اور ایسے دیگر افعال جو اس تکوینی حکم سے انحراف قرار پاتے ہیں ممنوع ہیں کیونکہ وہ کسی طرح بھی جنسی

حاصل کرنے کے اصلی مقصد کو پورا نہیں کرتے جب کہ اس کے علاوہ بھی ان اعمال کے شدید نقصانات ہیں۔

"ان اللّٰہ یحب التوابین و یحب المتطہرین"

خدا توبہ کرنے والوں اور پاک باز لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

توبہ کا معنی ہے گناہ سے پلٹنا اور خدا کی نافرمانی سے پشیمان ہونا۔ توبہ کے تین بنیادی ارکان ہیں۔

۱۔ یہ جاننا کہ میں پہلے خدا کی نافرمانی کر چکا ہوں۔

۲۔ اس عمل پر پشیمان اور نادم ہونا۔

۳۔ آئندہ اسے ترک کرنے کا عزم بالجزم کرنا اور جو ہو چکا ہے اس کی تلافی اور ازالہ کرنا۔

کسی شخص میں یہ کیفیت پائی جائے تو اسے تائب کہتے ہیں اور اس کے عمل کو توبہ کہا جاتا ہے (توبہ اور اس کی شرائط کے بارے میں مزید تشریح متعلقہ آیات میں بیان کی جا چکی ہے)۔

اس آیت میں تطہیر سے مراد گناہ سے آلودہ نہ ہونا اور اپنے آپ کو خدا کی نافرمانی سے بچانا ہے آیت کے آخر میں اس جملے کا استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ بعض لوگ اپنے کمزور مزاج پر ضبط نہ کرتے ہوئے ایام حیض میں عورتوں سے مباشرت کے خدائی حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور گناہ ہو جائیں۔ بعد ازاں اپنے اس عمل پر ان کی نظر پڑے تو وہ ناراحت اور افسردہ ہوں اور وہ اپنے تئیں غضب خدا کا حقدار سمجھیں تو ایسے میں یہ نہ ہو کہ انہیں اپنی بازگشت کا کوئی راستہ ہی بھائی نہ دے اور وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ متوجہ کرتا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو کسی حد تک لطف خدا سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ابتداء ہی سے اپنے نفس پر ضبط رکھیں اور اس گناہ سے پاک رہیں تو ان کے لیے پروردگار کے اس لطف و محبت کا حصہ زیادہ ہے۔

نوع بشر کی حفاظت کا ذریعہ

"نساؤکم حرث لکم فأتوا حرثکم انّٰی شئتم"

اس آیت میں عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ تشبیہ عورتوں کے بارے میں بوجھل ہو اور وہ سوچیں کہ اسلام نے آدھی انسانیت کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے حالانکہ اس تشبیہ میں ایک باریک سا نکتہ پنہاں ہے۔ درحقیقت قرآن چاہتا ہے کہ اس طرح سے عورت کو متعارف کروا کر انسانی معاشرے میں اس کے وجود کی ضرورت کو اجاگر کرے اور یہ واضح کرے کہ عورت فقط آتش شہوت کو سرد کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ نوع بشر کی بقا کا وسیلہ ہے۔

جیسے انسان اپنی بقا کے لیے غذا کا محتاج ہے اور یہ احتیاج کاشتکاری اور زراعت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، اسی طرح بقاء نوع انسانی عورت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے جو عورت کو ایک کھلونا اور ہوس پرستی کا ہدف سمجھے بیٹھے ہیں۔

"حرث" مصدر ہے۔ یہ زیج ڈالنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات زراعت کی جگہ مزرعہ کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔

لفظ "انی" اسماء شرط میں سے ہے اور زیادہ تر "متی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور "متی" کا معنی ہے "زمانہ"۔ اس صورت میں اسے "انی زمانیہ" کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ "مکان" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیہ ۳۷ میں ہے۔

"یا مریم انی لک ھذا قالت ھو من عند اللہ"

حضرت زکریا جب مریم کے پاس جاتے تو اُن کے پاس تیار شدہ کھانا دیکھتے تو پوچھتے "انی لک ھذا" یعنی یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا۔
جناب مریم جواب دیتیں "من عند اللہ" یعنی خدا کے ہاں سے (مراد تھی جنت سے)۔

لفظ "انی" اگر زمانی ہے تو عورتوں سے مباشرت کے وسیع زمانے کا مفہوم حاصل ہوگا یعنی شب و روز، تمام اوقات میں اس کی اجازت دی گئی ہے اور اگر یہ مکانی ہو تو مراد یہ ہوگی یہ مکان، مقام اور کیفیت تمام امور میں وسعت دی گئی ہے۔

"وقدموا لانفسکم"

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنسی ملاپ کا اصل مقصد صرف حصول لذت اور تکمیل خواہش نہیں بلکہ صاحب ایمان افراد کو چاہیئے کہ وہ اس عمل سے لائق اور شائستہ اولاد کے حصول کی خواہش کریں اور پھر اُس کی تربیت کی ذمہ داری پوری کریں اور اس مقدس تربیتی خدمت کو ایک معنوی سرمائے کے طور پر اپنے کل کے لیئے آگے بھیجیں۔ اس لیے قرآن تنبیہ کرتا ہے کہ بیوی کے انتخاب میں ایسے اصول پیش نظر رکھیں جن کا نتیجہ اچھی اولاد کی پرورش اور عظیم اجتماعی و انسانی سرمائے کا حصول ہو۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"اذا مات الانسان انقطع عملہ الا عن ثلاث: صدقۃ جاریۃ وعلم ینتفع بہ وولد صالح یدعولہ"

جب انسان مرجاتا ہے اُس کا دفتر عمل بھی بند ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان اپنے لیے کوئی بچت مہیا نہیں کرسکتا البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جو موت کے بعد بھی اُس کے لیے نتیجہ بخش ہوں گی۔

(۱) صدقہ جاریہ ، (۲) آثار علمی اور (۳) نیک اولاد کی تربیت

صدقہ جاریہ سے مراد ایسے آثار خیر ہیں جو اجتماعی فوائد کے لیئے استعمال ہوتے رہتے ہیں جیسے مسجد، مدرسہ، ہسپتال لائبریری یا ایسی دیگر چیزیں۔ آثار علمی سے مراد کتاب کی تالیف اور شاگردوں کی تربیت۔ نیک اولاد جو اپنے ماں باپ کے لیے عملی یا زبانی طور پر طلب بخشش کرے۔

"واتقوا اللہ واعلموا انکم ملاقوہ وبشر المؤمنین"

زیر نظر موضوع ــــ جنسی ملاپ ــــ چونکہ بہت ہی اہم ہے اور انسانی غرائز میں سے سب سے زیادہ پرکشش غریزہ جنسی ہی کا ہے اس لیے اس جملے کے ذریعے خدا تعالیٰ انسان کو جنسی ملاپ کے معاملے میں دقت نظر کی دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کی طرف متوجہ کرتا ہے اور فرماتا ہے "واتقوا اللہ" یعنی اللہ کی نافرمانی سے ڈرو۔

اس کے بعد متوجہ کرتا ہے کہ تمہیں قیامت کے دن پروردگار سے ملاقات اور اپنے اعمال کے نتائج کی طرف جانا ہوگا "واعلموا انکم ملاقوہ"

آخر میں ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کیونکہ صاحبان ایمان اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے مفید ہیں "وبشر المؤمنین"

۲۲۴۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

۲۲۵۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۲۴۔ خدا کو اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔ نیکی کرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں میں صلح صفائی کے عمل میں قسمیں نہ کھاتے رہو اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

۲۲۵۔ بے توجہ قسمیں کھانے پر تو خدا تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا البتہ جو کچھ تم دل و دماغ سے کرتے ہو (اور وہ قسمیں جو تم ارادہ و اختیار سے کھاتے ہو) اس پر ضرور بازپرس ہوگی اور خدا بخشنے والا صاحب حلم ہے۔

شان نزول

پیغمبر اکرمؐ کے ایک صحابی عبداللہ بن رواحہ کے داماد اور بیٹی میں اختلاف ہو گیا تو اس نے قسم کھائی کہ اُن میں صلح کے لیے وہ دخل اندازی نہیں کرے گا اور اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسی قسموں کو ممنوع اور بے بنیاد قرار دے دیا۔

تفسیر

"ایمان" "یمین" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "قسم"

"عرضۃ" کا معنی ہے کسی چیز کا معرض قرار دینا۔ مثلاً کوئی جنس بازار میں بیچنے کے لیے لاتے ہیں اور اسے معاملے کے معرض میں قرار دیتے ہیں یعنی اسے معاملے کے بیچ میں لاتے ہیں تو اسے عرضہ کہتے ہیں۔ بعض اوقات

موانع اور رکاوٹوں کو بھی عرضہ کہتے ہیں کیونکہ وہ عرض انسان میں حائل ہوتے ہیں اور انسان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں "عرضۃ" کے مذکورہ مفہوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر کچھ اس طرح ہوگی: خدا کو اپنی قسموں کے معرض میں نہ لاؤ اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم نہ کھاؤ۔ خدا کے نام کو معمولی نہ بنا دو۔ اہم مقاصد کے علاوہ یوں قسم کھانا غیر مناسب اور غیر مطلوب کام ہے۔ یہ بات بہت سی احادیث میں بھی بیان کی گئی۔ ان میں سے امام صادق علیہ السلام کا ایک فرمان ملاحظہ کیجئے، آپؑ نے فرمایا۔

"ولا تحلفوا باللّٰہ صادقین ولا کاذبین فانّہ سبحانہ یقول

لا تجعلوا اللّٰہ عرضۃ لایمانکم"

خدا کی قسم کبھی نہ کھانا۔ چاہے تم سچے ہو یا جھوٹے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ خدا اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔

اس صورت میں شان نزول کے ساتھ اس کی مناسبت یوں ہوگی کہ اچھے کاموں میں بھی قسم کھانا پسندیدہ عمل نہیں ہے چہ جائیکہ انسان کسی اچھے کام مثلاً لوگوں کے درمیان صلح صفائی وغیرہ ترک کرنے کے معاملے میں قسم کھائے۔ اس تفسیر کے مطابق "ان تبرّوا و تتقوا و تصلحوا بین الناس" اس طرف اشارہ ہے کہ نیک کاموں اور لوگوں کے درمیان معاملات کو سلجھانے میں بھی قسم نہ کھاؤ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "عرضۃ" آیت میں رکاوٹ اور مانع کے معنی میں ہو یعنی خدا کے نام کی قسم کو نیک عمل اور لوگوں کے درمیان صلح کروانے میں رکاوٹ نہ بناؤ اور ایسی ہر قسم کی کوئی قیمت اور اعتبار نہیں۔ شان نزول سے اس تفسیر کی مناسبت مکمل طور پر واضح ہے۔

"لا یؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما

کسبت قلوبکم"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو طرح کی قسموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلی قسم ۔ لغو قسموں کی ہے، جن کا کوئی اثر نہیں اور جن کی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ قسمیں ہیں جو لوگ بغیر توجہ کے کھاتے ہیں۔ بعض لوگ تکیہ کلام اور عادت کے طور پر قسمیں کھاتے ہیں۔ ہر کام میں "لا واللّٰہ" اور "بلیٰ واللّٰہ" یعنی نہ بخدا اور ہاں بخدا کہتے ہیں۔ ایسی قسمیں لغو ہیں۔ "لغو" لغت میں ان تمام کاموں اور باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہدف اور مقصد معین نہ ہو یا جو قصد و ارادہ سے سرزد نہ ہوں۔

اس لیے وہ قسمیں لغو کہلائیں گی جو انسان غضب اور غصے کی حالت میں کھاتا ہے، جب کہ حالت غضب میں وہ عام حالت میں نہ رہے۔

مندرجہ بالا آیت کے مطابق ایسی قسمیں جو قصد و ارادہ سے انجام پذیر نہ ہوں ان میں مؤاخذہ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی اثر رکھتی ہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ انسان کی تربیت اس طرح سے ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی قسموں سے بھی کنارہ کش رہے۔

دوسری قسم ـــــ ان قسموں کی ہے جو قصد و ارادہ کے ماتحت ہوں اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس میں کسب قلبی موثر ہے۔ ایسی قسم معتبر ہے اور اس کی پابندی کرنا چاہیئے اور اس کی مخالفت نہ فقط گناہ ہے بلکہ اس کا کفارہ بھی دینا پڑتا ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

قسمیں ـــــ جو قابلِ اعتبار ہیں

اسلام کی نظر میں قسم کھانا اصولی طور پر اچھا نہیں ہے جیسا کہ اوپر بھی بیان کیا جا چکا ہے لیکن یہ فعل حرام بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اہم مقاصد کے لیے قسم کھانا مستحب یا واجب بھی ہو جاتا ہے۔

بعض قسمیں تو اسلام کی نگاہ میں بالکل لغو اور بے اعتبار ہیں مثلاً وہ قسم جو غیر خدا کے نام کی ہو۔ ایسی قسمیں جن میں خدا کا نام نہیں ہے بالکل بے اثر ہیں اور اُن کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح حرام یا مکروہ فعل انجام دینے کے لیے کھائی جانے والی قسمیں بھی بے اثر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ کسی کا قرض ادا نہیں کرے گا یا جہاد سے بھاگ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی ایسی قسم کھائے تو اس کی پرواہ نہ کرے اور اپنی ذمہ داری پوری کرے اور اس کے ذمہ ایسی قسم کا کوئی کفارہ بھی نہیں "لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم" کی تفسیر میں ایک یہی مفہوم مضمر ہے۔

ایسی قسمیں جو خدا کے نام پر کھائی جائیں اور ان کا مقصد کوئی اچھا کام ہو یا کم از کم فعل مباح ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہے اور اس کی مخالفت پر کفارہ دینا پڑے گا۔ سورہ مائدہ آیہ ۸۹ کے مطابق اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں لباس پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

۲۲۶۔ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَآءُو فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

۲۲۷۔ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○

ترجمہ

۲۲۶ ـــــ جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں (یعنی اُن سے جنسی ملاپ نہ کرنے کی سوگند کھاتے ہیں) وہ چار ماہ تک انتظار کا حق رکھتے ہیں (اور ان چار ماہ کے دوران میں اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے یا اُسے طلاق دینے کے بارے میں اپنا ارادہ اور کیفیت واضح کریں، اب اگر اس وقفہ میں) رجوع کریں (تو کوئی حرج نہیں کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۲۲۷ ـــــ اور اگر علیحدگی کا مصمم ارادہ کر لیں (وہ بھی اس کی پوری شرائط کے ساتھ تو بھی حرج نہیں)

خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

زمانہ جاہلیت کے ایک طرزِ عمل کا خاتمہ

"ایلاء" وہ رسم ہے جو زمانہ جاہلیت میں میاں بیوی کے درمیان جدائی کے سلسلے میں عام تھی۔ ایلاء کا مفہوم ہے کہ میاں بیوی والے تعلقات ترک کرنے کی قسم کھانا۔ حکم طلاق نازل ہونے سے پہلے تو مسلموں میں بھی یہ رسم باقی تھی۔

زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرد اپنی بیوی سے متنفر ہو جاتا تو بعض اوقات قسم کھا لیتا کہ وہ اس سے ہمبستری نہیں کریگا اس طرح وہ اپنی بیوی کو اپنے اس غیر انسانی سلوک سے ایک شدید عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ نہ رسمی طور پر طلاق دیتا کہ وہ آزادی سے اپنے لیے کسی دوسرے شوہر کا انتخاب کر کے اپنی خواہشات پوری کر سکے نہ اس قسم کے بعد وہ خود تیار ہوتا کہ اس سے صلح کر کے ایک شوہر کی طرح زندگی بسر کرے۔

زیر نظر آیت میں اس سلسلے میں اسلام کا معین کردہ طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ شوہر کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس مصیبت اور عذاب سے نجات دے۔ اس عرصے میں وہ اپنی قسم کو ترک کر دے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے یا اسے طلاق دے کر آزاد کر دے۔

پہلی راہ کا انتخاب یعنی گھر کے ماحول کو خرابی سے بچانا بلاشبہ عقل و دانش کا تقاضا بھی ہے اور رضائے پروردگار کے حصول کا ذریعہ بھی۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"

اگر اپنے ارادے کو ترک کر دیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

(فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) ــــ یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کو ترک کرنا کوئی گناہ نہیں۔ اگرچہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم کھانا خود بھی ایک پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

اگر مرد علیحدگی کا ارادہ کرے اور طلاق دے دے تو اس صورت میں بخشش و مغفرت کا حکم نہیں ہے۔ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے، جانتا ہے کہ ہوس پرستی نے شوہر کو قانون طلاق سے غلط فائدہ اٹھانے پر ابھارا ہے یا اس کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ظاہری طلاق جاری کرنے کے بارے میں، اس کا سبب اور محرک سب کچھ خدا کے علم میں ہے اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔

"وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ"

اور اگر وہ طلاق ہی کا ارادہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

توجہ رہے کہ اسلام نے "ایلاء" کو بالکل تو ختم نہیں کیا البتہ اس کے برے آثار کو ختم کر دیا ہے کیونکہ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ "ایلاء" یا بیوی سے مباشرت ترک کرنے کی قسم کھانے سے وہ اپنی بیوی سے جدا ہو جائے۔

اسلام نے ایلاء کرنے والے کے لئے مدت کا تعین اس لیے نہیں کیا کہ واقعاً قسم کھانے سے ازدواجی حقوق

میں سے کوئی حق باطل ہوجاتا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے ہے کہ واجب شرعی ہونے کے لحاظ سے مباشرت چار ماہ میں ایک مرتبہ ضروری ہے۔ (البتہ یہ بھی اس صورت میں ہے کہ عورت طویل مدت کی وجہ سے گناہ کا شکار نہ ہو ورنہ اس صورت کے علاوہ خصوصاً جوان عورتوں کے بارے میں کہ جہاں خطرہ ہو کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں گی۔ ضروری ہے کہ عدم مباشرت کی مدت کم کر دی جائے تاکہ اس کی جنسی ضرورت پوری ہو سکے۔)

حکم اسلام اور دنیائے مغرب کا ایک تقابل

"ایلاء" کی رسم پر اسلام کی گرفت اور زمانہ جاہلیت کی گذشتہ تاریخ میں ایلاء کی طرح سے بدنی علیحدگی دیگر ممالک میں جس کی تائید کی جاچکی ہے، پر نظر کی جائے تو اسلام اور قرآن میں عورت کے حقوق کی کیفیت سے کافی آگاہی ہو سکتی ہے۔

وضاحت کچھ یوں ہے کہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد اہل فرانس کو طلاق کے لیے اس صورت کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے بدنی جدائی اختیار کریں اس قانون کے مطابق جو عورت مرد ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے ممکن تھا کہ وقتی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور علیحدہ گھروں میں زندگی بسر کریں (البتہ روابط اور حقوق برقرار رہتے تھے صرف شوہر کے ذمے اخراجات نہ رہتے اور عزت و پذیرائی عورت کے ذمہ نہ رہتی) لیکن اس قانون کی رو سے مرد دوسری بیوی نہ کر سکتا تھا اور عورت دوسرا شوہر کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس جدائی کی مدت زیادہ سے زیادہ تین سال تھی۔ تین سال کے بعد میاں بیوی مجبور تھے کہ مل جل کر زندگی بسر کریں اور علیحدگی ترک کر دیں۔ اسی طرح سے زمانہ جاہلیت کا ایک طرز عمل اس معاشرے کا حصہ بن گیا۔

دنیائے مغرب نے تو اس علیحدگی کی اجازت تین سال تک کے لیے دی ہے لیکن اسلام چار ماہ سے زیادہ جدائی کی اس کیفیت کو روا نہیں جانتا (جب کہ قسم نہ بھی کھائی جائے تب بھی مباشرت میں اس مدت تک کی تاخیر مباح ہے)۔ اگر اس مدت کے اختتام پر بھی مرد ٹال مٹول سے کام لے اور اپنے پروگرام کو واضح نہ کرے تو حکومت اسلامی اسے طلب کر سکتی ہے اور مخالفت کی صورت میں اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ معاملے کو طے کرے۔

۲۲۸۔ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ
وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ
إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ
بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي

عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۲۸۔ طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ ماہواری دیکھنے (اور پاک ہونے) کا انتظار کریں (اور اس طرح عدت پوری کریں) اور اگر خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اُسے چھپائیں اور ان کے شوہر اس مدت میں اُن کی طرف رجوع کرنے (اور ازدواجی عہد و پیمان کی نئے سرے سے بحالی کے دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں اگر (واقعاً) وہ صلح چاہتے ہیں اور جیسے عورتوں کے کندھوں پر فرائض عائد ہیں ایسے ہی ان کے لیے شائستہ حقوق مقرر کئے گئے ہیں اور مردان پر برتری رکھتے ہیں۔ اور خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

اکثر گھریلو معاملات کی خرابی معاشرتی ڈھانچے کے لیے ناقابل تلافی نقصانات کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے اسلام نے ایسے قوانین اور احکام وضع کئے ہیں کہ امکان کی آخری حد تک گھریلو رشتے ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ ایک طرف اسلام نے طلاق کو مباح اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت قرار دیا ہے اور دوسری طرف گھریلو اختلافات کے لیے خاندانی عدالت کا تصور دیا ہے۔ یہ عدالت رشتہ داروں پر ہی مشتمل ہوتی ہے تاکہ طرفین کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعے صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ طلاق کے معاملے کو تاخیر و التوا میں ڈالنے اور اس فیصلے کو متزلزل کرنے کے لیے "عدت" مقرر کی گئی ہے جس کی مدت تین "قرو" ہے جس کا ذکر زیر نظر آیت میں کیا گیا ہے۔

"قروء" سے کیا مراد ہے

"قروء" کا واحد ہے "قرء" یہ لفظ "ماہواری کی عادت" اور اس سے پاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ "ثلاثہ قروء" عدت کی حد ہے اور اس کا مفہوم ہے عورت کا خون حیض سے تین مرتبہ پاک ہونا، ان روایات سے قطع نظر خود اس آیت کا یہ مفہوم دو طرح سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ "قرء" کی دو جمع ہیں "قروء" اور "اقراء" وہ قرء جس کی جمع قروء ہے پاک ہونے کے معنی میں ہے اور جس کی جمع "اقراء" ہے اس کا مطلب ہے "حیض"

اس لیے زیر بحث آیت میں چونکہ "قرو" آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد عورت کے پاک ہونے کے دن ہیں نہ کہ حیض کے ایام۔

۲۔ لغت میں "قرء" کا اصلی معنی "طہر" اور بہ معنی پاکی سے ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ یہی وہ موقع ہے جب خون رحم میں جمع ہو جاتا ہے جب کہ عادت کے دنوں میں تو پراگندہ ہو کر باہر نکل آتا ہے۔

عدت ــــ صلح اور بازگشت کا ذریعہ ہے

بعض اوقات مختلف عوامل کی وجہ سے نفسیاتی طور پر حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ایک معمولی سا اختلاف اور چھوٹی سی وجہ نزاع جذبۂ انتقام بن کر بھڑک اٹھتی ہے اور عقل و وجدان کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ گھریلو جدائیاں زیادہ تر ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کشمکش کے تھوڑی مدت بعد ہی عورت اور مرد اپنے کیے پر پشیمان ہو جاتے ہیں خصوصاً جب وہ گھر کے نظام کی ابتری اور گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں تو ندامت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے زیر بحث آیت کہتی ہے کہ عورت کو ایک مدت تک عدت میں رہنا چاہیے اور صبر کرنا چاہیے تاکہ یہ تیز لہریں گزر جائیں اور نزاع و کشمکش کے سیاہ بادل ان کی زندگی کے فلک سے چھٹ جائیں۔ اس سلسلے میں وہ حکم خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جو اسلام نے زمانۂ عدت میں عورت کو گھر سے باہر جانے پر پابندی کی صورت میں دیا ہے۔ ایسے میں جذبۂ فکر برانگیختہ ہوتا ہے اور یہ جذبہ شوہر سے عورت کے روابط کی درستی اور اصلاح میں بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے سورہ طلاق کی پہلی آیت میں ہے۔

"لا تخرجوهن من بيوتهن .... لا تدري لعل الله يحدث بعد ذلك امرا"

انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو .... تمہیں کیا معلوم کہ شاید خدا کوئی کشائش پیدا کر دے اور ان میں صلح ہو جائے۔

طلاق سے پہلے کی زندگی کی گزشتہ جذبات اور شیریں لمحات کی یاد اس بات کے لیے کافی ہے کہ دلوں میں خلوص و محبت لوٹ آئے اور کمزور پڑ جانے والا دائرہ محبت قوی ہو جائے۔

عدت ــــ حفاظت نسل کا ذریعہ ہے

عدت کا ایک اور فلسفہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہے تو یہ کیفیت واضح ہو جائے۔ یہ درست ہے کہ ایک مرتبہ ماہواری دیکھنے ہی سے عموماً عورت کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ حاملہ ہونے کے باوجود ابتدائے حمل میں عورتوں کو خون حیض آنے لگتا ہے۔ اس لیے اس معاملے کی پوری وضاحت کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ عورت تین مرتبہ ماہواری دیکھے اور پاک ہو جائے تاکہ حتمی طور پر پہلے شوہر سے اس کا حاملہ نہ ہونا واضح ہو جائے اور پھر وہ دوسرے سے کہیں شادی کر سکے۔

"ولا يحل لهن ان يكتمن ما خلق الله في ارحامهن"

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عدت کے دنوں کی ابتداء و انتہا کس طرح معلوم کی جائے۔ اسلام نے اس معاملے میں خود عورت کی بات کو مستند قرار دیا ہے۔ اسی لیے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"قد فوض الله الی النساء ثلاثة اشياء الحيض و الطهر والحمل"

یعنی تین باتیں عورت پر چھوڑ دی گئی ہیں ایک ماہواری دوسرا پاکیزگی تیسرا حمل

یہ بات مندرجہ بالا آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس حق سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے خلافِ واقعہ بات کہے یعنی عورت کی بات مستند اور قابل قبول ہے۔

"ان یکتمن ما خلق الله ..." یہ جملہ دو مفاہیم دیتا ہے ایک بچے کے حمل کو چھپانا اور دوسرا ماہواری کی عادت کو پوشیدہ رکھنا یعنی اگر عورت حاملہ ہے تو اسے اپنا حمل چھپاتے ہوئے عدت کی مدت کم کرنے کے لیے یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ماہواری کے ایام میں ہے (کیونکہ حاملہ عورت کی عدت تو وضع حمل ہی ہے) اور اس طرح پاک ہونے یا ماہواری کی عادت میں ہونے کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

"وبعولتهن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا"

جب عورت طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو تو شوہر کو رجوع کرنے کا حق ہے تاکہ اگر وہ چاہے تو بلا تکلف اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی جاری رکھ سکتا ہے البتہ آیت نے (ان ارادوا اصلاحا) کی قید لگائی ہے اور اس سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حکم یک طرفہ نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ مرد آمادانہ بلا شرط حقِ رجوع رکھتا ہو اور چاہے زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھاتا رہے اور عورت پر سختی اور تکلیف روا رکھے لہٰذا یہ حق اسے اس صورت میں ہے کہ وہ واقعاً اپنے طرز و طریقے سے پشیمان ہو اور وہ واقعاً اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز چاہتا ہو تب وہ اصلاح کے مطابق رجوع کا حق رکھتا ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ عورت کو ضرر، دلو اور تکلیف نہ پہنچانا چاہتا ہو۔

ضمنی طور پر یہ بھی ملحوظ نظر رہنا چاہیئے کہ آیت کے آخر میں جو مسئلہ رجوع بیان ہوا ہے آیت کے شروع میں بیان ہونے والے حکم عدت ہی سے مربوط ہے اگرچہ ابتداء میں یہ ایک کلی حکم نظر آتا ہے۔ اس لیے آیت صرف طلاقِ رجعی کے بارے میں بھی جائے گی اور اس کے علاوہ طلاق کے کسی طریقے کے بارے میں یہ خاموش ہے لہٰذا یہ امر اس بات کے منافی نہیں کہ عدت اور مدتِ استبراء کے بارے میں جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے طلاق کی کچھ اقسام اس سے مختلف بھی ہیں۔

"ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة"

گزشتہ مسائل کے بعد یہ جملہ عورت اور مرد کے باہمی احترام کے بارے میں ہے جسے طلاق اور عدت کے مسئلے سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شخصی اور اجتماعی حقوق کی طرف راہنمائی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جیسے مرد کے حقوق وضع کیے گئے ہیں تاکہ عورت ان حقوق کا احترام کرے اسی طرح عورت کے مختلف حقوق بھی مرد کے ذمہ ہیں جن کی ادائیگی کا وہ ذمہ دار ہے۔ "بالمعروف" کا لفظ اس سلسلۂ آیات میں بارہ ۱۲ مرتبہ آیا ہے یہ سب اس لیے ہے کہ کوئی اپنے حقوق سے

غلط فائدہ اٹھائے۔ عورت اور مرد دونوں کو مصلحت اندیش ہونا چاہیئے اور باہمی حقوق مناسب طریقے سے ادا کرنے چاہیئں۔

حقوق و فرائض

قرآن یہاں پر ایک بنیادی بات بیان کر رہا ہے اور وہ یہ کہ ہر فرض اور ذمہ داری کے پہلو میں ایک حق بھی ہے یعنی ذمہ داری اور فرض کبھی حق سے جدا نہیں ہوتے۔ مثلاً ماں باپ پر اولاد کے بارے میں کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کے ذمے ان کے کچھ حقوق بھی ہوں گے۔ اس طرح قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل و انصاف کو عام کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بدلے قاضی کے لیے بہت سے حقوق بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ اس طرح انبیاء اور امتوں کا معاملہ بھی ہے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جیسے عورتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح ان کے لیے کچھ حقوق بھی مقرر کیے گئے ہیں مگر ان حقوق و فرائض میں مساوات کی وجہ سے ان میں "عدالت کا اجرا" عملی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے لیے کوئی حق مقرر کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں اس پر فرائض بھی عائد کیے گئے ہوں گے لہٰذا کوئی ایسا شخص میسر نہیں آ سکتا کہ اس کا کوئی حق ہو اور اس کے کندھے پر کوئی فرض اور ذمہ داری نہ ہو۔

"وللرجال علیهن درجة والله عزیز حکیم"

یہ جملہ گذشتہ قانون کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ گذشتہ جملے میں عورت کے بارے میں قانون عدالت مرد کی طرح جاری ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت تمام فرائض اور ذمہ داریوں میں اور پھر ان کے پس منظر میں تمام حقوق میں سو فیصد برابر اور ہم دوش ہوں۔

عورت اور مرد کی جسمانی و روحانی قوت و استعداد میں جو وسیع فرق ہے اسے مد نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے چونکہ عورت کے ذمہ ماں کا حساس فریضہ اور معاشرے کے لیے کبر و مند نسلوں کی پرورش ہے لہٰذا اس میں احساسات و جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ عورت میں احساسات کی اسی برتری کے پیش نظر ضروری ہے کہ بعض اجتماعی فرائض جن میں زیادہ فکری اور نظری قوت درکار ہے ان میں مرد بلند مرتبے کے حامل ہوں کیونکہ ان امور کو جذبات سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ حکومت، قضاوت، گھریلو معاملات کی سرپرستی ایسے امور ہی کی مثالیں ہیں۔ البتہ ان امور کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ بعض خواتین اپنے علم و تقویٰ کے سبب کسی مرحلے میں بہت سے مردوں سے بلند تر ہوں۔

اگر اس پروگرام پر عمل نہ کیا جائے یعنی ہم تمام حقوق اور حالات کے بارے میں ایک ہی قسم کا حکم لاگو کرنے لگیں تو یہ "الرجال قوامون علی النساء" کے کلی قانون کی بھی خلاف ورزی ہوگی عدالت کے اس حکم کو "ولهن مثل الذی علیهن" کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ ہر شخص کو اپنا حق ملنا چاہیئے" کا مفہوم یہ ہے کہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک اپنی مخصوص استعداد، صلاحیتوں، خواہشات اور ساخت کے مطابق اپنی ذمہ داری انجام دے۔ جو کام مرد سے نہیں ہو سکتے عورت اس کی مدد کرے اور جو کام عورت سے نہیں ہو سکتے مرد اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ قانون نظم کا تقاضا ہے کہ احساسات و نرم مزاجی کے

حامل افراد زیادہ فکر و نظر رکھنے والے افراد کی سرپرستی میں ہوں لہذا گھر کی سرپرستی مرد کے ذمے ہے اور عورت کے ذمے ہے کہ گھر کا نظام چلانے میں اس کی معاون ہو۔

عورت اور اس کے حقوق کی تاریخ

پوری تاریخ انسانی میں عورت ایک عجیب دردناک داستان رکھتی ہے۔ عورت کی یہ داستان آج انسانی سوسائٹی کی شناخت کی اہم ترین بحث شمار ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر عورت کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور: ماقبل تاریخ کا ہے جس کے متعلق آج ہمارے پاس کوئی صحیح اطلاع نہیں کہ اس زمانے میں عورت کے حالات کیا تھے ہو سکتا ہے کہ اس دور میں عورت زیادہ تر طبیعی اور فطری حقوق سے بہرہ ور ہو۔

دوسرا دور: آغاز تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے بعض معاشروں میں عورت تمام اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی حقوق میں ایک غیر مستقل شخصیت کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ یہی کیفیت بعض ممالک میں آخری صدیوں تک جاری رہی۔

عورت کے بارے میں یہ طرز فکر فرانس کے قانون مدنی جسے ترقی یافتہ کہا جاتا ہے تک میں نظر آتا ہے۔ نمونے کے طور پر شوہر اور بیوی کے مالی روابط کے سلسلے میں بعض ضوابط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

آرٹیکل نمبر ۲۱۷ اور ۱۱۲۴ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر دار عورت اپنے شوہر کی اجازت اور دستخط کے بغیر کوئی مالی امور انجام نہیں دے سکتی اور اس کا ہر قسم کا لین دین شوہر کی اجازت کا محتاج ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ شوہر اپنے اختیار سے غلط فائدہ نہ اٹھائے اور کسی معقول سبب کے بغیر اجازت دینے سے انکار نہ کرے۔

آرٹیکل نمبر ۱۴۲۳ کے مطابق شوہر حق رکھتا ہے کہ وہ اکیلا اس مال میں جو عورت اور مرد کے درمیان مشترک ہے جیسا چاہے تصرف کرے اور اس میں عورت کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں البتہ جو کام انتظام و اہتمام کی حدود سے خارج ہے اس میں عورت کی موافقت ضروری ہے۔[1]

وہ سرزمین جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا یعنی حجاز میں بھی پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پہلے عورت کے ساتھ ایک محکوم اور غیر مستقل انسان کا سا سلوک روا تھا۔ ان کا طرز عمل نیم وحشی انسانوں کا سا تھا کیونکہ عورت سے رکیک ترین مقاصد حاصل کیے جاتے تھے۔ عورت اس ماحول میں اس قدر بے ارادہ و بے اختیار تھی کہ بعض اوقات اپنے شوہر کے اخراجات کے لیے کرائے پر پیش کی جاتی تھی۔ تمدن سے محرومیت اور فقر و فاقہ کی ابتلاء نے انہیں عجیب و غریب سختی اور خشونت میں مبتلا کر رکھا تھا جس کے زیر اثر وہ عورت کو زندہ گاڑنے کے مشہور جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔

عورت کی زندگی میں نیا مرحلہ

ظہور اسلام اور اس کی مخصوص تعلیمات کے ساتھ عورت کی زندگی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی جو پہلے دو مراحل سے بہت مختلف تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں عورت مستقل اور تمام انفرادی، اجتماعی اور انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوئی۔ عورت

---

[1] حقوق زن در اسلام و اروپا

کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جن کا تذکرہ زیر بحث آیات میں ہے۔ "ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف۔" ــــ یعنی عورت کے معاشرے میں جس قدر فرائض اہم ہیں اسی قدر قابل توجہ حقوق کی بھی مالک ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح کامل انسانی روح اور ارادہ و اختیار کی حامل سمجھتا ہے اور اسے سیر تکامل اور ارتقاء کے عالم میں دیکھتا ہے جو کہ مقصدِ خلقت ہے اسی لیے اسلام دونوں کو ایک ہی صف میں قرار دیتا ہے اور دونوں کو "یا ایھا الناس" اور "یا ایھا الذین اٰمنوا" میں مخاطب کرتا ہے۔ اسلام نے دونوں کے لیے تربیتی، اخلاقی اور عملی پروگرام لازمی قرار دیے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"ومن عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فاولئک یدخلون الجنۃ۔"

یعنی جو بھی مرد یا عورت عمل صالح بجا لائے وہ مومن ہے اور ایسے ہی لوگ جنت میں جائیں گے۔ (مومن ـ ۴۰)

ایسی سعادتیں ہر دو اصناف حاصل کر سکتی ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے:

"من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون":

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے گا اور وہ ایمان دار بھی ہوگا تو ہم اسے پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہوں گے اس کا اچھے سے اچھا اجر و ثواب عطا کریں گے۔ (نحل ـ ۹۷)

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک اسلام کے پروگراموں پر عمل درآمد کے ذریعے معنوی اور مادی تکامل کی منزل پا لیتا ہے اور ایک طیب و پاکیزہ زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ جو کہ آرام و سکون کی منزل ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح مکمل طور پر آزاد سمجھتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"کل نفس بما کسبت رھینۃ"

ہر کوئی اپنے اعمال کے بدلے رہن ہے۔ (مدثر ـ ۳۸)

سورۂ جاثیہ میں ارشاد ہے:

"من عمل صالحا فلنفسہ ۚ ومن اساء فعلیھا"

جو بھی اچھا کام کرے تو یہ اس کے اپنے فائدے میں ہے اور جو برا کام کرے وہ بھی اس کا نتیجہ خود بھگتے گا۔ (جاثیہ ـ ۱۵)

یہ آیات بلا تفریق مرد اور عورت سب کے لیے ہیں۔ اسی لیے سزاؤں کے بارے میں ایک آیت یوں ہے۔

"الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مأۃ جلدۃ"

زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔ (نور — ۲)

ایسی دیگر آیات میں بھی دونوں کے لیے ایک جیسے گناہ پر ایک جیسی سزا کا حکم سنایا گیا ہے۔

ارادہ و اختیار سے استقلال پیدا ہوتا ہے۔ یہی استقلال اسلام اقتصادی حقوق میں لاتا ہے۔ اسلام بغیر کسی رکاوٹ کے ہر قسم کے مالی رابطے عورت کے لیے روا جانتا ہے اور عورت کو اس کی در آمد اور سرمائے کا مالک شمار کرتا ہے سورہ نساء میں ہے۔

"للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن"

مرد جو کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصہ ہے۔ (نساء — ۳۲)

لغت میں اکتساب کا معنی کسب کے برعکس ہے۔ اکتساب کا نتیجہ کسب کرنے اور حاصل کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے [1] اسی طرح قانون کلی ہے کہ:

"الناس مسلطون علی اموالھم"

یعنی — تمام لوگ اپنے مال پر مسلط ہیں۔

اس قانون کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اسلام عورت کے اقتصادی استقلال کا احترام کرتا ہے اور عورت و مرد میں اس نے کوئی فرق نہیں رکھا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی نظر میں عورت معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے اور اسے ایک بے ارادہ، محکوم اور قیم و نگران کا محتاج وجود ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے۔

مساوات کے مفہوم میں اشتباہ نہ ہو

اسلام نے مساوات کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہمیں بھی متوجہ ہونا چاہیئے لیکن خیال رہے کہ بعض لوگ بے سوچے سمجھے جذبات کی رو میں بہہ کر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور مرد اور عورت کے روحانی و جسمانی فرق اور ان کی ذمہ داریوں کے اختلاف تک سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔

ہم جس چیز کا چاہے انکار کریں تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان دو صنفوں میں جسمانی و روحانی طور پر بہت فرق ہے۔ مختلف کتب میں اس کی تفصیلات موجود ہیں اور یہاں ہمیں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورت وجود انسانی کی پیدائش کا ظرف ہے۔ نونہالوں کا رشد اسی کے دامن میں انجام پاتا ہے۔ جیسے وہ جسمانی طور پر آنے والی نسلوں کی پیدائش، تربیت اور پرورش کے لیے پیدا کی گئی ہے اسی طرح روحانی طور پر بھی اسے عواطف، احساسات اور جذبات

---

[1] مفردات راغب دیکھئے۔ البتہ یہ مفہوم اس موقع پر ہے جہاں کسب اور اکتساب ایک دوسرے کے مد مقابل ہوں۔

کا زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔

ان وسیع اختلافات کی موجودگی میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرد اور عورت کو تمام حالات میں ہم قدم ہونا چاہیئے اور تمام کاموں میں انہیں سو فیصد مساوی ہونا چاہیئے۔

کیا عدالت اور مساوات کے حامیوں کو معاشرے کے تقاضوں کے حوالے سے بات کرنا چاہیے؟ کیا یہ عدالت نہیں کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری ادا کرے اور اپنے وجود کی نعمتوں اور خوبیوں سے بہرہ مند ہو؟ اس لیے، کیا عورت کا ایسے کاموں میں دخیل ہونا جو اس کی روح اور جسم سے مناسبت نہیں رکھتے خلافِ عدالت نہیں؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جو عدالت کا ہی طرفدار ہے مرد کو کسی ایک اجتماعی کاموں میں سختی یا زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے مثلاً گھر کے معاملات کی سرپرستی وغیرہ میں مقدم رکھتا ہے اور معاونت و کمک کا مقام عورت کے سپرد کر دیتا ہے ایک گھر اور ایک معاشرے کو منتظم کی ضرورت ہے اور نظم و ضبط کا آخری مرحلہ ایک ہی شخص تک انجام پذیر ہونا چاہیے ورنہ کشمکش اور ہرج مرج پیدا ہوگا۔

اگر تمام تعصبات سے بے نیاز ہو کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ مرد کی ساخت کے پیش نظر ضروری ہے کہ گھر کی سرپرستی اس کے ذمے رکھی جائے اور عورت اس کی معاون ہو۔ اگرچہ کچھ لوگ ان حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

آج کی دنیا میں بھی بلکہ ان اقوام میں بھی جو عورتوں کو مکمل آزادی و مساوات دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خارجی حالات زندگی نشاندہی کرتے ہیں کہ عملی طور پر وہی بات ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اگرچہ باتوں میں اس کے برخلاف کہتے ہیں۔

۲۲۹۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ
اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۲۹۔ طلاق (جس میں رجوع ہے) دو مرتبہ ہے (اور ہر مرتبہ) مناسب طریقے سے اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے (اور صلح کر لے) یا نیکی کے ساتھ اسے چھوڑ دے (اور اس سے الگ ہو جائے) اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ انہیں جو چیز دی ہے وہ ان سے واپس لو۔ مگر یہ کہ دونوں (میاں بیوی) اس سے ڈریں کہ وہ حدودِ الٰہی

کی پاسداری نہیں کر سکیں گے اگر انہیں خوف ہے کہ وہ حدود الٰہی کا لحاظ نہ کر سکیں گے تو پھر ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ عورت فدیہ اور عوض دے دے (اور طلاق لے لے) یہ حدود اور خدائی سرحدیں ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے وہ ظالم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے کہ عدت اور رجوع کا قانون خاندانوں کی اصلاح اور جدائی کو روکنے کے لیے ہے لیکن اسلام لانے والے نئے مسلمان اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور بیوی کو تکلیف اور سختی پہنچانے کے لیے پے در پے طلاق دیتے اور عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیتے۔ اس طرح وہ عورت پر سختی کرتے اور اسے مصیبت میں مبتلا رکھتے۔

زیر بحث آیت اس غیر انسانی فعل کو روکتی ہے۔ ارشاد ہے کہ دو مرتبہ تک طلاق اور رجوع صحیح ہے لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق انجام پذیر ہوئی تو پھر رجوع کا حق نہیں ہے۔ اور آخری طلاق یہی تیسری طلاق ہے۔ البتہ "الطلاق مرتان" سے مراد ہے وہ طلاق جس میں رجوع ممکن ہے اور جس کے بارے میں "امساک بمعروف" صادق آتا ہے جو دو سے زیادہ نہیں اور تیسری طلاق میں رجوع نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت گواہی دیتی ہے۔

"امساک" کا معنی ہے۔ روکے رکھنا اور "تسریح" کا معنی ہے چھوڑ دینا۔ جب کشمکش، طلاق اور پھر صلح اور رجوع کی نوبت دو مرتبہ ہو گزرے تو پھر مرد کو چاہیئے کہ معاملے کو ایک طرف کرے۔

یہاں دو نکات قابل توجہ ہیں:۔

۱۔ جس طرح رجوع کرنے اور عورت کو روک رکھنے میں "معروف" کی شرط ہے یعنی رجوع اور روکے رکھنا صلح و صفائی اور خلوص و محبت کی بنیاد پر ہو اسی طرح جدائی بھی "احسان" کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی علیحدگی اور جدائی ہر طرح کے ناپسندیدہ امر سے پاک ہو مثلاً انتقام، غیظ، غضب اور کینہ سے مبرا ہو اور کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا یہ حصہ احسان ہی کی وضاحت کر رہا ہے

"لا یحل لکم ان تأخذوا مما آتیتموھن شیئا"۔

۲۔ "الطلاق مرتان" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو یا تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں انجام نہیں پا سکتیں بلکہ چاہیئے کہ وہ متعدد مواقع پر واقع ہوں۔ خصوصاً جب تعدد طلاق کا مقصد یہ ہے کہ رجوع کا زیادہ موقع مل سکے اور شاید پہلی کشمکش کے بعد صلح و صفائی برقرار ہو جائے اور اگر پہلی مرتبہ صلح و آشتی نہ ہو سکے تو شاید دوسری مرتبہ ہو جائے۔ لیکن ایک ہی موقع پر متعدد طلاقوں سے یہ راستہ بالکل مسدود ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح تعدد طلاق عملی طور پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

مکتب تشیع میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے لیکن اہل سنت کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف نظر ہے۔ البتہ زیادہ تر کا عقیدہ یہی ہے کہ تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی جا سکتی ہیں۔

تفسیر المنار کے مولف مسند احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم (جیسی اہل سنت کی بنیادی کتب) سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے سے لے کر حضرت عمر کی خلافت کے دو سال تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں اور یہ مسئلہ سب اصحاب پیغمبرؐ کے نزدیک متفق علیہ تھا لیکن اُس وقت خلیفہ دوم نے حکم دیا کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں

اہل سُنت کے مفتی اعظم نے شیعہ نظریہ تسلیم کر لیا

خلیفہ دوم کے حکم کے باوجود یہ مسئلہ اہل سنت کے ہاں متفق علیہ نہیں رہا۔ اہل سنت کے بہت سے علماء نے دیگر علماء سے اختلاف کرتے ہوئے شیعہ نقطۂ نظر کو انتخاب کیا ہے۔ ان میں سے جامعہ الازہر کے سابق رئیس اور اہل سنت کے مفتی اعظم شیخ محمود شلتوت لکھتے ہیں۔

> میں ایک عرصے تک مشرق کے کالج میں مذاہب کی تحقیق اور ان کے درمیان موازنہ و تقابل میں مصروف رہا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ میں کسی ایک مسائل میں مختلف مذاہب کی آراء و نظریات کی طرف جو ع کرتا۔ بہت سے مقامات پر میں نے شیعہ مذہب کے استدلالات کو محکم اور استوار دیکھا تو ان کے سامنے جھکا اور میں نے ان میں شیعہ نظریے کو انتخاب کر لیا۔
>
> اس سلسلے میں چند مثالوں کے ذیل میں وہ مزید لکھتے ہیں:
>
> ایک ہی مجلس کی تین طلاقیں اہل سنت کے چاروں مذہب میں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ لیکن شیعہ امامیہ عقیدے کے مطابق وہ ایک سے زیادہ طلاقیں شمار نہیں ہوتیں۔ چونکہ واقعاً قانون کی نظر اور اجتماعی کیفیات کی نظر سے اہل التشیع کی رائے حق ہے۔ اس لیے اہل سنت کا فقہ قانونی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے[1]

"ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئا."

گزشتہ جملے میں کہا جا چکا ہے کہ علیحدگی احسان کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ زیر نظر جملہ اسی کی وضاحت بھی ہے اور ایک مستقل حکم بھی ہے زیر بیان مواقع کے لیے ایک نمونہ بھی ہے جو احسان کی بنیاد پر علیحدگی کی تشریح کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جو چیز حق مہر کے طور پر ادا کر دے چکا ہے وہ واپس نہیں لے سکتا۔ سورہ نساء آیات ۲۰ و ۲۱ میں یہ حکم زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"الا ان یخافا الا یقیما حدود الله فان خفتم الا یقیما حدود الله فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ."

صرف ایک صورت میں حق مہر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ جب عورت خود ازدواجی زندگی کو جاری رکھنا نہ چاہتی ہو اور یہاں تک کہ اُس کے عدم میلان اور نفرت کی وجہ سے اندیشہ ہو کہ عورت اور مرد حدود الٰہی کی حفاظت نہ کر سکیں گے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ حق مہر عوض کے طور پر شوہر کو دے دیا جائے تاکہ وہ عورت کو طلاق دے دے[2]

---

[1] [illegible] [2] [illegible]

"تِلۡكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوهَا ۚ وَمَنۡ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ"

"تلک" ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ جملوں میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ حقیقت میں یہ احکام اجتماعی، اخلاقی اور فقہی نکات کا مجموعہ ہیں جنہیں پروردگار نے اجتماعی روابط کے استحکام کے لیے وضع اور بیان فرمایا ہے۔

زیر نظر جملے میں کہا گیا ہے کہ اگر بعض لوگ افراد کا شکار جہل اور ناجائز میلانات کی وجہ سے حدودِ الٰہی سے بے پرواہ ہو جائیں تو ان کا شمار ستمگروں اور ظالموں میں ہوگا۔

یہ اشخاص کس پر ظلم کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت اس آیت میں موجود نہیں البتہ سورہ طلاق کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"من یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ."

جو شخص حدود خدا سے تجاوز کرتا ہے وہ پہلے ہی نفس پر ظلم کرتا ہے

اور واقعاً ایسا ہی ہے کیونکہ قوانینِ خداوندی کی سرحدوں سے تجاوز کرنے کا نقصان سب سے پہلے تجاوز کرنے والوں ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ انہی قوانین کے سائے میں ان کے حقوق کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ اب اگر قانون شکنی اور سرحد سے تجاوز کرنا رائج ہو جائے تو اس کا نقصان ان لوگوں کے دامن کو بھی آئے گا جنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی ہے۔

خدائی سرحدیں

اس آیت اور قرآن مجید کی دیگر بہت سی آیات میں قوانینِ الٰہی کے بارے میں ایک لطیف تعبیر نظر آتی ہے اور وہ ہے حدود و سرحد۔ اس طرح قوانین کی نافرمانی اور مخالفت سرحد سے تجاوز شمار ہوتا ہے۔ حقیقت میں انسان جو کام انجام دیتا ہے اس میں ان مقامات ممنوعہ کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے جہاں داخل ہونا بہت زیادہ خطرناک ہے۔ قوانین و احکام الٰہی ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان مقامات کی پہچان کیلئے ان قوانین میں بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"تلک حدود اللّٰہ فلا تقربوھا."

یہ خدائی سرحدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

کیونکہ ان سرحدوں کے قریب جانے والا گرنے کے بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔ اہل بیتؑ کے طریقوں سے مروی احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مشتبہ مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا کرنا سرحد کے قریب جانے کے مترادف ہے ممکن ہے کہ سرحد کے قریب پہنچ کر انسان قدم اس طرف رکھ دے۔ اور ہلاکت و تباہی کا شکار ہو جائے۔

۲۳۰۔ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا
غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ

ہوتا ہے ، اگر یہ بنیاد شکستہ بھی ٹوٹ جائے اور سابق میاں بیوی دوبارہ ایک دوسرے سے تعلق پیدا کریں اور حتمی طور پر گھریلو فرائض کی انجام دہی کا پختہ ارادہ کر لیں تو پھر رجوع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ نیا نکاح تحریم کے حکم کو ختم کر دے گا ۔ اسی لیے اسے محلل کا نام دیا گیا ہے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ محلل ایک بنیادی مسئلے اور حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہاں نئے نکاح کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ آیت کے علاوہ روایات سے بھی واضح طور پر یہی معنی نکلتا ہے ۔ ایک سرسری مطالعے سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر بحث ایک حقیقی اور حتمی ازدواج کے بارے میں ہے لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے دائمی نکاح کا مقصد نہ رکھتا ہو اور صرف ظاہری طور پر ایسا کرے تاکہ محلل کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ نکاح بے شبہ ہے کیونکہ اس صورت میں دوسرا نکاح بھی باطل ہوگا اور پہلا شوہر بھی پھر سے عورت کے لیے حلال نہیں ہوگا ۔ ہو سکتا ہے مذکورہ حدیث "لعن اللہ المحلل والمحلل لہ" اسی قسم کے محلل کی طرف اشارہ ہو۔

۲۳۱۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ
ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ
وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ
وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ
وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۳۱۔ جب عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت کے آخری دنوں کو پہنچ جائیں تو یا انہیں صحیح طریقے سے اپنے ہاں رکھ لو اور (ان سے صلح کر لو) اور یا انہیں پسندیدہ طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لیے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے ہی اوپر ظلم کیا (اور ان احکام اور قوانین سے غلط فائدہ اٹھا کر) آیات خدا کا مذاق نہ اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمت الٰہی، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں ان کے ذریعے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اسے یاد کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے (اور وہ ان لوگوں کی نیتوں سے باخبر ہے جو قوانین الٰہی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں)۔

"تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ"

"تلک" ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ جملوں میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ حقیقت میں یہ احکام اجتماعی، اخلاقی اور فقہی نکات کا مجموعہ ہیں جنہیں پروردگار نے اجتماعی روابط کے استحکام کے لیے وضع اور بیان فرمایا ہے۔

زیر نظر جملے میں کہا گیا ہے کہ اگر بعض لوگ افراط کا شکار ہوں اور ناجائز میلانات کی وجہ سے حدود الٰہی سے بے پرواہ ہو جائیں تو ان کا شمار ستمگروں اور ظالموں میں ہوگا۔

یہ اشخاص کس پر ظلم کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت اس آیت میں موجود نہیں البتہ سورہ طلاق کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ"

جو شخص حدود خدا سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرتا ہے

اور واقعاً ایسا ہی ہے کیونکہ قانون خداوندی کی سرحدوں سے تجاوز کرنے کا نقصان سب سے پہلے تجاوز کرنے والوں ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اسی قانون کے سائے میں ان کے حقوق کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ اب اگر قانون شکنی اور سرحد سے تجاوز کرنا رائج ہو جائے تو اس کا نقصان ان لوگوں کے دامن گیر بھی آئے گا جنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی ہے۔

خدائی سرحدیں

اس آیت اور قرآن مجید کی دیگر بہت سی آیات میں قوانین الٰہی کے بارے میں ایک لطیف تعبیر نظر آتی ہے اور وہ ہے حد اور سرحد۔ اس طرح قوانین کی نافرمانی اور مخالفت سرحد سے تجاوز شمار ہوتا ہے۔ حقیقت میں انسان جو کام انجام دیتا ہے اس میں ان منطقات ممنوعہ کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے جہاں داخل ہونا بہت نقصان دہ اور خطرناک ہے۔ قوانین و احکام الٰہی ان منطقات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان منطقات کی پہچان کیلئے ان قوانین میں بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا"

یہ خدائی سرحدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

کیونکہ ان سرحدوں کے قریب جانے والا گرنے کے بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔ اہل بیت کے طریقوں سے مروی احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مشتبہ مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا کام سرحد کے قریب جانے کے مترادف ہے ممکن ہے کہ سرحد کے قریب پہنچ کر انسان قدم اس طرف رکھ دے۔ اور ہلاکت و تباہی کا شکار ہو جائے۔

۲۳۰۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا

إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۳۰۔ اگر، دو مرتبہ طلاق دینے اور پھر رجوع کر لینے کے بعد پھر) اسے طلاق دے تو اس کے بعد وہ عورت اس پر حلال نہیں ہوگی مگر یہ کہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی کرے (اور وہ اس سے جنسی ملاپ کرے۔ بعد از اں وہ دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں (اور عورت اپنے پہلے شوہر سے پھر سے شادی کر لے) جب کہ انہیں اُمید ہو کہ وہ حدود الٰہی کا احترام کریں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں خدا آگاہ لوگوں سے بیان کرتا ہے۔

شانِ نزول

ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی: میں اپنے چچازاد رفاعہ کی بیوی تھی۔ اس نے مجھے تین مرتبہ طلاق دی تو میں نے ایک اور شخص عبدالرحمٰن سے شادی کر لی۔ اتفاقاً اس نے بھی مجھے طلاق دے دی لیکن اس دوران میں اس نے مجھ سے ہم بستری نہیں کی۔ کیا اب میں پہلے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہوں؟

آنحضرتؐ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ پہلے شوہر سے تیری شادی اسی صورت میں صحیح ہے جب نئے شوہر نے تجھ سے مباشرت کی ہو۔

اس واقعے کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی

تفسیر

گذشتہ آیت میں اجمالی طور پر یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری طلاق کے بعد عورت اور مرد الفت و صلح کی راہ اپنا لیں یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

یہ آیت حقیقت میں ایک تبصرہ ہے جو گذشتہ آیت سے منسلک ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جدائی کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے لیکن عورت دوسری شادی کرے۔ اور دوسرے شوہر سے مباشرت کے بعد طلاق لے لے تو اس صورت میں چاہے تو پہلے شوہر سے صلح کر سکتی ہے اور امید رکھے کہ اگر وہ حالات کو ساز گار رکھیں اور حدود الٰہی کا احترام کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اسلام کے عظیم رہبروں سے جو روایات پہنچی ہیں اُن میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دوسرا نکاح دائمی ہو اور نکاح کے بعد میاں بیوی کے تعلقات بھی عملی طور پر انجام پائیں۔ روایات سے قطع نظر یہ دونوں شرطیں خود آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ لفظ نکاح جنسی عمل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور صیغہ عقد کے اجراء کے لیے بھی جیسا کہ آیت کی شانِ نزول میں اس کی صراحت ہو چکی ہے نیز "فان طلقها" سے دوسری شرط یعنی نکاح کا دائمی ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ نکاح موقت طلاق کا محتاج نہیں ہوتا۔

بے راہ روی سے روکنے کا ایک عامل

بعض حیلہ باز محلل کے اس حکم کو غلط مقاصد کے لیے دستاویز بناتے ہیں اور کچھ بے خبر لوگوں کی جہالت اور جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بارے میں اسلام پر نامردانہ حملے کرتے ہیں لیکن احکام طلاق میں غور کرنے اور ان کے فلسفے کی طرف متوجہ ہونے سے حقیقت کے متلاشی اس قانون کے ایک عجیب نقش سے آشنا ہوتے ہیں۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے طلاق بھی مخصوص حالات میں شادی کی طرح ایک حیاتی عمل اور ضروری امر شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن خاندانوں میں جدائیاں عموماً فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ لہذا مختلف طریقوں کے ذریعے طلاق کے عمل سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

محلل کا عمل یا شادی کرنا ان طریقوں میں سے ایک ہے کیونکہ تین طلاقوں کے بعد عورت کا رسمی طور پر نکاح کرنا طلاق کے عمل کو جاری رکھنے کی راہ میں ایک بہت بڑا بند اور رکاوٹ ہے۔ جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینا چاہے گا جب اس کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ اس طرح اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی تو اس کا ارادہ ضرور متزلزل ہوگا اور جب تک وہ مجبور نہ ہوگا اس قسم کا کام نہیں کرے گا۔ حقیقت میں محلل کا طریقہ جسے زیادہ صحیح لفظوں میں عورت کا دوسرے شوہر سے نیا نکاح کہا جا سکتا ہے، طلاق کے عمل میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ ہوس پرست اور فریب کار مردوں کے لیے رکھا گیا ہے تاکہ وہ عورت کو اپنی سرکش ہوس کا کھلونا نہ بنائیں اور قانون طلاق و رجوع سے لامحدود فائدہ نہ اٹھاتے رہیں۔

دوسرے نکاح کی شرائط مثلاً اس کا دائمی ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ اس نئے رشتے کا مقصد یہ نہیں کہ اس کے ذریعے پہلے شوہر اور بیوی کے بچھڑے ملنے کا ذریعہ بن جائے۔ لہذا اس قانون سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور نکاح موقت کے ذریعے رکاوٹ دور نہیں کی جا سکتی۔

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جو اس مفہوم کو بہت ہی واضح کر دیتی ہے۔ اس روایت کے مطابق جو لوگ اس مسئلے کی انحرافی صورت پر عمل کرتے ہیں یعنی شادی اس مقصد کے لیے کرتے ہیں کہ عورت پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکے وہ رحمت خدا سے دور ہیں۔

"لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہ"

خدا کی لعنت ہر محلل پر اور اس پر جس کے لیے یہ محلل بنا ہے [1]

اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تین طلاقوں کے بعد مرد اور عورت ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور پھر اپنی مرضی سے نئی زندگی کی تشکیل کریں اور شادی جو بذات خود ایک مقدس امر ہے پہلے شوہر کے شیطانی رجحانات کا کھلونا نہ بن جائے۔

البتہ چونکہ اسلام ہمیشہ عاقلانہ خواہشات کا احترام کرتا ہے اور اصلاح کے ہر دریچے سے استفادہ کرتا ہے۔ لہذا ارشاد

---

[1] المنار: ج ٢،

ہوتا ہے ۔ اگر یہ نیا رشتہ بھی ٹوٹ جائے اور سابق میاں بیوی دوبارہ ایک دوسرے سے تعلق پیدا کریں اور حتمی طور پر گھر یلو فرائض کی انجام دہی کا پختہ ارادہ کرلیں تو پھر رجوع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ نیا نکاح تحریم کے حکم کو ختم کر دے گا ۔ اسی لیے اسے محلل کا نام دیا گیا ہے ۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ محلل ایک بنیادی مسئلے اور حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہاں تئے نکاح کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ آیت کے علاوہ روایات سے بھی واضح طور پر یہی معنی نکلتا ہے ۔ ایک سرسری مطالعے سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر بحث ایک حقیقی اور حتمی ازدواج کے بارے میں ہے لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے دائمی نکاح کا مقصد نہ رکھتا ہو اور صرف ظاہری طور پر ایسا کرے تاکہ محلل کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ نکاح بے اثر ہے کیونکہ اس صورت میں دوسرا نکاح بھی باطل ہوگا اور پہلا شوہر بھی پھر سے عورت کے لیے حلال نہیں ہوگا ۔ ہو سکتا ہے مذکورہ حدیث " لعن اللہ المحلل والمحلل لہ " اسی قسم کے محلل کی طرف اشارہ ہو ۔

۲۳۱ - وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْآ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۳۱ - جب عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت کے آخری دنوں کو پہنچ جائیں تو یا انہیں صحیح طریقے سے اپنے ہاں رکھ لو اور (اُن سے صلح کر لو) اور یا انہیں پسندیدہ طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لیے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے ہی اوپر ظلم کیا (اور ان احکام اور قوانین سے غلط فائدہ اٹھا کر) آیات خدا کا مذاق نہ اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمت الٰہی ، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں ان کے ذریعے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اسے یاد کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے (اور وہ ان لوگوں کی نیتوں سے باخبر ہے جو جو قوانین الٰہی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں) ۔

تفسیر

گذشتہ آیات کے بعد اس آیت میں اسلام طلاق کے بارے میں وضع کردہ حد بندیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ حقوق اور عورت کے احترام سے چشم پوشی نہ کی جا سکے۔

آیت کہتی ہے کہ جب تک عدت کی مدت ختم نہ ہو اگرچہ اس کا آخری دن باقی ہو مرد کو اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے صلح کرے اور دونوں خلوص و محبت سے زندگی بسر کرنے لگیں " فامسکوھن بمعروف " اگر حالات ناساعد ہیں تو اسے چھوڑ دے " او سرحوھن بمعروف " لیکن توجہ رہے کہ رجوع یا علیحدگی ہر صورت میں احسان اور نیکی ملحوظ رہے اور جذبہ انتقام سے یہ کام انجام نہیں پانا چاہیئے۔

" ولا تمسکوھن ضرارًا لتعتدوا ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ "

یہ جملہ " معروف " کی تفسیر ہے یعنی رجوع صدق و صفا اور خلوص و محبت کی بنا پر ہو۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق اور رجوع کو انتقام لینے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لہٰذا آیت قطعی لہجے میں کہتی ہے کہ عورت کو آزار و تعدی کے مقصد سے زوجیت کی قید میں نہ رکھا جائے کیونکہ ایسا کرنا اس پر نہیں بلکہ خود تمہارے نفس پر بھی ظلم ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ بیوی پر ظلم کرنا کس طرح اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ اس کی وجوہ یہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ حق کشی کی بنیاد پر کیئے جانے والے رجوع میں کوئی سکون و آرام میسر نہیں آسکتا۔

۲۔ قرآن کی نگاہ میں مرد اور عورت نظام خلقت میں ایک پیکر کے دو جزو ہیں اس بنا پر عورت پر ظلم کرنا اپنے ہی حقوق پامال کرنے کے مترادف ہے۔

۳۔ جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے دراصل وہ خدا کے عذاب کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اور حقیقت میں اس طرح وہ اپنے اوپر ہی ظلم کر رہا ہوتا ہے۔

خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ

" ولا تتخذوا آیات اللہ ھزوًا واذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ "

" ھزو " اور " ھزوء " کا معنی تمسخر کرنا ہے۔

عموماً ہزار لوگ شرعی احکام کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے وجدانی دباؤ سے بچنے کے لیئے اور اپنے خیال میں) عذاب الٰہی سے فرار کے لیئے شرعی حیلے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آیات و احکام کے ظواہر کو اپنے لیئے دستاویز بنا لیتے ہیں۔ اس روش کو قرآن آیات قرآن اور احکام الٰہی سے استہزاء اور تمسخر قرار دیتا ہے۔

بات باعثِ افسوس ہے کہ بہت سے احکام کے بارے میں ایسا انحراف عموماً نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ طلاق کے معاملے میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مرد کے لیے حق رجوع ازدواج اور شادی کو زیادہ سے زیادہ پائیدار بنانے کے لیے ہے لیکن بعض لوگ اس مقصد کے برعکس اقدام کرتے ہیں یعنی رجوع حق کی اجازت کو عورت سے انتقام لینے اور اسے آزار پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح قانون پر عمل کرنے کے پردے میں اپنے حقیقی ظالمانہ چہرے کو چھپاتے ہیں اسی کو قرآن اور قانون کا تمسخر اڑانا کہتے ہیں۔ محل بحث آیت کہتی ہے: آیاتِ خدا کو کھلونا نہ بناؤ اور خدا کی عظیم نعمت دین اور آسمانی کتاب کو یاد رکھو جو تمہاری سعادت کے لیے آئے ہیں۔

دین اور اس کے تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ جہانِ ثابت کا نظام ہے جسے نوعِ انسانی کے حقیقی مصالح کی روشنی میں بنایا گیا ہے اس لیے مصالح سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے بعض احکام کے ظاہری طریقوں کو اپنا کر بے روح سانچے نہ بناؤ۔ کہیں یہ طرزِ عمل خود تمہارے فوائد کو بھی خطرے میں ڈال دے گا اور آیات خدا کے سامنے مذاق اڑانے کا جرم بھی شمار نہ کر لیا جائے۔

" واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بکل شیء علیم "

آیت کے آخر میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے لیے احکام الٰہی سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی گرفت کی گئی ہے اور ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ تمہارے کاموں اور اس جہان کے تمام اسرار سے آگاہ ہے:

۲۳۲۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳۲۔ اور جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت تمام ہو جائے تو اگر پسندیدہ طریقے اور باہمی رضا مندی سے وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس سے نہ روکو۔ اس حکم سے تم سے بس وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں (اور اس پر عمل کرتے ہیں) جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں یہ (احکام) تمہارے (خانوادوں کے) نشوونما کے لیے زیادہ موثر اور آلودگیوں کو دھونے کے لیے زیادہ مفید ہیں اور خدا جانتا ہے (لیکن) تم نہیں جانتے۔

شانِ نزول

معقل بن یسار پیغمبر اکرمؐ کا ایک صحابی تھا۔ اس کی ایک بہن جمیلہ تھی۔ عاصم بن عدی اس کی بہن کا پہلا شوہر تھا۔ وہ عاصم سے اپنی بہن کی دوبارہ شادی کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ عاصم نے قبل ازیں اسے طلاق دے دی تھی۔
اس بناء پر آیت نازل ہوئی جس میں اس قسم کی مخالفت سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جابر بن عبداللہ نے اپنی چچازاد کی پہلے شوہر سے دوبارہ شادی کی مخالفت کی تھی شاید زمانہ جاہلیت میں اکثر اوقات قریبی رشتہ داروں کو یہ حق دیا جاتا تھا۔

(اس میں شک نہیں کہ ہماری فقہ میں بھائی اور چچازاد اپنی بہن یا چچا کی بیٹی پر ایسا حق نہیں رکھتے لیکن مندرجہ بالا آیت جیسا کہ ذکر آئے گا۔ ایک کلی مفہوم کی حامل ہے اور اس کے مطابق ولی یا غیر ولی کوئی شخص بھی یعنی باپ۔ ماں چچازاد بھائی اور دوسرے لوگوں میں سے کوئی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ ایسی شادی کی مخالفت کرے)۔

تفسیر

ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی

جیسا کہ گذشتہ مباحث میں گزر چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں پابندیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ارادے، فکر و نظر اور میلان و رغبت کی کوئی حیثیت نہ تھی اور وہ خود سر مردوں کے ارادہ و میلان کے تابع تھیں۔ اس کیفیت کا ایک نمونہ انتخاب شوہر کا مسئلہ بھی تھا جس میں عورتوں کی خواہش و رغبت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس روش میں معاملہ یہاں تک جا پہنچا تھا کہ اگر عورت رسمی نکاح بھی کر لیتی اور اس کے بعد اس شوہر سے علیحدگی ہو جاتی تو نئے سرے سے اس سے وابستگی بھی ولی (یا اولیاء) کے ارادے پر موقوف تھی۔ بعض اوقات اگر میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے تو ان کے اولیاء اپنے منافع کی خاطر یا خیالات و موہومات کی بناء پر اس تعلق میں حائل ہو جاتے۔
قرآن صراحت سے اس روش کو مذموم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اولیاء اور دیگر افراد ہرگز ایسا کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ جب میاں بیوی جو شادی کے دو اصلی اور بنیادی رکن ہیں وہ ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ علیحدگی کے بعد پھر شادی کرلیں تو دوسروں کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔
گذشتہ آیت میں "بلوغ اجل" کا معنی ہے عورت کے آخری دنوں تک پہنچنا لیکن اس آیت میں نئے سرے سے ازدواج کے قرینے سے "بلوغ اجل" سے مراد آخری دن کا گزر جانا ہے۔ اصطلاح کے مطابق گذشتہ آیت میں غایت "مغیا" کا جزء تھی اور یہاں "مغیا" سے خارج ہے۔
اس بناء پر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیبہ عورتیں یعنی جنہوں نے ایک دفعہ شادی کرلی ہے وہ دوبارہ شادی کے لیے اولیاء کی تائید حاصل کرنے کی بالکل محتاج نہیں ہیں یہاں تک کہ ان کی مخالفت بھی بے اثر ہے لیکن کیا باکرہ لڑکیاں ولی کی اجازت کی محتاج ہیں یا نہیں، اس بارے میں آیت خاموش ہے۔ اس کی تشریح کتب فقہ میں موجود ہے۔ آیت کا آخری حصہ کہتا ہے

کہ احکام کا یہ سلسلہ جو تمہارے نفع کے لیے بیان ہوا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو کائنات کے پیدا کرنے والے اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب تک انسان خدا پرستی اختیار کر کے خود پرستی سے نجات حاصل نہ کرے اپنے میلانات پر ہرگز کنٹرول نہیں کر سکتا اور کج روی سے بالکل نہیں بچ سکتا۔

"ذٰلکم ازکٰی لکم و اطھر واللہ یعلم و انتم لا تعلمون"

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ سو فیصد تمہارے حق میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اطلاعات کی کمی کی وجہ سے تمہیں احکام کے فلسفہ سے واقفیت حاصل نہ ہو لیکن وہ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے اس نے یہ احکام تمہارے منافع کے تحفظ، خاندانوں کی طہارت اور پاکیزگی کے لیے جاری کیے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے اس جملے میں ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ تزکیہ بھی اور طہارت بھی قرار دیا ہے "ازکی لکم و اطھر" اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کرنا ایک تو ان مختلف آلودگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرتا ہے جو غلط کاموں کے سبب خاندانوں کے دامن گیر ہو جاتی ہیں اور دوسرا اس کا حاصل یہ ہے کہ انہیں نشوونما، تکامل اور خیر و برکت نصیب ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ تزکیہ کا اصلی لغوی معنی نمو پانا اور بڑھنا ہی ہے۔

۲۳۳۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ
وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ
وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ
ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

ترجمہ

۲۳۳۔ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلاتی ہیں (یہ) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کے دور کی تکمیل کرنا چاہے اور اس (باپ) کے لیے جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے ضروری ہے وہ ان ماؤں کو (دودھ پلانے کی مدت میں) مناسب طریقے سے خوراک اور لباس دے (اگرچہ وہ طلاق لے چکی ہوں)۔

کسی شخص کی ذمہ داری اس کی قوت وطاقت سے زیادہ نہیں ہے نہ ماں بچے کو اس کے باپ سے اختلاف کی وجہ سے ضرر پہنچانے کا حق رکھتی ہے اور نہ باپ اور اس کے وارث پر ایسا کرنا لازم ہے (کہ وہ دودھ پلانے کی مدت میں ماں کے اخراجات مہیا کرے) اور اگر وہ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ (زیادہ جلدی) چھڑوا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر (طاقت نہ رکھنے یا ماں کے موافق نہ ہونے سے) اپنے بچوں کے لیے کوئی دایا لے آؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ماں کا گذشتہ حق شائستہ اور مناسب طریقے سے ادا کر دو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

لغت عرب میں "والدہ" ماں کو کہا جاتا ہے لیکن لفظ "اُم" بہت وسیع معنی کا حامل ہے۔ یہ لفظ کبھی ماں کے لیے اور کبھی ہر چیز کی جڑ اور بنیاد کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں قرآن نومولود بچوں کو دودھ پلانے کے لیے مختلف طریقے اور اس سلسلے میں مختلف حقوق بیان کرتا ہے ان کا تعلق ماں، بیٹا اور باپ سے ہے۔ اس آیت سے مجموعی طور پر سات احکام حاصل ہوتے ہیں۔

نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے بارے میں سات احکام

۱۔ دودھ پلانے کے دو سالوں میں دودھ پلانے کا حق ماں سے مخصوص ہے اور وہی اس مدت میں بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور وہی دیکھ بھال بھی کرے گی۔ اگرچہ چھوٹے بچوں کی ولایت باپ کے ذمہ ہے لیکن نوزائیدہ بچے کو ماں کی دیکھ بھال اور سرپرستی میں دے دیا گیا ہے کیونکہ نومولود کے جسم و روح کی غذا کے طور پر ماں کا دودھ اور شفقت مادری درکار ہے۔ بچے اور ماں کا یہ انمٹ رشتہ ہے ایک پہلو یہ ہے کہ ماں کے جذبات کا بھی لحاظ رکھا جانا چاہیے کیونکہ ایسے حساس لمحات میں ماں اپنی گود کو خالی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بچے کی حالت دیکھ کے آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس عرصے میں دیکھ بھال اور دودھ پلانے کا حق ماں کو دیا گیا ہے۔ یہ حکم دو پہلوؤں کا حامل ہے۔ اس میں بچے اور ماں دونوں کی حالت کو ملحوظ رکھا گیا ہے " والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین "

۲۔ ضروری نہیں کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت پورے دو سال ہی ہو۔ دو سال تو اس صورت میں ہے اگر وہ دودھ پلانے کے اس دور کو مکمل کرنا چاہیں ("لمن اراد ان یتم الرضاعۃ")

لیکن مائیں حق رکھتی ہیں کہ نومولود کی حالت و کیفیت اور سلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں کمی کر دیں۔ اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں دودھ پلانے کا مکمل دور دو سال بیان فرمایا گیا ہے اور نامکمل دور ۲۱ ماہ بتایا گیا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ معنی زیر نظر آیت اور سورہ احقاف کی آیہ ۱۵ کو ایک دوسرے میں ضم کرنے سے پیدا ہوتا ہو۔ کیونکہ سورہ احقاف میں ہے: " وحملہ و فصالہ ثلاثون شھرا "

اور اس کا حمل اور دودھ پلانے کی مدت ۳۰ ماہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ حمل کی مدت عموماً ۹ ماہ ہوتی ہے ۔ اس لیے باقی ۲۱ ماہ دودھ پلانے کی عام مدت ہوگی اور چونکہ سورہ احقاف کی مذکورہ آیت میں بھی مسئلہ وجوب کی صورت میں نہیں آیا لہٰذا مائیں حق رکھتی ہیں کہ بچے کی سلامتی کو نظر میں رکھتے ہوئے چاہیں تو دودھ پلانے کی مدت ۲۱ ماہ سے بھی کم کردیں ۔

۳ ۔ " وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن ":

یہاں لفظ " الاب " جس کا معنی باپ ہے استعمال نہیں ہوا بلکہ " المولود لہ " کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جس کا معنی ہے " وہ شخص جس کا بچہ پیدا ہوا ہے " ۔ یہ بات یہاں قابل توجہ ہے ۔ یہ تعبیر گویا اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پدری جذبات کو زیادہ سے زیادہ تحریک دی جائے یعنی اگر بچے اور اس کی ماں کے اخراجات مرد کے ذمے رکھے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس کے دل کا میوہ ہے نہ کہ ایک اجنبی فرد ۔

اس مقام پر " معروف " کی شرط اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماں کی غذا اور لباس رائج معیار کے مطابق اور شایانِ شان ہو ۔ اس سلسلے میں سختی درست ہے نہ فضول خرچی ۔

اس کے بعد اس سلسلے میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے مزید وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ہر باپ اپنی طاقت کے مطابق ذمہ دار ہے کیونکہ خداوند عالم کسی کی توانائی سے زیادہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا " لا تکلف نفس الا وسعھا ":

۴ ۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تقدیر اپنے اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھا دیں اور ان اختلافات کے ذریعے نوزائیدہ بچے کی روح رواں پر ناقابلِ تلافی ضربیں نہ لگا دیں " لا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہ بولدہ ":

دودھ پلانے کے دوران میں بچوں کی دیکھ بھال کا حق ماؤں کو حاصل ہے ۔ مردوں کو چاہیئے کہ ان سے یہ حق چھین کر پامال نہ کریں اور مائیں بھی جنہیں یہ حق دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور مختلف موہوم بہانوں سے دودھ پلانے سے پہلو تہی نہ کریں اور یونہی مرد کو بچے کی ملاقات سے محروم نہ کردیں ۔

اس جملے کے مفہوم کے بارے میں اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ گذشتہ جملوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔

۵ ۔ باپ کی موت کے بعد وارثوں کو چاہیئے کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لیں اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران میں ماں کی ضرورت کو پورا کریں ۔

۶ ۔ بچے کو دودھ چھڑوانے کا اختیار ماں باپ کو دیا گیا ہے ۔ گذشتہ آیت میں اگرچہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہو چکا ہے لیکن ماں باپ بچے کی جسمانی کیفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ اور باہمی رضامندی سے مناسب موقع پر بچے کا دودھ چھڑوا سکتے ہیں " فان ارادا فصالا عن تراض منھما و تشاور

فلا جناح علیھما. یعنی اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑوانا چاہیں کوئی حرج نہیں ماں نوزائیدہ بچے کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں ہے اور وہ جب چاہے دودھ پلانے سے انکار کر سکتی ہے لیکن کیا خوب ہے کہ بچے کے رشد و تکامل کے لیے وہ اپنی بعض خواہشات کو قربان کر دے اور اس سلسلے میں شوہر کی ہمکاری اور موافقت سے ہاتھ نہ اٹھائے اور "تراضی" اور "تشاور" یعنی ایک دوسرے کو راضی رکھنے اور آپس میں مشورہ کرنے کے حکم کو عملی جامہ پہنائے۔

ماں کے دودھ پلانے اور دیکھ بھال کرنے کے حق کو ہرگز نہیں رد کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ماں خود انکار کر دے یا اس میں کوئی رکاوٹ حائل ہو جائے تو اس صورت کے لیے ارشاد فرماتا ہے:

"وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم ولا جناح علیکم اذا سلمتم ما اتیتم بالمعروف۔"

تمہیں حق پہنچتا ہے کہ بچے کی دیکھ بھال اور اسے دودھ پلانے کا کام کسی مناسب دایا کے سپرد کر دو یا پھر کچھ مدت کے لیے دودھ پلانے کا کام اسے سونپ دو تاکہ ماں کے لیے مدد و اعانت ہو سکے۔

(اذا سلمتم ما اتیتم بالمعروف۔) اس جملے کا معنی ہے کہ ماں کی بجائے دودھ پلانے کے لیے دوسری عورت کا انتخاب طرفین کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ماں کے گذشتہ حقوق اور جتنا دودھ اس نے پلایا ہے اس کا حق پامال نہ ہو جائے بلکہ جو مروج طریقہ ہے اس کے مطابق ہر حق ادا کیا جائے۔

"واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر۔"

بعض اوقات عورت اور مرد کے مابین اختلافات انتقامی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی اپنی یا بے چارے بچوں کی زندگی خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں لہٰذا ان تمام احکام کے آخر میں فرماتا ہے: خدا سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جان لو کہ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے اور وہ بینا ہے۔

۲۳۴۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۳۴۔ اور تم سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں تو ان بیویوں کو چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہیے (اور عدت گزارنا چاہیے) اور جب وہ یہ مدت پوری کر چکیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں وہ اپنے بارے میں جو چاہیں مناسب طور پر انجام دیں (اور اپنی خواہش کے مطابق کسی سے نکاح کر لیں) اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی عورت کے لیے بنیادی اور مشکل مسائل میں سے ہے۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد فوری طور پر دوسری شادی کرنا سابق شوہر کی محبت، دوستی اور احترام کے منافی ہے۔ نیز یہ یقین پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ عورت کا رحم پہلے شوہر کے نطفے سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فوری طور پر دوسری شادی مرنے والے کے لواحقین کے جذبات کے مجروح ہونے کا سبب بھی ہے لہٰذا منجملہ بالا آیت میں عورتوں کے لیے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ نئے نکاح کے لیے چار مہینے اور دس دن کی عدت گزاریں۔

شوہر کے مرنے کے بعد بھی ازدواجی زندگی کے حریم کا احترام ایک فطری امر ہے۔ اس لیے مختلف قبائل میں اس مقصد کے لیے طرح طرح کے آداب و رسوم رہے ہیں اگرچہ بعض اوقات یہ بات زیادتی اور افراط کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور عملی طور پر عورتیں قید و بند میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسی عورتوں پر بہت زیادہ ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔ بعض لوگ تو شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو جلا دیتے تھے یا مرد کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔

لوگوں میں یہ رسم بھی رہی ہے کہ عورت کو نئی شادی سے یکسر محروم کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا جاتا۔ بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورت ایک مدت تک سیاہ اور بوسیدہ خیمہ قبر شوہر پر گاڑتی اور اس میں پھٹے پرانے اور کثیف لباس میں وقت گزارتی۔ ہر طرح کی آرائش و زیور یہاں تک کہ نہانے دھونے سے بھی دور رہتی اور یونہی اس کے شب و روز گزر جاتے۔[1]

زیر نظر آیت نے ان تمام خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور شائستہ طور پر حریم زوجیت کی بنیاد کی حفاظت کے لیے "عدت" مقرر کر دی ہے۔

"والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشرا"

لفظ "توفیٰ" قرآن میں بہت سے مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ہے "گرفت میں لینا" لفظ "یذر" ماضی کا صیغہ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے "چھوڑنا"۔ آیت کہتی ہے: جن عورتوں کے شوہر چل بستے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ چار مہینے اور دس دن عدت میں رہیں اور اس عرصے میں نئی شادی سے اجتناب کریں۔

---

[1] اسلام و عقائد بشری

رہبرانِ اسلام سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے مطابق عورتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مدت میں حالتِ سوگواری میں رہیں یعنی آرائش و زیبائش ہرگز نہ کریں اور سادگی میں رہیں۔ عدت مقرر کرنے کا فلسفہ بھی اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو زمانہ جاہلیت کے آداب و رسوم سے اس حد تک نجات بخشی کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ شاید وہ اس عدت کے دوران میں بھی شادی کر سکتی ہیں۔ جن عورتوں کا یہ خیال تھا انہی میں سے ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ نئی شادی کے لیے اجازت کی طلب گار تھی اس نے پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا:

"کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں سُرمہ لگاؤں اور اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کروں؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم عورتیں بھی عجیب و غریب مخلوق ہو۔ اسلام سے پہلے تو وفاتِ شوہر کے بعد مدتِ عدت سخت ترین حالات میں بھی پوری کرتی تھیں یہاں تک کہ بعض اوقات مرتے دم تک یہ مدت تمہارے ساتھ چلتی تھی۔ اب جب کہ خاندان کے احترام اور حقِ زوجیت کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ تھوڑی سی مدت صبر کرو تو اب اسے بھی برداشت نہیں کرتی ہو۔[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی تصریح کی جا چکی ہے کہ اگر عورت کے حاملہ ہونے کا کوئی احتمال نہ بھی ہو پھر بھی اُسے شوہر کی وفات کے بعد عدت پوری کرنا چاہیے۔ اسی لیے عورت کے لیے عدت کی ابتداء شوہر کی وفات سے نہیں ہوتی بلکہ یہ مدت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب عورت کو شوہر کے انتقال کی خبر ملے۔ چاہے یہ خبر کئی ماہ کے بعد ہی کیوں نہ ملے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی تشریع ہر چیز سے پہلے زوجیت کے احترام و حریم کی حفاظت کے لیے ہے اگرچہ احتمالی طور پر عورت کا حاملہ ہونا بھی اس قانون میں ضمنی طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

"فاذا بلغن اجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن في انفسهن بالمعروف"

"بلوغ اجل" کا مفہوم ہے "مہلت کا انجام کو پہنچنا"۔ آیت کے اس حصے کے مطابق اس مدتِ عدت کے خاتمے پر عورتیں اپنی خواہش کے مطابق شادی کر سکتی ہیں۔

بعض اوقات اولیاء خرافات اور موہوم افکار کی بناء پر عورت کے نکاح ثانی میں حائل ہوتے ہیں اس لیے آیت انہیں مخاطب کرکے کہتی ہے: اس سلسلے میں اب تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی پسند کے مردوں سے رشتۂ نکاح صحیح بنیاد پر قائم کریں۔

"واللّٰه بما تعملون خبير"

اور اولاد کے امور کے بارے میں دخل اندازی نہ کریں کیونکہ پروردگار تمام چیزوں سے باخبر ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے اچھے اور بُرے اعمال کی جزا دے گا۔

۲۳۵- وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

[1] المنار ۲۵

سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّآ أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۳۵۔ اور اس بات کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ اشارے کنائے سے تم ان عورتوں سے، خواستگاری کرو (جن کے شوہر وفات پا چکے ہیں) یا بلا اظہار دل میں اس کے لیے پختہ ارادہ کرلو۔ خدا جانتا تھا کہ تم ان کی یاد میں گرفتار ہو جاؤ گے (اور وہ معقول طریقے سے ظاہر ہونے والی تمہاری فطری خواہش کا مخالف نہیں) لیکن ان سے پوشیدہ طور پر مباشرت کا وعدہ نہ کرو ہاں مگر (کنایہ کے طور پر) پسندیدہ طریقے سے اظہار کرو (لیکن ہر حالت میں) ان کی عدت ختم ہونے تک شادی کا اقدام نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اُسے جانتا ہے۔ اس کی مخالفت سے ڈرو اور جان لو کہ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے (اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا)۔

تفسیر

کیا دورانِ عدت عورتوں سے خواستگاری کی جاسکتی ہے؟

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سابق زوجیت کا احترام بھی زائل نہ ہو اور نہ ہی عورت اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے سے محروم رہے۔ اس بناء پر اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت میں ایک قابل توجہ حکم دیا ہے جو عادلانہ بھی ہے اور اس میں طرفین کا مکمل احترام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص دورانِ عدت عورت سے خواستگاری کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ پوشیدہ طور پر اور اشارہ وکنایہ کی صورت میں ہو نہ کہ آشکار اور صریح (ولا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ بغیر اظہار کے (جس میں صراحت ہو نہ کنایہ) ان سے عدتِ وفات کے بعد نکاح کرنے کے ارادے میں بھی کوئی گناہ نہیں (اَوْ اَکْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ)۔

عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ

آیت کے اس حصّے کے مطابق یہ حکم اس بناء پر ہے کہ ان کے شوہروں کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ بعض افراد ان سے شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں اور چونکہ اسلام فطری اور معقول خواہشات کی مخالفت نہیں کرتا

لہٰذا اس فکر کو وہ گناہ شمار نہیں کرتا۔

"وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا"

آیت کے اس حصے میں سمجھایا گیا ہے کہ کھلے بندوں خواستگاری ہی سے رکنا کافی نہیں بلکہ مخفی طور پر عدت کے دوران میں عورت سے بالصراحت خواستگاری نہیں کرنا چاہیئے البتہ اس سلسلے میں گفتگو واقعاً اس طرح ہو کہ معاشرتی آداب اور فوت شدہ شوہر کے احترام سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں "معروف" یعنی پسندیدہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پردے اور کنائے سے ہو۔

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں رہبران اسلام نے سربستہ خواستگاری اور قول معروف کی وضاحت کے لیے کئی ایک مثالیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ہم بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

قول معروف یہ ہے کہ مشتاق مرد جس عورت کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے اس سے کہے کہ میں عورتوں کا احترام کرتا ہوں۔ تم سے دلی لگاؤ رکھتا ہوں اس لیے کسی اور کو مجھ پر ترجیح نہ دینا۔ [1]

"ولا تعزموا عقدة النكاح حتى يبلغ الكتاب اجله ...."

آیت کے اس حصے میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ جب تک عدت ختم نہ ہو نکاح نہ کیا جائے۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارے مخفی بھیدوں سے آگاہ ہے لہٰذا اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔ لیکن خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو بندے کبھی کبھار اس کی مخالفت کر بیٹھیں وہ بالکل اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ لہٰذا فرماتا ہے: جان لو کہ خدا بخشنے والا ہے اور وہ بندوں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

"واعلموا ان الله يعلم ما فى انفسكم فاحذروه واعلموا ان الله غفور حليم."

۲۳۶۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۲۳۶۔ اگر مباشرت اور تعیین مہر سے قبل (بوجوہ) عورتوں کو طلاق دے دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں (اس موقع پر انہیں (مناسب ہدیہ کی صورت میں) بہرہ مند کرو۔ جو شخص طاقت رکھتا ہے وہ اس کے

[1] نور الثقلین ج ۱۔ اس آیت کے ذیل میں۔

مطابق اور جو تنگ دست ہے وہ اپنے حسبِ حال شائستہ ہدیہ (جو لینے والے اور دینے والے دونوں کے شایانِ شان ہو) دے اور یہ نیکوکاروں کے لیے ضروری ہے۔

تفسیر

لغت میں "مس" کا معنی ہے "چھونا"۔ یہاں مباشرت کے عمل سے کنایہ ہے۔ زیر نظر آیت دو نکات پر مشتمل ہے

۱۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مباشرت اور تعیین حق مہر سے قبل طلاق دینا صحیح نہیں۔ آیت نے ان کے خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے۔

"لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ"

البتہ اس کی صورت یہ ہے کہ طرفین عقد کے بعد مباشرت سے قبل کئی ایک وجوہ کی بنیاد پر یہ سمجھیں کہ وہ ایک ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر طرفین طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔

۲۔ مباشرت سے قبل طلاق کی صورت میں اگر حق مہر معین شدہ نہ ہو تو ایسا ہدیہ جو کہ عورت کے شایانِ شان ہو اسے ادا کیا جائے (متعوھن)۔

حق مہر معین ہو چکا ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے، اس کی وضاحت اگلی آیت میں آئے گی۔ اس بیان کے مطابق لفظ "او" "واؤ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ہدیہ دینے کے بارے میں لوگوں کی طاقت اور استطاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ"

"موسع" کا معنی ہے "تونگر" اور "مقتر" کا معنی ہے "تنگدست"[1] اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ صاحب ثروت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی استطاعت کے مطابق ہدیہ ادا کرے۔

"متاعا بالمعروف" یعنی یہ ہدیہ شائستہ طور پر ہو۔ اسراف و بخل دونوں سے پاک ہو۔ دینے والے اور لینے والے ہر دو کے حسبِ حال ہو۔

یہ ہدیہ اہم تاثیر کا حامل ہے۔ جذبۂ انتقام کو ختم کرنے اور عورت کو کئی ایک مشکلات سے بچانے کے لیے یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے (یہ مشکلات اس رشتۂ ازدواج کے ٹوٹنے سے پیدا ہو سکتی ہیں) لہٰذا آیت میں اس عمل کو نیکی اور احسان کے جذبے سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے "(حقا علی المحسنین) یعنی نیک لوگوں کے لیے یہ عمل ضروری ہے۔ یعنی اسے نیکی اور صلح و صفائی کے جذبے سے سرشار ہونا چاہیے۔

یہ بات بن کہے بھی واضح ہے کہ "محسنین" کی تعبیر کا یہ مقصد نہیں کہ مذکورہ ہر حکم الزامی و ضروری نہیں بلکہ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے لوگوں کے جذبات و احساسات کو تحریک دینے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یہ حکم بجا لانا لازمی اور ضروری ہے۔

---

[1] "مقتر" کا مادہ بخل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے "وکان الانسان قتورا" لیکن یہاں زیر نظر آیت میں یہ معنی مراد نہیں۔

دوسرا اہم نکتہ جو اس آیت سے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ مرد کی طرف سے عورت کو دیے جانے والے اس ہدیے کو "متاع" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ لغت میں متاع کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے۔ یہ لفظ زیادہ تر نقدی کے علاوہ چیزوں پر بولا جاتا ہے کیونکہ روپے پیسے سے براہِ راست فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ متاع میں تبدیل ہو۔ اسی بنا پر قرآن ہدیے کو متاع سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بات نفسیاتی طور پر خاص اثر رکھتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ ہدیہ جو قابلِ استعمال اجناس کی صورت میں ہو مثلاً خوراک، لباس وغیرہ کتنا ہی کم قیمت کیوں نہ ہو دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ اگر انہیں نقدی میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ ہرگز نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السّلام سے پہنچنے والی روایات میں زیادہ تر لباس، غذائی اجناس اور زرعی زمین جیسی چیزوں کا ہدیے کے نمونوں کے طور پر ذکر آیا ہے۔

ضمناً آیت سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ نکاح دائمی میں پہلے سے حق مہر کا معین ہونا ضروری نہیں اور طرفین میں بعد ازاں بھی اس پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ [1]

آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مہر معین ہونے اور مباشرت سے پہلے طلاق ہو جائے تو حق مہر واجب نہیں ہوگا اور مذکورہ ہدیہ حق مہر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

۲۳۷۔ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

ترجمہ

۲۳۷۔ اور اگر عورتوں کو چھونے (اور ان سے ہمبستری کرنے) سے قبل طلاق دے دو جب کہ حق مہر معین ہو چکا ہو تو (ضروری ہے کہ) معین شدہ کا نصف (انہیں دے دو) مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) بخش دیں یا (اگر وہ صغیر اور سفیہ ہیں تو ان کا حق) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اسے بخش دے اور اگر تم درگزر کرو (اور تمام مہر انہیں ادا کر دو) تو پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے۔ نیز درگذر اور پرہیزگاری کو اپنے درمیان سے فراموش نہ کرو کیونکہ تم جو کچھ انجام دیتے ہو خداوند عالم اس سے بینا ہے۔

---

[1] لیکن اگر عقدِ دائمی میں مہر معین نہ کیا گیا ہو تو مہر ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ مہر مثل (وہ مہر جو اس جیسی عورتوں کو دیا جاتا ہے) ہی مقرر سمجھا جائے گا۔ مباشرت سے پہلے طلاق کی صورت میں اگر مہر معین نہ ہو تو صرف ہدیہ واجب ہوگا جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں بھی طلاق کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ صورت کی طرح اگر مباشرت کا عمل نہیں ہوا لیکن حق مہر معین ہو چکا ہے تو اس سلسلے میں آیت پہلے قانونِ اسلام کی نگاہ میں جو حکم ہے اسے بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ مرد کو چاہیئے کہ مقررشدہ حق مہر سے آدھا ادا کرے (" فنصف ما فرضتم ")۔ قانونی حکم جو اجتماعی نظام کی حقیقی بنیاد ہے اسے بیان کرنے کے بعد اخلاقی پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: آدھے حق مہر کی ادائیگی کا حکم تو عفو اور بخشش سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہے لیکن اگر عورت اپنے مسلّم حق سے درگزر کرے تو پھر شوہر پر کچھ واجب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے وہ حق مہر سے چشم پوشی کرلے تو شوہر پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ " الذی بیدہ عقدۃ النکاح " (یعنی جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے) اس سے کون شخص مراد ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد شوہر ہے۔ لیکن آیت پر غور و خوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے عورت کے اولیاء مراد ہیں۔

ابتداء سے روئے سخن کیونکہ شوہروں کی طرف ہے اس لیے فرماتا ہے " وان طلقتموھن " (اگر تم انہیں طلاق دے دو) اور آیت کے آخر میں بھی روئے سخن شوہروں کی طرف ہے " وان تعفوا اقرب للتقوٰی " (اگر تم معاف کردو تو یہ پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے) اس لیئے " او یعفوا الذی بیدہ عقدۃ النکاح " کا جملہ جو فعل غائب کی شکل میں ہے یقیناً شوہروں سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مقصود عورت کے اولیاء ہی ہیں۔ وہی حق مہر کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر بیوی نادان یا بچی ہو تو اس صورت میں اولیاء حق مہر بخشنے یا لینے کے بارے میں اس کے منافع کو پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

معصوم پیشواؤں سے مروی روایات میں بھی آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ شیعہ مفسرین نے بھی آیت کے مضمون اور روایات اہل بیتؑ کو مدّنظر رکھتے ہوئے اسی نظریے کا انتخاب کیا ہے اور ان کے نزدیک بھی اس عبارت سے بیوی کے اولیاء مراد ہیں۔

" وان تعفوا اقرب للتقوٰی "۔ یہ جملہ مرد اور اس کے انسانی فرائض کے بارے میں ایک اور حکم بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ بہتر ہے مرد درگزر کی راہ اپنائے اور اگر تمام حق مہر ادا کر چکا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لے اور اگر ادا نہیں کیا تو سارے کا سارا ادا کردے اور اپنے آدھے حق سے صرفِ نظر کرلے۔ آیت کے اس حصّے میں بتایا گیا ہے کہ اگر مرد عفو اور درگذر سے کام لے تو یہ پرہیزگاری کے نزدیک ہے۔

عقد کے بعد اور رخصتی سے قبل شوہر سے جدا ہوجانے والی لڑکی اور عورت بہت سی معاشرتی اور نفسیاتی مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے اور مسلّم ہے کہ مرد اگر درگذر سے کام لے اور تمام حق مہر ادا کردے تو یہ اس کے زخموں کے لیے ایک طرح کا مرہم ہو سکتا ہے۔

"ولا تنسوا الفضل بینکم ان اللہ بما تعملون بصیر"

اسلام چاہتا ہے کہ جدائی اور علیحدگی کا مرحلہ بھی "معروف" اور "احسان" کی بنیاد پر انجام پذیر ہو۔ یعنی انتقام جوئی سے خالی نہ ہو بلکہ مرد اور عورت دونوں عظمت و بزرگی کی روح کو بھی فراموش نہ کریں۔ فرماتا ہے: اپنے درمیان سے کبھی نیکی، منفعت اور احسان کو فراموش نہ کرو۔ کیونکہ خدا تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

۲۳۸۔ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝

۲۳۹۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۸۔ تمام نمازوں کی انجام دہی اور (خصوصاً) نمازِ وسطیٰ (نمازِ ظہر) کی ادائیگی میں کوشاں رہو اور خضوع و اطاعت کے ساتھ خدا کے لیے قیام کرو۔

۲۳۹۔ اور اگر (جنگ یا کسی اور خطرے کی وجہ سے) تمہیں خوف ہو تو نماز کو پیادہ یا سواری کی حالت میں انجام دو لیکن جب حالت امن لوٹ آئے تو خدا کو یاد کرو (اور نماز کو معمول کے مطابق ادا کرو) جیسا کہ اس نے تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دی ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

شانِ نزول

بعض منافقین نے گرمی کا بہانہ تراشا اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے وہ نماز باجماعت میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی جماعت میں شرکت ترک کر دی۔ اس طرح مسلمانوں کی جماعت میں کمی آگئی۔ اس پر پیغمبر اکرم بہت پریشان تھے۔ آپ نے انہیں سخت سزا کی دھمکی دی۔ زید بن ثابت سے منقول ہے کہ پیغمبر اسلام سخت ترین گرمی میں بھی دوپہر ہوتے ہی نماز ظہر جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یہ عمل آپ کے اصحاب کے لیے بہت گراں تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں نماز کی اہمیت بالعموم اور نماز ظہر کی اہمیت بالخصوص بیان ہوئی۔

تفسیر

نماز انسان کو خالق کائنات سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر وہ اپنی صحیح شرائط کے ساتھ انجام پا جائے تو دل کو عشق خدا سے معمور کر دیتی ہے اور اس کے ذریعے انسان بہتر طور پر گناہوں، آلودگیوں اور پروردگار کی نافرمانیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت تاکید کرتی ہے کہ مسلمان اس فریضہ کو قائم کرنے میں کوشاں رہیں اور خشوع و خضوع اور پوری توجہ سے بجا لائیں۔ خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی حفاظت کریں۔

صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے

صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن ہمارے پیش نظر جو قرائن ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہی ہے۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ نماز ظہر دن کے وسط اور درمیان میں بجالائی جاتی ہے۔ آیت کی شان نزول بھی گواہی دیتی ہے کہ نماز ظہر کی تاکید اس لیے ہے کہ لوگ گرمی کی وجہ سے اس میں کوتاہی کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر کئی ایک روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ نماز وسطیٰ سے مراد نماز ظہر ہی ہے [1]

"وقوموا للّٰه قانتین" : قنوت کے دو معانی ہیں۔

۱۔ پیروی اور اطاعت کرنا۔

۲۔ خشوع و خضوع۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات دونوں معانی مراد ہوں جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے اس جملے کی تفسیر میں دونوں معانی بیان فرمائے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

"وقوموا للّٰه قانتین" — کا مفہوم ہے کہ نماز کو خضوع اور پروردگار کی طرف توجہ کرتے ہوئے بجا لاؤ۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"وقوموا للّٰه قانتین" یعنی "مطیعین" (اطاعت کرتے ہوئے)

فان خفتم فرجالا او رکباناً۔ "رجال" یہاں "راجل" کی جمع ہے جس کا معنی ہے پاپیادہ اور "رکبان" "راکب" کی جمع ہے جس کا معنی ہے سوار یعنی میدان جنگ یا ایسے کسی اور موقع پر خوف کے عالم میں تم پیدل چلتے ہوئے یا سواری و حرکت کی حالت میں بھی نماز ادا کرسکتے ہو۔

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ سخت ترین حالات حتیٰ کہ جنگ میں نماز کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں نماز کی بہت سی شرائط ساقط ہو جاتی ہیں مثلاً قبلہ رخ ہونا۔ متعارف اور معمول کے طریقے سے رکوع و سجود بجالانا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔ ایسی حالت میں رکوع و سجود کو اشارے سے بھی بجالایا جاسکتا ہے۔

منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ جب تک جنگ ہوتی رہے ایماء اور اشارے سے نماز پڑھتے رہو۔ [2]

ایک اور حدیث میں ہے:۔

"انّ النبی صلی اللّٰه علیه وآله صلی یوم الاحزاب ایماءً"

پیغمبر اکرمؐ نے جنگ احزاب میں اشارے سے نماز پڑھی تھی۔

---

[1] اس بارے میں مزید تفصیلات کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ [2] تفسیر نور الثقلین۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا گیا۔

اگر کوئی شخص کسی درندے کی گرفت میں آجائے اور بالکل حرکت نہ کرسکتا ہو۔ نماز کا وقت بھی تنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کیا ہے۔

آپؑ نے فرمایا:۔

جس حالت میں ہے اسی حالت میں نماز پڑھے چاہے قبلہ کی طرف پشت ہی کیوں نہ ہو۔ [1]

اسے نماز خوف کہتے ہیں۔ فقہ میں اس کے بارے میں فقہاء نے مفصل بحث کی ہے۔

آیت کہتی ہے کہ نماز کا پروگرام اور دل ہر حالت میں خدا سے مربوط رہے تاکہ ہر حالت میں خدا سے دل بستگی رہے اور اسی سے انسان کی اُمید بندھی رہے تاکہ میدان جنگ تک میں نماز اور خدا کی طرف توجہ ترک نہ ہونے پائے۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگ تصور کریں کہ نماز کے بارے میں اس قدر تاکید اور اصرار ایک طرح کی سخت گیری ہے اور ایسے حالات میں یہ انسان کو اپنے اہم دفاعی فرائض سے غافل کرسکتی ہے۔ دراصل یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ عموماً ان حالات میں انسان ہر چیز سے زیادہ روحانی تقویت کا محتاج ہوتا ہے اور اگر خوف و ہراس، وحشت اور روحانی کمزوری اس پر غالب آجائے تو اس کی شکست تقریباً یقینی ہوتی ہے۔ لہٰذا نماز اور خدا سے رشتہ جوڑنے سے بہتر عمل کونسا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تمام جہان ہستی پر خدا ہی کا حکم کارفرما ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادے کے سامنے سہل، معمولی اور آسان ہیں۔ وہ طاقت رکھتا ہے کہ مجاہد سپاہیوں اور خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں کی روح کو تقویت بخش دے۔

صدر اول کے بہت سے مجاہدات میں پیش آنے والے شواہد سے قطع نظر یہودیوں سے مسلمانوں کی حالیہ چوتھی جنگ جو اس سال (۱۳۹۳ ہجری) کے ماہ رمضان میں ہوئی کی خبروں پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ نماز اور احکام اسلام کی طرف توجہ نے مسلمانوں کو بہت روحانی تقویت بخشی جو دشمنوں پر کامیابی کے لیے بہت مؤثر رہی۔

"فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم تکونوا تعلمون"

آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیدل چلتے ہوئے اور سواری پر نماز کی ادائیگی حالت خوف و خطر سے مخصوص ہے اور جب امن و امان قائم ہو جائے اور راحت و آرام میسر آجائے تو پھر عام حالت کی طرح نماز ادا کرنا چاہیئے "فاذا امنتم فاذکروا اللہ"۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم بہت سی چیزوں کو نہیں جانتے تھے اور خدا نے تمہیں ان کی تعلیم دی ہے۔ امن اور خوف میں نماز پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ واضح ہے کہ اس تعلیم کا شکرانہ یہی ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے اور جیسا حکم دیا جائے ویسا عمل کیا جائے "کما علمکم مالم تکونوا تعلمون"۔

۲۴۰۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ

---

[1] "وسائل الشیعہ" ج ۵. ابواب صلوٰۃ الخوف.

مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۴۰۔ اور تم میں سے جو لوگ آستانۂ موت تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے لیے وصیت کرنی چاہیئے کہ ایک سال تک انہیں (زندگی کے اخراجات سے) بہرہ مند کریں بشرطیکہ وہ (شوہر کے گھر سے) باہر نہ نکلیں (اور نئی شادی کے لیے اقدام نہ کریں)۔ اور اگر وہ باہر چلی جائیں (تو مصارف حیات لینے کا حق نہیں رکھتیں لیکن) ان پر اس بارے میں کوئی گناہ بھی نہیں کہ وہ اپنے لیے کوئی شائستہ اقدام کریں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

آیت کے پہلے حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو موت کے آستانے تک جا پہنچیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جائیں تو انہیں وصیت کرنا چاہیے کہ ان کے پسماندگان ایک سال تک ان کے مال سے ان کی بیویوں کے اخراجات ادا کریں۔ اس لیے لفظ "یتوفون" مرنے کے معنی میں نہیں بلکہ ذکر وصیت کے قرینہ سے موت کے آستانے پہ جا پہنچنا مراد ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عورت بھی شوہر کی موت کے بعد ایک سال تک اس کے گھر میں رہے اور اس سے باہر نہ نکلے "غیر اخراج"

"فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسهن."

یہ جملہ دو معانی پر منطبق ہو سکتا ہے۔

۱۔ عورت کا حق ہے کہ مرد کے وارث ایک سال تک اس کے مصارف ادا کریں لیکن اگر عورت اپنی خوشی سے ایک سال کا خرچ نہ لے اور شوہر کے گھر میں بھی نہ رہے تو پھر کوئی اس کا جواب دہ نہیں ہے اور اگر عورت دوسری شادی کرلے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ عورت پہلے سال کے دوران میں نان نفقہ سے صرف نظر کر کے سابق شوہر کے گھر سے چلی جائے۔

۲۔ اگر عورت ایک سال تک صبر کرے اور یہ مدت پوری کرنے کے بعد شوہر کے گھر سے نکلے اور پھر نئی شادی کرلے تو کوئی حرج نہیں۔

دوسرے معنی کے مطابق ایک سال تک کی مدت گزارنا عورت پر لازمی ہے دوسرے لفظوں میں ایک سال تک مکمل عدت گزارنا عورت کے لیے "حکم" کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ یہ اس کا حق ہے جیسا کہ پہلے مفہوم میں ظاہر

ہوتا ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسی تفسیر آیت کے مفہوم سے میل کھاتی ہے اور مناسب ہے۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی سورہ کی آیت ۲۳۴ کے ذریعے منسوخ ہو گئی ہے ۔ اس میں عدتِ وفات چار ماہ اور دس دن معین کی گئی ہے۔ اگرچہ وہ آیت تنظیم اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے آئی ہے ۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ سورتوں کی آیات کی تنظیم تاریخ نزول کے مطابق نہیں ہے ۔ بلکہ بعض اوقات وہ آیات جو بعد میں نازل ہوئی ہیں سورہ کے آخر میں ہیں اور ایسا آیات کی مناسبت کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور یہ فرمان پیغمبرؐ کے مطابق ہی ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسا آیت ۲۳۴ کی تفسیر میں گزر چکا ہے زمانہ جاہلیت میں عدتِ وفات ایک سال سمجھی جاتی تھی اور اس عدت میں عورت کے لیے خرافات پر مبنی اور تکلیف دہ رسوم رائج تھیں ۔ اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا۔ پہلے عدت کو ایک سال کے لیے قرار دیا بعد ازاں اس ایک سال کی مدت کو ختم کر کے چار مہینے اور دس دن کی عدت معین کی اور اس عرصے میں عورت کو صرف زیب و زینت سے منع کیا گیا۔

لیکن آیت کی منسوخی کے بارے میں یہ دلائل قابل قبول نہیں کیونکہ نسخ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم آیت کے دوسرے معنی مراد لیں یعنی اس آیت کا مفہوم یہ سمجھیں کہ ایک سال تک گھر سے نہ نکلنا عورت کے ذمے فرض ہے ۔ یہ عورت کا حق نہیں ہے ۔ اگر پہلا مفہوم مراد لیا جائے جب کہ وہ آیت سے بہت زیادہ مناسبت بھی رکھتا ہے تو پھر نسخ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اس آیت میں اخراجات کے حصول اور مکان سے فائدہ اٹھانے کو ایک سال تک کی عدت سے مشروط کر دیا ہے ۔ اس میں عورت کو حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو چار ماہ اور دس دن بعد شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کرے لہٰذا اس صورت میں فطری طور پر اس کی زندگی کے مصارف پہلے شوہر کے مال سے منقطع ہو جائیں گے ۔

اصطلاح کی رُو سے چار ماہ دس دن کی عدت رکھنا عورت کے لیے ایک حکم الزامی ہے اور اس میں عورت کا انتخاب کوئی اثر نہیں رکھتا البتہ ایک سال تک اسے جاری رکھنا یہ عورت کا حق ہے اور وہ اس حق سے استفادہ کر سکتی ہے اور یہ عدت اختیار کر کے اپنے لیے اخراجات حاصل کر سکتی ہے اور اُسے یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ ان سے صرف نظر کر کے شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کر لے ۔

"مِنْ مَّعْرُوْفٍ ." یہ تعبیر اس بات کی طرف کو اشارہ ہے کہ عورتیں مجاز ہیں کہ ہر شائستہ اور مناسب اقدام کر سکیں (یہاں اس سے مراد شادی کرنا ہے) اور اس سلسلے میں انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔

"وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ." آیت کے آخر میں اس بناء پر کہ ایسی عورتیں اپنی آئندہ کی زندگی سے پریشان نہ ہوں، ان کی دلجوئی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے : خدا قادر ہے کہ پہلے شوہر کی وفات کے بعد ان کے لیے کوئی اور راہ کھول دے اور انہیں کوئی مصیبت پہنچی ہے تو اس میں کوئی حکمت تھی۔ خلاصہ یہ کہ اگر خداوند

عالم حکمت کی وجہ سے ایک دروازہ بند کرتا ہے تو اپنے لطف و کرم سے دوسرا کھول دیتا ہے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۴۱- وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○

۲۴۲- كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۴۱- (شوہر کی طرف سے) تمام مطلقہ عورتوں کو ہدیہ دیا جانا مناسب ہے۔ یہ پرہیزگار مردوں پر حق ہے۔

۲۴۲- اس طرح خدا اپنی آیات تمہارے سامنے بیان کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

تفسیر

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے ایسے مواقع پر متاع سے مراد ہدیہ ہے جو مرد عورت کو طلاق کے بعد دیتا ہے۔ یہ آیت احکام طلاق کا خاتمہ ہے اس میں بھی جذبہ انتقام کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کے لیے اور بغض و کینہ کے خاتمے کے لیے مطلقہ عورتوں کے بارے میں پھر سفارش کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ مردوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو انہیں ہدیہ پیش کریں اور یہ فریضہ تمام پرہیزگار مردوں پر عائد کیا گیا ہے۔ البتہ اس آیت کا ظاہری مفہوم سب عورتوں کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ آیت ۲۳۶ میں کہا جا چکا ہے کہ ہدیہ دینا صرف اس صورت میں واجب ہے کہ حق مہر معین نہ ہوا ہو اور رخصتی بھی نہ ہوئی ہو۔ اس بنا پر یہ حکم باقی صورتوں کے لیے مستحب ہوگا۔ دراصل اسلام کا یہ حکم انسانی پہلو کا حامل ہے۔

"كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"

آیات اور اسلامی روایات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل کا ذکر زیادہ تر ایسے مواقع پر آتا ہے جہاں فہم و ادراک کا تعلق عواطف و احساسات سے بھی ہو اور اس کے بعد عمل کا موقع ہو مثلاً قرآن خداشناسی کے بہت سے مباحث میں اس عجیب و غریب جہان کے نظام کو بیان کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ ہم ان آیات اور نشانیوں کو اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ("لعلکم تعقلون") شاید تم تعقل و تفکر کرو تو اس سے مقصود یہ نہیں کہ فقط نظام طبیعت کی معلومات کو دماغ میں جگہ دو۔ کیونکہ طبیعی و مادی علوم کے ساتھ دل اور احساس کا تعلق پیدا نہ ہو اور خالق کائنات کی محبت، دوستی اور آشنائی میں یہ کام نہ آئیں تو پھر مسائل توحید اور خداشناسی سے ان کا کوئی ربط نہ ہوگا۔

اس طرح عملی پہلو رکھنے والی معلومات بھی ہیں۔ ان پر بھی تعقل کا اطلاق اسی صورت میں ہوگا جب وہ عملی پہلو

کی حامل ہوں گی۔
تفسیر المیزان میں ہے کہ تعقل وہاں بولا جاتا ہے جہاں فہم وادراک کے بعد انسان مرحلۂ عمل میں داخل ہو۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

اور دوزخی کہیں گے کہ اگر ہمارے سننے والے کان ہوتے اور تعقل کرتے تو اہل جہنم کی صف میں نہ ہوتے۔ (ملک - ۱۰)

"اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ"

کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی تاکہ اس کے ذریعے ان کے دل سمجھ لیتے۔ (حج - ۴۶)

ایسی آیات گواہ ہیں کہ اگر مجرم قیامت کے دن دنیا میں تعقل کرنے کی آرزو کریں گے تو اس سے مراد وہ تعقل ہے جس میں عمل شامل ہے۔ اس طرح جب خدا کہتا ہے کہ لوگ سیر و سیاحت کریں اور غور و فکر کے ذریعے اور دنیا کی کیفیت و وضعیت کے مطالعے سے کچھ چیزیں سمجھیں تو اس سے مراد بھی ایسا فہم و ادراک ہے جس کی مدد سے اپنا راستہ بدل لیں اور سیدھی راہ پر گامزن ہوں۔

۲۴۳۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۴۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ ہزاروں افراد تھے (جنہوں نے طاعون کی بیماری کا بہانہ کر کے میدان جہاد میں شرکت سے پہلو تہی کی) خدا نے ان سے کہا کہ مرجاؤ (اور جس بیماری کا انہوں نے بہانہ کیا تھا اسی سے وہ مرگئے) خدا نے پھر انہیں زندہ کیا (اور ان کی اس زندگی کے واقعے کو آنے والوں کے لیے عبرت قرار دیا) خدا تو اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ شکر بجا نہیں لاتے۔

شان نزول

شام کے ایک شہر میں طاعون کی بیماری پیدا ہوگئی۔ بڑی عجیب اور سرسام آور تیزی سے لوگ مرنے لگے کچھ لوگ موت سے بچنے کے لیے وہ شہر اور علاقہ چھوڑ گئے۔ علاقے سے فرار اور موت سے نجات نے ان میں یہ

احساس پیدا کر دیا کہ وہ بہت قدرت و استقلال کے مالک ہیں۔ ارادۂ الٰہی سے بے پرواہ ہو کر فقط طبیعی عوامل پر نظر رکھتے ہوئے وہ غرور اور فریب میں مبتلا ہوئے لہٰذا پروردگار نے انہیں اسی بیماری کے ذریعے اسی بیابان میں نیست و نابود کر دیا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بیماری دراصل مکافات عمل کا مظہر تھی اور سزا کے طور پر آئی تھی کیونکہ ان کے پیشوا اور رہبر نے ان سے جہاد کے لیے شہر سے نکلنے کا حکم دیا تو انہوں نے بہانہ کیا کہ جنگی علاقے میں طاعون کی بیماری پھیلی ہوئی ہے اور اس طرح انہوں نے جنگ میں جانے کے حکم سے روگردانی کی۔ اس پر ہوا یوں کہ جس چیز سے وہ ڈرتے تھے جس بہانے سے وہ جنگ سے فرار چاہتے تھے انہیں اسی میں مبتلا کر دیا گیا ان میں طاعون کی بیماری پھیل گئی۔ وہ اپنا شہر چھوڑ کر طاعون سے نجات کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن سب کے سب بیابان میں پہنچ کر نابود ہو گئے۔

اس واقعے کے ایک عرصے بعد بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت حزقیل[1] وہاں سے گزرے انہوں نے خدا سے خواہش کی کہ انہیں زندہ کر دے۔ خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔

تفسیر

ادبیات عرب کا طریقہ ہے کہ جب کسی مفہوم کو زیادہ مجسم انداز میں پیش کرنا چاہیں اور اس کی بہتر تصویر کشی مطلوب ہو تو "الم تر" استعمال کرتے ہیں یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا۔

اس مقام پر بظاہر تو پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے لیکن درحقیقت یہ سب لوگوں سے فرمایا جا رہا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی طرف خطاب کا رُخ اس تاکید اور زیادہ اہمیت کے پیش نظر ہے۔

"الم تر" کے بعد آیت میں ایک گروہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑ گیا اور پھر وہ سب لوگ خدا کے حکم سے مر گئے اور انہیں بھاگ جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا "الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم و ھم الوف حذر الموت فقال لھم اللّٰہ موتوا......" یہ بات واضح ہے کہ لفظ "الوف" جس کا معنی ہے ہزاروں۔ یہ یہاں کسی خاص تعداد کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اس گروہ کی زیادتی اور کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں ان کی تعداد دس ہزار اور بعض میں ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ "مُوتُوا" یعنی مر جاؤ سے اد حکم لفظی نہیں بلکہ خدا کا امر تکوینی ہے جو تمام عالم ہستی اور جہان حیات پر حکم فرما ہے یعنی خدا نے ان کی موت کے اسباب   الل فراہم کیے اور سب کے سب بڑی تیزی سے مر گئے یہ امر اس امر کی طرح ہے۔

"انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون"

اس کا حکم صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے (یٰسٓ ۸۲)

"ثم احیاھم" آیت کے اس حصے میں اس گروہ کی موت کے بعد پھر زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایسا حضرت حزقیل (جو پیغمبر تھے) کی دعا سے ہوا۔

"ان اللّٰہ لذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون"

---

[1] بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت حزقیلؑ بنی اسرائیل کے تیسرے راہنما تھے۔

ان کی دوبارہ زندگی خدا کی ایک واضح دلیل اور نشانی تھی اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: صرف یہ ایک نعمت نہ تھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی۔ خدا تمام لوگوں کے لیے بخشنے والا اور مہربان ہے اور سب کو اپنی نعمتوں اور احسانات سے نوازتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بات باعثِ افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ان نعمتوں کا شکر نہیں بجا لاتے۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک درسِ عبرت: آیت دراصل سب لوگوں کے لیے ایک درسِ عبرت بیان کرتی ہے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ذمہ داریوں سے فرار اور بہانہ سازیوں کے ذریعے وہ مامون ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہ کریں کہ قدرت پروردگار بلکہ طبیعی ہماری قوانین جو دنیا پر حاکم ہیں ان سے وہ زیادہ طاقتور ہیں۔ اگر وہ دشمنوں سے جنگ کرنے سے پہلوتہی کریں اور جہاد سے فرار حاصل کریں، جب کہ یہ خود انہی کی سربلندی کا ذریعہ ہے پھر بھی ممکن ہے خداوند عالم انہیں کسی اور دشمن کے سامنے کر دے ۔۔۔ شاید ہے وہ ایسا چھوٹا دشمن ہو جو آنکھوں سے دیکھا بھی نہ جا سکے۔

خوردبین سے دیکھے جانے والے یہ چھوٹے دشمن جنہیں جراثیم کہتے ہیں، انہی کے ذریعے طاعون یا کوئی اور وبا پھیل سکتی ہے جو اتنی تیزی اور برق رفتاری سے انہیں مار ڈالتی ہے کہ کوئی خطرناک دشمن بھی میدان جنگ میں ان سے ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ پھر بھی لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرتے ہیں۔

۲۔ یہ تاریخ ہے یا تمثیل: جو داستان یہاں بیان کی گئی ہے کیا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن نے سربستہ طور پر اشارہ کیا ہے جبکہ روایات میں اس کی تفصیل آئی ہے یا اسے ایک تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور عقلی حقائق کی حسی طور پر تصویر کشی کی گئی ہے۔

مذکورہ واقعے میں کئی ایک غیر معمولی پہلو ہیں اور بعض مفسرین کے لیے مشکل تھا کہ وہ اسے جوں کا توں گوارا کریں۔ لہٰذا انہوں نے اس کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کر دیا ہے ان کے نزدیک یہ واقعہ بطور تمثیل ذکر ہوا ہے جس میں ایک ایسے گروہ کا تذکرہ ہے جو دشمن سے مقابلے میں سستی کرتا ہے اور نتیجۃً شکست کھا جاتا ہے۔ پھر عبرت حاصل کرتے ہوئے بیدار ہو جاتا ہے۔ قیام اور مقابلہ پھر سے شروع کرتا ہے اور آخرکار کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "مُوْتُوْا" کا لفظ سستی اور تساہل کے نتیجے میں شکست کھانے سے کنایہ ہے اور "اَحْیَاھُمْ" (یعنی خدا نے انہیں زندہ کیا) ان کی آگاہی و بیداری کے بعد کامیابی کی طرف اشارہ ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اس سلسلے میں وارد ہونے والی روایات جعلی ہیں اور اسرائیلیات میں سے ہیں۔

لیکن ــــ یہ کہنا پڑے گا کہ سستی و بیداری کے نتیجے میں شکست و کامیابی کا معاملہ جاذب نظر تو ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ظاہر آیت ایک تاریخی واقعے کا بیان ہے نہ کہ ایک تمثیل کا ذکر۔

آیت میں گذشتہ لوگوں کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے۔ یہ لوگ ایک وحشت ناک حادثے کے نتیجے میں مر

گئے تھے۔ خداوند عالم نے انہیں پھر سے زندہ کیا۔ کوئی واقعہ غیر عادی یا غیر معمولی ہونے کی وجہ سے توجیہ و تاویل کے قابل سمجھ جائے تو پھر انبیاء کے تمام معجزات کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اگر ایسی توجیہات اور تفاسیر کو قرآن کی طرف گھسیٹا جائے گا تو انبیاء کے معجزات کے انکار کے علاوہ قرآن کے بہت سے تاریخی مباحث کا انکار کرنا پڑے گا اور انہیں تمثیل یا سمبالک (SYMBOLIC) قرار دینا پڑے گا۔ مثلاً ہابیل و قابیل کی سرگزشت کو عدالت و حق کی جستجو اور قساوت و سنگدلی کے مقابلے کی مثال سمجھنا پڑے گا اور اس صورت میں قرآن کے تمام تاریخی مباحث اپنی قدر و قیمت کھو دیں گے۔

علاوہ ازیں اس تعبیر سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی تمام روایات سے چشم پوشی کرلی جائے جب کہ ان میں سے بعض تو معتبر اسناد سے منقول ہیں اور انہیں جعلی و اسرائیلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۳۔ **رجعت کی طرف اشارہ:** اس آیت میں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رجعت کا امکان ہے۔ گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو مرنے کے بعد دوبارہ اس جہاں میں پلٹ آئے۔ جیسے بنی اسرائیل کی وہ جماعت جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر آئندہ کسی دور میں ایسے واقعے کا اعادہ ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

مشہور شیعہ عالم شیخ صدوق نے اسی آیت سے رجعت کے امکان کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد میں سے ایک عقیدہ رجعت ہے البتہ رجعت کا تناسخ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مسئلے کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

۲۴۴۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

۲۴۵۔ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

ترجمہ

۲۴۴۔ اور راہ خدا میں جنگ کرو اور جان لو کہ خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

۲۴۵۔ کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے (اور اس نے جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرے) تاکہ خدا اس مال کو اس کے لیے کئی گنا کر دے اور خدا (بندوں کی روزی کو) محدود اور وسیع کرتا ہے (اور خرچ کرنے سے روزی میں کمی نہیں ہوتی) اور اس کی طرف لوٹ جاؤ گے (اور اپنا بدلہ اور جزا پالوگے)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کی سرگذشت جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ موت وحیات پروردگار کے ہاتھ میں ہے ۔ اگر یہ واقع نظر میں رہے تو انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ جہاد سے بھاگ جانے اور جنگ میں سستی کرنے سے وہ موت سے نہیں بچ سکتا۔

زیر نظر آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرو اور جان لو کہ خدائے بزرگ و برتر تمام چیزوں سے باخبر ہے اور تمہارے باطن سے اٹھنے والے علل و اسباب کو جانتا ہے اور جنگ کے بارے میں تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے ۔ وہ تمہاری ہر گفتگو سنتا ہے اور کوئی چیز اس کی درگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ۔

"من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا."

جیسے معاشرہ اپنے استقلال، پیش رفت اور سربلندی کے لیے مجاہدو مبارز افراد کا محتاج ہے اس طرح محروم انسانوں کی حمایت، عمومی منافع اور وسائل جہاد کے لیے بھی کمک کی ضرورت ہے ۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن راہِ خدا میں خرچ کرنے کے معاملے پر خاص طور پر زور دیتا ہے ۔

خدا بندوں سے قرض لیتا ہے

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دیگر آیات میں اس اجتماعی ذمہ داری کو قرض سے تعبیر کرتا ہے یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ تمام اموال کا حقیقی مالک پروردگار عالم ہے ۔ انسان تو صرف نمائندہ خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں صرف کرتا ہے ۔ البتہ اس سرپرستی اور نمائندگی کی شرط یہ ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے علاوہ عام لوگوں کی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کرے ۔ جیسا کہ سورہ حدید کی آیہ ۷ میں ہے ۔

"اٰمنوا باللہ و رسولہ و انفقوا
مما جعلکم مستخلفین فیہ."

خدا پر ایمان لے آؤ اور جن اموال میں خدا نے تمہیں
اپنا نمائندہ بنایا ہے ان میں سے خرچ کرو

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ اس مادی کمک کو خدا کو قرض دینے کے حساب میں شمار کرو۔ اُس خالق کائنات کو قرض دو کہ جس کی طرف سے تمام چیزیں ہیں اور جب واپس لوگے تو کئی گنا ملے گا ("فیضاعفہ لہ اضعافا کثیرۃ")

اس سے بندوں پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے اور انفاق اور خرچ کرنے کی کمال اہمیت اس سے عیاں ہوتی ہے ۔ باوجودیکہ وہی مالک اور بخشنے والا ہے ۔ پھر بھی اپنے بندے سے قرض کی خواہش کرتا ہے اور

قرض بھی ایسا کہ جس کے ساتھ اس قدر نفع بھی شامل ہو جائے یعنی خداوند کریم کا کرم ہیں اور لطف وعنایات (فیضاعف لہ اضعافا کثیرۃ)۔

"اضعاف" "ضعف" (بروزن شعر) کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو دو برابر یا چند برابر کرنا۔ توجہ رہے کہ "اضعاف" جمع ہے "کثیرۃ" تاکید کے لیے ہے "یضاعف" تاکید مزید کے لیے ہے کیونکہ باعتبار لغت "یضاعف" "یضعف" کی نسبت زیادہ تاکید کا حامل ہے۔ ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق اور خرچ کرنے کے مقابلے میں خدا تعالیٰ ایک بڑی مقدار عطا فرماتا ہے۔ جیسے ایک مستعد بیج کو جب زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی آبیاری کی جاتی ہے تو نشوونما کے بعد وہ ایک سے بہت زیادہ مقدار میں میسر آتا ہے جیسا کہ آیہ ۲۶۱ میں آئے گا

"واللہ یقبض و یبصط والیہ ترجعون"

آیت کے آخر میں یہ جملہ گویا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ خیال نہ کرنا کہ انفاق اور بخشش تمہارے اموال کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ تمہارے سرمائے کی وسعت اور محدودیت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو آسمان اور زمین کی برکتوں سے تمہیں مالا مال کر سکتا ہے اور عطا کردہ اموال کی جگہ کئی گنا ثروت تمہیں بخش سکتا ہے۔ بلکہ معاشرتی روابط اور وابستگیوں کے انداز پر نظر کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہی عطا کردہ اموال آخر کار تمہاری طرف پلٹ آئیں گے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تمہیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ تم نے خدا کی طرف پلٹ جانا ہے اور ایک اور جہان تمہارے آگے ہے جہاں تم اپنے ان انفاق اور مصارف کا ثمر پاؤ گے۔

۲۴۶۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ○

۲۴۷۔ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ

مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ
يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝
۲۴۸۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ
فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ
هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ
إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝
۲۴۹۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ
فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ
مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا
قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ
الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝
۲۵۰۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝
۲۵۱۔ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ

الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ○
۲۵۲۔ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ
لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ○

ترجمہ

۲۴۶۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ موسیٰؑ کے بعد اپنے نبی سے کہنے لگا کہ ہمارے لیے کسی فرمانروا کا انتخاب کردیں تاکہ (اُس کی قیادت میں) ہم راہ خدا میں جنگ کریں۔ اُن کے پیغمبر نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم (روگردانی کرو اور) راہ خدا میں جہاد نہ کرو۔ انہوں نے کہا کیسے ممکن ہے کہ ہم راہ خدا میں جنگ نہ کریں جب کہ ہمارے گھر اور اولاد ہم سے چھوٹ چکے ہیں (اور ہمارے شہروں پر دشمنوں نے قبضہ کرکے ہماری اولاد کو قید کرلیا ہے)۔ لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے علاوہ سب پھر گئے اور خدا ستمگروں کو جانتا ہے۔

۲۴۷۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طالوت کو تمہاری بادشاہی کے لیے (انتخاب کرکے) بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگے یہ ہم پر کیسے حکومت کرسکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ اہل ہیں اور اس کے پاس تو زیادہ دولت و ثروت بھی نہیں ہے۔ اُس (نبی) نے کہا کہ اسے خدا نے علم اور جسمانی طاقت میں تم سے برتری کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے اور خدا کا احسان وسیع ہے اور وہ (لوگوں کی اہلیت سے) آگاہ ہے۔

۲۴۸۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ "صندوق عہد" تمہاری طرف آئے گا۔ (وہی صندوق کہ) جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اُسے اٹھا رکھا ہوگا اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس میں تمہارے لیے (واضح) نشانی ہے۔

۲۴۹۔ اور جب طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کی فرمانروائی کے لیے مقرر ہوگئے اور وہ لشکر کو باہر لے گئے تو ان سے کہا کہ خدا تمہارا پانی کی ایک نہر کے ذریعے امتحان لے گا تو جو لوگ (پیاس کے وقت)

اسے پی لیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں اور جو اپنے ہاتھ سے ایک پیالے سے زیادہ نہیں پئیں گے وہ مجھ سے ہیں چند افراد کے علاوہ سب نے اس سے پانی پی لیا۔ اس کے بعد وہ اور ان پر ایمان لانے والے (اور امتحان کی کسوٹی میں پورے اترنے والے) نہر سے گذر گئے (اب وہ اپنی تعداد کی کمی پر پریشان ہوگئے) اور ایک گروہ کے لوگ کہنے لگے آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن وہ جو جانتے تھے کہ خدا کی ملاقات ہوگی (اور وہ قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہنے لگے کہ کتنے ہی ایسے تھوڑے لوگ تھے جو حکم خدا سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آئے اور کامیاب ہوگئے اور خدا صابرین (اور استقامت دکھانے والوں) کے ساتھ ہے۔

۲۵۰۔ اور وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ڈٹ گئے تو کہنے لگے پروردگار! ہم پر شکیبائی اور استقامت نازل فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافر قوم پر کامیابی عطا فرما۔

۲۵۱۔ اس کے بعد انہوں نے خدا کے حکم سے دشمن کی فوج کو شکست سے دوچار کردیا اور داؤد نے جو طالوت کے لشکر میں قوی اور شجاع نوجوان تھے) جالوت کو قتل کردیا اور خدا نے انہیں حکومت اور علم و دانش عطا فرمائی اور جو کچھ اُس (اللہ) نے چاہا انہیں تعلیم دی اور اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض کو دفع نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے لیکن خدا تمام جہانوں پر لطف و احسان کرنے والا ہے۔

۲۵۲۔ یہ خدا کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ تم پر پڑھتے ہیں اور تم مرسلین میں سے ہو۔

تفسیر

خدائے بزرگ و برتر ان آیات میں ایک عبرتناک واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ جہاد اور حریم دین خدا یعنی حریم انسانیت کے دفاع کا یہ تذکرہ مسلمانوں کی عبرت کے لیے ہے۔ آیات کی تفسیر سے قبل ہم اس داستان کو بیان کرتے ہیں۔

ایک عبرت خیز واقعہ

اہل فرعون کے زیر اثر رہ کر بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں انہیں اس افسوسناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قدرت و عظمت حاصل کرلی۔

اس پیغمبر کی برکت سے خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد[1] بھی تھا یہودی اپنے لشکر کے آگے اسے اٹھائے رکھتے تھے۔ اس سے ان میں ایک طرح کا سکون قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل کو یہ قدرت و عظمت حضرت موسیٰؑ کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور و تکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں انہیں فلسطینیوں کے ہاتھوں شکست

---

[1] بہت جلد صندوق عہد، اس کی تاریخ اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں بحث کریں گے۔

اٹھانا پڑی۔ وہ اپنی قسمت و عظمت کھو بیٹھے اور صندوق عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔ پھر اس قدر پراگندگی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمنوں سے بھی دفاع کے قابل نہ رہے یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور ان کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور ارشاد و ہدایت کے لیے حضرت اشموئیل کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا۔ بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم و جور سے تنگ آچکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہٰذا ان کے گرد جمع ہوگئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لیے کوئی رہبر اور امیر مقرر کردیں تاکہ وہ اس کی قیادت میں ہم آواز اور ایک جان ہوکر دشمن سے جنگ کریں اور عزت رفتہ بحال ہوسکے۔

اشموئیل ان کی اندرونی کیفیات اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ جب جہاد کا حکم آئے تو تم کہیں امیر و رہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو۔

وہ کہنے لگے

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے۔ ہماری زمینوں پر قبضہ کرچکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا کر لے گیا ہے۔

حضرت اشموئیل نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشخیص کرچکے ہیں اور اب انہیں ایک طبیب کی ضرورت ہے۔ گویا وہ اپنی پسماندگی کے راز سے واقف ہوچکے ہیں۔ اس پر حضرت اشموئیل نے بارگاہِ الٰہی کا رُخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا۔ وحی ہوئی:

"میں نے طالوت کو اُن کی سربراہی کے لیے منتخب کیا ہے"

حضرت اشموئیل نے عرض کیا:

خداوندا! میں نے ابھی تک طالوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں

ارشاد ہوا:

ہم اسے تمہاری طرف بھیجیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اُس کے حوالے کر دینا اور علم جہاد اس کے ہاتھ میں دے دینا

طالوت کون تھے

طالوت ایک بلند قامت، تنومند اور خوبصورت مرد تھے۔ وہ مضبوط اور قوی اعصاب کے مالک تھے۔ روحانی طور پر بھی بہت ہی زیرک، دانشمند اور صاحب تدبیر تھے۔ بعض لوگوں نے اُن کے نام "طالوت" کو بھی اُن کے طولانی قد کا سبب قرار دیا ہے۔

ان تمام صفات کے باوجود وہ مشہور نہیں تھے ۔ اپنے والد کے ساتھ دریا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے والد کے چوپایوں کو چراتے اور زراعت کرتے تھے ۔

ایک دن کچھ جانور بیابان میں گم ہو گئے ۔ طالوت اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی تلاش میں کئی دن تک سرگرداں رہے ۔ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شہر "صوف" کے قریب پہنچ گئے ۔

اُن کے دوست نے کہا "ہم تو اشموئیل کے شہر صوف میں آپہنچے ہیں ۔ آیئے اُن کے پاس چلتے ہیں ۔ شاید وحی کے سائے میں اور اُن کی رائے کی روشنی میں ہمیں کچھ پتہ چل سکے ۔

شہر میں داخل ہوتے تو حضرت اشموئیلؑ سے ملاقات ہوگئی ۔ جب اشموئیلؑ اور طالوت نے ایک دوسرے کو دیکھا تو گویا دل مل گئے ۔ اشموئیلؑ نے اسی لمحے طالوت کو پہچان لیا ۔ وہ جان گئے کہ یہ وہی نوجوان ہے جسے خدا نے ان لوگوں کی قیادت کے لیے منتخب کیا ہے ۔

طالوت نے اپنی کہانی سنائی تو اشموئیل کہنے لگے : وہ چوپائے تو اس وقت تمہاری بستی کی راہ پر ہیں اور تمہارے باپ کے باغ کی طرف جارہے ہیں ۔ ان کے بارے میں فکر نہ کرو ۔ میں تمہیں اس سے کہیں بڑے کام کے لیے دعوت دیتا ہوں ۔ خدا نے تمہیں بنی اسرائیل کی نجات کے لیے مامور کیا ہے ۔

طالوت پہلے تو اس پروگرام پر حیران ہوئے اور پھر اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا ۔ اشموئیلؑ نے اپنی قوم سے کہا :

خدا نے طالوت کو تمہاری قیادت سونپی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تم
سب اس کی پیروی کرو ۔ اب اپنے تئیں دشمن سے مقابلے کے
لیے تیار کر لو ۔

بنی اسرائیل کے نزدیک تو حسب و نسب اور ثروت کے حوالے سے کئی خصوصیات فرمانروا کے لیے ضروری تھیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی طالوت میں دکھائی نہ دیتی تھی اس انتخاب و تقرر پر وہ بہت حیران و پریشان ہو گئے ۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقیدے کے برخلاف وہ نہ تو لاوی کی اولاد میں سے تھے جن میں سے نبی ہوتے تھے ۔ نہ یوسف اور یہودا کے خاندان سے تھے جو گذشتہ زمانے میں حکمرانی کرتے تھے بلکہ ان کا تعلق تو بنیامین کے گمنام خاندان سے تھا اور پھر وہ مالی طور پر بھی تہی دست تھے ۔

انہوں نے اعتراض کیا : وہ کیسے حکومت کر سکتا ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں ۔

اشموئیل سمجھتے تھے کہ یہ بہت اشتباہ کر رہے ہیں کہنے لگے : انہیں خدا نے تم پر امیر مقرر کیا ہے نیز قیادت کے لیے ان کی اہلیت اور لیاقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہیں اور روحانی طاقت میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ تم سب پر برتری رکھتے ہیں ۔

بنی اسرائیل نے خدا کی طرف سے اُس کے تقرر کے لیے کسی نشانی یا علامت کا مطالبہ کیا ۔ اس پر اشموئیلؑ بولے انبیاء بنی اسرائیل کی اہم یادگار تابوت (صندوق عہد) جو جنگ میں تمہارے لیے اطمینان اور دلاوری کا باعث تھا تمہارے

پاس لوٹ آئے گا اور اسے تمہارے آگے آگے چند فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صندوقِ عہد ان کے سامنے آگیا۔ یہ نشانی دیکھ کر انہوں نے طالوت کی سربراہی قبول کرلی۔

طالوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی

طالوت نے لشکر کی قیادت کا بیڑا اٹھایا۔ اُنہوں نے تھوڑی ہی مدت میں امورِ سلطنت کی انجام دہی اور فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ پھر آپ نے فوج کو دشمن سے مقابلے کی دعوت دی۔ دشمن نے ان کی ہر چیز کو خطرے سے دوچار کر رکھا تھا

طالوت نے تاکید کرتے ہوئے کہا: میرے ساتھ وہ لوگ چلیں جن کی ساری توجہ جہاد پر مرکوز رہ سکے۔ جن کی صحت ناقص ہو اور جو درمیان ہی میں ہمت ہار بیٹھنے والے ہوں، اس جنگ میں شرکت نہ کریں۔

بہت جلد بظاہر ایک کثیر تعداد اور طاقتور فوج جمع ہوگئی اور وہ دشمن کی طرف چل پڑے۔

سورج کی تپش تھی۔ گرمی میں چلتے چلتے انہیں سخت پیاس لگ گئی۔ طالوت خدا کے حکم سے انہیں آزمانا چاہتے تھے اور ان کی تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا: جلد تمہارے راستے میں ایک نہر آئے گی۔ اس کے ذریعے خدا تمہارا امتحان لے گا۔ جو لوگ اس میں سے سیر ہو کر پانی پئیں گے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں البتہ جو تھوڑا سا پانی پئیں گے وہ میرے ساتھی ہیں۔ ان کی نظر نہر پر پڑی تو بہت خوش ہوئے۔ جلدی سے وہاں پہنچے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ تھوڑے سے فوجی اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔

طالوت نے دیکھا کہ ان کی فوج کی اکثریت بے ارادہ اور کمزور عہد و پیمان کی حامل ہے اور اس میں تھوڑے سے صاحبِ ایمان افراد موجود ہیں۔ اُنہوں نے بے قاعدہ اور نافرمان اکثریت کو چھوڑ دیا اور اُنہی کم تعداد صاحبِ ایمان کو ساتھ لیا اور شہر سے گزر کر میدانِ جہاد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

طالوت کی فوج نے اپنی کم تعداد دیکھی تو پریشان اور وحشت زدہ ہوئی۔ فوجیوں نے ان سے کہا: ہم میں تو اس طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا دل خدا کی محبت سے معمور تھا وہ دشمن کی فوجی کثرت و قوت اور اپنی تھوڑی تعداد پر ہراساں نہ ہوئے اور کمال شجاعت سے طالوت سے کہنے لگے: آپ جو مصلحت سمجھتے ہیں حکم دیجیے۔ ہم ہر مقام پر آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاء اللہ کم تعداد کے باوجود دشمن سے جہاد کریں گے کیونکہ یہ تو کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ کم تعداد خدا کے ارادہ و مشیت کے سہارے کثیر تعداد پر غالب آئی ہے اور خدا استقامت و پامردی دکھانے والوں کے ساتھ ہے۔ طالوت ان کم تعداد اہلِ ایمان مجاہدین کے ساتھ آمادہ کارزار ہوئے۔ ان لوگوں نے درگاہِ الٰہی سے شکیبائی اور کامیابی کی دعا کی۔

جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ جالوت اپنا لشکر لے کر باہر نکلا۔ لشکروں کے مابین مبارز طلبی ہوئی۔ اس کی بارعب پکار نے دلوں کو لرزا دیا۔ میدان میں جانے کی جرأت کسی میں نہ رہی۔ داؤد ایک کم سن نوجوان تھا۔ شاید وہ جنگ کے لیے بھی

میدان میں نہ آیا تھا بلکہ اپنے جنگجو بڑے بھائیوں اور باپ کی خدمت کے لیے چلا آیا تھا لیکن چاک وچوبند اور قوی تھا۔ فلاخن اس کے ہاتھ میں تھی اس کے ذریعے اس نے دو پتھر ایسے ماہرانہ انداز میں پھینکے کہ ٹھیک جالوت کی پیشانی اور سر میں پیوست ہوگئے۔ اس کے سپاہیوں پر وحشت اور تعجب کا عالم طاری تھا۔ وہ ان کے درمیان گرا اور مرگیا۔ جالوت کے قتل سے اس کی فوج میں عجیب خوف وہراس پیدا ہوگیا۔ جالوت کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور بنی اسرائیل کامیاب وکامران ہوگئے۔ [1]

"المرتر الی الملاء من بنی اسرائیل ....."

لغت میں "ملاء" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آنکھ بھر جائے اور دیکھنے والے کے تعجب کو برانگیختہ کردے۔ اس لیے زیادہ جمعیت کو جو ہم رائے اور ہم عقیدہ ہو "ملاء" کہتے ہیں۔ نیز ہر قوم وملت کے اشراف اور بزرگوں کو بھی ملاء کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک خاص مقام ومنزلت کے حامل ہونے کی وجہ سے دیکھنے والے کی آنکھ کو بھر دیتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے آیت بنی اسرائیل کی ایک بڑی جمعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان لوگوں نے یک آواز اپنے پیغمبر سے امیر ورہبر کا تقاضا کیا تاکہ اس کی قیادت میں جالوت کا مقابلہ کرسکیں جس نے ان کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی حیثیت کو معرض خطر میں ڈال رکھا تھا۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰ کے بعد رونما ہوا۔

"فی سبیل اللہ"

بنی اسرائیل اس دشمن کے تجاوز اور زیادتی سے نجات چاہتے تھے جس نے انہیں ان کی سرزمین سے نکال دیا تھا۔ اس کے لیے وہ آمادہ جنگ تھے۔ اس کے باوجود اس پروگرام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز انسانوں کی آزادی، ظلم کی سرکوبی اور تجاوز سے نجات کے لیے مددگار ثابت ہوسکے وہ "فی سبیل اللہ" میں شمار ہوتی ہے۔

"قال هل عسيتم ان كتب عليكم القتال الا تقاتلوا"

ان کے پیغمبر چونکہ ان کی سستی وکاہلی سے واقف تھے اس لیے کہنے لگے، ممکن ہے جب تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے تو تم عمل نہ کرو۔

"قالوا ومالنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا"

وہ کہنے لگے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ جنگ سے روگردانی کریں۔ حالانکہ اس نے ہمیں ہمارے شہر سے باہر نکال دیا ہے اور ہمارے بچوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔

اسی طرح ان سے پیمان وفاداری لیا گیا لیکن خدا کا نام اس کا فرمان۔ اپنے وجود اور استقلال کی حفاظت کا تقاضا اور اولاد کی آزادی کی خواہش کوئی چیز بھی انہیں عہد شکنی سے نہ روک سکی اس لیے قرآن نے ساتھ ہی یہ فرمایا ہے:

"فلما كتب عليهم القتال تولوا الا قليلا منهم" یعنی جب ان پر جہاد فرض ہوا تو تھوڑے سے افراد کے علاوہ سب لوگ روگرداں ہوگئے اور ان کے قائد نے ایک قلیل سی فوج لے کر جنگ کے عظیم میدان میں شرکت کی۔

---

[1] تفسیر "مجمع البیان"، "الدر المنثور" اور "قصص القرآن" سے اقتباس کی تلخیص۔

"واللہ علیم بالظالمین"

خدا ان ظالموں کو جانتا ہے جنہوں نے اپنے آپ پر، معاشرے پر، آنے والی نسلوں پر اور اپنی اولاد پر ظلم کیا ہے۔ ان کے حسب حال سزا اب ان کا انتظار کر رہی ہے۔

"وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا"

اس آیت کے مطابق بنی اسرائیل کے لشکر کی بادشاہی اور سربراہی کے لیے خدا تعالیٰ نے طالوت کو منتخب کیا تھا اور شاید "بعث" کا لفظ اسی طرف اشارہ ہو جو کچھ اس واقعہ کی تفصیل میں بیان کیا گیا ہے یعنی غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے طالوت پیغمبر کی مجلس تک آپہنچے۔

ضمنی طور پر آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالوت فقط لشکر کے کمانڈر ہی نہ تھے، ملک کے حکمران بھی تھے

"قالوا انى يكون له الملك علينا ونحن احق بالملك منه ولم يؤت سعة من المال"

بنی اسرائیل کی طرف سے یہ پہلی عہد شکنی ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے سامنے طالوت کے انتخاب کے بارے میں اعتراض کیا۔ حالانکہ وہ تصریح کر چکے تھے کہ یہ جانثار خدا کی طرف سے ہے لیکن وہ خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنے سے بھی نہ چوکے اور کہنے لگے: ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ عالی نسبی اور فراواں دولت تو ہمارے پاس ہے جو حکمرانی کی دو لازمی شرطیں ہیں۔

جیسا کہ ہم اس واقعے کی تفصیل میں دیکھ چکے ہیں کہ طالوت بنی اسرائیل کے ایک گمنام قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مالی طور پر ایک عام زراعت پیشہ شخص سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔

قیادت کی شرائط

اس زمانے کے پیغمبر نے معترضین کو جو دندان شکن جواب دیا قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے: خدا نے اسے تم پر حکمرانی کی خاطر اس لیے چنا ہے کہ وہ دانائی و مردانگی اور علم سے مالا مال ہے اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے قوی اور صاحب قدرت ہے۔ یعنی تم اشتباہ کا شکار ہو اور رہبری کی بنیادی شرائط کو بھولے بیٹھے ہو۔

اس طرح قرآن نے قیادت کے لیے پیش کردہ ان کی شرائط کی نفی کر دی کیونکہ ان کی پیش کردہ دونوں شرائط میں سے کوئی بھی حقیقی امتیاز اور خصوصیت نہیں کہلا سکتی۔ آباؤ اجداد کی شخصیت اور دولت و ثروت دونوں اعتباری اور خارج از ذات امتیازات ہیں۔ لیکن علم و دانش اور جسمانی طاقت ذات میں داخل امتیازات اور خصوصیات ہیں۔

رہبر اپنے علم و دانش سے معاشرے کے لیے راہ سعادت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے لیے اصول بتلاتا ہے نیز اپنی طاقت و قوت کے ذریعے اس کے اجراء کا اہتمام بھی کرتا ہے اسی لیے تو فرمایا گیا ہے: "ان الله اصطفه عليكم وزاده بسطة فى العلم والجسم"

"بسطۃ" جس کا معنی "وسعت" ہے ضمنی طور پر علم و قدرت کے سائے میں انسانی وجود کی وسعت کی طرف اشارہ ہے یعنی علم و دانش اور فرزانگی نیز جسمانی قدرت و طاقت وجود و ہستی کے اعتبار سے انسان میں وسعت پیدا کرتی ہے اور جوں جوں یہ صفات وسیع ہوتی ہیں وجود ہستی میں بھی وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

"واللہ یؤتی ملکہ من یشاء"

ممکن ہے یہ جملہ رہبری کی تیسری شرط کی طرف اشارہ ہو جو یہ ہے کہ رہبر کے لیے مختلف اسباب و ذرائع کی فراہمی بھی درکار ہے کیونکہ ممکن ہے رہبر علم و قدرت سے تو مالا مال ہو لیکن اس کا سابقہ ایسے حالات و اوقات سے ہو جو اس کے مقدس مقاصد کے لیے سازگار نہ ہوں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ایسی رہبری واضح کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ حکومت الٰہی جسے خدا چاہتا ہے بخش دیتا ہے یعنی اس ماحول کے لیے جو وسائل و ذرائع ضروری ہوں وہ اس کے لیے فراہم کر دیتا ہے۔

"واللہ واسع علیم"

یعنی خدا ایک وسیع اور لامتناہی ہستی ہے۔ اس کا فضل اور بخشش بھی اس کے وجود کی طرح لامتناہی ہے لیکن وہ علیم ہے اور جانتا ہے کہ کون سا منصب کسے بخش جانا چاہیئے۔

"وقال لھم نبیھم ان آیۃ ملکہ ان یاتیکم التابوت"

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل ابھی تک خدا کی طرف سے طالوت کی ماموریت پر مطمئن نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے پیغمبر اشموئیل تصریح کر چکے تھے کہ وہ اس کام کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس کی نشانی اور دلیل کا تقاضا کیا۔ جواب میں اشموئیل نے کہا: طالوت کے مامور من اللہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تابوت (صندوق عہد) تمہاری طرف آئے گا۔

یہ بات بنی اسرائیل کے لیے کافی ہونا چاہیے تھی۔ بہر حال اب دیکھتے ہیں تابوت کیا چیز تھی۔

تابوت کیا ہے

"تابوت" کا لغوی معنی ہے وہ صندوق جسے لکڑی سے بنایا جائے۔ جنازے کے صندوق کو بھی اسی لیے تابوت کہتے ہیں لیکن تابوت مُردوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کے لکڑی کے صندوق کے لیے مستعمل ہے۔

بنی اسرائیل کا تابوت یا صندوقِ عہد کیا تھا، وہ کس کے ہاتھ سے بنا تھا اور اس میں کیا چیزیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں بہت سی روایات و تفاسیر میں اور اسی طرح "عہد قدیم" (تورات) میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سب سے زیادہ واضح چیز جو احادیث اہل بیتؑ اور بعض مفسرین مثلاً ابن عباس سے منقول ہے یہ ہے کہ یہ تابوت ..... وہی صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے انہیں لپٹا کر دریا میں پھینکا تھا۔ فرعون کے کارندوں نے اسے دریا میں سے پکڑ لیا۔ حضرت موسیٰ کو اس میں سے نکال لیا گیا اور صندوق جوں کا توں فرعون کے پاس محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا تو وہ اس عجیب صندوق کو محترم شمار کرنے لگے اور اسے متبرک سمجھنے لگے۔

حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ الواح مقدسہ جن پر احکام خدا لکھے ہوئے تھے اس میں رکھ دیں ۔ نیز اپنی زرہ اور دوسری یادگار چیزوں کا بھی اس میں اضافہ کر دیا ۔ صندوق آپ نے اپنے وصی حضرت یوشع بن نون کے سپرد کر دیا یوں صندوق کی اہمیت بنی اسرائیل کی نگاہ میں اور بڑھ گئی ۔ لہذا وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں اسے ہمراہ لے جاتے اور اس کا ان پر نفسیاتی اور روحانی طور پر بہت اثر ہوتا ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ دل انگیز صندوق اُن مقدس چیزوں کے سمیت ان کے ساتھ رہا وہ سربلند رہے اور آبرو مندانہ زندگی بسر کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی دینی بنیادیں کمزور پڑ گئیں اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کرتے رہے ۔ وہ صندوق بھی ان سے چھن گیا ۔

اِن آیات کے مطابق حضرت اشموئیل نے اُن سے وعدہ کیا کہ عنقریب صندوقِ عہد اُن کے قول کی سچائی کا مظہر بن کر واپس آجائے گا ۔

"فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ"

اِس جملے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صندوق عہد وہ ایسے تبرکات تھے جو حوادث کے موقع پر بنی اسرائیل کے لیے اطمینان بخش تھے اور معنوی و نفسیاتی اثرات کے حامل تھے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعد ازاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے خاندان کی کچھ یادگاریں بھی اس میں رکھ دی گئی تھیں ۔

توجہ رہے کہ "سکینہ" سکون کے مادہ سے ہے اور تسکین و آرام کے معنی میں مستعمل ہے ۔ یہاں اس سے مراد جان و دل کا سکون اور اطمینان ہے ۔

حضرت اشموئیل نے بنی اسرائیل کو یہ بات دل نشین کرائی کہ صندوق عہد دوبارہ انہیں مل جائے گا ۔ وہ جو سکون اور اطمینان وہ کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل کر لیں گے ۔ معنوی و تاریخی پہلو کے حامل اس صندوق کی اہمیت دراصل بنی اسرائیل کے لیے ایک پرچم اور شعار سے بڑھ کر تھی ۔ اسے دیکھ کر ان کی نظروں میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔ حضرت اشموئیل نے خبر دی کہ وہ صندوق لوٹ آئے گا ۔ فطری امر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے لیے ایک بہت بڑی بشارت تھی ۔

تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ فرشتوں نے اُسے اُٹھا رکھا ہو گا

فرشتے صندوق عہد کیسے لائے ؟ اِس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں ۔ ان میں سے زیادہ واضح تواریخ کے حوالے سے یہ ہے کہ جب صندوق عہد فلسطین کے بت پرستوں کے ہاتھ لگا اور وہ اسے اپنے بت خانے میں لے گئے اس کے بعد وہ بہت سی مصیبتوں اور ابتلاؤں کا شکار ہو گئے تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ سب کچھ صندوق عہد کے آثار میں سے ہے لہذا انہوں نے طے کر لیا کہ اسے اپنے شہر اور علاقے سے باہر بھیج دیں گے ۔ کوئی شخص اسے باہر لے جانے کو تیار نہ ہوا ۔ مجبوراً دو بیل جوتے گئے اور صندوق عہد کو باندھ کر بیلوں کو بیابان میں جا کر چھوڑ دیا گیا ۔ اتفاق سے یہ واقعہ ٹھیک اس وقت رونما ہوا جب طالوت کو بنی اسرائیل کا فرمانروا بنایا گیا ۔

خدا کے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان دو بیلوں کو اشموئیل کے شہر کی طرف ہانک کر لے جائیں ۔ بنی اسرائیل نے

صندوق عہد کو دیکھا تو اسے طالوت کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی نشانی کے طور پر قبول کر لیا۔ اس لیے ظاہراً تو وہ بیل اسے شہر میں لائے لیکن درحقیقت یہ کام خدائی فرشتوں کی وجہ سے انجام پذیر ہوا اسی وجہ سے صندوق اٹھالانے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔ اصولی طور پر فرشتہ اور ملک قرآن حکیم اور روایات میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اس مفہوم میں روحانی عقل رکھنے والے موجودات کے علاوہ اس جہان کی مخفی قوتوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔

"ان فی ذٰلک لاٰیۃ لکم ان کنتم مؤمنین"

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کو یاد دھانی کرائی گئی ہے کہ صندوق عہد کی تمہارے پاس واپسی تمہارے لیے ایک واضح نشانی ہے بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ حقیقت میں یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس روشنی اور نشانی کے باوجود تم میں ایسے افراد ہیں جو حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ اس واقعے کے آخر میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

"فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ مبتلیکم بنھر فمن شرب منہ فلیس منی ومن لم یطعمہ فانہ منی الا من اغترف غرفۃ بیدہ فشربوا منہ الا قلیلا منھم۔

"فصل" کا معنی ہے "علیحدہ ہونا" اور "قطع ہونا"۔ "جُنُود" "جُند" کی جمع ہے۔ جند دراصل ایسی زمین کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے پتھروں سے بھری ہو۔ تاہم ہر اکٹرانے والی اور اکٹھوں میں کھینے والی چیز کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اسی لیے عموماً لشکر کی کثیر تعداد کو جند کہتے ہیں۔

یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر گروہ کی کامیابی رہبر اور کمانڈر کے حکم کے مطابق فوج کے نظم و ضبط اور ایمان کی مرہون منت ہے۔

اگر فوجی اپنے کمانڈر کی قابلیت اور حکم پر ایمان رکھتے ہوں تو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ طالوت جو بنی اسرائیل کو جہاد کے لیے لے جا رہے تھے ان کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کے اہل لشکر ان کے حکم کی کتنی اطاعت کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ وہ لشکر تھا جس نے تردد اور بددلی سے ان کی قیادت قبول کی تھی۔ اگرچہ وہ ظاہراً ان کی رہبری کو تسلیم کر چکے تھے لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ فطرتاً ابھی شک و تردد کے عالم میں ہوں۔ لہٰذا فرمان الٰہی کے ذریعے انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں آزمائیں۔ اس پر طالوت نے خبر دی کہ بہت جلد ایک نہر آئے گی۔ ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ پیاس کا مقابلہ کریں اور تھوڑا سا پانی پئیں تاکہ واضح ہو جائے کہ دشمن کی شمشیر آتش بار کے مقابلے میں جانے والا لشکر پیاس کو برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہے یا نہیں۔

اس واقعے کی تفصیل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اکثریت آزمائش کی اس کٹھالی سے صحیح سالم نہ نکل سکی۔

اس طرح طالوت کا لشکر تطہیر کے دوسرے عمل سے گزرا۔ پہلی تطہیر وہ تھی جب انہوں نے عام لوگوں کو تیاری کے وقت کہا تھا کہ جو لوگ دل جمعی سے ساتھ نہ دے سکیں اور تکمیل مقصد تک قائم نہ رہ سکیں، وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔

"فلما جاوزہ ھو والذین اٰمنوا معہٗ قالوا لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ......"

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ تھوڑے سے افراد جو پیاس کی آزمائش پر پورے اترے وہی طالوت کے ساتھ گئے لیکن جب اس چھوٹے سے گروہ نے غور کیا کہ جلد ہی اُن کا دشمن کے عظیم اور طاقتور لشکر سے سامنا ہوگا تو اپنی تعداد کی کمی پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب آزمائش کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔

"قال الذین یظنون انھم ملاقوا اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ."

"فئۃ" کا مادہ ہے "فیء" اس کا معنی ہے بازگشت۔ گروہ اور تشکیل شدہ جماعت کو بھی فئۃ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ آتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ اس وقت قیامت پر ایمان راسخ رکھنے والے باقی ساتھیوں کو بیدار اور تنبیہ کرنے لگے کہ کسی جمعیت کی مقدار اور تعداد پر نگاہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ کیفیت اور جذبے کو دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک کم تعداد مگر باایمان اور عزم صمیم رکھنے والی جمعیت نے حکم خدا سے اپنے سے کہیں بڑی تعداد پر غلبہ پالیا۔

توجہ رہے کہ "یظنون" اس مقام پر "یعلمون" کے معنی میں ہے یعنی جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں نہ کہ قیامت کا گمان رکھتے ہیں کیونکہ "ظن" بہت سے مواقع پر یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اگر اسے گمان کے معنی میں لیا جائے تب بھی غیر مناسب نہیں ہے کیونکہ پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ قیامت کا گمان (چہ جائیکہ علم ولیقین) بھی کافی ہے کہ وہ انسان کو مقاصد الٰہی کے سامنے راسخ العزم بنادے کیونکہ زندگی میں کامیابی کا گمان رکھنے والے تمام لوگ مثلاً زراعت، تجارت، صنعت اور سیاست سے وابستہ لوگ صرف گمان کی بنیاد پر اپنا کام پختہ ارادے سے انجام دیتے ہیں قیامت کے دن لقائے پروردگار کا دن کیوں کہا گیا ہے اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد اوّل کے اردو ترجمہ کے صفحہ ۱۷۹ پر گفتگو کی جاچکی ہے۔ "باذن اللہ" یعنی حکم خدا سے۔

عزم صمیم رکھنے والے ایمان دار لوگوں کی بہت سے بے ایمان گروہوں اور جماعتوں پر کامیابی ایک مسلّمہ امر ہے جو روحانی اور نفسیاتی عوامل سے مربوط ہے پھر بھی قرآن اسے فرمان الٰہی سے منسلک قرار دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں کسی بھی طرح کے آثار ونتائج ہوں سب آفرینش پروردگار کی برکت سے، اس کی طرف سے اور اس کے حسب فرمان ہیں۔ ایسی ہی تعبیر قرآن میں بہت سے مواقع پر نظر آتی ہے۔

"واللہ مع الصابرین"

یہ جملہ عزم صمیم رکھنے والے اہل ایمان کی طرف سے دوسروں کو صبر واستقامت کی دعوت کا حرف آخر ہے۔

یہ اہل ایمان انہیں بشارت دیتے تھے کہ خدا اہل صبر واستقامت کے ساتھ ہے۔

"ولما برزوا لجالوت وجنودہ:"

"بروز" کا معنی ہے "ظہور"۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آمادۂ جنگ ہو اور میدانِ جنگ میں نکل آئے تو اس کے عمل کو "براز" کہتے ہیں اور جب کوئی دوسرے کو جنگ کی دعوت دے تو کہتے ہیں کہ وہ مبارز طلبی کر رہا ہے۔

یہ آیت کہتی ہے کہ جب طالوت اور اُن کا لشکر ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں جالوت کا طاقتور لشکر نمایاں طور پر نظر آرہا تھا تو وہ اِس عظیم قوت کے سامنے صف بستہ ہوگئے اُنہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اپنے تئیں پروردگار کی لامتناہی قدرت کے سپرد کردیا اور اس سے استقامت اور صبر کا تقاضا کیا۔

"ربنا افرغ علینا صبرًا"۔

"افراغ" کا مطلب ہے کسی سیال مادے کو برتن سے ایسے گرانا کہ برتن خالی ہوجائے حضرت طالوت کے ہمراہی دعا کے وقت کہتے ہیں کہ خداوندا ہم پر صبر و استقامت انڈیل دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے صبر، استقامت اور پامردی کا آخری درجہ طلب کر رہے ہیں جیسے کسی برتن کا سارا پانی کسی پر ڈال دیا جائے اور برتن خالی ہوجائے۔

"وثبت اقدامنا"۔

یعنی ہمیں ثابت قدم رکھ تاکہ ہمارے قدم اکھڑ نہ جائیں اور میدان سے بھاگ کھڑے نہ ہوں حقیقت میں پہلی دعا باطنی پہلو کی حامل ہے اور یہ دعا ظاہری پہلو رکھتی ہے اور یہ مسلّم ہے کہ ثابت قدمی صبر و استقامت کی روح کا نتیجہ ہے

"وانصرنا علی القوم الکافرین"۔

دراصل یہ جملہ استقامت اور ثبات قدمی کا نتیجہ ہے جو گذشتہ دو جملوں میں بیان ہوچکی ہے یعنی خداوندا استقامت اور ثبات قدمی کے زیر سایہ ہمیں کفار پر فتح عطا فرما۔

"فھزموھم باذن اللہ وقتل داؤد جالوت"۔

اِس آیت میں طالوت کی رہبری اور کمان میں بنی اسرائیل کی جالوت جیسے ظالم اور اس کے طاقتور لشکر سے جنگ کے آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے جالوت کا لشکر مجبوراً شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا خود جالوت بھی حضرت طالوت کے لشکر کے ایک شخص داؤد کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ داؤد کے ہاتھوں جالوت کے قتل کی تفصیلات گذشتہ اوراق میں بیان کی جاچکی ہیں۔

زیر نظر آیت میں یہ صراحت موجود نہیں کہ یہ داؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے والد گرامی ہیں یا کوئی اور شخص۔ لیکن اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل ہوئے آیت کا اگلا حصہ یہ ہے۔

"واٰتہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء"

یعنی۔ خدا نے اُسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اُسے سکھایا
ایسی تعبیر عام طور سے انبیاء کے متعلق ہی ہوتی ہے۔
سورہ ص آیہ ۲۰ میں حضرت داؤدؑ پیغمبر کے بارے میں ہے۔

"وشددنا ملکه واتیناه الحکمة"

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کر دیا اور اسے علم و دانش عطا کیا۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث منقول ہیں ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ وہی مشہور پیغمبر حضرت داؤد تھے۔

ضمناً "علمه مما یشاء" (جو علوم خدا چاہتا تھا اسے سکھائے) سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و مرسلین کے علوم اور حکمتیں اس محدود مقدار کی حامل ہوتی ہیں جس کا خدا ارادہ کرتا ہے اگرچہ ان کے علم و دانش کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا ہے پھر بھی وہ اس مقدار میں ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

تنازع بقا کا مفروضہ

"ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض"

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے مومنین کی ایک جماعت کے ہاتھوں ظالم جالوت اور اس کی فوج کی شکست کے بعد آئی ہے، تفسیر خود بخود واضح ہو جاتی ہے کیونکہ اگر خداوند عالم بعض اوقات صاحب ایمان و استقامت لوگوں کے ذریعے ستمگروں اور ظالموں کی سرکوبی نہ کرے تو ممکن ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر قدرت حاصل کرلیں۔ پروردگار عالم کی سنت تو یہ ہے کہ دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی ہو اور لوگ خیر و شر کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں، لیکن جب ستمگروں کی سرکشی دنیا کی عمومی تباہی کا باعث بن رہی ہو تو خدا اپنے بندوں میں سے کسی ایک گروہ کی مدد کرتا ہے جو راہِ سرکشی کو روک دیتے ہیں اور یہ پروردگار عالم کا اپنے بندوں پر ایک لطف و کرم ہے۔

اس جملے کی نظیر سورہ حج آیت ۴۰ میں موجود ہے ارشاد ہوتا ہے:

"ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد......"

اگر خدا اپنے بعض بندوں کے ذریعے بعض دوسروں کو دفع نہ کرے تو گرجے، کلیسے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو جائیں۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے برخلاف آیت تنازع بقا سے کوئی ربط نہیں رکھتی ان کا خیال ہے کہ محل بحث آیت کہتی ہے کہ انسانوں میں ہمیشہ جنگ و جدال رہنا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو جمود، سستی اور فساد پوری زمین کو اپنی گرفت میں لے لے گا اور نسلِ انسانی تنزل کا شکار ہو جائے گی لیکن نزاع اور دائمی جنگ و جدل کے باعث زیادہ طاقتور باقی رہ جاتے ہیں اور کمزور پامال ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور یوں زیادہ صلاحیت رکھنے والا منتخب ہو جاتا ہے جسے انتخابِ اصلح کہتے ہیں۔

لیکن یہ تفسیر اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ ہم آیت کو اس کے ماقبل سے بالکل منقطع کردیں اور اس کی مشابہ سورہ حج کی آیت سے بھی صرفِ نظر کرلیں لیکن اگر ان پر توجہ رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ظالم اور سرکش لوگوں سے جنگ

کے بارے میں ہے اور ان میں اصولی طور پر جنگ کو مقدس و محترم قرار نہیں دیا گیا علاوہ ازیں تنازع بقاء کے قانون کے نام سے جو کچھ کہا جاتا ہے اور جو جانداروں کے چیزوں کے تکامل و ارتقاء کے چار یادگار اصولوں میں شمار ہوتا ہے وہ کوئی مسلّمہ علمی قانون نہیں ہے بلکہ ایک باطل شدہ مفروضہ ہے یہاں تک کہ تکامل انواع کے حامی بھی دنیا میں تنازع بقاء کے قانون کا ہرگز سہارا نہیں لیتے اور جانوروں کے تکامل کو طبیعت و خلقت کے قانون سے مربوط سمجھتے ہیں۔[1]

ان تمام چیزوں سے قطع نظر اگر تنازع بقاء کے مفروضے کی کوئی علمی بنیاد تسلیم کر لی جائے تب بھی اس سے صرف جانوروں کی زندگی کے سلسلے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسے انسانی زندگی کی بنیاد ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انسانی تکامل و ارتقاء تعاون بقاء کے ذریعے ہے نہ کہ تنازع بقاء کے زیر سایہ۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ تنازع بقاء کے مفروضے میں نوع انسانی کو بھی شامل کرنا ایک طرح کی استعماری اور سامراجی طرز فکر ہے۔ سرمایہ داری کے بعض حامی اپنی خونی جنگوں اور نفرت انگیز حکومتوں کی توجیہ اس طرز فکر سے کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جنگ و جدل کو ایک فطری تقاضے اور انسانی معاشروں کی ترقی کے زینے کے طور پر متعارف کرائیں اور اپنے جرائم کو ایک علمی لبادہ اوڑھا دیں لہٰذا جن لوگوں نے ان کے انسان دشمن افکار کے زیر اثر زیر بحث آیت کو ان کی فکر پر منطبق کیا ہے وہ یقینی طور پر قرآنی تعلیمات سے بہت دور چلے گئے ہیں کیونکہ قرآن صراحت سے کہتا ہے:

"یاایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" (بقرہ آیت ۲۰۸)

اے ایمان والو! سب کے سب صلح و سلامتی میں داخل ہو جاؤ

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"ولٰکن اللہ ذو فضل علی العالمین"

خدا عالمین پر لطف و رحمت کی نظر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ روئے زمین پر فساد و بربادی کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی لپیٹ میں آنے سے روکتا ہے۔

"تلک اٰیات اللہ نتلوھا علیک بالحق وانک لمن المرسلین"

یہ آیت میں بنی اسرائیل کے بارے میں بیان کیے گئے متعدد واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے ان میں سے ہر واقعہ پروردگار کی قدرت و عظمت کی نشانی ہے اور یہ واقعات خرافات اور ہر افسانوی رنگ سے پاک ہو کر پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئے اور یہ امر بذات خود پیغمبر اکرمؐ کی سچائی اور نبوت کی ایک علامت ہے وانک لمن المرسلین

۲۵۳۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے "اعتراض فرضیہ ہائے تکامل" کا مطالعہ فرمائیں۔

الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

ترجمہ

۲۵۳۔ اِن بعض رسُولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض سے خُدا نے (براہِ راست) گفتگو کی ہے اور بعض کو برتر درجات عطا کیے ہیں اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے واضح نشانیاں دی ہیں اور اُن کی تائید ہم نے روح القدس کے ذریعے کی (لیکن کسی پیغمبر کے مقام کی فضیلت سے اُمتوں کا اختلاف ختم نہ ہوا) اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد ایک دوسرے سے جنگ و جدال نہ کرتے (لیکن خدا لوگوں کو مجبور نہیں کیا کرتا اور انہیں راہ سعادت طے کرنے کے لیے آزاد رہنے دیتا ہے) مگر ان امتوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعض ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے (اور جنگ و جدال اور اختلاف کے درپے ہو گئے) پھر بھی اگر خدا چاہتا تو وہ (آپس میں) جنگ نہ کرتے لیکن خدا جو چاہتا ہے (حکمت کی بناء پر) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

"تِلْكَ الرُّسُل" :

"تِلْكَ" اشارۂ بعید کے لیے ہے لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کبھی کسی شخص یا چیز کے احترام کے لیے، اس کی حیثیت اور مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے اشارہ بعید استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی "رُسُل" سے پہلے "تِلْكَ" پیغمبرانِ خدا کی عظمت اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہے۔

"رُسُل" سے یہاں مراد تمام مرسلین اور پیغمبر ہیں یا پھر وہ رسُول مراد ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی گذشتہ آیات میں آچکا ہے یا جن کے واقعات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مثلاً ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤد اور اشموئیلؑ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ تمام رسول ہوں جن کے نام قرآن میں اس آیت کے نزول سے پہلے آچکے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تمام پیغمبر مراد ہیں۔ کیونکہ اصطلاحی طور پر لفظ "الرسل" "جمع محلّی باللام" ہے جو عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا سب رسولوں کے لیے ہے۔

"فضّلنا بعضهم علٰى بعض"

یہ جملہ وضاحت کرتا ہے کہ اگرچہ نبوت و رسالت کے لحاظ سے تمام پیغمبر ایک دوسرے کی مثل و نظیر ہیں لیکن مقام و منزلت میں یکساں نہیں ہیں کیونکہ ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ فداکار تو وہ سب تھے لیکن ان کی فداکاری کے درجات مختلف ہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔

"منہم من کلم اللہ"

اس جملے میں پیغمبروں کے بعض فضائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ خدا نے ان سے بعض کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ واضح ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں چونکہ وہی ایسی شخصیت ہیں جو کلیم اللہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ سورہ نساء آیت ۱۶۴ میں ان کے بارے میں ہے

"وکلم اللہ موسیٰ تکلیما"۔

یہ اخذ کرنا بہت بعید ہے کہ اس سے مراد پیغمبر اسلام ہیں اور سورہ شوریٰ آیت ۵۱ کے قرینے سے اس "تکلم" سے مراد وحی ہی ہے۔

"و رفع بعضھم درجٰت"

اس جملے میں بعض پیغمبروں کی درجے اور مرتبے کے اعتبار سے فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں پیغمبروں کے درجات کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر جملے سے مراد ایک یا کئی مخصوص افراد ہیں جن کا کامل نمونہ پیغمبر اسلام ہیں کیونکہ آپ کی ذات بابرکات ایسی ہے جس کا لایا ہوا دین، آئین آخری اور کامل ترین تھا اور جس کی رسالت کامل ترین دین کی تبلیغ کیلئے ہے اسے خود سب سے برتر ہونا چاہیئے اور خصوصاً یہ کہ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے۔

"وجئنا بک علیٰ ھؤلاء شھیدا"

قیامت کے دن ہر پیغمبر اپنی امت پر گواہ ہے اور تم تمام پیغمبروں پر گواہ ہو۔ (نساء ۴۱)

یہ آیت بھی مذکورہ موقف کی درستی پر دلالت کرتی ہے۔ گذشتہ جملے میں چونکہ حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد کا جملہ حضرت عیسیٰؑ کے مقام و منزلت کی صراحت کرتا ہے، لہٰذا بحث کی مناسبت سے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ جملہ بھی پیغمبر اسلامؐ کی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ تینوں پیغمبر عالمی مذاہب کے پیشوا ہیں اور اگر پیغمبر اسلامؐ کا ذکر ان دونوں کے درمیان آیا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ آپ ہی کا دین دیگر ادیان کے لیے حد وسط ہے اور اس میں ہر چیز اعتدال کے ساتھ موجود ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطا"۔ (بقرۃ - ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسط قرار دیا

ان تمام چیزوں کے باوجود آیت کے آئندہ جملے نشاندہی کرتے ہیں کہ "ورفع بعضھم درجات" سے مراد بعض گذشتہ پیغمبر مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ اور بعض دیگر ہیں کیونکہ بعد میں فرمایا گیا ہے:

"ولو شآء اللہ ما اقتتل الذین من بعدھم"

یعنی: اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کی امتیں ان کے بعد آپس میں جنگ و جدال نہ کرتیں۔

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ جملے سابق پیغمبروں کے بارے میں ہیں۔

"واٰتینا عیسی ابن مریم البینٰت وایدناہ بروح القدس"

فرمایا گیا ہے کہ ہم نے عیسیٰ کو واضح نشانیاں دیں مثلاً ناقابلِ علاج بیماروں کو شفا دینا، مُردوں کو زندہ کرنا، اعلیٰ مذہبی معارف اور روح القدس کے ذریعے انہیں تائید و تقویت بخشی۔

اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں بحث ہو چکی ہے کہ روح القدس سے مراد وحی الٰہی پہنچانے والے جبرئیل ہیں یا کوئی مخفی معنوی قوت جو تمام مومنین میں مختلف درجے پر موجود ہے۔

"ولو شآء اللہ ما اقتتل الذین من بعدھم من بعد ما جآءتھم البینٰت"

یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیغمبروں کی عظمت ان پیروکاروں کے درمیان اختلاف میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنی کیونکہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تکامل و ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ انسان حق و فضیلت کے راستے کو اپنے ارادے سے طے کرے۔ اگر خدا چاہتا تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ انسان کو حیوانات کی طرح خاص غرائز و طبائع کے ساتھ پیدا کرتا اور ان کے زیر اثر وہ انبیا کی پیروی کرتا اور صلح و صفائی سے رہتا لیکن یہ مسلم ہے کہ پھر ان پیغمبروں کی پیروی کرنا یا صلح و آشتی سے رہنا اور جنگ و جدال سے بچنا فضیلت و فخر کا باعث نہ ہوتا کیونکہ اس میں جبر و اکراہ کا پہلو پایا جاتا ہے۔

"ولٰکن اختلفوا فمنھم من اٰمن ومنھم من کفر"

اس اختلاف کا سرچشمہ خود لوگ ہی تھے ورنہ انبیاء و مرسلین میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان سب کا تو ایک ہی ہدف اور مقصد تھا۔ ہوا یہ کہ بعض لوگ ان کی تعلیمات پر ایمان لے آئے اور بعض نے مخالفت کی اور یہ امر اختلافات کے ظہور کا باعث بنا۔

"ولو شآء اللہ ما اقتتلوا ولٰکن اللہ یفعل ما یرید"

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان تھا کہ جبری طور پر اختلافات کو ختم کر دیتا لیکن خدا اپنے ارادے کے مطابق امور انجام دیتا ہے اور خدا کا ارادہ حکمت اور تکامل انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ اس نے انسان کو آزاد اور مختار قرار دیا ہے اگرچہ بعض لوگ اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کیا مختلف مذاہب اختلاف کا سبب ہیں؟

بعض مغربی مصنفین ادیان و مذاہب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انسانوں میں تفرقے اور نفاق کا باعث ہیں اور مذاہب میں بہت زیادہ انسانی خون بہایا گیا ہے۔ تاریخ میں بہت سی مذہبی جنگوں کے تذکرے موجود ہیں۔

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس اعتراض کے ذریعے وہ مذہب کی مذمت کرنا چاہتے ہیں اور اسے جنگ و جدال کا موجب قرار دیتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ امور قابلِ توجہ ہیں۔

اولاً جیسا کہ مندرجہ بالا آیت نشاندہی کرتی ہے کہ حقیقت میں سچے پیروکاروں اور حقیقی مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ اختلاف تو پیروانِ مذہب اور مخالفین مذہب کے درمیان تھا اور یہ جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں جنگ و جدال دکھائی دیتا ہے وہ ان کی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ مذاہب میں تحریف، نارو ا تعصبات اور آسمانی مذاہب میں خرافات کی آمیزش ہے۔

ثانیاً آج جب کہ بیشتر انسانی معاشروں میں سے مذہب یا کم از کم اس کی تاثیر ختم ہو چکی ہے تو پھر جنگوں میں وحشتناک ترین صورت میں وسعت کیوں آگئی ہے۔ آج یہ وحشت ناک جنگیں دنیا کے وسیع علاقوں میں جاری و ساری ہیں کیا اس کا الزام بھی مذہب کو دیا جائے گا یا پھر یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ انسانوں کے ایک گروہ کا سرکش نفس ان جنگوں کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ ہاں البتہ یہ لوگ کبھی مذہب کا بھیس بدل لیتے ہیں، کبھی سیاسی و اقتصادی مکاتب کا لباس پہن لیتے ہیں اور کبھی کسی اور سانچے میں ڈھل کر سامنے آ جاتے ہیں اس لیے قصور مذہب کا نہیں ہے۔ یہ سرکش لوگ ہیں جو اصل مجرم ہیں جو حیلے بہانوں سے جنگوں کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

ثالثاً آسمانی مذاہب بالخصوص اسلام نسل پرستی اور قوم پرستی کے مخالف ہیں اسی لیے انہوں نے بہت سی نسلی، جغرافیائی اور قبائلی سرحدوں کو ختم کر دیا ہے اور جن جنگوں کا سرچشمہ یہ امور تھے وہ فطرتاً ختم ہو گئی ہیں یوں جنگوں کا ایک حصہ انسانی زندگی کے مذہب کے زیر اثر آنے کے باعث تاریخ سے حذف ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں صلح و سلامتی، اچھے اخلاق و اوصاف تمام آسمانی مذاہب کی توجہ کا مرکز ہیں اور مختلف قوموں میں دشمنیوں اور نفرتوں کو کم کرنے میں مذاہب کی اس تعلیم نے گہرا اثر مرتب کیا ہے۔

رابعاً مذاہب آسمانی کا ایک پیغام محروم اور ستم رسیدہ طبقات کی آزادی تھا۔ اسی لیے انبیاء اور ان کے پیروکاروں نے جو جنگیں ستمگروں، ظالموں، فرعونوں اور نمرودوں سے لڑیں وہ دراصل انسانوں کی آزادی کے لیے جہاد کا مرتبہ رکھتی ہیں اور یہ مذاہب کے لیے کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں بلکہ ان کی قوت و طاقت کا نقطہ ہیں۔ ایک طرف مشرکین عرب اور مکہ کے سود خواروں اور دوسری طرف کسریٰ و قیصر سے پیغمبر اکرم کی جنگ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

۲۵۴- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○

ترجمہ

۲۵۴۔ اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکتی ہے (کہ تم اپنے لیے سعادت اور سزا سے

نجات خرید سکو) اور نہ دوستی (اور عام رفاقتیں وہاں سود بخش ہوں گی) اور نہ ہی شفاعت (کیونکہ تم شفاعت کے لائق نہ ہو گے) اور کافر تو ظالم ہیں (وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور معاشرے پر بھی)

تفسیر گذشتہ آیات میں پہلی اُمتوں کی سرنوشت، جہاد اور حکومت کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا بیان ہے نیز حکومت اور معاشرے کے لیے دفاعی بنیادوں کی تقویت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اے صاحب ایمان لوگو! ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں انفاق سے مراد انفاقِ واجب یعنی زکوٰۃ ہو کیونکہ اس کے بعد اس سے منہ موڑنے والوں کو روزِ قیامت سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انفاقِ واجب ہی دراصل بیت المال اور حکومت کی بنیاد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ضمنی طور پر مِمَّا سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق واجب ہمیشہ مال کے ایک حصے پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ سارے مال پر۔

"من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ"

آج جب کہ تم میں توانائی ہے انفاق کرو اور خرچ کرو چونکہ دوسرا جہان تو یہاں بوئے گئے کے کاٹنے کی جگہ ہے۔ وہاں معاملہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا وہاں خرید و فروخت کا معاملہ انجام نہ دے سکو گے کہ جس کے ذریعے اپنے لیے سعادت و نجات خرید سکو اور نہ اس جہان میں سرمائے کے ذریعے مادی دوستیاں حاصل کی جاسکتی ہیں کہ جو وہاں فائدہ بخش ہو سکیں اور شفاعت بھی تمہارے لیے سودمند نہ ہوگی کیونکہ تم واجب ادائیگیوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوتے اس لیے تم پر نجات کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

"والکافرون ھم الظالمون"۔

اس جملے میں قرآن یہ حقائق واضح کرنا چاہتا ہے:

۱۔ کافر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ انفاق اور واجب مخارج نیز دیگر دینی اور انسانی فرائض ترک کرکے خود کو عظیم ترین سعادتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال اُس جہان میں ان کے دامنگیر ہوں گے اور یہ خدا کی طرف سے کوئی ظلم نہ ہوگا۔

۲۔ کافر اپنے معاشرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اصولی طور پر کفر ہی قساوت، سنگدلی، مادہ پرستی اور دنیاداری کا منبع ہے۔ یہی چیزیں ظلم و ستم کے اصلی سرچشمے ہیں۔

یہاں اس نکتے کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ کفر کا لفظ اس آیت میں حکم انفاق کے بعد آیا ہے۔ لہٰذا یہاں یہ لفظ روگردانی، گناہ اور حکم خدا کی خلاف ورزی کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

۲۵۵۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ

يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ

۲۵۵۔ اُس خدائے یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ ہے اور اپنی ذات سے قائم ہے اور باقی موجودات اُس کے ساتھ قائم ہیں۔ اُسے کبھی اونگھ اور نیند نہیں آتی (اور لمحہ بھر کے لیے بھی وہ جہانِ ہستی کی تدبیر سے غافل نہیں ہوتا) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی طرف سے ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کرے (اس لیے شفاعت کے اہل لوگوں کے لیے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کے مالکِ مطلق ہونے میں کوئی کمی نہیں کر سکتی)۔ جو کچھ ان (بندوں) کے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اُسے وہ جانتا ہے (اور لوگوں کے گذشتہ اور آئندہ حالات یکساں طور پر اس کے علم میں ہیں) اور سوائے اس مقدار کے جسے وہ چاہے کوئی شخص اس کے علم سے واقف نہیں ہو سکتا (وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمام چیزوں سے آگاہ ہے اور دوسروں کا محدود علم و دانش اسی کے لامتناہی اور لامحدود علم کا پرتو ہے) اور اس کی (حکومت کی) کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور ان (آسمانوں اور زمین) کی نگہداری اس کے لیے گراں نہیں ہے اور بلندیٔ مقام اور عظمت اسی سے مخصوص ہے۔

تفسیر

"اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم ....."

یعنی وہ ذات جو یگانہ اور تنہا ہے اور تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے وہی عالمِ ہستی کو پیدا کرنے والی ہے۔ لہٰذا عالمِ وجود میں کوئی اس کے علاوہ پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ اس ارشاد میں قرآن خالقِ عالم کی وحدت و یگانگی کو جو اسلام کی بنیاد ہے بیان کرتا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے لفظ "اللّٰہ" میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اس حقیقت کی تاکید ہے۔

"حیّ" کا معنی ہے زندہ اور یہ لفظ ہر صفتِ مشبہ کی طرح دوام و ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کی حیات

حقیقی ہے کیونکہ اس کی حیات عین ذات ہے نہ کہ عارضی یا کسی دوسرے سے لی ہوئی ۔ سورہ فرقان آیہ ۵۸ میں ہے۔

"وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ"

یعنی اس زندہ ذات پر بھروسہ کرو جسے کبھی موت نہ آئے گی

ایک یہ پہلو ہے اور دوسرا یہ ہے کہ حیات کامل وہ زندگی ہے جس میں موت کا تصور نہ ہو ۔اس لیے حقیقی حیات اسی کی ہے جو ازل تا ابد قائم و دائم ہے ۔ رہی انسان کی زندگی خصوصاً اس جہان میں جہاں موت بھی ہے، یہ حقیقی حیات نہیں ہو سکتی اسی لیے سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہماری نظر سے یہ عبارت گزرتی ہے۔

"وما هذه الحيوة الدنيا الا لهو ولعب وان الدار الاخرة لهي الحيوان"

اس جہان کی زندگی لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں (ایک لحاظ سے) حقیقی زندگی تو دار آخرت کی زندگی ہے۔

ان دو وجوہ کی بناء پر حقیقی زندگی خدا ہی کیلئے مخصوص ہے ۔

خدا کے زندہ ہونے کا مفہوم

عام طور پر موجود زندہ اس چیز کو کہتے ہیں جو نمو، تغذیہ، تولید مثل، جذب و دفع اور کبھی حس و حرکت رکھتی ہو لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ ممکن ہے کوتاہ نظر افراد خدا کے بارے میں بھی ایسی ہی حیات سمجھتے ہوں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ میں ایسی کوئی صفت موجود نہیں ۔یہی قیاس انسان کو خدا شناسی کے بارے میں اشتباہ میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ وہ خدا کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنے لگتا ہے ۔حیات اپنے وسیع اور واقعی معنی کے لحاظ سے علم و قدرت سے عبارت ہے لہذا جو وجود لامتناہی علم و قدرت کا حامل ہے، وہ حیات کامل رکھتا ہے ۔خدا کی حیات اس کے علم و قدرت کا مجموعہ ہے اور درحقیقت علم و قدرت ہی کے ذریعے موجود زندہ اور غیر زندہ میں امتیاز کیا جا سکتا ہے ۔ رہا نمو، حرکت، تغذیہ اور تولید مثل تو یہ ناقص اور محدود موجودات کے آثار ہیں اور یہ آثار نقائص پر دلالت کرتے ہیں ۔کیونکہ غذا، تولید مثل اور حرکت دراصل کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے ۔لیکن وہ ذات کہ جس میں کوئی نقص اور کمی نہیں اس میں یہ امور نہیں پائے جاتے ۔

کیا خالق کا بھی کوئی خالق ہے؟

مادہ پرستوں کا مشہور اعتراض ہے کہ سب چیزوں کو تو خدا نے پیدا کیا ہے تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ ہر

موجود ایک پیدا کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ مسئلہ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے کیونکہ وہ موجودات جو پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں وہ ایسے ہیں کہ جن کے وجود کا سرچشمہ ان کی ذات سے خارج ہو۔ اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جن کی حیات اور وجود ان کی ذات کا جزء نہیں یعنی جو ممکن الوجود ہیں لیکن وہ وجود جس کی ہستی اُس کی ذات سے ہے یا بہتر الفاظ میں جس کی ہستی اُس کا عین وجود ہے ایسی ذات کو پیدا کرنے والے کی کوئی احتیاج نہیں، اسے کوئی حیات دینے والا نہیں، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور اس کی ذات کے لیے موت کا کوئی تصور ہی نہیں کہ کہا جاسکتا کہ وہ پیدا کرنے والے کی محتاج ہے۔ گویا وہ واجب الوجود ہے۔

آسان تر عبارات میں کہا جاسکتا ہے کہ جو حقیقت بھی اس جہان میں وجود رکھتی ہے آخرکار اُس کا کوئی سرچشمہ اور منبع ہے۔ مثلاً اگر سوال کیا جائے کہ یہ کرہ کیوں روشن ہے، ہم جواب دیں گے کہ نور نے اُسے روشن کیا ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ نور کیوں روشن ہے تو ہم کہیں گے کہ نور کے لیے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیوں روشن ہے کیونکہ یہ تو اس کی ذاتی خاصیت ہے۔

یہی بات موجوداتِ عالم کی ہستی کے بارے میں بعینہٖ ثابت ہے۔ انسان، ذرہ زار اور تمام جہانِ خلقت وجود میں آئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ان سب کو خدا نے پیدا کیا ہے اور ان کی حیات خدا کی طرف سے ہے لیکن اگر یہ سوال ہو کہ خدا نے کس طرح وجود پایا ہے تو ہم کہیں گے کہ ہستی اس کا عین ذات ہے اور وہ جہانِ ہستی کا سرچشمہ ہے۔[1]

القیوم

"قیوم" مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ "قیام" ہے۔ اسی بناء پر اس کا معنی ہے "وہ وجود جس کا قیام اپنی ذات کے ساتھ ہے اور تمام موجودات کا قیام اس کے ساتھ ہے۔" دوسرے لفظوں میں عالم ہستی کے تمام موجودات اُسی کے بھروسے اور سہارے پر قائم ہیں۔

واضح ہے کہ قیام کا معنی ہے کھڑا ہونا۔ روز مرہ میں یہ لفظ اسی مخصوص ہیئت و کیفیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کا خدا کے لیے کوئی مفہوم نہیں کیونکہ وہ جسم اور صفاتِ جسمانی سے منزہ ہے اس لیے اس سے مراد تخلیق، تدبیر اور نگہداری کے لیے قیام کرنا ہے۔ صرف وہی ذات ہے جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے اور اسی نے ان کی نگہداری و تربیت اپنے ذمے رکھی ہے۔ وہ کبھی اس کام کی انجام دہی میں غفلت نہیں کرتا اور وہ ہمیشہ سے بغیر کسی وقفے کے ان امور کو انجام دینے کے لیے قیام کیے ہوئے ہے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ "قیوم" حقیقت میں تمام صفاتِ فعل کی بنیاد ہے۔ صفاتِ فعل سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی موجود سے خدا کے ارتباط کو بیان کرتی ہیں، مثلاً پیدا کرنے والا، روزی دینے والا، زندہ کرنے والا، ہدایت کرنے والا وغیرہ۔

موجوداتِ عالم کی خلقت و تدبیر کے لیے قیام کرنے میں یہ تمام امور شامل ہیں۔ وہی ہے جو روزی دیتا ہے وہی

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "جستجوئے خدا" کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہے جو زندہ کرتا ہے، وہی ہے جو مارتا ہے، وہی ہے جو ہدایت کرتا ہے۔ اس لیے خالق، رازق اور محی وغیرہ صفات سب قیوم میں جمع ہیں۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

"سنۃ" مخصوص سستی ہے جو نیند کی ابتدا میں عارض ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونگھ یا نیند کے جھونکے کو سنۃ کہتے ہیں۔

"نوم" کا معنی ہے نیند یعنی وہ حالت جب انسان کے کچھ حواس طبیعی عوامل کے ذریعے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

"لا تاخذہ سنۃ و لا نوم" دراصل خدا کے قیوم ہونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ عالم ہستی کے لیے کامل و مطلق قیام کا تقاضا ہے کہ ایک لمحہ بھر کی غفلت نہ ہو یعنی حکومت مطلقہ اور عالم ہستی کے امور کی تدبیر کے لیے خدا تعالیٰ لمحے بھر کی غفلت نہیں کرتا لہٰذا ہر وہ چیز جو خدا کی اصل "قیومیت" کے ساتھ سازگار اور مناسب نہیں اس کی خود بخود اللہ کی بارگاہ مقدس سے نفی ہو جاتی ہے۔

یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ "اونگھ" کا ذکر آیت میں "نیند" سے پہلے کیوں ہے جب کہ قوی چیز کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا پھر ضعیف کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ فطری ترتیب ہے۔ پہلے اونگھ کی حالت پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد گہری نیند کا مرحلہ آتا ہے۔

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا فیض اور لطف دائمی ہے اور یہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے وجود سے منقطع نہیں ہوتا۔ وہ بندوں کی طرح نہیں ہے کہ نیند یا دیگر عوامل کے زیر اثر دوسروں سے غافل ہو جائے۔

"لا تاخذہ" (یعنی اسے نہیں پکڑ سکتی) یہ بھی ایک جاذب نظر اور موثر تعبیر ہے اس سے انسان پر نیند کے تسلط کی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے گویا نیند ایک طاقت ور پنجے کی مانند ہے جو انسان کو مضبوطی سے جکڑ لیتا ہے اور اسیر کر لیتا ہے۔ بیداری کے برعکس نیند کے عالم میں قوی ترین انسانوں کی جو حالت ہوتی ہے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔

خدا کی مالکیتِ مطلقہ

"لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض"

آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے اسکی مالکیت کے بغیر امور عالم کی تدبیر کے لیے قیام ممکن نہیں۔ اس لیے خدا کی قیومیت کا ذکر کرنے کے بعد اس حقیقت کی تصریح کی گئی ہے کہ تمام عالم اس کا ملک خاص ہے، عالم ہستی میں جو بھی تصرف ہو اسی کی طرف سے ہے۔

اس بناء پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے اور جن چیزوں سے وہ استفادہ کرتا ہے وہ اس کی حقیقی ملکیت نہیں ہیں۔ انسان ان چیزوں سے مالک حقیقی کی معین کردہ شرائط کے تحت ایک محدود مدت کے لیے حق تصرف رکھتا ہے۔ اس

وجہ سے عام مالک کی ذمہ داری ہے کہ مالک حقیقی کی طرف سے جو شرائط معین ہوئی ہیں ان کا پورا لحاظ رکھے اگر ایسا نہ کرے تو اس کی ملکیت باطل ہو جاتی ہے اور تصرف جائز نہیں رہتا۔ ملک خدا میں تصرفات کی شرائط وہی ہیں جو قوانین اسلامی کے ذریعے لوگوں تک پہنچی ہیں۔

بلکہ یہ واضح ہے کہ اس مفہوم کی طرف توجہ کرنا حقیقت میں ایک اہم تربیتی عامل ہے یوں کہ انسان میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دراصل اس کا نہیں ہے بلکہ چند روز کے لیے اسے عاریتاً ملا ہے تو یقیناً یہ عقیدہ اسے دوسروں کے حقوق میں تجاوز، استثمار، ذخیرہ اندوزی، حرص، طمع اور بخل سے باز رکھے گا کیونکہ ممکن ہے شدید دنیا پرستی کی وجہ سے یہ چیزیں انسان میں پیدا ہو جائیں۔ یہ عقیدہ انسان کی یہ تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنے شرعی حقوق پر راضی رہے۔

"من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ":

اصطلاحی طور پر یہ جملہ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی شخص بھی خدا کے حکم کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت و سفارش نہیں کر سکتا۔ یہ جملہ درحقیقت تمام موجودات عالم ہستی پر خدا کی قیومیت اور مالکیت مطلقہ کے مفہوم کی تکمیل کرتا ہے یعنی اگر کچھ لوگ بارگاہ الٰہی میں شفاعت کرتے نظر آتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ کسی چیز کے مالک ہیں اور وہ تاثیر میں استقلال رکھتے ہیں بلکہ یہ مقام شفاعت بھی انہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ ان کی شفاعت چونکہ حکم خدا سے ہے اس لیے یہ خود خدا کی قیومیت اور مالکیت پر ایک دلیل ہے۔

شفاعت کوئی پارٹی بازی نہیں ہے

"شفاعت" کا مفہوم ہے ایک قوی موجود کا ضعیف تر موجود کی مدد کرنا تاکہ وہ آسانی سے تکامل و ارتقا کے مراحل طے کر سکے۔ البتہ عموماً یہ لفظ گنہگاروں کی شفاعت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے لیکن شفاعت کے وسیع تر معنی میں عالم ہستی کے تمام عوامل اور علل و اسباب شامل ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی چار عامل ہیں جو دانے کو ایک مکمل درخت یا مکمل سبزے کے مرحلے تک پہنچانے میں شفاعت اور ہدایت کرتے ہیں۔ اب اگر مذکورہ آیت کو اس وسیع معنی میں دیکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ عالم ہستی کے مختلف عوامل و اسباب کا وجود خدا کی مالکیت مطلقہ کو ہرگز محدود نہیں کرتا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرتا کیونکہ ان تمام اسباب کی تاثیر اس کے حکم سے ہے اور دراصل اس کی قیومیت اور مالکیت کی نشانی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں شفاعت بھی بلاوجہ کسی کی سفارش کرنے کی طرح ہے اور ایک طرح کی پارٹی بازی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم یوں ہے کہ لوگ جو چاہیں گناہ کریں اور جب سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جائیں تو شفیع کا دامن پکڑ لیں اور اس طرح کہتے پھریں!

ع ان دم کہ مردماں بہ شفیعی زنند دست
ماییم و دست و دامن اولاد فاطمہؑ

یعنی جب دوسرے لوگ کسی شفیع کا دامن تھامیں گے تو ہم اولادِ طہٰ
کا ہاتھ اور دامن تھام لیں گے۔

اعتراض کرنے والوں نے شفاعت کے بارے میں دین کی منطق کو نہیں سمجھا اور نہ ہی اس گنہگار، جسور اور بے پروا گروہ نے اسے سمجھا ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شفاعت جو خدا کے خاص بندے کریں گے شفاعت تکوینی کی طرح ہے جو طبیعی عوامل کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ جیسے ایک دانے میں اگر عامل حیات اور زندگی کے سیل LIFE CELLS موجود نہ ہوں تو ہزاروں سال تک سورج کی تپش، بادِ نسیم اور بارش کے حیات بخش قطرے اسے نشو و نما اور رشد نہیں دے سکتے، اس طرح اولیاء خدا کی شفاعت بھی نالائق افراد کے لیے بے اثر ہے یعنی اصولی طور پر وہ ایسے افراد کی شفاعت نہیں کریں گے۔

شفاعت ایک طرح کے معنوی رابطہ کی محتاج ہے۔ یہ رابطہ شفاعت کرنے والے اور جس کی شفاعت ہو رہی ہے اس کے درمیان درکار ہے۔ اس لیے جو شفاعت کی امید رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس جہاں میں اس شخص سے معنوی رابطہ پیدا کرے جس سے وہ شفاعت کی توقع رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ رابطہ ہی شفاعت حاصل کرنے والے کے لیے تربیت کا ایک ذریعہ ہوگا۔ یہ تعلق اسے شفاعت کرنے والے کے افکار، اعمال اور مکتب کے قریب کرے گا اور اس کے نتیجے میں وہ شفاعت کے اہل ہو جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ شفاعت ایک عامل تربیت ہے نہ کہ پارٹی بازی یا فرائض سے فرار کا ذریعہ۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ شفاعت گنہگار کے بارے میں پروردگار کے ارادے میں تغیر و تبدل پیدا نہیں کرتی بلکہ گنہگار ہی شفاعت کرنے والے سے معنوی رابطہ کے ذریعے ایک تکامل و تربیت حاصل کرتا ہے اور ایسی سرحد میں جا پہنچتا ہے جہاں وہ عفوِ خدا کے اہل ہو جاتا ہے (غور کیجئے گا) [1]

"یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم"

گذشتہ جملے میں بیان کیا گیا ہے کہ شفاعت بارگاہ الٰہی میں حکم خدا ہی سے ممکن ہے زیرِ نظر جملے میں اس کی دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے کہ خدا شفاعت کرنے والوں کے گذشتہ اور آئندہ حالات سے آگاہ ہے اور جو کچھ ان سے پنہاں ہے اُسے جانتا ہے اس لیے وہ خدا کے سامنے جن کی شفاعت کر رہے ہیں ان کے بارے میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کر سکتے جس سے خدا ناواقف ہو اور جس کی وجہ سے وہ ان کے سلسلے میں اپنے حکم میں نظر ثانی کرے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سفارش کا عام اسلوب یہ ہے کہ سفارش کرنے والا جس کی سفارش کر رہا ہے اس کی اہلیت و لیاقت کا ذکر کرتا ہے یا پھر جس کی سفارش کر رہا ہے اس سے اپنا ارتباط بیان کرتا ہے تاکہ جس سے سفارش کی جا رہی ہے وہ سفارش کرنے والے کی خاطر اپنے حکم میں تبدیلی کرے۔ واضح ہے کہ دونوں صورتوں میں سفارش کرنے والا در اصل نئی معلومات فراہم کر رہا ہوتا ہے لیکن جس سے سفارش کی جا رہی ہے اگر وہ ہر چیز اور ہر شخص کے بارے میں پہلے ہی پوری طرح سے آگاہ ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس کی بارگاہ میں کسی کی سفارش نہیں کر سکتا کیونکہ وہی شفاعت کے لیے اہل لوگوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور وہی شفاعت

[1] تفسیر نمونہ جلد اول (اردو ترجمہ) کے صفحہ ۱۸۳ سے ۲۰۰ تک مسئلہ شفاعت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔

کی اجازت دینے والا ہے۔

"یعلم مابین ایدیھم و ما خلفھم" پروردگار کی قدرت کاملہ اور اس کے غلبے میں دوسروں کا قدرت سے تہی ہونے پر تاکید بھی ہے کیونکہ جو اپنے گذشتہ اور آئندہ سے بے خبر ہے اور آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم نہیں رکھتا اُس کی قدرت بہت ہی محدود ہوگی لیکن وہ ذات جو ہر دور میں ہر چیز سے آگاہ ہے اس کی قدرت ہر لحاظ سے لامتناہی ہے اس لیے ہر اقدام یہاں تک کہ شفاعت بھی اس کے فرمان کے تابع ہے۔

اس جملے کا ربط آیت کے گذشتہ جملوں اور مسئلہ شفاعت سے واضح ہے۔ اب یہ سوال باقی ہے کہ "مابین ایدیھم" (ان کے سامنے) "و ما خلفھم" (اور اُن کے پیچھے) سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں تعبیریں قرآن مجید میں کبھی مکان کے بارے میں اور کبھی زمان کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ آل عمران آیہ ۱۷۰ میں ہے۔

"و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم"

شہیدان راہ خدا انہیں بشارت دیتے ہیں جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے۔

واضح ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر زمانی ہے۔ لیکن سورہ اعراف آیہ ۱۷ میں ہے۔

"ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم و من خلفھم و عن ایمانھم و عن شمائلھم"

میں اُن کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے، ان کی دائیں طرف سے اور اُن کی بائیں طرف سے آؤں گا۔

یہ سامنے اور پیچھے مکان کے لحاظ سے ہے۔ البتہ محل بحث آیت میں ہو سکتا ہے جامع معنی ہو جس میں زمان و مکان دونوں شامل ہوں۔ یعنی خداوند عالم گذشتہ اور آئندہ سے اسی طرح لوگوں کے سامنے اور پس پشت جو کچھ ہے اگرچہ لوگوں سے پوشیدہ و پنہاں ہے۔ سب کچھ جانتا ہے اور سب سے آگاہ ہے۔ اس کی بارگاہ علم میں زمان و مکان کی وسعت اور پہنائی واضح ہے اور شفاعت کرنے والے اُس کے سامنے کوئی نئی اطلاع پیش نہیں کر سکتے۔

"و لا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شاء":

یہ جملہ بھی درحقیقت سابقہ جملے کی تاکید کے طور پر ہے اور علم خدا کے مقابلے میں شفاعت کرنے والوں کے محدود علم کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار کے علم پر احاطہ نہیں رکھتے اور خدا جس قدر چاہے وہ اتنا ہی باخبر ہوتے ہیں۔

اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی طرف سے کوئی علم نہیں رکھتا اور انسان کے تمام علوم

خدا کی طرف سے ہیں۔ وہی ہے جو رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجاً جہانِ آفرینش کے حیرت انگیز اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور نئے حقائق انسان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اس کی معلومات میں وسعت پیدا کرتا ہے

اس جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے خدا بعض علوم غیب بعض منتخب لوگوں کو دے دے اور کچھ لوگوں کو اسرارِ غیب سے آگاہ کر دے۔ اس بناء پر یہ بات ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ علم غیب تو انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ ان آیات کی بھی تفسیر ہے جو لبشر کے لیے علم غیب کی نفی کرتی ہیں یعنی انسان ذاتی طور پر اسرارِ غیب میں سے کسی چیز کو نہیں جانتا مگر یہ کہ خدا علم دے اور جس قدر دے وہ اس قدر جان لیتا ہے (مزید وضاحت انشاء اللہ غیب سے مربوط آیات کے ذیل میں آئے گی۔

عرش و کرسی سے کیا مراد ہے؟

"وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض"

لفظ کرسی اصل لغت کے لحاظ سے "کرس" (بروزن ارث) سے ہے جس کا معنی ہے اصل، اساس اور بنیاد۔ بعض اوقات ہر اس چیز کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ اور ترکیب شدہ ہو اسی بناء پر چھوٹے تخت کو کرسی کہتے ہیں۔ اس کا لفظ مقابل "عرش" ہے جس کا معنی ہے "چھت والی چیز" یا "چھت" یا "بلند پایہ تخت"۔

چونکہ استاد اور معلم، تدریس وتعلیم کے وقت کرسی پر بیٹھتا ہے لہٰذا بعض اوقات لفظ کرسی "علم" کے لیے کنایہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کرسی چونکہ انسان کے اختیار اور کنٹرول میں ہوتی ہے اس لیے کبھی کبھار یہ لفظ حکومت وقدرت اور فرمانروائی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں لفظ "کرسی" کے چند معانی ممکن ہیں:

۱۔ قلمرو اور حکومت کا علاقہ: یعنی خدا تمام آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتا ہے اور اس کا نفوذ تمام مجموعہ پر محیط ہے۔ اس معنی میں خدا کی کرسی سے مراد عالم مادہ کا مجموعہ ہے چاہے وہ زمین ہو یا ستارے، کہکشائیں ہوں یا بادل۔

یہ فطری امر ہے کہ کرسی کا یہ مفہوم ہو تو عرش اس جہان مادہ سے کسی بالاتر اور عالی تر مرحلے کا نام ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ عرش کا معنی کرسی کے برعکس لغت میں چھت، سائبان اور بلند پایہ تخت ہے۔ اس صورت میں عرش کا معنی عالم ارواح، ملائکہ اور جہان ماوراء طبیعت ہوگا۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عرش و کرسی ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تاکہ ایک عالم مادہ وطبیعت اور دوسرا عالم ماوراء طبیعت کہلائے لیکن جیسا کہ سورہ

اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں آئے گا کہ عرش کے کچھ اور معانی بھی ہیں خصوصاً اگر وہ کرسی کے مقابلے میں نہ ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کا معنی تمام عالم ہستی ہو۔

۲۔ وسعت علم کا علاقہ: یعنی خدا کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور کوئی چیز بھی اس کی حکومت علم سے باہر نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کرسی بعض اوقات علم کے لیے کنایہ ہوتی ہے۔ کئی ایک روایات میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ حفص بن غیاث امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے آنحضرتؑ سے پوچھا کہ

"وسع کرسیه السمٰوٰت والارض" سے کیا مراد ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد اس کا علم ہے[1]

۳۔ آسمانوں اور زمین سے وسیع تر چیز: یعنی ایک ایسا موجود جو آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جو ہر طرف سے ان پر محیط ہے۔ اس طرح آیت کا معنی ہوگا کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اٹھائے ہوئے ہے اور ان پر محیط ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے یہی تفسیر منقول ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"الکرسی محیط بالسمٰوٰت والارض وما بینهما وما تحت الثری":

یعنی۔ کرسی زمین و آسمان جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ زمین کی گہرائیوں میں ہے سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہاں تک کہ کچھ روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ کرسی آسمانوں اور زمین سے اس قدر وسیع تر ہے کہ وہ سب کے سب کرسی کے مقابلے میں اس انگوٹھی کی طرح ہیں جو وسط بیابان میں پڑی ہو۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

"ما السمٰوٰت والارض عند الکرسی الا کحلقة خاتم فی فلاة وما الکرسی عند العرش الا کحلقة فی فلاة":

آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہیں اور کرسی بھی عرش کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہے۔

پہلا اور دوسرا معنی تو قابل فہم اور واضح ہے لیکن تیسرا معنی ایسا ہے کہ ابھی تک علم و دانش بشر اس سے پردہ نہیں اٹھا سکے کیونکہ ایسے عالم کا وجود جو آسمانوں اور زمین پر بھی محیط ہو اور ہمارے جہان سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہو ابھی تک مروج علمی ذرائع سے ثابت نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اس کی نفی پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں۔ جدید علوم کے تمام ماہرین معترف ہیں کہ

---

[1] نور الثقلین ج: اول۔

علوم و مطالعاتِ نجوم کے وسائل اور ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ آسمان و زمین کی وسعت ہماری نظر میں بڑھتی جارہی ہے اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ عالمِ ہستی کی وسعت بس اتنی ہے جتنی آج کے علم نے بتائی ہے بلکہ قوی احتمال ہے کہ بے شمار عالم ایسے ہوں جو آج کے وسائل اور ذرائع کی نگاہ سے اوجھل ہوں۔

یہ بات کہے بغیر نہ رہ جائے کہ مندرجہ بالا تینوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں اور "وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض" ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی

— پروردگار کی حکومت مطلقہ اور قدرت کا نفاذ،

— علمی نفوذ و احاطہ اور

— ایسا وسیع تر جہان جو آسمانوں اور زمین پر محیط ہو۔

بہر صورت یہ جملہ آیت کے پہلے جملوں کی تکمیل کرتا ہے جو پروردگار کے علم کی وسعت کے بارے میں تھے۔

خلاصہ اور نتیجہ یہ کہ پروردگار کا تختِ حکومت و قدرت تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے علم و دانش کی کرسی تمام عالمین پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کی حکومت اور علم سے خارج نہیں۔

"ولا یؤدہ حفظھما":

"یؤدہ" "اود" (بروزن قول) سے ہے۔ اس کا معنی ہے "سنگینی" یعنی آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور نگرانی خدا تعالیٰ کے لیے کسی قسم کی سنگینی، بوجھ اور مشقت کا باعث نہیں کیونکہ وہ اپنی مخلوق اور بندوں کی طرح نہیں کہ جن کی قدرت محدود ہے۔ کیونکہ بندے تو بعض اوقات کسی چیز کی حفاظت سے تھک کر عاجز آ جاتے ہیں جب کہ اس کی قدرت لامحدود ہے اور لامحدود قدرت کے لیے اصولی طور پر سنگینی و آسانی، مشقت و راحت کا کوئی مفہوم نہیں۔ یہ سب مفاہیم تو محدود قوتوں پر صادق آتے ہیں۔

اوپر ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ "یؤدہ" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے آیت کے سابقہ والے حقہ جملے بھی اسی کے شاہد ہیں کیونکہ ان کی ضمیریں بھی سب خدا کی طرف لوٹتی ہیں۔ اس بناء پر یہ احتمال بہت ضعیف دکھائی دیتا ہے جس کے مطابق یہ ضمیر کرسی کی طرف لوٹتی ہے اور جس کے مطابق معنی یہ ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حفاظت کرسی کے لیے سنگین اور بوجھل نہیں۔

"وھو العلی العظیم":

یہ جملہ دراصل سابقہ جملوں کی دلیل کے طور پر ہے یعنی وہ خدا جو برتر اور بالاتر ہے۔ ہر طرح کے شبیہ اور شریک سے پاک ہے اور ہر قسم کی کمی، عیب اور نقص سے ماورا ہے۔ وہ خدا جو عظیم، بزرگ اور لامتناہی ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے اور وہ کسی وقت بھی جہانِ ہستی کو منظم کرنے اور اس کی تدبیر کرنے سے خستہ، عاجز، غافل اور بے خبر نہیں ہو سکتا اور اُس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔

۲۵۶- لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ
يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۵۶- دین قبول کرنے میں کوئی جبرواکراہ نہیں ہے (کیونکہ) صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جُدا اور آشکار ہو چکا ہے اس بناء پر جو کوئی طاغوت (بت، شیطان اور ہر سرکش) سے منہ موڑ کر خدا پر ایمان لے آئے تو اس نے محکم کڑے کو تھاما ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی شانِ نزول یہ نقل کی ہے کہ مدینے میں ایک شخص حصین نامی تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ مدینہ میں مال تجارت لانے والے دو تاجروں نے ان لڑکوں سے ملاقات کی تو انہیں عیسائیت کی دعوت دی اور وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور نتیجتاً عیسائی ہو گئے۔

حصین اس واقعے سے بہت پریشان ہوا اور پیغمبر اسلامؐ کو اس کی اطلاع دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انہیں واپس اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہوں اس نے سوال کیا کہ وہ جبری طور پر انہیں اپنے مذہب میں واپس لا سکتا ہے تو اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مذہب کو اختیار کرنے میں کوئی جبرواکراہ نہیں ہے۔

تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ حصین نے اپنے دونوں بیٹوں کو جبراً اسلام کی طرف پلٹانے کی کوشش کی تو وہ شکایت لے کر پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے۔ حصین نے عرض کیا کہ میں کیسے برداشت کر لوں کہ میرے بیٹے جہنم کی آگ میں جلیں اور میں دیکھتا رہوں۔ اس پر محل بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

"رُشد" لغت میں راستہ پانے اور واقع تک پہنچنے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس "غی" حقیقت سے انحراف کرنے اور واقع سے دور ہونے کے معنی میں ہے۔ دین و مذہب کا تعلق چونکہ لوگوں کی فکر اور روح سے ہے اور اس کی اساس و بنیاد ایمان و یقین پر استوار ہے لہٰذا منطق و استدلال کے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں۔

جیسا کہ آیت کی شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے بعض افراد پیغمبر اکرمؐ سے چاہتے تھے کہ آپؐ بھی جابر حکمرانوں کی طرح طاقت اور زور سے لوگوں کے عقائد تبدیل کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ مندرجہ بالا آیت نے اس پر صراحت

سے جواب دیا کہ دین و آئین ایسی چیز نہیں کہ جس کی جبری تبلیغ کی جائے۔

یہ آیت ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو اسلام کو زبردستی اور جبری پہلو کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی ترقی فوج اور تلوار کی مرہون منت ہے۔

جب اسلام باپ کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے بیٹے کو مذہبی عقیدہ زبردستی بدلنے پر مجبور کرے تو دوسروں کی ذمہ داری اس سے واضح ہو جاتی ہے۔ اگر عقیدہ بدلنے کے لیے جبر ممکن اور جائز ہوتا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے باپ کو بیٹے کے بارے میں اجازت دی جاتی جبکہ اُسے یہ حق نہیں دیا گیا۔

مذہب جبری نہیں ہو سکتا

اصولی طور پر اسلام یا کوئی مذہب حق دو وجوہ کی بناء پر جبر و اکراہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ ان تمام واضح دلائل، منطقی استدلالات اور آشکار معجزات کے ہوتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہی نہیں کہ جبر و اکراہ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ جبر و اکراہ تو وہ اختیار کرتے ہیں جو منطق سے عاری ہوتے ہیں نہ کہ اسلام جیسا دین جو واضح اور قوی استدلالات کا حامل ہے۔

۲۔ اصولی طور پر دین جس کی بنیاد قلبی اعتقادات کا ایک سلسلہ ہے ممکن ہی نہیں کہ جبری ہو۔ زور، طاقت، تلوار اور فوجی قوت ہمارے جسمانی اعمال و حرکات پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے افکار و عقائد کو نہیں بدل سکتے۔

جو کچھ کہا گیا ہے عیسائی زہریلی تبلیغ کا واضح جواب ہے کیونکہ قرآن کے ان الفاظ "لا اکراہ فی الدین" سے بڑھ کر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ یہ لوگ اسلامی جنگوں کو غلط رنگ دینے کے درپے رہتے ہیں جب کہ ان اسلامی جنگوں کے مطالعے سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض تو دفاعی تھیں اور بعض ابتدائی جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں کشور کشائی اور لوگوں کو دین اسلام کے لیے مجبور کرنے کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ان کا مقصد غلط اور ظالمانہ نظام کو تہ و بالا کرنا تھا تاکہ لوگوں کو آزادانہ طور پر مذہب اور اجتماعی زندگی کے مطالعے کا موقع فراہم کیا جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب کسی شہر کو فتح کرتے تو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو مسلمانوں کی طرح آزادی دیتے تھے اور جزیہ کے طور پر جو ٹیکس ان سے وصول کیا جاتا وہ دراصل امن و امان برقرار رکھنے اور امن و امان برقرار رکھنے والی قوتوں کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ہوتا تھا کیونکہ اسلام میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و ناموس محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مذہبی رسوم بھی آزادانہ بجالاتے تھے۔

وہ سب لوگ جو تاریخ اسلام سے واقف ہیں اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ عیسائی جنہوں نے اسلام کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً کتاب تمدنِ اسلام و عرب میں ہے:

> مسلمانوں کا دوسرے لوگوں سے سلوک اس قدر محبت بھرا اور نرم تھا کہ ان کے سرداروں نے انہیں اپنی مذہبی تقریبات تک منعقد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

کئی ایک تواریخ میں ہے کہ عیسائیوں کا ایک گروہ جو بعض سوالات اور تحقیقات کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا تھا اس نے اپنی مذہبی عبادت مدینہ کی مسجد نبوی میں آزادانہ انجام دی۔

اسلام میں فوجی طاقت کے استعمال کے مواقع

اصولی طور پر اسلام صرف تین مواقع پر فوجی طاقت کو ذریعہ قرار دیتا ہے:

۱۔ شرک اور بت پرستی کی بیخ کنی کے لیے: شرک اور بت پرستی کے آثار محو کرنے کے لیے اسلام فوجی طاقت استعمال میں لاتا ہے کیونکہ بت پرستی اسلام کی نظر میں کوئی دین و آئین نہیں ہے بلکہ گمروی، بیماری اور بے ہودہ چیز ہے اور اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جانا چاہیے کہ لوگ سو فیصد غلط اور بے ہودہ راستے پر چلتے رہیں بلکہ اس کی جڑ شکنی کی جانا چاہیے۔ لہذا اسلام نے بت پرستوں کو تبلیغ کے ذریعے راہ توحید کی طرف دعوت دی لیکن جہاں انہوں نے مقابلے کا راستہ اختیار کیا اسلام نے طاقت استعمال کی، ان کے بت خانے توڑ دیے گئے اور بت اور بت پرستی کے تمام آثار مٹا دیے گئے تاکہ اس روحانی اور فکری بیماری کی مکمل ریشہ کنی کی جا سکے۔

مشرکین سے قتال کرنے کی آیات اسی مفہوم کی حامل ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۳ میں ہے:

"وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة"

مشرکین سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ شرک کا فتنہ معاشرے سے ختم ہو جائے۔

اس بناء پر محل بحث اور اس قسم کی آیات میں کوئی تضاد نہیں کہ جس کی بنیاد پر نسخ کا ذکر ضروری ہو۔

۲۔ اسلام کے خلاف حملے کی تیاری کرنے والوں سے: جو لوگ مسلمانوں کی نابودی کے لیے ان پر حملے کی سازش کر رہے ہوں وہاں دفاعی جہاد اور فوجی قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کی اسلامی جنگیں شاید زیادہ اسی قسم کی تھیں۔ مثال کے طور پر احد، احزاب، حنین، موتہ اور تبوک کے غزوات کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ تبلیغ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے: ہر دین حق رکھتا ہے کہ منطقی طریقوں سے اس کا آزادانہ تعارف کروایا جا سکے۔ اگر کچھ لوگ اس میں مانع ہوں اور رکاوٹ پیدا کریں تو یہ حق طاقت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى"

"طاغوت" صیغہ مبالغہ ہے۔ اس کا مادہ ہے "طغیان" اس کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا اور زیادتی کرنا۔ ہر وہ چیز جو حد سے تجاوز کا ذریعہ بنے اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔ اسی بناء پر شیطان، بت، جابر اور ظالم و متکبر حاکم کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پروردگار عالم کے علاوہ ہر معبود اور ہر راستہ جو غیر حق تک پہنچائے اسے پر

طاغوت کا اطلاق ہوتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے اس حصے میں قرآن کہتا ہے: جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اس سے منہ پھیرے اور خدا پر ایمان لے آئے اس نے گویا مضبوط کڑے پر ہاتھ ڈالا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

عروۃ الوثقیٰ اس آہنی کڑے کو کہتے ہیں جو دروازے کی پشت پر نصب کرتے ہیں اور دروازہ بند کرتے یا کھولتے وقت اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔

طاغوت سے یہاں کیا مراد ہے۔ اس بارے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں بعض نے بت کہا ہے، بعض نے شیطان مراد لیا ہے، بعض نے کاہنوں کو طاغوت قرار دیا ہے اور بعض نے جادوگر مراد لیے ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے یعنی ہر سرکش، ٹیڑھے اور غلط مذہب اور راستے کو یہ لفظ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

درحقیقت یہ حصہ آیت کے سابقہ حصوں کے لیے ایک دلیل ہے۔ دین و مذہب جبر و اکراہ کا محتاج نہیں کیونکہ دین خدا کی طرف دعوت دیتا ہے جو ہر خیر و برکت اور سعادت کا منبع ہے جبکہ دوسرے لوگ تباہی، انحراف اور فساد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ بہر حال خدا پر ایمان لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی محکم کڑے پر ہاتھ ڈالنا کہ جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہ ہو۔

"وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفر و ایمان کا مسئلہ ایسا نہیں جو دکھاوے سے حل ہو جائے کیونکہ خدا سب کی باتوں کو سنتا ہے چاہے وہ آشکار ہوں یا بند کمروں اور مخفی اجلاسوں میں۔ اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں اور لوگوں کے ضمیروں کی حالت سے آگاہ ہے۔

یہ جملہ دراصل حقیقی ایمان لانے والوں کے لیے تشویق اور منافقین کے لیے تہدید اور دھمکی ہے۔

۲۵۷۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۵۷۔ خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے ہیں۔ انہیں وہ تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے (لیکن) وہ لوگ جو کافر ہوگئے ہیں ان کے اولیاء اور سرپرست طاغوت (بت، شیطان اور ظالم و سرکش لوگ) ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں

کی طرف لے جاتے ہیں وہ اہل آتش (جہنم) ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

"ولی" کا معنی جیسا کہ بعد میں "انما ولیکم اللہ و رسولہ ......" والی آیت کے ذیل میں آئے گا اصل میں "نزدیکی اور عدم جدائی" ہے۔ اسی بنا پر سرپرست کو ولی کہتے ہیں اور جو شخص تربیت اور سرپرستی کا محتاج ہو اس کے مربی کو ولی کہا جاتا ہے۔ مخلص دوستوں اور رفقاء کے لیے بھی ولی اور اولیاء کا اطلاق ہوتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس آیت میں پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

گزشتہ آیات میں کفر و ایمان، حق و باطل اور راہ راست اور انحرافی راستے کی وضاحت کے بعد اب یہ آیت تکمیل مطلب کے لیے کہتی ہے: مومن و کافر ہر کسی کا رہبر و راہنما اور اپنا مخصوص راستہ ہے۔ مومنین کا رہبر و راہنما خدا ہے، ان کا راستہ تاریکیوں سے جدا ہو کر نور کی طرف جاتا ہے۔ لیکن کافروں کا رہبر طاغوت ہے اور ان کی راہ مومنین کے برعکس نور سے ظلمت کی طرف جاتی ہے اور ان کا انجام بھی واضح ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے (اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **نور و ظلمت کی تشبیہ:** ایمان اور کفر کو نور اور ظلمت سے تشبیہ دینا اس موقع کی مناسب ترین تشبیہ ہے۔ نور ـــــ زندگی اور تمام برکات و آثار حیات کا منبع ہے۔ نور ہی رشد، نمو، تکامل، تحرک اور جنبش کا سرچشمہ ہے اور نور ہی سکون بخش، مطمئن کرنے والا، آگاہ کرنے والا اور نشاندہی کرنے والا ہے جبکہ ظلمت و تاریکی سکوت، موت، خواب، نادانی، گمراہی اور وحشت کی رمز ہے۔

۲۔ **"نور" کے مقابل "ظلمات" کیوں:** اس آیت میں اور اس کے مشابہ آیات قرآن میں لفظ ظلمت کی جمع ظلمات استعمال کیا گیا ہے اور نور صیغہ مفرد کے طور پر آیا ہے۔ یہ دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ راہ حق میں کسی قسم کی کوئی پراگندگی اور انتشار نہیں بلکہ وہ الہام بخش وحدت و یگانگی ہے۔ راہ حق خط مستقیم کی طرح ہے جو دو نقطوں کے درمیان کھینچا جائے تو ہمیشہ ایک ہی ہوگا اور اس میں ایک سے زیادہ کی تعداد ممکن نہیں لیکن اہل باطل اپنے باطل میں ہم آہنگ نہیں رہیں۔ ان میں ہدف اور مقصد کی وحدت نہیں ہے ان کی حالت بالکل دو نقطوں کے درمیان کھینچے جانے والے غیر منظم خطوط کی سی ہے جن کی تعداد خط مستقیم کے دونوں طرف بے شمار ہے۔

۲۵۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ

قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ

ترجمہ

۲۵۸۔ کیا دیکھتے نہیں ہو (اور اُس سے آگاہ نہیں ہو) جس نے ابراہیم کے ساتھ اُس کے پروردگار کے بارے میں حجت بازی اور کلام کیا کیونکہ خدا نے اُسے حکومت دے رکھی تھی اور وہ کم ظرفی کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست ہو گیا تھا، جب ابراہیم نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

(اس کے بعد اُس نے مغالطہ پیدا کرنے کا حکم دیا اور دو قیدی حاضر کیے گئے، اُس نے ایک کی آزادی اور دوسرے کے قتل کا فرمان جاری کر دیا) ابراہیم نے کہا خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو کہ تمہی جہان ہستی پر حکمران ہو تو تم خورشید کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ (یہاں) وہ کافر مبہوت ہو گیا اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

گذشتہ آیت پروردگار کی ولایت اور راہنمائی کے ذریعے مومنین کی ہدایت اور طاغوت کی پیروی کے ذریعے کفار کی گمراہی کے بارے میں تھی۔ اس کے بعد زیر نظر آیت میں خدا ایک زندہ اور واضح شاہد کا ذکر کرتا ہے جو اس کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے متعلق رونما ہوا۔

ہوا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے کے ایک جابر سے بحث مباحثہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کئے وہ اپنی حکومت کی وجہ سے بادہ غرور سے سرمست تھا لہذا حضرت ابراہیمؑ سے پوچھنے لگا تیرا خدا کون ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا وہی جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ حقیقت میں آپ نے عظیم ترین شاہکار قدرت کو دلیل کے طور پیش کیا۔ مبداءِ جہان ہستی کے علم و قدرت کی واضح نشانی یہی قانون موت و حیات ہے لیکن اس نے مکر و تزویر کی راہ اختیار کی اور مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں کو اور اپنے حاشیوں کو غافل رکھنے کے لیے کہا وہ تو میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور موت و حیات کا قانون میرے ہاتھ میں ہے (اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ)۔

قرآن میں اس کے جملے کے بعد واضح نہیں ہے کہ اُس نے اپنے پیدا کیے گئے مغالطے کی تائید کے لیے کس طرح عملی اقدام کیا لیکن احادیث و تواریخ میں آیا ہے کہ اُس نے فوراً دو قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ قیدی لائے گئے تو اس نے

فرمان جاری کیا کہ ایک کو آزاد کر دو اور دوسرے کو قتل کر دو۔ پھر کہنے لگا: تم نے دیکھا کہ موت و حیات کس طرح میرے قبضے میں ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت و حیات سے متعلق دلیل ہر لحاظ سے قوی تھی لیکن دشمن سادہ لوح لوگوں کو جھل دے سکتا تھا لہذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا کہ خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے اگر جہان ہستی کی حکومت تیرے ہاتھ میں ہے تو تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہاں دشمن خاموش، مبہوت اور عاجز ہوگیا۔ اس میں سکت نہ رہی کہ اس زندہ منطق کے بارے میں کوئی بات کر سکے۔ ایسے ہٹ دھرم دشمنوں کو زچ کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے: یہ مسلم ہے کہ موت و حیات کا مسئلہ کئی جہات سے آسمان اور گردش شمس و قمر کی نسبت پروردگار عالم کے علم و قدرت پر زیادہ گواہی دیتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ نے پہلے وہی مسئلہ پیش کیا اور یہ فطری امر ہے کہ اگر صاحب فکر اور روشن ضمیر افراد اس مجلس میں ہوں گے تو وہ اسی دلیل سے مطمئن ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک قیدی کو آزاد کرنا اور دوسرے کو قتل کر دینا یہ طبیعی اور حقیقی موت و حیات سے بالکل ربط نہیں رکھتا لیکن جو لوگ کم عقل تھے اور اس دور کے ظالم حکام کے پیدا کردہ مغالطے سے متاثر ہو سکتے تھے ان کی فکر راہ حق سے منحرف ہو سکتی تھی لہذا آپ نے دوسرا استدلال پیش کیا اور سورج کے طلوع و غروب کا مسئلہ پیش کیا تاکہ حق ہر دو طرح کے افراد کے سامنے واضح ہو جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت ابراہیمؑ کے مدمقابل کون تھا:** سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے مدمقابل اس اجتماع میں کون تھا اور کون آپ سے حجت بازی کر رہا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن فرمایا گیا ہے۔

"ان اتٰه الله الملك"

یعنی — اس غرور و تکبر کے باعث جو اس میں نشۂ حکومت کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا وہ ابراہیم سے حجت بازی کرنے لگا۔

لیکن حضرت علی علیہ السلام سے منقول در منثور کی ایک حدیث میں اور اسی طرح تواریخ میں اس کا نام "نمرود بن کنعان" بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ **یہ مباحثہ کب ہوا:** زیر بحث آیت میں اس مباحثے کا وقت نہیں بتایا گیا۔ لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی اور آگ کی بھٹی سے نجات کے بعد کا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ آگ میں ڈالے جانے سے قبل اس گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اصولی طور پر بت پرست آپ کو ایسے مباحثے کا حق نہ دے سکتے تھے وہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسا مجرم اور گنہ گار سمجھتے تھے جسے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے اعمال اور خدایان مقدس کے

خلاف قیام کی سزا ملے ۔ وہ تو انہوں نے بت شکنی کے اقدام کا صرف سبب پوچھا تھا اور اس کے بعد انتہائی غصے اور سختی سے انہیں آگ میں جلانے کا حکم صادر ہوا تھا لیکن جب آپ حیرت انگیز طریقے سے آگ سے نجات پا گئے تو پھر اصطلاحی الفاظ میں "نمرود کے حضور رسائی ہوئی" اور پھر بحث و مباحثہ کے لیے بیٹھ گئے ۔

۳۔ بحث سے نمرود کا مقصد : آیت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اس بحث اور گفتگو کے ذریعے نمرود کسی حقیقت کی جستجو نہ کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے باطل موقف کو برتر ثابت کرنا چاہتا تھا ۔ شاید لفظ "حاج" اسی مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ لفظ عموماً ایسے ہی مواقع پر استعمال ہوتا ہے ۔

۴۔ نمرود کا دعوائے الوہیت : آیت سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظالم حکمران اپنے بارے میں الوہیت کا مدعی تھا یہی نہیں کہ وہ اپنی پرستش کرواتا تھا بلکہ اپنے آپ کو عالم ہستی کا پیدا کرنے والا بھی بتاتا تھا یعنی اپنے آپ کو معبود بھی سمجھتا تھا اور خالق بھی ۔

ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب لوگ پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے کے علاوہ انہیں امور عالم میں موثر اور سہیم بھی مانتے ہیں تو ایسا موقع ایک مکار اور ظالم حکمران کے لیے بھی پیش آ سکتا ہے کہ وہ سادہ لوح لوگوں سے فائدہ اٹھائے ، انہیں اپنی طرف دعوت دے اور اپنے آپ کو ایک بنا کر پیش کرے تاکہ اس کی بھی پرستش ہو اور لوگ اس کی خالقیت کے سامنے گردن جھکائیں ۔

بُت پرستی کی مختصر تاریخ

ہم یہاں بُت پرستی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں ۔

بُت پرستی کی ابتداء کا تعین بہت مشکل ہے ۔ قدیم ترین زمانے سے جہاں تک ہمیں انسانوں کی تاریخ معلوم ہے یہ بت پرستی ان لوگوں میں موجود رہی ہے جو پست فکر اور گھٹیا تھے ۔ بت پرستی دراصل خدا پرستی کے عقیدے کی ایک تحریف ہے ۔ خدا پرستی دراصل انسان کی فطرت اور سرشت کا جزء ہے اور شروع سے انسان اسی فطرت اور سرشت کا مالک رہا ہے لہٰذا اس کی تحریف بھی پست افراد میں ہمیشہ رہی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بت پرستی کی تاریخ تقریباً تاریخ انسانی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان اپنی سرشت اور خلقت کے تقاضے کی بناء پر طبیعات سے ماوراء ایک قوت کی طرف متوجہ تھا ۔ نظام ہستی کے واضح استدلالات اس سرشت کی تائید کرتے تھے اور ایک ایسے مبداء کی نشاندہی کرتے تھے کہ جو عالم و قادر ہے اور انسان سرشت اور عقل کے ان دونوں طریقوں سے کم و بیش ہمیشہ ہی اس مبدا ہستی سے آشنا رہا ہے لیکن ــــ بھوک کا وہ احساس جو بچے میں موجود ہے اگر بر محل اس کی رہبری نہ کی جائے اور اسے صحیح غذا نہ دی جائے تو پھر وہ کیچڑ اور اس جیسی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ ایسی ہی چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی صحت و سلامتی کھو بیٹھتا ہے اسی طرح انسان کی عقل و فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بر وقت راہنمائی میسر نہ آسکے

تو وہ مصنوعی خدا اور طرح طرح کے بتوں کا رخ کر لیتا ہے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کر بیٹھتا ہے اور ان کے لیے خدائی صفات کا قائل ہو جاتا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ کوتاہ فکر اور بے وقوف لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر چیز کو حسی قالب میں دیکھیں۔ بنیادی طور پر ان کی فکر محسوسات کی دنیا سے آگے قدم نہیں رکھتی اس لیے ان دیکھے خدا کی پرستش ان کے لیے مشکل ہے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے خدا کو پیکر محسوس میں دیکھیں۔ یہ جہالت و نادانی جب خدا پرستی کی سرشت سے مل جاتی ہے تو بت پرستی اور خدائے حس کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ گزشتہ قومیں انبیاء اور بزرگان دین کے لیے جو خاص احترام رکھتی تھیں اس کے پیش نظر ان کی وفات کے بعد ان کے مجسمے یادگار کے طور پر بنا لیتی تھیں۔ کوتاہ نظر اور کم فکر لوگوں میں جو جہلی فضائل اور غلو کی روح ہوتی ہے وہ انہیں جوش ولائی اور مجبور کرتی کہ ان مجسموں کے لیے بلند مرتبوں اور معجزوں کے قائل ہو جائیں اور یوں انہیں سرحد الوہیت تک پہنچا دیں۔ یہ انداز بت پرستی کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

بت پرستی کا ایک سرچشمہ یہ بھی تھا کہ موجودات کا ایک سلسلہ جو انسانی زندگی کے لیے سودمند تھا مثلاً چاند، سورج، آگ اور پانی وغیرہ۔ لوگ ان کے سامنے سر تعظیم خم کر دیتے اور اپنی فکر کے افق کو وسیع نہ کرتے کہ جس کے نتیجے میں وہ ان سے ماوراء سبب اول اور خالق عالم کو دیکھ پاتے۔ احترام اور تعظیم کے اس انداز نے رفتہ رفتہ بت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔

بت پرستی کی تمام اشکال کی جڑ اور بنیاد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے فکری پستی اور جہل و نادانی نیز خدا جوئی اور خداشناسی کے لیے صحیح رہبری کا نہ ہونا مگر جب انبیاء کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی موجود تھی تو پھر یہ عذر قابل گرفت ضرور ہے۔

۲۵۹۔ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ

نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ
أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۲۵۹۔ یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی میں سے گزرا، حالت یہ تھی کہ اس کی دیواریں چھتوں پر گری پڑی تھیں، (اور اس میں رہنے والوں کے جسم اور ہڈیاں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیکھا تو وہ شخص اپنے آپ سے) کہنے لگا: خدا انہیں موت کے بعد اب کیسے زندہ کرے گا (اسی وقت) خدا نے اسے ایک سو سال کیلئے مار دیا۔ پھر اُسے زندہ کیا اور اس سے کہا: کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ کہنے لگا: ایک دن۔ یا دن کا کچھ حصہ فرمایا: (نہیں) بلکہ ایک سو سال تک ٹھہرے رہے ہو۔ اپنی غذا اور پینے کی چیز کی طرف دیکھو (جو تمہارے پاس تھی اور سالہا سال گزرنے کے باوجود) اس میں کوئی تغیر نہیں آیا (وہ خدا جس نے جلد خراب ہو جانے والی ان چیزوں کی اتنی طویل مدت حفاظت کی ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) لیکن اپنے گدھے کی طرف دیکھو (کہ وہ کیسے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے موت کے بعد زندگی تمہارے اطمینان کے لیے ہے نیز) اس لیے بھی کہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے (معاد کے بارے میں) نشانی قرار دیں اب (اپنی سواری کی) ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کیسے اٹھا کر ایک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ (یہ حقائق) جب اس پر آشکار ہونے تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

واقعے کی تفصیلات

یہ آیت ایک گذشتہ نبی کا دوسرا واقعہ بیان کرتی ہے یہ واقعہ معاد اور قیامت پر ایک زندہ گواہ ہے۔ درحقیقت گذشتہ آیات جن میں حضرت ابراہیمؑ کی نمرود سے ہونے والی گفتگو کو بیان کیا گیا تھا توحید اور خدا شناسی کے بارے میں تھیں اور یہ آیت معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہے۔ پہلے ہم اجمالی طور اس واقعے کو دیکھیں گے اور پھر آیت کی تفسیر کریں گے۔ آیت ایک ایسے شخص کی سرگذشت بیان کر رہی ہے جو ناشائے سفر میں تھا۔ ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشتناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہو چکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ جب اس نے یہ وحشتناک منظر دیکھا تو کہنے لگا:

خدا ان مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔

ہاں البتہ اُس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے تعجب تھی کیونکہ آیت میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے۔ جیسا کہ آیت کے مطابق خدا نے اُس سے گفتگو کی۔ روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خدا تعالیٰ نے اسی وقت اُس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال کے بعد اسے زندہ کیا۔ اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے۔ فوراً جواب میں عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کیسے طویل مدت میں حکم خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ اب اس دلیل کے لیے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔ اب دیکھو کہ ہم اس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اُٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آگیا ہے
اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے، مختلف احتمالات دیئے گئے ہیں۔ بعض نے "ارمیا" کہا ہے اور بعض "خضر" سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ "عزیر" تھے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر کے نام کی تائید ہوتی ہے۔

یہ بھی سوال اختلافی ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی۔ بعض اسے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو بخت النصر کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

اب آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

"او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا":

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کر رہی ہے۔ گذشتہ آیت میں توحید کے بارے میں بحث تھی۔ یہ اور اس سے اگلی آیت معاد اور قیامت کے حسی نمونے پیش کر رہی ہیں۔ ابتدا یوں ہوتی ہے: کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک ایسی جگہ سے گذر رہا تھا جو بالکل ویران ہو چکی تھی۔

"عروش" جمع ہے "عرش" کی۔ یہاں "چھت" کے معنی میں ہے۔ "خاویۃ" دراصل "خالی" کے معنی میں ہے اور یہاں ویران ہونے کے مفہوم کے لیے کنایہ کے طور پر کیا ہے کیونکہ آباد گھر عموماً سکونتی ہوتے ہیں اور جو گھر خالی ہوتے ہیں، پہلے سے ویران ہوتے ہیں یا خالی رہنے کی وجہ سے ویران ہو جاتے ہیں۔ اس لیے "وھی خاویۃ علی عروشھا" کا مطلب ہے کہ اس آبادی کے سب گھر ویران ہو چکے تھے لیکن اس شکل میں کہ پہلے ان کی چھتیں گری تھیں اور اس کے بعد ان کی دیواریں زمین بوس ہو گئی تھیں ایسی ویرانی ایک مکمل ویرانی ہوتی ہے کیونکہ کسی عمارت کی تباہی کے وقت عموماً پہلے چھت تباہ ہوتی

ہے اور ایک مدت تک دیواریں کھڑی رہتی ہیں اور پھر وہ بھی تباہ شدہ چھتوں پر آجاتی ہیں۔

"قال انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا":

ظاہراً اس ماجرے میں پیغمبر کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اپنے آپ سے کہا: خدا اس بستی کو موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ "قریہ" سے مراد یہاں بستی والے ہیں۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس حادثے میں اہل بستی کی بکھری پڑی ہڈیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی طرف اشارہ کرکے یہ بات کر رہے تھے۔

"فاماتہ اللہ مائة عام ثم بعثہ":

اکثر مفسرین اس جملے سے یہ سمجھے ہیں کہ خدا نے پیغمبر مذکور کو ایک سو سال کے لیے مار دیا تھا۔ پھر انہیں زندہ کیا۔ "اماتہ" کا لفظ بھی جو "موت" کے مادہ سے ہے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن تفسیر المنار کا مولف کہتا ہے:

> "ممکن ہے یہ ایک قسم کی نیند کی طرف اشارہ ہو، جسے آج کے علماء "سبات" کہتے ہیں، جس کے مطابق موجود زندہ ایک طویل مدت تک گہری نیند میں مستغرق رہتا ہے لیکن اس میں شعلہ حیات خاموش نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے اصحاب کہف کی نیند کے بارے میں پڑھ رکھا ہے"

پھر وہ مزید لکھتا ہے

> "اس طویل نیند کے بارے میں اب تک جو اتفاق ہوا ہے وہ چند سال سے زیادہ نہیں لہٰذا اس کا سو سال تک طویل ہو جانا خلاف معمول ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ جب چند سال کے لیے ایسا ممکن ہے تو سو سال کے لیے بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ خارق عادت امور قبول کرنے کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کام ممکن ہو محال عقلی نہ ہو۔

اس تفسیر کے لیے ظاہراً آیت میں کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ آیت کا ظہور یہ ہے کہ پیغمبر مذکور دنیا سے چل بسے اور سو سال کے بعد پھر سے زندہ ہوئے۔ ایسی موت و حیات البتہ ایک خارق عادت اور غیر معمولی چیز ہے لیکن محال ہرگز نہیں اور پھر خارق عادت واقعات صرف اسی موقع کے لیے منحصر نہیں کہ ہمیں اس کی توجیہ و تاویل کرنا پڑے۔

بہت سے حیوانات ایسے ہیں جو سردیوں کے موسم میں سوتے پڑے رہتے ہیں اور جب ہوا گرم ہوتی ہے تو بیدار ہو جاتے ہیں۔ بعض حیوانات طبیعی طور پر منجمد ہو جاتے ہیں اور انسان بھی جانوروں کو مصنوعی طریقے سے منجمد کر سکتا ہے۔

وہ اگر یہاں چند سال تک کی طویل نیند کے امکان کے حوالے سے سو سال تک مردہ رہنے کے بعد زندہ ہونے کو بھی ایک امر ممکن شمار کیا جائے تو یہ ایک اچھی بات ہوگی۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ خدا جو جانوروں کو سالہا سال تک طویل نیند یا حالت انجماد میں رکھ کر انہیں پھر بیدار کر دیتا ہے اور وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں

کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے۔

اصولی طور پر معاد، قیامت کے دن مردوں کی دوبارہ زندگی خارق عادت واقعات اور انبیاء کے معجزات تسلیم کر لینے کا فائدہ یہ ہے کہ تمام آیات قرآن کی طبیعی قوانین کی روشنی میں تفسیر کرنے پر اصرار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور نہ ظاہری مفہوم کے خلاف بیان کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی صحیح

"قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم":

اس جملے میں خدا تعالیٰ پیغمبر سے پوچھتا ہے: اس جگہ کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ جواب میں تردد سے کہتے ہیں: ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ۔

جواب میں تردد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مرنے کا وقت اور زندہ ہونے کا وقت دن کی کوئی ایک معین گھڑی نہ تھی مثلاً موت کا وقت ظہر سے پہلے تھا اور زندہ ہونے کا زوال کے بعد تھا۔ لہٰذا وہ شک میں پڑ گئے کہ کیا ایک شب و روز گزر گئے ہیں یا دن کے چند گھنٹے گزرے ہیں۔ اسی لیے ایک دن کہنے کے بعد پھر تردد کے عالم میں کہا: یا دن کا کچھ حصّہ۔ لیکن فوراً خطاب ہوا کہ انہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال سے ٹھہرے ہوئے ہو" بل لبثت مائة عام"

"فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنه":

"یتسنہ" کا مادہ ہے "سنة" یعنی ایک سال "لم یتسنه" کا معنی ہے "اُسے ایک سال نہیں گزرا"۔ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ یہ متغیر اور خراب نہیں ہوا۔ اس طرح جملے کا مجموعی معنی یہ ہوگا کہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود یوں لگتا ہے کہ گویا ان پر ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا اور ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تیری کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی اصل حالت میں محفوظ رکھ سکتا ہے جب کہ قاعدۃً انہیں بہت جلد خراب اور فاسد ہو جانا چاہیے اسی خدا کے لیے مردوں کو زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو اتنی مدت تک خراب ہونے سے بچانا دراصل حیات کو باقی رکھنا ہے کیونکہ ایسی چیزوں کی مدت عمر تو بالعموم بہت کم ہوتی ہے جو کہ بذات خود مردوں کو زندہ کرنے سے آسان تر نہیں ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ پیغمبر کے پاس کھانے پینے کی کیا چیزیں تھیں تو آیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کھانے کے لیے انجیر اور پینے کے لیے کسی پھل کا جوس تھا اور یہ معلوم ہے کہ یہ چیزیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں اس لیے ایک طویل مدت تک ان کی بقا ایک اہم امر ہے۔

"وانظر الی حمارک":

یعنی۔ اپنے گدھے کو دیکھو۔ قرآن نے ان کی سواری کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سواری وقت گزرنے کے ساتھ بالکل گل سڑ چکی تھی کیونکہ اس کے علاوہ سو سال گزرنے پر کوئی دلیل نہ تھی۔

---

[1] توجہ رہے کہ لم یتسنہ کی ضمیر مفرد ہے جبکہ اس کا تعلق "طعام" سے بھی ہے اور شراب سے بھی اس لیے بظاہر ضمیر تثنیہ ہونا چاہیے تھی لیکن چونکہ یہاں مراد جنس ہے اور سب ایک چیز شمار ہوتی ہے لہٰذا ضمیر بھی مفرد کی شکل میں ہے۔

یہ خود ایک عجیب و غریب چیز ہے کہ جانور جس کے لیے طویل عمر کا امکان ہے اس کے اجزاء اس طرح بکھر جائیں لیکن پھل اور پھلوں کا جوس جسے بہت جلد خراب ہونا چاہیئے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے یہاں تک کہ اس کا ذائقہ اور بو تک نہ بدلے۔ یہ خدا تعالیٰ کی انتہائی قدرت نمائی ہے۔

"ولنجعلک آیۃ للناس":

یعنی یہ واقعہ نہ صرف تمہارے لیے قیامت میں اٹھائے جانے کی دلیل ہے بلکہ تمام لوگوں کے لیے نشانی ہے۔

"وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما":

"ننشزھا" کا مادہ ہے "نشوز" اس کا معنی ہے "ارتفاع" اور "بلند ہونا"۔ یہاں مراد ہے بکھری ہوئی چیزوں کا جمع ہو کر باہم پیوست ہونا۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی یوں ہوگا: بکھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کیسے انہیں اٹھا کر ایک دوسرے سے پیوست کرتے ہیں اور ان پر گوشت (کا لباس) پہناتے ہیں اور اسے زندہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں سے مراد ان کی سواری کے جانور کی ہڈیاں ہیں نہ کہ اہل بستی کی بوسیدہ ہڈیاں کیونکہ یہ امر گذشتہ جملوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔

"فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شیء قدیر"

یہ مسائل جب پیغمبر پر آشکار ہو گئے تو وہ کہنے لگے: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے اب جان لیا ہے۔ جب کہ زلیخا کی حضرت یوسفؑ سے گفتگو میں اس طرح ہے:

"الان حصحص الحق"

یعنی — اب حق واضح ہوا ہے۔

بلکہ پیغمبر کہتے ہیں: میں جانتا ہوں۔ یعنی اب اپنی آگاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

۲۶۰۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۰۔ اور اس وقت (کو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لائے۔ کہنے لگے: کیوں نہیں میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کرلو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرلو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملادو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئینگے اور جان لو کہ خدا غالب اور حکیم ہے (وہ مردوں کے اجزائے بدن کو بھی جانتا ہے اور انہیں جمع کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے)۔

تفسیر

بہت سے مفسرین اور مورخین نے اس آیت کے ذیل میں یہ واقعہ لکھا ہے:

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک مردار دریا کے کنارے پڑا ہوا دیکھا۔ اس کا کچھ حصہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا۔ دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلے کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت۔ ابراہیمؑ سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جزء بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے عمل میں آئے گا جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا: چار پرندے لے لو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو۔ پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کردو اور ہر حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تا کہ میدان حشر کا منظر دیکھ سکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آ گئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس مشہور واقعے کے مقابلے میں ایک مفسر ابو مسلم نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے جسے مشہور مفسر فخر رازی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ ابو مسلم کا نظریہ باقی مفسرین کے برخلاف ہے لیکن چونکہ ایک معاصر مفسر مولف المنار نے اس کی تائید کی ہے لہذا ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

موصوف نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر ہرگز دلالت نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کو ذبح کیا اور پھر حکم خدا سے انہیں زندہ کیا۔ بلکہ آیت میں تو مسئلہ حشر و نشر واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ یعنی اے ابراہیم! چار پرندے

لے لو اور انہیں اپنے ساتھ یہ مانوس کر لو کہ جب انہیں پکارو تو وہ تمہارے پاس آجائیں اگر چہ ان میں سے ہر ایک کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دو تو یہ کام تمہارے لیے کتنا آسان ہے۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا اور مختلف مقامات عالم سے ان کے پراگندہ اجزاء جمع کرنا بھی خدا کے لیے آسان ہے۔

اس لیے خدا نے ابراہیمؑ کو پرندوں کے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی کام کریں بلکہ صرف ایک مثال اور تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں کام نہایت آسانی سے اور تیزی سے کر سکتا ہوں۔ بس تم پانی کا ایک گھونٹ پیو اور میں یہ کام کیے دیتا ہوں۔ یعنی یہ میرے لیے اس قدر آسان ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پر پانی کا گھونٹ پینا فرض ہو گیا ہے۔

دوسرے نظریے کے حامی "صرھن الیک" سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لفظ "الی" سے متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "مائل کرنا" اور "مانوس بنانا" اس لیے جملے کا مفہوم ہوگا کہ مذکورہ پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرو۔ علاوہ ازیں "صرھن" "منھن" اور "ادعھن" کی ضمیریں پرندوں کی طرف لوٹتی ہیں اور یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو درست مان لیں کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں پرندوں سے متعلق ہیں اور بعض ان کے اجزاء سے متعلق جب کہ یہ مناسب دکھائی نہیں دیتا۔

ان استدلالات کا جواب ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے لیکن جس بات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آیت یہ حقیقت وضاحت سے پیش کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حشر و نشر کے محسوس مشاہدے کا تقاضا کیا تھا تاکہ ان کا دل مطمئن ہو جائے اور واضح ہے کہ ایک مثال حشر و نشر کی منظر کشی نہیں کر سکتی اور نہ ہی دل کے لیے باعث اطمینان ہو سکتی ہے۔ درحقیقت عقل و منطق کے ذریعے تو حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی حشر و نشر پر ایمان رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس کا حسی طور پر مشاہدہ کریں۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ کونسا نظریہ تفسیر سے میل کھاتا ہے۔

"واذ قال ابرٰھم رب ارنی کیف تحی الموتٰی":

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ حشر و نشر کے بارے میں یہ آیت گذشتہ آیت کے موضوع کی تکمیل کرتی ہے۔ "ارنی کیف ....." سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مشاہدہ، رویت اور شہود کا تقاضا کر رہے تھے اور وہ بھی اصل معاد کا نہیں بلکہ اس کی کیفیت کا۔

"قال اولم تؤمن قال بلٰی ولکن لیطمئن قلبی":

ممکن تھا کہ مذکورہ مطالبے پر لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے بارے میں تزلزل کا گمان کرتے لہٰذا انہیں وحی ہوئی، تو کیا تم ایمان نہیں لائے ہو؟ یہ اس لیے تھا تاکہ وضاحت ہو جائے اور اس واقعے سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو لہٰذا انہوں نے کہا جی ہاں، میرا ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں دل مطمئن ہو جائے۔

ضمناً اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مسئلے میں علمی اور منطقی دلائل سے یقین پیدا ہو جائے

لیکن اطمینان قلب نہ ہو کیونکہ استدلال عقلِ انسانی کو تو راضی کر لیتا ہے لیکن دل اور جذبات انسانی کو نہیں۔ جو دونوں کو سیراب کرتا ہے وہ شہود عینی اور مشاہدات حسی ہی ہیں۔ یہ ایک اہم بات ہے جس کے بارے میں اس کے مقام پر مزید وضاحت کریں گے۔

"قال فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزءا" :

"صرهن" کا مادہ ہے "صور" (بروزن قول) اس کا معنی ہے "ٹکڑے کرنا" "مائل کرنا" اور "بلند آواز سے پکارنا"۔ یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے یعنی چار پرندے انتخاب کر لو، انہیں ذبح کرو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے ملا دو۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ حشر و نشر اور مردوں کے اجزاء بدن کے بکھر جانے کے بعد زندہ ہونے کے نمونے کا مشاہدہ کریں اور یہ بات پکارنے اور مائل کرنے کے معانی سے حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جبکہ آیت کا بعد کا حصہ کہتا ہے: پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصہ رکھ دو۔ آیت کا یہ حصہ واضح گواہی دے رہا ہے کہ پہلے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے اور ان کے اجزاء بنے ہیں۔ جو لوگ "صرهن" کا ترجمہ "مانوس اور مائل کرنا" کرتے ہیں وہ درحقیقت لفظ "جزء" کے معنی سے غافل ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ چار پرندے: اس میں شک نہیں کہ مذکورہ چار پرندے مختلف انواع میں سے تھے کیونکہ اس کے بغیر حضرت ابراہیمؑ کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہر ایک کے اجزاء اس کے اصلی بدن میں واپس آئیں اور یہ مختلف انواع ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا تھا۔ مشہور روایات کے مطابق وہ چار پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوا تھے جو کہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

بعض ان پرندوں کو انسانوں کی مختلف صفات اور جذبات کا مظہر سمجھتے ہیں۔

مور: خودنمائی، زیبائش اور تکبر کا مظہر ہے،

مرغ: شدید جنسی میلانات کا مظہر ہے،

کبوتر: لہو و لعب اور کھیل کود کا مظہر ہے اور

کوا: لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔

۲۔ پہاڑوں کی تعداد: جن پہاڑوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے اجزاء رکھے تھے ان کی تعداد کی صراحت قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن روایات اہل بیتؑ میں یہ تعداد دس بتائی گئی ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مال کا ایک جزء فلاں سلسلے میں صرف کرنا اور اس کی مقدار معین نہ کر جائے تو مال کا دسواں حصہ دینا کافی ہے۔[۱]

۳۔ واقعہ کب رونما ہوا: یہ واقعہ کب پیش آیا۔ جب حضرت ابراہیمؑ بابل میں تھے یا جب شام چلے آئے تھے۔ لیکن

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، جلد اول، صفحہ ۲۷۸

گمان ہے کہ یہ شام میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ سرزمین بابل میں پہاڑ نہیں ہیں۔

"ثم ادعهن یاتینک سعیا":

"پھر انہیں پکارو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف آئیں گے" اس موقع پر ایک پرندے کے بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہوئے اور آپس میں مل گئے اور پرندے نئے سرے سے زندہ ہو گئے۔ البتہ ایسا ہونا بالکل خارق عادت اور خلاف معمول ہے لیکن اگر ہم خدا کو طبیعی قوانین پر حاکم سمجھیں نہ کہ محکوم، تو پھر مسئلے میں کوئی پیچیدگی نہیں رہے گی۔

ضمناً یہ بھی ایک پہلو ہے کہ بعض نے لفظ "سعیا" سے یہ سمجھا ہے کہ پرندے زندہ ہونے کے بعد پرواز نہ کرسکے بلکہ دوڑ کر ابراہیمؑ کے پاس آئے "سعیا" عموماً لغت عرب میں تیزی سے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

خلیل بن احمد مشہور عربی ادیب سے منقول ہے کہ ابراہیمؑ چل رہے تھے کہ پرندے ان کے پاس آئے (یعنی "سعی" ابراہیمؑ سے متعلق ہے پرندوں سے نہیں)۔

بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ "سعیا" سریع اور تیز پرواز کے لیے کنایہ ہو۔

"واعلم ان اللہ عزیز حکیم":

جب ابراہیمؑ یہ حیرت انگیز منظر دیکھ چکے تو انہیں وحی ہوئی کہ یہ واقعہ دیکھ کر جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے تمام کام حکمت کے ماتحت ہیں اور اتنا بڑا علم و قدرت رکھنے کی وجہ سے اس کے لیے مُردوں کے منتشر اجزاء کو جاننا اور انہیں جمع کرنا کوئی مشکل نہیں۔

معاد جسمانی

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والی بہت سی آیات معاد جسمانی کی توضیح و تشریح کرتی ہیں۔ اصولی طور پر جن لوگوں کا قرآن میں آیات معاد سے رابطہ ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں معاد سے مراد معاد جسمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور معاد جسمانی کا یہ مطلب ہے کہ حشر و نشر کے وقت یہ جسم بھی پلٹ آئے گا اور روح بھی۔ اسی لیے تو قرآن میں اسے "احیاء الموتیٰ" (مُردوں کو زندہ کرنا) کہا گیا ہے اور اگر قیامت صرف روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو زندہ کرنے کا اصلاً کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

زیر بحث آیت بھی صراحت سے اسی بدن کے منتشر اجزاء کا لوٹنا بیان کر رہی ہے جس کا نمونہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

شبۂ آکل و ماکول

مُردوں کے زندہ ہونے کے منظر کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا حضرت ابراہیمؑ نے جس وجہ سے کیا تھا اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور وہ تھا مردہ جانور کا دریا کے کنارے پڑا ہونے کا واقعہ جسے دریا اور خشکی کے جانور کھا رہے تھے۔ اس سے معلوم

جواب ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا تقاضا زیادہ تر یہ تھا کہ ایک جانور کا بدن دوسرے جانوروں کے بدن کا جزو بننے کے بعد اپنی اصلی صورت میں کیسے پلٹ سکتا ہے۔ علم عقائد میں اسی بحث کو "شبہٴ آکل و ماکول" کہا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت میں خدا انسان کو اسی مادی جسم کے ساتھ پلٹائے گا۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ جسم اور روح دونوں پلٹ آئیں گے۔

اس صورت میں یہ اشکال سامنے آتا ہے کہ اگر ایک انسان کا بدن خاک ہو جائے اور درختوں کی جڑوں کے ذریعے کسی سبزی یا پھل کا جزو بن جائے پھر کوئی دوسرا انسان اسے کھالے اور اب یہ اس کے بدن کا جزو بن جائے یا مثال کے طور پر قحط سالی میں ایک انسان دوسرے انسان کا گوشت کھالے تو میدانِ حشر میں کھائے ہوئے اجزاء ان دونوں میں سے کس کے بدن کا جزو بنیں گے اگر پہلے بدن کا جزو بنیں تو دوسرا بدن ناقص اور دوسرے کا بنیں تو پہلا ناقص رہ جائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے:

فلاسفہ اور علم عقائد کے علماء نے اس قدیم اعتراض کے مختلف جواب دیے ہیں۔ یہاں سب کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری نہیں۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو قابلِ اطمینان جواب نہیں دے سکے اس لیے انہیں معادِ جسمانی سے مربوط آیات کی توجیہ و تاویل کرنا پڑی اور انہوں نے انسان کی شخصیت کو روح اور روحانی صفات میں منحصر کر دیا۔ حالانکہ انسانی شخصیت صرف روح پر منحصر نہیں اور نہ ہی معادِ جسمانی سے مربوط آیات ایسی ہیں کہ ان کی تاویل کی جا سکے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وہ کاملاً صریح آیات ہیں۔

بعض لوگ ایک ایسی معاد کے بھی قائل ہیں جو ظاہراً جسمانی ہے لیکن معادِ روحانی سے اس کا کوئی خاص فرق بھی نہیں۔

لیکن ہم یہاں قرآنی آیات کے حوالے سے ایک ایسا واضح راستہ اختیار کریں گے جو دورِ حاضر کے علوم کی نظر میں بھی صحیح ہے البتہ اس کی وضاحت کے لیے چند پہلوؤں پر غور کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی بدن کے اجزاء بچپن سے لے کر موت تک بار بار بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دماغ کے خلیے اگرچہ تعداد میں کم یا زیادہ نہیں ہوتے پھر بھی اجزاء کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کی تحلیل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مکمل تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ دس سال سے کم عرصے میں انسانی بدن کے گذشتہ ذرات میں سے کچھ باقی نہیں رہ جاتا لیکن توجہ رہے کہ پہلے ذرات جب موت کی وادی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اپنے تمام خواص اور آثار نئے اور تازہ خلیوں کے سپرد کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانی جسم کی تمام خصوصیات رنگ، شکل اور قیافہ سے لے کر دیگر جسمانی کیفیات تک زمانہ گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پرانی صفات نئے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس بناء پر ہر انسان کے بدن کے آخری اجزاء جو موت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ سب ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اس نے پوری عمر میں کسب کئے ہیں اور یہ صفات انسانی جسم کی تمام عمر کی سرگذشت کی بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح سے پڑتی ہے لیکن توجہ رہنا چاہیئے کہ روح کی پرورش جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور جسم کے ساتھ ہی روح تکامل و ارتقا کی منزل حاصل کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے جیسے دو جسم تمام جہات سے ایک دوسرے سے شباہت نہیں رکھتے، دو روحیں بھی تمام پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہوتیں۔

اسی بنا پر کوئی روح اس جسم کے بغیر مکمل اور وسیع مناسبت اور کارکردگی باقی نہیں رکھ سکتی جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہو اور تکامل و ارتقاء حاصل کیا ہو لہٰذا ضروری ہے کہ قیامت میں وہی سابق جسم لوٹ آئے گے تاکہ اس سے وابستہ ہو کر روح عالی تر مرحلے میں نئے سرے سے اپنی فعالیت کا آغاز کرے اور اپنے انجام دیے ہوئے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہو۔

۳۔ انسانی بدن کا ہر ذرہ اس کے تمام مشخصات جسمی کا حامل ہوتا ہے یعنی اگر واقعاً ہم بدن کے ہر خلیے (CELL) کی پرورش کر کے اُسے ایک مکمل انسان بنالیں تو وہ انسان اس شخص کی تمام صفت کا حامل ہوگا جس کا جزء لیا گیا تھا (یہ امر بھی قابلِ غور ہے)۔

پہلے دن انسان ایک خلیے سے زیادہ نہ تھا۔ پہلے نطفے کا خلیہ تھا۔ اسی میں انسان کی تمام صفات موجود تھیں۔ تدریجاً وہ تقسیم ہوا اور دو خلیے بن گئے پھر دو سے چار ہوئے اور رفتہ رفتہ انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آگئے۔ اسی بناء پر انسانی جسم کے تمام خلیے پہلے خلیے کی طرح ہیں اگر ان کی بھی پہلے خلیے کی طرح پرورش ہو تو ہر ایک ہر لحاظ سے ایک پورا انسان ہوگا جو بعینہ پہلے خلیے سے وجود میں آنے والے انسان کی سی صفات کا حامل ہوگا۔

ان مندرجہ بالا تین مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم اصل اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں۔

آیات قرآنی صراحت سے کہتی ہیں کہ آخری ذرات جو موت کے وقت انسانی بدن میں ہوتے ہیں، قیامت کے دن انسان انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔[1]

اس بناء پر اگر کسی دوسرے انسان نے کسی کا گوشت کھایا ہو تو وہ اجزا اس کے بدن سے خارج ہو کر اصلی شخص کے بدن میں پلٹ آئیں گے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسرے کا بدن تو ضرور ناقص ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ناقص نہیں ہوگا بلکہ چھوٹا ہو جائے گا کیونکہ اس کے اجزاء بدن سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں اب جب وہ اس سے لے لیے جائیں گے تو اسی نسبت سے دوسرا بدن مجموعی طور پر لاغر اور چھوٹا ہو جائے گا مثلاً ایک انسان کا وزن ساٹھ کلو ہے۔ اس میں سے چالیس کلو دوسرے کے بدن کا حصہ تھا وہ لے لیا گیا تو باقی بیس کلو کا چھوٹا سا بدن رہ جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کوئی مشکل تو پیدا نہیں ہوگی۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً نہیں ہوگی کیونکہ یہ چھوٹا سا بدن بالکم و کاست دوسرے شخص کی تمام صفات کا حامل ہے۔ روزِ قیامت ایک چھوٹے بچے کی طرح اس کی پرورش ہوگی اور وہ بڑا ہو کر مکمل انسان کی شکل میں محشور ہوگا حشر و نشر کے موقع پر ایسی پرورش و تکامل میں عقلی اور نقلی طور پر کوئی اشکال نہیں۔

یہ پرورش محشور ہوتے وقت فوری ہوگی یا تدریجی۔۔ یہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو صورت بھی ہو اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو سکتا اور دونوں صورتوں میں مسئلہ حل شدہ ہے۔

---

[1] ان آیات کا مفاد پہلے جزو میں دیا گیا ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے زندہ ہوں گے۔

ایک سوال اب یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کا سارا جسم دوسرے کے اجزاء سے تشکیل پایا ہو تو اس صورت میں کیا بنے گا۔

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے کہ اصولی طور پر ایسا ہونا محال ہے کیونکہ مسئلہ آکل و مأکول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بدن پہلے موجود ہو اور وہ دوسرے بدن سے کھائے اور یوں پرورش پائے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بدن کے تمام اجزاء دوسرے بدن سے تشکیل پائیں۔ پہلے ایک بدن فرض کرنا ہوگا جو دوسرے بدن کو کھائے اس طرح دوسرے بدن کا جزء بنے گا نہ کہ کل (غور کیجئے گا)۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے بدن سے معادِ جسمانی کے مسئلے پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا اور جن آیات میں اس مفہوم کی صراحت کی گئی ہے، ان کی کسی توجیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۶۱۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۱۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ اس بیج کی مانند ہیں جس کے سات خوشے نکلیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہے (اور جو لیاقت و اہلیت رکھتا ہو) دوگنا یا کئی گنا کر دیتا ہے اور خدا (قدرت و رحمت کے لحاظ سے) وسیع اور (تمام چیزوں سے) آگاہ و دانا ہے۔

تفسیر

انفاق ــــ طبقاتی تفاوت کا ایک حل

معاشرے کی ایک مشکل جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہتا ہے اور بالخصوص آج صنعتی اور مادی ترقی کے انسان اس میں مبتلا ہے وہ طبقاتی تفاوت ہے۔ ایک طرف فقر، بے چارگی اور تنگدستی ہے اور دوسری طرف مال و دولت کے ڈھیر ہیں۔

کچھ وہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ فقر و فاقہ کی ایسی تکلیف دہ حالت سے دوچار ہیں کہ ضروریات زندگی مثلاً کھانا، رہائش اور سادہ لباس بھی مہیا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

واضح ہے کہ جس معاشرے کا ایک حصّہ دولت و ثروت کے پاٹے پر اور دوسرا اہم حصّہ فقر و فاقے کے پاٹے پر کھڑا ہو زندہ نہیں رہ سکتا اور ہرگز کسی حقیقی سعادت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا معاشرہ اضطراب، پریشانی، نفرت اور آخرکار دشمنی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اگرچہ گذشتہ زمانوں میں بھی انسانی معاشروں میں یہ اختلاف رہا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ طبقاتی فاصلہ زیادہ ہوگیا ہے اور خطرناک ترین صورت اختیار کر چکا ہے۔

حالت یہ ہے کہ ایک طرف سے حقیقی معنی میں انسانی ہمدردی، تعاون اور مدد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ سود جو طبقاتی اختلافات کا بہت بڑا سبب ہے اس کا دروازہ کئی مختلف شکلوں میں کھل چکا ہے۔ کیمونزم جیسے نظاموں کی پیدائش، خون ریزیاں، چھوٹی بڑی اور وحشت ناک جنگیں اس صدی کی پیداوار ہیں۔ یہ جنگیں ابھی تک دنیا کے مختلف حصّوں میں جاری ہیں۔ ان سب حالات کی زیادہ تر بنیادیں اقتصادی ہیں اور یہ انسانی معاشروں میں سے اکثریت کی محرومیت کا نتیجہ ہیں۔

دنیا کے اقتصادی ماہرین اور مکاتب اس عظیم اجتماعی مشکل کی چارہ جوئی اور حل کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک نے ایک راستہ انتخاب کر لیا ہے۔ کیمونزم نے انفرادی ملکیت کو لغو قرار دے دیا ہے اور سرمایہ داری نے بھاری مالیات وصول کر کے عام لوگ کے فائدے کے نام پر ادارے قائم کر دیے ہیں۔ جو طبقاتی تفاوت کے حل کی بجائے زیادہ تر دکھاوے پر مبنی ہیں۔ یہ سب اپنے تئیں طبقاتی فاصلوں کو میٹنے کے درپے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس راستے میں موثر قدم نہیں اٹھا سکا کیونکہ روح مادہ پرستی جو اس وقت دنیا پر حکمران ہے اس کی موجودگی میں اس مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا ایک ہدف اور مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سے غیر عادلانہ اختلافات ختم ہو جائیں جو اجتماعی بے انصافی کی وجہ سے غریب اور امیر طبقے میں پائے جاتے ہیں اور جو لوگ دوسروں کی مدد کے بغیر اپنی ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتے ان کی سطح زندگی بلند ہو جائے اور کم از کم لوگوں کے پاس لوازمات زندگی تو فراہم ہونا چاہئیں۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اسلام کے پاس ایک وسیع پروگرام ہے۔ اسلام نے سود خواری مطلقاً حرام قرار دی ہے، زکوٰۃ و خمس وغیرہ جو کہ اسلامی مالیات ہیں ان کی ادائیگی واجب قرار دی ہے۔ انفاق، خرچ کرنے، وقف کرنے، قرض حسنہ دینے اور مختلف قسم کی مالی امداد دینے کا شوق پیدا کرنا بھی اسی پروگرام کا ایک حصّہ ہے اور ان سب سے زیادہ روح ایمانی پیدا کرنا اور انسانی بھائی چارے کو زندہ کرنا اسلامی پروگرام کی عظمت ہے۔

"مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة":

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد جہاد میں خرچ کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل آیات میں جہاد کی گفتگو آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ مناسبت تخصیص کا سبب نہیں بنتی کیونکہ "سبیل الله" مطلقاً آیا ہے جس میں ہر نیک مصرف شامل ہے۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ ان تمام آیات میں جہاد کے علاوہ دوسری بحث ہو رہی ہے اور "انفاق" اور خرچ کرنے کی بحث کا مستقل طور پر پیچھا کیا گیا ہے۔ تفسیر مجمع البیان کے مطابق روایات میں بھی آیت کے عمومی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اشخاص کو اس پُربرکت دانے سے تشبیہ دی گئی ہے جیسے مستعد اور قابل زمین میں ڈالا جائے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان اشخاص کو دانے سے تشبیہ نہ دی جاتی بلکہ ان کے "انفاق" اور خرچ کرنے کو دانے سے تشبیہ دی جاتی یا خود انہیں بیج ڈالنے والے کسان سے تشبیہ دی جاتی۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہے یا لفظ "صدقات" "الذین" سے پہلے یا لفظ "باذر" "حبۃ" سے قبل فرض کرنا چاہیئے لیکن آیت میں ایسی کوئی دلیل اور قرینہ نہیں کہ حذف یا فرض کرنے کا معاملہ درپیش ہو۔

انفاق اور خرچ کرنے والے افراد کو پُربرکت دانوں سے تشبیہ بڑی جاذبِ نظر ہے اور یہ ایک عمیق اور گہری بات ہے۔

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر شخص کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے اور عمل میں جتنی وسعت پیدا ہوتی ہے دراصل اتنی ہی وسعت انسانی وجود میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ انسانی اعمال انسانی قوتوں کی تبدیل شدہ صورت ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن انسان کے عمل کو اس کے وجود سے جدا نہیں سمجھتا اور دونوں کو ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں قرار دیتا ہے۔ اس بناء پر آیت بغیر کسی حذف اور مفروضے کے قابلِ تفسیر ہے اور یہ ایک عقلی حقیقت کی طرف اشارہ ہے یعنی ایسے نیک لوگ ایک پُرثمر بیج کی طرح ہیں جو ہر طرف اپنی جڑیں اور شاخیں پھیلاتا ہے اور تمام جگہیں اس کے پَر و بال کے سائے میں آ جاتی ہیں۔

"انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ"

اس جملے میں قرآن اس پُربرکت دانے کی توصیف یوں کرتا ہے: اس سے سات سنبل اور خوشے اگتے ہیں ان میں سے ہر خوشے میں سو دانے ہیں۔ یوں وہ اپنی اصل سے سات سو گنا ہو جاتے ہیں۔

کیا یہ ایک فرضی تشبیہ ہے

کیا ایسا کوئی دانا نہیں ہے جس سے سات سو دانے نکلیں یا پھر اس سے مراد "ارزن[1]" کے دانوں جیسے دانے ہیں جن میں ایسی تعداد دیکھی جا سکتی ہے چونکہ کہتے ہیں کہ گندم وغیرہ میں یہ تعداد نظر نہیں آتی۔

لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چند سال پیشتر ایک مرتبہ کثرت سے بارشیں ہوئیں تو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بوشہر[2] کے گرد و نواح کے بعض کھیتوں میں گندم کے تنے بہت بلند اور پُرخوشہ تھے اور ان میں سے بعض اوقات ایک ہی تنے میں گندم کے چار ہزار تک دانے موجود تھے۔ یہ خود ایک دلیل ہے کہ قرآن کی تشبیہ واقعاً ایک مکمل تشبیہ ہے۔

"واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم":

"یضاعف" کا مادہ ہے "ضعف" (بروزن "شعر")، یہ دوگنا یا چند گنا کے معنی میں ہے۔ اس لیے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا جس کے لیے چاہے اس برکت کو زیادہ کر دے اور دوگنا یا کئی گنا کر دے۔ مندرجہ بالا تحریر کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دانے ایسے بھی ہیں جو سات سو سے کئی گنا زیادہ ثمر دیتے ہیں۔

اس بناء پر یہ تشبیہ ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] باریک دانوں والا ایک غلہ (مترجم) [2] ایران کا ایک شہر (مترجم)

آیت کے آخری حصے میں پروردگار کی وسعتِ قدرت اور تمام چیزوں سے اس کی آگاہی کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ خرچ کرنے والے جان لیں کہ وہ ان کے عمل اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے اور ہر قسم کی برکت عطا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہے۔

۲۶۲۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶۲۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہو اس پر کوئی منت اور احسان نہیں جتاتے اور اذیت نہیں پہنچاتے ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے اور انہیں کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

کس انفاق کی قدر و قیمت ہے

اس آیت میں بھی انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بطور مطلق آیا ہے اور اس میں ہر وہ نیک کام شامل ہے جو خدا کے لیے انجام پذیر ہو۔

"ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى":

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہِ پروردگار میں خرچ کرنے کی قبولیت تبھی ہے جب اس میں احسان جتلانے کا عمل نہ ہو اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ضرورت مندوں کے لیے تکلیف و آزار کا باعث ہو۔ اس بناء پر جو لوگ راہِ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں اور بعد میں احسان جتلاتے ہیں یا کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اذیت اور تکلیف کا باعث ہو تو وہ در حقیقت اس ناپسندیدہ عمل سے اپنا اجر اور صلہ بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

اس آیت میں جو بات اپنی طرف زیادہ توجہ مبذول کرواتی ہے یہ ہے کہ قرآن واقع میں انسانی زندگی کے سرمائے کو مادی سرمائے میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ روحانی اور اجتماعی سرمائے کو بھی شمار کرتا ہے۔

جو شخص کوئی چیز کسی کو دیتا ہے اور پھر اسے احسان جتلاتا ہے یا تکلیف پہنچا کر دل شکستہ کرتا ہے حقیقت میں اس نے اسے کوئی چیز نہیں دی کیونکہ اگر کچھ سرمایہ اسے دیا ہے تو کچھ لے بھی لیا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ تحقیر و تذلیل اور

روحانی شکستگی اسے دیے جانے والے مال سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایسے اشخاص کے لیے کوئی اجر اور ثواب نہ ہو تو یہ بالکل فطری اور عادلانہ معاملہ ہوگا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے افراد بہت سے مواقع پر تو مقروض ہوتے ہیں نہ کہ قرض خواہ کیونکہ انسان کی عزت و آبرو مال و ثروت سے کئی درجے برتر و بالاتر ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ احسان جتانے اور اذیت پہنچانے کا ذکر آیت میں لفظ "ثم" کے ساتھ آیا ہے جو عام طور پر دو واقعات کے درمیان فاصلے اور اصطلاح میں "تراخی" کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اور بعد میں منت و احسان جتلاتے ہیں نہ اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد صرف یہ نہیں کہ انفاق ادب و احترام سے اور احسان جتائے بغیر ہو بلکہ بعد از آں بھی احسان نہیں جتایا جانا چاہیے۔ یہ امر اسلام کی انتہائی عمیق نظری اور انسانی خدمات میں خلوص کا پتہ دیتا ہے۔

توجہ رکھنی چاہیے کہ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا جو انفاق کی عدم قبولیت کا سبب ہیں فقراء اور مساکین سے مخصوص نہیں بلکہ عمومی اور اجتماعی کاموں مثلاً راہ خدا میں جہاد کرنا یا فلاح و بہبود کے کام جن میں مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کے بجالانے میں بھی اس امر کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔

"لهم اجرهم عند ربهم"

یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے تاکہ وہ دلی اطمینان سے اس راہ میں بڑھ چڑھ کر قدم اٹھائیں کیونکہ جو چیز خدا کے پاس ہے نہ اس کے نابود ہونے کا خطرہ ہے نہ اس کے نقصان کا اندیشہ ہے بلکہ لفظ "رب" کے ساتھ "ھم" کی ضمیر (جس کا معنی ہے ان کا پروردگار) یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ان کی پرورش کرتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

"ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون"

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ "خوف" آئندہ کے امور کے بارے میں ہوتا ہے اور حزن و اندوہ گذشتہ امور کے بارے میں۔ خرچ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان کا اجر اور جزا بارگاہِ خدا میں محفوظ ہے اس لیے نہ وہ آئندہ اور روزِ قیامت کا خوف رکھتے ہیں اور نہ راہِ خدا میں بخش دیے جانے والے کے بارے میں کوئی ملال کرتے ہیں۔

۲۶۳۔ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَآ أَذًى ۗ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ○

ترجمہ

۲۶۳۔ (ضرورت مندوں کے سامنے) پسندیدہ گفتگو اور عفو (اور ان سے تلخ باتیں کہنے سے بچنا) اس بخشش و عطا سے بہتر ہے جس کے بعد اذیت اور تکلیف پہنچائی جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ جو لوگ حاجت مندوں سے اچھی بات اور خوش کن گفتگو کرتے ہیں اور سخت لب ولہجے میں ان کے اصرار کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں وہ ان سے بہتر ہیں جو کچھ دینے کے بعد لوگوں کو اذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔

یہ آیت اشخاص کی اجتماعی قدر وقیمت اور وقعت وحیثیت کے بارے میں اسلام کی منطق واضح کرتی ہے۔ جو لوگ انسانیت کے سرمائے کی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں، حاجت مندوں سے اچھی گفتگو کرتے ہیں، کبھی ان کی ضروری راہنمائی بھی کرتے ہیں اور ان کے راز کبھی فاش نہیں کرتے وہ ان کے مقابلے میں اسلام کی نظر میں برتر و بالاتر ہیں جو خود پست ہیں، کوتاہ نظر ہیں، معمولی سی مدد کرکے عزت دار اور آبرومند لوگوں کو زبان کے ہزار چرکے لگاتے ہیں اور اُن کی شخصیت مجروح کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں ایسے افراد درحقیقت جتنا فائدہ پہنچاتے ہیں اس سے زیادہ نقصان دہ اور مضر ہیں اور اگر کچھ سرمایہ دیتے ہیں تو بہت بڑا سرمایہ برباد کر دیتے ہیں۔

جو کچھ اُوپر کہا جاچکا ہے اس سے واضح ہوتا ہے "قول معروف" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ہر قسم کی اچھی بات، دلجوئی اور راہنمائی اِس کے مفہوم میں شامل ہے۔

"مغفرۃ" کا مفہوم ہے۔ حاجتمندوں کی سختی کے جواب میں عفو و درگزر کرنا کیونکہ مصائب وآلام کے ہجوم کی وجہ سے کبھی ان کا پیمانۂ صبر لبریز بھی ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت باتیں کر جاتے ہیں۔

یہ لوگ دراصل اپنا حق غصب کرنے والے ظالم معاشرے سے اس طرح انتقام لینا چاہتے ہیں اور معاشرے اور صاحبانِ استطاعت ان کی محرومیت کی جو کم از کم تلافی کر سکتے ہیں۔ یہ ہے کہ ان کی باتیں تحمل سے سنیں کیونکہ یہ اُن کے اندر لگی ہوئی آگ کی چنگاریاں ہیں۔ انہیں نرمی اور محبت سے خاموش کرنا چاہیے۔ واضح ہے کہ ان کی سختی کو برداشت کرنا، اُن کی سخت نکتہ چینی پر درگزر کرنا اور ان کے دُکھ درد کی گرہوں کو ڈھیلا کرنا ایک اسلامی حکم ہے اور یہ ہدایت اسلامی حکم کی اہمیت کو مزید روشن کر دیتی ہے۔

بعض نے یہاں "مغفرۃ" کو اس کے اصلی معنیٰ میں لیا ہے۔ اس کا اصل معنی ہے "پردہ پوشی کرنا" اس مفہوم میں اِس لفظ کو حاجت مندوں کے اسرار کی پردہ پوشی کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ تفسیر اس سے کوئی تضاد یا اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ "مغفرۃ" اپنے وسیع مفہوم میں عفو و درگزر بھی ہے اور حاجتمندوں کے رازوں کی پردہ پوشی بھی ہے۔

تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث یوں منقول ہے:

"اذا سئل السائل فلا تقطعوا عليه مسألته حتّٰی يفرغ منها ثم ردوا عليه بوقار ولين اما يبذل يسير او رد جميل فانه قد يأتكم من ليس بانس

ولا جان ینظرونکم کیف صنیعکم فیما خولکم اللہ تعالیٰ "

اس حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے خرچ کے آداب کے ایک پہلو کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

" جب کوئی حاجت مند تم سے کوئی چیز مانگے تو جب تک وہ اپنا تمام مقصد بیان نہ کرے اس کی بات قطع نہ کرو۔ اس کے بعد اُسے وقار، ادب اور نرمی سے جواب دو۔ جو چیز تمہارے بس میں ہے اسے دے دو یا پھر شائستہ اور خوبصورت طریقے سے اُسے واپس کر دو۔ کیونکہ ممکن ہے سوال کرنے والا کوئی فرشتہ ہو جو تمہاری آزمائش پر مامور ہو تاکہ وہ دیکھے کہ خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کے پیش نظر تم عمل کس طرح کرتے ہو۔ [1]

" واللہ غنی حلیم "

چھوٹے چھوٹے جملے جو عموماً آیات کے آخر میں آتے ہیں اور جن میں خدا کی بعض صفات بیان کی گئی ہوتی ہیں آیت کے مضمون سے یقیناً مربوط ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے " واللہ غنی حلیم " (یعنی خدا بے نیاز اور بردبار ہے) کے جملے سے مراد گویا یہ ہے کہ انسان چونکہ طبعی طور پر سرکش ہے اور کسی مقام و مرتبہ اور ثروت و دولت تک پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت بعض اوقات اس کی طرف سے فقراء اور مساکین سے گرمی اور بد زبانی کا باعث بن جاتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ غنی بالذات صرف خدا ہے۔ حقیقت میں وہی ہے جو تمام چیزوں سے بے نیاز ہے اور انسان کی بے نیازی تو سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی لہٰذا مقام اور دولت کی وجہ سے اسے فقراء سے بے اعتنائی نہیں برتنا چاہیے۔ علاوہ ازیں خدا لوگوں کی ناشکری کے مقابلے میں بردبار ہے لہٰذا صاحبِ ایمان افراد کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ میں اس طرف اشارہ ہو کہ خدا تمہارے انفاق اور خرچ کرنے سے بے نیاز ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ اس لیے تمہارا کسی پر احسان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ تمہاری سخت روی اور درشتی کے مقابلے میں بردبار ہے اور سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا تاکہ تم بیدار ہو کر اپنی اصلاح کر لو۔

۲۶۴۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰىۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ

[1] نور الثقلین ج ۱، ص ۲۸۳۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

۲۶۵۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا
وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ
فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۶۴۔ اے ایمان والو! اپنی بخششوں کو احسان جتانے اور آزار پہنچانے سے اُس شخص کی طرح باطل نہ کرو جو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور (اس کا کام) پتھر کے ٹکڑے کی طرح ہے جس پر مٹی (کی باریک تہ) ہو (اور اس میں بیج ڈالے جائیں) اور خوب بارش اس پر برسے (اور ساری مٹی اور بیج بہالے جائے) اور اُسے (مٹی اور بیج سے) خالی کردے۔ ایسے لوگ جو کام بجالاتے ہیں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں کرسکتے اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

۲۶۵۔ اور ان لوگوں کا (کام) جو اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنی روح (میں ملکات انسانی باقی رکھنے) کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند جگہ پر ہو، اس پر تیز بارش برسے (اور وہ کھلی ہوا اور نور آفتاب سے خوب بہرہ ور ہو) اور اپنا پھل دوگنا دے اور اگر اس پر سخت بارش نہ برسے اور اس پر پھوار اور شبنم پڑے (لہٰذا وہ ہمیشہ سرسبز، شاداب اور تر و تازہ رہے) اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے بینا ہے۔

تفسیر

راہِ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج

ان دو آیات میں پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اہل ایمان کو نہیں چاہیے کہ وہ راہ خدا میں خرچ کیے گئے سرمائے کو احسان جتلا کر اور آزار پہنچا کر ضائع کردیں۔ اس کے لیے دو عمدہ مثالوں کے ذریعے دونوں طرح کے انفاق کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک وہ خرچ ہے جس میں احسان جتلانا، آزار پہنچانا، ریاکاری اور خودنمائی کی آمیزش ہے اور دوسرا وہ کہ جس کا سرچشمہ خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات ہیں۔

پہلی مثال سخت پتھر کی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہ جمی ہو، اس میں بیج ڈال دیا جائے، اس پر کھلی ہوا چلے

اور سورج چمکے، پھر اس پر موٹے موٹے قطرات کی بارش خوب برسے۔ مسلم ہے کہ ایسی بارش مٹی کی پتلی سی تہ کو دھو ڈالے گی اور بیج کو بہا لے جائے گی سخت پتھر جس میں پانی اور بیج نہیں ڈالا جا سکتا اس پر سبزہ کیسے اُگ سکتا ہے۔ اس کی سختی ظاہر ہو جائے گی۔ یہ سب اس لیے نہیں ہوا کہ سورج کی حدت، کھلی ہوا اور مذکورہ بارش کوئی بُرا اثر رکھتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیج کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ مناسب نہیں تھی۔ ظاہری طور پر صحیح تھی اندرونی طور پر ناقابل نفوذ تھی اس پر صرف مٹی کی پتلی سی تہ جمی ہوئی تھی جبکہ سبزے اور درخت کی جڑوں کے لیے گہری مٹی درکار ہے تاکہ پودوں کو اس ذریعے سے غذا بھی پہنچتی رہے۔

قرآن نے ریاکاری، احسان جتلانے اور آزار پہنچانے کے لیے کیے گئے خرچ کو جس کا سرچشمہ سخت اور قساوت رکھنے والے دل ہیں، اسی نازک تہ سے تشبیہ دی ہے جس نے سخت پتھر کے بالائی حصے کو چھپا رکھا ہوا اور جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو بلکہ وہ باغبان اور کسان کی محنت ضائع کر دے۔[1]

دوسری مثال: ایک سرسبز و شاداب باغ کی ہے جو بلند اور زرخیز زمین میں ہے اس پر آزاد ہوا چلے اور وافر دھوپ پڑتی ہے۔ موسلادھار اور نفع بخش بارش اس پر برسے اور جب کے موسلادھار بارش نہ برسے تب بھی شبنم اور پھوار کے ذریعے اس کی زمین ایسی زرخیز ہے کہ شبنم اور پھوار بھی اس کے درختوں کے ثمر آور ہونے کے لیے کافی ہے۔ چونکہ وہ بلندی پر ہے اس لیے کھلی ہوا اور دھوپ سے خوب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس کا خوبصورت منظر ہر دیکھنے والے کی آنکھ کے لیے پرکشش ہے یہ سیلاب کے خطرے سے بھی محفوظ ہے۔

جو لوگ اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنے قلب و روح میں ایمان و یقین کو استوار کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ اس باغ کی طرح ہیں جو پُر برکت، مفید اور بیش بہا پھل دینے والا ہو۔

چند اہم نکات

(۱) بعض اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیتے ہیں:۔ "لا تبطلوا صدقٰتکم بالمن والاذیٰ" (یعنی اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذا رسانی سے باطل نہ کرو۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ کچھ اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیں۔ یہ وہی مسئلہ احباط ہے جس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۲۱۷ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

(۲) ریاکاری کی مشابہت:۔ وہ پتھر جس پر مٹی کی باریک سی تہ ہو اس کی ریاکارانہ عمل سے مشابہت واضح ہے۔

---

[1] "صفوان" جمع ہے۔ اس کا مفرد "صفوانہ" ہے اس کا معنی ہے صاف و شفاف پتھر۔ "وابل" سخت اور موٹے قطرات والی بارش کو کہتے ہیں۔ "صلد" کا معنی بھی صاف پتھر ہے۔ "ضعفین" "ضعف" کا تثنیہ ہے اس کا معنی ہے دوگنا اور تثنیہ ہونے کی وجہ سے اس کا معنی چوگنا نہیں ہو جاتا مثلاً جیسے زوجین ہے جو کہ دو طرف کی نشاندہی کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

ریاکار لوگ اپنے سخت اور بے ثمر باطن کو خیرخواہی اور نیکی کے چہرے سے چھپا لیتے ہیں اور ایسے اعمال بجالاتے ہیں جن کی جڑیں ان کے وجود میں استوار نہیں ہیں لیکن زندگی کے واقعات و حوادث بہت جلد اس پردے کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں۔

(۳) انفاق کے اسباب: "ابتغاء مرضات اللہ و تثبیتا من انفسهم" (یعنی جو اپنا مال خوشنودیٔ خدا اور اپنے آپ میں انسانی فضائل باقی رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں)۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح اور خدا کیلیے خرچ کرنے کے دو اسباب ہیں۔

(۱) خوشنودیٔ خدا

(۲) رُوحِ ایمان کی تقویت اور اطمینانِ قلب

اس سے واضح ہوتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو صرف خوشنودیٔ خدا اور فضائلِ انسانی کی پرورش اور اپنی روح میں ان صفات کے ثبات و استحکام کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس اضطراب اور دکھ کو دور کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں جو محروم لوگوں کو دیکھ کر احساسِ ذمہ داری اور مسئولیت کے پیشِ نظر ان کے وجدان میں پیدا ہو جاتا ہے (اس بنا پر آیت میں لفظ "من" "فی" کے معنی میں ہوگا)۔

(۴) خدا بصیر ہے: دوسری آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "واللہ بما تعملون بصیر" (یعنی تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھنے والا ہے) یہ جملہ نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے ہے کہ جب بھی وہ کوئی عملِ خیر انجام دیں تو توجہ رکھیں کہ نیت یا عمل میں معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہو کیونکہ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔

۲۶۶۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ
فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۶۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہو جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں، اس باغ میں اُس کے لیے ہر طرح کا پھل موجود ہو لیکن وہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اُس کی اولاد (چھوٹی اور) کمزور ہو (ایسے میں) آگ کا زبردست بگولہ اُٹھے اور جلا ڈالے (جو لوگ خرچ

کرکے ریاکاری، احسان جتلانے اور ایذا رسانی کے ذریعے اس عمل کو باطل کر دیتے ہیں ان کی حالت ایسی ہی ہے) خدا اس طرح اپنی آیات آشکار کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو (اور سوچ سمجھ کر راہ حق کو پا لو)۔

تفسیر

ایک اور مثال

"ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ ......"

انسان کو روزِ قیامت اعمالِ صالح کی سخت ضرورت ہوگی نیز ریاکاری، احسان جتلانا اور کسی کو تکلیف پہنچانا انفاق اور عملِ صالح کو ضائع کر دیتا ہے یہ مطالب واضح کرنے کے لیے زیرِ نظر آیت میں ایک اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے جس کا ایک سرسبز و شاداب باغ ہو اس میں کھجوروں اور انگور جیسے طرح طرح کے پھل دار درخت ہوں، درختوں کے نیچے پانی بہتا رہتا ہو اور آبیاری کی احتیاج نہ ہو۔ وہ شخص بوڑھا ہو چکا ہو۔ اس کی اولاد ابھی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی زندگی کا دار و مدار اسی باغ پر ہو۔ اب اگر یہ باغ اجڑ جائے تو وہ اور نہ اس کی اولاد اسے آباد نہیں کر سکتے۔ اگر اچانک آتش بار آندھی کے گولے اس باغ پر برسنے لگیں اور اسے جلا کر خاکستر کر دیں تو اس وقت وہ بوڑھا شخص جو جوانی کی توانائیاں کھو چکا ہے اور کسی اور ذریعے سے اپنے اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور کیسی حسرت و غم کی کیفیت سے دوچار ہوگا۔ جو لوگ نیک عمل بجا لاتے ہیں اور پھر ریاکاری، احسان دھرنے اور اذیت دینے سے اسے ضائع کر دیتے ہیں اسی شخص کی طرح ہیں جس نے محنت سے باغ تیار کیا ہو اور جب پھل حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے کام کا نتیجہ بالکل برباد ہو جائے اور اس کے پاس حسرت و اندوہ کے علاوہ کوئی چیز باقی نہ رہے۔

"کذٰلک یبین اللہ لکم الاٰیٰت لعلکم تتفکرون"

تمام بدبختیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ غور و فکر سے کام نہ لیا جائے اس ضمن میں خصوصاً ایسے کام ہیں جو بے وقوف لوگ کرتے ہیں مثلاً احسان جتلانا، جن کا فائدہ بہت کم اور نقصان بڑی تیزی سے اور بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

چند اہم نکات

"واصابہ الکبر ولہ ذریۃ ضعفاء"۔ یعنی باغ کا مالک بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کے بچے ابھی کمزور و ناتواں ہیں۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ خدا میں بخشش کرنا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا خرمے کے باغ کی طرح ہے جس کے پھلوں سے انسان خود بھی بہرہ مند ہوتا ہے اور اس کی اولاد بھی جب کہ ریاکاری، احسان دھرنا اور ایذا رسانی خود انسان کی اپنی محرومیت کا سبب بنتی ہیں اور اس کی آئندہ نسلیں بھی اس سے محرومیت کا شکار ہوتی ہیں حالانکہ انہیں تو ان کے نیک اعمال اور ثمرات کا فائدہ پہنچنا چاہیے تھا۔

یہ بات اِس امر کی بھی دلیل ہے کہ آئندہ نسلیں گذشتہ نسلوں کے اعمالِ نیک کے نتائج میں حصّہ دار ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ آباؤ اجداد اپنے نیک کاموں کی وجہ سے لوگوں کے افکار میں جو ایک محبوبیت اور اعتماد پیدا کر لیتے ہیں وہ اُن کی اولاد کے لئے بھی ایک بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔

"اعصار فیہ نار": یعنی ۔ ہوا کا بگولہ جس میں آگ بھی ہو۔ ممکن ہے یہ اُن بگولوں کی طرف اشارہ ہو جو بلاکم جلانے والی اور خشک کر دینے والی ہوا ہوتی ہے۔ یا پھر اس سے وہ بگولہ مراد ہے جو آگ کے الاؤ سے گزرے اور عام طور پر بگولے کے راستے میں جو چیز آتی ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے اڑتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ آگ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ جا پھینکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاعقہ کے ساتھ پڑنے والے بگولے کی طرف اشارہ ہو جو تمام چیزوں کو خاکستر کر دے۔ بہر حال یہ فوری اور مکمل نابودی کی طرف اشارہ ہے۔ [1]

۲۶۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ○

ترجمہ

۲۶۷۔ اے ایمان والو! پاکیزہ اموال (جو تجارت کے ذریعے) تمہارے ہاتھ آئے ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین (کے خزانوں اور معادن) سے نکالے ہیں خرچ کرو حالانکہ یہ اموال (قبول کرتے وقت) تم چشم پوشی کرتے ہوئے اور ناپسندیدگی کے علاوہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہو اور جان لو کہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

شانِ نزول

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جس نے زمانہ جاہلیت میں سُود کے طور پر دولت جمع کر رکھی تھی اور اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتا تھا۔ خداتعالیٰ نے انہیں اس کام سے روکا اور انہیں حکم دیا کہ وہ پاک اور حلال مال سے خرچ کریں۔

---

[1] لغت میں اعصار کا معنی وہ بگولہ ہے جو ہوا کے چلتے وقت دو مختلف سمتوں سے بنتا ہے اور عمودی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک سرا زمین سے لپٹا ہوتا ہے اور دوسرا سرا فضا میں ہوتا ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو خرچ کرتے وقت خشک، کم مادہ اور غیر مرغوب کھجوریں، اچھی کھجوروں میں ملا کر دیتے تھے۔ اس میں انہیں حکم ہوا کہ اس کام سے اجتناب کریں۔

دونوں شان نزول ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ ممکن ہے یہ آیت دونوں گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو یعنی ایک معنوی پاکیزگی کی طرف اور دوسری ظاہری اور عدم مرغوبیت کے بارے میں ہو۔

لیکن خیال رہے کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۷۵ کے مطابق جن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں سودی ذرائع سے کچھ مال جمع کر لیا تھا اور اس آیت کے نزول کے بعد انہوں نے سود خوری کو جاری رکھنے سے اجتناب کیا مگر گذشتہ مال ان پر حرام نہیں ہوا تھا یعنی یہ قانون گذشتہ اموال کے لیے نہ تھا اور حقیقت میں ان اموال سے مشابہ تھا جو ناپسندیدہ طریقے سے حاصل کئے گئے ہوں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں انفاق کے ثمرات و فوائد اور خرچ کرنے والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں نیز وہ اعمال بھی بتائے گئے ہیں جو انسانی اور خدا پسند کاموں کو آلودہ کر سکتے ہیں اور ان کی جزاء اور ثواب ختم کر سکتے ہیں۔ اب اس آیت میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ کیسے مال کو خرچ کیا جانا چاہیے۔ آیت کے پہلے حصے میں خدا ایماندار لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اموال میں سے "طیبات" کو خرچ کرو۔

ہم جانتے ہیں کہ "طیب" کا لغوی معنی "پاکیزہ" اور "طیبات" اس کی جمع ہے۔ یہ لفظ جیسے ظاہری اور مادی پاکیزگی کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح معنوی اور باطنی پاکیزگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ مال جو عمدہ، مفید اور قیمتی بھی ہے اور ساتھ ساتھ ہر قسم کے شبہ اور آلودگی سے بھی مبرا ہے

دو شان نزول جن کا ذکر کیا گیا ہے آیت کے معنی کی عمومیت کی بھی تائید کرتی ہیں۔

"لستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ" (یعنی۔ تم تیار نہیں ہو کہ غیر طیب مال قبول کرو۔ مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ) یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ مراد صرف ظاہری پاکیزگی ہو کیونکہ اہل انسان نہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ جو مال ظاہری طور پر آلودہ اور بے قیمت ہو اُسے قبول کر لیں اور نہ شبہ والے، ناپسندیدہ اور مکروہ مال کو قبول کرتے ہیں مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ۔

"ومما اخرجنا لکم من الارض"

"ما کسبتم" (جو کچھ تم نے کسب کیا ہے) ــــ یہ لفظ تجارتی اموال کی طرف اشارہ ہے اور "مما اخرجنا......" زراعتی، معدنی اور زیر زمین سرچشموں کی دولت کے بارے میں ہے۔ اس بناء پر تمام طرح کے اموال

کا ذکر آیا ہے کیونکہ تمام انسانی اموال کی بنیاد زمین اور اس کے گوناگوں منابع ہیں ۔ یہاں تک کہ صنعتیں، تجارتیں، جانوروں کا ریوڑ اور ایسی دیگر چیزوں کی بنیاد یہی ہے ۔

ضمناً اس جملے کے مطابق تمام منابع انسان کے اختیار میں دے دیے گئے ہیں ۔ اس لیے راہ خدا میں کسی اچھے مال کو خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھنا چاہیے ۔

"ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باٰخذیه الا ان تغمضوا فیه" :

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ ہمیشہ وہ مال جو بے قیمت ہو اور تقریباً ناقابل استعمال ہو اور خود ان کے لیے کام کا نہ ہو اسے خرچ کرتے ہیں ۔ ایسے مخارج نہ انسان کی اپنی تربیت کا باعث بنتے ہیں اور نہ انسانی روح کی پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے لیے بھی یہ کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتے بلکہ ایسے ان کی ایک طرح سے تحقیر و توہین ہوتی ہے لہٰذا یہ جملہ لوگوں کو صراحت سے اس کام سے منع کر رہا ہے ۔ فرمایا گیا ہے : ایسے مال سے کس طرح خرچ کرتے ہو جب کہ تم خود اسے کراہت و مجبوری کے سوا قبول کرنے کو تیار نہیں ہو ۔ تو کیا تمہارے مسلمان بھائی بلکہ اس سے بڑھ کر وہ خدا جس کی راہ میں خرچ کر رہے ہو تمہاری نگاہ میں خود تم سے بھی کمتر ہیں ۔

آیت درحقیقت ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ جو اخراجات اللہ کی راہ میں ہوتے ہیں ان میں ایک طرف تو حاجتمند، فقراء اور مساکین ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جس کے لیے اخراجات کیے جاتے ہیں ۔ اس حالت میں اگر پست اور بے قیمت مال کا انتخاب کیا گیا تو ایک طرف پروردگار کے مقام بلند کی توہین شمار ہوگی کہ اسے طیب و پاکیزہ اجناس کے لائق نہ سمجھا گیا اور دوسری طرف حاجت مندوں کی تحقیر ہے کیونکہ ممکن ہے تہی دست ہونے کے باوجود وہ ایمان اور انسانیت میں بلند مقام رکھتے ہوں اور وہ ایسے انفاق سے روحانی طور پر آزردہ اور دکھی ہوں ۔

ضمناً اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ "ولا تیمموا" (یعنی ۔ قصد نہ کرو) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اموال انفاق میں اگر نہ جانتے ہوئے کوئی ناپسندیدہ چیز شامل ہوگئی ہے تو اس گفتگو میں اسے شامل نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ گفتگو تو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں ۔

"واعلموا ان الله غنی حمید" :

ارشاد فرمایا گیا ہے : جان لو کہ خداوند عالم بے نیاز اور لائق تعریف ہے یعنی اس امر کی طرف متوجہ رہو کہ اس خدا کی راہ میں خرچ کر رہے ہو جسے تمہارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں اور حمد و ستائش کے لائق وہی ہے جس نے یہ تمام نعمتیں تمہارے اختیار میں دی ہیں ۔

ممکن ہے "حمید" کا معنی "حمد و تعریف کرنے والا" یعنی بے نیاز ہونے کے باوجود جب تم خرچ کرتے ہو تو وہ تمہاری تعریف کرتا ہے ۔ اس لیے اپنے پاکیزہ اموال سے خرچ کرنے کی کوشش کرو ۔

۲۶۸۔ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۸۔ شیطان تمہیں (خرچ کرتے وقت) فقر وفاقہ اور تنگ دستی کے وعدے دیتا ہے اور معصیت (اور برائیوں) کی دعوت دیتا ہے لیکن خدا تم سے مغفرت وبخشش اور اضافے کا وعدہ کرتا ہے اور خدا کی قدرت وسیع ہے اور وہ (ہر چیز کو) جانتا ہے (اس لیے وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا)۔

تفسیر

انفاق کی رکاوٹوں اور شیطانی افکار سے مقابلہ

آیت کا پہلا حصہ کہتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اور زکوٰۃ دیتے وقت شیطان تمہیں فقر وتنگدستی سے ڈراتا ہے۔ خصوصاً جب اچھے اور قابل توجہ اموال خرچ کرنا چاہو جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے (اکثر اوقات یہ شیطانی وسوسہ خرچ کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے بلکہ زکوٰۃ وخمس اور دیگر واجب اخراجات پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کو آگاہ کررہا ہے کہ تنگ دستی کے خوف سے انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے بچنا غلط فکر اور شیطانی وسوسہ ہے اور ممکن ہے انسان کی نظر میں ہو کہ یہ خوف اگرچہ شیطان کی طرف سے ہے پھر بھی ایک منطقی خوف تو ہے لہٰذا بلا فاصلہ فرماتا ہے "ویامرکم بالفحشاء" شیطان تمہیں معصیت اور گناہ کا حکم دیتا ہے، اس لیے فقر وفاقہ اور تہی دستی سے ڈرنا ہر حالت میں غلط ہے کیونکہ شیطان باطل اور گمراہی کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔ اصولی طور پر ہر منفی، مانع اور کوتاہ فکری بنیاد فطرت سے انحراف اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے لیکن ہر مثبت، اصلاحی، محرک اور بلند فکر کا سرچشمہ خدائی الہامات اور خدا داد پاک فطرت ہے۔

اگر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ شیطانی وسوسے قوانین فطرت اور سنت الٰہی کے برخلاف ہیں تو یہ واضح ہوجائے گا کہ ان کا نتیجہ منفی اور نقصان وبدبختی پر مبنی ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروردگار عالم کے فرامین خلقت وفطرت سے ہم آہنگ اور اس کے ہم دوش ہیں اور ان کا نتیجہ سعادت بخش زندگی ہے۔

وضاحت یہ ہے کہ پہلی نظر میں انفاق اور مال خرچ کرنا، مال کم کرنے کے سوا کچھ نہیں اور یہی کوتاہ بینی کا شیطانی نظریہ

بے یقین وقت نظر اور وسعت نگاہ سے دیکھا جائے تو انفاق معاشرت کی بقا کا ضامن، عدالتِ اجتماعی کے قیام کا ذریعہ، طبقاتی فاصلوں کو کم کرنے کا سبب اور پورے معاشرے اور عام لوگوں کی پیش رفت کا ذریعہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ معاشرے کی اجتماعی پیش رفت سے افراد کو رفاہیت اور آسائش و آرام میسر آئے گا اور یہی حقیقت شناسی کا الٰہی نظریہ ہے۔

قرآن اس ذریعے سے مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ انفاق اگرچہ ظاہری طور پر تم سے کسی چیز کو کم کر دیتا ہے لیکن درحقیقت تمہارے سرمائے میں معنوی اور مادی ہر دو لحاظ سے بہت سی چیزوں کا اضافہ کر دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں اور تقسیمِ دولت میں عدمِ اعتدال کی وجہ سے انسانی سرمائے کی پامالی کی جو صورت پیدا ہو چکی ہے اس کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت کے معنی کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ انفاق اور فحش و قبیح امور کے درمیان ایک خاص ربط ہے البتہ فحشاء سے بخل مراد لیا جائے تو پھر اس کا ترکِ انفاق سے ربط یوں ظاہر ہوگا کہ اس طرح آہستہ آہستہ انسان میں صفتِ بخل پیدا ہو جائے گی جو بدترین صفات میں سے ایک ہے اور اگر فحشاء کا معنی مطلق گناہ یا جنسی برائیاں لیا جائے تب بھی ترکِ انفاق سے اس کا ربط کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ بہت سے گناہ، آلودگیوں اور خود فروشیوں کا سرچشمہ فقر و فاقہ اور تنگ دستی ہے۔ علاوہ ازیں انفاق ایک معنوی آثار و برکات کے سلسلے کا بھی حامل ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"واللّٰہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا":

تفسیر "مجمع البیان" میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

> انفاق کرتے وقت دو چیزیں خدا کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا کی طرف سے گناہوں کی بخشش اور وسعتِ مال ہے اور شیطان کی طرف سے فقر و تنگ دستی کا وعدہ اور فحشاء و منکر کا حکم دیتا ہے۔

اس بناء پر مغفرت سے مراد گناہوں کی بخشش ہے اور فضل سے مراد جیسا کہ ابنِ عباس سے منقول ہے انفاق کے ذریعے سرمائے میں اضافہ ہے۔

ایک بات کی طرف اور توجہ رہے اور وہ یہ کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

> جب سختی اور تنگ دستی میں مبتلا ہو جاؤ تو انفاق کے ذریعے خدا سے معاملہ کرو (یعنی انفاق کرو تاکہ تنگ دستی سے نجات پا جاؤ)۔ [1]

"واللّٰہ واسع علیم":

یہ جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ وسیع قدرت اور لامتناہی علم رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے وعدہ پر عمل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے وعدے پر یقین کرنا چاہیے نہ کہ فریب کار اور ناتواں شیطان کے وعدے پر جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچ

[1] "نہج البلاغہ"

نے جاتا ہے۔ چونکہ وہ مستقبل سے آگاہ نہیں ہے اور قدرت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کا وعدہ گمراہی اور نادانی کی تشویق کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۲۶۹۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ○

ترجمہ

۲۶۹۔ حکمت و دانش جسے چاہتا ہے (اور اہل دیکھتا ہے) عطا کرتا ہے اور جسے حکمت و دانش دی گئی اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور عقلمندوں کے سوا (ان حقائق کو) کوئی نہیں پا سکتا (اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے)

تفسیر

لفظ "حکمت" کے بہت سے معانی بیان کیے گئے ہیں، مثلاً "جہان ہستی کی معرفت و شناخت" "حقائق قرآن کا علم" "گفتار و کردار کے لحاظ سے حق تک پہنچنا" اور "خدا کی معرفت و آشنائی" وغیرہ۔ یہ سب معانی ایک وسیع مفہوم میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کی گذشتہ آیات سے مناسبت یہ ہے کہ بعض افراد کو خدا تعالیٰ ان کی پاکیزگی اور کوشش کی وجہ سے ایک علم و آگاہی عطا کرتا ہے جس کی بنا پر وہ نہایت عمدہ طریقے سے معاشرے میں انفاق کے فوائد و آثار اور نقوش حیات کا ادراک کر لیتے ہیں اور خدائی الہامات اور شیطانی وساوس میں فرق کو جان لیتے ہیں دوسرے لفظوں میں گذشتہ آیت میں چونکہ اس بات پر گفتگو تھی کہ خدا تعالیٰ انفاق کے نتیجے میں بخشش و برکت کا وعدہ کرتا ہے اور شیطان انسان کے دل میں فقر و فاقہ کا وسوسہ پیدا کرتا ہے اس لیے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکمت ہی ایسی چیز ہے جو خدائی اور شیطانی وعدوں میں فرق کر سکتی ہے اور گمراہ کرنے والے وسوسوں سے نجات بخشتی ہے۔

واضح ہے کہ "من یشاء" (جسے وہ چاہتا ہے) سے یہ مراد نہیں کہ حکمت و دانش بغیر کسی وجہ سے اسے یا اُسے دی جاتی ہے بلکہ خدا کی مشیت و ارادہ تمام امور میں حکمت سے منسلک ہے۔ یعنی جس شخص کو وہ اہل سمجھتا ہے اُسے دیتا ہے اور اس حیات بخش، صاف و شفاف اور شیریں سرچشمے سے سیراب کرتا ہے۔

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا":

حکمت بخشنے والا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن اس جملے میں اس کا نام نہیں لیا گیا، صرف یہ فرمایا گیا ہے: جس کسی کو حکمت دی جاتی ہے اسے بہت سی خیر دی گئی ہے۔ اور جس طرف سے بھی اس کے خیر ہونے میں کوئی فرق نہیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس جملے میں فرمایا گیا ہے کہ جسے دانش و حکمت دی گئی ہے، اسے بہت سی خیر و برکت

لگئی ہے۔ مطلق "خیر" نہیں کہا گیا کیونکہ خیر و سعادت صرف دانش و حکمت میں نہیں ہے بلکہ حکمت اس کا ایک اہم عامل ہے۔

"وما یذکر الا اولوا الالباب":

"تذکر" کا معنی ہے "یاد آوری" اور "روح میں علوم اور دانائیوں کی حفاظت" "اَلْبَاب" "لب" کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے "مغز" چونکہ ہر چیز کے بہترین اور بنیادی حصے کو مغز کہتے ہیں اس لیے عقل و خرد کو "لب" کہا جاتا ہے اس جملے میں کہا گیا ہے کہ صرف صاحبان عقل و خرد ہی ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں، دوسروں کو یاد دلاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ (دیوانوں کے علاوہ) سب لوگ صاحب عقل ہیں لیکن سب کو "اولوالالباب" نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عقل و خرد کو کام میں لاتے ہیں اور اس چراغ پُر فروغ کے ذریعے راہ حیات پا لیتے ہیں۔

۲۷۰۔ وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ‌ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ○

ترجمہ

۲۷۰۔ جو چیز خرچ کرتے ہو! (جن اموال کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی) نذر کرتے ہو خدا انہیں جانتا ہے اور ستمگروں کا کوئی یار و مددگار نہیں۔

تفسیر

آیت کہتی ہے: راہ خدا میں جو کچھ خرچ کرو وہ واجب ہو یا غیر واجب، کم ہو یا زیادہ .... حلال طریقے سے حاصل شدہ ہو یا حرام سے، خلوص سے ہو یا ریاکاری سے، احسان جتلا کر ہو یا ایذا پہنچا کر یا اس کے بغیر، ایسے اموال میں سے جنہیں خرچ کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے یا انسان نے نذر کے ذریعے اپنے اوپر واجب کر لیا ہو۔ غرض جس طرح کا بھی ہو خدا اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے اور اس کی جزا اچھی ہو یا بُری، ضرور دے گا۔

"وما للظالمین من انصار":

یہ جملہ کہتا ہے: ستمگروں اور ظالموں کا کوئی یار و یاور نہیں۔ یعنی جو لوگ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے ذریعے محروموں اور تہی دستوں کو مصیبت سے نجات دلاتے ہیں یا ایسے کاموں میں مال صرف کرتے ہیں جو اجتماعی مفاد میں ہو اور عام لوگوں کی رفاہ و آسائش کے لیے ہو تو ان کے لیے یہ اخراجات پشت پناہ اور قوی مددگار ثابت ہوں گے جب کہ بخیل سرمایہ دار یا ریاکاری و مردم آزاری کے ساتھ خرچ کرنے والے اس یار و یاور سے محروم ہوں گے۔

ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے دن کے لیے جو سزائیں ریاکاروں، بخیلوں، احسان دھرنے

والوں اور لوگوں کو اذیت پہنچانے والوں کے انتظار میں ہیں ان سے بچانے کے لیے کوئی بھی ان کی حمایت اور شفاعت نہیں کرے گا۔ یہ ظالم وہ ہیں جنہوں نے عوام کے حقوق پامال کیے ہیں اس لیے کوئی اُس عظیم عدالت میں ان کا دفاع نہیں کرے گا۔

ہر ظلم اور ہر ستم کا یہی اثر ہے چاہے وہ جس چہرے اور جس شکل میں ہو۔

۲۷۱۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۷۱۔ اگر انفاق اور صدقات کھلے بندوں کرو تو اچھا ہے اور اگر مخفی طور پر کرو تو حاجتمندوں کو دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور ایسا کرنا تمہارے کچھ گناہوں کو چھپا دیتا ہے (اور راہ خدا میں بخشش کرنے کے ذریعے تم بخشے جاؤ گے) اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خرچ کیسے کرنا چاہیے

اس میں شک نہیں کہ راہ خدا میں اعلانیہ یا مخفی طور پر خرچ کرنے میں سے ہر ایک مُفید اثر رکھتا ہے کیونکہ انسان جب آشکار اور اعلانیہ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتا ہے تو اگر وہ واجب خرچ ہے تو قطع نظر اس کے کہ اس سے ایسے نیک کاموں کا لوگوں میں شوق پیدا ہوتا ہے انسان اس تہمت سے بھی بچتا ہے کہ اس نے واجب ذمہ داری پوری نہیں کی اور اگر یہ انفاق مستحب ہے تو حقیقت میں ایک طرح کی عملی تبلیغ ہے جو اچھے کام کرنے، محروموں کا ساتھ دینے اور اجتماعی مفاد کے لیے نیک کام کرنے کی تشویق کا باعث ہے۔

دوسری طرف اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو یقیناً اس میں ریاکاری اور خود نمائی کمتر ہوگی اور اس میں خلوص زیادہ ہوگا خصوصاً محروم انسانوں کی مدد کے بارے میں یہ طرزِ عمل بہتر ہے کیونکہ اس طرح ان کی عزت و آبرو بہتر طور پر محفوظ رہ سکے گی۔

انہی پہلوؤں کے پیش نظر آیت میں ان ہر دو طریقوں کو ذیل جگہ پر اچھا اور شائستہ قرار دیا گیا ہے

مخفی طور پر خرچ کرنے کے بارے میں اس حکم پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ صرف مستحب اخراجات کے لیے ہے۔ واجب انفاق مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی تو ہمیشہ آشکار اور اعلانیہ ہی بہتر ہے لیکن مسلم ہے کہ دونوں احکام (اظہار اور اخفاء) میں سے کوئی بھی عمومی اور سب کے لیے ایک جیسا پہلو نہیں رکھتے بلکہ حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جب کہ تشویق زیادہ موثر

ہو اور خلوص پر زد بھی نہ پڑتی ہو تو اظہار کرنا بہتر ہے۔ بعض اوقات آبرومند افراد سے ایسا معاملہ درپیش ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا تقاضا ہے کہ انفاق مخفی طور پر انجام پائے اور ریاکاری اور عدمِ خلوص کا خوف بھی ہے تو وہاں اسے مخفی ہی رکھنا چاہیے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

> واجب زکوٰۃ اپنے مال سے آشکار طور پر الگ کرلو اور کھلے بندوں خرچ کرو۔ لیکن مستحب انفاق مخفی ہو تو بہتر ہے۔ [1]

جو کچھ ہم نے کہا ہے ایسی احادیث اس سے متضاد نہیں کیونکہ واجبات کی ادائیگی میں ریا کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذمہ داری اور فریضہ ہوتی ہے اور اسلامی ماحول میں ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ اسے ادا کرے اور یہ یقینی اموال کی حیثیت سے ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اس بناء پر ان کا اظہار بہتر ہے اور مستحبی انفاق میں چونکہ لازمی ہونے کا پہلو نہیں تو ممکن ہے اس کا اظہار خلوصِ نیت کو نقصان پہنچائے لہٰذا اسے مخفی طور پر انجام دینا زیادہ مناسب ہے۔

"ویکفر عنکم من سیاٰتکم":

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنا گناہوں کی بخشش کے لیے بہت مؤثر ہے کیونکہ حکمِ انفاق کے بعد اس جملے میں فرمایا گیا ہے: اور تمہارے گناہوں کو چھپاتا ہے۔

البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تھوڑے سے انفاق کی وجہ سے سب گناہ بخش دیے جائیں گے بلکہ یہاں "من" استعمال ہوا ہے جو عام طور پر کچھ حصے کے لیے "تبعیض" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کچھ گناہوں کو چھپاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انفاق کی مقدار اور خلوص کے معیار سے وابستہ ہے۔

اس بارے میں کہ انفاق سببِ بخشش ہے، اہل بیتؑ کے ذرائع سے اور اہل سنت کے طرق سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

> پوشیدہ طور پر خرچ کرنا غضبِ خدا کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اس طرح یہ انسان کے گناہ ختم کر دیتا ہے۔ [2]

ایک اور روایت میں ہے:

> سات اشخاص ایسے ہیں جن پر قیامت کے دن خدا اپنے لطف کا سایہ کرے گا جب کہ اس دن اس کے سایۂ لطف کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اور وہ سات اشخاص یہ ہیں:

۱۔ عادل راہنما۔

۲۔ وہ جوان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پروان چڑھتا ہے۔

---

[1] "الزکوٰۃ المفروضۃ تخرج علانیۃ وتدفع علانیۃ وغیر الزکوٰۃ ان دفعہ سرًا فھو افضل"۔ (تفسیر مجمع البیان نقل از علی بن ابراہیم)۔ [2] (صدقۃ السر تطفیٔ غضب الرب وتطفیٔ الخطیئۃ کما یطفیٔ الماء النار۔)

۳۔ وہ شخص جس کا دل مسجد سے پیوستہ ہے۔

۴۔ وہ اشخاص جو ایک دوسرے کو خدا کے لیے دوست رکھتے ہیں، محبت والفت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور محبت ہی سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

۵۔ وہ شخص جسے خوبصورت اور قدر و منزلت کی حامل عورت دعوتِ گناہ دے اور وہ کہے: میں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔

۶۔ وہ شخص جو اس طرح مخفی طور پر انفاق کرتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں نے انفاق کیا ہے۔

۷۔ وہ شخص جو اکیلا یادِ خدا میں محو ہو اور اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو گر رہے ہوں۔ [1]

"واللّٰہ بما تعملون خبیر"

اس جملے کا معنی ہے کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو ظاہراً ہو یا پوشیدہ، خدا جانتا ہے۔ اسی طرح وہ تمہاری نیتوں سے بھی آگاہ ہے کہ اظہار و اخفاء کس مقصد کے لیے انجام دیتے ہو۔

بہر حال انفاق میں جو چیز مؤثر ہے وہ عمل میں پاکیزہ نیت اور خلوص ہے۔ لوگوں کا جاننا یا نہ جاننا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم چیز خدا کا جاننا ہے کیونکہ انسان کے اعمال کی جزا دینے والا وہی ہے۔ وہ اعمال مخفی ہوں چاہے آشکار۔

۲۷۲۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۲۔ (جبر سے) اُن کی ہدایت کرنا تمہارے ذمے نہیں ہے (اس بناء پر غیر مسلموں کو اسلام لانے پر

---

[1] "سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل الا ظله الامام العدل والشاب الذي نشأ في عبادة الله تعالى ورجل قلبه يتعلق بالمساجد حتى يعود اليها، ورجلان تحابا في الله و اجتمعا عليه وتفرقا عليه، ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال اني اخاف الله تعالى، ورجل تصدق فاخفاها حتى لم تعلم يمينه ما تنفق شماله ورجل ذكر الله خاليا ففاضت عيناه"۔

مجبور کرنے کے لیے ان پر خرچ نہ کرنا صحیح نہیں ہے) لیکن خدا جسے چاہتا ہے (اور وہ اہلیت رکھتا ہے تو) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم اچھی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو وہ تمہارے ہی لیے ہے (لیکن) اللہ کی رضا کے سوا خرچ نہ کرو اور اچھی چیزوں میں سے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اجازت دی گئی کہ ضروری مواقع پر یہ کام انجام دیں۔

اس آیت کے بارے میں ایک اور شانِ نزول بھی منقول ہے جو پہلی شانِ نزول سے غیر مشابہ نہیں ہے اور یہ کہ اسماء ایک مسلمان عورت تھی۔ عمرۃ القضاء کے سفر میں وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھی۔ اس کی ماں اور دادی اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچیں انہوں نے اس سے مدد مانگی۔ چونکہ وہ دونوں مشرک اور بت پرست تھیں اس لیے اسماء نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: ضروری ہے کہ پہلے پیغمبر اکرمؐ سے اجازت حاصل کر لوں۔ کیونکہ تم میرے دین کی پیرو نہیں ہو۔ اس کے بعد وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئی اور اجازت چاہی۔ اس پر محلِ بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

"لیس علیک ھدٰھم" یعنی۔ تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو۔

اس جملے میں پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور گذشتہ آیات سے اس کا ربط واضح ہے کیونکہ گزشتہ آیت میں کلی طور پر انفاق کا ذکر ہے اور یہ آیت غیر مسلموں پر اس معنی میں خرچ کرنے کی تشریح کرتی ہے کہ غیر مسلم فقراء و مساکین پر اس مقصد کے لیے خرچ نہ کرنا کہ وہ فقر و فاقہ کی سختی سے اکتا کر اسلام قبول کر لیں اور ان کی ہدایت ہو جائے، یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے اس دنیا میں خدائی بخشش اور نعمتیں (بلا تفریق دین و آئین) سب انسانوں کے لیے ہیں مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ جب مستحب انفاق کریں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں تو ضروری مواقع پر غیر مسلموں کی حالت کا بھی خیال رکھیں۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب غیر مسلموں پر خرچ کرنا انسانی مدد کے طور پر ہو۔ کفر کی تقویت اور اسلام دشمنوں کی منحوس سازشوں کی پیش رفت کا سبب نہ بنے بلکہ انہیں اسلام کی روح انسان دوستی سے آگاہی کا ذریعہ بنے۔

یہ جو پیغمبر اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو، واضح ہے کہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ارشاد و تبلیغ آپؐ کا فریضہ اور ذمہ داری نہیں۔ کیونکہ ارشاد و تبلیغ تو پیغمبر کے واضح ترین اور بنیادی ترین پروگرام کا حصہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آپؐ کا فریضہ نہیں کہ ان پر سختی کریں اور انہیں ہدایت پر مجبور کریں۔ دوسرے لفظوں میں مراد جبری ہدایت کی نفی ہے اختیاری ہدایت کی نہیں یا مراد ہدایت تکوینی کی نفی ہے، ہدایت تشریعی کی نہیں۔ اس کی وضاحت ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ہدایت کی اقسام

ہدایت کی بہت سی قسمیں ہیں۔

۱ ۔ **ہدایت تکوینی** :۔ ہدایت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ خدا نے مختلف موجودات عالم مثلاً انسان اور دیگر جاندار بلکہ بے جان موجودات کے ارتقاء اور تکامل کے لیے عوامل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے۔ شکم مادر میں بچے کا رشد و تکامل مختلف اجناس اور نباتات کے دانوں کی زمین کے اندر پیش رفت اور نشوونما، نظام شمسی کے مختلف کرات کی اپنے مدار میں حرکت اور اس قسم کی دیگر چیزیں ہدایت تکوینی کے مختلف نمونے ہیں۔ ایسی ہدایت خدا سے مخصوص ہے اور اس کے طبیعی و ماوراء طبیعی عوامل واسباب ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

"الذی اعطی کل شیء خلقه ثم ھدی"۔

وہ خدا جس نے ہر موجود و مخلوق کو اس کی مخصوص خلقت عطا کی اور اس کے بعد اسے ہدایت کی۔ (طٰہٰ - ۵۰)

۲ ۔ **ہدایت تشریعی** :۔ اس ہدایت سے مراد ہے تعلیم و تربیت، مفید قوانین، عادلانہ حکومت اور پند و نصیحت کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کرنا۔ یہ ہدایت انبیاء، مرسلین، آئمہ معصومینؑ، صالحین اور ہمدرد مربیین کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ قرآن میں بارہا اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے

"ذٰلک الکتٰب لا ریب فیه ھدی للمتقین"۔

اس عظیم کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں اور یہ پرہیزگاروں کی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ سورۃ بقرۃ: آیۃ ۲۔

۳ ۔ **وسیلے کی فراہمی** :۔ ہدایت کا ایک معنی وسیلہ اور ذریعہ فراہم کرنا بھی ہے۔ ایسی ہدایت کو کبھی توفیق بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو ضروری وسائل فراہم کر دیے جائیں تاکہ وہ اپنی رضا و رغبت سے اپنی پیش رفت کے لیے ان سے استفادہ کر سکیں۔ مثلاً مدرسہ، مسجد اور دیگر تربیتی مراکز قائم کرنا، ضروری پروگرام اور کتب مہیا کرنا اور لائق و اہل مبلغین اور معلمین کی تربیت کرنا۔ یہ سب امور ہدایت کی اس قسم میں شامل ہیں۔ دراصل ہدایت کی یہ قسم ہدایت تکوینی اور ہدایت تشریعی کے درمیان حد فاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"۔

اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور کوشش کرتے ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔ (عنکبوت - ۶۹)

۴ ۔ **نعمتوں اور جزاء و ثواب کی طرف ہدایت** : اس ہدایت سے مراد ہے دوسرے جہاں میں اہل ایمان کو ان کے نیک اعمال کے نتائج سے بہرہ مند کرنا۔ ایسی ہدایت اہل ایمان اور اعمال صالح بجا لانے والے افراد سے مخصوص ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"سیھدیھم ویصلح بالھم"۔

خدا انہیں ہدایت کرتا ہے اور ان کی حالت کی اصلاح کرتا ہے۔ (محمد : ۵)

آیت میں یہ جملہ راہِ خدا میں شہید ہونے والوں کی فداکاری کے ذکر کے بعد آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت صرف دوسرے جہان میں اُن کے اپنے عمل کے اچھے نتائج سے بہرہ مند ہونے سے مربوط ہے۔

واقع میں یہ چار قسم کی ہدایت ایک ہی حقیقت کے مختلف مراحل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پہلے کے بعد اگلا مرحلہ ہے۔

سب سے پہلے ہدایت تکوینی ہے جو انسان کی تلاش میں آتی ہے اور عقل و فکر اور دوسرے قویٰ اس کے اختیار میں دے دیتی ہے۔

پھر انبیاء کی ہدایت اور راہنمائی شروع ہوجاتی ہے اور وہ لوگوں کو راہِ حق کی ہدایت کرتے ہیں اس کے بعد جب لوگ اگلے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں تو توفیق الٰہی اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ اُن کے لیے راستے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح وہ تیسرے مرحلے کو طے کرتے ہیں۔

آخر میں دارِ آخرت ہے جہاں لوگ اپنے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہوں گے۔

ان چار اقسام میں سے ارشاد، تبلیغ انبیاء اور آئمہ ہدیٰ کے حتمی فرائض میں سے ہے اور تیسری قسم میں یہ جو راستہ ہموار کرنا کہا گیا ہے۔ یہ انبیاء و آئمہ کی حکومت الٰہی کے پروگراموں کا جزء ہے۔ آخری اور پہلی قسم ذات خدا سے مخصوص ہے۔

اس بناء پر قرآن میں جہاں کہیں پیغمبر اکرمؐ سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد دوسری اور تیسری قسم کی ہدایت نہیں ہے۔

"ولٰکن اللہ یھدی من یشآء"

یعنی خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے لیکن یہ مسلّم ہے کہ پروردگارِ عالم کی طرف سے ہدایت حساب و کتاب اور حکمت و دانش کے بغیر نہیں یعنی ایسا نہیں کہ وہ کسی کو بلاوجہ ہدایت دے دے اور دوسرے کو محروم رکھے۔

زیر نظر آیت سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو یہ جو ریاکاری، احسان جتلانے اور آزار پہنچانے سے منع رہنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے اس کے باوجود اگر پھر لوگ اپنے آپ کو ان امور سے آلودہ کریں تو تم پریشان نہ ہونا۔ تمہاری ذمہ داری فقط احکام بیان کرنا اور ایک صحیح اجتماعی ماحول پیدا کرنا ہے۔ اس کے تم ہرگز ذمہ دار نہیں ہو کہ انہیں مجبور کرو۔ واضح ہے کہ یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت سے دونوں مفاہیم حاصل کیے جائیں۔

انفاق کرنے والوں پر اس کے اثرات

"وما تنفقوا من خیر فلانفسکم":

آیت کے اس حصے میں فرمایا گیا ہے کہ انفاق کے فوائد کی بازگشت خود تمہاری طرف ہے۔ اس میں انفاق کرنے والوں کو اس انسانی عمل کی تشویق دلائی گئی ہے۔ مسلّم ہے کہ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کے کام کا نتیجہ اور فائدہ خود اسی کو حاصل ہوگا تو اس کا دل زیادہ اس کام میں لگے گا۔

ممکن ہے بادی النظر میں یہ معلوم ہو کہ انفاق کے منافع کی بازگشت سے مراد اس کی اُخروی جزا اور اس کے اُخروی نتائج ہیں۔ یہ مفہوم اگرچہ صحیح ہے لیکن ایسا نہیں کہ انفاق کا فائدہ فقط آخرت میں حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دنیا میں

بھی اس کے مادی اور معنوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

معنوی لحاظ سے انفاق کرنے والے میں عفو و بخشش، ایثار، دوستی اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور حقیقت میں یہ انسان کے تکامل اور اس کی روح کے ارتقاء کے لیے ایک موثر تربیتی ذریعہ ہے۔

مادی لحاظ سے دیکھا جائے تو معاشرے میں محروم اور بے نوا لوگوں کی موجودگی خطرناک دھماکوں کا سبب ہوتی ہے اور یہ دھماکے بعض اوقات اصل ملکیت کو ختم کر دیتے ہیں، تمام دولت اور سرمایے کو نگل جاتے ہیں اور نابود کر دیتے ہیں۔

انفاق اور خرچ کرنے سے مختلف طبقات میں تفاوت میں کمی آتی ہے اور طبقاتی کش مکش کی وجہ سے معاشرے کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں انفاق کے ذریعے ٹل جاتے ہیں۔ انفاق غیظ و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور محروم طبقوں کے جلا دینے والے شعلوں کو بجھا دیتا ہے اور ان میں سے انتقام کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔

اس بناء پر انفاق اجتماعی اہمیت، اقتصادی سالمیت اور مختلف دیگر مادی و معنوی پہلوؤں کے پیش نظر خود خرچ کرنے والوں کے فائدے میں ہے۔

"وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله":

یعنی مسلمان اپنے اموال خوشنودی خدا کی طلب کے علاوہ خرچ نہیں کرتے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، ممکن ہے کہ جملہ خبریہ یہاں نہی کے معنی میں ہو یعنی لوگوں کو انفاق نہیں کرنا چاہیئے مگر یہ کہ خدا کی رضا کے لیے ہو اور انفاق صرف اس صورت میں سودمند اور مفید ہے جب خدا کی خاطر انجام پذیر ہو۔

وجہ اللہ کا مفہوم

"وجہ" کا لغوی معنی ہے "چہرہ"۔ بعض اوقات یہ "ذات" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بناء پر "وجہ اللہ" کا معنی ہوا "ذات خدا"۔

انفاق کرنے والوں کی نظر میں پروردگار کی ذات پاک ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ "وجہ" اس آیت میں اور ایسی دیگر آیات میں ایک طرح کی تاکید کا حامل ہے کیونکہ "ذاتِ خدا کے لیے" میں "خدا کے لیے" کی نسبت زیادہ تاکید ہے یعنی حتمی طور پر خدا کے لیے ہو کسی اور کے لیے نہ ہو۔

علاوہ ازیں انسان کا چہرہ اس کے ظاہری بدن کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ قوت بصارت، قوت سماعت اور قوت گویائی اسی حصے میں موجود ہیں۔ اس لیے جب لفظ "وجہ" استعمال ہو تو وہ اہمیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں بھی خدا کے بارے میں یہ لفظ بطور کنایہ استعمال ہوا ہے اور واقع میں اس سے ایک طرح کا احترام اور اہمیت ظاہر ہو رہی ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ خدا تعالیٰ جسم رکھتا ہے نہ کوئی اس کا چہرہ ہے۔

"وما تنفقوا من خير يوف اليكم وانتم لا تظلمون":

آیت کے اس حصے میں سابق مفہوم کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یہ گمان نہ کرو کہ انفاق سے

تمہیں صرف تھوڑا سا فائدہ پہنچے گا بلکہ جو کچھ تم خرچ کرو گے سب تمہاری طرف پلٹ آئے گا اور تم پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا اس لیے انفاق کرتے وقت ہاتھ اور دل کھلا رکھو۔

ضمنی طور پر یہ جملہ تجسّمِ اعمال کے مسئلہ پر بھی دلیل ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق: جو تم خرچ کرو گے وہی چیز تمہیں واپس کردی جائے گی۔

۲۷۳۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۷۳۔ (تمہارا انفاق خاص طور پر ایسے لوگوں کے لیے ہونا چاہیے) جو حاجت مند ہوں اور راہِ خدا میں محصور ہو چکے ہوں (دین خدا کی طرف ان کی رغبت کی وجہ سے وہ بے وطن ہو گئے ہوں اور جہاد میں شرکت کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہ رہا ہو کہ وہ کسب و تجارت کے ذریعہ اپنے اسباب زندگی فراہم کر سکیں) سفر نہ کر سکتے ہوں (کہ سفر کے ذریعے روزگار مہیا کر سکیں اور ان کی خودداری کی وجہ سے بے خبر لوگ انہیں دولت مند اور تونگر سمجھتے ہیں لیکن تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان لوگے اور وہ اصرار کر کے ہرگز لوگوں سے کوئی چیز طلب نہیں کرتے (یہ ان کی نشانیاں ہیں) اور ہر اچھی چیز جو تم راہِ خدا میں خرچ کرو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

امام باقرؑ سے منقول ہے کہ یہ آیت اصحابِ صُفّہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے[1]۔ مسجد میں ان کی رہائش چونکہ مسجد کے احترامات کے منافی تھی لہٰذا انہیں حکم دیا گیا کہ مسجد سے باہر صُفّہ[2] میں منتقل ہو جائیں۔ اس صورت حال پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اپنے ان بھائیوں کو ہر ممکنہ امداد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

---

[1] اصحابِ صفہ: یہ تقریباً چار سو افراد تھے۔ ان کا تعلق مکہ اور اطراف مدینہ سے تھا۔ مدینہ میں ان کا کوئی گھر اور کوئی رشتہ دار نہ تھا اس لئے انہوں نے مسجد نبوی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انہوں نے ہر اسلامی جہاد میں شرکت کے لیے اپنی آمادگی کا اعلان کر رکھا تھا۔

[2] صُفّہ۔ بڑے اور وسیع برآمدے کو کہتے ہیں۔

تفسیر

انفاق کا بہترین موقع

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے انفاق کے لیے بہترین موقع بیان کیا ہے۔ جن پر خرچ کیا جانا چاہیے ان لوگوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں :

۱۔ الذین احصروا فی سبیل اللہ : یعنی وہ لوگ جو اہم کاموں مثلاً جہاد، دشمن سے مقابلہ، فنونِ جنگ کی تعلیم اور ضروری علوم کی تحصیل میں معروف ہیں اور اس وجہ سے اپنی زندگی کے اسباب مہیا نہیں کر سکتے۔ جیسا اصحاب صُفّہ، جو اس کے واضح مصداق تھے۔

۲۔ لا یستطیعون ضربا فی الارض : وہ اسباب زندگی کی تلاش میں سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ شہروں، بستیوں اور ایسے علاقوں میں جائیں جہاں اللہ کی نعمتیں فراواں ہیں۔ اس لیے جو لوگ اسباب زندگی مہیا کر سکتے ہیں وہ سفر کی مشقت اور تکلیف برداشت کریں اور دوسروں کے دست و بازو کی کمائی پر ہرگز نہ بیٹھے رہیں۔ ہاں البتہ کسی زیادہ اہم کام کی وجہ سے وہ لوگ رک جائیں مثلاً جہاد جو رضائے الٰہی کا محل و مقام ہے۔

۳۔ یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف : یعنی جو لوگ ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان کی خودداری، عزت نفس اور پاکدامنی کی وجہ سے گمان کرتے ہیں کہ یہ غنی اور کسی کی امداد سے بے نیاز ہیں۔

۴۔ تعرفھم بسیماھم : "سیما" لغت میں "علامت" اور "نشانی" کے معنی میں ہے۔ یعنی اگرچہ وہ اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کہتے لیکن ان کے چہرے پر داخلی دکھ درد کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں جو باشعور افراد کے لیے واضح ہوتی ہیں۔ ان کے رخساروں کا رنگ ان کے اندرونی راز کی خبر دیتا ہے۔

۵۔ لا یسئلون الناس الحافا : مراد یہ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیروں کی طرح کسی سے سوال نہیں کرتے یعنی وہ تو اصولی طور پر سوال کرتے ہی نہیں چہ جائیکہ وہ سوال میں اصرار یا تکرار کریں۔ دوسرے لفظوں میں پیشہ ور فقیروں کا معمول ہے کہ وہ سوال پر اصرار کرتے ہیں لیکن وہ بالعموم ضرورت مند اور حاجتمند نہیں ہوتے۔

یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیر نہیں ہوتے کہ سوال کرتے پھریں۔ اس بناء پر اس جملے کا آیت کے ابتدائی جملے سے کوئی اختلاف نہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی علامت سے پہچانے جاتے ہیں نہ کہ سوال کے ذریعے۔

آیت میں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر شدید حالتِ اضطرار کے باعث وہ سوال پر مجبور بھی ہو جائیں تو کبھی سوال پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اپنی حاجت کو بہایت احسن طریقے سے اپنے مسلمان بھائیوں کے گوش گزار کرتے ہیں۔

وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم : یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو شوق دلانے

کے لیے ہے۔ خصوصاً ایسے افراد پر خرچ کرنا جو صاحب عزت نفس اور عالی مزاج ہیں کیونکہ جب خرچ کرتے وقت کسی کو یہ خیال ہو کہ جو کچھ وہ راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے چاہے مخفی طور پر ہے لیکن خدا تعالیٰ اس سے آگاہ ہے اور اسے اس کے عمل کے ثمرات سے بہرہ مند کرے گا تو وہ زیادہ لگاؤ اور انہماک سے یہ عظیم خدمت سرانجام دے گا۔

۲۷۴۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۴۔ وہ لوگ جو شب و روز اپنے اموال پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، اُن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

ہر صورت میں خرچ کرنا

بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے ایک درہم رات کو، ایک دن کو، ایک چھپا کر اور ایک ظاہر بظاہر خرچ کیا تھا۔[1]

لیکن قرآن کا حکم حسب معمول ایک عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں انفاق کے طور طریقوں اور مختلف کیفیات کی تشریح کی گئی ہے اور انفاق کرنے والوں کی ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ظاہر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرتے وقت اخلاقی و اجتماعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے اس کی شخصی حیثیت کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

جس مقام پہ حاجتمندوں کی حفاظت آبرو اور زیادہ خلوص متقتضی ہو کہ انفاق کو پوشیدہ رکھا جائے وہاں پوشیدہ ہی رہنا چاہیے اور جہاں دیگر مصالح مثلاً شعائر مذہبی کی تعظیم اور دوسروں کو تشویق و ترغیب دلانا مقصود ہو اور کسی مسلمان کی ہتک حرمت بھی نہ ہوتی ہو وہاں ظاہری طور پر خرچ کرو۔ ایسے افراد کو اجر اور اچھے بدلے کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: ان کا اجر و ثواب خدا کے پاس ہے اور ان کے لیے کوئی دہشت و خوف اور غم و اندوہ نہیں ہے

---

[1] نور الثقلین ج ۱، ص ۲۹۰-۲۹۱۔ اس حدیث کا مضمون اہل سنت کی کتب تفاسیر میں بھی نقل ہوا ہے۔ در منثور میں یہی حدیث ابن عساکر، طبرانی، ابو حاتم، ابن جریر اور دیگر بہت سے مؤلفین کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

"فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون":

ہم جانتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کو جاری و ساری رکھنے اور اس کا انتظام کرنے کے لیے اپنے آپ کو مال و دولت سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔ اس لیے جب اسے ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے تو حزن و ملال کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے بھی پریشان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے حالات آئندہ کیسے رہیں گے۔ یہی خیال بہت سے مواقع پر اسے خرچ کرنے سے روک لیتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کے وعدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خرچ کرنے کے اجتماعی آثار کو بھی سمجھتے ہیں وہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے مستقبل کے لیے کسی خوف و وحشت میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنی کچھ دولت خرچ کر دینے پر غمزدہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس کے بدلے میں پروردگار کے ہاں کئی مراتب حاصل کریں گے اور اس کے بہت فضل سے بہرہ مند ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں اور آخرت میں اس عمل کے ذریعے انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی برکات حاصل ہوں گی۔

۲۷۵۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۚ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۚ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۲۷۶۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○

۲۷۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۵۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ تو بس اُس شخص کی طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور وہ اپنے اعتدال کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو (کبھی زمین پر گر پڑتا ہو اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہو) یہ سب اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود کی طرح ہے (اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے (کیونکہ دونوں میں بہت فرق ہے) اور اگر کسی تک خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیحت پہنچ جائے اور وہ (سود خوری سے) بچ جائے تو وہ سود جو (اس کی حرمت کے حکم کے نازل ہونے سے) پہلے اسے مل چکا ہے وہ اس کا مال ہے (اور اس حکم میں گذشتہ مال شامل نہ ہوگا) اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا (اور وہ اس گذشتہ معاملے کو بخش دے گا) لیکن جو لوگ لوٹ جائیں (اور اس گناہ کا نئے سرے سے ارتکاب کریں) وہ اہل آتشِ جہنم میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۷۶۔ اللہ سود کو نابود کر دے گا اور صدقات کو بڑھائے گا اور خدا کسی ناشکر گزار گنہ کار کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۷۷۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کی اجرت و ثواب ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے نہ انھیں کوئی خوف ہے نہ وہ کسی حزن و ملال میں مبتلا ہوں گے۔

تفسیر

سُود خوری قرآن کی نظر میں

گذشتہ آیات میں حاجت مندوں کے لیے مال خرچ کرنے اور رفاہِ عامہ کے کام سرانجام دینے کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان آیات میں سود خوری کا مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے۔ سود خوری کا اثر اور نتیجہ انفاق کے اثر اور نتیجے کی ضد ہے۔ ان آیات کا مقصد در اصل گذشتہ آیات کے سلسلے کی تکمیل کرنا ہے کیونکہ سود طبقاتی تفاوت میں اضافے، چند لوگوں کے پاس سرمائے کی ریل پیل اور معاشرے کے بیشتر لوگوں کی محرومیت کا سبب بنتا ہے۔

ان آیات میں سختی سے سود کے بارے میں حکم اور اس کی حرمت بیان کی گئی ہے آیات کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل ازیں بھی سود کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ قرآنی سورتوں کی تاریخِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے یہ معاملہ اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کے نزول کی ترتیب کے مطابق سب سے پہلے جس سورۃ میں سود کے متعلق گفتگو ہوئی ہے وہ سورہ روم ہے کیونکہ سورۃ روم تیسویں سورت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی اِس سورت کے علاوہ کسی اور مکی سورت میں سود کے بارے میں کوئی حکم نظر نہیں آتا لیکن اس میں بھی سود کے بارے میں اخلاقی نصیحت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ سود خوری بارگاہِ پروردگار میں کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وما اٰتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ"

یعنی — ہو سکتا ہے کوتاہ بین افراد کی نظر میں سود خوری سرمائے میں اضافے کا ذریعہ ہو لیکن بارگاہِ خدا میں اس سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ (روم - ۳۹)

پھر ہجرت کے بعد تین مدنی سورتوں میں سود کی بحث آئی ہے۔ ان سورتوں کی ترتیب یہ ہے، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء۔ سورہ بقرہ اگرچہ سورہ آل عمران سے قبل نازل ہوئی ہے لیکن بعید نہیں سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۰ جس میں سود کی حرمت کا حکم ہے سورہ بقرہ اور زیر نظر آیات سے پہلے نازل ہوئی ہو۔

بہرحال یہ آیت اور سود کے بارے میں دیگر آیات اِس وقت نازل ہوئی ہیں جب سود خوری مکہ، مدینہ اور پورے جزیرۃ العرب میں کمال شدت سے رائج تھی اور طبقاتی زندگی، محنت کش طبقے کی پسماندگی اور اشراف کی سرکشی کا اہم عامل تھی لہٰذا سود کے خلاف اسلام کی جنگ اجتماعی امور کے بارے میں اس کے اہم معرکوں میں شمار ہوتی ہے۔

"الذین یأکلون الربٰوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس":

"خبط" کا لغوی معنی ہے "راہ چلتے یا اُٹھتے وقت بدن کا اعتدال برقرار نہ رکھ سکنا"۔ آیت میں سود خور کو آسیب زدہ اور دیوانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چلتے وقت اپنے بدن کا اعتدال میں نہ رکھ سکے اور صحیح طریقے سے قدم نہ اٹھا سکے۔

اِس سے مراد دُنیا میں سود خوروں کا اجتماعی چال چلن ہے کیونکہ ان کا یہ عمل دیوانوں کا سا ہے۔ وہ صحیح اجتماعی فکر نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ اپنے فوائد کو بھی نہیں پہچان پاتے کیونکہ تعاون، ہمدردی، انسانی جذبے اور دوستی جیسے مسائل ان کے نزدیک کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔ دولت کی پرستش نے ان کی آنکھوں کو ایسا اندھا کر رکھا ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ پسے ہوئے طبقوں کا استحصال اور اُن کی محنت و زحمت سے حاصل ہونے والے مال کی غارت گری ان کے دلوں میں دشمنی کا بیج بوئے گی اور معاملہ ایسے انقلابات اور تغیرات تک جا پہنچے گا کہ مالکیت کی بنیادی خطرے سے دوچار ہو جائے گی اور ایسی صورت میں معاشرے میں سے امن و امان اور راحت و سکون رخصت ہو جائے گا۔ اِس طرح سود خور بھی راحت و آسائش کی زندگی نہیں گزار سکیں گے لہٰذا ان کا چال چلن دیوانوں کا سا ہے۔

اِس سے مراد حشر و نشر کے وقت کھڑا ہونا اور میدانِ قیامت میں آنا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی سود خوار اُس جہاں میں زندہ ہونے کے وقت دیوانوں اور آسیب زدہ افراد کی طرح محشور ہوگا۔

اکثر مفسرین نے دوسرے احتمال کو قبول کیا ہے لیکن بعض نے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن انسان کے اعمال چونکہ اس جہان میں مجسم ہو کر پیش ہوں گے لہذا ممکن ہے آیت کا اشارہ دونوں معانی کی طرف ہو یعنی دنیا میں جن لوگوں کا قیام غیر عاقلانہ اور دیوانہ وار سرمایہ اندوزی ہے دوسرے جہان میں بھی وہ دیوانوں کی طرح محشور ہوں گے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ روایات میں دونوں مفاہیم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آیت کی تفسیر میں ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"اٰکل الربوا لا یخرج من الدنیا حتی یتخبطہ الشیطٰن"

سود خور جب تک پاگل پن کی ایک قسم میں مبتلا نہ ہو جائے دُنیا سے نہیں جاتا۔ [1]

سُود خور جو صرف اپنے منافع کی فکر میں رہتے ہیں اور ان کی دولت ان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت ایک روایت میں بیان کی گئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

"میں معراج پر گیا تو وہاں ایک گروہ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے پیٹ اتنے بڑے ہیں کہ وہ اٹھ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں اور اٹھنے کی کوشش میں بار بار زمین پر گر پڑتے ہیں۔ میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں اور ان کا جرم کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: یہ سُود خور ہیں" [2]

پہلی حدیث اس دُنیا میں سود خوروں کی پریشان حالی کو منعکس کرتی ہے اور دوسری میدانِ قیامت میں ان کے حالات بیان کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت سے مربوط ہیں۔ جیسے پیٹو لوگ بہت زیادہ موٹے ہوتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں بے عقلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار بھی سود خوری کی وجہ سے موٹے ہو جاتے ہیں ان کی غیر صحیح اقتصادی زندگی ان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنون اور آسیب کا سرچشمہ شیطان ہے جس کی طرف زیرِ مطالعہ آیت میں اشارہ ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آسیب اور جنون نفسیاتی بیماریوں میں سے ہیں اور اُن کے زیادہ تر عوامل کی شناخت ہو چکی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ "مس الشیطان" کی تعبیر نفسیاتی بیماری اور جنون کے لیے کنایہ ہے اور عربوں کے درمیان یہ تعبیر عام تھی۔ یہ نہیں کہ واقعاً شیطان روحِ انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن بعید نہیں کہ بعض شیطانی کام اور بے سوچے سمجھے غلط اعمال ایک طرح کے شیطانی جنون کا سبب بنتے ہوں یعنی ان اعمال کے بعد شیطان کسی شخص پر اثر انداز ہو کر اس کے نفسیاتی اعتدال کو درہم برہم کر دیتا ہو۔ علاوہ ازیں جب غلط اور شیطانی کام پے در پے ہوتے رہیں تو ان کا یہ فطری اثر ہوتا ہے کہ انسان سے صحیح چیز کی تشخیص کا احساس اور منطقی طرزِ فکر چھن جاتی ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱، ص۲۹۰ [2] تفسیر نور الثقلین ج ۱، ص۲۹۱

سود خوروں کی منطق

"ذٰلک بانھم قالوآ انما البیع مثل الربٰوا":

آیت کے اس حصّے میں سود خوروں کی یہ منطق بیان کی گئی ہے کہ تجارت اور سود خوری میں کوئی فرق نہیں یعنی دونوں ایک ہی طرح کا لین دین ہیں جنہیں طرفین اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: خدا نے بیع اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں کرنا چاہیے (واحل اللّٰہ البیع وحرم الربٰو) قرآن نے اس کی مزید تفصیل اس لیے بیان نہیں کی کہ یہ بالکل واضح ہے۔ اس سلسلے میں بعض پہلو یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ عام خرید و فروخت میں طرفین نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں بعض اوقات دونوں کو نفع ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور کبھی ایک کو نفع اور دوسرے کو نقصان ہوتا ہے جبکہ سودی معاملات میں سود خور کو کبھی نقصان نہیں ہوتا اور نقصان کے احتمال کا سارا بوجھ دوسرے کے کندھے پر جا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودی ادارے دن بدن بڑے سرمایہ دار بنتے چلے جاتے ہیں۔ ضعیف نحیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور دولتمندوں کی ثروت کا حجم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔

۲۔ عام تجارت اور خرید و فروخت میں طرفین تولید، مال و صرف کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں جبکہ سود خور اس سلسلے میں کوئی مثبت عمل سر انجام نہیں دیتا۔

۳۔ سود خوری کے عام ہو جانے سے سرمایہ غلط اور غیر صحیح راستے پر استعمال ہونے لگتا ہے اور اقتصاد کے ستون جو معاشرے کی بنیاد میں متزلزل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تجارت سرمائے کی درست اور صحیح گردش کا سبب ہے۔

۴۔ سود خوری طبقاتی کشمکشوں اور جنگوں کا ذریعہ ہے جب کہ صحیح تجارت اس طرح نہیں ہے وہ معاشرے کو کبھی طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی جنگوں کی طرف نہیں کھینچتی۔

"فمن جآءہ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف وامرہ الی اللّٰہ":

اس جملے میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس سود کی حرمت کے بارے میں خدائی نصیحت پہنچ جائے اور وہ یہ کام چھوڑ دیں، جو سود وہ اس حکم کے نزول سے قبل لے چکے ہیں وہ انہی کی ملکیت ہے یعنی یہ قانون ہر دوسرے قانون کی طرح ماقبل پر لاگو نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر قوانین گذشتہ امور پر بھی نافذ ہو جائیں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں اور زندگی شدید آشوب کا شکار ہو جائے۔ اس لیے قوانین جب بنتے ہیں اس وقت سے نافذ ہوتے ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سود خوروں کے حساب میں اگر کچھ سود لوگوں کے ذمے ابھی باقی تھا تو اس آیت کے نزول کے بعد بھی وہ لے سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جو سود وہ اس وقت تک لے چکے تھے وہ حلال کر دیا گیا ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے۔ "وامرہ الی اللّٰہ" یعنی ان کا معاملہ قیامت میں خدا کے سپرد ہوگا۔ اس جملے کا

ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ سزا یا معافی کے بارے میں ان لوگوں کا مستقبل واضح ہے لیکن گذشتہ حصے کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد شعوری ہے گویا سود استنا بڑا گناہ ہے کہ جو لوگ پہلے یہ کام کرتے تھے۔ ان کی معافی کا ذکر بھی صراحت سے کرنا پڑا ہے تاکہ بات مخفی نہ رہے۔

"ومن عاد فاولٓئک اصحٰب النار ھم فیھا خٰلدون":

یعنی جو شخص خدا تعالٰی کی طرف سے اس نصیحت اور بار بار کی تاکید کے باوجود اس عمل سے دستکش نہ ہوا سے چاہیے کہ پروردگار کے دردناک اور دائمی عذاب کا منتظر رہے۔

دائمی عذاب اگرچہ اہل ایمان کے لیے نہیں ہے لیکن آیت میں ایسے سود خوار مراد ہیں جو خدا سے جنگ اور دشمنی کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی سے اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے آیت میں ان کے لیے دائمی عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دوام سے مراد طولانی عذاب ہے نہ کہ دائمی اور اس کی مثال سورہ نساء کی آیت ۹۳ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیشہ سود خوری میں مبتلا رہنے کی وجہ سے انسان بغیر ایمان کے دنیا سے آنکھیں موند لے۔

"یمحق اللہ الربٰوا ویربی الصدقٰت":

"محق" کا معنی ہے "نقصان" اور تدریجاً نابود ہونا اور "ربا" "تدریجی رشد و نمو" کو کہتے ہیں۔

سود خور چونکہ اپنی دولت کے ذریعے محنت کش طبقے کے پسینے کی کمائی سمیٹتا ہے اور بعض اوقات اس طرح سے ان کے وجود ہی کو ختم کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے دل میں دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور حالت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سود خور کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور یوں خود سود خور کی جان اور مال خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں تو قرآن کہتا ہے: اللہ سود کو آہستہ آہستہ نابودی کی طرف لے جاتا ہے۔ تدریجاً واقع ہونے والی یہ نابودی جیسے سود خوروں کے لیے ہے اسی طرح سود خور معاشرے کے لیے بھی ہے۔

ان کے مقابلے میں جو لوگ انسانی جذبوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمدردی اور غمخواری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے سرمائے اور مال میں سے خرچ کرتے ہیں اور لوگوں کی احتیاج پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں عوام کی طرف سے محبت اور احترام حاصل ہوتا ہے۔ ان کا سرمایہ نہ فقط یہ کہ خطرے سے دوچار نہیں ہوتا ہے بلکہ عوام کے تعاون سے طبیعی رشد حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: انفاق کرنے میں اللہ تعالٰی اضافہ عطا کرتا ہے۔ یہ حکم فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ایک سا ہے۔ جس معاشرے میں عام لوگوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اس کے محنت کش اور کاریگر طبقے کی فکری اور جسمانی صلاحیتیں بہتر طور پر کام کرتی ہیں اور یہی طبقہ معاشرے کی اکثریت ہوتا ہے کہ اس طرح سے ایک صحیح اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے کہ جس کی بنیاد عوام کا تعاون اور عوام کی ضرورت کی کفالت پر استوار ہوتی ہے۔

"واللہ لا یحب کل کفار اثیم":

"کفار" مادہ "کفور" (بروزن "فجور") سے ہے۔ کفور اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی ناشکرا اور کفران نعمت کرنے والا ہو اور "اثیم" "زیادہ گناہ کرنے والے" کو کہتے ہیں۔

اِس جملے میں کہا گیا ہے کہ سُود خور نہ صرف یہ کہ راہِ خدا میں خرچ نہ کر کے، قرضِ حسنہ نہ دے کر اور عام ضرورتمندوں کے کام نہ آکر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کے ذریعے ہر قسم کا ظلم و ستم اور گناہ و فساد کرتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

"ان الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت و اقاموا الصّلوٰة و اٰتوا الزّکوٰة لھم اجرھم عند ربھم":

ناشکر گزار گنہگار سود خوروں کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان کے زیرِ سایہ خود پرستی کو ترک کئے ہوئے اپنے فطری جذبوں کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پروردگار سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ حاجتمندوں کے کام آتے ہیں اور اُن کی حمایت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ سرمائے کے ارتکاز، طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہزاروں جرائم کی راہ روکے ہوئے ہیں۔ ان کی جزا اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہ دونوں جہانوں میں اپنے نیک عمل کے نتیجے سے بہرہ مند ہوں گے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اضطراب اور پریشانی کے عوامل پیدا نہیں ہوتے اور جو خطرات صفت غور سرمایہ داروں کو لاحق تھے اور اُن پر جو لعن طعن اور نفرین ہوتی تھی ایسے لوگوں پر نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ وہ مکمل راحت، آرام اور اطمینان سے بہرہ یاب ہوں گے اور ان کے لیے کسی قسم کا اضطراب اور غم وانددہ نہیں ہے۔ "ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون"۔

۲۷۸۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ
الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

۲۷۹۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۚ
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○

۲۸۰۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ
تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۸۔ اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو ربا (کا تقاضا ابھی) باقی ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

۲۷۹۔ اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو پھر خدا اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ توبہ کرلو تو (سود کے بغیر اصل) سرمایہ تمہاری ہی ملکیت رہے گا۔ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

۲۸۰۔ اور اگر (مقروض قرض) ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ ایسا کر سکے اور (اگر وہ بالکل ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو) بخش دو تو بہتر ہے۔ اگر (تم اس کام کے فائدے سے) آگاہ ہو۔

شانِ نزول

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں ہے کہ سود کی آیات کے نزول کے بعد خالد بن ولید نامی ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: میرے باپ کے ثقیف قبیلے سے سودی معاملات تھے اور اس نے مطالبات وصول نہیں کیے تھے اور مجھے وصیت کر گیا تھا کہ اس کا سودی مال جو ابھی تک اس نے وصول نہیں کیا حاصل کر لوں اور اپنی تحویل میں لے لوں۔ کیا یہ عمل میرے لیے جائز ہے؟

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور لوگوں کو ایسے کام سے سختی سے روک دیا گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت نازل ہونے کے بعد فرمایا۔

"الا کل ربا من ربا الجاهلية موضوع واول ربا اضعه ربا العباسؓ ابن عبد المطلب":

آگاہ رہو کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے تمام سودی مطالبات چھوڑ دیے جائیں اور سب سے پہلے میں عباس بن عبد المطلب کے سودی مطالبات ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ زمانہ جاہلیت کے سودی مطالبات پر تنسیخ قلم پھیر رہے تھے تو آپؐ نے یہ کام اپنے رشتے داروں سے شروع کیا اور اگر ان میں عباس بن عبد المطلب جیسے دولت مند افراد تھے کہ جو زمانہ جاہلیت میں دیگر سرمایہ داروں کی طرح اس گناہ میں آلودہ تھے تو آپؐ نے سب سے پہلے انہی کے سودی تقاضوں کو ممنوع قرار دیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب فرمایا ہے، انہیں پرہیزگاری کی وصیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ

اگر وہ ایمان رکھتے ہیں تو اپنے باقی ماندہ سودی مطالبات بھول جائیں ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت ایمان باللہ سے شروع ہوتی ہے اور ایمان ہی کے تقاضے پر ختم ہوتی ہے ۔ یہ امر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ سود روح ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے ۔

"فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله و رسوله":

اس آیت میں قرآن نے اپنے لب و لہجہ کو بدل دیا ہے ۔ پہلی آیت کی نصیحتوں کے بعد اس آیت میں سود خوروں پر شدید حملہ کیا ہے اور انہیں خطرے کا اعلام دیا ہے ۔ حکم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح محروم لوگوں کا خون چوستے رہے تو پیغمبر مجبور ہیں کہ فوجی طاقت سے انہیں روکیں اور حق کے سامنے جھکا دیں ۔ حقیقت میں پیغمبر کی طرف سے اعلان جنگ ہے ۔ یہ وہی جنگ ہے جو اس قانون کے تحت انجام پاتی ہے :

"فقاتلوا التی تبغی حتی تفیء الی امر الله" (حجرات : آیۃ ۹)

متجاوز اور بغاوت کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تاکہ وہ فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ۔ (حجرات - ۹)

یہی وجہ ہے کہ جب امام صادق علیہ السلام نے ایک شخص کے بارے میں سنا کہ وہ بڑی جرأت سے سود کھاتا ہے اور اس نے اس کا نام لبا (دودھ) رکھ رکھا ہے تو فرمایا :

"اگر مجھے اس پر دسترس حاصل ہو جائے تو اسے قتل کر دوں ۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو اسلام میں حرمت سود کے منکر ہوں ۔

بہر صورت اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت طاقت کے ذریعے سود خوری کو روک سکنے کی مجاز ہے ۔

"وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون":

ارشاد ہوتا ہے : اگر توبہ کر لو اور سود خوری کی دوکان بڑھا دو تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو تمہارا اصلی سرمایہ ہے (سود چھوڑ کر) وہ لے لو اور یہ قانون ہر طرح سے عادلانہ ہے ۔ کیونکہ یہ قانون ایک طرف تو تمہیں دوسروں پر ظلم کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف تمہیں ظلم کے وار سے بچاتا ہے ۔ اس طرح نہ ظالم بنو گے اور نہ مظلوم ۔

"لا تظلمون ولا تظلمون" اگرچہ یہ سود خوروں کے بارے میں آرہا ہے لیکن درحقیقت یہ وسیع مفہوم کا حامل نہایت قیمتی اسلامی شعار ہے جو کہتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ظلم کرنے سے پرہیز کریں اس طرح اپنے آپ کو ظلم و ستم کے سپرد کرنے سے بھی اجتناب کریں ۔ اصولی طور پر اگر ستم کش نہ ہوں تو ستمگر بھی کم پیدا ہوں گے ۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے دفاع کا پورا حوصلہ اور آمادگی رکھتے ہوں تو کوئی ان پر ظلم نہیں کر سکتا ۔ لہٰذا ظالم کو ظلم سے منع کرنے سے پہلے مظلوم سے کہو کہ ظلم نہ سہے ۔

"وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ":

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ (سود کے بغیر) اصل سرمایہ طلبگار کا حق ہے ۔ اس آیت میں مقروض کا ایک حق بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو تو نہ صرف یہ کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق ان پر نیا سود نہ لگایا جائے

نے فرمایا:۔

" انما حرم الله عز وجل الربٰوا لکیلا یمتنع الناس من اصطناع المعروف " [1]

خدا تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ نیک کام کرنے سے رک نہ جائیں۔ [1]

۲۸۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ
مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ
وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ
وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ
وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ
فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ
إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ
وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ
ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا
تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا
إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفْعَلُوا

[1] وسائل ج ۱۲۔ ابواب ربٰوا۔ باب ۱۔ ص ۴۲۲۔

فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۸۲۔ اے ایمان والو! جب ایک معین مدت کے لیے (قرض یا کسی اور معاملے کے لیے) ایک دوسرے سے لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ عدل سے دستاویز لکھے اور جس شخص کو اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا کی ہے اسے چاہیے کہ وہ لکھنے سے گریز نہ کرے اور جس کے ذمے حق ہے اِملا وہ شخص کروائے اور خدا سے ڈرے اور طے شدہ معاملے میں کوئی چیز فروگزاشت نہ کرے اور اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو (یا دیوانہ ہو) اور یا (گونگا ہونے کی وجہ) اِملا نہ کروا سکتا ہو تو اس کے ولی کو چاہیے کہ (اس کی بجائے) عدل کو ملحوظ رکھتے ہوئے املا کروائے اور اپنے مردوں میں سے دو افراد کو (اس حق پر) گواہ بنائے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے حسب اطمینان ایک مرد اور دو عورتیں منتخب کر لو (یہ دونوں عورتیں مل کر ایک گواہ ہوں گی اور یہ دو عورتیں اس لیے ہیں) تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور جب گواہوں کو شہادت کے لیے بلایا جائے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے اور وہ معاملہ جس کی مدت معین ہے چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ اُسے لکھنے پر دل تنگ نہیں ہونا چاہیے (جو کچھ بھی ہو لکھ لینا چاہیے)۔ یہ خدا کے نزدیک عدل کے قریب تر ہے۔ شہادت کے لیے زیادہ سہولت اسی میں ہے اور شک و تردد اور بحث و نزاع کو روکنے کے لیے بھی بہتر ہے۔ ہاں البتہ جو لین دین تم دست بدست آپس میں کرتے ہو اس میں نہ بھی لکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اور نقد خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو (حق گوئی کی وجہ سے) کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ (اور نہ ان سے سختی کی جانا چاہیے) اور اگر ایسا کرو گے تو پروردگار کے فرمان سے نکل جاؤ گے۔ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

تفسیر

تجارتی دستاویزات

جیسے قرآن نے سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور بخل کے خلاف سخت جنگ کی ہے۔ اسی طرح تجارتی اور اقتصادی امور کے لیے تفصیلی قواعد بیان کیے ہیں۔ تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے سرمایہ طبیعی رُشد حاصل کرے اور کسی قسم کا جھگڑا، اختلاف اور نزاع پیدا نہ ہو۔

محل بحث آیت قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے۔ اس میں مالی لین دین کے قواعد کے سلسلے میں اشارہ احکام

بیان کیے گئے ہیں ۔ ذیل میں ہم ان قواعد کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں :

۱۔ جب کوئی شخص کسی کو قرض دے یا کوئی معاملہ انجام پائے اور طرفین میں سے ایک مقروض ہو جائے تو بعد میں ہر کسی اشتباہ یا نزاع سے بچنے کے لیے معاملے کی ساری شرائط ضبط تحریر میں آجانا چاہئیں ۔

"یاایھا الذین اٰمنوآ اذا تداینتم بدین الیٰ اجل مسمّی فاکتبوہ ." :

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ "قرض" نہیں بلکہ "دین" استعمال ہوا ۔ قرض صرف وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں دو ایسی چیزوں کا تبادلہ ہو جو ایک دوسرے کی مثل ہوں ۔ مثلاً نقدی یا جنس قرض کے طور پر لی جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی مثل واپس کر دی جائے لیکن دین کا دامن وسیع تر ہے کیونکہ جیسا معاملہ انجام پائے ۔ مثلاً صلح ، اجارہ ، خرید و فروخت وغیرہ پھر اگر ایک طرف سے کچھ دیا جانا ہو تو اسے دین کہتے ہیں ۔ اس بناء پر زیر بحث آیت ان تمام معاملات پر محیط ہے جو سلف یا نسیہ کے طور پر انجام پائے یہاں تک کہ قرض بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے ۔

۲۔ اطمینان کے حصول کے لیے اور طرفین میں سے کسی کی ممکنہ بے جا مداخلت سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ دستاویز کوئی تیسرا شخص لکھے ۔

"ولیکتب بینکم کاتبٌ" :

اس جملے کے ظاہری مفہوم سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دستاویز لکھنا واجب ہے ۔ لیکن بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے

فان امن بعضکم بعضا فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ :

اگر تمہیں آپس میں اطمینان ہے کہ جس کے ذمے حق ہے وہ ادا کر دیگا (تو تحریر موجود نہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اس صورت میں ضروری ہے جب آپس میں مکمل اطمینان نہ ہو اور احتمال ہو کہ معاملہ نزاع اور کشمکش تک جا پہنچے گا ۔

۳۔ کاتب کو چاہیے کہ دستاویز لکھتے وقت حق کو پیش نظر رکھے اور عین واقع کے مطابق لکھے (بالعدل) ۔

۴۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا فرمائی ہے اور وہ معاملے کے بارے میں احکام و شرائط سے آگاہ ہے اسے چاہیے کہ دستاویز لکھنے میں گریز نہ کرے بلکہ اس اجتماعی امر میں طرفین کی مدد کرے ۔

"ولا یأب کاتبٌ ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب ." :

"کما علمہ اللہ" مندرجہ بالا تفسیر کی روشنی میں دیکھا جائے تو آیہ کا یہ حصہ مزید تاکید اور تشویق کے لیے معلوم ہوتا ہے ۔ نیز یہ ایک اور نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جیسے خدا نے اسے تعلیم دی ہے ، انتہائی حد تک عدل اور امانت داری کو ملحوظ رکھے اور اصطلاح کے مطابق بَیْنَہٗ و بَیْنَ اللہ دستاویز کو انتہائی سوچ بچار سے ترتیب دے ۔

البتہ دستاویز لکھنے کی دعوت قبول کرنا واجب عینی نہیں جیسا کہ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے :

"ولا تسئموا ان تکتبوه صغیرا او کبیرا":

یعنی کسی چھوٹی بڑی دستاویز کے لکھنے سے دل تنگ نہ ہوگا۔

۵۔ چاہیے کہ معاملے کے دونوں فریق میں سے ایک دستاویز کی املا کروائے یعنی وہ کہتا جائے تاکہ کاتب لکھتا جائے۔ لیکن طرفین میں سے ایسا کون کرے؟ اس بارے میں آیت کہتی ہے کہ مقروض یعنی جسے حق ادا کرنا ہے وہ ایسا کرے ("ولیملل الذی علیه الحق")

ایسی دستاویزات میں ہمیشہ بنیادی اقرار تو مقروض ہی کا ہوتا ہے اور اسی کے دستخط بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے جو متن اس کے اعتراف اور املاء کروانے سے تیار ہوگا وہ ایک ایسی بنیاد بن جائے گا جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

۶۔ جس کے ذمہ حق واجب الادا ہے اسے چاہیے کہ املاء کرواتے وقت خدا تعالیٰ کو پیش نظر رکھے اور کسی چیز کو فراموش نہ کرے اور تمام چیزیں لکھے تاکہ کاتب لکھ دے "ولیتق الله ربه ولا یبخس منه شیئا"۔

۷۔ اگر مقروض سفیہ و نادان ہو اپنے مالی امور کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو اور اپنے نفع و نقصان کو نہ سمجھ سکتا ہو ضعیف و کمزور، کوتاہ فکر، کم عقل اور گونگا ہو بات کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ان صورتوں میں اس کی جگہ اس کا ولی املاء کروائے گا اور دستاویز کو ترتیب دینے والا اسے لکھے گا "فان کان الذی علیه الحق سفیها او ضعیفا او لا یستطیع ان یمل هو فلیملل ولیه":

۸۔ "ولی" کو بھی چاہیے کہ املاء میں عدالت کو ملحوظ رکھے اور حق سے انحراف سے بچے ولیملل ولیه بالعدل)

۹۔ طرفین کو دستاویز پر دو گواہ بھی بنانا چاہئیں (واستشهدوا شهیدین.)۔

۱۰۔ ۱۱۔ یہ دونوں گواہ بالغ اور مسلمان ہوں (من رجالکم.) "(کم.)" مسلمان ہونے کا معنی دیتا ہے کیونکہ "من رجالکم" کا لفظی معنیٰ ہے "ایسے مرد جو تمہاری جماعت میں سے ہوں"۔

۱۲۔ ایک مرد اور دو عورتیں بھی گواہ ہو سکتے ہیں "فان لم یکونا رجلین فرجل و امراتن"

۱۳۔ گواہ قابل اعتماد ہونا چاہئیں ("ممن ترضون من الشهداء")۔ اس جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ ہر لحاظ سے پسندیدہ ہوں اور اس سے مراد اُن کی عدالت ہی ہے۔ جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے۔

۱۴۔ جب گواہ دو مرد ہوں تو ان میں سے ہر ایک مستقل گواہی دے سکتا ہے لیکن جب ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو پھر ان دو عورتوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے سے مل کر متفق ہو کر گواہی دیں تاکہ ان میں سے ایک اشتباہ کرے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

رہا یہ سوال کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں شمار کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نرم دل ہوتی ہے

اور ممکن ہے بعض اوقات کسی کے زیر اثر آجائے اس لیے اس کے ساتھ ایک اور عورت کو شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ اسے کسی کے زیر اثر ہونے سے روک سکے "ان تضل احدٰهما فتذکر احدٰهما الاخریٰ"۔

۱۵۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ اسے تحریر میں آجانا چاہیے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ اقتصادی روابط میں کسی قسم کا جھگڑا اور نزاع نہ ہو۔ وہ کہتا ہے قرض کی کمی کی وجہ سے دستاویز لکھنے میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے ("ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا او کبیرا الیٰ اجلہ")

سستی اور خستگی کو "سامۃ" کہتے ہیں "لا تسئموا" یعنی خستہ و دل تنگ نہ ہو جاؤ۔

یہاں قرآن مندرجہ بالا احکام کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دستاویزات کی تیاری ایک طرف تو عدل وانصاف کی ضامن ہے اور دوسری طرف گواہوں کے لیے شہادت کے وقت تقویت و اطمینان کا باعث ہے اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ افراد معاشرہ کے مابین نزاع پیدا ہونے میں رکاوٹ کا کام دیتی ہے "ذٰلکم اقسط عند اللہ واقوم للشهادۃ وادنیٰ الا ترتابوا"۔

۱۶۔ جب معاملہ نقد بنقد ہو تو کسی سند یا دستاویز کی ضرورت نہیں ہے "الا ان تکون تجارۃ حاضرۃ تدیرونها بینکم فلیس علیکم جناح الا تکتبوها"۔

"تجارۃ حاضرۃ" کا معنی ہے "نقد سودا" اور "تدیرونها" کا مطلب ہے دست بدست پھیرنا جو کہ نقد معاملے ہی کی تاکید ہے۔

"فلا جناح" یعنی کوئی حرج نہیں۔ یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ جب نقد معاملہ انجام پا رہا ہو اس وقت بھی کوئی دستاویز تیار کر لینا بہتر ہے کیونکہ اس طرح ہر طرح کا ممکنہ اشتباہ اور اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ نقد معاملے میں اگرچہ تحریر ضروری نہیں البتہ گواہ بنا لینا چاہئیں ("واشھدوا اذا تبایعتم")

۱۸۔ آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ گواہوں اور کاتب پر کسی قسم کا تشدد اور سختی نہیں کی جانا چاہیے تاکہ وہ حق اور عدالت سے اپنا کام سرانجام دیں ("ولا یضار کاتب ولا شهید")۔

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا جملے میں کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "یضار" اصطلاح کے مطابق فعل مجہول ہے یعنی اسے اذیت نہ پہنچائی جائے۔

باقی رہا عدالت کے بارے میں کاتبوں اور گواہوں کے لیے حکم ــــ تو وہ آیت کی ابتداء میں آچکا ہے اس لیے ضرورت نہیں کہ "لا یضار" کو فعل معلوم سمجھیں اور اس کا معنی یہ لیں کہ "وہ اذیت نہ پہنچائیں" مندرجہ بالا حکم کے بعد تاکید ہے کہ اگر کوئی شخص حق گوئی کی بناء پر گواہوں اور کاتبوں کو اذیت پہنچائے تو وہ فسق و گناہ کا مرتکب قرار پائے گا اور ایسا کرنا بندگی خدا کے تقاضوں کے منافی ہے ("وان تفعلوا فانہ فسوق بکم")۔

یہ تمام احکام بیان کرنے کے بعد آخر میں لوگوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور اوامر الٰہی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے ("واتقوا اللہ")۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو چیزیں تمہاری مادی اور معنوی زندگی کے لیے ضروری ہیں،

خدا تعالیٰ تمہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ ("و یعلمکم اللہ") وہ لوگوں کے فائدے اور نقصان سے آگاہ ہے اور جن چیزوں میں ان کی بہتری اور صلاح ہے وہی ان کے لیے مقرر کرتا ہے ("واللہ بکل شیء علیم")۔

ضمنی طور پر ("واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ") سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پرستی آگاہی، روشن فکری اور علم و دانش میں اضافے پر تقویٰ اور پرہیزگاری گہرا اثر مرتب کرتی ہے اور جب انسان کا دل پاک ہو جاتا ہے تو وہ آئینے کی طرح حقائق کو اپنے اندر منعکس کر لیتا ہے۔

۲۸۳۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۸۳۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب میسر نہ آئے تو کچھ رہن رکھ لو (اور رہن کے طور پر دی گئی چیز قرض دینے والے کے قبضے میں رہنی چاہیے) اور اگر تم ایک دوسرے پر (کامل) اطمینان رکھتے ہو (تو پھر رہن کی بھی ضرورت نہیں) اور جسے امین سمجھا گیا ہے (اور بغیر کسی رہن کے اس نے دوسرے سے کوئی چیز لے لی ہے) اُسے چاہیے کہ امانت (اور اپنا قرض موقع پر) ادا کرے اور اُس اللہ سے ڈرے جو اُس کا پروردگار ہے اور شہادت کو نہ چھپاؤ کہ جو شخص اُسے چھپائے گا اس کا دل گنہ گار ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ اور اس کا عالم ہے۔

تفسیر

یہ آیت دراصل گذشتہ آیت کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں چند ایک احکام مزید بیان فرمائے گئے ہیں

۱۔ اگر لین دین کرتے وقت دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو، جیسا کہ سفر میں پیش آسکتا ہے تو قرض لینے والا دوسرے کی تسلی کے لیے کوئی چیز گروی کے طور پر دے دے ("وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھٰن مقبوضۃ")۔

بالخصوص آیت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہن کا قانون سفر سے مخصوص ہے لیکن اگلے جملے ولم تجدوا کاتبا
(کاتب میسر نہ آئے تو) سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر کا ذکر مثال کے طور پر ایسے موقع کے لیے آیا ہے جب دستاویز لکھنے والا
میسر نہ ہو۔ اس بناء پر وطن میں بھی طرفین صرف رہن پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ تفاسیر اہل بیتؑ میں بھی اس حقیقت کی طرف
اشارہ ہوا ہے۔ شیعہ و سنی کتب احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی زرہ ایک غیر مسلم کے پاس قرض لینے
کے لیے رہن کے طور پر رکھی تھی۔

۲۔ رہن حتمی طور پر قرض دینے والے کے پاس رہنا چاہیے تاکہ اسے اطمینان رہے "فرھن مقبوضۃ"
تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"لا رھن الا مقبوضۃ":

رہن، رہن نہیں مگر وہ کہ جو طلب گار کی تحویل میں ہو۔

۳۔ دستاویز لکھنا، گواہ بنانا اور رہن رکھنا سب احکام ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہیں جہاں طرفین ایک دوسرے کے
بارے میں مکمل طور پر اطمینان نہ رکھتے ہوں ورنہ قرض دینے والے کو کسی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں اور مقروض کو بھی
چاہیے کہ وہ اس کے اعتماد کا احترام کرے اور جلد اس کا حق ادا کر دے اور تقویٰ کو فراموش نہ کرے۔

"فان امن بعضکم بعضا فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ
ولیتق اللہ ربہ"[1]

۴۔ لین دین کا موقع ہو یا کوئی اور۔ اصولی طور پر جو لوگ جانتے ہیں کہ کس کا کیا حق ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ جب انہیں
گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ گواہی کو نہ چھپائیں کیونکہ گواہی کو چھپانا عظیم گناہوں میں شمار ہوتا ہے "ولا تکتموا
الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ اثم قلبہ"

یہ واضح ہے کہ گواہی دینا اس صورت میں ہم پر واجب ہے جب دوسرے اپنی شہادت سے حق کو ثابت نہ کریں
اگر کچھ لوگ اپنی گواہی سے حق ثابت کر دیں تو باقی لوگوں پر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اصطلاح میں گواہی دینا
واجب کفائی ہے۔

شہادت کا مخفی رکھنا اور موقع کے مطابق اس کا اظہار نہ کرنا، یہ عمل چونکہ دل ہی کی مرضی سے انجام پاتا ہے اس
لیے مزید تاکید کے طور پر گناہ کی نسبت دل کی طرف دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے، اس کا دل گناہگار ہے۔[2]

آیت کے آخر میں امانت اور دیگر حقوق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور بیداری کے لیے
فرمایا گیا ہے کہ پروردگار تمہارے کردار سے باخبر ہے ("واللہ بما تعملون علیم")

---

[1] "اؤتمن" امن کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اطمینان خاطر۔ اس سے مراد وہ مقروض ہے جسے امین سمجھا گیا ہے۔ دوسرے جملے
میں امانت سے مراد قرض ہے یعنی اس صورت میں قرض امانت والا حکم رکھتا ہے۔ [2] [illegible]

۲۸۴- لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ

۲۸۴- جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا مال ہے (لہٰذا) جو کچھ تمہارے دل میں ہے اُسے ظاہر کر دو یا پوشیدہ رکھو خدا تمہارا حساب اس کے مطابق ہی کرے گا۔ پھر جسے چاہے گا (اور جو اہل ہوگا) اُسے بخش دے گا اور جسے چاہے گا (اور وہ مستحق ہوگا) اسے عذاب دے گا اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

انسان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بعض بالکل خارجی پہلو رکھتے ہیں اور بعض داخلی اور قلبی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شہادت کو چھپانا اور شرک کرنا وغیرہ۔ مندرجہ بالا آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ صرف ظاہری گناہوں کا محاسبہ نہیں کرے گا بلکہ باطنی اور قلبی پہلو رکھنے والے گناہ بھی احتساب کے عمل سے نہیں گزریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان پر حاکم ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اندرونی اور قلبی گناہوں کا محاسبہ نہ کرنے والے وہ ہیں جو آسمان و زمین اور دنیا کے ظاہر و باطن سے بے خبر ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

اس تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان بہت سی احادیث سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جن میں فرمایا گیا ہے کہ گناہ کی نیت گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ احادیث ان نافرمانیوں کے بارے میں ہیں جو خارجی عمل کا پہلو رکھتی ہیں اور نیت ان کا مقدمہ اور تمہید ہے اور یہ احادیث ان گناہوں کے بارے میں نہیں ہیں جو ذاتی طور پر اندرونی اور باطنی پہلو رکھتے ہیں اور قلبی عمل ہیں۔ آیت کا ایک اور معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک عمل کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً انفاق ممکن ہے خدا کے لیے ہو یا شہرت طلبی کے لیے ہو۔ آیت کہتی ہے۔ تم اپنی نیت ظاہر کر دو یا چھپائے رکھو، خدا اس سے آگاہ ہے اور اس کا محاسبہ کرے گا۔ درحقیقت اس آیت میں "لا عمل الا بالنیۃ" (نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں) والی روایت کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جہاں وہ چاہتا ہے لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے اور جہاں اس کا ارادہ ہو سزا دیتا ہے (فیغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء) البتہ واضح ہے کہ بخشش و عذاب اور ہدایت و ضلالت کے بارے میں خدا کا ارادہ اور مشیت کسی حساب کے بغیر نہیں ہوتے بلکہ وہ اہلیت اور قابلیت کی بنا پر ہی ہیں جو شخص انسان

خود حامل کتاب ہے اور پروردگار ہر چیز پر طاقت و قدرت رکھنے والا ہے۔

۲۸۵۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۲۸۵۔ رسول اُس چیز پر ایمان لایا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے (اور وہ ایسا رہبر ہے کہ اپنی تمام باتوں کی صداقت پر مکمل ایمان رکھتا ہے اور مومنین بھی سب کے سب خدا اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے افراد (رسولوں) پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے رسولوں میں کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ہم نے سُنا ہے اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ اسے ہمارے پروردگار مغفرت تیری طرف سے ہے اور تیری ہی طرف (ہماری) بازگشت ہے۔

تفسیر

دیگر انسانی راہنماؤں کے مقابلے میں انبیاء کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے ہدف و مقصد اور دین و مکتب پر قطعی و یقینی ایمان رکھتے تھے اور ان کے عقیدے میں کسی قسم کا کوئی تزلزل نہ تھا۔ قرآن حکیم لوگوں کو ایسے پیغمبر کی طرف دعوت دیتا ہے جو اپنے پورے وجود سے اپنے مطلب و مدعا کا ادراک رکھتا ہے ارشادِ الٰہی ہے:۔

فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلماتہ۔

اللہ اور اس کے اُس رسول نبی اُمی پر ایمان لے آؤ جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے۔ (اعراف ۱۵۸)

زیر بحث آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ خالق کائنات اور اس کے تمام پروگرام جو پیغمبر پر نازل ہوئے ہیں پیغمبر کا ان پر مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ ہے بلکہ مومنین اور جو مکتب پیغمبر کے تربیت یافتہ ہیں وہ بھی

ایسے ہی ہیں ۔ ان کے برعکس یہ لوگ ہیں :

یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض

خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفرق اور اختلاف کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ بعض پر ایمان لے آئیں اور بعض کا انکار کردیں ۔ (نساء - ۱۵۰)

زیر بحث آیت آگے کہتی ہے : وہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی ہدف اور مقصد کے حامل ہیں اور ایک ہی مقصود کے لیے بھیجے گئے ہیں لہٰذا سب زبان حال سے کہتے ہیں : (لا نفرق بین احد من رسلہ) یعنی ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں کرتے ۔

البتہ یہ بات اس امر سے تضاد نہیں رکھتی کہ گذشتہ تمام ادیان منسوخ ہوچکے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات مختلف کلاسوں کی تعلیم کی طرح ہیں ۔ جب اعلیٰ کلاسوں میں ترقی کی جاتی ہے تو پہلی کلاسیں چھوٹ جاتی ہیں حالانکہ ان کا احترام برقرار رہتا ہے ۔

بندگی کا اعتراف

اہل ایمان ہمیشہ بندگی اور عبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں : پروردگار ! تیرے پیغمبر ہمیں تیری طرف بلانے کے لیے جو دعوت اور ندا دیتے ہیں ہم اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور تیری پیروی و اطاعت کی منزل میں داخل ہوتے ہیں ۔ "وقالوا سمعنا و اطعنا"

لیکن خدایا ! آخر ہم انسان ہیں ۔ کبھی ہمارے نفوس ہمیں لغزشوں سے بھی دوچار کردیتے ہیں لہٰذا ہم تجھ سے بخشش کی امید رکھتے ہیں کیونکہ ہم نے بہرحال تیری ہی طرف پلٹنا ہے ۔ غفرانک ربنا والیک المصیر"[1]

۲۸۶۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ

---

[1] [illegible] (غفرانک) [illegible]

عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۸۶۔ خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا (اسی بناء پر انسان) جو بھی (نیک) کام انجام دے اُس نے اپنے لیے انجام دیا ہے اور جو (برا) کام کرے خود اس کے لیے نقصان دہ ہے (مومنین کہتے ہیں) پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر گزریں تو ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! کسی سنگین ذمہ داری کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا جیسا کہ (گناہ وسرکشی کی وجہ سے) ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ایسی سزائیں نہ دے جنہیں ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہمارے گناہوں کے آثار ہم سے دھو ڈال ہمیں بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے تو ہمارا مولا اور سرپرست ہے پس ہمیں کفار کی جماعت پر کامیابی اور کامرانی عطا فرما۔

تفسیر

طاقت کے مطابق ذمہ داری

"وُسع" کا لغوی معنی قدرت اور طاقت ہے۔ اس بناء پر آیت اس عقلی حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ خدا کی طرف سے عائد ذمہ داریاں کبھی بشری طاقت سے ماوراء نہیں ہوسکتیں لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت تمام احکام کی تفسیر اور حد بندی کرتی ہے۔ تمام احکام یہ خصوصیت رکھتے ہیں کہ وہ انسانی قدرت وطاقت کے مطابق ہیں۔ ایک حکیم وعادل فقط ایسا ہی قانون بنا سکتا ہے۔

ضمنی طور پر اس بات سے اس حقیقت کی پھر تائید ہوجاتی ہے کہ احکام شرعی کبھی حکم عقل کے منافی نہیں ہو سکتے۔ حکم شرع اور حکم عقل ہمیشہ دوش بدوش رہتے ہیں۔

"لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت"

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہی قوانین و احکام پر عمل سے انسانی سرنوشت مربوط ہے اس جملے کے مطابق ہر شخص اپنے نیک و بد عمل کا نتیجہ حاصل کرے گا۔ اس جہان میں اور آئندہ جہان میں اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ اس طرح لوگوں کو ان کی ذمہ داری اور ان کے اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے قرآن نے ان افسانوں پر خط بطلان کھینچ دیا ہے جن میں لوگوں کو ان کے اعمال سے بری قرار دیا گیا ہے یا بلا وجہ کسی کے اعمال کی جوابدہی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیہ شریفہ میں نیک اعمال کے لیے لفظ "کسب" اور برے اعمال کے لیے لفظ "اکتساب" استعمال کیا ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لیے ہے کہ "کسب" ان اعمال کے لیے بولا جاتا ہے جو بلا تکلف اور فطرت کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں جب کہ "اکتساب" ان اعمال کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہوں اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور برے اعمال ذاتی طور پر خلاف فطرت ہیں۔

ان دونوں تعبیروں کے اختلاف کے بارے میں راغب اصفہانی نے ایک اور بات کہی ہے اور وہ بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ "کسب" ان کاموں کے لیے مخصوص ہے جن کا فائدہ فقط انسان کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے، ان اعمال خیر کی طرح جن کا نتیجہ صرف انجام دینے والے شخص کو نہیں پہنچتا بلکہ ممکن ہے کہ اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی اس میں شریک ہوں جب کہ "اکتساب" ان مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کام کا اثر صرف کرنے والے تک محدود ہو اور گناہ میں ایسا ہوتا ہے (البتہ توجہ رہے کہ یہ مفہوم اس وقت لیا جاتا ہے جب "کسب" اور "اکتساب" کو ایک دوسرے کے مد مقابل استعمال کیا جائے)۔

"ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا۔"

مومنین چونکہ لها ما کسبت و علیها ما اکتسبت کے قانون کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا انحصار ان کے اپنے اچھے یا برے کردار پر منحصر ہے لہذا بارگاہ الٰہی میں خاص تضرع و زاری کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس ذات کو پکارتے ہیں جو ان کی پرورش میں خاص لطف و کرم فرماتا ہے اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول اور خطا و اشتباہ سے دوچار ہو جائیں تو اپنی وسیع رحمت سے تو ہماری لغزش سے درگزر اور ہمیں اس کے عذاب سے رہائی بخش۔

خطا کے بدلے سزا

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ پروردگار کسی کو بھول چوک پر سزا دے کہ اس پر بھی درخواست کی گنجائش پیدا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات بھول چوک انسان کی اپنی سہل انگاری کی وجہ سے ہوتی ہے اور مسلّم ہے کہ بھول

چوک کی وجہ سے انسان سے جوابدہی اور مسئولیت ختم نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

"فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا"

عذاب خدا کا ذائقہ چکھو کیونکہ تم اس دن کو بھول گئے تھے۔ (سجدہ ۱۴)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ خطائیں جو اپنی سہل انگاری کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں، قابل سزا ہیں۔

ایک اور بات جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ نسیان اور خطا ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں لفظ "خطا" عام طور پر ایسے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو غفلت یا انسان کی عدم توجہ کے باعث سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص شکار کے لیے تیر مارتا ہے اور اس کے ارادے کے بغیر کسی انسان کو جا لگتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ لفظ "نسیان" ایسے کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انسان توجہ سے انجام دے لیکن حقائق سے ناآشنا ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی بے گناہ کو گناہگار سمجھتے ہوئے سزا دے دے۔

"ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا"

"اصر" کا معنی ہے کسی کو روک رکھنا، کسی کو حبس و قید میں رکھنا۔ یہ لفظ ہر اس سنگین اور بھاری کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی فعالیت کو روک دے نیز ایسے عہد و پیمان کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کو محدود کر دے۔ اسی لیے عذاب اور سزا کو بھی کبھی "اصر" کہتے ہیں۔

اس جملے میں مومنین خدا سے دو تقاضے اور کرتے ہیں:

پہلا یہ کہ ان پر دشوار ذمہ داریاں عائد نہ ہوں کیونکہ ایسی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بعض اوقات اطاعت پروردگار کے خلاف کام ہو جاتا ہے۔ احکام اسلام کے بارے میں ایسی ہی بات پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے۔

"بعثت الی الشریعۃ السھلۃ السمحۃ"

میں ایسے دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں جس پر عمل کرنا سب کے لیے سہل ہے۔

ممکن ہے اس موقع پر سوال کیا جائے کہ اگر شریعت کا سہل ہونا اچھی چیز ہے تو پھر یہ گذشتہ اقوام میں کیوں نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ امتوں کے لیے شدید تکالیف اصل شریعت میں نہیں تھیں بلکہ ان کی نافرمانیوں کے بعد سزا کے طور پر انہیں شدائد کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پے در پے نافرمانیوں کی وجہ سے کچھ حلال گوشتوں سے محروم ہو گئے تھے (انعام ۱۴۶، نساء ۱۶۰)

دوسرا یہ کہ وہ طاقت فرسا آزمائشوں اور ناقابل برداشت سزاؤں سے محفوظ رہیں۔ "ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ" "لا تحمل" گذشتہ جملے میں اور "ولا تحمل" اس جملے میں شاید اسی بنا پر ہے کیونکہ پہلی تعبیر مشکلات کے مواقع کے لیے اور دوسری طاقت فرسا مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

"واعف عنا واغفر لنا وارحمنا"

لغت میں عفو "کا معنی ہے "کسی چیز کے اثر کو محو کرنا" اور زیادہ تر یہ لفظ گناہ کے اثرات کو محو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں طبیعی آثار بھی شامل ہیں اور سزا کے محو ہونے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے "مغفرت" گناہ کے بدلے میں ملنے والی سزا سے صرف نظر کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بناء پر دونوں لفظوں کے استعمال سے یہ سمجھ آتا ہے کہ مومنین اپنے پروردگار سے چاہتے ہیں کہ وہ لغزشوں کے طبیعی اور تکوینی آثار ان کی روح سے محو کر دے تاکہ وہ ان کے بُرے نتائج میں گرفتار نہ ہوں اور یہ بھی تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی معینہ سزاؤں سے بھی بچ جائیں اور پھر اس کی وسیع رحمت کی خواہش کرتے ہیں جو تمام چیزوں پر محیط ہے۔

"انت مولنا فانصرنا علی القوم الکٰفرین"

پھر اپنی دعا کے آخری حصے میں خدا کو مولا کہہ کر پکارتے ہیں۔ یعنی ایسی ذات جو ان کی سرپرستی اور پرورش کرتی ہے ۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ انہیں ہر طرح کے دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب کرے۔

ان دو آیات میں چونکہ سورہ بقرہ کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور تسلیم و رضا کے آداب ہمیں سکھائے گئے ، یعنی اگر اہل ایمان چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر کرے ، ور مختلف قسم کے دشمنوں کے مقابلے میں انہیں کامیاب کرے تو انہیں چاہیے کہ "سمعنا و اطعنا" کے طریقہ کار پر عمل کریں اور کہیں کہ ہم پکارنے والے کی دعوت دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور ان کی پیروی کے درپے ہیں اور اس راہ میں کسی جستجو اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے ۔ اس کے بعد اللہ سے رکاوٹوں اور دشمنوں پر کامیابی کی خواہش کریں "رب" کے عنوان سے خدا کے نام کا تکرار اس حقیقت کی تکمیل کرتا ہے ۔ کیونکہ اس نام کا استعمال اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ وہ وہ ذات ہے جو ان کی پرورش کرنے میں خاص لطف و کرم رکھتی ہے۔

اسی لیے رہبران اسلام نے کئی ایک احادیث میں ہم مسلمانوں کو ان دو آیات کو خاص طور پر پڑھنے کی ترغیب دی ہے اور اس کی تلاوت کا بہت طرح کا ثواب بیان کیا ہے ۔ ان احادیث کے مطابق اگر زبان اور دل ان آیات کی تلاوت میں ہم آہنگ ہوں اور ان کے مفاہیم کو زندگی کا پروگرام بنا لیا جائے صرف یہی آیات مرکز دل کو خالق کائنات سے منسلک کرنے کا عامل بن جائیں ، روح میں پاکیزگی آجائے اور تحرک و فعالیت پیدا ہو جائے۔

❁



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے نسخہ قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱)
کے متن کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (شعلان فاضل)
مدرس / منیجر
امامیہ قرأت کالج



اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رَوِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لُغت کے زیادہ دِقت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سید شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔خدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

انچارج
شعبۂ تصحیح و ترتیب
مصباح القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــــ جلد ۱

ترتیب و تزئین ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد شکیل حسین موسوی
ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول وعقائد

توحید (اسمائے باری تعالیٰ)

۱۔ اللہ

۲۔ توّاب

۳۔ حکیم

۴۔ رب

۵۔ رحمٰن

۶۔ رحیم

۷۔ علیم

۸۔ غفور

قیامت

دُعا

شفاعت

جبر واکراہ

معجزہ

احکام

(فروعِ دین)

نماز

روزہ

حج

عدت

قسم

نکاح

◆ ◆ ◆

اخلاقیات

(اخلاقِ حسنہ)

انفاقِ رزق

ایفائے عہد

صبر

عفو و درگذر

اخلاقِ رذیلہ و سیئہ

خسران

فسق و فجور

کتمانِ حق

کفر

کذب

نفاق

اقوامِ سابقہ

بنی اسرائیل۔ یہود

صائبین

نصاریٰ

عمالقہ

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابلیس۔ شیطانِ اول

دحیہ کلبی

حضرت ہاجرہؑ

حضرت ہارون علیہ السلام

ہاروت و ماروت

ہلال بن محسن صابی

علماء و دانشور

کتبِ سماوی

انجیل

تورات

قرآنِ مجید

قرآن اور جدید سائنس

کتبِ تاریخ و تفسیر و سیرت

لغاتِ قرآن

(ا)

ابلیس: اسم معرفہ۔ شیطان جس نے آدمؑ کو ورغلایا ۱۶۲

اثم: گناہ ۴۸۸، ۴۹۱

اختلاف: مادہ "خلف" خلافت: جانشین ۲۹۴

ارزن: باریک دانوں کا ایک غلہ ۶۲۵

اساس القرآن: سورۂ فاتحہ ۳۸

اسباط: سبط، بسطت، انبساط۔ کسی شے کا آسانی سے پھیلاؤ ۳۴۰

اسرائیل: عبداللہ حضرت یعقوب کا ایک نام ۱۷۱

متفرق موضوعات

آیات

ابتلاء و امتحان

اقتصادیات

اکلِ باطل

اولوا الالباب

انفاق فی سبیل اللہ

بُت پرستی

بحر و انہار و کشتی

خلیفہ

ذباب ۔ مکھی

رشوت

رُشد

رعد

ریب ۔ شک

سقف ۔ چھت

سماجیات

سُود

شجر

شراب وجوا

شبہہ اکل وماکول

شمس وقمر

شہید

صراطِ مستقیم

صواعق

طبقاتی تفاوت

مذہب

مسئلۂ قومیت

مشرکین

ملائکہ

مؤمنین

من وسلویٰ

موت وحیات

نار

نور وظلمت

وقود - ایندھن

ہدایت

یتامیٰ

مقامات

آسمان وزمین

اُحد

ایک برباد بستی

بیت اللہ

٭ ٭ ٭